

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب	مطالب الفرقان (جلد سوم)
مصنف	غلام احمد پرویز
پبلشرز	طلوع اسلام ٹرسٹ
	۲۵، بی گلبرگ ۲، لاہور۔
پرنٹر	خالد منصور نسیم
پریس	النور پرنٹرز و پبلشرز
	۳/۲ فیصل نگر ملتان روڈ۔ لاہور۔
ایڈیشن	اول (نومبر ۱۹۷۹ء)
	دوم (نومبر ۱۹۸۸ء)
	سوم (مارچ ۱۹۹۳ء)
ضخامت	۱۴ + ۵۳۲ = ۵۴۸ صفحات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ایمپٹا

جلد سوم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶	ختم نبوت	۱	فہرست
	اختلافات کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔	۳	حرف آغاز
۸	اس کا صحیح مفہوم	۲	پہلا باب۔ الدین کے بنیادی اصول
۹	کتاب اللہ کی حکمرانی۔ حکومت خداوندی	۳	آیات $\frac{۲}{۱۱۳}$ تا $\frac{۲}{۱۳۳}$
	$\frac{۲}{۱۱۳}$ ومن اظلم خرابہا	$\frac{۲}{۱۱۳}$	وقالت الیہود یختلفون
۱۰	مساجد کا صحیح مفہوم۔ اطاعت خداوندی کا نظام	۴	الدین شروع سے ایک ہی چلا آتا تھا۔
۱۱-۱۲	دعا کا ضمنی مفہوم۔ رہبانیت کے خلاف	۵	رسول کے بعد اس میں آمیزش ہو جاتی۔
	ذرائع اور مقصد میں فرق	۶	اور مذہبی فرقے پیدا ہو جاتے۔
۱۳	ذکر کا مفہوم	۶	اسلام میں اس کا امکان نہیں تھا
۱۴	اسم اللہ کا مفہوم۔ صفات خداوندی کی جلوہ باریاں	۶	لیکن اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔
	$\frac{۲}{۱۱۳}$ اولئک عظیم		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۲	الذین خسرون - $\frac{۲}{۱۲۱}$	۱۲	ہماری مساجد کی حالت
۳۲	تلاوت کے معنی قرآن مجید کا اتباع کرنا ہیں - $\frac{۲}{۱۲۱}$	۱۳	وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ عَلِيم
۳۳	یٰۤیٰۤبَنۡیَ اِسْرَآئِیْل ینصرون - $\frac{۲}{۱۲۲-۱۲۳}$	۱۴	خدا زمان و مکان کی نسبتوں سے بلند ہے
	بنی اسرائیل اور قانونِ مکافاتِ عمل - $\frac{۲}{۱۲۲-۱۲۳}$	۱۵	وَقَالُوا قَانَتُونَ
	دوسرا باب — معمارِ حرم	۱۸	عیسائیوں کا ابنِ اللہ کا عقیدہ
	آیات $\frac{۲}{۱۲۴}$ تا $\frac{۲}{۱۲۵}$	۱۸	بدیع السموت یوقنون $\frac{۲}{۱۱۷-۱۱۸}$
	واذبتلی فاتمہن - $\frac{۲}{۱۲۴}$	۱۹	کلام اللہ وحی کو کہتے ہیں جس کا سلسلہ حضورؐ کی ذات پر ختم ہو گیا۔
۳۶	تمام رسولوں پر ایمان ضروری ہے۔	۲۰	حضرت موسیٰؑ سے کلام کرنے کا مفہوم
۳۶	تفریقِ بین الرسل جائز نہیں۔	۲۱	خدا کے لئے الفاظ کا مجازی مفہوم
۳۷	حضرت ابراہیمؑ کے تذکارِ جلیلہ کا آغاز	۲۲	حضرت موسیٰؑ کی (خدا کو بے حجاب دیکھنے کی درخواست)
۴۰	ابتلائے ابراہیمیؑ	۲۲	خدا کے انسانوں کے ساتھ کلام کرنے کے تین طریقے
	قال انّی جاعلک للناس اماما $\frac{۲}{۱۲۴}$	۲۳	معجزاتِ طلبی
 ظلمین۔	۲۵	کرامات کا عقیدہ
۴۱	نورِ انسانی کی امامت		انا ارسلنک اصحاب الجحیم $\frac{۲}{۱۱۹}$
۴۱	امام کے معانی	۲۶	رسول کا فریضہ لوگوں کو صحیح راستہ دکھانا تھا۔
۴۲	تفسیر ابن کثیر کی رو سے ان احکامات کی تفصیل	۲۷	اس راستے پر زبردستی چلانا نہیں تھا۔
۴۳	نسلی امتیاز کا باطل نظریہ		ولن ترضیٰ نصیر $\frac{۲}{۱۲۰}$
۴۴	وراثت کا باطل نظریہ	۲۸	اہل کتاب حضورؐ پر بہت کم ایمان لاتے۔
۴۴	نظامِ کن بنیادوں پر متشکل ہوتا ہے	۲۸	صرف اسلام ہی سچا دین کیوں ہے؟
۴۴	کعبہ - مرکزِ نظامِ خداوندی	۲۹	ملت کا مفہوم
		۳۱	مومنین اور اہل کتاب

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۸	اسلاف کے اعمال اگلی نسل کے کام نہیں آتے	۴۵	ہجرت کا مفہوم اور اہمیت
۶۸	اذ قال لہ مسلمون $\frac{۲}{۱۳۱-۱۳۲}$	۵۳	حضرت اسماعیلؑ کی وادی حجاز کی طرف نقل مکانی
۶۸	اسلام عمر کبر کا مسلسل پروگرام ہے	۵۳	تورات کا افسانہ
۶۹	قوموں کے عروج و زوال کا ابدی اصول	۵۴	بخاری کی روایت
۶۹	امرکتتم یعملون $\frac{۲}{۱۳۳-۱۳۴}$	۵۵	واذ جعلنا السجود $\frac{۲}{۱۳۵}$
۶۹	اسلاف کی بابت مت بحثوں میں پڑو	۵۵	کعبہ مرکز اجتماع امت ہے۔
۷۰	قرآن کریم نے شخصیت پرستی کا خاتمہ کر دیا تھا	۵۶	حج۔ عالمگیر انسانیت کا نقطہ اجتماع
۷۰	دین اللہ کا عطا کردہ ہوتا ہے	۵۷	طواف کا مفہوم
۷۱	اس کی نسبت کسی انسان کی طرف نہیں کرنی چاہیے	۵۸	عاکفین کا مفہوم
۷۱	مذہب کی نسبت اس کے بانی کی طرف ہوتی ہے	۵۸	بیت۔ خدا کا گھر ہونے کا مطلب
۷۱	وقالوا مشرکین۔ $\frac{۲}{۱۳۵}$	۶۰	مذہب میں کعبہ کی حیثیت
۷۱	حنیف کا مفہوم	۶۰	رسمی اعمال کا رائیگاں جانا
۷۲	ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت ضروری	۶۰	واذ قال ابراہیم بیئس المصیر۔ $\frac{۳}{۱۳۶}$
۷۲	قولوا امنا بحلیم۔ $\frac{۲}{۱۳۶-۱۳۷}$	۶۱	رزق کے لئے دعائیں
۷۳	اہل کتاب کے ایمان کا مطالبہ	۶۲	رزق کے دروازے مومن و کافر سب کے لئے کھلے ہیں۔
۷۳	جس طرح تم ایمان لائے ہو اسی طرح یہ بھی ایمان لائیں۔	۶۴	واذیرفع الرحیم $\frac{۲}{۱۳۷-۱۳۸}$
۷۴	صبغة اللہ عابدون $\frac{۲}{۱۳۸}$	۶۵	وادی حجاز کو مرکز بیت کے لئے کیوں منتخب کیا گیا تھا۔
۷۴	صبغة اللہ کا مفہوم	۶۵	ربنا المحکیم۔ $\frac{۲}{۱۳۹}$
۷۵	عیسائیوں کا بتسمہ یا اصطباغ	۶۵	انسانی ذات کو درخور اعتناء نہ سمجھنے والے۔
۷۶	قل اتعاجوننا مخلصون $\frac{۲}{۱۳۹}$	۶۵	ومن یرغب صالحین $\frac{۲}{۱۴۰}$
۷۶	دین کی صداقت کا استنتاجی طریق		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۹۴	اس امت کا موسس (حضرت ابراہیم)	۷۸	امرتقولون يعملون
۹۵	تعیین قبلہ کا مقصد		ماضی پرستی کی تباہ کاریاں
	قد تری يعلمون		(پہلا پارہ ختم)
۹۷	تربیتی مرکز	۸۰	تیسرا باب — مرکزیت کعبہ
۹۹	اب منقولات کے بجائے استدلالی دور آچکا ہے		آیات $\frac{2}{132}$ تا $\frac{2}{152}$
	الحق قدیر		کعبہ کی مرکزیت
۱۰۱	محسوس علامات کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا	۸۰	قریش مکہ اور یہودیوں کی مخالفت
	ومن حیث تعلمون	۸۲	سیقول مستقیم
۱۰۳	کعبہ، مرکز قلب و نظر	۸۳	تحویل قبلہ کی روایات
	فاذکرونی تکفرون	۸۴	معراج سے متعلق روایات
۱۰۴	ذکر کے معنی شرف و عظمت - عمرہ	۸۶	نمازیں کیسے فرض ہوئیں
۱۰۵	تقدیر - آغاز کار انسان کے ہاتھ میں ہے	۸۸	ایسی تفسیریں کس طرح لکھی گئیں اور قرآن کریم کے
۱۰۵	حقوق اور ذمہ داریوں کا باہمی تعلق		اس قسم کے ترجمے کس طرح ہو گئے
۱۰۷	چوتھا باب — رزمگاہ حیا		وحی کی دو قسمیں !
	آیات $\frac{2}{153}$ تا $\frac{2}{164}$	۸۹	کعبہ امت میں وحدت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے
۱۰۹	استعانت بالصبر والصلوة		وکنالک رحیم
	یا ایہا الذین صابرون	۹۰-۹۲	امت مسلمہ کی تشکیل اور اس کا فریضہ
۱۱۰	مقتولین فی سبیل اللہ		امرا بالمعروف اور نہی عن المنکر
	(شہداء)	۹۳	ولتکون من منکھامة کا غلط مفہوم
	ولا تقولوا تشعرون	۹۴	جماعت مومنین کی اہمیت

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۱۱	۲ ۱۹۰-۱۹۲ الذین ينظرون .	۱۱۱	شہداء جنگِ پاکستان کے متعلق افسانے
۱۲۷	توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ لیکن کس کے لئے؟	۱۱۲	۲ ۱۵۵ ولنبلوکم صابرين .
۱۲۷	اور کس کے لئے بند ہو جاتا ہے؟	۱۱۲	ابتلاء کا مفہوم
۱۲۸	ہماری حالت	۱۱۲	۲ ۱۵۶ الذین اذا راجعون
۱۲۹	۲ ۱۹۳ واللہکم الرحیم	۱۱۲	انا للہ وانا الیہ راجعون کا صحیح مفہوم
۱۲۹	جملہ کائنات میں قانونِ صرفِ خدا کا کارفرما ہے	۱۱۲	۲ ۱۵۷ اولئک مهتدون
۱۲۹	۲ ۱۹۴ ان یعقلون .	۱۱۳	دروہ کا مفہوم
۱۲۹	اس کی شہادت خود کارگر کائنات ہے	۱۱۴	قرآنی اصطلاحات
۱۳۰	۲ ۱۹۵ ومن الناس العذاب	۱۱۴	اسلام کی تاریخ مرتب کرنے کی ضرورت
۱۳۰	محبت (عشق) خدا کے ساتھ؟	۱۱۵	صلی علیہ کے معنی
۱۳۰	عشق حقیقی اور عشق مجازی!	۱۲۰	۲ ۱۵۸ ان الصّفا علیہم
۱۳۰	وصال اور عرس!	۱۲۰	حج اور عمرہ کا مفہوم
۱۳۱	حب اللہ کا قرآنی مفہوم	۱۲۰	جناح کا مفہوم
۱۳۴	۲ ۱۹۶-۱۹۷ اذ تبرا الذین الناس	۱۲۱	صفا اور مردہ
۱۳۴	تناسخ کا عقیدہ باطل ہے۔	۱۲۲	شعرا اللہ کا مفہوم۔ شعرا کبھی ضروری ہیں۔
۱۳۴	دنیا میں لوٹ کر نہیں آیا جاسکتا	۱۲۲	۲ ۱۵۹ ان الذین لا عنون
۱۳۵	۲ ۱۹۸-۱۹۹ یا ایہا الناس تعلمون	۱۲۲	قرآن بالکل واضح کتاب ہے۔
۱۳۵	حلال اور طیب رزق	۱۲۵	قرآنی تعلیم کو چھپانے کے طریق
۱۳۶	فحشاء کے معنی	۱۲۵	فقہ
۱۳۷	ستیات کے معنی	۱۲۶	قرآن کے باطنی معانی
۱۳۷	حسنات کے معنی	۱۲۶	لعنت ہر طرف سے
۱۳۷	۲ ۱۶۰ واذا یبھتدون		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	لیس الہیہ المتقون $\frac{۲}{۱۷۷}$	۱۳۸	مسلک تقلید
۱۵۴	بتر کی راہ کونسی ہے؟	۱۳۸	وشن کے معنی
۱۵۴	ذرائع اور مقصد کا باہمی تعلق	۱۳۹	وہائٹ ہیڈ کی وضاحت
۱۵۵	پانچ اجزائے ایمان		$\frac{۲}{۱۷۱}$ و مثل الذین یعقلون
۱۵۵	قبلہ کی طرف رخ کر لینا مقصود بالذات نہیں	۱۴۰	حیوانی روش
۱۵۵	اعمال صالح کی تفصیل		$\frac{۲}{۱۷۲}$ یا ایہا الذین تعبدون
۱۵۷	ان اجزاء کی تشریح	۱۴۰	حرام اور حلال کا نظریہ
۱۵۷	ذوی القربی۔ یتامی۔ مساکین۔ ابن السبیل۔		$\frac{۲}{۱۷۳}$ انما حرمہ رحیم
۱۵۹-۱۵۸	ساکین فی الرقاب، العقیقہ۔ دین کی گھاٹی کیا؟	۱۴۳	حرام چیزوں کی فہرست
۱۶۱	ذلت کے اسباب	۱۴۴	غیر اللہ کی طرف منسوب
۱۶۱	یتامی کی عزت نہ کرنا	۱۴۵	اہل کتاب کے بارے کا کلام
۱۶۱	نظام ربوبیت کی خصوصیات	۱۴۶	خنزیر کے گوشت سے متعلق بحث
۱۶۱	غلامی کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کی امداد		$\frac{۲}{۱۷۴}$ ان الذین الیم
۱۶۱	جمہوریت کا بنیادی نقص	۱۴۸	حرام چیزوں کی فقہی فہرستیں
۱۶۲	نظام خداوندی کی عملی شکل		$\frac{۲}{۱۷۵-۱۷۶}$ اولئک بعید
۱۶۲	زکوٰۃ کی مزید تشریح	۱۴۹	مذہبی پیشواؤں کا کاروبار
۱۶۳	رزق کے لئے انتظامات		پانچواں باب — بنیاد اور کتاب
۱۶۳	ایقانے عہد کا مفہوم		آیات $\frac{۲}{۱۷۷}$ تا $\frac{۲}{۱۸۸}$
۱۶۴	نظریہ ميثاق		دلائل۔ قوانین اور شمیر۔ تشکیل نظام خداوندی
۱۶۴	امانات کا مفہوم		کی تین کڑیاں
۱۶۵	ميثاق خداوندی کی عملی شکل	۱۵۳	
۱۶۵	حقوق و فرائض		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۸۶	کتاب حکمت - قانون اور اس کی غایت کا باہمی تعلق	۱۶۸	میدان جنگ میں مادی اسباب کی اہمیت
۱۸۶	ایسا کرنے سے کیا ہوگا؟	۱۶۸	انسانی جان کی قدر و قیمت
۱۸۷	روزوں کے احکام کی تفصیل	۱۶۸	شریکان مہم دین میں
۱۸۷	ایمان تعلیمون ۲/۱۸۳	۱۶۸	یا ایہا الذین تتقون ۲/۱۶۹-۱۷۰
۱۸۸	الذین یطیعونہ کی قدیمیت پر مبنی تفسیر	۱۷۹	تہذیب کا حکم
۱۹۰	نزول قرآن - کائنات انسانی کا عظیم ترین انقلابی واقعہ	۱۷۹	کفر کے معنی
۱۹۱	غیر مسلموں کی شہادت	۱۷۹	جمہوریت کا فلسفہ
۱۹۲	واقعہ نزول قرآن پر جشن مسرت منلو	۱۷۹	کتاب علیکم متقین ۲/۱۸۰
۱۹۲	شہر تعلیمون ۲/۱۸۵-۱۸۸	۱۷۹	ان کی اہمیت
۱۹۳	روزوں کے مزید احکام	۱۷۹	وہمیت کا حکم
۱۹۴	اعتکاف کا مفہوم	۱۷۹	فہم رحیم ۲/۱۸۱-۱۸۲
۱۹۵	لیلة القدر	۱۷۹	مفہم قانونی شریعت اس کے خلاف ہے
۱۹۵	شب بارات کا ثیو مار	۱۷۹	مفہم قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے؟
۱۹۷	روزوں کی غایت - ان سے مقصد	۱۸۰	ایمانیہ ذات رسالت کے خلاف گستاخی ہے
۱۹۷	خدا کی کبریائی کا عملی مفہوم: نظام خداوندی کا غلبہ	۱۸۱	روح فرسا واقعات
۲۰۱	اللہ اکبر کا مفہوم	۱۸۱	ائمہ کا فیصلہ
۲۰۱	حزب اللہ کا غلبہ	۱۸۲	وہمیت کے متعلق ایسا قانون بن ہی نہیں سکتا
۲۰۲	جانور ذبح کرتے وقت تکبیر کا مقصد	۱۸۲	جو کتاب سنت کے مطابق ہو۔
۲۰۳	مال حرام سے اجتناب	۱۸۲	حق تلفی
۲۰۳	رشوت کی ممانعت	۱۸۲	یا ایہا الذین تتقون ۲/۱۸۳
۲۰۴	دعا کا تفصیلی بیان	۱۸۲	کچھ اور قانون میں فرق
		۱۸۳	مفہم (دیندوں) کے احکام

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۳۰	قری اور شسی کیلنڈر	۲۰۴	اس کے غلط مفہوم سے پیدا ہونے والے شکوک
۲۳۱	نسی کا عملی مفہوم		اور اعتراضات
۲۳۲	سال کے بارہ مہینے لیکن کیلنڈر قمری	۲۰۷	السلطان ظل اللہ علی الارض کا عقیدہ
۲۳۳	اس سے پیدا ہونے والی الجھنیں	۲۰۸	دعائیں کس کی قبول ہوتی ہیں۔
۲۳۴	اسلام توہم پرستی کو مٹانے کے لئے آیا تھا	۲۱۱	حضرات انبیاء کرام کی دعائیں
۲۳۴	مذہب میں دین کے ارکان توہم پرستی بن جاتے ہیں	۲۱۳	مظلوموں کی دعائیں کیسے سنی جاتی ہیں
۲۳۵	حج کے اجتماع پر غیر مسلموں کو دعوت مشاہدہ	۲۱۵	مومنین کی سب دعائیں اجتماعی ہوتی ہیں۔
	آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ کی تشریح	۲۱۷	دعا سے ہونا کیا ہے؟ نفسیاتی تبدیلی۔
	صفحہ ۲۶۶ - ۲۸۱ پر دیکھیے	۲۲۱	ایک دوسرے کے لئے دعائیں۔
۲۳۸	۲۱۹۴ واتموا الحج شدید العقاب	۲۲۲	معراج نبوی کا مفہوم
	حج کے مزید احکام	۲۲۳	مقربین بارگاہ خداوندی
	۲۱۹۷ الحج الباب	۲۲۴	قرآن سے جواب ملتا ہے
۲۳۹	عقل کی اہمیت	۲۲۵	مرشد صرف خدا ہے۔
	۲۱۹۸ لیس الضالین	۲۲۶	کفارہ کے روزے
"	احرام		
	۲۱۹۹ ثما فیضوا رحیم		
۲۴۴	قربانی، ذبح، نحر		
۲۵۰	سنت ابراہیمی (ذبح عظیم)		
۲۵۲	حجر اسود		
۲۵۲	رمی الحجارۃ - تین شیطانوں کو پتھر مارنا	۲۲۸	حج اور عمرہ کے اجتماعات عہد جاہلیہ میں
۲۵۳	اصحاب انقیل (پاٹھنیوں والے کالشر)	"	شہر الحرام
	۲۲۰۰ فاذا الدالخصام		
			۲۱۸۹ آیت ۲ تا ۲۱۸
			حج اور عمرہ کے اجتماعات عہد جاہلیہ میں
			شہر الحرام
			۲۱۸۹ ہیسئلونک تفلحون

چھٹا باب — آل ورلڈ مسلم کانفرنس
حج کا اجتماع

آیات ۲ تا ۲۱۸

حج اور عمرہ کے اجتماعات عہد جاہلیہ میں

شہر الحرام

۲۱۸۹ ہیسئلونک تفلحون

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۴۰	مرتد کی سزا قتل	۲۵۵	دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں
۲۴۴	فی سبیل اللہ کا مفہوم	"	دنیا کے مقابلے میں آخرت کا مفہوم
۲۴۴	طاغوت سے مراد	۲۵۵	مذہب میں اعمال رائیگاں چلے جاتے ہیں
۲۴۵	فتنہ سے مراد	۲۵۵	نظامِ خداوندی کے دشمن لیکن ایمان کے مدعی
	الشہر الحرام المتقین $\frac{۲}{۱۹۳}$	۲۵۶	سیکولر ازم مذہب کے نقاب میں۔
۲۴۷	مذہبی آزادی کی خاطر جنگ		واذا قولی المہاد $\frac{۲}{۲۰۵-۲۰۶}$
	انسان کا اختیار سلب کر لینا بدترین استبداد ہے	۲۵۷	مستبد حکمران
۲۸۱	حرمات کے مہینوں کی پابندی	"	تکذیب دین کرنے والے
	وانفقوا فی المحسنین $\frac{۲}{۱۹۵}$	۲۵۸	اثم و عدوان
۲۸۱	جنگ کے اخراجات پورے کرنے کے لئے	۲۵۸	یہ تباہی ساری قوم کی ہوتی ہے
	(۱۰)		ومن الناس العباد $\frac{۲}{۲۰۷}$
	یا ایہذا الذین صبین $\frac{۲}{۲۰۸}$	۲۵۹	رضیات اللہ کا مفہوم
۲۸۲	اسلام کی تشریح و توضیح	۲۵۹	خوشنود ہی باری تعالیٰ کا تصور
۲۸۳	اسلام کی تغیر جانتا ہے اور محیط کل نظام ہے	۲۶۰	رضی اللہ عنہم و رضوانہ
	کافۃ اسلام کا مطالبہ	۲۶۴	قتال کے مقاصد اور ہدایات
	فان زللتہ حکیم $\frac{۲}{۲۰۹}$		آیات $\frac{۲}{۱۹۰}$ تا $\frac{۲}{۱۹۵}$
۲۸۳	قوت اور حکمت کا انتزاع		وقاتلوا الظالمین $\frac{۲}{۱۹۰-۱۹۳}$
۲۸۴	اسلامی نظام کو مسلسل قائم رکھنا ہوگا	۲۶۶	اسلام یا تلوار کا گمراہ کن پراپیگنڈہ
۲۸۵	قانون استبدال و استخلاف قومی		جنگ کے متعلق تفصیلی بحث
۲۸۷	قوموں کی باز آفرینی کا امکان	۲۶۶	اسلام کی وحشت انگیز تصویر
"	سیکولر ازم کے تحت حکومت کا انجام	۲۶۷	مودودی مرحوم کی تفسیر
	ہل ینظرون حساب $\frac{۲}{۲۱۰-۲۱۲}$	۲۶۷	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	ساتواں باب — دُرُونِ خَا	۲۸۸	اس کے لئے خدا خود نہیں آیا کرتا۔ اس کا قانون مکافات
	آیات ۲/۲۱۹ تا ۲/۲۵۷		یہ نتائج پیدا کر دیتا ہے۔
	۲/۲۱۹ یسئلونک تتفکرون۔	۲۸۸	۲/۲۱۳ کان الناس مستقیم
۳۱۷	اثم وعدوان	۲۹۰	وحدت انسانیت۔ وحی کا منتہی
۳۱۷	خمر کا مفہوم	۲۹۲	ہمارے اختلافات کس طرح مٹ سکتے ہیں؟
۳۱۷	امتناع خمر کے تدریجی احکام	۲۹۳	نوع انسان کے اختلافات کی تاریخ
۳۲۱	جنت کی شراب	۲۹۵	امت مسلمہ کی تشکیل۔ ایک ملت۔
۳۲۲	بلا سمجھے نماز یا تلاوت قرآن مجید	۲۹۵	اس کی مخالفت
۳۲۲	جوا (میسرہ)		۲/۲۱۳ امر حسبہتم قریب۔
۳۲۳	نظام سرمایہ داری بھی میسرہ ہے	۲۹۶	جنت یونہی نہیں مل جائے گی
۳۲۴	انصاب۔ چڑھاوے	۲۹۷	جنگ احزاب کا ہولناک نقشہ
۳۲۴	ازلام۔ قرعہ اندازی، فالیں لینا، لاٹری	۲۹۸	حصول جنت کے آسان طریقے
۳۲۴	قسمت کا حال پوچھنا	۳۰۱	جنت بطور بخشش
۳۲۴	عقیدہ تقدیر	۳۰۲	یہ نظام قائم ہو کر رہیگا خواہ کسی قوم کے ہاتھوں ہو۔
۳۲۶	قل العفو کی بحث۔ العفو کا مفہوم		۲/۲۱۵-۲۱۶ یسئلونک تعلمون
۳۲۷	غور و فکر۔ اخروی زندگی تک میں بھی	۳۰۲	الفاق کی اہمیت
	۲/۲۲۲-۲۲۳ فی الدنيا مستطہرین	۳۰۴	روزوں کی فرضیت پر اتنا زور، لیکن قتال
۳۲۹	رسول اللہ کی یتیمی کی حالت		کی فرضیت کا ذکر تک نہیں کیا جاتا
۳۲۹	یتیموں کے متعلق احکام	۳۰۵	میرزا غلام احمد نے جہاد کو منسوخ قرار دیدیا۔
۳۳۲	یتیموں کی دوسری قسم۔ بے یار و مددگار لوگ		۲/۲۱۷-۲۱۸ یسئلونک رحیم
		۳۰۷	ارتداد۔ قومی و انفرادی
		۳۰۸	ہجرت کا قرآنی مفہوم اور مقام

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۷۴	عزل - استمناہ بالید	۳۳۲	العقبہ کا مفہوم
۳۷۷	نساء کم مومنین $\frac{۲}{۲۲۳}$	۳۳۳	قرآن کا معاشی نظام اور اس کی غایت
۳۷۷	نساء کم حوث لکم کی تفسیر روایات کی روش سے	۳۳۴	تکذیب دین کرنے والے - سرمایہ دار
۳۸۱	ولا تجعلوا حلیم $\frac{۲}{۲۲۴-۲۲۵}$	۳۳۶	عائلی زندگی سے متعلق احکام و ہدایات
۳۸۱	ظہار $\frac{۲}{۲۲۴-۲۲۵}$	۳۳۶	نکاح کی تفصیل و شرائط
۳۸۳	ایلاء	۳۳۸	(حضرت) عائشہؓ کی عمر و وقت شادی
۳۸۵	طلاق سے متعلق احکام	۳۳۸	مودودی مرحوم اور نابالغ لڑکیوں کی شادی
۳۹۲	حلالہ	۳۴۲	محرمات
۳۹۵	مُتَّع	۳۴۳	رضاعی ماں اور بہن
۴۰۴	جنسی تعلقات کے متعلق ڈاکٹر انون کی تحقیق	۳۴۵	تعدد ازواج
۴۰۵	عدت	۴۰۸	رسول اللہؐ کی ازواجِ مطہرات
۴۱۰	رضاعت (دودھ پلانا)	۴۵۲	مجرد، ضبط (عفت) نفس سے کام لیں۔
۴۱۲	حضانت (بچہ کس کی تحویل میں ہے)	۴۵۴	مہر
۴۱۳	فلسفہ موت و حیات	۴۵۴	اجوس ہن سے مراد
۴۱۳	حافظوا تعلمون $\frac{۲}{۲۳۸-۲۳۹}$	۴۵۵	ایک ضمنی نکتہ - عربوں کے ہاں کی مروجہ اصطلاحات
۴۱۳	صلوۃ الوسطی	۴۵۷	اور قرآنی اصطلاحات میں فرق۔
۴۱۳	صفحو ۴۰۸، ۴۰۹ پر آچکی ہیں۔ $\frac{۲}{۲۴۰-۲۴۲}$	۴۵۷	(ضمنی) طلاق کے متعلق ایک نکتہ
۴۱۴	المتر علیم $\frac{۲}{۲۴۳-۲۴۴}$	۴۵۸	جہیز محض رسم ہے
۴۱۴	فلسفہ موت و حیات۔	۴۵۹	الرجال قوامون علی النساء کا مفہوم
	زندہ وہ رہتا ہے جو موت کے نہیں ڈرتا	۴۶۰	نسبی اور سرکاری رشتے
		۴۶۰	جنسی اختلاط کے متعلق بحث
		۴۶۳	اس کا مقصد - خاندانی منصوبہ بندی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۱۶	قرض حسنہ - خدا کو قرض دینا	۴۱۶	من ذالذی ترجعون
۴۱۹	بنی اسرائیل کا ایک واقعہ	۴۱۹	الہ تر مومنین
۴۲۰	کمانڈر کے انتخاب کا معیار - دولت نہیں - اہلیت اور صلاحیت ہے - تقدیر است الہیہ ہی قوانین خداوندی ہیں - (حضرت طاہر علیہ السلام کا انتخاب علم اور قوت کا امتزاج	۴۲۰	تباہی و تباہی سے مراد کثرت و قلت کا باطل اصول
۴۲۱	رشد و ہدایت - ایمان باللہ کے لئے کفر باطاغوت ضروری ہے	۴۲۱	کلیما فصل المرسلین
۴۲۱	کیمونزم کے فلسفہ کی بنیادی کمزوری	۴۲۱	کامیابی کا راز تعداد کی کثرت نہیں، ایمان اور صلاحیت ہے - مغربی جمہوریت -
۴۲۱	اللہ ولی خال دون - ولی کے معنی اولیاء اللہ	۴۲۱	اذن اللہ کے معنی
۴۲۱	آٹھواں باب - قرآنی نظام کے ابتدائی مصل	۴۲۱	تلك الرسل یرید
۴۲۱	آیات ۲۵۸ تا ۲۸۶	۴۲۱	تفریق بین الرسل جائز نہیں
۴۲۱	ختم سورۃ بقرہ	۴۲۱	کلام اللہ سے مراد
۴۲۱	المتر قدیر	۴۲۱	یا ایہا الذین ظالمون
۴۲۱	اسوۃ ابراہیمی	۴۲۱	انفاق کی اہمیت

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۷۹	تجارت اور ربو میں فرق	۴۵۶	بادشاہ وقت سے مناظرہ
۴۷۹	قانون کا اطلاق اس کی تاریخ نفاذ سے ہوگا۔	۴۵۷	واذ قال حکیم
۴۸۲	اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت	۴۵۷	مردوں کے زندہ کرنے کے متعلق روایاتی تفسیر
۴۸۳	یا ایہا الذین علیم	۴۵۹	(حضرت) ابراہیم کو معاذ اللہ شک۔
۴۸۵	لین دین کے متعلق ہدایات	۴۶۳	مثال الذین علیم
۴۸۹	دو عورتوں کی گواہی	۴۶۳	اتفاق فی سبیل اللہ
۴۸۹	رہن یا قبضہ	۴۶۴	لفظ سبع (سات) کا مفہوم
۴۹۰	لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ قدیر	۴۶۵	الذین بصیر
۴۹۰	قانون مکافات عمل	۴۶۶	اتفاق فی سبیل اللہ کے اثرات
۴۹۱	امن الرسول مصیر	۴۶۸	تشبیت نفس
۴۹۱	رسول کو بھی وحی پر ایمان لانا ہوتا تھا	۴۷۰	اَیُّوۃٌ تتفکرون۔
۴۹۱	ایمان کے بعد سوچ سمجھ کر اطاعت	۴۷۲	انشورنس
۴۹۲	لا یکلف اللہ کافرین	۴۷۲	نذر کے معنی۔ خدمات جو اپنے فے لے لی جائیں۔
۴۹۳	لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا	۴۷۳	یا ایہا الذین یظلمون
۴۹۳	کسب اور کتاب میں فرق	۴۷۴	معاشی نظام کی بنیاد
۴۹۳	نسیان، عزم کی کمزوری ہے	۴۷۴	صدقات کا مفہوم
۴۹۴	مومنین کی دعائیں	۴۷۴	دل کی رضا مندی۔ مومنین کا استغناء
۴۹۴	مولانا۔ صرف خدا کی ذات ہے۔	۴۷۴	ربو کی بحث
۴۹۴	انڈیکس	۴۷۴	نظام سرمایہ داری اور مودودی مرحوم

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

حسن این قصہ عشق است دفتر نمی گنج

انکارِ کلام

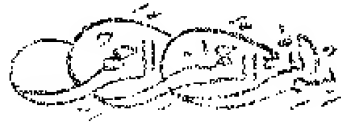
مطالب الفرقان کی پہلی جلد اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی اور دوسری جلد اکتوبر ۱۹۷۶ء میں۔ یہ دو گرام پر پختہ کر کے اس کی آئندہ جلدیں بھی اسی رفتار سے شائع ہوتی رہیں۔ پچانچہ میں نے جلد سوم کا مسودہ جولائی ۱۹۷۷ء میں مکمل کر لیا تھا۔ لیکن ہمارے ہاں کے نظامِ کتابت و طباعت کی منزل ایسی صبرِ آزما ہے کہ اس میں تمام عزمِ فسخ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کتاب اس کے فریب اڑھائی سال بعد قارئین کے سامنے آ رہی ہے۔ اس دوران میں اربابِ ذوقِ قرآنی کے پیہم تقاضے ان کی جس بیانی تمنا کے آئینہ دار بننے اس کا مجھے بخوبی احساس ہے لیکن اس بے بسی کے عالم میں خود مصنف کے دل پر جو گزرتی ہے اس کا شاید کوئی اور اندازہ نہ لگا سکے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ بالآخر یہ جلد شائع ہو گئی اور سابقہ جلدوں کے سے معیار کے مطابق شائع ہو گئی۔ ورنہ اس نامے میں ایسا معیار قائم رکھنا بڑا مشکل ہے۔

۲۔ جلد اول، سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کی ابتدائی ۲۹ آیات پر مشتمل تھی اور ضخامت ۳۸۸ صفحات۔ جلد دوم سورۃ بقرہ کی آیات ۱ تا ۱۱۲ کو محیط تھی اور ضخامت ۴۷۹ صفحات۔ زیرِ نظر جلد اسی سورۃ کی آیات ۱۱۳ تا ۲۸۶ پر مشتمل ہے جس پر سورۃ بقرہ اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ ضخامت اس کی ۵۴۸ صفحات ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخر میں، چھتیس صفحات پر مشتمل تینوں جلدوں کے جامع اندکس کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ اندکس یوں تو سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کے مضامین کا آئینہ دار ہے، لیکن اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ جائے گی کہ اسلام سے متعلق غاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس سے متعلق جمل یا مفصل اشارہ اس میں نہ آ گیا ہو۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھتے تو مطالب الفرقان کی یہ تین جلدیں پورے کے پورے قرآن مجید کی گویا طائرِ پیشِ رس ہیں جو تفسیر، تشریفِ آیات کے انداز سے حریج کی جائے اس کی جامعیت کا یہی عالم ہوتا ہے۔

۳۔ سلسلہ مطالب الفرقان کا تفصیلی تعارف اس کی پہلی دو جلدوں میں کرایا جا چکا ہے۔ اس پر کئی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آیات کا حوالہ اس جلد میں بھی حسبِ سابق ہے۔ یعنی (۱۱۳) سے مراد ہے سورۃ بقرہ کی آیت ۱۱۳، اندکس میں البتہ انہیں یوں لکھا گیا ہے (۱۱۳: ۲)۔ اسے ذہن میں رکھیے۔

۴۔ آخر میں، بدرِ گاہ رب العزت عرض گزار ہوں کہ جس طرح اس کے فیض بے پایاں نے مجھے اپنی کتابِ عظیم کے ساتھ والہانہ طور پر متمسک رہنے کی اب تک توفیق ارزانی فرمائی ہے، یہ سلسلہ زندگی کے آخری سانس تک قائم رہے۔ اس کے بعد مجھے کچھ اور مانگنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے!

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دُعا کے بعد



مَطَالِبُ الْفُرْقَانِ

جِلْد سَوِّم



سُورَةُ بَقَرَةٍ — آيَات — ١١٣ — تَا نُمْبَر ٢٨٤

خَتْمُ سُورَةِ بَقَرَةٍ

پہلا باب

الدین کے بنیادی اصول

- (۱) الدین شروع سے ایک ہی چلا آ رہا تھا۔
- (۲) اس کی تکمیل بعثت رسول اللہ سے ہوئی۔
- (۳) جب دین میں انسانی خیالات کی آمیزش ہو جاتے تو وہ مذہب بن جاتا ہے۔
- (۴) مذہب میں فرقے پیدا ہو جاتے ہیں۔
- (۵) فرقوں کے اختلافات صرف اس نظام میں مٹ سکتے ہیں جس میں تمام فیصلے کتاب اللہ کیطابق ہوں۔
- (۶) لیکن اہل کتاب نہ اس کتاب پر ایمان لائیں گے نہ اس نظام کو تسلیم کریں گے۔
- (۷) اس نظام کا مرکز کعبہ ہے جس کا تفصیلی تذکرہ دوسرے باب میں سامنے آئے گا۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پہلا باب

الدین کے بنیادی اصول

آغاز — سورۃ بقرہ — آیت نمبر ۱۱۳

مطالب الفرقان کی دوسری جلد کا اختتام سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۱۲ پر ہوا تھا۔ اُس (جلد) کا آخری حصہ بہ نسبت مجموعی داستان بنی اسرائیل پر مشتمل تھا۔ زیر نظر جلد کے ابتدا میں بھی انہی کا تذکرہ آئے گا، لیکن جستہ جستہ مقامات پر یہ آغاز کلام آیت نمبر ۱۱۳ سے کیا جاتا ہے جو یوں ہے :-

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصْرَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ - كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ - فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ - (۲/۱۱۳)

۲
۱۱۳

مفہوم اس آیت جلیلیہ کا یہ ہے :

حق کی مخالفت کرنے والوں کی حالت کبھی عجیب ہوتی ہے۔ ان کے باہمی اختلافات خواہ کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں، دینِ خداوندی کی مخالفت میں یہ سب متحدہ محاذ بنالیتے ہیں۔ یہی کیفیت ان یہود و نصاریٰ کی ہے، تمہاری مخالفت میں یہ سب ایک ہو جاتے ہیں، لیکن باہمی اختلافات کا یہ عالم ہے کہ یہودی، عیسائیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان کا مذہب کچھ نہیں۔

عیسائی، یہودیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ سچائی پر نہیں۔ اور لطف یہ کہ دونوں اس کے مدعی ہیں کہ وہ اُس کتاب کی پری کرتے ہیں جس کا سرچشمہ ایک ہے (یعنی عہد نامہ عتیق و جدید کی)۔ یہی حالت ان (مشرکین عرب) کی ہے جنہیں کتاب (وغیرہ) کا کوئی علم نہیں۔ وہ بھی اپنے معتقدات کو حق پر مبنی قرار دیتے ہیں اور دوسروں کی مخالفت کرتے ہیں۔ پارٹی بازی کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ ان کے یہ اختلافات جو خدا کا عذاب ہیں (۱۱۱) اُس وقت تک نہیں مٹ سکتے جب تک قرآن کی رو سے انسانی معاشرہ میں انقلابِ عظیم واقع نہیں ہو جاتا۔ (۱۱۱)۔ اُس وقت عالمگیر انسانیت اور وحدتِ اقتدار و قانون کا تصور غالب آجائے گا۔ اور یوں اختلافات مٹ جائیں گے۔ یا پھر مرنے کے بعد ہر ایک کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ حق پر تھا یا باطل پر۔

اس آیت کی مختصر سی تشریح، مطالب الفرقان، جلد دوم (صفحہ ۱۹۲) میں، زیر آیت (۱۱۱) گزر چکی ہے۔ مزید وضاحت کے سلسلہ میں سمجھ لینا چاہیے کہ:-

(۱) اصول اور اساسی طو پر دین شروع سے ایک ہی چلا آ رہا ہے۔ شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا

وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى...

الدين کی وحدت

... (۱۱۲)۔ (اے مخاطبینِ قرآن) تمہارے لئے بھی الدین کا وہی راستہ تجویز کیا گیا ہے جس کا حکم (حضرت) نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (رحمہ اللہ) انبیاء کرامؑ کو دیا گیا تھا، اور جس کا حکم (اے رسول!) اب

تمہیں دیا جا رہا ہے۔ چونکہ الدین سے اس سرچشمہ ایک ہی تھا۔ یعنی وحیِ خداوندی۔ اس لئے

اس میں اختلاف اور تفرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر جہاں انبیاء کرامؑ سے کہہ دیا گیا تھا: اَنْ اَتَّبِعُوا الدِّينَ

وَلَا تَفَرَّقُوا فِیْهِ۔ (۱۱۲)۔ وہ اس دین (نظامِ خداوندی) کو متکلیں کریں اور اس میں کسی قسم کا تفرقہ پیدا نہ کریں،

لیکن ہوتا یہ رہا کہ جب تک رسول زندہ رہتا وہ اپنے متبعین کو وحیِ خداوندی (کتاب اللہ) کے مطابق چلاتا اور

اس طرح انہیں ایک مرکز پر قائم رکھتا۔ الدین کی عملی شکل، منابطہ قوانین کی وحدت کی رو سے، امت واحدہ کی

تشکیل ہے۔ لیکن اس کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد، اُس وحیِ خداوندی میں آمیزشیں شروع ہو جاتیں۔

یہ ماجرا ہر رسول کی وحی کے ساتھ گزرا۔ وَمَا اَمْرُ سَلْتَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَلَا نَبِیٍّ اِلَّا اِذَا اَمَّیْتُ

اَلْقَى الشَّیْطٰنُ فِیْ اَمْنِیَّتِهِمْ (۱۱۳)۔ (نیز ۱۱۳ ز ۱۱۴)۔ "اے رسول! تم سے پہلے جسے ہمارے فرستادہ نبی آئے

اُن کے ساتھ یہ ہوتا رہا کہ وہ جب، ہمارا پیغام پہنچا کر، دنیا سے رخصت ہو جاتے تو ان قوانین سے سرکشی برتنے

والے، ان کی وحی میں آمیزش کر کے اسے کچھ کا کچھ بنا دیتے۔" فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یَحْكُمُ

اللّٰهُ اَیْتِهِ۔ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ (۱۱۴)۔ "اس کے بعد خدا ایک اور رسول بھیج دیتا اور سابقہ وحی سے

انسانی آمیزش کو دور کر کے، اپنے قوانین کو پھر مندرجہ حالت میں محکم کر دیتا۔ اس لئے کہ خدا کو ہر بات کا علم ہوتا ہے، اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ”اسے نسخ و منسوخ کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا تفصیلی ذکر جلد اول صفحہ ۱۲۵۔ زیر آیت ۲؛ جلد دوم صفحہ ۴۴ زیر آیت ۲۱۰، آچکا ہے، جب الدین میں انسانی خیالات کی آمیزش ہو جائے تو اسے مذہب کہا جاتا ہے۔ جب سابقہ رسول کی وحی سے انسانی آمیزش دور کرنے کے لئے نیا رسول آتا، تو مذہب پرست طبقہ اپنے مذہب پر بضد قائم رہتا اور اس رسول کی طرف سے پیش کردہ الدین کی سخت مخالفت کرتا۔ یہ مخالفت مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوتی جو مذہب کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیتے تھے۔ (تفصیل اس کی جلد اول صفحہ ۲۵۶ زیر آیت (۲۱۰)؛ اور جلد دوم صفحہ ۴۴ زیر آیت (۲۱۰) دیکھیے)۔ اس طرح دنیا میں دین واحد کی جگہ، مختلف مذاہب پیدا ہو گئے۔ پھر جس طرح ہر پیشیہ میں ہوتا ہے، ان مختلف مذاہب کے پیشواؤں کی باہمی رقابت، انہیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رکھتی۔ کاروبار چلتا ہی اس طرح سے ہے۔ اس پیشیہ ورانہ رقابت کو قرآن کریم نے ”بَغْيًا بَيْنَهُمْ“ کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ (دیکھیے آیات ۲۰؛ ۲۱؛ ۲۲؛ ۲۳؛ ۲۴؛ ۲۵؛ ۲۶؛ ۲۷؛ ۲۸؛ ۲۹؛ ۳۰؛ ۳۱؛ ۳۲؛ ۳۳؛ ۳۴؛ ۳۵؛ ۳۶؛ ۳۷؛ ۳۸؛ ۳۹؛ ۴۰؛ ۴۱؛ ۴۲؛ ۴۳؛ ۴۴؛ ۴۵؛ ۴۶؛ ۴۷؛ ۴۸؛ ۴۹؛ ۵۰؛ ۵۱؛ ۵۲؛ ۵۳؛ ۵۴؛ ۵۵؛ ۵۶؛ ۵۷؛ ۵۸؛ ۵۹؛ ۶۰؛ ۶۱؛ ۶۲؛ ۶۳؛ ۶۴؛ ۶۵؛ ۶۶؛ ۶۷؛ ۶۸؛ ۶۹؛ ۷۰؛ ۷۱؛ ۷۲؛ ۷۳؛ ۷۴؛ ۷۵؛ ۷۶؛ ۷۷؛ ۷۸؛ ۷۹؛ ۸۰؛ ۸۱؛ ۸۲؛ ۸۳؛ ۸۴؛ ۸۵؛ ۸۶؛ ۸۷؛ ۸۸؛ ۸۹؛ ۹۰؛ ۹۱؛ ۹۲؛ ۹۳؛ ۹۴؛ ۹۵؛ ۹۶؛ ۹۷؛ ۹۸؛ ۹۹؛ ۱۰۰؛ ۱۰۱؛ ۱۰۲؛ ۱۰۳؛ ۱۰۴؛ ۱۰۵؛ ۱۰۶؛ ۱۰۷؛ ۱۰۸؛ ۱۰۹؛ ۱۱۰؛ ۱۱۱؛ ۱۱۲؛ ۱۱۳؛ ۱۱۴؛ ۱۱۵؛ ۱۱۶؛ ۱۱۷؛ ۱۱۸؛ ۱۱۹؛ ۱۲۰؛ ۱۲۱؛ ۱۲۲؛ ۱۲۳؛ ۱۲۴؛ ۱۲۵؛ ۱۲۶؛ ۱۲۷؛ ۱۲۸؛ ۱۲۹؛ ۱۳۰؛ ۱۳۱؛ ۱۳۲؛ ۱۳۳؛ ۱۳۴؛ ۱۳۵؛ ۱۳۶؛ ۱۳۷؛ ۱۳۸؛ ۱۳۹؛ ۱۴۰؛ ۱۴۱؛ ۱۴۲؛ ۱۴۳؛ ۱۴۴؛ ۱۴۵؛ ۱۴۶؛ ۱۴۷؛ ۱۴۸؛ ۱۴۹؛ ۱۵۰؛ ۱۵۱؛ ۱۵۲؛ ۱۵۳؛ ۱۵۴؛ ۱۵۵؛ ۱۵۶؛ ۱۵۷؛ ۱۵۸؛ ۱۵۹؛ ۱۶۰؛ ۱۶۱؛ ۱۶۲؛ ۱۶۳؛ ۱۶۴؛ ۱۶۵؛ ۱۶۶؛ ۱۶۷؛ ۱۶۸؛ ۱۶۹؛ ۱۷۰؛ ۱۷۱؛ ۱۷۲؛ ۱۷۳؛ ۱۷۴؛ ۱۷۵؛ ۱۷۶؛ ۱۷۷؛ ۱۷۸؛ ۱۷۹؛ ۱۸۰؛ ۱۸۱؛ ۱۸۲؛ ۱۸۳؛ ۱۸۴؛ ۱۸۵؛ ۱۸۶؛ ۱۸۷؛ ۱۸۸؛ ۱۸۹؛ ۱۹۰؛ ۱۹۱؛ ۱۹۲؛ ۱۹۳؛ ۱۹۴؛ ۱۹۵؛ ۱۹۶؛ ۱۹۷؛ ۱۹۸؛ ۱۹۹؛ ۲۰۰؛ ۲۰۱؛ ۲۰۲؛ ۲۰۳؛ ۲۰۴؛ ۲۰۵؛ ۲۰۶؛ ۲۰۷؛ ۲۰۸؛ ۲۰۹؛ ۲۱۰؛ ۲۱۱؛ ۲۱۲؛ ۲۱۳؛ ۲۱۴؛ ۲۱۵؛ ۲۱۶؛ ۲۱۷؛ ۲۱۸؛ ۲۱۹؛ ۲۲۰؛ ۲۲۱؛ ۲۲۲؛ ۲۲۳؛ ۲۲۴؛ ۲۲۵؛ ۲۲۶؛ ۲۲۷؛ ۲۲۸؛ ۲۲۹؛ ۲۳۰؛ ۲۳۱؛ ۲۳۲؛ ۲۳۳؛ ۲۳۴؛ ۲۳۵؛ ۲۳۶؛ ۲۳۷؛ ۲۳۸؛ ۲۳۹؛ ۲۴۰؛ ۲۴۱؛ ۲۴۲؛ ۲۴۳؛ ۲۴۴؛ ۲۴۵؛ ۲۴۶؛ ۲۴۷؛ ۲۴۸؛ ۲۴۹؛ ۲۵۰؛ ۲۵۱؛ ۲۵۲؛ ۲۵۳؛ ۲۵۴؛ ۲۵۵؛ ۲۵۶؛ ۲۵۷؛ ۲۵۸؛ ۲۵۹؛ ۲۶۰؛ ۲۶۱؛ ۲۶۲؛ ۲۶۳؛ ۲۶۴؛ ۲۶۵؛ ۲۶۶؛ ۲۶۷؛ ۲۶۸؛ ۲۶۹؛ ۲۷۰؛ ۲۷۱؛ ۲۷۲؛ ۲۷۳؛ ۲۷۴؛ ۲۷۵؛ ۲۷۶؛ ۲۷۷؛ ۲۷۸؛ ۲۷۹؛ ۲۸۰؛ ۲۸۱؛ ۲۸۲؛ ۲۸۳؛ ۲۸۴؛ ۲۸۵؛ ۲۸۶؛ ۲۸۷؛ ۲۸۸؛ ۲۸۹؛ ۲۹۰؛ ۲۹۱؛ ۲۹۲؛ ۲۹۳؛ ۲۹۴؛ ۲۹۵؛ ۲۹۶؛ ۲۹۷؛ ۲۹۸؛ ۲۹۹؛ ۳۰۰؛ ۳۰۱؛ ۳۰۲؛ ۳۰۳؛ ۳۰۴؛ ۳۰۵؛ ۳۰۶؛ ۳۰۷؛ ۳۰۸؛ ۳۰۹؛ ۳۱۰؛ ۳۱۱؛ ۳۱۲؛ ۳۱۳؛ ۳۱۴؛ ۳۱۵؛ ۳۱۶؛ ۳۱۷؛ ۳۱۸؛ ۳۱۹؛ ۳۲۰؛ ۳۲۱؛ ۳۲۲؛ ۳۲۳؛ ۳۲۴؛ ۳۲۵؛ ۳۲۶؛ ۳۲۷؛ ۳۲۸؛ ۳۲۹؛ ۳۳۰؛ ۳۳۱؛ ۳۳۲؛ ۳۳۳؛ ۳۳۴؛ ۳۳۵؛ ۳۳۶؛ ۳۳۷؛ ۳۳۸؛ ۳۳۹؛ ۳۴۰؛ ۳۴۱؛ ۳۴۲؛ ۳۴۳؛ ۳۴۴؛ ۳۴۵؛ ۳۴۶؛ ۳۴۷؛ ۳۴۸؛ ۳۴۹؛ ۳۵۰؛ ۳۵۱؛ ۳۵۲؛ ۳۵۳؛ ۳۵۴؛ ۳۵۵؛ ۳۵۶؛ ۳۵۷؛ ۳۵۸؛ ۳۵۹؛ ۳۶۰؛ ۳۶۱؛ ۳۶۲؛ ۳۶۳؛ ۳۶۴؛ ۳۶۵؛ ۳۶۶؛ ۳۶۷؛ ۳۶۸؛ ۳۶۹؛ ۳۷۰؛ ۳۷۱؛ ۳۷۲؛ ۳۷۳؛ ۳۷۴؛ ۳۷۵؛ ۳۷۶؛ ۳۷۷؛ ۳۷۸؛ ۳۷۹؛ ۳۸۰؛ ۳۸۱؛ ۳۸۲؛ ۳۸۳؛ ۳۸۴؛ ۳۸۵؛ ۳۸۶؛ ۳۸۷؛ ۳۸۸؛ ۳۸۹؛ ۳۹۰؛ ۳۹۱؛ ۳۹۲؛ ۳۹۳؛ ۳۹۴؛ ۳۹۵؛ ۳۹۶؛ ۳۹۷؛ ۳۹۸؛ ۳۹۹؛ ۴۰۰؛ ۴۰۱؛ ۴۰۲؛ ۴۰۳؛ ۴۰۴؛ ۴۰۵؛ ۴۰۶؛ ۴۰۷؛ ۴۰۸؛ ۴۰۹؛ ۴۱۰؛ ۴۱۱؛ ۴۱۲؛ ۴۱۳؛ ۴۱۴؛ ۴۱۵؛ ۴۱۶؛ ۴۱۷؛ ۴۱۸؛ ۴۱۹؛ ۴۲۰؛ ۴۲۱؛ ۴۲۲؛ ۴۲۳؛ ۴۲۴؛ ۴۲۵؛ ۴۲۶؛ ۴۲۷؛ ۴۲۸؛ ۴۲۹؛ ۴۳۰؛ ۴۳۱؛ ۴۳۲؛ ۴۳۳؛ ۴۳۴؛ ۴۳۵؛ ۴۳۶؛ ۴۳۷؛ ۴۳۸؛ ۴۳۹؛ ۴۴۰؛ ۴۴۱؛ ۴۴۲؛ ۴۴۳؛ ۴۴۴؛ ۴۴۵؛ ۴۴۶؛ ۴۴۷؛ ۴۴۸؛ ۴۴۹؛ ۴۵۰؛ ۴۵۱؛ ۴۵۲؛ ۴۵۳؛ ۴۵۴؛ ۴۵۵؛ ۴۵۶؛ ۴۵۷؛ ۴۵۸؛ ۴۵۹؛ ۴۶۰؛ ۴۶۱؛ ۴۶۲؛ ۴۶۳؛ ۴۶۴؛ ۴۶۵؛ ۴۶۶؛ ۴۶۷؛ ۴۶۸؛ ۴۶۹؛ ۴۷۰؛ ۴۷۱؛ ۴۷۲؛ ۴۷۳؛ ۴۷۴؛ ۴۷۵؛ ۴۷۶؛ ۴۷۷؛ ۴۷۸؛ ۴۷۹؛ ۴۸۰؛ ۴۸۱؛ ۴۸۲؛ ۴۸۳؛ ۴۸۴؛ ۴۸۵؛ ۴۸۶؛ ۴۸۷؛ ۴۸۸؛ ۴۸۹؛ ۴۹۰؛ ۴۹۱؛ ۴۹۲؛ ۴۹۳؛ ۴۹۴؛ ۴۹۵؛ ۴۹۶؛ ۴۹۷؛ ۴۹۸؛ ۴۹۹؛ ۵۰۰؛ ۵۰۱؛ ۵۰۲؛ ۵۰۳؛ ۵۰۴؛ ۵۰۵؛ ۵۰۶؛ ۵۰۷؛ ۵۰۸؛ ۵۰۹؛ ۵۱۰؛ ۵۱۱؛ ۵۱۲؛ ۵۱۳؛ ۵۱۴؛ ۵۱۵؛ ۵۱۶؛ ۵۱۷؛ ۵۱۸؛ ۵۱۹؛ ۵۲۰؛ ۵۲۱؛ ۵۲۲؛ ۵۲۳؛ ۵۲۴؛ ۵۲۵؛ ۵۲۶؛ ۵۲۷؛ ۵۲۸؛ ۵۲۹؛ ۵۳۰؛ ۵۳۱؛ ۵۳۲؛ ۵۳۳؛ ۵۳۴؛ ۵۳۵؛ ۵۳۶؛ ۵۳۷؛ ۵۳۸؛ ۵۳۹؛ ۵۴۰؛ ۵۴۱؛ ۵۴۲؛ ۵۴۳؛ ۵۴۴؛ ۵۴۵؛ ۵۴۶؛ ۵۴۷؛ ۵۴۸؛ ۵۴۹؛ ۵۵۰؛ ۵۵۱؛ ۵۵۲؛ ۵۵۳؛ ۵۵۴؛ ۵۵۵؛ ۵۵۶؛ ۵۵۷؛ ۵۵۸؛ ۵۵۹؛ ۵۶۰؛ ۵۶۱؛ ۵۶۲؛ ۵۶۳؛ ۵۶۴؛ ۵۶۵؛ ۵۶۶؛ ۵۶۷؛ ۵۶۸؛ ۵۶۹؛ ۵۷۰؛ ۵۷۱؛ ۵۷۲؛ ۵۷۳؛ ۵۷۴؛ ۵۷۵؛ ۵۷۶؛ ۵۷۷؛ ۵۷۸؛ ۵۷۹؛ ۵۸۰؛ ۵۸۱؛ ۵۸۲؛ ۵۸۳؛ ۵۸۴؛ ۵۸۵؛ ۵۸۶؛ ۵۸۷؛ ۵۸۸؛ ۵۸۹؛ ۵۹۰؛ ۵۹۱؛ ۵۹۲؛ ۵۹۳؛ ۵۹۴؛ ۵۹۵؛ ۵۹۶؛ ۵۹۷؛ ۵۹۸؛ ۵۹۹؛ ۶۰۰؛ ۶۰۱؛ ۶۰۲؛ ۶۰۳؛ ۶۰۴؛ ۶۰۵؛ ۶۰۶؛ ۶۰۷؛ ۶۰۸؛ ۶۰۹؛ ۶۱۰؛ ۶۱۱؛ ۶۱۲؛ ۶۱۳؛ ۶۱۴؛ ۶۱۵؛ ۶۱۶؛ ۶۱۷؛ ۶۱۸؛ ۶۱۹؛ ۶۲۰؛ ۶۲۱؛ ۶۲۲؛ ۶۲۳؛ ۶۲۴؛ ۶۲۵؛ ۶۲۶؛ ۶۲۷؛ ۶۲۸؛ ۶۲۹؛ ۶۳۰؛ ۶۳۱؛ ۶۳۲؛ ۶۳۳؛ ۶۳۴؛ ۶۳۵؛ ۶۳۶؛ ۶۳۷؛ ۶۳۸؛ ۶۳۹؛ ۶۴۰؛ ۶۴۱؛ ۶۴۲؛ ۶۴۳؛ ۶۴۴؛ ۶۴۵؛ ۶۴۶؛ ۶۴۷؛ ۶۴۸؛ ۶۴۹؛ ۶۵۰؛ ۶۵۱؛ ۶۵۲؛ ۶۵۳؛ ۶۵۴؛ ۶۵۵؛ ۶۵۶؛ ۶۵۷؛ ۶۵۸؛ ۶۵۹؛ ۶۶۰؛ ۶۶۱؛ ۶۶۲؛ ۶۶۳؛ ۶۶۴؛ ۶۶۵؛ ۶۶۶؛ ۶۶۷؛ ۶۶۸؛ ۶۶۹؛ ۶۷۰؛ ۶۷۱؛ ۶۷۲؛ ۶۷۳؛ ۶۷۴؛ ۶۷۵؛ ۶۷۶؛ ۶۷۷؛ ۶۷۸؛ ۶۷۹؛ ۶۸۰؛ ۶۸۱؛ ۶۸۲؛ ۶۸۳؛ ۶۸۴؛ ۶۸۵؛ ۶۸۶؛ ۶۸۷؛ ۶۸۸؛ ۶۸۹؛ ۶۹۰؛ ۶۹۱؛ ۶۹۲؛ ۶۹۳؛ ۶۹۴؛ ۶۹۵؛ ۶۹۶؛ ۶۹۷؛ ۶۹۸؛ ۶۹۹؛ ۷۰۰؛ ۷۰۱؛ ۷۰۲؛ ۷۰۳؛ ۷۰۴؛ ۷۰۵؛ ۷۰۶؛ ۷۰۷؛ ۷۰۸؛ ۷۰۹؛ ۷۱۰؛ ۷۱۱؛ ۷۱۲؛ ۷۱۳؛ ۷۱۴؛ ۷۱۵؛ ۷۱۶؛ ۷۱۷؛ ۷۱۸؛ ۷۱۹؛ ۷۲۰؛ ۷۲۱؛ ۷۲۲؛ ۷۲۳؛ ۷۲۴؛ ۷۲۵؛ ۷۲۶؛ ۷۲۷؛ ۷۲۸؛ ۷۲۹؛ ۷۳۰؛ ۷۳۱؛ ۷۳۲؛ ۷۳۳؛ ۷۳۴؛ ۷۳۵؛ ۷۳۶؛ ۷۳۷؛ ۷۳۸؛ ۷۳۹؛ ۷۴۰؛ ۷۴۱؛ ۷۴۲؛ ۷۴۳؛ ۷۴۴؛ ۷۴۵؛ ۷۴۶؛ ۷۴۷؛ ۷۴۸؛ ۷۴۹؛ ۷۵۰؛ ۷۵۱؛ ۷۵۲؛ ۷۵۳؛ ۷۵۴؛ ۷۵۵؛ ۷۵۶؛ ۷۵۷؛ ۷۵۸؛ ۷۵۹؛ ۷۶۰؛ ۷۶۱؛ ۷۶۲؛ ۷۶۳؛ ۷۶۴؛ ۷۶۵؛ ۷۶۶؛ ۷۶۷؛ ۷۶۸؛ ۷۶۹؛ ۷۷۰؛ ۷۷۱؛ ۷۷۲؛ ۷۷۳؛ ۷۷۴؛ ۷۷۵؛ ۷۷۶؛ ۷۷۷؛ ۷۷۸؛ ۷۷۹؛ ۷۸۰؛ ۷۸۱؛ ۷۸۲؛ ۷۸۳؛ ۷۸۴؛ ۷۸۵؛ ۷۸۶؛ ۷۸۷؛ ۷۸۸؛ ۷۸۹؛ ۷۹۰؛ ۷۹۱؛ ۷۹۲؛ ۷۹۳؛ ۷۹۴؛ ۷۹۵؛ ۷۹۶؛ ۷۹۷؛ ۷۹۸؛ ۷۹۹؛ ۸۰۰؛ ۸۰۱؛ ۸۰۲؛ ۸۰۳؛ ۸۰۴؛ ۸۰۵؛ ۸۰۶؛ ۸۰۷؛ ۸۰۸؛ ۸۰۹؛ ۸۱۰؛ ۸۱۱؛ ۸۱۲؛ ۸۱۳؛ ۸۱۴؛ ۸۱۵؛ ۸۱۶؛ ۸۱۷؛ ۸۱۸؛ ۸۱۹؛ ۸۲۰؛ ۸۲۱؛ ۸۲۲؛ ۸۲۳؛ ۸۲۴؛ ۸۲۵؛ ۸۲۶؛ ۸۲۷؛ ۸۲۸؛ ۸۲۹؛ ۸۳۰؛ ۸۳۱؛ ۸۳۲؛ ۸۳۳؛ ۸۳۴؛ ۸۳۵؛ ۸۳۶؛ ۸۳۷؛ ۸۳۸؛ ۸۳۹؛ ۸۴۰؛ ۸۴۱؛ ۸۴۲؛ ۸۴۳؛ ۸۴۴؛ ۸۴۵؛ ۸۴۶؛ ۸۴۷؛ ۸۴۸؛ ۸۴۹؛ ۸۵۰؛ ۸۵۱؛ ۸۵۲؛ ۸۵۳؛ ۸۵۴؛ ۸۵۵؛ ۸۵۶؛ ۸۵۷؛ ۸۵۸؛ ۸۵۹؛ ۸۶۰؛ ۸۶۱؛ ۸۶۲؛ ۸۶۳؛ ۸۶۴؛ ۸۶۵؛ ۸۶۶؛ ۸۶۷؛ ۸۶۸؛ ۸۶۹؛ ۸۷۰؛ ۸۷۱؛ ۸۷۲؛ ۸۷۳؛ ۸۷۴؛ ۸۷۵؛ ۸۷۶؛ ۸۷۷؛ ۸۷۸؛ ۸۷۹؛ ۸۸۰؛ ۸۸۱؛ ۸۸۲؛ ۸۸۳؛ ۸۸۴؛ ۸۸۵؛ ۸۸۶؛ ۸۸۷؛ ۸۸۸؛ ۸۸۹؛ ۸۹۰؛ ۸۹۱؛ ۸۹۲؛ ۸۹۳؛ ۸۹۴؛ ۸۹۵؛ ۸۹۶؛ ۸۹۷؛ ۸۹۸؛ ۸۹۹؛ ۹۰۰؛ ۹۰۱؛ ۹۰۲؛ ۹۰۳؛ ۹۰۴؛ ۹۰۵؛ ۹۰۶؛ ۹۰۷؛ ۹۰۸؛ ۹۰۹؛ ۹۱۰؛ ۹۱۱؛ ۹۱۲؛ ۹۱۳؛ ۹۱۴؛ ۹۱۵؛ ۹۱۶؛ ۹۱۷؛ ۹۱۸؛ ۹۱۹؛ ۹۲۰؛ ۹۲۱؛ ۹۲۲؛ ۹۲۳؛ ۹۲۴؛ ۹۲۵؛ ۹۲۶؛ ۹۲۷؛ ۹۲۸؛ ۹۲۹؛ ۹۳۰؛ ۹۳۱؛ ۹۳۲؛ ۹۳۳؛ ۹۳۴؛ ۹۳۵؛ ۹۳۶؛ ۹۳۷؛ ۹۳۸؛ ۹۳۹؛ ۹۴۰؛ ۹۴۱؛ ۹۴۲؛ ۹۴۳؛ ۹۴۴؛ ۹۴۵؛ ۹۴۶؛ ۹۴۷؛ ۹۴۸؛ ۹۴۹؛ ۹۵۰؛ ۹۵۱؛ ۹۵۲؛ ۹۵۳؛ ۹۵۴؛ ۹۵۵؛ ۹۵۶؛ ۹۵۷؛ ۹۵۸؛ ۹۵۹؛ ۹۶۰؛ ۹۶۱؛ ۹۶۲؛ ۹۶۳؛ ۹۶۴؛ ۹۶۵؛ ۹۶۶؛ ۹۶۷؛ ۹۶۸؛ ۹۶۹؛ ۹۷۰؛ ۹۷۱؛ ۹۷۲؛ ۹۷۳؛ ۹۷۴؛ ۹۷۵؛ ۹۷۶؛ ۹۷۷؛ ۹۷۸؛ ۹۷۹؛ ۹۸۰؛ ۹۸۱؛ ۹۸۲؛ ۹۸۳؛ ۹۸۴؛ ۹۸۵؛ ۹۸۶؛ ۹۸۷؛ ۹۸۸؛ ۹۸۹؛ ۹۹۰؛ ۹۹۱؛ ۹۹۲؛ ۹۹۳؛ ۹۹۴؛ ۹۹۵؛ ۹۹۶؛ ۹۹۷؛ ۹۹۸؛ ۹۹۹؛ ۱۰۰۰؛ ۱۰۰۱؛ ۱۰۰۲؛ ۱۰۰۳؛ ۱۰۰۴؛ ۱۰۰۵؛ ۱۰۰۶؛ ۱۰۰۷؛ ۱۰۰۸؛ ۱۰۰۹؛ ۱۰۱۰؛ ۱۰۱۱؛ ۱۰۱۲؛ ۱۰۱۳؛ ۱۰۱۴؛ ۱۰۱۵؛ ۱۰۱۶؛ ۱۰۱۷؛ ۱۰۱۸؛ ۱۰۱۹؛ ۱۰۲۰؛ ۱۰۲۱؛ ۱۰۲۲؛ ۱۰۲۳؛ ۱۰۲۴؛ ۱۰۲۵؛ ۱۰۲۶؛ ۱۰۲۷؛ ۱۰۲۸؛ ۱۰۲۹؛ ۱۰۳۰؛ ۱۰۳۱؛ ۱۰۳۲؛ ۱۰۳۳؛ ۱۰۳۴؛ ۱۰۳۵؛ ۱۰۳۶؛ ۱۰۳۷؛ ۱۰۳۸؛ ۱۰۳۹؛ ۱۰۴۰؛ ۱۰۴۱؛ ۱۰۴۲؛ ۱۰۴۳؛ ۱۰۴۴؛ ۱۰۴۵؛ ۱۰۴۶؛ ۱۰۴۷؛ ۱۰۴۸؛ ۱۰۴۹؛ ۱۰۵۰؛ ۱۰۵۱؛ ۱۰۵۲؛ ۱۰۵۳؛ ۱۰۵۴؛ ۱۰۵۵؛ ۱۰۵۶؛ ۱۰۵۷؛ ۱۰۵۸؛ ۱۰۵۹؛ ۱۰۶۰؛ ۱۰۶۱؛ ۱۰۶۲؛ ۱۰۶۳؛ ۱۰۶۴؛ ۱۰۶۵؛ ۱۰۶۶؛ ۱۰۶۷؛ ۱۰۶۸؛ ۱۰۶۹؛ ۱۰۷۰؛ ۱۰۷۱؛ ۱۰۷۲؛ ۱۰۷۳؛ ۱۰۷۴؛ ۱۰۷۵؛ ۱۰۷۶؛ ۱۰۷۷؛ ۱۰۷۸؛ ۱۰۷۹؛ ۱۰۸۰؛ ۱۰۸۱؛ ۱۰۸۲؛ ۱۰۸۳؛ ۱۰۸۴؛ ۱۰۸۵؛ ۱۰۸۶؛ ۱۰۸۷؛ ۱۰۸۸؛ ۱۰۸۹؛ ۱۰۹۰؛ ۱۰۹۱؛ ۱۰۹۲؛ ۱۰۹۳؛ ۱۰۹۴؛ ۱۰۹۵؛ ۱۰۹۶؛ ۱۰۹۷؛ ۱۰۹۸؛ ۱۰۹۹؛ ۱۱۰۰؛ ۱۱۰۱؛ ۱۱۰۲؛ ۱۱۰۳؛ ۱۱۰۴؛ ۱۱۰۵؛ ۱۱۰۶؛ ۱۱۰۷؛ ۱۱۰۸؛ ۱۱۰۹؛ ۱۱۱۰؛ ۱۱۱۱؛ ۱۱۱۲؛ ۱۱۱۳؛ ۱۱۱۴؛ ۱۱۱۵؛ ۱۱۱۶؛ ۱۱۱۷؛ ۱۱۱۸؛ ۱۱۱۹؛ ۱۱۲۰؛ ۱۱۲۱؛ ۱۱۲۲؛ ۱۱۲۳؛ ۱۱۲۴؛ ۱۱۲۵؛ ۱۱۲۶؛ ۱۱۲۷؛ ۱۱۲۸؛ ۱۱۲۹؛ ۱۱۳۰؛ ۱۱۳۱؛ ۱۱۳۲؛ ۱۱۳۳؛ ۱۱۳۴؛ ۱۱۳۵؛ ۱۱۳۶؛ ۱۱۳۷؛ ۱۱۳۸؛ ۱۱۳۹؛ ۱۱۴۰؛ ۱۱۴۱؛ ۱۱۴۲؛ ۱۱۴۳؛ ۱۱۴۴؛ ۱۱۴۵؛ ۱۱۴۶؛ ۱۱۴۷؛ ۱۱۴۸؛ ۱۱۴۹؛ ۱۱۵۰؛ ۱۱۵۱؛ ۱۱۵۲؛ ۱۱۵۳؛ ۱۱۵۴؛ ۱۱۵۵؛ ۱۱۵۶؛ ۱۱۵۷؛ ۱۱۵۸؛ ۱۱۵۹؛ ۱۱۶۰؛ ۱۱۶۱؛ ۱۱۶۲؛ ۱۱۶۳؛ ۱۱۶۴؛ ۱۱۶۵؛ ۱۱۶۶؛ ۱۱۶۷؛ ۱۱۶۸؛ ۱۱۶۹؛ ۱۱۷۰؛ ۱۱۷۱؛ ۱۱۷۲؛ ۱۱۷۳؛ ۱۱۷۴؛ ۱۱۷۵؛ ۱۱۷۶؛ ۱۱۷۷؛ ۱۱۷۸؛ ۱۱۷۹؛ ۱۱۸۰؛ ۱۱۸۱؛ ۱۱۸۲؛ ۱۱۸۳؛ ۱۱۸۴؛ ۱۱۸۵؛ ۱۱۸۶؛ ۱۱۸۷؛ ۱۱۸۸؛ ۱۱۸۹؛ ۱۱۹۰؛ ۱۱۹۱؛ ۱۱۹۲؛ ۱۱۹۳؛ ۱۱۹۴؛ ۱۱۹۵؛ ۱۱۹۶؛ ۱۱۹۷؛ ۱۱۹۸؛ ۱۱۹۹؛ ۱۲۰۰؛ ۱۲۰۱؛ ۱۲۰۲؛ ۱۲۰۳؛ ۱۲۰۴؛ ۱۲۰۵؛ ۱۲۰۶؛ ۱۲۰۷؛ ۱۲۰۸؛ ۱۲۰۹؛ ۱۲۱۰؛ ۱۲۱۱؛ ۱۲۱۲؛ ۱۲۱۳؛ ۱۲۱۴؛ ۱۲۱۵؛ ۱۲۱۶؛ ۱۲۱۷؛ ۱۲۱۸؛ ۱۲۱۹؛ ۱۲۲۰؛ ۱۲۲۱؛ ۱۲۲۲؛ ۱۲۲۳؛ ۱۲۲۴؛ ۱۲۲۵؛ ۱۲۲۶؛ ۱۲۲۷؛ ۱۲۲۸؛ ۱۲۲۹؛ ۱۲۳۰؛ ۱۲۳۱؛ ۱۲۳۲؛ ۱۲۳۳؛ ۱۲۳۴؛ ۱۲۳۵؛ ۱۲۳۶؛ ۱۲۳۷؛ ۱۲۳۸؛ ۱۲۳۹؛ ۱۲۴۰؛ ۱۲۴۱؛ ۱۲۴۲؛ ۱۲۴۳؛ ۱۲۴۴؛ ۱۲۴۵؛ ۱۲۴۶؛ ۱۲۴۷؛ ۱۲۴۸؛ ۱۲۴۹؛ ۱۲۵۰؛ ۱۲۵۱؛ ۱۲۵۲؛ ۱۲۵۳؛ ۱۲۵۴؛ ۱۲۵۵؛ ۱۲۵۶؛ ۱۲۵۷؛ ۱۲۵۸؛ ۱۲۵۹؛ ۱۲۶۰؛ ۱۲۶۱؛ ۱۲۶۲؛ ۱۲۶۳؛ ۱۲۶۴؛ ۱۲۶۵؛ ۱۲۶۶؛ ۱۲۶۷؛ ۱۲۶۸؛ ۱۲۶۹؛ ۱۲۷۰؛ ۱۲۷۱؛ ۱۲۷۲؛ ۱۲۷۳؛ ۱۲۷۴؛ ۱۲۷۵؛ ۱۲۷۶؛ ۱۲۷۷؛ ۱۲۷۸؛ ۱۲۷۹؛ ۱۲۸۰؛ ۱۲۸۱؛ ۱۲۸۲؛ ۱۲۸۳؛ ۱۲۸۴؛ ۱۲۸۵؛ ۱۲۸۶؛ ۱۲۸۷؛ ۱۲۸۸؛ ۱۲۸۹؛ ۱۲۹۰؛ ۱۲۹۱؛ ۱۲۹۲؛ ۱۲۹۳؛ ۱۲۹۴؛ ۱۲۹۵؛ ۱۲۹۶؛ ۱۲۹۷؛ ۱۲۹۸؛ ۱۲۹۹؛ ۱۳۰۰؛ ۱۳۰۱؛ ۱۳۰۲؛ ۱۳۰۳؛ ۱۳۰۴؛ ۱۳۰۵؛ ۱۳۰۶؛ ۱۳۰۷؛ ۱۳۰۸؛ ۱۳۰۹؛ ۱۳۱۰؛ ۱۳۱۱؛ ۱۳۱۲؛ ۱۳۱۳؛ ۱۳۱۴؛ ۱۳۱۵؛ ۱۳۱۶؛ ۱۳۱۷؛ ۱۳۱۸؛ ۱۳۱۹؛ ۱۳۲۰؛ ۱۳۲۱؛ ۱۳۲۲؛ ۱۳۲۳؛ ۱۳۲۴؛ ۱۳۲۵؛ ۱۳۲۶؛ ۱۳۲۷؛ ۱۳۲۸؛ ۱۳۲۹؛ ۱۳۳۰؛ ۱۳۳۱؛ ۱۳۳۲؛ ۱۳۳۳؛ ۱۳۳۴؛ ۱۳۳۵؛ ۱۳۳۶؛ ۱۳۳۷؛ ۱۳۳۸؛ ۱۳۳۹؛ ۱۳۴۰؛ ۱۳۴۱؛ ۱۳۴۲؛ ۱۳۴۳؛ ۱۳۴۴؛ ۱۳۴۵؛ ۱۳۴۶؛ ۱۳۴۷؛ ۱۳۴۸؛ ۱۳۴۹؛ ۱۳۵۰؛ ۱۳۵۱؛ ۱۳۵۲؛ ۱۳۵۳؛ ۱۳۵۴؛ ۱۳۵۵؛ ۱۳۵۶؛ ۱۳۵۷؛ ۱۳۵۸؛ ۱۳۵۹؛ ۱۳۶۰؛ ۱۳۶۱؛ ۱۳۶۲؛ ۱۳۶۳؛ ۱۳۶۴؛ ۱۳۶۵؛ ۱۳۶۶؛ ۱۳۶۷؛ ۱۳۶۸؛ ۱۳۶۹؛ ۱۳۷۰؛ ۱۳۷۱؛ ۱۳۷۲؛ ۱۳۷۳؛ ۱۳۷۴؛ ۱۳۷۵؛ ۱۳۷۶؛ ۱۳۷۷؛ ۱۳۷۸؛ ۱۳۷۹؛ ۱۳۸۰؛ ۱۳۸۱؛ ۱۳۸۲؛ ۱۳۸۳؛ ۱۳۸۴؛ ۱۳۸۵؛ ۱۳۸۶؛ ۱۳۸۷؛ ۱۳۸۸؛ ۱۳۸۹؛ ۱۳۹۰؛ ۱۳۹۱؛ ۱۳۹۲؛ ۱۳۹۳؛ ۱۳۹۴؛ ۱۳۹۵؛ ۱۳۹۶؛ ۱۳۹۷؛ ۱۳۹۸؛ ۱۳۹۹؛ ۱۴۰۰؛ ۱۴۰۱؛ ۱۴۰۲؛ ۱۴۰۳؛ ۱۴۰۴؛ ۱۴۰۵؛ ۱۴۰۶؛ ۱۴۰۷؛ ۱۴۰۸؛ ۱۴۰۹؛ ۱۴۱۰؛ ۱۴۱۱؛ ۱۴۱۲؛ ۱

زیر آیت ۱، اور جلد دوم صفحہ ۳۶۲۔ آیت ۲ میں گزر چکے ہیں)۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو الدین رسول اللہ کی وساطت سے دنیا کو دیا گیا تھا، قرآن کریم کے مکمل اور محفوظ ہو جانے کے بعد، (اس کے مذہب میں تبدیل ہو جانے کا امکان نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ بھی مذہب میں تبدیل ہو گیا اور امت، امت واحدہ رہنے کے بجائے فرقوں میں بٹ گئی۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ جس طرح یہود، نصاریٰ، مجوس وغیرہ الدین کے باقی نہ رہنے سے مختلف فرقے بن گئے، اسی طرح اسلام کے جثیت دین باقی نہ رہنے سے، امت مسلمہ مختلف فرقوں میں بٹ گئی اور جس

طرح قَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرَى عَلَى شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصْرَى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَى شَيْءٍ (۲)۔ یہودی کہتے ہیں کہ حق پر ہم ہیں، نصاریٰ باطل پر۔ اور

فرقہ بندی

نصاریٰ کہتے ہیں کہ حق پر ہم ہیں اور یہودی باطل پر ہیں۔ اسی طرح ہمارا بھی ہر فرقہ یہ کہتا ہے کہ حق پر ہم ہیں۔ باقی فرقے باطل پر ہیں۔ اور تماشا یہ ہے کہ هُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ (۲)۔ سب فرقے قرآن کو خدا کی کتاب اور اپنے آپ کو اس کتاب کا متبع کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ۔ وَكُوْنَا مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوْ جَدُّ وَافِيهِ اَخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۲)۔ کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے۔ یعنی قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کی ایک تین دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر مختلف فرقے (باہمی اختلافات کے باوجود) اس کے مدعی ہوں کہ وہ قرآن کریم کا اتباع کرتے ہیں، تو اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ قرآن کریم میں اختلافات ہیں۔ یعنی ہمارے فرقوں کا اختلاف، قرآن کے اس دعویٰ کا بطلان کرتا ہے کہ وہ منجانب اللہ ہے۔ (فرقہ بندی کے متعلق جلد اول صفحہ ۱۶۳، زیر آیت ۲، صفحہ ۲۱۵، زیر آیت ۲، گفتگو کی جا چکی ہے)۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ جب وحی خداوندی میں انسانی آمیزش کر دی جاتی تھی تو دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ اس طرح دنیا کے مختلف مذاہب وجود میں آ گئے۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے ہاں بھی وحی خداوندی (قرآن مجید) میں انسانی آمیزش ہو گئی جو دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا اور مختلف فرقے وجود میں آ گئے؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہوا۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا کیونکہ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔ تو پھر ہوا کیا؟۔ ہوا یہ کہ قرآن تو غیر محرف رہا لیکن مذہبی پیشوا بیت نے خارج از قرآن عناصر کو وحی کا درجہ دے دیا۔ اس کے بعد غیر محرف قرآن تو محض تلاوت کے لئے باقی رہ گیا اور عمل، ان خارج از قرآن عناصر کے

مطابق ہونے لگا۔ لہذا، دیگر مذاہب میں وحی خداوندی کے غیر محرف شکل میں باقی نہ رہنے اور ہمارے ہاں اسکے غیر محرف شکل میں باقی رہنے، میں عملاً کوئی فرق نہ رہا۔ کتاب اللہ تو اسی صورت میں مؤثر رہتی اور وحدت امت کا ذریعہ بنتی ہے جب اسے اور صرف اسے، دین میں سند اور آخری حجت تسلیم کیا جائے۔

مختلف مذاہب کے باہمی اختلافات کے سلسلے میں آیہ زیر نظر (۲) میں کہا گیا ہے: **فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ**۔ (۲)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ ”اللہ ان کے اختلافی امور کا فیصلہ قیامت کے دن کرے گا“

قیامت کا عام مفہوم ”آخرت کی زندگی“ لیا جاتا ہے۔ حیاتِ آخرت پر ایمان، مسلمان ہونے کی لازمی اور بنیادی شرط ہے۔ (اس پر تفصیلی بحث جلد اول صفحہ ۱۵۲-۱۴۴، زیر آیت (۲) ہو چکی ہے۔ مختلف مذاہب یا فرقوں کے باہمی اختلافات کا فیصلہ ”قیامت کے دن“ (یعنی مرنے کے بعد کی زندگی میں) ہوگا۔ لاریب اور برحق۔ لیکن یہ واضح ہے کہ ”قیامت کا دن“ دنیاوی زندگی میں کئے گئے اعمال کے نتائج کے سامنے آنے کا دن ہے۔ لہذا، ان اختلافات میں قیامت کے دن فیصلہ ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ وہاں ہر مذہب کے پیروں اور ہر فرقہ والوں کو معلوم ہو جائے گا کہ حق کیا تھا اور باطل کیا۔ اور اسی کے مطابق ان کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ لیکن اس سے یہ فائدہ نہیں ہوگا کہ غلط روش پر چلنے والے کو اپنی غلطی کا علم ہو جائے تو وہ اس روش کو چھوڑ کر، صحیح روش اختیار کر لے جو اس دنیا میں غلط روش پر چلتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اور جہنم دارالعمل نہیں، دارالجزا ہے۔ یعنی اُس میں، اپنی اصلاح کر کے، صحیح راستے پر چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ جنت اور جہنم، اور جزا و سزا کے متعلق جلد اول اور دوم۔ بالخصوص جلد اول۔ میں بڑی تفصیلی بحث آچکی ہے۔ متعلقہ جلد کی فہرست مضامین کے حوالے سے اس بحث پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ اصلاح کا امکان تو اسی صورت میں ہوگا کہ اختلافی امور کی حقیقت اسی دنیا میں سامنے آجائے۔ قرآن کریم میں قیامت کا لفظ ان معانی میں بھی آیا ہے۔

قیامت کا لفظ ”قِيَامٌ“ سے ہے جس کے معنی کھڑے ہو جانے کے ہیں۔ اس لفظ (قِيَامٌ) کے ساتھ (۴) کے اضافہ سے قیامۃ ”بنا ہے جس کے معنی ہیں، یک لخت کھڑے ہو جانا۔ میری کتاب۔ جہانِ فردا۔ کے ایک پورے باب میں اس کے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس تفصیل کے

قیامت کا مفہوم

اس جگہ دہرانے کا نتیجہ تحصیل حاصل ہوگا۔ موضوع زیر نظر کی مناسبت سے اس کے

و ایک متعلقہ اقتباسات کا پیش کیا جانا کافی ہوگا۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ”انسان کے اٹھ کھڑے ہونے“ کا مقام یہ دنیا بھی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی بھی۔ اس دنیا میں مستبد قوتیں، مجنوروں اور ناتوانوں کو اس طرح دبا دے رکھتی ہیں کہ ان میں اٹھنے کی سکت تو ایک طرف، اس کا تصور تک پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات بدلتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ ایک ہنگامہ خیز انقلاب آتا ہے اور یہی دینی ہوئی انسانیت، یکبارگی اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہ اس دنیا میں قیامت ہے۔ یہ انقلاب اگر اس جماعت کے ہاتھوں رونما ہو جو مستقل اقدار خداوندی کی حامل ہے تو معاشرہ میں ظلم و استبداد کی جگہ عدل و احسان کا دور دورہ ہوگا۔ ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا اصلہ ملے گا، کوئی اسے غصب نہیں کر سکے گا۔ ہر معاملہ کا فیصلہ تائید خداوندی کے مطابق ہوگا۔ حق، باطل پر غالب آجائے گا۔ اس قسم کا انقلاب، نبی اکرمؐ اور حضورؑ کے رفقاءؓ کے ہاتھوں اس قدر نمایاں طور پر رونما ہوا تھا جس کی نظیر تاریخ کے صفحات پر نہیں ملتی۔ قرآن کریم نے اسے بھی القیامت سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل بتاتی ہیں —

رسول اللہؐ کی بعثت کے وقت دنیا میں، دین خداوندی اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں کہیں باقی نہیں رہا تھا۔ وہ ہر جگہ مذہب میں تبدیل ہو چکا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ تمام اہل مذاہب کا یہ دعویٰ تھا کہ ان کے پاس خدائی تعلیم اپنی حقیقی شکل میں موجود ہے۔ لیکن ایک کی تعلیم دوسرے سے ملتی نہیں تھی۔ ان میں باہمی اختلافات موجود تھے۔ لیکن چونکہ ان کے پاس کوئی ایسا معیار نہیں تھا جو حق و باطل میں امتیاز کر کے، ان نزاعات کو مٹا سکے، اس لئے ان میں باہمی جنگ و جدل جاری رہتی تھی۔ قرآن کریم نے کہا کہ اس انقلاب سے ایک معیار سامنے آجائے گا جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کون سی تعلیم فی الواقعہ خدا کی دی ہوئی ہے اور کون سی انسانوں کی خود ساختہ۔ اس طرح ان کے باہمی اختلافات دور ہو جائیں گے۔ چنانچہ مختلف مذاہب عالم کے پیروؤں (یہود، نصاریٰ، مجوس وغیرہ) نے جب اسلام قبول کیا تو ان کے اختلافات مٹ گئے۔ قرآن کریم میں جہاں یہ آیا ہے کہ ”يَوْمَ الْقِيَمَةِ“ میں ان کے اختلافات مٹ جائیں گے تو اس سے یہی مراد ہے۔ (عربی زبان اور قرآن کریم کی روش سے، یوم کے معنی دن ہی نہیں ہوتے۔ اس سے مراد زمانہ، دور، عہد بھی ہوتے ہیں۔ اس نسبت سے ”يَوْمَ الْقِيَمَةِ“ سے مراد ہوگا وہ انقلابی دور جو قرآن کی روش سے سامنے آیا تھا۔

اس انقلابی دور میں، ان اہل مذاہب کے اختلافات رفع ہوئے تھے — لہذا آیت (۱۱۱) میں جو کہا گیا ہے کہ ان کے اختلافات کا فیصلہ ”يَوْمَ الْقِيَمَةِ“ میں ہو جائے گا تو اس سے مراد یہ ہے کہ اب خدا کا دین پھر اپنی اصل شکل میں آگیا ہے۔ جب اس کے مطابق معاشرہ کا نظام قائم ہو جائے گا تو اس وقت واضح ہو جائے گا کہ کون سی روش صحیح ہے اور کونسی غلط۔

آیت (۲۲) میں کہا گیا ہے کہ جب سابقہ دین میں آمیزش ہو جاتی تو ایک نئے رسول کی وساطت سے اس آمیزش کو دور کر دیا جاتا۔ ثُمَّ يَحْكُمُ اللَّهُ أَيْسَرَهُ (۲۲)۔ اور اس کے بعد اللہ اپنے قوانین کو محکم کر دیتا یہ خود آیت (۲۳) میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔ فَإِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ۔

(حکم) کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اختلافی اور نزاعی امور میں فیصلے، وعظ و نصیحت سے نہیں ہو سکتے۔ (یہی وجہ ہے کہ مذہب میں اختلافی امور کے فیصلے۔ مناظروں اور مباحثوں کے ذریعے نہ کبھی ہوتے ہیں نہ ہو سکتے ہیں)۔ فیصلہ تو وہی اتھارٹی دے کے گی جو صاحب اقتدار ہو۔ اسے "استخلاف فی الارض" (۲۴) یا نظام مملکت کہا جاتا ہے۔ وہ نظام جس میں تمام امور کے فیصلے قانون خداوندی کی روش سے ہوں۔ مثلاً :-

(۱) سورہ بقرہ میں جہاں انبیاء کرام کی بعثت کا ذکر آیا ہے وہاں کہا کہ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ۔ (۲۵)۔ "ان انبیاء کے ساتھ خدا نے ضابطہ قوانین، (الکتاب) بھی نازل کیا تاکہ وہ اس کے مطابق لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کیا کریں۔

(۲) خود حضور نبی اکرم سے کہا گیا کہ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ۔ (۲۶)۔ "اے رسول! تو لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کر۔"

(۳) حضور کی زبان مبارک سے یہ اعلان کرایا گیا کہ أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حُكْمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا۔ (۲۷)۔ "کیا (تم چاہتے ہو کہ) میں اللہ کے سوا کسی اور کو صاحب اقتدار (فیصلہ کن اتھارٹی) تسلیم کر لوں جس نے تمہاری طرف یہ بکھرا ہوا ضابطہ قوانین نازل کیا ہے؟"

(۴) اس کتاب کے ساتھ کوئی اور ضابطہ قوانین شامل نہیں کیا جاسکتا۔ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا۔ (۲۸)۔ "اللہ اپنے حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔"

(۵) خود رسول اللہ بھی اسی کا اتباع کرتے تھے (۲۹)۔

(۶) اس کی خلاف ورزی معصیت خداوندی تھی اور مستوجب عذاب۔ (۳۰)۔

(۷) ہر اختلاف اسی کی روش سے مٹے گا۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ۔ (۳۱)۔

"جس معاملات میں تم اختلاف کرتے ہو، ان کے فیصلے کے لئے خدا (کی اس کتاب) کی طرف رجوع کیا کرو۔"

(۸) یہی کفر اور ایمان میں حداثہ امتیاز ہے وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۳۲)۔

”جو لوگ کتاب خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، انہی کو تو کافر کہا جاتا ہے“

ظاہر ہے کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے، مملکت کے اقتدار کی رو سے کئے جاسکیں گے۔ اسے قرآن نے حکومت خداوندی کہہ کر پکارا ہے۔ لہذا، دنیاوی زندگی میں **يَوْمَ الْقِيَمَةِ**۔ (جس میں لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کتاب کے مطابق ہوں گے)، وہ ہے جس کے متعلق کہا گیا کہ **الْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ يَخْضَعُونَ لَہٗ**۔ (جس دور میں اقتدار و اختیار صرف خدا کا ہوگا اور تمام امور کے فیصلے وہی کرے گا)۔ (یعنی فیصلے اس کی کتاب کی رو سے ہوں گے) جب یہ نظام حضور نبی اکرمؐ کے ہاتھوں قائم ہوا، تو اس میں مختلف مذاہب کے اختلافی امور کے فیصلے ہو گئے۔ اس سے واضح ہے کہ ہمارے فرقوں کے اختلافات بھی اسی صورت میں منسٹ سکیں گے جب کتاب اللہ کو حکم (فیصلہ کن) اختیار ملی (تسلیم کر لیا جائے)۔ علاوہ شکل اسلامی نظام یا قرآنی مملکت ہی میں سامنے آسکے گی۔

اس کی سب سے زیادہ مخالفت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوگی — خواہ وہ یہود و نصاریٰ (دیگر مذاہب) کی پیشوائیت ہو، اور خواہ مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت۔ اس کی وضاحت اگلی آیت میں کر دی گئی جہاں کہا گیا،

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسْجِدَ اللّٰهِ اَنْ يَّبْنٰی عَلَیْہِہٖ اَسْمَہٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِہَا..... (۱۱۳)

آیت کے اتنے حصے کا عام الفاظ میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ”اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا کہ جو اللہ کی مساجد میں اس کے ذکر کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرے اور اس طرح ان کی تخریب کا باعث بنے“، لیکن اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے لفظ ”مسجد“ اور ”ذکر“ کا قرآنی مفہوم سمجھ لینا ضروری ہوگا۔ سابقہ آیت میں کہا گیا تھا کہ خدا ”اپنی آیات کو محکم کرے گا“ اور اس کا مفہوم یہ تھا کہ ایک ایسا نظام قائم ہوگا جس میں احکام خداوندی (آیات اللہ) مملکت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ العمل ہوں۔ اس مفہوم کی روشنی میں ”مسجد“ اور ”ذکر“ کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجائے گا۔

لغت کی رو سے مسجد کے معنی ہیں سجدہ گاہ۔ یا سجدہ کرنا۔ سجدہ کا مفہوم جلد دوم صفحہ ۱۰۴-۱۰۳، زیر آیت (۱۱۳)

بیان کیا جا چکا ہے اس سے مراد ہے احکام و قوانین خداوندی کی کامل اطاعت کرنا۔ خدا کی حکمرانیت اختیار کرنا۔ (یہی معنی ”عبادت“ کے ہیں جس کی تشریح جلد اول صفحہ ۳۵ آیت ۱۴ میں گزر چکی ہے) لہذا،

مسجد کے معنی ہیں اطاعت خداوندی کے مراکز۔ وہ مقامات جہاں یہ امور طے ہوں کہ قوانین خداوندی کی اطاعت اور ان کے نفاذ کے طور پر کیا ہوں گے۔ اسی لئے کہا گیا کہ **وَأَقِمْ وُجُوْہَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوْہٗ** **مُخْلِصِیْنَ لَہٗ الدِّیْنَ**۔ (۱۱۴)۔ ”تم اپنی توجہات تمام تر قوانین خداوندی پر مرکوز رکھو۔ ہر معاملہ میں انہی کی طرف رجوع کرو۔

ان کے سامنے اپنا تسلیم ختم کر دو اور اطاعت اسی کے لئے مخصوص کر دو۔ اس میں کسی اور کو شریک نہ کرو، اس کی تشریح کرتے ہوئے دوسرے مقام پر کہا: **وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا** (۲۶)۔ اطاعت و فرماں پذیری صرف احکام خداوندی کی ہو سکتی ہے، کسی اور کی نہیں، اس لئے کسی اور کی اطاعت کو اس میں شریک نہ کرو، یعنی لَا يُشْرِكُ بِعِبَادَةِ رَبِّهِمْ أَحَدًا۔ (۱۸)۔ ”اطاعت خداوندی میں کسی اور کو شریک نہیں کیا جاسکتا“

ضمناً آیات (۲۶) اور (۲۷) میں دَعَا کا لفظ آیا ہے جس کے عام معانی ”پکارتے“ کے کئے جاتے ہیں۔ یعنی خدا کے سوا (یا اس کے ساتھ) کسی اور کو نہ پکارو۔ اور اس سے یہ نظری مسائل پیدا ہو کر باعث بحث و جدل بن گئے کہ یا اللہ کی طرح کسی اور کو بھی یہاں کہہ کر پکارنا جائز ہے یا نہیں۔ جیسے یا رسول اللہ۔ یا علیؑ۔ یا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ وغیرہ۔ دَعَا کے معنی محض پکارنے کے نہیں۔ اس کے معنی ہیں اپنے ہر معاملہ میں قانون خداوندی کی طرف رجوع کرنا۔ کتاب اللہ کو ”دعوت دینا“ کہ وہ بتائے کہ ہمیں اس باب میں کیا کرنا چاہیئے۔ اگرچہ دَعَا کے متعلق مختصر طور پر جلد اول، صفحہ ۳۲، زیر آیت ۲۶ میں لکھا جا چکا ہے لیکن اس کی تفصیلی بحث کا مقام آیت (۲۶) ہے جہاں کہا گیا ہے کہ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ۔ یہ تفصیل وہیں بیان کی جائے گی۔ یہاں انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ہم کہہ رہے تھے کہ مسجد کے معنی یا تو قوانین خداوندی کی اطاعت کرنا ہیں اور یا وہ مراکز جہاں ان قوانین کے نفاذ اور ان کی عملی اطاعت کے متعلق غور و تدبر اور بحث و مشاورت ہو۔ یہ اطاعت خالصتاً قوانین خداوندی کی ہوگی اس میں کسی اور کی اطاعت کو شامل کرنا شرک ہے۔ اسی لئے کہا کہ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسْجِدَ اللَّهِ۔ (۹)۔ ”مشرکین کے لئے جائز ہی نہیں۔ انہیں اس کی اجازت ہی نہیں دی جاسکتی کہ وہ مسجد کی تعمیر (آباد کاری) میں حصہ لیں“ جو لوگ خالصتاً قوانین خداوندی کی اطاعت میں (BELIEVE) ہی نہ کریں، اُن کے ہاتھوں اُس نظام کی بُرومندی اور فروغ کیسے ہو سکتا ہے جو خالصتاً اطاعت خداوندی کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسْجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔ (۲۶) اس نظام کی تشکیل، استحکام اور فروغ صرف اُن لوگوں کے ہاتھوں سرانجام پاسکتا ہے جو ارشادِ خداوندی کی صداقت اور اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کی محکمیت پر یقین رکھتے ہوں۔

مذہب کی دنیا میں ”خدا پرستی“ سے ذہن فوراً رہبانیت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یعنی ”اللہ والوں“ کی نشانی

یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ دنیا سے دُور بھاگیں۔ ترک لذات، ترک حظا نظر، ترک خواہشات، ترک زیب و زینت، ان کا مسلک۔ اور خاک نشینی اور سر بزمیری ان کا مشرب ہو۔ اطاعت خداوندی کے اس باطل تصور کی تردید کے طور پر واضح طور پر کہہ دیا: **يَكُنِيَ آدَمَ خُذْ وَارِثَتَكَ مِنْ عِنْدِ كُلِّ**

رہبانیت کے خلاف

مَسْجِدٌ..... (۱۱۱)۔ "اے نوح انسان! اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ دنیاوی زریب وزینت، اطاعتِ خداوندی کی راہ میں حائل نہیں ہوتی" اس لئے جس نظامِ خداوندی کے قیام کی تمہیں دعوت دی جاتی ہے، اس کا لازمی نتیجہ دنیا کی خوشگواریاں بھی ہیں۔

ایک طرف یہ کہا اور دوسری طرف اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ اگر تم نے احکامِ خداوندی کی اطاعت محض رسمی (میکانکی) طور پر کی تو اس سے بھی اطاعت کا مقصد پورا نہیں ہو سکے گا۔ ان کی اطاعت کا نفع انا تمہارے دل کی گہرائیوں سے ابھرنا چاہیے۔ (اس کو خشوع و خضوع کہتے ہیں)۔ خود لفظ اطاعت کے لغوی معنوں کے اندر بھی یہ حقیقت پوشیدہ ہے اس کے معنی بطیب خاطر فرماں پذیری ہیں۔

اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے ذرائع اور مقصد کے فرق کو بھی نمایاں طور پر واضح کر دیا ہے۔ گھر سے اسٹیشن کی طرف روانہ ہونا، ٹکٹ خریدنا، ریل میں بیٹھنا، یہ سب ذرائع ہیں منزل تک پہنچنے کے مقصد منزل تک پہنچنا ہے۔ حصولِ مقصد کے لئے ذرائع اختیار کرنا بھی نہایت ضروری، بلکہ لاینفک اور ناگزیر ہے۔ لیکن اگر ذرائع ہی مقصود بالذات بن جائیں اور مقصد یا نصب العین فراموش ہو جائے، تو محض ذرائع اختیار کرنا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ ٹکٹ خرید کر گھر بیٹھے رہنے سے آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ دین میں شعار اور مناسک، یعنی احکام کی مرئی اور محسوس شکلیں اصل مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ مذہب میں یہی محسوس و مرئی شکلیں مقصود بالذات بن جاتی ہیں اور مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

نظامِ خداوندی میں کعبہ کو اساسی مرکز کی حیثیت حاصل ہے (تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی) اسی لئے اسے

مسجد الحرام کہہ کر پکارا، اور پوری کی پوری امتِ مسلمہ کا مطمح نگاہ قرار دیا گیا ہے۔ دیگر مساجد اساسی اصل کی شاخیں ہیں۔ اس اساسی مرکز (کعبہ) کی دیکھ بھال ضروری ہے لیکن

مسجد الحرام کی دیکھ بھال

کعبہ بھی حصولِ مقصد کا ذریعہ ہے، خود مقصود نہیں۔ اس لئے اس کی دیکھ بھال بھی ایک ذریعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں یہ

کہا کہ مساجد (مراکز نظامِ خداوندی) کی تعمیر و فروغ، جماعتِ مومنین (امتِ مسلمہ) کا فرض ہے، اس کے ساتھ ہی اس

کی بھی وضاحت کر دی کہ: أَجْعَلْتُمْ سَقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ - وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ - (۱۱۱)

تم کہیں ایسا نہ سمجھ لینا کہ مسجدِ حرام کی آباد کاری، اور اس مرکز میں جمع ہونے والوں کی دیکھ بھال مقصود بالذات ہے بالکل

نہیں۔ اصل مقصد خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہنا ہے جو اس لم کو نہیں سمجھتا وہ

حقیقت فراموش ہے اور کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ زیر نظر آیت (۲۱) میں ”مساجد اللہ“ سے مفہوم کیا ہے۔ ان سے مفہوم ہے

نظامِ خداوندی کے مراکز۔ ایواناتِ مملکتِ اسلامیہ۔ اس کے بعد لفظ ذکر کی طرف آئیے۔

ذکر اللہ کا مفہوم

برسبیل تذکرہ تو اس کا مفہوم، جلد دوم صفحہ ۴۷۷۔ زیر آیت (۲۱) بیان کیا جا چکا ہے۔ لیکن

اس مقام پر یہ لفظ مزید وضاحت طلب ہے۔

ذکر کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی باری ہر وقت، ذہن میں رکھنا۔ اسے نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔ اسے

نصب العین حیات قرار دے لینا۔ اس مقصد کے لئے کہ وہ کہیں فراموش نہ ہو جائے، اسے بار بار نگاہوں کے سامنے لانا،

اور اس کی یاد تازہ کرنا۔ یہ سب ذکر کے مفہوم میں شامل ہوتا ہے۔

نظامِ خداوندی کے قیام سے مقصد، احکام و قوانین و اصول و اقدارِ خداوندی کو معاشرہ میں علانیاً نافذ کرنا ہے۔ ان

قوانین و اقدار (وغیرہ) کا ضابطہ قرآن مجید ہے۔ یہی اس نظام (اسلامی مملکت) کا آئین و دستور ہے اس لئے یہ ضروری

ہے کہ یہ ضابطہ خداوندی ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کو الذکر کہہ کر پکارا گیا ہے۔

ذِكْرُ مَنْ رَبِّكُمْ (۲۱)، نَزَلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ (۲۲)، اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ (۲۳)۔ اَشْرَلْنَا

عَلَيْكَ الذِّكْرَ (۲۴)۔ و دیگر مقامات۔ یعنی اس نظام کا نصب العین، قرآن مجید ہے۔ چونکہ قرآن تمام

نوعِ انسانی کے لئے نصب العین حیات ہے، اس لئے اسے ذکر ”لِلْعَالَمِينَ“ (۲۳) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ نیز

۲۵: ۵۲، ۶۸: ۲، قرآنی نظام ہر قسم کے سلب و نہب اور غصب و استحصال کو ختم کر دیتا ہے۔ اس لئے مفادِ پرست

گروہوں کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ اس نظام کے ضابطہ آئین (قرآن مجید) کو نگاہوں سے اوجھل کر دیں۔ اِسْتَحْذَرُوا

عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانَ فَاَتَسَاهَمُ ذِكْرُ اللَّهِ (۲۴)۔ ”مفادِ پرستانہ جذبات ان پر غالب آجاتے ہیں اور اس طرح وہ اس

ضابطہ خداوندی کو فراموش کر دیتے ہیں“ ایسے لوگوں کو راہِ راست پر لانے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی رو سے انہیں،

ان کے صحیح نصب العین حیات کی یاد تازہ کرائی جائے۔ قَدْ ذُكِّرَ بِالْقُرْآنِ (۲۵)۔ یہی فریضہ رسالت تھا (۲۶)۔ یعنی

فراموش کردہ حقیقتوں کی یاد دہانی۔ رسول، ان لوگوں کو ان حقیقتوں کی یاد دہانی کراتا تھا لیکن یہ ان سے اعراض برستے

تھے۔ (۲۶: ۲۲)

اس ذکر سے اعراض برتنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے فرمایا وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً

صَنْكًا وَنَحْشَةً يَوْمَ الْقِيَمَةِ اَعْمٰی (۲۶)۔ ”جو ہمارے ذکر سے اعراض برتا ہے اس کی، اس دنیا

میں معیشت تنگ ہو جاتی ہے اور وہ قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا۔

یہ ہے حق و باطل کی وہ کشمکش اور خیر و شر کی وہ آویزش جو شروع سے چلی آرہی ہے۔ یعنی ایک طرف ظلم و استبداد اور سلب و نہب کی قوتیں، اور ان کے مقابلہ میں، صلابتِ خداوندی (ذکر اللہ) کی حامل جماعتیں جو باطل کے نظام کو مٹا کر اس کی جگہ حق کے نظام کو قائم کرنے کے لئے مصروفِ جدوجہد ہوتی ہیں۔ ان کی اس جدوجہد کو ”اللہ کا ذکر کرنے“ سے تعبیر کیا گیا ہے (جیسا کہ جلد دوم، صفحہ ۷۷، ۷۸، زیر آیت ۱۲۸ میں بتایا گیا ہے) جب حضرت موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ تم فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ بڑا کمرش اور حدودِ فراموش ہوتا جا رہا ہے (۱۲۶) تو حضرت موسیٰ نے، اس مہم کی مہمت طلبیوں اور دشوار گزاریل کے پیش نظر، علاوہ دیگر درخواستوں کے ’خدا سے یہ بھی کہا کہ میرے بھائی ہارون کو بھی میرے ہمراہ بھیج دیجئے۔ کئی مُسْتَحَقِّ کَثِیْرًا۔ وَ ذُنُورُكَ كَثِیْرًا (۱۲۷) اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ”تا کہ ہم تیری بہت زیادہ تسبیح کریں اور بہت زیادہ ذکر کریں“ (تسبیح کا مفہوم جلد دوم، صفحہ ۷۷، ۷۸، زیر آیت ۱۲۸ بتایا جا چکا ہے)۔ ذکر کا جو مفہوم اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے اس آیت کا صحیح مطلب سمجھ میں آسکتا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ نے کہا تھا کہ ہم دو ہوں گے تو تیرے متعین کر دے۔ پر ذکر ام کی تکمیل اور تیرے مقرر کردہ نصب العین کے حصول کے لئے زیادہ کوشش سے جدوجہد کر سکیں گے۔ بارگاہِ خداوندی سے ان کی اس درخواست کو شرفِ قبولیت عطا ہوا تو ساتھ ہی اس کی بھی تاکید کر دی کہ وَلَا تَنسِیَا فِیْ ذِكْرِیْ۔ (۱۲۸)۔ ”ہم نے تمہاری مانگ پوری کر دی ہے۔ اب دیکھنا! تم میرے ذکر میں تساہل نہ برتنا۔“ یہاں سے بھی ذکر کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اور یہی ہے وہ ذکر اللہ جس کے متعلق فرمایا کہ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَیْنُ الْقُلُوْبُ۔ (۱۲۹)۔ ”یا درکھو! صحیح اطمینانِ قلب اسی سے حاصل ہو سکتا ہے کہ تم قرآن کے بتائے ہوئے نصب العین کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھو اور اس کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرو۔“

آیت زیرِ نظر (۱۲۸) میں تیسرا تشریحِ طلب لفظ اَسْمَاءُ ہے۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے ”خدا کا نام“ لیکن (جیسا کہ جلد اول صفحہ ۷۷ پر بتایا گیا ہے)۔ اسماءِ خداوندی کے معنی صفاتِ خداوندی ہیں اور اس سے **اسم اللہ کا مفہوم** ایک عظیم حقیقت سامنے آتی ہے۔ ہم نے کہا ہے کہ نظامِ خداوندی کے قیام سے مقصد یہ ہے کہ احکام و اقدارِ خداوندی کو عملاً نافذ کیا جائے۔ اس حقیقت کو اگر اور سمٹا کر بیان کیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ نظامِ خداوندی کے قیام سے مقصد یہ ہے کہ افراد اور معاشرہ میں تباہی و بکثرت (صفاتِ خداوندی کی نمود و ظہور ہو۔ اسلامی معاشرہ) صفاتِ خداوندی کو (محدود پیمانے پر) عملی شکل میں منعکس کرتا ہے اس طرح جلال و جمالِ خداوندی، انسانی دنیا میں ”جلوہ بار“ ہوتے ہیں۔ وَ اَشْرَقَتْ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔ (۱۳۰)۔ ”اور یہ زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا

اٹھتی ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آیت (۲) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی جماعتِ مومنین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ نظام قائم ہو جائے جس میں صفاتِ خداوندی کی نمود، نصب العین اور مقصود ہو لیکن مفاد پرست قوتیں اس نظام کے قیام کے راستے میں ہر قسم کی کاوٹیں ڈالتی ہیں کوشش کرتی ہیں کہ اس نظام کے مراکز، آباد اور فروغ یافتہ ہونے کے بجائے ویران اور برباد ہو جائیں۔ ذرا سوچو کہ ان لوگوں سے بڑھ کر انسانیت کا دشمن اور کون ہو سکتا ہے۔ اگر کسی گاؤں میں ہسپتال کھولنے کے لئے عمارت تعمیر کی جا رہی ہو اور کچھ بد قماش اس عمارت کو مسمار اور ویران کر دیں، تو ان سے بڑھ کر گاؤں والوں کا دشمن اور کون ہو سکتا ہے؟

آیت کا باقی حصہ یہ ہے :-

أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا
خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۲)

۲
۱۱۴

ان لوگوں کو چاہیے یہ تھا کہ ان انسانیت ساز مراکزِ نظامِ خداوندی کی طرف آتے تو سرکشی کے جذبات لئے ہوئے نہیں بلکہ اپنی تخریبی کارروائیوں کے تباہ کن نتائج سے ڈرتے ہوئے آتے۔ بہر حال، ان کی اس مخالفت اور سرکشی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ انہیں دنیاوی زندگی میں ذلت و رسوائی نصیب ہوگی اور آخرت کی زندگی میں تباہی اور بربادی۔

دنیاوی زندگی میں اعمال کے نتائج کے سلسلہ میں، جلد اول، صفحہ ۱۴۹ پر زیر آیت (۲)، تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔ قریش مکہ جو اس نظام کے قیام کی راہ میں مسلسل رکاوٹیں ڈالتے رہے، ان کا انجام کیا ہوا، اس پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔

(۱)

صدرِ اول میں جب تک قرآنی نظام قائم رہا، مسجد کی یہی پوزیشن رہی۔ یعنی وہ امورِ مملکت طے کرنے کا مرکز تھی۔ نظامِ صلوٰۃ کے متعلق، جلد اول، صفحہ ۹۷-۹۸ پر زیر آیت (۲)، تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ اس سے مراد ان تمام فرائضِ منصبی کا ادا کرنا ہے جو خدا کی طرف سے امت پر عاید کئے گئے ہیں۔ اجتماعاتِ صلوٰۃ (جنہیں بعد میں نماز کہا گیا) بھی اسی پروگرام کا ایک حصہ ہیں، اس لئے صدرِ اول میں ان کا عقد بھی بہر حال مسجد ہی میں ہوتا تھا۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اُس دور میں، نہ صلوٰۃ سے مراد محض نماز تھی، نہ مسجد کا مصرف صرف ادائیگی نماز۔ اُس زمانے میں قرآنی نظام کے دار الخلافہ (مدینہ) کی مسجد (مسجد نبوی) امت کی تمام سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ حکومت کا جملہ کاروبار اسی میں سرانجام پاتا تھا۔ مختلف مملکتوں

میں ہر قسم کی رکاوٹیں کھڑی کرتے تھے۔ بالفاظ دیگر، جماعتِ مومنین مسجد (مسجد حرام کعبہ) کی تعمیر چاہتی تھی اور فریقِ مخالف اس کی تخریب کے درپے تھا۔ آپ نے دیکھا کہ سوال کسی عمارت کی تعمیر اور تخریب کا نہیں تھا، نظامِ خداوندی کے قیام اور انہدام کا تھا۔ یہی وہ کشمکش تھی جس کے متعلق کہا کہ یہ لوگ جس قدر جی چاہے، مزاحمت کر کے دیکھ لیں یہ نظام قائم ہو کر رہے گا اور اس کے مخالفین ذلیل و رسوا ہوں گے۔ قرآنی نظام میں کعبہ (قبلہ) کو کس قدر اہمیت حاصل تھی اس کے متعلق جلد دوم صفحہ ۲۱۴-۲۱۶ زیرِ آیت (۲۴۸) لکھا جا چکا ہے۔ اسے خدا نے بَنَیَّ (میرا گھر) کہہ کر پکارا ہے اور تم سے کہا ہے کہ وَحِیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْہَکُمْ شَطْرَہٗ۔ (۲۴۸) تم دنیا کے کسی گوشے میں ہو، تمہاری نگاہوں کا رخ اسی مرکز کی طرف ہونا چاہیے؟ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اللہ تعالیٰ اس گھر میں رہائش پذیر ہے۔ بالکل نہیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ کی تو کیفیت یہ ہے کہ:-

وَلِلّٰہِ الْمَشْرِیْقُ وَالْمَغْرِبُ۔ فَاَیْمًا تَوَلُّوْا فَاْتَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ۔ اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔ (۱۱۵)

وہ جہت و سمت کی قیود سے بالا اور زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ وہ کائنات کی تمام پہنائیوں پر چھایا ہوا ہے۔ تم جس طرف بھی رخ کر گے، خدا کی جلوہ باریاں تمہارے سامنے ہوں گی۔ کسی سمت کو رخ کرنا تو ایک طرف،

خدا کا آفاقی تصور هُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ۔ (۱۱۶) تم جہاں کہیں بھی ہو، خدا تمہارے پاس اور ساتھ ہوتا ہے جی کہ تَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (۱۱۶) وہ تو انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے، کعبہ کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ تمہاری سہیت اجتماعیہ کامرکز ہے۔ وہ ذکرِ اللہ (قرآنی تصورات) کو دنیا میں عام کرنے کا سرچشمہ ہے۔

اسی سے اس نے قریش کو بھی متنبہ کر دیا کہ تم یہ نہ سمجھ لو کہ اگر کعبہ کی عمارت پر تم نے اپنا قبضہ نہ چھوڑا تو یہ نظام قائم نہیں ہو سکے گا۔ اس نظام میں کعبہ کی اہمیت اپنے مقام پر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کسی خاص مقام کے ساتھ وابستہ نہیں (حضور نبی اکرم کے ارشادِ گرامی کے مطابق) سارا کرہ ارض جماعتِ مومنین کے لئے مسجد ہے۔ جہاں بھی قضا ساگوار ہوتی، یہ اس نظام کو قائم کر لیں گے۔ بنا بریں، صرف اس بنا پر کہ اس وقت تم اس عمارت پر قابض ہو، تم اس نظام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔

اس نظام کے قیام کی راہ میں ایک قریش ہی حائل نہیں تھے، جملہ اہل مذاہب بھی اس کے خلاف تھے کیونکہ اس کے قیام سے ان کے مفاد پر زور پڑتی تھی۔ ان اہل مذاہب میں سے یہودی اور عیسائی، اس تحریک کے مراکز (مکہ اور مدینہ)

اور ان کے ارد گرد پھیلے ہوئے تھے۔ وہ اس نظام کے کس قدر مخالف تھے، اس کا ذکر چار آیات آگے (۱۱۴) میں آئے گا۔ یہاں ان دونوں میں سے نصاریٰ (عیسائیوں) کی پستی فکر کو پہلے سامنے لایا گیا، کہا کہ :-

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَنَهُ . بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ .
كُلُّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ - (۱۱۴)

ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کا ایک بیٹا بھی ہے۔ اس طرح انہوں نے خدا کو انسانوں کی سطح پر لا کر رکھ دیا ہے۔ وہ اس سطح سے بہت بلند اور اس تصور سے بہت دور، پاک اور منزہ ہے۔ کائنات کی لپٹیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ سب اس کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کسے لے، اس کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ اس لئے وہ انسانوں کی طرح بیٹوں کی مدد کا محتاج نہیں۔

يَبْدِئُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ . وَاِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ
فَيَكُوْنُ - (۱۱۵)

ان کا محدود ذہن انہیں یہی بتا سکا ہے کہ خدا کا طریق آفرینش بھی تولید (PROCREATION) ہے۔ یعنی وہ طریق جس سے انسانی دنیا میں باپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ خدا وہ ہے جو جملہ کائنات کو کسی ساز و سامان (MATERIAL) کے بغیر عدم سے وجود میں لایا ہے۔ اس کا انداز تخلیق یہ ہے کہ وہ جب کسی شے کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کی تخلیق کا آغاز ہو جاتا ہے اور پھر وہ بتدریج اپنی تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسے لانا تھا تو تولد کے مالک خدا کو بیٹوں کی کیا حاجت؟ تخلیق کائنات، عالم امر و خلق اور تخلیق و تولید کے متعلق تفصیلی بحث پہلی دو جلدوں میں آچکی ہے۔ اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ (دیکھئے جلد اول صفحہ ۲۲-۱۶۔ زیر آیت (۱) ذ ص ۲۹۲-۲۸۳۔ زیر آیت (۲) ذ جلد دوم صفحہ ۳۴۳۔ زیر آیت (۳) حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے کے باطل عقیدہ کی (ضمنی) تردید جلد دوم صفحہ ۳۴۳۔ زیر آیت (۴) کی جا چکی ہے۔ اس کی مزید تشریح، پیدائش حضرت عیسیٰ کے ضمن میں اپنے مقام پر آئے گی۔ آیات زیر نظر (۱۱۴-۱۱۵) میں قرآن کریم نے عیسائیوں کے اس باطل عقیدہ کی اصولی تردید پر اکتفا کیا ہے۔ مقصد اس سے یہ بتانا ہے کہ جو قوم اس قدر توہمات میں گھری ہوتی ہو وہ دین کے نظام کے بلند تصور کو باسانی کس طرح سمجھ سکتی ہے۔ لہذا ان کی طرف سے اس کی مخالفت قابل فہم ہے۔

نبی اکرمؐ اپنے اس دعویٰ کی بنیاد وحی خداوندی پر استوار کرتے تھے، اور مخالفین وحی کے متعلق طرح طرح کے

سوالات کرتے تھے۔ ان کا مقصد تو اس نظام کے قیام کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنا تھا۔ لیکن وہ دکھائے بندوں اس کا اظہار کرنے کے بجائے وحی، نبوت، رسالت کے متعلق اعتراضات کرتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُعَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَنْزِلُنَا آيَةً كَذَلِكَ
 قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا
 الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ - (۱۱۸)

ان میں سے بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر خدا کو ہماری راہ نمائی مقصود ہے تو وہ ہم سے براہ راست باتیں کیوں نہیں کرتا۔ یا کوئی ایسی مجیر العقول، خارق عادت نشانی ہمارے سامنے کیوں نہیں لے آتا جس سے ہم پہچان لیں کہ یہ واقعی خدا کی طرف سے وحی ہے۔ ان کی یہ باتیں وحی کی کئی حقیقت سے ناواقفیت پر مبنی ہیں اور پہلی مرتبہ نہیں کہی گئیں ان سے پہلے بھی، اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے یہی کچھ کہا کرتے تھے۔ انہیں کون بتائے کہ ہماری کتنی نشانیاں صفحہ کائنات پر بکھری پڑی ہیں۔ لیکن یہ نشانیاں انہی کو نظر آ سکتی ہیں جو علم و بصیرت سے کام لے کر اعتراف حقیقت پر آمادہ ہوں۔

یہاں ان کی طرف سے پیش کردہ دو مطالبات کا ذکر ہے۔ (۱) یہ کہ وحی ان کی طرف براہ راست آئے اور (۲) یہ رسول کوئی خارق عادت (معجزہ) دکھائے۔ پہلے شق اول کو لیتے۔

وحی کے متعلق سابقہ دو جلدوں میں تفصیلاً لکھا جا چکا ہے۔ ملخصاً یہ کہ:-

(۱) خارجی کائنات کی ہر شے، اور جانداروں میں ہر نوع کے ہر فرد کے اندر، از خود وہ رہنمائی و دلالت کر کے رکھ دی گئی ہے جس کے مطابق اسے زندگی بسر کرنا ہے۔ یہ اشیاء یا انواع و افراد، اس راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ اسے (ANIMAL INSTINCT) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (جلد اول صفحہ ۱۷۷ - آیت ۱)

(۲) انسانوں کی راہ نمائی کے لئے وحی کی ضرورت (جلد اول صفحہ ۱۷۷ - آیت ۱) (جلد دوم صفحہ ۱۷۹ - آیت ۲)۔

(۳) یہ وحی کسی منتخب ہستی کی طرف نازل.... کی جاتی تھی اور اس سے کہا جاتا تھا کہ اسے دوسرے انسانوں تک

بھی پہنچا دے۔ یہ علم خدا سے براہ راست حاصل ہوتا تھا اور اس میں اس ہستی کی اپنی فکر یا کاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ (جلد اول صفحہ ۱۷۷ - آیت ۲؛ صفحہ ۱۷۸ - آیت ۳)

(۴) کوئی غیر از نبی جان نہیں سکتا کہ وحی کی ماہیت کیا ہوتی تھی۔ وہ نبی کو کس طرح ملتی تھی؟ (جلد دوم صفحہ ۳۸۷ -

آیت ۲)

(۵) نبی کی طرف وحی، اس کی کتاب میں محفوظ ہوتی تھی۔ اس کے باہر و خارج از قرآن، وحی کا وجود نہیں ہوتا تھا۔ (جلد اول ص ۱۸۱ آیت ۲)۔

(۶) وحی کے سوا، خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ جان انسانی کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی طرح کشف و الہام، کبھی۔ یہ اصطلاحات بھی انسانوں کی خود وضع کردہ ہیں۔ قرآن کریم میں ان کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ فنی چیزیں ہیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ ان پر تفصیلی بحث جلد اول اور دوم میں تصوف کے عنوان میں گزر چکی ہے۔

(۷) وحی حضور نبی اکرم کی ذات اقدس پر ختم ہو گئی۔ اب کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔

زیر نظر آیت (۲۸) میں، ان لوگوں کی طرف سے مطالبہ یہ کیا تھا کہ خدا ان سے براہ راست کلام کرے۔ (لَوْ كُنَّا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ) مقصد اس سے وحی ہی تھا۔ وحی کو اللہ تعالیٰ نے خود کلام اللہ کہہ کر پکارا ہے (۵۵ ز ۲۱ و ۱۵۴)۔ اسی جہت سے وحی کی رو سے عطا شدہ قوانین و احکام خداوندی کو کلمات اللہ کہا گیا ہے۔ (۱۱۶ ز ۵۸ و ۱۶۱ ز ۱۵۴) وحی کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے جبریل یا روح الامین یا روح القدس (جو ایک ہی بات ہے) باذن خداوندی قلب نبوی پر نازل کرتا تھا (۲۱ ز ۱۶۱ و ۱۶۲-۱۹۳)۔ اسی کو ایک مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ وَاتَّخَذَ لِنَفْسِیَ الْقُرْآنَ مِنْ لَدُنْ حَکِیْمٍ عَلِیْمٍ۔ (۲۴)۔ خدا کی طرف سے قرآن، نبی اکرم کی طرف القا کیا گیا تھا۔ خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرام کو وحی اسی پنج سے ملتی تھی۔ لیکن حضرت موسیٰ کے سلسلے میں اسے خاص طور پر کلام کہہ کر پکارا گیا ہے۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰی تَخَلُّیْمًا۔ (۲۴)۔ ”خدا نے موسیٰ کے ساتھ

حضرت موسیٰ سے کلام

کلام کیا۔ اس کلام کو بھی وحی کہہ کر پکارا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ سے کہا گیا۔ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوحٰی۔ (۲)۔ ”جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اسے کان لگا کر سن لے“ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بھی اگر وحی ہی تھی (جس کا قلب نبوی پر القا ہوتا ہے تو حضرت موسیٰ کے ضمن میں) اسے خاص طور پر کلام کیوں کہا گیا اور اس کی تخصیص کیوں کی گئی کہ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰی تَخَلُّیْمًا۔ (۲۴)۔ ”موسیٰ کے ساتھ خدا نے باتیں کیں“ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں تو یہی آتی ہے کہ حضرت موسیٰ کو وحی ملنے کا جہاں ذکر آیا ہے اس واقعہ کا انداز بیان ایسا ہے گویا کسی کے ساتھ باتیں ہو رہی ہیں۔ (مثلاً سورہ طہ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ آگ کے نشان پر طور پر گئے تو نُودِیَ یٰمُوسٰی)۔ (۲)۔ ”اے پکارا گیا۔ اے یہ کہہ کر آواز دی گئی کہ اے موسیٰ! اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّکَ۔ (۲۴)۔

”میں تیرا رب ہوں“ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ (۲۸) ہم نے تجھے ایک عظیم مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔ لہذا جو کچھ تیری طرف وحی کی جاتی ہے اُسے اچھی طرح سے سن لو۔

اسی طرح سورہ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ وہاں پہنچے تو نُودِیٰ مِنَ شَاطِئِ الْوَادِ الْاٰیْمَنِ (۲۹)۔ ”نودی کی دائیں جانب سے اسے پکارا گیا“۔۔۔۔۔ اسی طرح سورہ نمل میں بھی نُودِیٰ آیا ہے (۲۶/۱۱-۲۷/۱۰) نیز (۲۶/۱۱-۲۷/۱۰) یعنی اسے آواز دی۔ ان تمام مقامات میں آواز دے کر بلانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ سلسلہ کلام شروع ہوتا ہے۔ اسے عام الفاظ میں سوال جواب یا عرض معروض کہہ لیجئے۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں انداز ہم کلامی کا سا ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے کا۔ لہذا اسے کلام کہہ کر پکارا گیا ہے۔ مقصد اس سے۔۔۔ وحی ہی ہے جس طرح ہم یہ نہیں جان سکتے (اور کوئی غیر از نبی جان نہیں سکتا) کہ نبی کے قلب پر وحی کا نزول کس طرح ہوتا تھا، اسی طرح ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ ہم کلامی کی نوعیت کیا تھی۔ واضح ہے کہ نَادِیْنِہ کی تخصیص حضرت موسیٰ کیساتھ نہیں تھی (۱۹/۱۰) دیگر انبیاء کرام کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے۔ (مثلاً) وَنَادِیْنِہ اَنْ دِیَا اِبْرٰہِیْمُ (۲۶/۲۵) اور ہم نے ابراہیم کو آواز دے کر کہا۔۔۔۔۔ جہاں نَدِی کے لفظ کے بغیر دِیَا تِلْکَ السَّبِی (۲۶/۲۵) یا اِیَّہَا الرَّسُوْلُ (۲۶/۲۵) کہا گیا ہے، وہاں بھی آواز دینا، پکار کر کہنا یا مخاطب کرنا مراد ہے جتنی کہ دِیَا تِلْکَ السَّبِی (۲۶/۲۵) بلکہ دِیَا تِلْکَ السَّبِی (۲۶/۲۵)۔ میں غیر از انبیاء انسانوں کو مخاطب کر کے احکام دیتے گئے ہیں۔ اس طرح خدا ان سب کے ہم کلام ہوتا ہے۔ یعنی اس وحی کے ذریعے جو انبیاء کرام کی وساطت سے انسانوں تک پہنچتی ہے۔

واضح ہے کہ خدا کے لئے جہاں کلام کا لفظ بولا جائے گا تو اس سے مراد، انسانوں کی طرح زبانی سے الفاظ ادا کر کے باتیں کرنا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے محسوس ذرائع سے بلند اور اودار ہے۔ ایسے مقامات پر اس قسم کے الفاظ کو ان کے حقیقی معانی میں نہیں بلکہ مجازی معانی میں لینا چاہیے۔ (مثلاً) جہاں اللہ تعالیٰ نے دِیَا تِلْکَ السَّبِی کہا ہے (اللہ کا ہاتھ۔ ۲۶/۲۵) تو اس سے مراد، انسانوں کا سا ہاتھ نہیں۔ اس کا مطلب خدا کی قدرت اور اختیار ہے۔ اسی طرح جب کہا جائے گا کہ خدا دیکھتا ہے۔ خدا سنتا ہے تو اس سے مراد اس کا (انسانوں کی طرح) آنکھوں سے دیکھنا یا کانوں سے سننا نہیں ہوگا۔ اس سے مراد علیم خداوندی ہوگا۔

بات حضرت موسیٰ کے ساتھ ہم کلامی کی ہو رہی تھی۔ اسے ایک مقام پر ”مِنْ قَرَارِیْ جِجَابِ“ (۲۶/۲۵)۔ ”پردے کے پیچھے سے بات کرنا“ بھی کہا گیا ہے۔ یہ اس نسبت سے کہ سورہ اعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے درخواست کی کہ: رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ (۲۶/۲۵)۔ ”اے میرے پروردگار! تو میرے سامنے بے حجابانہ آنکھ تیرے دیدار سے میری

نگاہ بھی کامیاب ہو۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ لَنْ تَرَانِي (۱۱۱) ”نہیں“ موسیٰ! تو مجھے دیکھ نہیں سکتا۔ تو یہ کلام مِنْ ذُرَّائِي حِجَاب ہے۔ بے عمل نہ ہوگا اگر ہم اُس آیت کی مزید تشریح کر دیں جس میں مِنْ ذُرَّائِي حِجَاب۔ خدا کے کلام کرنے کا ذکر ہے۔ ارشاد ہے: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ۔ (۱۱۲) ”کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے۔ (بجز ان طریقوں کے جن کا ذکر آگے آتا ہے)۔ یہاں دیکھئے! یہ نہیں کہا کہ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ خدا سے کلام کرے (بجز ان طریقوں کے)۔ کہا یہ ہے کہ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے۔ بجز ان طریقوں کے۔ یعنی انسان خدا سے کلام نہیں کر سکتا۔ خدا انسان سے کلام کرتا تھا یا کلام کرتا ہے۔ کس طرح؟ اَلَا وَحِيًا۔ وحی کے ذریعے۔ جس کا القاد انبیاء کے دل میں کرایا جاتا تھا۔ (۱۱۳) اَوْ مِنْ ذُرَّائِي حِجَاب۔ ”یا پردے کے پیچھے سے“ (جس طرح حضرت موسیٰ کے ساتھ ہوا)۔ یہ دونوں طریقے حضرات انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص تھے۔ باقی ہے دوسرے لوگ (یعنی غیر از نبی) سوان کے ساتھ خدا کے کلام کرنے کا طریقہ یہ ہے۔ اَوْ يُوسِّلَ رَسُوْلًا فَيُوحِيْ بِمَا يَشَاءُ۔ (۱۱۴) ان کی طرف خدا کا رسول بھیجا جاتا تھا جو ان تک خدا کے وہ احکام پہنچاتا تھا جنہیں خدا اپنے قانون مشیت کی رُو سے، اس رسول کو دیتا تھا۔ یعنی غیر از نبی انسانوں سے خدا براہ راست کلام نہیں کرتا۔ اس کا کلام، انبیاء کرام کی وساطت سے انسانوں تک پہنچتا ہے۔ واضح رہے کہ وحی کے معنی کسی کے حکم کو کسی کی طرف پہنچانے کے بھی ہیں۔

ہم نے ان تصریحات کو قرآن کریم کے متعلق مقامات کی وضاحت کے لئے پیش کیا ہے ورنہ جہاں تک اصل سوال کا تعلق ہے، یہ تمام بحثیں اب محض نظری ہیں۔ سلسلہ وحی، حضور نبی اکرم کی ذات اقدس پر ختم ہو گیا اور خدا کی طرف سے آخری وحی قرآن کریم میں محفوظ ہو گئی۔ اب کسی کو خدا کی طرف سے وحی نہیں مل سکتی۔ یعنی کسی کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ خدا کسی انسان سے براہ راست کلام نہیں کرتا۔ لہذا، اسباب بحثوں کا عملی مفہوم کچھ نہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ حضرات انبیاء کرام کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہوتا تھا۔ جسے وحی کہا جاتا تھا۔ یہ وحی آخری مرتبہ حضور نبی اکرم کو عطا کی گئی جو قرآن کریم کی دفین میں موجود ہے۔ اس قرآن پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ بحثیں کہ وحی کی کنہ و ماہیت کیا تھی، وہ انبیاء کرام پر کس طرح نازل ہوتی تھی، بے مقصد ہیں اور خواہ مخواہ الجھنیں پیدا کرنے کا موجب۔ نہ ہی یہ بحثیں کہ خدا کی طرف سے وحی تو نہیں ملتی البتہ کشف والہام ہوتا ہے۔ یہ تمام تصورات، تصوف کے پیدا کردہ ہیں۔ جو (بقول علامہ اقبالؒ) اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے اور بڑی خطرناک گمراہیاں پیدا کرنے کا موجب۔ جعلی نبی انہی سیڑھیوں سے ”دعوائی نبوت کے مقام پر پہنچتے ہیں۔

اس کے بعد آیت زیر نظر (۱۱۸) کی طرف پھر آجائیے۔ رسول اللہ کے مخالفین کا مطالبہ یہ تھا کہ وحی ان کی طرف براہ راست آنی چاہئے۔ اس سلسلہ میں ایک تو انہیں یہ بتایا گیا کہ جو وحی انسانی راہ نمائی کے لئے دی جاتی ہے، اس کا طریق ہی یہ ہے کہ ایک منتخب شخصیت کی طرف وحی کی جاتی ہے جسے وہ دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے (۱۱۷)۔ دوسرے ان سے یہ کہا گیا کہ تم یہ نہ دیکھو کہ یہ تعلیم تمہیں کس کی وساطت سے دی جا رہی ہے۔ تم یہ دیکھو کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے، وہ کیا ہے؟ اگر تم علم و بصیرت اور عقل و شعور کی رو سے اس نتیجہ پر پہنچو کہ یہ تعلیم صداقت پر مبنی ہے تو اسے قبول کر لو اور اگر تمہارا فیصلہ اس کے خلاف ہو تو اسے مسترد کر دو۔ یہ تو کوئی معقول انداز نہ ہوا کہ ایک بات کسی اور کی طرف سے ملے تو اسے مسترد کر دیا جائے اور وہی بات اگر براہ راست تم سے کہہ دی جائے تو تم اسے قبول کر لو۔ تم اپنی نگاہ اس پر رکھو کہ تم سے کہا کیا جا رہا ہے۔ نہ اس پر کہ وہ بات تم تک پہنچی کس طریق سے ہے۔ اگر تم اس بنیادی نقطہ کو سمجھ لو تو سارا جھگڑا ختم ہو جائے۔ لیکن جیسا کہ ایک ہی آیت اگے چل کر بتایا گیا، ان کا مقصد افہام و تفہیم تھا ہی نہیں۔ وہ اپنی بات پر جیسے رہنا چاہتے تھے اور اس قسم کے مطالبات اور اعتراضات سب کٹ حجتیاں تھیں۔ دنیا میں انسانوں کی عام روش یہی ہے اور اسی سے تمام جھگڑے اٹھتے اور فسادات برپا ہوتے ہیں۔

ان کا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ یہ رسول انہیں کوئی حسی معجزہ دکھائے۔ وحی کے مخالفین کی طرف سے معجزات طلبی کے متعلق جلد اول صفحہ ۳۰۹-۳۱۰ زیر آیت (۱۱۷) تفصیلی بحث آچکی ہے۔ نسل انسانی میں بعض جذبات، خواہشات، تصورات معتقدات انسان کے ابتدائی دور سے متواتر چلے آ رہے ہیں۔ انہی میں اعمو بہ پسندی بھی ہے۔ ابتدائی دور کے انسان کا شعور نیم بیدار یا نیم سخت تھا۔ اس لئے فطرت کا قانون علت و معلول (LAW OF CAUSE AND EFFECT) اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اسی بنا پر وہ فطرت کے ہر مظہر اور کائنات کے ہر حادثہ کو خارق عادت خیال کرتا تھا۔ ان کے مذہبی پیشوا ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے تھے اور انہیں طرح طرح کے شعبدوں میں الجھائے رکھتے تھے۔ اس سے یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ دعوائی ”روحانیت“ کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ

معجزات طلبی

اس کا مدعی کوئی شعبہ دکھائے۔ انسانی شعور کہیں سے کہیں پہنچ گیا لیکن انسان کی یہ خواہش غیر شعوری طور پر متواتر چلی آرہی ہے اس لئے قرآن کریم نے کہا کہ ان لوگوں کا یہ مطالبہ کوئی نئی بات نہیں، ایسا شروع سے ہونا چلا آ رہا ہے۔ یہ جذبہ انسانوں میں متواتر چلا آ رہا ہے (كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ۔ (۱۱۷)۔ ”تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ“ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ جذبہ یا خواہش نوع انسان میں غیر شعوری طور پر متواتر چلی آرہی ہے۔ دوسری جگہ کہا ہے: اَتَوَاصُوا بِهِمْ۔ (۱۱۸)۔ یوں نظر

آئے گا جیسے ہر جانے والی قوم، آنے والی قوم کو وصیت کر جاتی ہے کہ تمہاری طرف سے اس قسم کا ردِ عمل ہونا چاہیے اور تم اس قسم کے مطالبات پیش کرنا، اس قسم کے اعتراضات کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ جذبہ، خواہ متواتر ہی کیوں نہ چلا آ رہا ہو، بہر حال مبنی بر جہالت ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے ہر مقام پر سختی سے اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ تم عقل و فکر کو سلب کرنے والی فرمائشوں کے بجائے، غور و تدبیر سے کام لو اور سوچو کہ تم سے کہا کیا جا رہا ہے؟ جب تم معجز طلب کرتے ہو تو اس کی دو صورتیں ہی ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ رسولِ مہتیں اپنی طرف سے کوئی معجزہ دکھائے۔ اس سلسلہ میں یہ رسول تم سے بار بار کہہ رہا ہے کہ "اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" "میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔" (جلد اول ص ۳۰۰، آیت ۲۱)۔ لہذا، اس کے اس اعتراف اور اعلان کے بعد اس سے کسی فوق البشر یا خارق عادت، واقعہ کے ظہور میں لانے کا مطالبہ ہی غیر معقول ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خدا انہیں کوئی معجزہ دکھائے۔ معجزہ کے معنی ہیں ایسی بات جس کے کرنے سے تمہاری عقل عاجز ہو۔ سو اس قسم کے (من جانب اللہ) معجزات تو خطہ ہستی پر ایک ایک قدم پر بکھرے پڑے ہیں۔ زیادہ دور نہ جاؤ۔ تم بتاؤ کہ تم ایک مکھی بھی بنا سکتے ہو؟ تو کیا مکھی کی تخلیق اور اس کا وجود (خود تمہارے معیار کے مطابق) معجزہ نہیں؟ اب آؤ اس قرآن کی طرف جسے یہ رسول پیش کرتا ہے۔ سو اس کے متعلق تمہیں چیلنج دیا گیا ہے کہ تم اس کی ایک سورۃ جیسی سورۃ تصنیف کر کے پیش کرو۔۔۔۔۔ (جلد اول آیات ۲۳-۲۴ صفحہ ۳۱۶-۳۱۸) تم نے یہ چیلنج قبول نہیں کیا جس سے واضح ہے کہ تم اس کی مثل بنانے سے عاجز ہو۔ تو کیا یہ (قرآن) معجزہ نہیں؟

کیسی واضح اور بتیں ہے یہ بات، لیکن یہ تو اسی کی سمجھ میں آ سکتی ہے جو عقل و فکر سے کام لے۔

(۰)

قرآن کریم نے ان ہر دو مطالبات کو مبنی بر جہالت قرار دیا اور ان کے وقوع پذیر ہونے سے انکار کر دیا لیکن وائے بر حال! کہ ہم نے انہیں خود اپنے معتقدات میں شامل کر لیا۔ اُن کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ خدا براہِ راست ہم سے ہمکلام ہو۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہمکلامی تو صرف نبی سے ہو سکتی ہے، غیر از نبی سے نہیں۔ اور نبوت کا خاتمہ نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر ہو گیا۔ لہذا، رسول اللہ کے بعد، خدا کا کسی انسان سے براہِ راست ہمکلام ہونے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا کی طرف سے یہ سلسلہ ہمکلامی بدستور جاری ہے۔ وہ اولیاء اللہ یا صوفیاء کرام سے براہِ راست بانیں کرتا ہے۔ بلکہ یہ حضرات خود خدا سے براہِ راست باتیں کرتے ہیں۔ آپ غور فرمائیے کہ ایک طرف ہم ختم نبوت پر بھی عقیدہ رکھتے ہیں اور اسے دین

خدا سے ہمکلامی کا عقیدہ

کی اصل و بنیاد قرار دیتے ہیں (اور یہ حقیقت بھی ہے) اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کی طرف سے سلسلہ کلام بدستور جاری ہے۔ البتہ اس کا نام وحی کے بجائے کشف و الہام رکھ لیا گیا ہے۔ یعنی محض نام بدل دینے سے ہم مطمئن ہو گئے کہ اس سے عقیدہ ختم نبوت پر حرج نہیں آتا۔

باقی رہے معجزات۔ سو اس کے لئے بزرگوں کی کرامات کا عقیدہ وضع کر لیا گیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ تو اپنے رسول کے

متعلق کہتا ہے کہ وہ تمہارے ہی جیسا انسان ہے۔ اس لئے اس سے فوق البشر (یا خارق عادت)

واقعات کے ظہور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن ہمارے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں۔

کی طرف سے ایسے واقعات کا ظہور ہوتا ہے۔ اس میں بھی، نام کے فرق سے اپنے آپ کو (بھٹو)، اطمینان دلایا جاتا ہے کہ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ اور یہ عقیدہ بھنگنے والوں کے منگوں کا نہیں، بڑے بڑے عالمانِ دین کا ہے۔ مفتی محمد شفیع مرحوم (جن کا حال ہی میں ۱۹۷۷ء میں انتقال ہوا ہے) دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم تھے جس کے بعد وہ پاکستان تشریف لے آئے۔ وہ اپنی تفسیر القرآن میں لکھتے ہیں :

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح معجزہ میں اسبابِ طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فضل

ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ۔ اسی

طرح کرامت میں بھی اسبابِ طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی کام ہو جاتا

ہے۔ معجزہ اور کرامت دونوں خود صاحبِ معجزہ و کرامت کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ ان دونوں

میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایسا کوئی خارق عادت کام اگر کسی صاحبِ وحی کے ہاتھ پر ہو تو معجزہ کہلاتا ہے۔

غیر نبی سے اس کا ظہور ہو تو کرامت کہلاتی ہے۔

رواۃ نامہ البلاغ۔ کراچی بابت مارچ ۱۹۷۷ء۔

بحوالہ ماہ نامہ طلوع اسلام۔ بابت اپریل ۱۹۷۷ء۔ صفحہ ۵۵-۵۶۔

مَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ۔ (پ)۔ کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ اس وقت صرف یہ

دیکھئے کہ ان حضرات کے نزدیک معجزہ اور کرامت حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ فرق صرف ناموں کا ہے۔

یہ ہیں ہمارے عقاید! واضح رہے کہ ہم نے مفتی محمد شفیع مرحوم کا قول محض مثال کے طور پر درج کیا ہے ورنہ ہمارے ہاں کے

بڑے بڑے نامور اربابِ شریعت کی کتابیں کرامات کے امکان کی بحثوں سے بھری پڑی ہیں۔ اور خود ان حضرات کی کرامات کے تذکرے ان کی تصانیف میں عام ملتے ہیں اور ان کے متبعین کی زبانوں پر رواں رہتے ہیں۔

(۱)

بہر حال، یہ تھا جو مخالفین کی معجزہ طلبی کے جواب میں کہا گیا۔۔۔ اس کے بعد خود نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے ان لوگوں کو بتایا گیا کہ نبوت سے مقصود اور نبی کا مشن کیا ہوتا ہے۔ فرمایا:

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْئَلُ عَنْ
أَصْحَابِ الْجَحِيمِ - (۱۱۹)

اے رسول! ہم نے تجھے الحق (قرآن مجید) کے ساتھ انسانوں کی طرف بھیجا ہے تاکہ لوگوں کو بتا دے کہ خدا کی وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ کس قدر خوشگوار ہوگا اور اس کی خلاف ورزی سے کس طرح تباہی آجائے گی۔ تو ان تک یہ پیغام پہنچا دے اور پھر یہ ان پر چھوڑ دے کہ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ جو انکار کرے گا وہ تباہ ہو جائے گا اور اس کی تباہی کی ذمہ داری تم پر عائد نہیں ہوگی۔

کہا یہ گیا ہے کہ:-

(۱) رسول کو بالحق بھیجا گیا ہے۔ الحق کا مفہوم جلد دوم صفحہ ۸۹۔ زیر آیت ۲ بیان کیا جا چکا ہے۔ یعنی رسول زندگی کی حقیقتیں (REALITIES) پیش کرتا ہے جو مبنی بر صداقت ہوتی ہیں حقائق اور عجوبات دو متضاد باتیں ہیں۔

رسول بالحق بھیجا گیا

(۲) ان حقائق کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو بتایا جاتے کہ غلط روش زندگی کا نتیجہ تباہیاں اور بربادیاں ہوتا ہے، اور (ان حقائق پر مبنی) صحیح روش کا مال خوشگواریاں اور مسر فرازیاں۔ تذریر کے معنی ہوتے ہیں خطرات سے آگاہ کرنے والا، اور بشیر اسے کہتے ہیں جو خوشگوار یوں کی بشارت دے۔ (تفصیل جلد اول صفحہ ۱۶۱ زیر آیت ۲ گزر چکی ہے)۔

اس کے بعد، رسول اللہ سے کہا کہ تمہارا کام ان حقائق کو ان لوگوں تک پہنچا دینا اور اس طرح انہیں صحیح راستہ دکھا دینا ہے۔ تمہارا فرض یہ نہیں اس صحیح راستے پر زبردستی چلانا نہیں۔ انسان کو صاحب اختیار و ارادہ بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ صحیح اور غلط راستے سامنے آجانے کے بعد وہ خود طے کرے کہ اسے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ (انسانی اختیار و ارادہ کے متعلق، جلد اول صفحہ ۸۴ زیر آیت ۱۵۔ اور جلد دوم۔ یاب تمہید و سرگزشت آدم میں

بڑی تفصیل سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ بنا بریں، حضورؐ سے یہ کہا گیا کہ آپ نے ان جقات کو ان لوگوں تک پہنچا دیا۔ اس سے آپ نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ اس کے بعد اگر یہ لوگ، غلط راستے پر چل کر جہنم کے گڑھے میں جا گریں گے تو اس کی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوگی۔ بایں ہمہ حضورؐ کی شفقت قلبی، ان کی اس تباہی پر خون کے آنسو روتی تھی۔ آپ ہزار جان سے چاہتے تھے کہ وہ لوگ کسی طرح اس تباہی سے بچ جائیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے جلد دوم صفحہ ۳۳۲۔ آیت ۲/۵)

یہاں ان تباہ ہونے والوں کو اصحاب الحجیم کہا گیا ہے۔ حجیم، جہنم ہی کا دوسرا نام ہے اور جہنم کے معانی جلد آئل ص ۳۲۷ زیر آیت ۲/۴ بیان کئے جا چکے ہیں۔ حجیم کے معنی ہیں رکاوٹ۔ یعنی جس مقام پر انسانی زندگی کا ارتقار رک جاتا ہے وہ حجیم ہے۔ اس سلسلہ میں، جلد اول صفحہ ۱۲۷، آیت (۲/۴) میں جنت اور انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل سے متعلق بحث بھی دیکھئے۔

(۰)

یہ کچھ واضح کر دینے کے بعد، حضورؐ سے کہا گیا کہ یہ لوگ جو اس قسم کے اعتراضات اٹھاتے اور مطالبات پیش کرتے ہیں تو یہ ان کی کٹ جھتیاں ہیں۔ ان کا مقصد حقائق کو سمجھنا نہیں۔ یہ اپنے مسلک و مشرب ہی کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہ تمہارے پیش کردہ مسلک (کو اختیار کرنا تو ایک طرف، اس پر غور و فکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے یہ اس فریب نفس میں مبتلا ہیں کہ صداقت اور حقیقت ان کے پاس پہلے سے موجود ہے۔ اس لئے انہیں اسے کسی اور جگہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے حضورؐ سے کہا گیا کہ :-

وَلَكِنْ تَرْضَوْنَ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ
مِلَّتَهُمْ۔ (۲/۱۳۰)

۲
۱۳۰

یہ یہود اور نصاریٰ تم سے کبھی راضی نہیں ہو سکیں گے جب تک تو (اپنا مسلک چھوڑ کر) ان کا مسلک اختیار نہ کر لے۔

”مذہب“ کی دنیا میں بالعموم یہی ہوتا ہے۔ کوئی اہل مذہب اپنا مذہب چھوڑ کر، دوسروں کا مذہب اختیار کر لینے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوتا۔ دوسرا مذہب اختیار کر لینا، تو ایک طرف، وہ کبھی اس کا تصور کرنے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوتا کہ دیکھ تو لوں کہیں میرا مذہب غلط ہی نہ ہو۔ یہی کیفیت فرقوں میں ہوتی ہے، کُلِّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فِئْرَحُونَ۔ (۲/۱۳۱)۔ ہر فرقہ کے متبعین اس خیال میں لگن ہوتے ہیں کہ صحیح راستے پر وہی ہیں۔ باقی

سب غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضور نبی اکرمؐ پر یہود و نصاریٰ میں سے خال خال ایمان لائے۔ اس مقام پر یہ سوال دل میں پیدا ہوتا تھا (اور آج بھی پیدا ہوتا ہے) کہ جوابات دیگر اہل مذہب کہتے ہیں، وہی بات اسلام بھی کہتا ہے۔ اس کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ حقیقت اور صداقت اس کے ہاں ہے، کسی اور کے ہاں نہیں۔ پھر یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ دیگر اہل مذاہب کا یہ دعویٰ تو باطل ہے اور اسلام کا وہی دعویٰ مبنی پر حقیقت ہے؟ سوال اہم ہے اور اس کا جواب اس آیت کے اگلے ٹکڑے میں یہ کہہ کر دے دیا گیا کہ :-

قُلْ اِنَّ هُدٰى اللّٰهُ هُوَ الْهُدٰى - (۲۱)

۲
۱۳۰

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ سوال میرے راستے اور تمہارے راستے کا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ خدا

کا بتایا ہوا راستہ کون سا ہے اور اس راستے کی طرف راہنمائی کرنے والی تعلیم کہاں سے ملے گی؟

یہ حق اور باطل۔ صحیح اور غلط کے پرکھنے کا معیار! نظری طور پر اس کا بھی یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ ہر مذہب اس کا مدعی ہے کہ وہ تعلیم اس کے پاس موجود ہے۔ پھر اس کا فیصلہ کس طرح کیا جاسکتا ہے کہ اس باب میں کس کا دعویٰ صحیح ہے اور کس کا غلط۔

صرف اسلام ہی کیوں سچا دین ہے

قرآن کریم نے اس کا جواب دیا ہے اور اپنے مخصوص انداز کے مطابق، ٹھوس حقیقت پر مبنی جواب دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ دین بے شک ایک ہی تھا جو مختلف انبیاء کرامؑ کی طرف نازل کردہ کتابوں میں دیا گیا تھا۔ اگر ان انبیاء کے نام لیواؤں کے پاس وہ کتابیں ہر تین تو بیشک ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ صحیح ہوتا کہ صداقت اس کے پاس ہے اور چونکہ وہ صداقت ایک ہی تھی اس لئے ان میں نہ تفرق ہوتا نہ باہمی جنگ و پیکار۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں جو ان کے نبی کو دی گئی تھی۔ لہذا، ان کا یہ دعویٰ باطل ہے کہ ان کے پاس ہدایتِ خداوندی موجود ہے۔ رسول اللہ نے یہ جواب (وحی کی رو سے) اپنے زمانے کے اہل کتاب کو دیا، اور ان میں سے کسی نے بھی اس کی تردید نہیں کی۔

اور آج بھی جواب اہم اپنے زمانے کے جملہ اہل مذاہب کو بھی دے سکتے ہیں۔ اور ہمارا یہ جواب بلا سند اور بلا دلیل

نہیں۔ میں نے اپنی کتاب — ”مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں“ — میں، خود مختلف اہل مذاہب کی تصانیف کی اسناد سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں جو ان کے نبی کو دی گئی تھی اور اس کا خود ان کو بھی اعتراف ہے۔ اس سلسلہ میں مطالب الفرقان جلد دوم، صفحہ ۱۸۵-۱۸۶۔ زیر آیت (۲۱) میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے اور وہاں تو اسات کی جمع و تدوین کی پوری تاریخ دے دی گئی ہے۔ (دیگر کتب کی تاریخ،

میری مذکورہ بالا کتاب میں موجود ہے)

ان سے کہا گیا کہ :-

(۱) تم بھی مانتے ہو کہ سچی راہ نہایتی وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ملے۔ اِنَّ هُدٰى اللّٰهُ هُوَ الْهُدٰى۔

(۱۱۸)۔ اور

(۲) اس کا تمہیں خود اعتراف ہے کہ یہ ہُدٰى اللّٰہ (خدا کی طرف سے دی گئی ہدایت) اپنی اصلی شکل میں تمہارے

پاس نہیں ہے۔

(۳) میں اس ہدایت کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ تم علم و بصیرت کی بنا پر، کامل غور و تدبر کے بعد خود فیصلہ کرو کہ یہ راہ نہایتی 'خدا کی ہدایت' ہو سکتی ہے یا نہیں۔ تم میرے دعویٰ پر نہ جاؤ۔ غور و فکر کے بعد خود اس کا فیصلہ کرو۔ تمہارے پاس خدا کی راہ نہایتی ہے نہیں، تمہارا یہ دعویٰ کہ تمہارا مسلک صحیح ہے اور من جانب اللہ، محض تمہاری اندھی عقیدت پر مبنی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حقیقت کے مقابلہ میں خالی عقیدت کبھی مبنی بر صداقت نہیں سمجھی جاسکتی۔ بین العکرم پیش کرتا ہوں اور تم محض خوش عقیدگی کے جذبات۔ تم علم و عقل کی بارگاہ سے پوچھو کہ ان دونوں میں سے کون سا مسلک حق و صداقت کا مسلک کہلا سکتا ہے۔ بنا بریں، اگر تم سمجھتے ہو کہ میں اس ہدایت خداوندی کو چھوڑ کر، تمہارے جذبات کا اتباع کر لوں گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔ اگر میں ایسا کروں تو غلط راستے پر چلنے کے جو تباہ کن نتائج ہوں گے، اُن سے مجھے کون بچا سکے گا؟ یہ حقیقت، آیہ زیر نظر کے باقی ماندہ حصے میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ :-

وَلٰٓئِن اَتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ حَبَّأَكَ مِنَ الْعِلْمِ
مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلٰٓئٍ وَّلَا نَصِیْرٍ (۱۶۰)

۲
۱۶۰

اے رسول! اگر اس کے بعد، تم نے، اس العلم کو چھوڑ کر ان کے منکاح فریب جذبات کی پیروی اختیار کر لی تو اس روش کے تباہ کن نتائج سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔

(۰)

اس آیت میں ملت کا لفظ آیا ہے۔ ملت (مادہ م۔ ل۔ ل) کے بنیادی معنی ہیں ایسی دستاویز جسے املا کر لکھایا گیا ہو۔ اس اعتبار سے ملت کے معنی ہوں گے تحریری ضابطہ قانون۔ چونکہ تحریر سے ایک چیز واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے اس لئے طَرِیقٌ مَّیْلٌ۔ اس راستے کو کہتے ہیں جو واضح اور

ملت کا مفہوم

نمایاں ہو اور اس پر بکثرت آمدورفت ہوتی ہو۔ اس اعتبار سے مسئلہ کے معنی طریقہ اور راستہ (مسک و مشرب) کے ہوں گے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے۔ یعنی مسک و مشرب۔ طریق راہ۔ (مثلاً) حضرت یوسف نے اپنے قید خانہ کے ساتھیوں سے (اپنا تعارف کراتے ہوئے) کہا کہ اِنِّیْ تَرٰکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاِلٰہِہٖمْ (۲۴)۔ ”میں نے اس قوم کے مسک کو ترک کر دیا جو خدا پر ایمان نہیں رکھتی تھی“ اور اس کے برعکس وَاسْتَبَعَتْ مِلَّةَ اٰبَآءِہِیْ اِبْرٰہِیْمَ وَاسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ..... (۲۵) اپنے آباء۔ ابراہیم و اسحاق و یعقوب کا مسک اختیار کر لیا۔ یا (مثلاً) جب نبی اکرمؐ نے توحید کی دعوت پیش کی تو مخالفین نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ: مَا سَمِعْنَا بِہِذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ۔ اِنْ هٰذَا اِلَّا اِخْتِلَافٌ (۲۶) جو مسک ہماریے اسلاف سے چلا آ رہا ہے اس میں ہم نے نہ ایسی بات دیکھی نہ سنی۔ یہ تو ایک انوکھا سا مسک ہے جسے شخص (رسول اکرمؐ) پیش کر رہا ہے۔“

قرآن کریم نے (متعدد مقامات پر) اسلام کو ملت ابراہیمی کہہ کر پکارا ہے۔ (مثلاً ۲/۱۳۵، ۲/۱۳۵، ۲/۹۵، ۲/۱۲۵، ۲/۱۶۱، ۲/۱۶۳، ۲/۲۲)۔ اسے مسک ابراہیمی کیوں کہا گیا ہے، اس کی وضاحت حضرت ابراہیمؑ کے تذکارِ جلیلہ میں کی جائے گی۔

بہر حال، زیر نظر آیت میں، یہود و نصاریٰ کے متعلق کہا گیا کہ وہ رسول اللہ سے کبھی راضی نہیں ہوں گے جب تک آپ ان کے مسک کو اختیار نہ کر لیں۔ ان کے برعکس :-

الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الشُّکُوبَ یَشْلُوْنَہٗ حَتّٰی تَلَاوَتْہٗ۔ اُولَٰئِکَ

یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ۔ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ فَاُولَٰئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲۷)

اس کا عام ترجمہ ہو گا کہ ”ان (یہود و نصاریٰ) کے برعکس، جن لوگوں کو یہ کتاب دی گئی ہے، وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے، یہ لوگ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے برعکس، جو لوگ اس کے ماننے سے انکار کریں گے اور اس کے خلاف سرکشی برتیں گے، وہ آخر الامر نقصانی میں رہیں گے۔“

قرآن کریم نے، ان اہل مذاہب کو جو اُس زمانے میں اس کے مدعی تھے کہ وہ اُس کتاب کے پیرو ہیں جو ان کے نبی کو خدا کی طرف سے ملی تھی، ”اہل کتاب“ کہہ کر پکارا ہے اور ان میں یہود و نصاریٰ کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا ہے۔ بعض مقامات پر انہیں اَلَّذِیْنَ اُوْتُوْا الشُّکُوبَ بھی کہا گیا ہے۔ (۲/۱۴۵، ۲/۱۴۵)۔ یعنی وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی تھی۔ لیکن انہیں اہل کتاب کہنے کے باوجود ان سے کتاب اللہ (قرآن کریم اور نبی اکرمؐ کی نبوت) پر ایمان

لانے کا مطالبہ کیا ہے۔ (تفصیل جلد اول - صفحہ ۸۳۔ آیت (۲) ذ اور جلد دوم - صفحہ ۱۸۲۔ آیت (۱۶۴) میں پیش کی جا چکی ہے)۔

اس نے جماعتِ مومنین کو ”اہل کتاب“ کہہ کر تو نہیں پکارا، لیکن بعض مقامات پر انہیں بھی ”الَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (مثلاً ۲۴۴) یا الَّذِينَ آمَنُوا

مومنین اور اہل کتاب

الْكِتَابِ (۲۴۴) یعنی وہ لوگ جنہیں الکتاب دی گئی ہے۔ ایک جگہ انہیں واثرین کتاب بھی کہا گیا ہے (۳۴۳)۔ اس ضمن میں ایک اور نکتہ بھی قابل غور ہے۔ نبی اکرم کی طرف کتاب نازل کئے جانے کے لئے عام طور پر اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ کے الفاظ آتے ہیں (۲۴۴)۔ ”تجھ پر (عَلَيْكَ) کتاب نازل کی ہے“۔ لیکن بعض جگہ (اِلَيْكَ) کا لفظ بھی آیا ہے (مثلاً ۲۴۴ میں) یعنی ”تیری طرف“ کتاب نازل کی گئی ہے۔ جماعتِ مومنین کے ضمن میں بالعموم اَنْزَلَ اِلَيْكُمْ الْكِتَابَ (۲۴۴) کے الفاظ آتے ہیں۔ یعنی تمہاری طرف کتاب نازل کی گئی ہے۔ لیکن بعض جگہ (اِلَيْكُمْ)۔ تمہاری طرف — کے بجائے (عَلَيْكُمْ) کا لفظ بھی آیا ہے (۲۴۴)۔ ”تم پر کتاب نازل کی ہے“۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جس طرح نبی پر کتاب نازل کی گئی ہے اسی طرح تم پر بھی کتاب نازل کی گئی ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ اس کتاب کو تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے۔ اگرچہ ذرا گھبراتا میں جا کر دیکھا جاتے تو اس کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح یہ کتاب، قلبِ نبوی کے اندر اتاری گئی ہے اسی طرح تم بھی اس پر غور و فکر کے بعد اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں نقش کرو۔ قرآن اس ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا جو دل کی گہرائیوں میں نہ اتر چکا ہو۔ (۲۴۴) اقبال کے الفاظ میں :-

ترے ضمیر پر جب تک نہ ہونزل کتاب
گرہ کشا ہے ز رازی، نہ صاحبِ کثافت

اس کے بعد آپ پھر آیہ زیر نظر کی طرف آجائے (۲۴۴)۔ اس میں کہا گیا ہے کہ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ - ”وہ لوگ جنہیں یہ کتاب دی گئی ہے“۔ اس سے مراد جماعتِ مومنین ہے نہ کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ وغیرہ) ایک تو اس لئے کہ آیت (۲۴۴) میں یہود و نصاریٰ کا بالتصریح ذکر آیا ہے اور اس آیت میں اس جماعت کا ذکر ہے جس کا مسلک ان کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ اس آیت میں ان کے متعلق کہا گیا ہے اُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ (۲۴۴)۔ یہ لوگ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس جماعت (مومنین) کے متعلق کہا گیا ہے کہ - يَتْلُوْنَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ (۲۴۴)۔ یہ اس کتاب کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے۔ تِلَاوَتِ

کا لفظ تشریح طلب ہے۔ ہمارے ہاں تو تلاوت قرآن مجید سے مراد، قرآن کا پڑھنا ہے خواہ وہ معنی اور مفہوم سمجھ بغیر ہی کیوں نہ ہو۔ (اس کے متعلق جلد دوم صفحہ ۳۳۹۔ زیر آیت (۲/۸) لکھا جا چکا ہے)۔ لیکن تلاوت کا مفہوم اس سے وسیع اور عمیق ہے۔

لفظ تلاوت کا مادہ (ت۔ل۔و) ہے جس کے معنی ہیں کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ کسی کی پیروی کرنا۔ کسی کے ”پیچھے پیچھے چلنا“ جسمانی طور پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔ **وَالْقَمَرَ إِذَا شَلَّهَا۔ (۹۱)۔** ”چاند جب وہ سورج کے پیچھے پیچھے چلتا ہے“ اور احکام کے اتباع کے لئے بھی۔ امام راغب نے کہا ہے کہ تلاوت سے مقصود تو اتباع کتاب ہے لیکن اتباع کے لئے ضروری ہے کہ اسے پڑھا جائے (یعنی سمجھ کر پڑھا جائے) اس لئے تلاوت کا لفظ قرآن مجید کے پڑھنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ لفظ قراءت سے مختص ہے۔ یعنی قراءت محض پڑھنے کو کہتے ہیں اور تلاوت میں قراءت اور اتباع دونوں آجاتے ہیں۔ اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن مجید کا پڑھنا اس لئے ضروری ہے کہ اسے سمجھا جائے، اور سمجھنا اس لئے ضروری کہ اس کا اتباع کیا جائے۔ اگر قرآن کو سمجھا نہ جاتے تو اس کا پڑھنا کچھ فائدہ نہیں دیتا اور اگر اس پر عمل نہ کیا جائے تو اس کا سمجھنا بھی بیکار ہے۔

آیہ زیر نظر میں جو کہا گیا ہے کہ: **الَّذِينَ اتَّخَذُوا السَّيْفَ حَتَّىٰ تَبْلُغُوا حَتَّىٰ تَبْلُغُوا حَتَّىٰ تَبْلُغُوا** (۲/۱۲۱) تو اس سے مراد فقط پڑھنا نہیں بلکہ اس کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا بھی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد کہا کہ **أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ۔ (۱۲۱)۔** ”یہ لوگ درحقیقت اس پر ایمان لاتے ہیں۔“ اگر تلاوت کے معنی صرف پڑھنا لیا جائے تو یہ جماعت مومنین کی خصوصیت نہیں قرآن کو پڑھتے تو غیر مسلم بھی ہیں لیکن وہ اس کا اتباع نہیں کرتے جماعت مومنین کی تلاوت یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کو پڑھتے ہیں۔ اسے سمجھتے ہیں اور پھر اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں نبی اکرمؐ کا فریضہ رسالت ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ (۲/۱۲۹)

اس میں پہلا فریضہ، کتاب اللہ کو دوسروں تک پہنچانا۔ اسے ان کے سامنے پیش کرنا۔ اسے پڑھ کر سنانا ہے۔ دوسرا فریضہ اس کتاب کا سمجھانا ہے (يُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ) اور تیسرا فریضہ، ان کی ذات کی نشوونما کرنا ہے جو احکام قرآنہ کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہو سکتی ہے۔ لہذا، تلاوت میں تینوں باتیں آگئیں۔

کتاب اللہ کا پڑھنا پڑھنا۔ اس کا سمجھنا سمجھنا اور اس کا اتباع کرنا۔

رسول اللہ کو جس انداز سے کتاب دی گئی تھی، اس کے لئے بھی تلاوت کا لفظ آیا ہے۔ ذَلِك نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَ الذِّكْرِ الْحَكِيمِ (۱۶۱)۔ ”اس طرح ہم نے، اے رسول! اس کتاب کو تمہارے سامنے پیش کیا۔ تمہیں عطا کیا۔“ جیسا کہ وحی کے سلسلہ میں بتایا جا چکا ہے، ہم نہیں جان سکتے (اور کوئی بھی غیر از نبی نہیں جان سکتا) کہ نزول وحی کی کیفیت کیا تھی۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ خدا نے حضورؐ سے جو کہا ہے کہ: ”نَتْلُوهُ عَلَيْكَ“ تو اس کی کیفیت اور ماہیت کیا تھی ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب حضورؐ پر بذریعہ وحی نازل کی گئی تھی، لیکن رسول اللہ جس طرح اسے دوسروں تک پہنچاتے تھے، اس کی کیفیت اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ اس میں تعلیم کتاب بھی شامل تھی اور اس کے اتباع سے تزکیہ ذات بھی۔

(۱۰)

مطالب الفرقان جلد دوم کا بشیر حصہ، داستان بنی اسرائیل پر مشتمل تھا۔ اس داستان کا آغاز یہ کہہ کر کیا گیا تھا کہ: **يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓئِيْلُ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيْ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ..... (۱۶۱)** ”تم خدا کی ان نعمتوں کو یاد کرو جن سے اس نے تمہیں نوازا تھا“ (جلد دوم صفحہ ۱۶۱)۔ اس کے بعد ان نعمتوں کی یاد دہانی آیت (۱۶۲) میں کر لی گئی جس کی تفصیل جلد دوم صفحہ ۲۲۸ میں سامنے آچکی ہے۔ اس سے ملحقہ آیت میں ان کے باطل عقائد کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو بعض ان کی خوش عقیدگی پر مبنی تھے اور جو دین کے بنیادی اصول۔ قانون مکافات عمل۔ کے خلاف تھے۔ اس کی تشریح جلد دوم صفحہ ۲۲۸ میں بیان کی جا چکی ہے۔ اب اس داستان کا اختتام بھی اسی انداز سے کیا گیا ہے جس انداز سے اس کا آغاز کیا گیا تھا۔ یعنی کہا یہ گیا کہ:-

يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓئِيْلُ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيْ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ

وَ اٰتٰى فَضْلَكُمْ عَلٰى الْعٰلَمِيْنَ. وَ اتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزٰى

نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ

وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ. (۱۶۲-۱۶۳)

یہ آیات لفظاً لفظاً آیات (۱۶۸-۱۶۹) جیسی ہیں۔ یا یوں کہتے کہ انہی آیات کو یہاں دہرایا گیا ہے۔ اگر آپ جلد دوم صفحات ۲۲۸-۲۲۹ پر ایک بار پھر نظر ڈال لیں تو آپ یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان آیات کو آخر میں کیوں دہرایا گیا ہے۔ جیسا کہ وہاں تفصیلاً بتایا گیا ہے، بنی اسرائیل کی تمام تباہیوں اور بربادیوں کا بنیادی سبب

ان کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ خدا کی چاہتی قوم ہے اس لئے، خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ کریں، انہیں اس دنیا میں بھی نعمائے خداوندی سے نوازا جائے گا۔ یعنی انہیں وہ بطور استحقاق (AS OF RIGHT) حاصل ہوں گی، اور آخرت میں جنت بھی اسی طرح مل جائے گی۔ یہ، طل عقیدہ ان کے رگ و پے میں سرایت، اور ان کے دل کی گہرائیوں تک میں اتر چکا تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ اس کی بار بار تردید کی جاتی۔ جس قدر مرضِ مُزمن ہوگا، اسی قدر ضرورت ہوگی کہ اس کا علاج پیہم اور متواتر کیا جائے۔ قرآن کریم میں تصریح آیات (آیات کو کچھ پھیر کر، بار بار سامنے لانے۔ ان کا اعادہ کرنے) سے یہی مقصود ہے۔ لہذا، اس مقام پر ان کے اس بنیادی عقیدہ کی ایک بار پھر تردید کر کے، اس داستان کو سرِ دست تہ کر کے رکھ دیا۔



دوسرا باب

معارج

آیات — (۱۲۳) تا (۱۳۱)

- (۱) تعمیرِ جسم سے پہلے تخریبِ دیر، لازمی مرحلہ ہے۔
- (۲) نوعِ انسان کی امامت (لیڈر شپ کا استحقاق)
- (۳) تخریب کے تعمیر کی طرف نقلِ مکانی — ہجرت۔
- (۴) نوعِ انسانی کے عالمگیر مرکز کی تاسیس و تعمیر۔
- (۵) حج — عالمگیر انسانیت کا نقطہ اجتماع۔
- (۶) اس کی وجہ جامعیت — ایک ضابطہ قوانین کی اطاعت — قوانینِ خداوندی کی۔
- (۷) اس نصب العین پر یقین کا مطالبہ تمام نوعِ انسان سے — خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا غیر اہل کتاب۔
- (۸) اسی سے وحدتِ انسانیہ کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔
- (۹) یہی وہ صبغۃ اللہ ہے جس میں ڈوب جانے سے تمام تضادات ختم ہو جاتے ہیں اور نوعِ انسان امتِ واحدہ بن جاتی ہے۔

دوسرا باب

معماری غم

قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرات انبیاء کرام، مختلف زمانوں میں، مختلف اقوام کی طرف آتے اور خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ ان تمام انبیاء کو من جانب اللہ ماننا، جزو ایمان ہے۔ مَن آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ الْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّنَ... (۱۶۱) ”جو ایمان لایا اللہ پر۔ آخرت پر۔ ملائکہ پر۔ کتابوں پر اور انبیاء پر۔“ ان میں بعض کا ذکر تصریحی طور پر قرآن مجید میں آیا ہے اور بعض کا اس طرح ذکر نہیں آیا۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ..... (۱۶۲) ”اے رسول! یہ حقیقت ہے کہ ہم تجھ سے پہلے بھی اپنے رسول بھیجتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا ذکر تصریحاً کر دیا گیا ہے اور بعض وہ جن کا یوں ذکر نہیں کیا گیا“ ان میں سے بعض پر ایمان لاکر اور بعض سے انکار کر کے، انسان مومن نہیں ہو سکتا۔ یہ کفار کا شیوہ ہے جو کہتے ہیں کہ نُوْمِنُ بِبَعْضٍ وَنُكْفِرُ بِبَعْضٍ (۱۶۳)۔ ”ہم بعض انبیاء پر ایمان لاتے ہیں اور بعض پر ایمان نہیں لاتے“ ان کے متعلق کہا کہ: اُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا۔ (۱۶۴) ”یہ یکے کا فر ہیں“ یعنی بعض انبیاء کا ماننا، انہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

یہ اسی طرح کافر کے کافر رہتے ہیں۔ مومن ہونے کے لئے تمام انبیاء کو ماننا ہوگا، اور ماننا بھی اس طرح کہ لَا تُفَرِّقُ مَبَیْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ۔ (۱۶۵) ”ان کے نبی ہونے میں کسی قسم کا فرق نہ کیا جاسے۔“ یہ ماننا جائے کہ نبی ہونے کی حیثیت سے یہ سب یکساں تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ ان حضرات کے دوائر تبلیغ و تعلیم میں فرق تھا، ایک رسول صرف ایک بستی کے لوگوں کی اصلاح کے لئے آتا۔ دوسرا کسی عظیم قوم کی ہدایت کے لئے۔ ایک کا مقابلہ اپنے قریہ کے چند شریر نفوس سے ہوتا اور دوسرے کا تصادم بڑی بڑی مستبد قوتوں کے ساتھ۔ اس اعتبار سے ان کے مدارج و مناصب میں فرق ہوتا۔ اور اسی نہج سے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ (۲۵ ذ ۱۶۴)۔ اس اختلافِ مدارج اور مراتب کے باوجود یہ سب حضرات ایک ہی برادری کے افراد، ایک ہی شمع کی کرنیں اور ایک ہی سبکِ مروارید کے گہرے تابدار نغے۔

قرآن کریم نے سلسلہ انبیاء کا آغاز حضرت نوحؑ کے تذکار سے کیا ہے۔ ان کے بعد (قوم عاد کی طرف) حضرت ہودؑ اور پھر (قوم ثمود کی طرف) حضرت صالحؑ کا تذکرہ۔ ان کی دعوتِ رشد و ہدایت کا دائرہ ان **حضرت ابراہیمؑ** کی اپنی قوم تک محدود تھا۔ لیکن اسلام تو تمام بنی فروع انسان کا دین ہے اس لئے اس کا پیغام عالمگیر ہے۔ ان تین انبیاء کرامؑ کے بعد قرآن کریم نے اُس رسول کا ذکر کیا ہے جس کے ہاتھوں اسلام کی اس آفاقیت اور عالمگیریت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ یہ ذاتِ گرامی، پیکرِ خلقت و صداقت، حضرت ابراہیمؑ کی سچے جنہیں شہیتِ ایزدی نے اس منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب کیا اور سامی اقوام میں نبوت و رسالت کی نعمتِ عظمیٰ آپ کی ذریت سے باہر نکلی۔ اس شجرِ مقدس کی ایک شاخِ طوبی، حضرت عیسیٰؑ تک منتج رہی تو دوسری شاخ سے وہ گلِ سرسبز بسمِ فشان اور عطرِ بیز ہو جس پر نور و نکبت کی تمام رعنائیاں معراج تک پہنچ گئیں۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

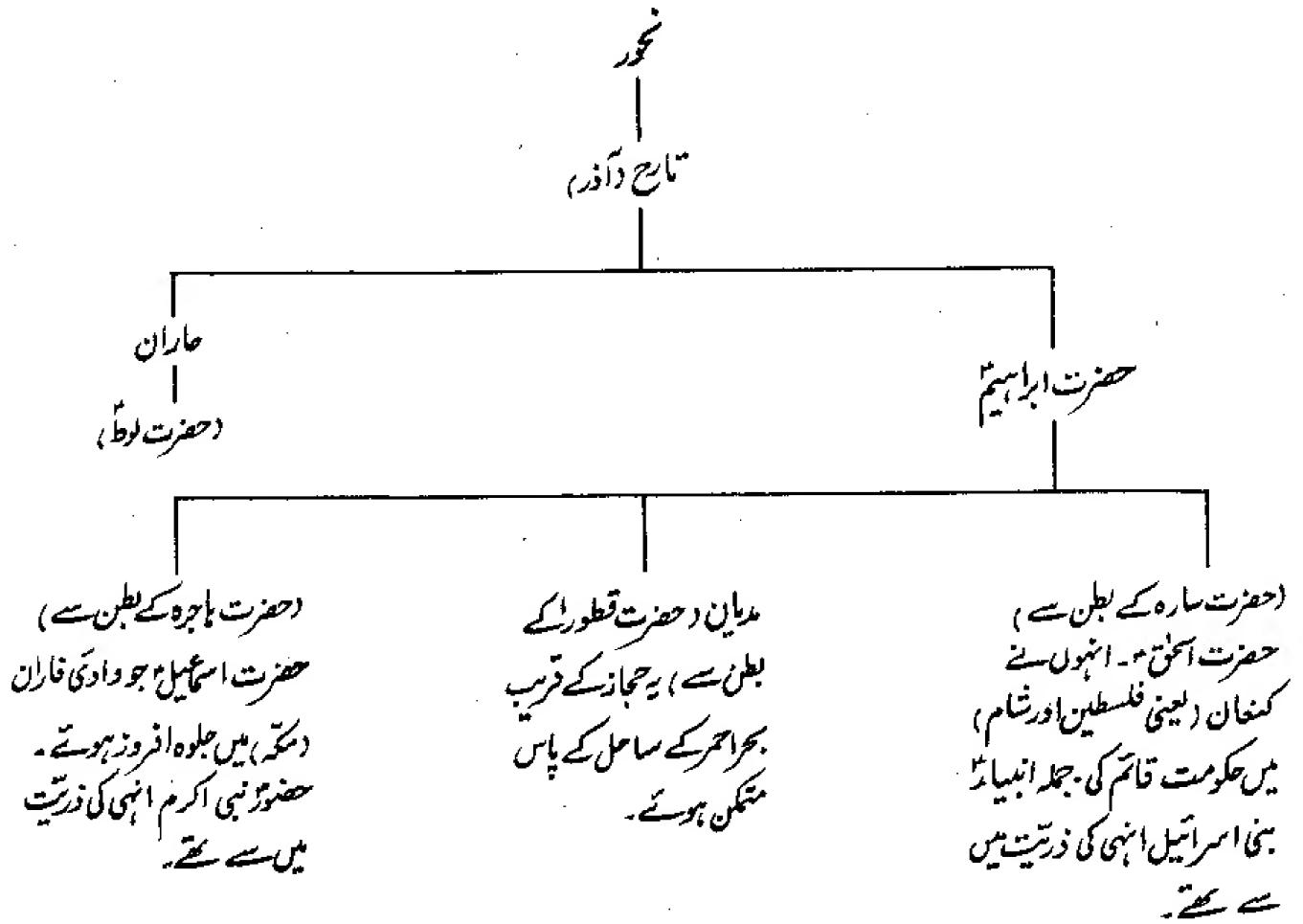
قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اسی سلسلہ نبوت کی کڑی تھے جس کے تذکرہ کی ابتدا حضرت نوحؑ سے کی گئی ہے۔ وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ (۲۱)۔ اور یقیناً ابراہیمؑ، نوحؑ کے گروہ (زمرہ انبیاء) میں سے تھا، دوسری طرف جملہ انبیاء بنی اسرائیل اور حضورِ خاتم النبیین ان کی ذریت میں تھے۔

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا. وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَى وَهَارُونَ. وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (۲۲)۔

اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحقؑ اور اسحاقؑ کا بیٹا، یعقوبؑ عطا کیا۔ ہم نے ان سب کو زندگی کا صحیح راستہ دکھایا۔ وہی راستہ جو اس سے پہلے نوحؑ کو دکھایا گیا تھا اور اس کی نسل میں سے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھی وہی راہ دکھائی۔ ہم اس طرح حسنِ عمل کرنے والوں کو ان کے اعمالِ حسنہ کا بدلہ دیتے ہیں۔

تورات میں ہے کہ حضرت نوحؑ کی آنکھوں پشت میں نچور پیدا ہوئے جو حضرت **نوحؑ ابراہیمؑ** کے دادا تھے۔ وہ آٹھ لپٹیں یہ ہیں۔ نوحؑ، سامؑ، ارفکسدؑ، سلجؑ، عبرؑ،

فلجؑ، رعوؑ، سروجؑ، شحورؑ، تارحؑ، ابراہیمؑ۔
نچور سے یہ سلسلہ اس طرح آگے بڑھا۔



حضرت ابراہیمؑ کے والد کا خاندان، کلدانیوں کے شہر اُور میں آباد تھا خود اُور کے معنی شہر یا بستی کے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد 'بابل' وغیرہ کوئی بڑا شہر ہو۔ تورات (کتاب پیدائش) میں ہے :-

اور تامح نے اپنے بیٹے ابرام اور اپنے پوتے لوط۔ یعنی اپنے بیٹے حاران کے بیٹے۔ کو، اور اپنی بہو، سرے، اپنے بیٹے ابرام کی جو رکھ لیا اور ان کے ساتھ کسدئیوں کے اُور سے روانہ ہوئے کہ کنعان کے ملک میں جائیں اور وہ حاران تک آئے اور وہاں رہے۔ (پیدائش - ۱۳)

کلدانیوں کا تمدن، ازمنہ قدیم کی تاریخ کے اوراق پر نمایاں حروف میں منقوش ہے۔ تورات میں، حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں، عراق اور شام کی باہمی جنگ کا قصہ مذکور ہے جس میں شنعاء (بابل کے بادشاہ کا نام)۔ امرخیل بتایا گیا ہے۔ قیاس ہے کہ یہ وہی بادشاہ ہے جو حمورابی کے نام سے مشہور ہے اور جس کے قوانین مینار بابل پر کندہ ہیں۔ اس قیاس کی رو سے، حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ ۲۲ ق م قرار دیا جاسکتا ہے۔ واضح رہے کہ تورات کا بیان ہو، یا عام تاریخ کا، یہ سب قیاسات ہیں۔ قرآن کریم اس قسم کی تفصیلات سے بحث نہیں کرتا۔

جس قوم میں حضرت ابراہیمؑ مبعوث ہوئے وہ بت پرستی اور ستارہ پرستی میں مشہور تھی۔ خود حضرت ابراہیمؑ کے والد، ملکیت کے بلند مرتبہ پجاری (آوار) تھے۔ واضح ہے کہ اُس زمانے کے پجاری، آجکل کے پنڈتوں، گرجا کے پادریوں، مساجد کے اماموں یا درگاہوں کے مجادروں جیسے نہیں ہوتے تھے۔ وہ بادشاہ کے بعد، ملکیت کے بلند ترین منصب پر فائز اور وسیع اختیارات کے مالک ہوتے تھے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ وہ بادشاہ گرجا ہوتے تھے اور ملکیت کا سارا کاروبار انہی کی منشاء کے مطابق سرانجام پاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے والد (آذر) کا بھی یہی مقام تھا اور اُس کے بعد اس مقام و منصب کے وارث (حضرت) ابراہیمؑ قرار پانے والے تھے۔ اس قسم کے ماحول اور اس قسم کے گھرانے میں پیدا ہونے اور پرورش پانے والے بچے کو انہی معتقدات کا حامل ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مشیتِ خداوندی نے جس بچے کو (آگے چل کر) نبوت جیسے منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب کرنا ہوتا تھا، وہ مشروع ہی سے اس قسم کے خارجی اثرات سے غیر متاثر رہتا تھا۔ اسے یہ تو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ زندگی کا صحیح راستہ کون سا ہے (اس کی نشاندہی تو وحی کے ذریعے ہی ہو سکتی تھی) لیکن غلط راستوں سے اس کی طبیعت مشروع ہی سے ابا کرتی تھی۔ (تفصیل اس اجمال کی حضورِ نبی اکرمؐ کے تذکارِ جلیلہ کے ضمن میں اپنے مقام پر سامنے آئے گی۔ علمِ انفس (PSYCHOLOGY) اس حقیقت پر انگشت بندناں اور عمرانیات (SOCIOLOGY) سرگرمیاں ہے کہ اس قسم کی بت پرستی کی فضا میں پرورش پانے والا بچہ، آگے چل کر دنیا کا سب سے بڑا بت شکن کس طرح بنا۔ اس کی یہ بت شکنی مٹی اور پتھر کی محسوس اور مرئی صورتوں تک محدود نہ تھی بلکہ ایسے زمانے میں جب انسانی نگاہ محسوسات کی چار دیواری کے باہر بشکل جاتی تھی، تشبیہ براہیمی نے دلوں کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے، غیر محسوس بتوں تک کو پاش پاش کر ڈالا اور یوں، دنیا میں توحیدِ خالص کے انقلاب آفرین پیامبر کی حیثیت سے، ملتِ موحده کے مورثِ اعلیٰ قرار پائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی فضا میں، اصنام پرستی اور بت گری کی جگہ بت شکنی کی دعوت اور اس کی عملی نمود کوئی آسان بات نہیں تھی۔ اس کے لئے طوفانوں کے سامنے سینہ سپر کھڑے ہو جانے کی ہمت اور پہاڑوں کے ساتھ ٹکرا جانے والی استقامت کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے خدائی کے دعویدار بادشاہ (جسے نمرود کہہ کر پکارا جاتا ہے) کی قہرمانیت، آذر جیسے بت گرجا کے باپ کی ایمانیت اور شعلہ صفت، آتش بہرینِ قوم کی مذہبی دیوانگی کا تنہا مقابلہ کرنے کی بے لوث درکار تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے مخالفتوں کے ان تمام ہجوموں کا مقابلہ کیا اور ان صبر آزما، جان گداز مراحل کو اس کامیابی اور کامرانی سے طے کیا کہ تاریخ کے شواہد اس پر آج تک تحسین و تبریک کے پھول نہچا کر تے چلے آئے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس بطلِ جلیل کی داستانِ حیات کا آغاز اسی مقام

سے، یہ کہہ کر کیا ہے کہ :-

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ . (۱۲۴)

۲
۱۲۳

اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے :- جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند احکام میں آزمایا تو اس نے انہیں پورا کیا ! اس میں ”آزمایا“ ترجمہ ہے ابتلی کا۔ ہمارے ہاں ابتلا کا لفظ آزمائش کے لئے بولا جاتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کو مختلف مصائب میں مبتلا کر کے ان کی آزمائش کرتا ہے، ان کا امتحان لیتا ہے۔ قرآنی نقطہ نگاہ سے ابتلا کا یہ مفہوم صحیح نہیں۔ اس کے صحیح مفہوم کے متعلق جلد دوم ص ۲۴۱۔ زیر آیت (۲۹) تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس بحث کا ملخص یہ ہے کہ انسان کے سامنے بہت سے صبر آزما اور بہت طلب مراحل آتے ہیں۔

ابتلا کا مفہوم

ان میں اسے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس میں ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کی کس قدر صلاحیت ہے۔ اس قسم کے مقامات درحقیقت انسان کے حقیقی کردار کی نمود کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ اس سے وہ اپنی ذات کی صلاحیتوں کا محاسبہ (TEST) کرتا ہے۔ لہذا ابتلا درحقیقت محاسبہ خویش کا دوسرا نام ہے۔ بنابرین، آیہ زیر نظر کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ حضرت ابراہیمؑ کو حق و باطل کی کشمکش میں بڑے سخت جنگل مراحل میں سے گزرنا پڑا۔ انہوں نے ان تمام صبر آزما مراحل کا نہایت ثبات و استقلال سے مقابلہ کیا اور کامیاب و کامران آگے بڑھ گئے اور اس طرح انہوں نے خود بھی دیکھ لیا اور دنیا کو بھی بتا دیا کہ ان کی صلاحیتیں کس قدر نشوونما پا چکی ہیں۔ قرآن کریم نے ان مراحل اور ان میں سے حضرت ابراہیمؑ کے حسن و خوبی کے ساتھ گزر جانے کا تذکرہ متعدد مقامات پر کیا ہے۔ ان کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں مختصراً اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ انہیں مملکت کی بلند ترین پیشوائیت کا منصب اور اس سے وابستہ دولت، ثروت، عزت، شہرت، عظمت، اختیارات، سب بلا محنت و کاوش وراثت میں مل سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ان سب کو پائے استحقاق سے ٹھکرا دیا۔ اس قسم کی جاذبیتوں اور کششوں سے، دامن جھٹک کر الگ ہو جانا، بڑی ہمت کا کام ہوتا ہے۔ اس کے بعد، بادشاہ کے ساتھ مقابلہ کا مرحلہ آ جاتا ہے۔ اُس زمانے کے مستبد، اختیارات مطلقہ کے مالک، بادشاہ۔ اور بادشاہ بھی نمود جیسا جس کا استبداد دنیا میں ضرب المثل ہے۔ اس کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جانا اور اس طرح مقابلہ کرنا کہ (قرآن کے الفاظ میں) اُسے منہ کی کھانی پڑی۔ (فَبِهِتَ الَّذِي كَفَرَ - ۲۵۸)

جس کو آساہمت اور جرات کا متقاضی تھا، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ پھر، اس قسم کی مذہب پر قوم کے معبودوں کی نہ صرف نظری طور پر تنقیص و تنکیر، بلکہ انہیں ٹھٹھے ٹھٹھے کر کے رکھ دینا، جس آتش فشاں

کا سامنا کرنا تھا، اس کے متعلق بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس عزیمت اور خلت کے مجسمہ نے ان تمام تلاطم خیز یوں کا مروانہ وار مقابلہ کیا تو اس کے بعد وہ مرحلہ آگیا جہاں قوم، وطن، سب کو چھوڑ کر اِنِّیْ مَّهْجًا جِئْنَا اِلَیْ رَبِّیْ۔ (۲۹) اور اِنِّیْ ذَا هِیْبٍ اِلَیْ رَبِّیْ۔ (۳۰) کا عملی ثبوت پیش کر کے، ایک اجنبی سرزمین کی طرف ہجرت کر جانا اور اسی پر کفایت نہیں، اپنی اولاد (کے ایک حصہ) کو ایک بے برگ و گیاه وادی (۳۱-۳۵) میں جا بسانا، اور اس طرح اپنے گھر کو اجاڑ کر، خدا کے گھر کو آباد کرنا۔ سوچئے کہ اس قدر جانگداز مراحل کو انتہائی خندہ پیشانی سے طے کر جانا، کس عظمت کر وار کا آئینہ دار ہے۔

یہ شہادت کہ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا
حضرت ابراہیمؑ نے اس قدر بلندئی کردار کا ثبوت دیا تو بارگاہِ خداوندی کی طرف سے انہیں یہ کہہ کر نواز گیا کہ ابراہیمؑ!
تو واقعی اس کا اہل ہے کہ تجھے عالم انسانیت کے بلند ترین مقام پر فہرستہ از کیا جائے۔

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ (۳۶)

عالم انسانیت کا وہ بلند ترین مقام تھا جس کا اہل حضرت ابراہیمؑ کو قرار دیا گیا؟ — نوع انسانی کی
امامت کبریٰ — کسی ایک قبیلہ، ایک غاندان، ایک قوم کی امامت نہیں — پوری کی پوری نوع انسانی
کی امامت۔

امامت کا عام ترجمہ تو (LEADERSHIP) کیا جاتا ہے لیکن عربی زبان (اور قرآنی لسان) کی رو سے

اس کا مفہوم اس سے کہیں گہرا اور بلند ہے۔ یالیوں کہتے کہ اس لفظ سے درحقیقت بتایا یہ
امامت کا مفہوم | گیا ہے کہ امام (لیڈر) کا منصب کیا ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ معماروں کے پاس ایک
چھوٹا سا آلہ ہوتا ہے — یعنی لمبے سے دھاگے کے ساتھ ایک لٹو سا بندھا ہوتا ہے۔ اس سے وہ دیکھتے جاتے
ہیں کہ دیوار سیدھی اٹھ رہی ہے؟ چٹائی ہموار ہو رہی ہے؟ دیوار میں کہیں خم تو نہیں آ رہا؟ اس میں کجی تو نہیں پیدا ہو
رہی؟ اس آلہ کو امام کہا جاتا ہے۔ لہذا حضرت ابراہیمؑ کو اِمَامًا لِلنَّاسِ قرار دینے سے مقصود یہ تھا کہ دنیا کی
کسی قوم نے اگر یہ دیکھنا ہو کہ اس کے عمل و کردار کی دیوار صحیح استوار ہو رہی ہے تو اس کے پرکھنے کے لئے اسے
سیرتِ ابراہیمیؑ کو بطور معیار اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے سیرتِ ابراہیمیؑ کو نوع انسان
کے لئے بہترین ماڈل (اسوۂ حسنہ) کہہ کر پکارا ہے — یعنی انسانی معاشرہ کی سیدھ اور ٹیڑھ ماپنے
کا پیمانہ۔

آیت کے اگلے حصہ میں ایک اور عظیم حقیقت کو واشگاف کیا گیا ہے۔ لیکن اس مقام پر میں تھوڑے سے توقف کے لئے معذرت چاہوں گا۔ میں نے اس کتاب (مطالب الفرقان) میں، قرآنی حقائق کو براہ راست پیش کئے جانے کا انداز اختیار کیا ہے اور اس کے تقابلی مطالعہ سے عام طور پر اعراض برتا ہے۔ لیکن بعض مقامات ایسے آجاتے ہیں جہاں اس قسم کا تقابل ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن مجید کو اسلاف کی تفسیروں کی رو سے سمجھنا چاہیئے۔

روایات کی رو سے تفسیر چنانچہ جہاں کوئی شخص قرآن مجید کا کوئی مفہم پیش کرتا ہے اس سے سب سے پہلا سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ کیا اسلاف میں سے بھی کسی نے ایسا کہا ہے؟ اگر ان

میں سے کسی نے ایسا نہیں کہا تو پھر اس کا پیش کردہ مفہم بلا سوچے سمجھے مسترد کر دینے کے قابل قرار دے دیا جاتا ہے۔ زیرِ نظر آیت میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ آپ کے سامنے آچکا ہے۔ تفسیر ابن کثیر ہمارے ہاں بڑی مستند تفسیر سمجھی جاتی ہے۔ اس میں اس آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو آزمائے کے لئے کچھ احکام دیئے تھے جن کی انہوں نے تعمیل کی اور اس طرح اس آزمائش میں پورے اتر آئے۔ وہ احکام کیا تھے؟ غور سے دیکھئے۔ وہ احکام یہ تھے:-

مونچوں کو کم کرنا۔ کلی کرنا۔ ناک صاف کرنا۔ مسواک کرنا۔ سر کے بال مٹھ دانا یا رکھنا تو مانگ نکالنا۔ ناخن لینا۔

زیرِ ناف بال لینا۔ ختنہ کرنا۔ بغل کے بال لینا۔ پیشاب پاخانے کے بعد استنجا کرنا۔ جمود کے دن غسل کرنا وغیرہ۔

(تفسیر ابن کثیر۔ اردو ترجمہ۔ پہلا پارہ صفحہ ۱۴۳)

اس کے بعد لکھا ہے:-

صحیح مسلم شریف میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے: دس باتیں فطرت کی اور اصل

دین کی ہیں۔ مونچیں کم کرنا۔ ڈاڑھی بڑھانا۔ مسواک کرنا۔ ناک میں پانی لینا۔ ناخن لینا۔ پوریاں دھونا۔ بغل کے بال

لینا۔ زیرِ ناف بال لینا۔ استنجا کرنا۔ راوی کہتا ہے کہ میں دسویں بات بھول گیا شاید کلی کرنا بھی صحیحین میں ہے

کہ حضورؐ فرماتے ہیں۔ پانچ باتیں فطرت کی ہیں۔ ختنہ کرنا۔ موٹے زہار لینا۔ مونچیں کم کرنا۔ ناخن لینا۔ بغل کے

بال لینا۔ (ایضاً صفحہ ۱۴۴)

یہ تھے وہ احکام جن کی تعمیل کرنے سے حضرت ابراہیمؑ کو نوع انسان کی امامت کا سزاوار قرار دیا گیا تھا۔ ان میں ختنہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ بخاری کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اسی سال کی عمر میں بسولہ سے اپنا ختنہ آپ کیا تھا۔ (بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ اردو ترجمہ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۵۱)

بہر حال، یہ ہے ہماری مستند تفاسیر اور روایات کی رو سے تفسیر اس آیت کی۔

(۱)

اب آگے بڑھیے۔ قدیم زمانے میں، انسانی معاشرہ کی بنیاد نسلی امتیاز پر تھی۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے اور ایک خاندان دوسرے خاندان سے الگ، نسلی بنیاد پر ہی ہوتا تھا۔ ہندو دھرم (یا ہندو معاشرہ) میں ورنوں (ذاتوں، گوتوں) کی تقسیم بھی پیدائش کی رو سے ہوتی تھی۔ جو بچہ جس گھرانے میں پیدا ہو گیا، اس گھرانے کا ورن (برہمن، کشتری، ویشی، شودر) اس کی زندگی کا جزو و لا ینفک قرار پا گیا۔ یعنی اس ورن کو دنیا کی کوئی طاقت بدل نہیں سکتی تھی۔

ابلیس و آدم کی تمثیلی آویزش کے سلسلے میں بتایا جا چکا ہے (جلد دوم صفحہ ۱۱۶ - آیت ۲۶) کہ ابلیس نے آدم کو اسی نسلی امتیاز کا چمکے دے کر بہکا یا تھا۔ اسی تصور کی رو سے موروثی بادشاہت کا نظام وجود میں آیا۔ یعنی بادشاہ کا بیٹا محض اس کا بیٹا ہونے کی جہت سے تخت و تاج کا وارث قرار پا گیا۔ یہی ”اصول“ نسلی امتیاز کا باطل نظریہ دیگر مناصب و مدارج کے سلسلہ میں تسلیم کر لیا گیا۔ نسلی تفریق کا یہ باطل نظریہ،

عالم انسانیت میں کس قدر تباہیوں کا موجب چلا آ رہا ہے، اس کے متعلق جلد اول صفحہ ۲۳۹ آیت ۱۱-۱۲ کے تحت تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ وہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دین کا مقصد ان غیر فطری تفریقات کو مٹا کر، نوع انسان کو ایک عالمگیر برادری میں منسلک کر دینا تھا۔ اس کے لئے سب سے پہلے، موروثیت کے تصور کا ابطال ضروری تھا چنانچہ حضرات انبیاء کریمؑ نے اس کی عملی مثالیں قائم کیں۔ داستان حضرت نوحؑ کے ضمن میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جب انہوں نے، موروثیت کے اس قدیم نظریہ کی رو سے سمجھا کہ ان کا بیٹا محض اس لئے تباہی سے بچا لیا جائے گا کہ وہ ان کا بیٹا ہے، تو ان کی اس غلط فہمی کو یہ کہہ کر دور کر دیا کہ دین میں ”فلال ابن فلال“ چیز سے نیست۔ ”تیرا“ وہی ہے جو دین میں تجھ سے ہم آہنگ ہے۔ (آیت ۲۶) تفصیل کے لئے میری کتاب۔ جوئے نور۔ میں داستان حضرت نوحؑ ملاحظہ کیجئے۔ وہاں باپ کے کہا گیا تھا کہ جب تک تیرا بیٹا ایمان میں تجھ سے ہم آہنگ نہ ہو، وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہو سکتا۔ داستان حضرت ابراہیمؑ میں پہلے بیٹے (حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ تیرا اُس باپ سے کوئی رشتہ نہیں جو تیرا ہم منسلک نہیں (جلد دوم صفحہ ۳۲۸)۔ زیر آیت ۲۶) اور آخر میں انہوں نے اس کلی اصول کا اعلان کر دیا کہ فَمَنْ تَبِعَنِي فَاِنَّهُ مِنِّي۔ (۲۶)۔ ”جو میرا اتباع کرے گا وہ میرا ہوگا“ جو اس راستے سے الگ راستہ اختیار کرے گا، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد آیہ زیر نظر کے اگلے ٹکڑے کی طرف آئیے۔ پہلے یہ کہا گیا تھا کہ نوع انسان کی امامت، حضرت ابراہیمؑ کے حصے میں آئے گی۔ یہ بڑا جلیل القدر منصب تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس کی وضاحت چاہی کہ کیا

عام دنیاوی دستور کے مطابق یہ منصب میری اولاد کو وراثت میں ملے گا؟ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي۔ (۲۴۱) جواب ملا۔ نہیں! ابراہیمؑ تجھے یہ منصب تیرے جوہر ذاتی کی

بنیاد پر ملا ہے۔ تیری اولاد میں اگر یہ جوہر پائے گئے تو وہ بھی اس منصب پر سرفراز رہے گی۔ لیکن اگر ان میں یہ جوہر نہ ہوگا تو وہ اس منصب کے مستحق نہیں رہیں گے۔

قَالَ لَا يَنْالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ۔ (۲۴۲)

کہا کہ نہیں! جو اس راستے سے سرکشی اختیار کرے گا، اسے یہ منصب نہیں ملے گا۔ ہمارا وعدہ مشروط ہے جوہر ذاتی کے ساتھ۔

اس ایک اساسی اصول سے، اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ :-

(۱) وراثت کا نظریہ باطل ہے خواہ وہ ملکیت کے سلسلہ میں ہو اور خواہ دیگر امتیازات اور مقامات کے ضمن میں۔

(۲) حضرت ابراہیمؑ کی ذریت (نسل) میں جو انبیاء کرامؑ پیدا ہوئے تو اس بنیاد پر نہیں کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے تھے۔ انہیں ان کے جوہر ذاتی کی بنیاد پر اس منصب کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ اس سے یہ دوسرا کلیہ مستنبط ہوا کہ اگر کسی شخص کا بیٹا اپنے جوہر ذاتی کی بنیاد پر، باپ کے منصب کا مستحق قرار پاتا ہے تو اسے، محض اُس شخص کا بیٹا ہونے کی بنیاد پر اس سے محروم نہیں کر دیا جائے گا۔ اور

(۳) اس سے یہود و لیل کے اس عقیدہ کی بھی تردید ہو گئی کہ وہ اولاد ابراہیمؑ ہونے کی بنیاد پر جنت کے مستحق قرار دیتے جا چکے ہیں۔

مساواتِ انسانیہ کے اس آفاقی اصول کے بعد اس عمارت کی طرف آئیے جو اس سنگِ بنیاد پر استوار ہوتی ہے یعنی

نوعِ انسانی کو امتِ واحدہ کے قالب میں ڈھالنے کا نظام — نظام کے تصور سے ایک بنیادی

حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ نظام متشکل ہوتا ہے ان اصولوں کی بنیاد پر جو اسے دوسرے

نظاموں سے منفرد کرتے ہیں۔ یہ اصول اس نظام کا فکری مرکز قرار پاتے ہیں۔ وحدتِ افکار کے بغیر کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر نظام کا ایک محسوس یا مشہود مرکز بھی ہوتا ہے۔ (اس کی وضاحت

جلد دوم، صفحہ ۲۱۴، زیرِ آیت (۲۴۱) کی جا چکی ہے)۔ نظامِ خداوندی (الدین) کا فکری

کعبہ مرکزِ نظامِ خداوندی مرکزِ توحیدِ حق (جو اب قرآن کریم میں محفوظ ہے) لیکن اس کا ایک محسوس مرکز بھی ضروری

تھا۔ یہ مرکز کعبہ ہے جس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ کے مقدس ہاتھوں سے عمل پذیر ہوئی تھی۔ ان کا یہ کارنامہ ان کے منصب — امامت نوح انسان — کی اولین ذمہ داری تھا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کا آبائی وطن، بابل کا علاقہ تھا اور کعبہ سرزمین حجاز میں واقع ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ بابل سے حجاز کیسے تشریف لائے۔ اگر یہ معاملہ محض نقل مکانی کا ہوتا تو ہم اسے اہمیت نہ دیتے۔ لیکن یہ تبدیلی محض جائے رہائش کی تبدیلی نہیں تھی۔ یہ دین کے نظام کے قیام کی ایک اہم کڑی تھی۔ اس لئے ہم نے اسے درخور اہمیت قرار دیا ہے۔ اور ہم کیا! خود اللہ تعالیٰ نے اسے ایک اہم انقلاب کے تعبیر کیا ہے۔ دین کی اصطلاح میں اسے ہجرت کہا جاتا ہے۔ میں نے اس موضوع پر اپنی کتاب —

ہجرت

معراج انسانیت — میں بڑی شرح و بسط سے گفتگو کی ہے لیکن مطالب الفرقان کی جامعیت کا تقاضا ہے کہ اسے یہاں دہرا دیا جائے۔

آپ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت انقلاب کی تاریخ پر غور کیجئے۔ صاف نظر آجائے گا کہ ہر تحریک میں مراحل سے گزرتی رہی ہے۔ پہلا مرحلہ دعوت و تلقین اور تبلیغ و تبیین کا ہوتا ہے جس میں اس پیغام کی عام نشر و اشاعت کی جاتی ہے اور افہام و تفہیم کے ذریعے سعید روحوں کو اس کی طرف بلایا جاتا ہے۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ اس جماعت (مومنین) کے حلقہ میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ ایسا وقت آجاتا ہے جب نظر آتا ہے کہ ان بقایا لوگوں میں حق و صداقت کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں اور ان کی طرف سے سوائے مخالفت کے اور کسی سلوک کا امکان نہیں۔ اس وقت برأت و ہجرت کا مرحلہ آتا ہے جس میں ان متمرّد و سرکش انسانوں

مرحلہ برأت و ہجرت

سے قطعِ علاقہ کر لیا جاتا ہے۔ اور تیسرا مرحلہ فتح و کامرانی کا ہوتا ہے جس میں حق باطل پر غالب آجاتا ہے۔ یہ دوسرا مرحلہ اپنی نزاکت اور اہمیت کے اعتبار سے ایک خاص امتیازی مقام رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچ کر حضرت نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ :-

وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْكَافِرِينَ دَقِيًّا (۱۲۴)

اور نوحؑ نے کہا: اے میرے پروردگار! انکارِ حق کرنے والوں میں سے روتے زمین پر کسی سرکشی اختیار کرنے والے (منتفخ) کو (زندہ) نہ چھوڑا۔

اور اس کے بعد اس متمرّد قوم کا جو کچھ انجام ہوا اس پر پھنور کی آنکھ آج تک روتی ہے۔ یہی حضرت ہودؑ نے قوم عاد سے کہا :-

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أَمَرْتُ بِهٖ إِلَيْكُمْ. وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ. وَلَا تَصْزُوهٖ شَيْئًا. إِنْ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيفٌ. (۱۲۲)

پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لئے میں بھیجا گیا تھا، وہ میں نے پہنچا دی۔ (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں) اور (مجھے تو نظر آ رہا ہے کہ) میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دے دے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔ یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگرانِ حال ہے۔

اور اس کے بعد :-

فَإِنْ جِئْتَهُمُ بِالْبَيِّنَاتِ مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَّعْتَ أَدْبَارَ الَّذِينَ كَذَبُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ. (۱۲۳)

”پھر ایسا ہو کہ ہم نے ہمو کو اور اس کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے بچالیا۔ اور جنہوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائی تھیں، ان کی بیخ و بنیا دمک اکھاڑ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی ایمان لانے والے نہ تھے۔“

اور حضرت صالحؑ نے بھی اس مقام پر پہنچ کر اسی طرح اعراض برتا۔

فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَا تُحِبُّونَ النَّصِيحِينَ. (۱۲۴)

پھر صالحؑ ان سے کنارہ کش ہو گیا۔ اس نے کہا: ”اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچایا اور نصیحت کی مگر (افسوس تم پر!) تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔“

اور اس کے بعد :-

وَتَمُودَ إِفْسًا أَبَقَىٰ. (۱۲۵)

تمود کا نام و نشان تک مٹ گیا۔

ملتِ عنفیہ کے موسس اول حضرت ابراہیمؑ کی تحریک میں یہ مقام برأت و ہجرت نمایاں طور پر سامنے آتا ہے :-

إِذْ تَأْلَوْا الْقَوْمُ مِمَّا بَرَأْنَا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحَدًّا. (۱۲۶)

جب انہوں نے اپنی قوم سے علانیہ کہہ دیا کہ ”ہم“ (حضرات ابراہیمؑ اور ان کی جماعت) ان سے جنہیں تم اللہ کے

سوا معبود بناتے ہوئے ہو۔ بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ ہم تمہارا انکار کرتے ہیں اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت و نفرت آشکارا ہو گئی۔ یہاں تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان لے آؤ۔

اور اس کے بعد ان سے کہہ دیا کہ :-

إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۲۹)

”میں اس وطن کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں جو غالب اور حکمت والا ہے۔“

اور اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اس ملک کو چھوڑ کر دوسری طرف چلے گئے تاکہ کسی بار آور زمین میں حکومتِ خداوندی کے شجرِ مقدس کی تخم ریزی کی جائے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچ کر نبی اکرمؐ نے دینِ خداوندی کے مخالفین کو مخاطب کر کے یہ زلزلہ انگیز اعلان کیا تھا کہ :-

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ. لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ
مَا أَعْبُدُ. وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ. وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ
مَا أَعْبُدُ. لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ - (۱۰۹)

(اے رسول!) تم کہہ دو: اے منکرینِ دعوتِ حق! میں ان کی عبودیت (اطاعت و فرمانبرداری) اختیار نہیں کروں گا جن کی عبودیت تم اختیار کئے ہوئے ہو اور (حالات اس پر شاہد ہیں کہ) نہ تم ہی اُس (خدائے واحد) کی عبودیت (اطاعت) اختیار کرو گے جس کی عبودیت میں اختیار کر رہا ہوں (لہذا میری اور تمہاری راہ الگ الگ ہے) اور نہ میں ان کی عبودیت (اطاعت) اختیار کر سکتا ہوں جن کی عبودیت تم نے اختیار کر رکھی ہے اور (بظاہر حالات) تم بھی اس (خدائے واحد) کی عبودیت (اطاعت) اختیار کرنے والے نہیں ہو جس کی عبودیت میں نے اختیار کر لی ہے۔ تمہارے لئے تمہارے اعمال کی جزا ہے اور میرے لئے میرے اعمال کی جزا۔ (مکافاتِ عمل کے دن حقیقت واضح ہو جائے گی)۔

اس اعلانِ برأت و علیحدگی کی شدت، تاکید اور وضاحت پر غور کیجئے اور دیکھتے کہ چند جملوں کے تکرار سے حق و باطل کو کس طرح الگ الگ کر رکھ دیا ہے کہ ان میں مفادِ مصلحت و مصالحت کا کوئی شائبہ تک نہیں رہا۔ وہ ’رسول‘ ان سے کہتا ہے کہ میں نے تمہیں اچھی طرح آگاہ کر دیا کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ تم اس کے جواب میں کہتے ہو کہ نہیں! جس راستے پر ہم چل رہے ہیں وہ تو کامیابیوں کا راستہ ہے، لیکن جس راستے کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو وہ تباہیوں کی طرف لے جانے والا ہے۔ اب اس کے بعد اس بات کا فیصلہ کرنے کی کوئی اور صورت بجز

اس کے کہ تم اپنے راستے پر چلتے جاؤ اور مجھے میرے راستے پر چلنے دو۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ کس کا راستہ کس منزل کی طرف لے جاتا ہے۔

وَقُلْ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اَعْمَلُوا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عَمِلُوْنَ - وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ - (۱۱۲-۱۱۱)

اور (اے رسول!) تم ان لوگوں سے کہہ دو تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ۔ ہم بھی (اپنی جگہ) سرگرم عمل ہیں۔ تم بھی نتیجہ (کے) منتظر رہو۔ ہم بھی منتظر ہیں۔

(۱)

اب اسی موضوع کے دوسرے گوشے کی طرف آئیے۔ جیسا کہ اس سے پیشتر لکھا جا چکا ہے، رسول کا مقصد خالی غلط نصیحت نہیں ہونا بلکہ ایک ایسے نظام حکومت کا قیام ہوتا ہے، جس میں احکامات خداوندی نافذ ہوں۔ وعظ و تلقین اور تبلیغ و تفہیم سب اسی مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسی منزل کی طرف لے جانے والے راستے ہوتے ہیں۔ وہ جس جگہ پیدا ہوتا ہے، کوشش کرتا ہے کہ اس نظام حکومت کا قیام اسی جگہ سے شروع ہو۔ وہ اس فضا کو اس نظام زندگی کے لئے سازگار بنانے میں سعی و عمل کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتا۔ وہ پوری جدوجہد کرتا ہے کہ لوگ سمجھ سکیں کہ وہ انہیں کس زندگی بخش نظام کی طرف بلاتا ہے۔ لیکن کرشمہ قوتیں جو اس نظام کے قیام میں اپنے مفاد و مقاصد کی موت دیکھتی ہیں، اس کی سرٹوٹ مخالفت کرتی ہیں۔ لیکن جب صورت یہ پیدا ہو جائے کہ اس مقام پر اس نظام کے قیام کا امکان نظر نہ آئے تو اس وقت یہ داعی انقلاب یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان نہیں دے لیتا کہ میرے ذمہ جو فرضیہ عاید ہوتا تھا، میں نے اسے ادا کر دیا۔ اب اگر یہ لوگ نہ مانیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اس کا مقصد ان پیش نظر لوگوں تک دعوت حق و صداقت کا پہنچانا ہی نہیں ہوتا۔ وہ ان تک یہ پیغام پہنچانا ہی اس لئے ہے کہ وہ اپنے غلط معاشرہ کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کر لیں۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ ایسے معاشرہ کا قیام اس جگہ ممکن نہیں تو وہ پاؤں توڑ کر اسی جگہ نہیں بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ایسے مقام کی طرف چلا جاتا ہے جہاں کی فضا اس معاشرہ کے قیام کے لئے مساعد ہو۔ وطن کی حدود و شعور اس کے نزدیک کچھ معنی نہیں رکھتیں، اس لئے اس کی چار دیواری اس کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہو سکتی۔ اس کے نزدیک ”وطن“ وہ ہے جس کی زمین اس نظام خداوندی کے لئے سازگار اور

وطن کا مفہوم رسول کی نگاہوں میں | بار آور ہو۔ لہذا جب وہ کسی ایک مقام پر اس نظام کے قیام کے

امکانات نہیں دیکھتا تو کسی ایسے مقام کا رخ کر لیتا ہے جہاں اس کے امکانات نسبتاً زیادہ ہوں اسی کا نام رسول

کی زبان میں ”ذہاب الی اللہ“ یا ”ہجرت الی اللہ“ ہے۔ ہجرت کے معنی ہیں چھوڑ دینا۔ ترک کر دینا۔ ایک مسلم کی زندگی کا ایک لمحہ ہجرت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر وہ تعلق جو اس کے نصب العین کے حصول میں مانع ہو، وہ اسے بلا تامل و توقف چھوڑنا چلا جاتا ہے۔ یہی وہ کانٹے ہیں جنہیں راستے سے ہٹانا بڑی ہمت کا کام ہے۔ ذاتی جذبات و خواہشات، عیش و آرام۔ مال کی محبت۔ اولاد سے وابستگی۔ رشتہ داروں سے تعلقات۔ دیگر رجانات و میلانات، ان میں سے جو ”کانٹا“ بھی دامن گیر ہو، اسے جھٹک کر الگ کر دیا جائے۔ ایک سہل انگار اور تن آسان آدمی کے لئے وطن کی جاذبیت بڑی محکم گیر ہوتی ہے۔ اس لئے انسان وطن کی زمین میں بڑی طرح پابگل ہو جاتا ہے۔ وطن کی یہ کشش و جاذبیت تھی جو ایک جگہ رہنے والے انسانوں کے لئے وجہ جامعیت اور باعث اتحاد و اتفاق بنی اور اس کے بعد اس نے رفتہ رفتہ ایسی پختگی اختیار کر لی۔ کہ آج دنیا میں قومیتوں کا انحصار اوطان پر قرار پا گیا اور خدا کی یہ وسیع زمین، محض پہاڑوں اور دریاؤں کے فرضی خطوط سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر انسانوں کی بستیوں کے بجائے درندوں کا بھٹ بن گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان جس مقام پر رہتا ہے، اس کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ جس مکان کو آپ اتنے شوق سے بناتے ہیں۔ پھر اس میں اپنے مال و متاع کو محفوظ رکھتے ہیں۔ مختلف کام کاج کرنے کے بعد آپ کا ہر قدم غیر شعوری طور پر اس کی طرف اٹھتا ہے جب آپ کو اطلاع ملتی ہے کہ دریا چڑھ گیا ہے اور عنقریب سیلاب کا رخ اسی بستی کی طرف ہونے والا ہے جس میں آپ کا یہ مکان ہے، تو آپ ہر کشش و جاذبیت کو جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں اور دیوانہ وار وہاں سے بھاگ اٹھتے ہیں۔ اس وقت نہ مکان کی محبت آپ کے راستہ میں حائل ہوتی ہے نہ اس کے مشمولات سے وابستگی غماں گیر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ آپ کے پاس ایک ایسی چیز ہے جسے آپ مکان اور اس کے تمام متعلقات سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ اس کی حفاظت کے لئے آپ ان تمام چیزوں کو بلا توقف و تردد چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ متاع گراں بہا جس کی حفاظت میں آپ کسی تعلق اور وابستگی پر واہ نہیں کہتے، آپ کی جان ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جان بڑی گراں بہا متاع ہے لیکن جنکی نگاہیں طبعی زندگی کی چار دیواری سے آگے بھی جاتی ہیں، ان کے نزدیک جان سے بھی زیادہ گراں بہا اور عزیز تر شے ایک اور ہے جسے جو ہر خودی۔ شرف انسانیت۔ کلمۃ الحق یا ایمان کے جامع لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہذا اگر کوئی دیکھے کہ باطل کا سیلاب بے پناہ ہے جو چاروں طرف سے امنڈے چلا آ رہا ہے اور اس میں اس کی اس متاع نایاب کی خیر نہیں تو کہئے کہ اس وقت اس کے نزدیک وطن کی حیثیت کیا رہ جائے گی؟ وہ بلا تردد و تامل وطن کی خاردار جھاڑی کو اپنے راستے سے الگ پھینک دے گا اور کسی ایسے مقام کی طرف رخ کر لے گا جہاں اُس کی یہ متاع بے بہا محفوظ ہو جائے۔ (اور اس کی حفاظت صرف اسی نظام میں ممکن ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) اس کا نام ہجرت ہے۔ حتیٰ کہ اس کی حفاظت

ہجرت کے مفہوم | میں اسے اپنی جان تک بھی دینی پڑجاتے تو، زیادہ عزیز شے کی حفاظت کی خاطر، کم عزیز شے کی قربانی کے اصول کے مطابق وہ اس میں بھی دریغ نہیں کرے گا۔ لہذا، ہجرت ایمان کا تقاضا اور مومن کی مجاہدانہ زندگی کا شعار ہے۔

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است
معنی اوازِ تنک آبی رزم است
ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
ترکِ شبہم بہرِ تسخیرِ یم است

یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر قرآنِ کریم نے ہجرت کو اس قدر اہمیت دی ہے اور مختلف طرق و اسالیب کے اس کی اس سی حکمت کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ سورہ عنکبوت میں ہے :

يُعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِيَّ وَأَسْعَةَ فَآيَاتِي فَأَعْبُدُونِي - (۲۹)

اے میرے بند و جو میرے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، اس حقیقت کو سمجھ لو کہ تمہاری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تم میری اور صرف میری محکومیت اختیار کرو۔ اگر ایسا کرنا کسی ایک خطہ زمین میں ممکن نہیں تو میری زمین بہت وسیع ہے۔ تم کسی ایسے خطہ زمین کی طرف ہجرت کر جاؤ جہاں اس انداز کی زندگی بسر کرنے کے امکانات زیادہ روشن ہوں۔

فَآيَاتِي فَأَعْبُدُونِي کے انقلاب انگیز ٹکڑے پر غور کیجئے۔ یعنی مومن کی زندگی یہ ہے کہ وہ خدا اور صرف خدا کی محکومیت اختیار کرے۔ اگر ایسا ہونا اُس سرزمین میں ممکن ہے جہاں وہ پیدا ہوا ہے تو حوالہ مراد۔ اور اگر وہاں اس کا امکان نہیں تو اِنَّ اَرْضِيَّ وَاسْعَةَ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھے رہنا، اور غیر اللہ کی محکومیت پر قناعت کر جانا، یہ تو مردِ مومن کی زندگی نہیں۔ دیکھئے! سورہ نساء میں اسی حقیقت کو کس طرح کھل کر بیان کیا گیا ہے :-

إِنَّ الَّذِينَ تَوَقَّعَهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ - قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَهْلَ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا - فَأُولَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ - وَسَاءَتْ مَصِيرًا - (۲۴)

جو لوگ (غیر خداوندی ماحول میں رہ کر) اپنے ہاتھوں اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں، ان کی روح قبض کرتے وقت فرشتے ان سے پوچھتے ہیں : تم کس حال میں تھے ؟ (یعنی دین کے اعتبار سے تمہارا کیا حال تھا ؟) وہ جواب میں کہتے ہیں۔ ”ہم کیا کرتے ؟ ہم ملک میں بے بس اور کمزور تھے“ (یعنی بے بسی کی وجہ سے دین کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے)

تھے۔ اس پر فرشتے کہتے ہیں (اگر تم اپنے ملک میں مغلوب و بے بس تھے، تو کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ کسی دوسری جگہ ہجرت کر کے چلے جاتے؟) یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور (جس کا ٹھکانہ جہنم ہوا تو) کیا ہی بڑی جگہ ہے! معذرت صرف ان لوگوں کی قابل قبول ہے جو طبعی (نہ کہ قلبی) طور پر کمزور و ناتواں اور ہجرت کی کوئی راہ نہ پاتے ہوں۔

معذورین

إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا. فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَغْفُو عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا غَفُورًا. (۹۴-۹۶)

مگر (باں) جو مرد، عورتیں، بچے، ایسے مجبور و بے بس ہوں کہ چارہ کار نہ رکھتے ہوں، اور (ہجرت کی) کوئی راہ نہ پاتے ہوں، تو امید ہے کہ اللہ (ان کی معذوری دیکھتے ہوئے) انہیں معاف کر دے، اور وہ درگزر کر دینے والا، سامانِ حفاظت عطا کرنے والا ہے!

باقی ہے ہجرت کر جانے والے تو :-

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرْعًا كَثِيرًا وَسِعَةً. وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ. وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا. (۹۷)

اور (دیکھو) جو کوئی اللہ کی راہ میں (اپنا گھر یا چھوڑ کر) ہجرت کر گیا تو اسے خدا کی زمین میں بہت سی اقامت گاہیں ملیں گی، اور (ہر طرح کی) کشائش پائے گا (کہ معیشت کی نئی نئی راہیں اس کے سامنے کھل جائیں گی)۔ اور جو کوئی اپنے گھر سے ایسے مقام کی طرف ہجرت کر کے نکلے جہاں کی سر زمین نظامِ خداوندی کے لئے زیادہ سازگار ہو، اور پھر اسے (راہ ہی میں) موت آجائے، تو اس کا اجر اللہ کے حضور ثابت ہو گیا (وہ اپنی نیت کے مطابق اپنی کوشش کا ضرور اجر پائے گا) اور اللہ تو (ہر حال میں) حفاظت اور سامانِ نشوونما دینے والا ہے۔

لے ہجرت کی راہ نہ پانے والوں پر یہ لازم آجاتا ہے کہ وہ اپنے ہی مقام کو حکومتِ خداوندی کے لئے سازگار بنانے کی جدوجہد کریں۔ نہ کہ اپنی حالت پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں۔

مہاجرین کے مدالج | خدا کی راہ، یعنی قیامِ نظامِ حکومتِ الہیہ کے لئے ہجرت کرنے والوں کے فضائل و مناقب، قرآن کے مختلف مقامات پر ابھرے ہوئے حروف میں ملتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں ہے:-

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجْهَهُدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ
يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ - وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ - (۲۱۸)

جو لوگ ایمان لائے (اور راہِ ایمان میں ثابت قدم رہے) اور جن لوگوں نے ہجرت کی سختیاں برداشت کیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کی (سچی) امید داری کرنے والے ہیں اور (جو کوئی اللہ کی رحمت کا سچے طریقہ پر امیدوار ہو، تو) اللہ سامانِ حفاظت اور پرورش عطا کرنے والا ہے۔

قرآن کریم میں اس قسم کی متعدد آیات ہیں۔ ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

(۵)

دین (نظامِ خداوندی) کے اس پروگرام کے مطابق، حضرت ابراہیمؑ اپنے وطنِ مالوت سے ہجرت کر کے کنعان اور شام کے علاقوں میں آئے۔ چونکہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین کا نظام متشکل نہیں ہو سکتا، اس لئے وہاں آپ نے ایک مملکت قائم کی جو آلِ ابراہیمؑ کے ہاتھوں بڑی مستحکم ہوتی چلی گئی۔ قرآن کریم میں ہے: وَقَعَدْنَا إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مَّا كَانُوا يَشَاءُونَ (۱۱۱) ہم نے خاندانِ ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت بھی عطا کی تھی اور ان کے ساتھ ایک عظیم الشان سلطنت بھی۔ آپ کے دو بیٹے — حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ بھی منصبِ نبوت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت اسماعیلؑ بڑے بڑے تھے اور حضرت اسحاقؑ چھوٹے۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ نے تو اس نظام کی بنیاد رکھی تھی جو عالمگیر انسانیت کو محیط ہو، مشیت کا پروگرام یہ تھا کہ اس نظام کا مرکز محسوس، سرزمینِ حجاز میں مکہ کے قریب، کعبہ قرار پائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے، آپ نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مکہ کے قریب آن بسایا۔ اس عالمگیر آفاقی مقصد کے لئے سرزمینِ حجاز کا انتخاب کیوں عمل میں لایا گیا، اس کے متعلق ہم بعثتِ نبی اکرمؐ کے سلسلہ میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔ یہاں ہم اپنے آپ کو واقعات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

لیکن اس مقام پر ایک اہم نکتہ ہمارا دامن گیر ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم تو یہ بتاتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کو مشیت کے اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے اس جگہ بسایا گیا تھا۔ لیکن تورات جس طرح اس واقعہ کو بیان کرتی ہے اس

ہجرتِ امیل سے انسانی آمیزش سے منزہ وحی اور محرف کتاب اللہ کا فرق ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی دو بیویاں تھیں۔ سہری (سارہ) اور ہاجرہ — بلکہ یوں کہئے کہ سارہ بیوی تھی اور ہاجرہ لونڈی۔ سارہ کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ اس کے برعکس ہاجرہ بار آور ہو گئی تو یہ بات سارہ کو سخت ناگوار گزری اور وہ اسے تنگ کرنے لگ گئی۔ چنانچہ ہاجرہ ایک مرتبہ تنگ آکر گھر سے بھاگ گئی لیکن فرشتے نے اسے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ تو حاملہ ہے، ایک بیٹا جنے گی، اس کا نام اسمعیلؑ **تورات کا فسانہ** رکھنا کہ خداوند نے تیرا دکھ سُن لیا ہے (پیدائش - ۱۶)۔ آگے چل کر کہا گیا ہے کہ (حضرت) اسمعیلؑ کی پیدائش سے سارہ کا حسد اور بھی بڑھ گیا اور اس کے بعد جب سارہ کے ہاں (حضرت) اسحقؑ پیدا ہوئے تو حسد کی آگ ناقابلِ برداشت ہو گئی کیونکہ پہلو ٹا بیٹا ہونے کی جہت سے باپ کے وارث (حضرت) اسمعیلؑ قرار پاتے تھے (حضرت) اسحقؑ نہیں چنانچہ سارہ نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ اس لونڈی اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو۔

چنانچہ ابراہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کے کاندھے پر دھردی اور اس کے لڑکے کو بھی اور اُسے رخصت کیا۔ وہ روانہ ہوئی اور برتبع کے میدان میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ (پیدائش ۲۱) اس کے بعد :-

اور جب مشک کا پانی چمک گیا تب اس نے اس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا۔ اور آپ اس کے سامنے ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی۔ کیونکہ اس نے کہا کہ میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں۔ سو وہ سامنے بیٹھی اور چلا چلا کے روئی۔ تب خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی۔ اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے، خدا نے سنی۔ اٹھ اور لڑکے کو اٹھاؤ۔ اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اُس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر اس مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا۔ وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیرا نڈان ہو گیا۔ (پیدائش - ۲۱-۲۰)

آپ نے غور فرمایا کہ مشیت کے پردگام کی اس عظیم کڑی کو محرف کتاب میں کس رنگ میں پیش کیا گیا ہے؟ لیکن تو رات پر کیا لڑکے وہ تو محرف کتاب ہے۔ آپ دیکھئے کہ خود ہماری کتبِ حادثہ میں اس واقعہ کو کس طرح بیان کیا گیا ہے۔

زگفر و دشمنانم کز اہل بازار راست تپاک گرمی رستم باغبانم سوخت

بخاری میں، جسے حدیث کی مستند ترین کتاب قرار دیا جاتا ہے، لکھا ہے:-

بخاری کی روایت

ابن عباس کہتے ہیں کہ اول اول جس عورت نے گھاگرہ پہنا وہ والدہ اسمعیلؑ ہیں انہوں نے گھاگرہ اس لئے پہنا کہ ان کے نشانِ پاکا سارہ کو تپ نہ چلے۔ پھر ابراہیمؑ علیہ السلام انہیں اور ان کے بیٹے اسمعیل کو لے سکے اور وہ اس کو دودھ پلاتی تھیں حتیٰ کہ ان دونوں (ماں بیٹے) کو خانہ کعبہ کے نزدیک ایک بڑے درخت کے پاس زمزم (کی جگہ) کے بالائی طرف موقع مسجد کے اوپر کی جانب چھوڑ گئے اور اس وقت مقام مکہ میں کوئی شخص نہ تھا اور نہ ہی وہاں پانی تھا۔ پس وہ وہاں ان دونوں کو چھوڑ گئے اور ان کو ایک ایک سختی کھجوروں اور ایک مشک پانی کی دے گئے۔ پھر ابراہیمؑ پیچھے کو چل پڑے اور والدہ اسمعیلؑ ان کے پیچھے پیچھے چلیں اور کہنے لگیں کہ اے ابراہیمؑ! آپ ہم کو اس وادی میں چھوڑ کر کہاں جلتے ہیں جس میں نہ کوئی غمخوار انسان ہے اور نہ کوئی چیز۔ اس نے بار بار ان کو یہ کہا لیکن وہ کچھ التفات نہ کرتے تھے۔ آخر کار انہوں نے کہا کہ کیا وہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا ہاں۔ اس پر انہوں نے کہا تو اللہ ہم کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔

اس کے بعد اس روایت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ہاجرہ کس طرح پانی کی تلاش میں مضطرب و بیکار، کبھی صحرائیں، کبھی پہاڑیوں پر سرگرداں پھرتی رہیں تاکہ خدا نے پانی کا چشمہ جاری کر دیا۔ یعنی بعینہ وہی کچھ جو تورات جیسی محرف افسانوی کتاب میں لکھا ہے۔ آپ غور فرمائیے کہ وہ بلند اور عظیم مقصد تو ایک طرف، اس سے حضرت ابراہیمؑ کا کس قسم کا کردار سامنے آتا ہے جو شخص اپنی بیوی اور شیرخوار بچے کو، ایک لی و دق صحرائیں، پانی کا ایک مشکیزہ دے کر اتنا چھوڑ جائے، اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ اور جب اس پر یہ اضافہ کیا جاتے کہ ایسا کچھ خدا کے حکم سے کیا گیا تھا، تو اس قسم کے خدا کے متعلق آپ (معاذ اللہ) کیا تصور قائم کریں گے؟ — بہر حال، تورات محرف ہے اور ہماری روایات وضعی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہودی اس قسم کی افسانوی کتاب کو وحی خداوندی کہہ کر سر پر اٹھاتے پھرتے ہیں اور ہم اس قسم کی وضعی روایات کو سینے سے لگاتے پھرتے۔ مذہب ہیں ایسا ہی ہوتا ہے، خواہ وہ کوئی مذہب ہو۔ قرآن کریم میں اس قسم کے کسی واقعہ کا اشارہ تک نہیں۔

قرآن مجید نے تعمیر کعبہ کا آغاز سخن تو آیت (۲۱۶) سے کیا ہے لیکن اس سے پہلے اس کی غایت ان الفاظ میں

بیان کر دی ہے:-

اللہ نے کعبہ کو واجب الاحترام مقام قرار دیا جس کا مقصد یہ ہے کہ نوع انسان اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو جائے۔

تعمیر کعبہ کے بعد، حضرت ابراہیمؑ نے دعایہ مانگی کہ میں نے اپنی اولاد کو یہاں بسا دیا ہے۔

(۴) فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً قَاتِلَتِ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ (۳۳)

بارالہا! تو ایسا کر دے کہ لوگوں (انسان) کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں۔

اس شہر پر یہاں کے رہنے والوں کی اجارہ داری نہیں۔

(۵) جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً نِ الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ (۳۴)

یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے، اس کے دروازے تمام نوع انسان کے لئے یکساں کھلے رہیں گے۔

آپ نے دیکھا کہ جہاں بھی کعبہ کا ذکر ہے، اسے الناس (نوع انسان) کے لئے بتایا گیا ہے۔ یہاں ہونے والے

حج۔ تمام نوع انسانی کا نقطہ اجتماع | اجتماع (حج) کے سلسلہ میں بھی، حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ وَآذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ۔ (۳۵) تو تمام نوع انسان کو دعوت دے کہ

وہ یہاں آئیں لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (۳۶)۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے۔ وَبَيِّنْهُ عَلَى النَّاسِ حُجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا۔ (۳۷)۔ جو لوگ (انسان) بھی اس تک پہنچنے کی راہ پائیں ان سے کہو کہ وہ یہاں آئیں۔ بشرطیکہ ان کا اس طرح جمع مقصد خداوندی کے حصول کے لئے ہو۔ اپنے اپنے گروہی یا قومی مفاد کی خاطر نہ ہو، کہ اس سے فساد پھیلتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ الدین (اسلامی نظام) کا عالمگیر انسانیت کو امت واحدہ بنانے کا جو پروگرام ہے، کعبہ کس طرح اس کا مرکز قرار دیا گیا ہے اور حج کا اجتماع اس مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ جسے امت مسلمہ کہا جاتا ہے، اس کے ذمہ اس مرکز کی نگہ برداشت اور اس اجتماع کا اہتمام کرنا ہے اس لئے اس امت کے متعلق بھی کہا کہ كُنْتُمْ شَعِيرَةً أُمَّةً أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳۸)۔ تم ایک بہترین قوم ہو جسے نوع انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو اِمَامًا لِلنَّاسِ کہا گیا تھا، اس سے مقصد کیا تھا؟ وہ اس نظام کے داعی اول تھے جس کا منتہی تمام عالم انسانیت کو ایک عالمگیر برادری کے قالب میں ڈھالنا تھا اور یہی

تھا وہ ابراہیمی مسلک (ملۃ ابراہیمی جس کے اتباع کا تمام اہل مذاہب کو حکم دیا گیا تھا (۲/۱۲۵) حتیٰ کہ خود نبی اکرم سے بھی کہا گیا کہ۔ ثُمَّ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ اَنْ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيفًا (۲/۱۳۰) ہم نے تیری طرف بھی یہی وحی بھیجی ہے۔ اس کا حکم دیا گیا ہے کہ تم ہر طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر ملت ابراہیمی کا اتباع کرو۔ اور امت مسلمہ (جماعت مومنین) سے کہا کہ

وَ اتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّیً (۲/۱۲۵)

تم مقام ابراہیمی کے حصول کو اپنی تنگ و تار حیات کی جولا نگاہ بناؤ۔

تمہاری سعی و کاوش کی غایت، جدوجہد حیات کا مقصد، مقام ابراہیمی کا حصول ہونا چاہیے۔ یعنی نوع انسان کی اہمیت اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اُسی کے مسلک و مشرب (ملت) کا اتباع کرو۔ اس کے پیچھے پیچھے چلتے جاؤ۔ (مصلیٰ کے معنی جلد اول صفحہ ۹۰ سلسلہ صلوٰۃ۔ زیر آیت (۲/۱۲۵) واضح کئے گئے ہیں)۔

مقام ابراہیمی

آیت زیر نظر (۲/۱۲۵) کا باقی ماندہ حصہ یہ ہے۔

وَعَهْدُنَا اِلٰی اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (۲/۱۲۵)

ہم نے (معمارانِ حرم) ابراہیم اور اسمعیلؑ سے تاکید کی تھی کہ وہ اس مقام کو عالمگیر انسانیت کا مرکز بنائیں اور اسے انسانوں کے خود ساختہ تصورات و معتقدات سے پاک اور صاف رکھ کر اس جماعت کے لئے مخصوص کر دیں جس کا مقصد حیات یہ ہے کہ وہ قوانین خداوندی کے سامنے تسلیم خم کر کے، یعنی ان کی پوری پوری اطاعت کر کے، ایسی پوزیشن اختیار کرے کہ وہ تمام نوع انسان کی پاسبان اور نگران ہو۔ ان کے اُلجھے ہوئے معاملات کو سنوارے اور ان کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو مجتمع کرے۔

رکوع اور سجدہ کا مفہوم، جلد دوم صفحہ ۲۱۲۔ آیت (۲/۱۲۵)۔ اور سجدہ کا مفہوم جلد دوم صفحہ ۹۰۔ زیر آیت (۲/۱۲۵) بیان کیا جا چکا ہے۔

طَوَّفَ کے معنی گھومنے اور چکر لگانے کے ہوتے ہیں۔ الطَّائِفُ، جو کیدار یا کوتوال کو کہتے ہیں جو رات کو حفاظت کے لئے پہرے اور چکر لگاتے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اس نظام کی حامل امت

طواف کا مفہوم | کو جس کا مرکز کعبہ ہے، خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۲/۱۲۹) کہا گیا ہے۔ یعنی وہ قوم

جسے نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے مشکل کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔ (۱۳۳)۔ یہ آیت، ان آیات کے درمیان آئی ہے جن میں کعبہ کی اہمیت کا ذکر ہے۔ اس امت کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اُمّۃً وَسَطًا ہے۔ وسطاً اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیزوں میں سے ہر ایک سے یکساں فاصلے پر ہو، جس طرح دائرے کا مرکز اس کے محیط کے ہر نقطہ سے یکساں فاصلے پر ہوتا ہے۔ لہذا، یہ وہ قوم (امت) ہوگی جو تمام نوع انسان سے یکساں فاصلے پر ہو۔ جو نہ کسی کی طرف یونہی جھکے، نہ کسی سے یونہی کھینچ کر رہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عدل کرنے والی قوم کا اس سے زیادہ جامع تصور کوئی اور ہو نہیں سکتا۔

اس کے بعد دیکھتے کہ اس امت کا فرض کیا بتایا گیا ہے۔ شُہَدَاءَ عَلَى النَّاسِ۔ تمام اقوام عالم کے اعمال و کردار کی نگرانی، یعنی یہ دیکھنے والی کہ کوئی قوم جادۂ عدل و انصاف سے ادھر ادھر تو نہیں ہوئی۔ اور ان کا رسول (نظام خداوندی کی آخری اتھارٹی) ان کے اعمال و کردار کا نگران۔ اقوام عالم کی اس نگرانی اور نگہبانی کی حیثیت سے انہیں طائفین کہہ کر بکارا گیا ہے۔ یعنی ان کی حفاظت اور نگرانی کرنے والی قوم۔

ان کی دوسری خصوصیت عاکفین بتائی گئی ہے۔ عَکَفَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو بکھرنے سے بچانے کیلئے اسے لڑی میں پرودینا جس طرح موتیوں کو دھلگے میں پر کر انہیں سلک گہرا بنا دیا اور اس طرح بکھرنے سے بچالیا جاتا ہے۔ نیز اس کے معنی ہوتے ہیں پریشان اور بکھرے ہوئے بالوں میں کنگھی کر کے انہیں بنا اور سنوار دینا۔ ان کی مشاطگی کر دینا۔ لہذا، عاکفین کے معنی ہوں گے وہ امت جو اقوام عالم کے منتشر شیرازہ کو منظم کر دے اور ان کے الجھے ہوئے معاملات کو سمجھا دے۔ چونکہ اس مقصد کے لئے بڑے گہرے غور و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لئے کسی پرسکون ماحول میں مرک کر، ٹھہر کر، بیٹھنا ضروری ہوتا ہے۔ اسلئے ثانوی طور پر اس کے معنی کسی جگہ رک کر بیٹھنے والے بھی آتے ہیں۔

یہ ہوا قرآنی مفہوم، طائفین، عاکفین اور رکع السجود کا۔ یعنی ان خصوصیات کی حامل ہوگی وہ قوم جس کے ہاتھوں وہ

بیت کا مفہوم | نظام مشکل ہو گا جس کا مرکز کعبہ ہے۔ یہاں قرآن نے کعبہ کو بتی کہا ہے۔ یعنی میرا گھر۔ اس کائنات میں ہر شے خدا کی ہے لیکن وہ بعض چیزوں کو خصوصیات سے "میری" کہہ کر بکارتا

ہے جس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی خاص قوم، خاص گروہ، خاص جماعت، یا خاص افراد کی ملک نہیں ہو سکتی۔ وہ تمام نوع انسان کے مشترکہ مفاد کے لئے کھلی رہیں گی۔ اس کی بین مثال قومِ ثمود اور حضرت صالح کی کشمکش کی داستان ہیں

مٹی ہے۔ اس قوم کی حالت یہ تھی کہ وہاں کی چرگا گاہیں اور چٹھے بڑے بڑے سرداروں کی اونٹنیوں کے لئے مخصوص تھے اور غریبوں کے مویشیوں کی ان تک رسائی مشکل تھی۔ حضرت صالحؑ نے اس سلب و نہب اور جور و استبداد کے خلاف آواز بلند کیا۔ (المختصر) طے یہ پایا کہ تمام مویشیوں کی باریاں مقرر کر دی جائیں اور ہر ایک جانور اپنی باری پران سے متمتع ہو۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ اس کا کوئی تین ثبوت ہونا چاہیے کہ تم اپنے اس عہد کی پابندی کرتے ہو یا نہیں۔ اور ثبوت کی عملی شکل یہ ہے کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ نہ کسی سردار کی ملکیت ہے نہ کسی غریب کی۔ بلکہ یہ سب کی مشترکہ اونٹنی ہے۔ اگر تم نے اسے اس کی باری پر پانی پینے دیا تو سمجھا جائے گا کہ تم اپنے عہد پر پابند ہے ہو۔ اس اونٹنی کو ناقۃ اللہ کہہ کر پکارا گیا (۲۷) یعنی نہ میری نہ تیری۔ بلکہ سب کی مشترکہ۔

اسی طرح اس نے کہا ہے کہ اگر کسی خاص خطہ زمین کو مستبد قوتیں اپنی ملکیت تصور کر کے تم پر عرصہ حیات تنگ کر دیں تو تمہیں چاہیے کہ وہاں سے کسی ایسے خطہ زمین کی طرف ہجرت کر جاؤ جس پر کوئی قابض نہ ہو۔ اسے بھی خدا نے ”ارضی“ کہہ کر پکارا ہے (۲۹) یعنی ”میری زمین“ حالانکہ ساری زمین خدا ہی کی ہے۔

ان مثالوں کی روشنی میں جتنی جتنی کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ گھر جو دنیا میں کسی فرد یا کسی قوم کا نہیں بلکہ وہ تمام نوع انسان کا مشترکہ گھر ہے کیونکہ ان کے اللہ کا گھر ہے۔

یہ تھا وہ اللہ کا گھر جسے پاک اور صاف رکھنے کے لئے معمارانِ حرم کو تاکید کی گئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ طہارت کا لفظ جسمانی پاکیزگی کے لئے بھی آتا ہے لیکن یہ قلب و نگاہ، خیالات، نظریات، معتقدات کی پاکیزگی کے لئے بھی آتا ہے۔ مثلاً سورۃ مائدہ میں منافقین کے متعلق ہے۔ لَعْنُ اللّٰهِ اَنْ یُّطَهَّرَ قُلُوْبُهُمْ۔ (۱۵)۔ ان کے قلوب پاکیزہ ہو ہی نہیں سکتے۔ لہذا ”خدا کے گھر“ کو پاکیزہ رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے جس نظام کا مرکز قرار دیا گیا ہے اس میں انسانی خیالات اور نظریات کی آمیزش نہیں ہونی چاہیے۔ اسے خالصۃً اقدار خداوندی کے لئے وقف رہنا چاہیے۔

یہ تھی کعبہ کی حقیقت اور کیفیت دین خداوندی میں۔ لیکن بعد میں جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو بات کچھ سے کچھ ہو گئی۔ آپ مطالب الفرقان جلد اول ص ۱۲۲ کو سامنے لائیے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ انسانی جذبات اور قلبی کیفیات کا اظہار، محسوس حرکات کی رو سے ہوتا ہے۔ دین کے نظام کی خایت تو انسانی قلب و نگاہ میں منشاء ایزدی (قرآن کریم) کے مطابق تبدیلی پیدا کرتا ہے جس کے لئے اس نے کچھ اصول اقدار اور احکام دیئے ہیں۔ لیکن ان اقدار و احکام کی تعمیل کے مظاہر خارجی حرکات ہوتی ہیں۔ نماز میں رکوع و سجود اس کی تین مثال ہے۔

مذہب میں کعبہ کی حیثیت

اسی طرح کعبہ بھی، امت کی مرکزیت کی محسوس علامت، اور حج ان کی نہایت اجتماعی کی محسوس شکل ہے۔ لیکن مذہب میں ہوتا یہ ہے کہ ان احکام کی غرضِ نجات ننگا ہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور اس کی محسوس شکلیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اب کعبہ کی حیثیت محض ایک مقدس مقام کی رہ گئی ہے اور حج، ایک مذہبی فریضہ کی ادائیگی۔ اب تطہیر کعبہ کے لئے اس مکان کو گلاب اور کیڑہ سے غسل دیا جاتا، اور فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے اس کے گرد طواف کر لیا جاتا ہے۔ مذہب میں یہی منظر ہر مقصود بالذات بن جاتے ہیں اور ان کی ادائیگی سے انسان مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں نے فریضہ خداوندی ادا کر دیا۔ یہی وہ اعمال ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ: **أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ** (۱۱۸)۔ وہ بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ یعنی ایک تو وہ لوگ ہیں جو کچھ کرتے ہی نہیں۔ لیکن یہ لوگ ہیں کہ اس قدر جانکاہ مشقتیں اٹھاتے اور صبر آزمائی کا لیف برداشت کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے اعمال رائیگاں جاتے ہیں۔ ایسے رائیگاں کہ **لَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا** (۱۱۹)۔ اعمال کا بدلہ (نتیجہ) متعین کرنے کے وقت، ان کے لئے میزان (ترازو) کھٹے کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ انہیں **أَخْسَرِينَ أَعْمَالًا** (۱۲۰)۔ کہا گیا ہے۔ یعنی وہ جنہیں ان کے اعمال کی وجہ سے شدید نقصان اٹھانا پڑے گا۔ یعنی بے عملی کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان اعمال کی وجہ سے جو محض یہی طور پر ادا کئے گئے تھے۔

بات تعمیر کعبہ کی ہو رہی تھی۔ اس کی تفصیل اگلی چار آیات میں دی گئی ہے۔ آیت (۱۲۶) میں کہا گیا ہے کہ وہ دونوں، باپ بیٹا، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کعبہ کی بنیادوں کو استوار کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ خدا سے دعائیں بھی مانگ رہے تھے۔ ان دعاؤں میں پہلی دعا یہ تھی کہ:

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۱۲۶)

ابراہیمؑ نے اس مرکزیت کی بنیاد رکھ دی اور خدا سے التجا کی کہ اے وہ جو تمام کائنات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا ہے! تو ایسا کر دے کہ یہ مقام ساری دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں کے لئے امن اور پناہ کی جگہ بن جائے۔ (۱۲۶) اور ان میں سے جو لوگ تیرے قوانین کی صداقتوں پر یقین اور مستقبل کی زندگی پر ایمان رکھیں، خواہ وہ

کہیں کے رہنے والے بھی کیوں نہ ہوں (۲۲)۔ انہیں زندگی کی آسائشیں اور سامانِ رست کی فراوانیاں عطا کر دے (۲۳)۔

خدا نے کہا کہ بے شک ان لوگوں کو یہ کچھ ملے گا۔ باقی سب وہ جو اس سے انکار کریں گے، تو ہمارے طبعی قوانین کے

مطابق، انہیں بھی زندگی کے عاجلہ سفا و ضرور حاصل ہوں گے (۲۴)۔ لیکن انجام کار وہ نہایت بے بسی کی حالت

میں مصیبت کی زندگی کی طرف کھینچے چلے جائیں گے۔ کس قدر سوختہ بخت ہے وہ قوم جس کا آل یہ ہوا۔

دیکھئے! تعمیرِ کعبہ جیسے عظیم اور مقدس فریضہ سے سبکدوش ہونے کے بعد سب سے پہلی دعا جو ان کے لبوں کو چومتی

ہے یہ ہے کہ انہیں رزق اور اس عطا فرما۔ اس سے رزق اور امن کی اہمیت واضح ہو جاتی

ہے حقیقت یہ ہے کہ نظامِ خداوندی کی تشکیل اور استحکام کا فریضہ اسی صورت میں ادا ہو سکتا

ہے کہ یہ قوم ہر قسم کے خطرات سے مامون اور معاش کی طرف سے مطمئن ہو۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے سورہ نحل

کی آیت (۱۶) میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے فرمایا اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھو۔ مَثَلًا قَرَبِيَّةٌ

كَانَتْ اِمْنَةً مِّنْهُمْ يَتِيَهَا رِزْقُهَا رَعْدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ.... (۱۶)۔ ایک بستی تھی جسے

خطرات کی طرف سے مامونیت اور معاش کی طرف سے اطمینان حاصل تھا۔ اس کی طرف چاروں سمت سے سامانِ رزق

کھینچے چلا آتا تھا۔ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ۔ (۱۷) یہ انعاماتِ خداوندی تھے لیکن انہوں نے کفرانِ نعمت کیا جس

مقصد کے لئے انہیں ان بخشائشوں سے نوازا گیا تھا، انہوں نے انہیں اس کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا۔ انہوں

نے خدا کے مقرر کردہ معاشی نظام کے خلاف اپنا نظام قائم کر لیا۔ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَ

الْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ۔ (۱۸) ان کے خود ساختہ نظامِ معیشت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھوک اور خوف کے

عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ فارغ البالی کی جگہ انہیں فلتے آنے شروع ہو گئے اور اُن کا امن، خطرات میں گھر گیا۔ یہ

سب اُن کے اپنے وضع کردہ غلط نظام کا نتیجہ تھا۔ قوانینِ خداوندی سے اعراض برتنے کا لازمی نتیجہ رزق کی تنگی

ہوتا ہے۔ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا.... (۱۹) جو قوانینِ خداوندی سے

اعراض برتا ہے اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے اور اس طرح (یوں سمجھو کہ) وہ دنیا میں اندھا ہو جاتا ہے اور۔

وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمَى۔ (۲۰) اور جو شخص دنیا میں اندھا ہو جائے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہتا ہے۔

بلکہ وہاں یہ تاریکیاں زیادہ شدید ہو جاتی ہیں (۲۱)۔ کعبہ اس نظام کا مرکز ہے جس میں رزق کی فراوانیاں بھی

ہوتی ہیں اور ہر طرح کا امن و اطمینان بھی۔ چنانچہ قریش سے جو اس نظام کے قیام کی مخالفت کرتے تھے،

یہی کہا گیا تھا۔

لَا يَلْفُ قَرْنَيْنِ - الْفِيهِمْ رَحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ - فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ -
الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ - (۱۳۶)

قرنیش کعبے کے متولی ہیں، اس لئے لوگوں کے دلوں میں ان کی بڑی عزت و عظمت ہے۔ اسی عزت و احترام کا نتیجہ ہے کہ ہمایہ قبائل اور ممالک نے ان سے عہد و پیمان کر رکھے ہیں کہ ان کے قافلوں کو کوئی نہیں لوٹے گا۔ چنانچہ یہ سردی اور گرمی، سال بھر اپنے تجارتی قافلے مسلسل ادھر ادھر بھیجتے رہتے ہیں اور وہ ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔

کعبے کے متولی ہونے کی جہت سے قرنیش کو اس قدر فوائد حاصل ہیں، لیکن جس مقصد کے لئے انہیں اس کا متولی بنایا گیا تھا، انہوں نے اسے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ انہیں خدا نے بھوک اور خوف سے نجات دلائی تھی، تاکہ یہ اس طرح مامون و مطمئن ہو کر، کعبے کو نظام خداوندی کا مرکز بنائیں۔ لیکن انہوں نے اسے یا ترا کا تیرتھ بنا کر رکھ دیا اور خود اس کے ہنٹ بن گئے۔

یہ غلط ہے۔ انہیں چاہیے کہ یہ اس گھر کے مالک یعنی خدا کے قوانین کی اطاعت کریں جس گھر کے ساتھ نسبت نے انہیں یہ مقام عطا کر رکھا ہے۔ یہ کام اب اس جماعت کے ہاتھوں سرانجام پائے گا جو اس مقصد کے لئے متشکل کی جا رہی ہے۔

رزق کے متعلق دعائے ابراہیمی دوسرے مقام پر ان الفاظ میں مذکور ہے :

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا
الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الشَّمْسَاتِ
لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ - (۱۳۷)

اے ہمارے نشوونما دینے والے! میں نے (اس مقصد عظیم کے لئے) اپنی کچھ اولاد کو، تیرے واجب الاحترام گھر کے پاس لا کر بسا دیا ہے (اسے "تیرا گھر" اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ تمام انفرادی نسبتوں سے بلند ہو کر عالمگیر نسبت کی مشترک جائے امن ہے)۔ یہ ایک ایسے مقام پر واقع ہے جہاں کمیتی کا نام و نشان تک نہیں۔

میں نے یہ سب اہتمام اس لئے کیا ہے کہ میری اولاد نظام صلوٰۃ کو قائم کرے۔ یعنی اس نظام کو جس میں تمام افراد تیرے قوانین کا اتباع کریں۔ سو، اے ہمارے نشوونما دینے والے! ایسا کر دے کہ (ان تمام، بظاہر، نامساعد حالات کے باوجود) لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں۔ نیز تو، ان کے لئے، زمین کی پیداوار سے سامانِ رزق فراہم کر دے۔ (۱۳۷) تاکہ (یہ معیشت کی طرف سے مطمئن ہو کر، اس مقصد کے حصول کے لئے،

ایسے جذب و انہماک سے کام کریں کہ ان کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہوں۔
(قرآن کے معاشی نظام کے متعلق دیکھئے جلد اول صفحہ ۱۰۱۔ آیت ۲۰۰؛ صفحہ ۲۹۹۔ آیت ۲۰۲)

(۱۰)

یہاں ایک لمحہ کے لئے رُک جائیے۔ دعائے ابراہیمی میں کہا گیا ہے۔ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا۔ (۲/۱۲۶)
مئے ہمارے نشوونما دینے والے! تو اس شہر (بلد) کو امن کی جگہ بنا دے؛ (۲/۱۲۶) اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ
نے اپنی اولاد (حضرت اسمعیلؑ) کو جس جگہ بسایا تھا، وہ وادی تو ایسی تھی جہاں زراعت نہیں ہوتی تھی لیکن جہاں نہیں
سیایا تھا وہ ایک شہر (مکہ) تھا۔ اس سے بھی اس روایت (اور تورات کے بیان) کی تردید ہو جاتی ہے جس میں کہا
گیا ہے (اور جو پہلے گزر چکی ہے) کہ آپ اپنی بیوی اور شیرخوار بچے کو کسی ویرانے میں چھوڑ گئے تھے۔ بہر حال اس ضمنی
نکتہ کے بعد آگے بڑھئے۔

دعائے ابراہیمی میں ایک اور نکتہ بھی قابل غور ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ: وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ
مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔ (۲/۱۲۶)۔ ”یہاں کے رہنے والوں
میں سے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لاتے، اسے رزق عطا فرما“۔ یعنی انہوں نے
رزق خداوندی کو جماعتِ مومنین تک محدود اور مختص کر دیا تھا۔ لیکن خدا تو رب العالمین ہے اس نے فوراً یہ کہہ کر
اس کی تصحیح کر دی کہ:-

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ۔ وَ

بِئْسَ الْمَصِيرُ۔ (۲/۱۲۶)

خدا نے کہا کہ بے شک جماعتِ مومنین کو وہ کچھ ملے گا جس کے متعلق تم نے دعائ مانگی ہے۔ لیکن جو اس سے
انکار کریں گے ان پر بھی رزق کے دروازے بند نہیں ہوں گے۔ انہیں ہمارے قانونِ طبیعی کے مطابق مفاد
عاجلہ ضرور حاصل ہوں گے۔ فرق یہ ہوگا کہ یہ لوگ آخر کار نہایت بے بسی کی حالت میں مصیبت کی زندگی کی
طرف کھینچے چلے جائیں گے کہ غلط نظامِ زندگی کا نتیجہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل جلد اول صفحہ ۱۵۰-۱۵۹؛ زیر آیت (۲/۲۵۳)؛ صفحہ ۲۵۳-۲۵۴؛ زیر آیت (۲/۲۵۴)؛ صفحہ ۲۵۴-۲۵۵؛ زیر آیت (۲/۲۵۵)؛ صفحہ ۲۵۵-۲۵۶؛ زیر آیت (۲/۲۵۶)؛ صفحہ ۲۵۶-۲۵۷؛ زیر آیت (۲/۲۵۷)؛ صفحہ ۲۵۷-۲۵۸؛ زیر آیت (۲/۲۵۸)؛ صفحہ ۲۵۸-۲۵۹؛ زیر آیت (۲/۲۵۹)؛ صفحہ ۲۵۹-۲۶۰؛ زیر آیت (۲/۲۶۰)؛ صفحہ ۲۶۰-۲۶۱؛ زیر آیت (۲/۲۶۱)؛ صفحہ ۲۶۱-۲۶۲؛ زیر آیت (۲/۲۶۲)؛ صفحہ ۲۶۲-۲۶۳؛ زیر آیت (۲/۲۶۳)؛ صفحہ ۲۶۳-۲۶۴؛ زیر آیت (۲/۲۶۴)؛ صفحہ ۲۶۴-۲۶۵؛ زیر آیت (۲/۲۶۵)؛ صفحہ ۲۶۵-۲۶۶؛ زیر آیت (۲/۲۶۶)؛ صفحہ ۲۶۶-۲۶۷؛ زیر آیت (۲/۲۶۷)؛ صفحہ ۲۶۷-۲۶۸؛ زیر آیت (۲/۲۶۸)؛ صفحہ ۲۶۸-۲۶۹؛ زیر آیت (۲/۲۶۹)؛ صفحہ ۲۶۹-۲۷۰؛ زیر آیت (۲/۲۷۰)؛ صفحہ ۲۷۰-۲۷۱؛ زیر آیت (۲/۲۷۱)؛ صفحہ ۲۷۱-۲۷۲؛ زیر آیت (۲/۲۷۲)؛ صفحہ ۲۷۲-۲۷۳؛ زیر آیت (۲/۲۷۳)؛ صفحہ ۲۷۳-۲۷۴؛ زیر آیت (۲/۲۷۴)؛ صفحہ ۲۷۴-۲۷۵؛ زیر آیت (۲/۲۷۵)؛ صفحہ ۲۷۵-۲۷۶؛ زیر آیت (۲/۲۷۶)؛ صفحہ ۲۷۶-۲۷۷؛ زیر آیت (۲/۲۷۷)؛ صفحہ ۲۷۷-۲۷۸؛ زیر آیت (۲/۲۷۸)؛ صفحہ ۲۷۸-۲۷۹؛ زیر آیت (۲/۲۷۹)؛ صفحہ ۲۷۹-۲۸۰؛ زیر آیت (۲/۲۸۰)؛ صفحہ ۲۸۰-۲۸۱؛ زیر آیت (۲/۲۸۱)؛ صفحہ ۲۸۱-۲۸۲؛ زیر آیت (۲/۲۸۲)؛ صفحہ ۲۸۲-۲۸۳؛ زیر آیت (۲/۲۸۳)؛ صفحہ ۲۸۳-۲۸۴؛ زیر آیت (۲/۲۸۴)؛ صفحہ ۲۸۴-۲۸۵؛ زیر آیت (۲/۲۸۵)؛ صفحہ ۲۸۵-۲۸۶؛ زیر آیت (۲/۲۸۶)؛ صفحہ ۲۸۶-۲۸۷؛ زیر آیت (۲/۲۸۷)؛ صفحہ ۲۸۷-۲۸۸؛ زیر آیت (۲/۲۸۸)؛ صفحہ ۲۸۸-۲۸۹؛ زیر آیت (۲/۲۸۹)؛ صفحہ ۲۸۹-۲۹۰؛ زیر آیت (۲/۲۹۰)؛ صفحہ ۲۹۰-۲۹۱؛ زیر آیت (۲/۲۹۱)؛ صفحہ ۲۹۱-۲۹۲؛ زیر آیت (۲/۲۹۲)؛ صفحہ ۲۹۲-۲۹۳؛ زیر آیت (۲/۲۹۳)؛ صفحہ ۲۹۳-۲۹۴؛ زیر آیت (۲/۲۹۴)؛ صفحہ ۲۹۴-۲۹۵؛ زیر آیت (۲/۲۹۵)؛ صفحہ ۲۹۵-۲۹۶؛ زیر آیت (۲/۲۹۶)؛ صفحہ ۲۹۶-۲۹۷؛ زیر آیت (۲/۲۹۷)؛ صفحہ ۲۹۷-۲۹۸؛ زیر آیت (۲/۲۹۸)؛ صفحہ ۲۹۸-۲۹۹؛ زیر آیت (۲/۲۹۹)؛ صفحہ ۲۹۹-۳۰۰؛ زیر آیت (۲/۳۰۰)؛ صفحہ ۳۰۰-۳۰۱؛ زیر آیت (۲/۳۰۱)؛ صفحہ ۳۰۱-۳۰۲؛ زیر آیت (۲/۳۰۲)؛ صفحہ ۳۰۲-۳۰۳؛ زیر آیت (۲/۳۰۳)؛ صفحہ ۳۰۳-۳۰۴؛ زیر آیت (۲/۳۰۴)؛ صفحہ ۳۰۴-۳۰۵؛ زیر آیت (۲/۳۰۵)؛ صفحہ ۳۰۵-۳۰۶؛ زیر آیت (۲/۳۰۶)؛ صفحہ ۳۰۶-۳۰۷؛ زیر آیت (۲/۳۰۷)؛ صفحہ ۳۰۷-۳۰۸؛ زیر آیت (۲/۳۰۸)؛ صفحہ ۳۰۸-۳۰۹؛ زیر آیت (۲/۳۰۹)؛ صفحہ ۳۰۹-۳۱۰؛ زیر آیت (۲/۳۱۰)؛ صفحہ ۳۱۰-۳۱۱؛ زیر آیت (۲/۳۱۱)؛ صفحہ ۳۱۱-۳۱۲؛ زیر آیت (۲/۳۱۲)؛ صفحہ ۳۱۲-۳۱۳؛ زیر آیت (۲/۳۱۳)؛ صفحہ ۳۱۳-۳۱۴؛ زیر آیت (۲/۳۱۴)؛ صفحہ ۳۱۴-۳۱۵؛ زیر آیت (۲/۳۱۵)؛ صفحہ ۳۱۵-۳۱۶؛ زیر آیت (۲/۳۱۶)؛ صفحہ ۳۱۶-۳۱۷؛ زیر آیت (۲/۳۱۷)؛ صفحہ ۳۱۷-۳۱۸؛ زیر آیت (۲/۳۱۸)؛ صفحہ ۳۱۸-۳۱۹؛ زیر آیت (۲/۳۱۹)؛ صفحہ ۳۱۹-۳۲۰؛ زیر آیت (۲/۳۲۰)؛ صفحہ ۳۲۰-۳۲۱؛ زیر آیت (۲/۳۲۱)؛ صفحہ ۳۲۱-۳۲۲؛ زیر آیت (۲/۳۲۲)؛ صفحہ ۳۲۲-۳۲۳؛ زیر آیت (۲/۳۲۳)؛ صفحہ ۳۲۳-۳۲۴؛ زیر آیت (۲/۳۲۴)؛ صفحہ ۳۲۴-۳۲۵؛ زیر آیت (۲/۳۲۵)؛ صفحہ ۳۲۵-۳۲۶؛ زیر آیت (۲/۳۲۶)؛ صفحہ ۳۲۶-۳۲۷؛ زیر آیت (۲/۳۲۷)؛ صفحہ ۳۲۷-۳۲۸؛ زیر آیت (۲/۳۲۸)؛ صفحہ ۳۲۸-۳۲۹؛ زیر آیت (۲/۳۲۹)؛ صفحہ ۳۲۹-۳۳۰؛ زیر آیت (۲/۳۳۰)؛ صفحہ ۳۳۰-۳۳۱؛ زیر آیت (۲/۳۳۱)؛ صفحہ ۳۳۱-۳۳۲؛ زیر آیت (۲/۳۳۲)؛ صفحہ ۳۳۲-۳۳۳؛ زیر آیت (۲/۳۳۳)؛ صفحہ ۳۳۳-۳۳۴؛ زیر آیت (۲/۳۳۴)؛ صفحہ ۳۳۴-۳۳۵؛ زیر آیت (۲/۳۳۵)؛ صفحہ ۳۳۵-۳۳۶؛ زیر آیت (۲/۳۳۶)؛ صفحہ ۳۳۶-۳۳۷؛ زیر آیت (۲/۳۳۷)؛ صفحہ ۳۳۷-۳۳۸؛ زیر آیت (۲/۳۳۸)؛ صفحہ ۳۳۸-۳۳۹؛ زیر آیت (۲/۳۳۹)؛ صفحہ ۳۳۹-۳۴۰؛ زیر آیت (۲/۳۴۰)؛ صفحہ ۳۴۰-۳۴۱؛ زیر آیت (۲/۳۴۱)؛ صفحہ ۳۴۱-۳۴۲؛ زیر آیت (۲/۳۴۲)؛ صفحہ ۳۴۲-۳۴۳؛ زیر آیت (۲/۳۴۳)؛ صفحہ ۳۴۳-۳۴۴؛ زیر آیت (۲/۳۴۴)؛ صفحہ ۳۴۴-۳۴۵؛ زیر آیت (۲/۳۴۵)؛ صفحہ ۳۴۵-۳۴۶؛ زیر آیت (۲/۳۴۶)؛ صفحہ ۳۴۶-۳۴۷؛ زیر آیت (۲/۳۴۷)؛ صفحہ ۳۴۷-۳۴۸؛ زیر آیت (۲/۳۴۸)؛ صفحہ ۳۴۸-۳۴۹؛ زیر آیت (۲/۳۴۹)؛ صفحہ ۳۴۹-۳۵۰؛ زیر آیت (۲/۳۵۰)؛ صفحہ ۳۵۰-۳۵۱؛ زیر آیت (۲/۳۵۱)؛ صفحہ ۳۵۱-۳۵۲؛ زیر آیت (۲/۳۵۲)؛ صفحہ ۳۵۲-۳۵۳؛ زیر آیت (۲/۳۵۳)؛ صفحہ ۳۵۳-۳۵۴؛ زیر آیت (۲/۳۵۴)؛ صفحہ ۳۵۴-۳۵۵؛ زیر آیت (۲/۳۵۵)؛ صفحہ ۳۵۵-۳۵۶؛ زیر آیت (۲/۳۵۶)؛ صفحہ ۳۵۶-۳۵۷؛ زیر آیت (۲/۳۵۷)؛ صفحہ ۳۵۷-۳۵۸؛ زیر آیت (۲/۳۵۸)؛ صفحہ ۳۵۸-۳۵۹؛ زیر آیت (۲/۳۵۹)؛ صفحہ ۳۵۹-۳۶۰؛ زیر آیت (۲/۳۶۰)؛ صفحہ ۳۶۰-۳۶۱؛ زیر آیت (۲/۳۶۱)؛ صفحہ ۳۶۱-۳۶۲؛ زیر آیت (۲/۳۶۲)؛ صفحہ ۳۶۲-۳۶۳؛ زیر آیت (۲/۳۶۳)؛ صفحہ ۳۶۳-۳۶۴؛ زیر آیت (۲/۳۶۴)؛ صفحہ ۳۶۴-۳۶۵؛ زیر آیت (۲/۳۶۵)؛ صفحہ ۳۶۵-۳۶۶؛ زیر آیت (۲/۳۶۶)؛ صفحہ ۳۶۶-۳۶۷؛ زیر آیت (۲/۳۶۷)؛ صفحہ ۳۶۷-۳۶۸؛ زیر آیت (۲/۳۶۸)؛ صفحہ ۳۶۸-۳۶۹؛ زیر آیت (۲/۳۶۹)؛ صفحہ ۳۶۹-۳۷۰؛ زیر آیت (۲/۳۷۰)؛ صفحہ ۳۷۰-۳۷۱؛ زیر آیت (۲/۳۷۱)؛ صفحہ ۳۷۱-۳۷۲؛ زیر آیت (۲/۳۷۲)؛ صفحہ ۳۷۲-۳۷۳؛ زیر آیت (۲/۳۷۳)؛ صفحہ ۳۷۳-۳۷۴؛ زیر آیت (۲/۳۷۴)؛ صفحہ ۳۷۴-۳۷۵؛ زیر آیت (۲/۳۷۵)؛ صفحہ ۳۷۵-۳۷۶؛ زیر آیت (۲/۳۷۶)؛ صفحہ ۳۷۶-۳۷۷؛ زیر آیت (۲/۳۷۷)؛ صفحہ ۳۷۷-۳۷۸؛ زیر آیت (۲/۳۷۸)؛ صفحہ ۳۷۸-۳۷۹؛ زیر آیت (۲/۳۷۹)؛ صفحہ ۳۷۹-۳۸۰؛ زیر آیت (۲/۳۸۰)؛ صفحہ ۳۸۰-۳۸۱؛ زیر آیت (۲/۳۸۱)؛ صفحہ ۳۸۱-۳۸۲؛ زیر آیت (۲/۳۸۲)؛ صفحہ ۳۸۲-۳۸۳؛ زیر آیت (۲/۳۸۳)؛ صفحہ ۳۸۳-۳۸۴؛ زیر آیت (۲/۳۸۴)؛ صفحہ ۳۸۴-۳۸۵؛ زیر آیت (۲/۳۸۵)؛ صفحہ ۳۸۵-۳۸۶؛ زیر آیت (۲/۳۸۶)؛ صفحہ ۳۸۶-۳۸۷؛ زیر آیت (۲/۳۸۷)؛ صفحہ ۳۸۷-۳۸۸؛ زیر آیت (۲/۳۸۸)؛ صفحہ ۳۸۸-۳۸۹؛ زیر آیت (۲/۳۸۹)؛ صفحہ ۳۸۹-۳۹۰؛ زیر آیت (۲/۳۹۰)؛ صفحہ ۳۹۰-۳۹۱؛ زیر آیت (۲/۳۹۱)؛ صفحہ ۳۹۱-۳۹۲؛ زیر آیت (۲/۳۹۲)؛ صفحہ ۳۹۲-۳۹۳؛ زیر آیت (۲/۳۹۳)؛ صفحہ ۳۹۳-۳۹۴؛ زیر آیت (۲/۳۹۴)؛ صفحہ ۳۹۴-۳۹۵؛ زیر آیت (۲/۳۹۵)؛ صفحہ ۳۹۵-۳۹۶؛ زیر آیت (۲/۳۹۶)؛ صفحہ ۳۹۶-۳۹۷؛ زیر آیت (۲/۳۹۷)؛ صفحہ ۳۹۷-۳۹۸؛ زیر آیت (۲/۳۹۸)؛ صفحہ ۳۹۸-۳۹۹؛ زیر آیت (۲/۳۹۹)؛ صفحہ ۳۹۹-۴۰۰؛ زیر آیت (۲/۴۰۰)؛ صفحہ ۴۰۰-۴۰۱؛ زیر آیت (۲/۴۰۱)؛ صفحہ ۴۰۱-۴۰۲؛ زیر آیت (۲/۴۰۲)؛ صفحہ ۴۰۲-۴۰۳؛ زیر آیت (۲/۴۰۳)؛ صفحہ ۴۰۳-۴۰۴؛ زیر آیت (۲/۴۰۴)؛ صفحہ ۴۰۴-۴۰۵؛ زیر آیت (۲/۴۰۵)؛ صفحہ ۴۰۵-۴۰۶؛ زیر آیت (۲/۴۰۶)؛ صفحہ ۴۰۶-۴۰۷؛ زیر آیت (۲/۴۰۷)؛ صفحہ ۴۰۷-۴۰۸؛ زیر آیت (۲/۴۰۸)؛ صفحہ ۴۰۸-۴۰۹؛ زیر آیت (۲/۴۰۹)؛ صفحہ ۴۰۹-۴۱۰؛ زیر آیت (۲/۴۱۰)؛ صفحہ ۴۱۰-۴۱۱؛ زیر آیت (۲/۴۱۱)؛ صفحہ ۴۱۱-۴۱۲؛ زیر آیت (۲/۴۱۲)؛ صفحہ ۴۱۲-۴۱۳؛ زیر آیت (۲/۴۱۳)؛ صفحہ ۴۱۳-۴۱۴؛ زیر آیت (۲/۴۱۴)؛ صفحہ ۴۱۴-۴۱۵؛ زیر آیت (۲/۴۱۵)؛ صفحہ ۴۱۵-۴۱۶؛ زیر آیت (۲/۴۱۶)؛ صفحہ ۴۱۶-۴۱۷؛ زیر آیت (۲/۴۱۷)؛ صفحہ ۴۱۷-۴۱۸؛ زیر آیت (۲/۴۱۸)؛ صفحہ ۴۱۸-۴۱۹؛ زیر آیت (۲/۴۱۹)؛ صفحہ ۴۱۹-۴۲۰؛ زیر آیت (۲/۴۲۰)؛ صفحہ ۴۲۰-۴۲۱؛ زیر آیت (۲/۴۲۱)؛ صفحہ ۴۲۱-۴۲۲؛ زیر آیت (۲/۴۲۲)؛ صفحہ ۴۲۲-۴۲۳؛ زیر آیت (۲/۴۲۳)؛ صفحہ ۴۲۳-۴۲۴؛ زیر آیت (۲/۴۲۴)؛ صفحہ ۴۲۴-۴۲۵؛ زیر آیت (۲/۴۲۵)؛ صفحہ ۴۲۵-۴۲۶؛ زیر آیت (۲/۴۲۶)؛ صفحہ ۴۲۶-۴۲۷؛ زیر آیت (۲/۴۲۷)؛ صفحہ ۴۲۷-۴۲۸؛ زیر آیت (۲/۴۲۸)؛ صفحہ ۴۲۸-۴۲۹؛ زیر آیت (۲/۴۲۹)؛ صفحہ ۴۲۹-۴۳۰؛ زیر آیت (۲/۴۳۰)؛ صفحہ ۴۳۰-۴۳۱؛ زیر آیت (۲/۴۳۱)؛ صفحہ ۴۳۱-۴۳۲؛ زیر آیت (۲/۴۳۲)؛ صفحہ ۴۳۲-۴۳۳؛ زیر آیت (۲/۴۳۳)؛ صفحہ ۴۳۳-۴۳۴؛ زیر آیت (۲/۴۳۴)؛ صفحہ ۴۳۴-۴۳۵؛ زیر آیت (۲/۴۳۵)؛ صفحہ ۴۳۵-۴۳۶؛ زیر آیت (۲/۴۳۶)؛ صفحہ ۴۳۶-۴۳۷؛ زیر آیت (۲/۴۳۷)؛ صفحہ ۴۳۷-۴۳۸؛ زیر آیت (۲/۴۳۸)؛ صفحہ ۴۳۸-۴۳۹؛ زیر آیت (۲/۴۳۹)؛ صفحہ ۴۳۹-۴۴۰؛ زیر آیت (۲/۴۴۰)؛ صفحہ ۴۴۰-۴۴۱؛ زیر آیت (۲/۴۴۱)؛ صفحہ ۴۴۱-۴۴۲؛ زیر آیت (۲/۴۴۲)؛ صفحہ ۴۴۲-۴۴۳؛ زیر آیت (۲/۴۴۳)؛ صفحہ ۴۴۳-۴۴۴؛ زیر آیت (۲/۴۴۴)؛ صفحہ ۴۴۴-۴۴۵؛ زیر آیت (۲/۴۴۵)؛ صفحہ ۴۴۵-۴۴۶؛ زیر آیت (۲/۴۴۶)؛ صفحہ ۴۴۶-۴۴۷؛ زیر آیت (۲/۴۴۷)؛ صفحہ ۴۴۷-۴۴۸؛ زیر آیت (۲/۴۴۸)؛ صفحہ ۴۴۸-۴۴۹؛ زیر آیت (۲/۴۴۹)؛ صفحہ ۴۴۹-۴۵۰؛ زیر آیت (۲/۴۵۰)؛ صفحہ ۴۵۰-۴۵۱؛ زیر آیت (۲/۴۵۱)؛ صفحہ ۴۵۱-۴۵۲؛ زیر آیت (۲/۴۵۲)؛ صفحہ ۴۵۲-۴۵۳؛ زیر آیت (۲/۴۵۳)؛ صفحہ ۴۵۳-۴۵۴؛ زیر آیت (۲/۴۵۴)؛ صفحہ ۴۵۴-۴۵۵؛ زیر آیت (۲/۴۵۵)؛ صفحہ ۴۵۵-۴۵۶؛ زیر آیت (۲/۴۵۶)؛ صفحہ ۴۵۶-۴۵۷؛ زیر آیت (۲/۴۵۷)؛ صفحہ ۴۵۷-۴۵۸؛ زیر آیت (۲/۴۵۸)؛ صفحہ ۴۵۸-۴۵۹؛ زیر آیت (۲/۴۵۹)؛ صفحہ ۴۵۹-۴۶۰؛ زیر آیت (۲/۴۶۰)؛ صفحہ ۴۶۰-۴۶۱؛ زیر آیت (۲/۴۶۱)؛ صفحہ ۴۶۱-۴۶۲؛ زیر آیت (۲/۴۶۲)؛ صفحہ ۴۶۲-۴۶۳؛ زیر آیت (۲/۴۶۳)؛ صفحہ ۴۶۳-۴۶۴؛ زیر آیت (۲/۴۶۴)؛ صفحہ ۴۶۴-۴۶۵؛ زیر آیت (۲/۴۶۵)؛ صفحہ ۴۶۵-۴۶۶؛ زیر آیت (۲/۴۶۶)؛ صفحہ ۴۶۶-۴۶۷؛ زیر آیت (۲/۴۶۷)؛ صفحہ ۴۶۷-۴۶۸؛ زیر آیت (۲/۴۶۸)؛ صفحہ ۴۶۸-۴۶۹؛ زیر آیت (۲/۴۶۹)؛ صفحہ ۴۶۹-۴۷۰؛ زیر آیت (۲/۴۷۰)؛ صفحہ ۴۷۰-۴۷۱؛ زیر آیت (۲/۴۷۱)؛ صفحہ ۴۷۱-۴۷۲؛ زیر آیت (۲/۴۷۲)؛ صفحہ ۴۷۲-۴۷۳؛ زیر آیت (۲/۴۷۳)؛ صفحہ ۴۷۳-۴۷۴؛ زیر آیت (۲/۴۷۴)؛ صفحہ ۴۷۴-۴۷۵؛ زیر آیت (۲/۴۷۵)؛ صفحہ ۴۷۵-۴۷۶؛ زیر آیت (۲/۴۷۶)؛ صفحہ ۴۷۶-۴۷۷؛ زیر آیت (۲/۴۷۷)؛ صفحہ ۴۷۷-۴۷۸؛ زیر آیت (۲/۴۷۸)؛ صفحہ ۴۷۸-۴۷۹؛ زیر آیت (۲/۴۷۹)؛ صفحہ ۴۷۹-۴۸۰؛ زیر آیت (۲/۴۸۰)؛ صفحہ ۴۸۰-۴۸۱؛ زیر آیت (۲/۴۸۱)؛ صفحہ ۴۸۱-۴۸۲؛ زیر آیت (۲/۴۸۲)؛ صفحہ ۴۸۲-۴۸۳؛ زیر آیت (۲/۴۸۳)؛ صفحہ ۴۸۳-۴۸۴؛ زیر آیت (۲/۴۸۴)؛ صفحہ ۴۸۴-۴۸۵؛ زیر آیت (۲/۴۸۵)؛ صفحہ ۴۸۵-۴۸۶؛ زیر آیت (۲/۴۸۶)؛ صفحہ ۴۸۶-۴۸۷؛ زیر آیت (۲/۴۸۷)؛ صفحہ ۴۸۷-۴۸۸؛ زیر آیت (۲/۴۸۸)؛ صفحہ ۴۸۸-۴۸۹؛ زیر آیت (۲/۴۸۹)؛ صفحہ ۴۸۹-۴۹۰؛ زیر آیت (۲/۴۹۰)؛ صفحہ ۴۹۰-۴۹۱؛ زیر آیت (۲/۴۹۱)؛ صفحہ ۴۹۱-۴۹۲؛ زیر آیت (۲/۴۹۲)؛ صفحہ ۴۹۲-۴۹۳؛ زیر آیت (۲/۴۹۳)؛ صفحہ ۴۹۳-۴۹۴؛ زیر آیت (۲/۴۹۴)؛ صفحہ ۴۹۴-۴۹۵؛ زیر آیت (۲/۴۹۵)؛ صفحہ ۴۹۵-۴۹۶؛ زیر آیت (۲/۴۹۶)؛ صفحہ ۴۹۶-۴۹۷؛ زیر آیت (۲/۴۹۷)؛ صفحہ ۴۹۷-۴۹۸؛ زیر آیت (۲/۴۹۸)؛ صفحہ ۴۹۸-۴۹۹؛ زیر آیت (۲/۴۹۹)؛ صفحہ ۴۹۹-۵۰۰؛ زیر آیت (۲/۵۰۰)؛ صفحہ ۵۰۰-۵۰۱؛ زیر آیت (۲/۵۰۱)؛ صفحہ ۵۰۱-۵۰۲؛ زیر آیت (۲/۵۰۲)؛ صفحہ ۵۰۲-۵۰۳؛ زیر آیت (۲/۵۰۳)؛ صفحہ ۵۰۳-۵۰۴؛ زیر آیت (۲/۵۰۴)؛ صفحہ ۵۰۴-۵۰۵؛ زیر آیت (۲/۵۰۵)؛ صفحہ ۵۰۵-۵۰۶؛ زیر آیت (۲/۵۰۶)؛ صفحہ ۵۰۶-۵۰۷؛ زیر آیت (۲/۵۰۷)؛ صفحہ ۵۰۷-۵۰۸؛ زیر آیت (۲/۵۰۸)؛ صفحہ ۵۰۸-۵۰۹؛ زیر آیت (۲/۵۰۹)؛ صفحہ ۵۰۹-۵۱۰؛ زیر آیت (۲/۵۱۰)؛ صفحہ ۵۱۰-۵۱۱؛ زیر آیت (۲/۵۱۱)؛ صفحہ ۵۱۱-۵۱۲؛ زیر آیت (۲/۵۱۲)؛ صفحہ ۵۱۲-۵۱۳؛ زیر آیت (۲/۵۱۳)؛ صفحہ ۵۱۳-۵۱۴؛ زیر آیت (۲/۵۱۴)؛ صفحہ ۵۱۴-۵۱۵؛ زیر آیت (۲/۵۱۵)؛ صفحہ ۵۱۵-۵۱۶؛ زیر آیت (۲/۵۱۶)؛ صفحہ ۵۱۶-۵۱۷؛ زیر آیت (۲/۵۱۷)؛ صفحہ ۵۱۷-۵۱۸؛ زیر آیت (۲/۵۱۸)؛ صفحہ ۵۱۸-۵۱۹؛ زیر آیت (۲/۵۱۹)؛ صفحہ ۵۱۹-۵۲۰؛ زیر آیت (۲/۵۲۰)؛ صفحہ ۵۲۰-۵۲۱؛ زیر آیت (۲/۵۲۱)؛ صفحہ ۵۲۱-۵۲۲؛ زیر آیت (۲/۵۲۲)؛ صفحہ ۵۲۲-۵۲۳؛ زیر آیت (۲/۵۲۳)؛ صفحہ ۵۲۳-۵۲۴؛ زیر آیت (۲/۵۲۴)؛ صفحہ ۵۲۴-۵۲۵؛ زیر آیت (۲/۵۲۵)؛ صفحہ ۵۲۵-۵۲۶؛ زیر آیت (۲/۵۲۶)؛ صفحہ ۵۲۶-۵۲۷؛ زیر آیت (۲/۵۲۷)؛ صفحہ ۵۲۷-۵۲۸؛ زیر آیت (۲/۵۲۸)؛ صفحہ ۵۲۸-۵۲۹؛ زیر آیت (۲/۵۲۹)؛ صفحہ ۵۲۹-۵۳۰؛ زیر آیت (۲/۵۳۰)؛ صفحہ ۵۳۰-۵۳۱؛ زیر آیت (۲/۵۳۱)؛ صفحہ ۵۳۱-۵۳۲؛ زیر آیت (۲/۵۳۲)؛ صفحہ ۵۳۲-۵۳۳؛ زیر آیت (۲/۵۳۳)؛ صفحہ ۵۳۳-۵۳۴؛ زیر آیت (۲/۵۳۴)؛ صفحہ ۵۳۴-۵۳۵؛ زیر آیت (۲/۵۳۵)؛ صفحہ ۵۳۵-۵۳۶؛ زیر آیت (۲/۵۳۶)؛ صفحہ ۵۳۶-۵۳۷؛ زیر آیت (۲/۵۳۷)؛ صفحہ ۵۳۷-۵۳۸؛ زیر آیت (۲/۵۳۸)؛ صفحہ ۵۳۸-۵۳۹؛ زیر آیت (۲/۵۳۹)؛ صفحہ ۵۳۹-۵۴۰؛ زیر آیت (۲/۵۴۰)؛ صفحہ ۵۴۰-۵۴۱؛ زیر آیت (۲/۵۴۱)؛ صفحہ ۵۴۱-۵۴۲؛ زیر آیت (۲/۵۴۲)؛ صفحہ ۵۴۲-۵۴۳؛ زیر آیت (۲/۵۴۳)؛ صفحہ ۵۴۳-۵۴۴؛ زیر آیت (۲/۵۴۴)؛ صفحہ ۵۴۴-۵۴۵؛ زیر آیت (۲/۵۴۵)؛ صفحہ ۵۴۵-۵۴۶؛ زیر آیت (۲/۵۴۶)؛ صفحہ ۵۴۶-۵۴۷؛ زیر آیت (۲/۵۴۷)؛ صفحہ ۵۴۷-۵۴۸؛ زیر آیت (۲/۵۴۸)؛ صفحہ ۵۴۸-۵۴۹؛ زیر آیت (۲/۵۴۹)؛ صفحہ ۵۴۹-۵۵۰؛ زیر آیت (۲/۵۵۰)؛ صفحہ ۵۵۰-۵۵۱؛ زیر آیت (۲/۵۵۱)؛ صفحہ ۵۵۱-۵۵۲؛ زیر آیت (۲/۵۵۲)؛ صفحہ ۵۵۲-۵۵۳؛ زیر آیت (۲/۵۵۳)؛ صفحہ ۵۵۳-۵۵۴؛ زیر آیت (۲/۵۵۴)؛ صفحہ ۵۵۴-۵۵۵؛ زیر آیت (۲/۵۵۵)؛ صفحہ ۵۵۵-۵۵۶؛ زیر آیت (۲/۵۵۶)؛ صفحہ ۵۵۶-۵۵۷؛ زیر آیت (۲/۵۵۷)؛ صفحہ ۵۵۷-۵۵۸؛ زیر آیت (۲/۵۵۸)؛ صفحہ ۵۵۸-۵۵۹؛ زیر آیت (۲/۵۵۹)؛ صفحہ ۵۵۹-۵۶۰؛ زیر آیت (۲/۵۶۰)؛ صفحہ ۵۶۰-۵۶۱؛ زیر آیت (۲/۵۶۱)؛ صفحہ ۵۶۱-۵۶۲؛ زیر آیت (۲/۵۶۲)؛ صفحہ ۵۶۲-۵۶۳؛ زیر آیت (۲/۵۶۳)؛ صفحہ ۵۶۳-۵۶۴؛ زیر آیت (۲/۵۶۴)؛ صفحہ ۵۶۴-۵۶۵؛ زیر آیت (۲/۵۶۵)؛ صفحہ ۵۶۵-۵۶۶؛ زیر آیت (۲/۵۶۶)؛ صفحہ ۵۶۶-۵۶۷؛ زیر آیت (۲/۵۶۷)؛ صفحہ ۵۶۷-۵۶۸؛ زیر آیت (۲/۵۶۸)؛ صفحہ ۵۶۸-۵۶۹؛ زیر آیت (۲/۵۶۹)؛ صفحہ ۵۶۹-۵۷۰؛ زیر آیت (۲/۵۷۰)؛ صفحہ ۵۷۰-۵۷۱؛ زیر آیت (۲/۵۷۱)؛ صفحہ ۵۷۱-۵۷۲؛ زیر آیت (۲/۵۷۲)؛ صفحہ ۵۷۲-۵۷۳؛ زیر آیت (۲/۵۷۳)؛ صفحہ ۵۷۳-۵۷۴؛ زیر آیت (۲/۵۷۴)؛ صفحہ ۵۷۴-۵۷۵؛ زیر آیت (۲/۵۷۵)؛ صفحہ ۵۷۵-۵۷۶؛ زیر آیت (۲/۵۷۶)؛ صفحہ ۵۷۶-۵۷۷؛ زیر آیت (۲/۵۷۷)؛ صفحہ ۵۷۷-۵۷۸؛ زیر آیت (۲/۵۷۸)؛ صفحہ ۵۷۸-۵۷۹؛ زیر آیت (۲/۵۷۹)؛ صفحہ ۵۷۹-۵۸۰؛ زیر آیت (۲/۵۸۰)؛ صفحہ ۵۸۰-۵۸۱؛ زیر آیت (۲/۵۸۱)؛ صفحہ ۵۸۱-۵۸۲؛ زیر آیت (۲/۵۸۲)؛ صفحہ ۵۸۲-۵۸۳؛ زیر آیت (۲/۵۸۳)؛ صفحہ ۵۸۳-۵۸۴؛ زیر آیت (۲/۵۸۴)؛ صفحہ ۵۸۴-۵۸۵؛ زیر آیت (۲/۵۸۵)؛ صفحہ ۵۸۵-۵۸۶؛ زیر آیت (۲/۵۸۶)؛ صفحہ ۵۸۶-۵۸۷؛ زیر آیت (۲/۵۸۷)؛ صفحہ ۵۸۷-۵۸۸؛ زیر آیت (۲/۵۸۸)؛ صفحہ ۵۸۸-۵۸۹؛ زیر آیت (۲/۵۸۹)؛ صفحہ ۵۸۹-۵۹۰؛ زیر آیت (۲/۵۹۰)؛ صفحہ ۵۹۰-۵۹۱؛ زیر آیت (۲/۵۹۱)؛ صفحہ ۵۹۱-۵۹۲؛ زیر آیت (۲/۵۹۲)؛ صفحہ ۵۹۲-

اس کے بعد آیات (۱۲۷-۱۲۸) کو سامنے لائیے :

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا. إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ. رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَمِّرْنَا مِنْ أَسْكَانٍ وَتُبْ عَلَيْنَا. إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ. (۱۲۷-۱۲۸)

ان حسین تمناؤں اور مقدس آرزوؤں کے ساتھ، ابراہیم اور اسماعیل نے اس مرکز نظام خداوندی کی بنیاد رکھی تھی۔ ان کے ہاتھ اس کی تعمیر میں مصروف تھے اور لب پر یہ وجدانگیز دعائیں کہ اسے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہماری ان ناچیز کوششوں کو شرف قبولیت عطا فرما دے کہ تو، دل میں پھلنے والی آرزوؤں کو جاننا اور لب تک آنے والی تمناؤں کو منتا ہے، اس لئے تو خوب جانتا ہے کہ ہم کن ارادوں کے ماتحت اس مرکز کی تعمیر کے لئے کوشاں ہیں۔ اور وہ ارادے اس کے سوا کیا ہیں کہ اس مرکز کے ساتھ وابستہ رہ کر، ہم تیرے منابطہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں اور ہمارے سراسر کے سامنے جھکے رہیں۔ نہ صرف ہم ہی، بلکہ ہماری آنے والی نسلوں میں بھی وہ لوگ پیدا ہوں جو، اسی طرح، تیرے قوانین کی اطاعت کرنے والے ہوں۔

اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہمیں وہ طور طریق بتا دے جن سے ہم اس مقصد عظیم کے حصول میں کامیاب ہو جائیں اور تیری عنایات و انعامات کا رخ ہماری طرف ہے۔ اس لئے کہ تیرا ہی قانون ہے کہ جو نہی کسی نے اُس کی طرف رخ کیا، وہ اپنے سامان رحمت و ربوبیت کو لئے، خود اُس کی طرف بڑھ آیا۔ (۱۲۷)

اس کے بعد ان حسین آرزوؤں کے مقطع کا بند جس میں بتایا گیا ہے کہ وحدتِ انسانیہ کے اس مرکز (کعبہ) کے لئے وادی حجاز کا انتخاب کیوں عمل میں لایا گیا تھا۔ اور اس مقصد کے لئے نیکو انتخاب حضرت اسماعیلؑ پر کیوں پڑی تھی۔ دعا مانگی کہ :-

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ. إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ. (۱۲۹)

اے ہمارے پروردگار! ہماری اولاد میں یہ سلسلہ اسی طرح قائم ہے، تا آنکہ اُن میں سے، اس دعوتِ انقلاب

کوئے کر، وہ رسول اکھ کھڑا ہو جو تیرے ضابطہ قوانین کو اُس کی آخری اور مکمل شکل میں اُن کے سامنے پیش کر دے (۱۳۰)۔ انہیں اس ضابطہ (کتاب) کی تعلیم بھی دے، اور یہ بھی بتائے کہ ان قوانین کی غرض و غایت کیا ہے اور ان پر عمل کرنے سے کیا نتائج مرتب ہوں گے (۱۳۱ ذ ۱۳۲ ذ ۱۳۳ ذ ۱۳۴ ذ) اور (صرف نظری طور پر ہی تعلیم نہ دے بلکہ عملاً ایسا نظام متشکل کر دے جس میں لوگوں کی صلاحیتوں کی برومندگی اور اُن کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے۔

اس قسم کی نشوونما، قوت اور حکمت، دونوں کے امتزاج سے ہو سکتی ہے، اور ان دونوں کا امتزاج

تیرے متعین کردہ نظام ہی کے اندر ممکن ہے۔ (۱۳۵)

حضور نبی اکرمؐ کی ان خصوصیات یا مناصب رسالت کا ذکر (۱۳۵ ذ ۱۳۶ ذ ۱۳۷ ذ) میں بھی آیا ہے حضورؐ کے فرضیہ تزکیہ کی تشریح، جلد دوم صفحہ ۲۵۵ زیر آیت (۱۳۲) بیان کی جا چکی ہے۔

یہ عقائد نظام جس کی ابتدا حضرت ابراہیمؑ نے کی اور حضور نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں تکمیل تک پہنچا۔ اسی کو مسکب ابراہیمی (ملت ابراہیمی) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس مسکب کے متعلق کہا کہ :-

وَمَنْ يَّرْغَبْ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ - وَلَقَدْ

۲
۱۳۰

اصْطَفٰیہٗ فِی الدُّنْیَا - وَآتٰہٗ فِی الْاٰخِرَةِ لِمَنِ الصَّلٰحٰتِ (۱۳۱)
عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اس قسم کے مسکب سے اعراض وہی برت سکتا ہے جو اپنے آپ کو بوقوف بنائے۔ سفاہت کے معنی حماقت بھی ہیں لیکن یہاں جو مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ۔ کہا تو اس سے فکر کا رخ کسی اور سمت کو مڑ جاتا ہے۔ قرآنی نقطہ نگاہ سے انسانی زندگی کا منہ ہی کیا ہے؟ انسانی ذات کی نشوونما تاکہ یہ اس دنیا میں بھی کامیابی اور کامرانی کی زندگی بسر کر سکے اور اس کے بعد مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی ہو جائے۔ آسمانی رشد و ہدایت اور اس کے مطابق انسانی معاشرہ کی تشکیل کے لئے نظام خداوندی (الدین) کی غرض و غایت یہی ہے اسی کے لئے حضور نبی اکرمؐ کا فرضیہ (میز کسبہ) بتایا گیا ہے۔ مسکب ابراہیمی کے اتباع سے یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس مسکب کو وہی اختیار کر لیا جو اپنی ذات کی قدر و قیمت جانتا ہو۔ جو اس کی نشوونما کی اہمیت کا پورا پورا احساس رکھتا ہو۔ جو اس کی اہمیت کا احساس نہ کرے، اس کی

انسانی ذات کو درخور اعتناء نہ سمجھنا

درخور اعتناء نہ سمجھے جس توجہ کی یہ مستحق ہے اسے وہ توجہ نہ دے، تو وہ اس مسکب سے برگشتگی اختیار کر لیا۔ مَنْ

سَفِهَ نَفْسَهُ کے یہی معنی ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ ان دو لفظوں میں قرآن کریم انسانی زندگی کے متعلق دوزوایہ نگاہ کو کس بلخ انداز سے سامنے لایا ہے۔ انسانی ذات کو درخور اعتناء سمجھنے والوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) سیکولر نظریہ حیات کے قائل جن کے نزدیک انسان عبارت ہے اس کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) سے، اور بس۔ جب وہ انسانی ذات کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے تو اس کے درخور توجہ قرار دینے کا سوال کہاں پیدا ہوگا؟

(۲) مذہبی پیشوائیت کے سامنے بھی انسانی ذات کا سوال نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک چند احکام کی میکانیکی اطاعت سے اسلام کا منشاء پورا ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان کو عذاب جہنم سے نجات مل جاتی ہے۔ اگر اس میں کچھ کسر رہ جاتے تو اسے خدا کی بخشش یا شفاعت پورا کر دیتی ہے۔

(۳) ارباب طریقت کے متعلق عام تصور یہ ہے کہ ان کی نگاہ تزکیہ نفس پر ہوتی ہے۔ لیکن تزکیہ نفس سے ان کی مراد انسانی ذات کی نشوونما نہیں، بلکہ اسے فنا کر دینا ہے۔ اس دنیا میں ترکِ علاق سے اور آخرت میں ذاتِ خداوندی میں جذب ہو جانے سے۔ (تفصیل اس کی جلد اول صفحہ ۲۵۷ - آیت ۱/۵ ; صفحہ ۳۵۱ - آیت ۲۸/۲۸ جلد دوم صفحہ ۲۰۱ آیت ۲۱/۲۱ میں ملے گی)۔

لہذا ان میں سے کوئی بھی مسلک ابراہیمی کا متبع نہیں ہو سکتا۔ اس کا اتباع وہی کرے گا جو نظامِ خداوندی کے تحت زندگی بسر کرنے سے اپنی ذات کی نشوونما کی کوشش کرے۔ اس مسلک کی بنیاد رکھنے والے (حضرت ابراہیمؑ) کی خصوصیت یہ تھی کہ ذَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا. وَابْنَهُ فِي الْآخِرَةِ لَمَنِ الصَّالِحِينَ۔ (یوسف) اُس کی اس دنیا کی زندگی بھی برگزیدہ تھی اور آخرت میں بھی اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جو اس بلند و بالا زندگی بسر کرنے کی صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے ہوں گے۔ (نیز دیکھیے ۱۲۲-۱۲۰)۔ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً۔ (دنیاوی خوشگوار یوں اور سرفراز یوں) کی تفصیل تو طولِ طویل ہے لیکن قرآن کریم نے اس کے ماحصل کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کر دیا کہ وَاتَّيْنَاهُم مَّلَكًا عَظِيمًا۔ (۲۴/۲۴)۔ انہیں ایک عظیم مملکت عطا کی تھی۔ دوسری جگہ ہے کہ وَهُوَ اَوْلٰى الْاَيْدِي وَالْاَبْصَارِ تَحْتَهُ (۲۵/۲۵)۔ یعنی انہیں قوت اور بصیرت دونوں حاصل تھیں۔

یہ برگزیدگی اور مقام بلند کس طرح حاصل ہوا، اسے بھی قرآن کریم نے اپنے مخصوص و منفرد انداز کے مطابق نہایت مختصر لیکن جامع شکل میں بیان کر دیا جب کہا کہ :-

اِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ۔ (۲۶/۲۶)

جب اُس کے نشوونما دینے والے نے اس سے کہا کہ تم قوانینِ خداوندی کے سامنے جھک جاؤ (ان کی اطاعت اختیار کرو) تو وہ نہایت خندہ پیشانی سے لَبَّيْكَ! اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ! کہتے ہوئے ان کے سامنے جھک گیا۔ ان احکام کی غرض و غایت کیا تھی؟ ربوبیتِ عالمینی۔ عالمگیر انسانیت کی نشوونما۔ (ربوبیتِ عالمینی کی تفصیل، جلد اول صفحہ ۱۸-۱۹ آیت (۱) میں گزر چکی ہے۔)

یہاں تک بات حضرت ابراہیمؑ کی ذات تک محدود تھی۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ان کے بعد اس نظام کے جاری رہنے کی کیا صورت تھی۔ ہم سابقہ صفحات میں آیت (۱۴۴) کے تحت دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ پر اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ نظام اور اس کی رُو سے حاصل ہونے والی خوشگواریاں اور سرفرازیاں دراثاً منتقل نہیں ہو جائیں گی۔ ہرنسل کو اپنی سعی و کوشش سے انہیں حاصل کرنا ہوگا۔ اس کے لئے :-

وَوَصَّي بِهَا اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهٖ وَيَعْقُوْبُ . يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰ لَكُمْ
الدِّينَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ - (۱۴۴)

ابراہیمؑ خود بھی اس ملک پر کاربند رہا اور اپنے بیٹوں کو بھی اس پر کاربند رہنے کی تلقین و تاکید کی۔ اسی طرح (ان یہودیوں کے جدِ امجد۔ اسرائیل یعنی یعقوبؑ نے بھی اسی ملک کی تاکید کی اور اپنی اولاد سے کہا کہ یہی وہ نظام ہے جسے خدا نے تمہارے لئے منتخب کیا ہے۔ لیکن اس ملک کی پابندی کوئی ہنگامی یا وقتی بات نہیں۔ یہ تو تمہاری ساری زندگی کا شعار ہونا چاہیے۔ تمہیں آخری سانس تک ان قوانین کی اطاعت کرنی ہوگی۔

اس آیت کا آخری محو ا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان کی طبعی زندگی کا انحصار سانس لینے پر ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم نے ایک بار سانس ... لیا یا کبھی کبھی سانس لے لیا تو اس سے زندگی برقرار رہے گی۔ یہ تو اسلام، عمر بھر کا پروگرام ہے | زندگی بھر کا عملِ پیہم اور شعارِ مسلسل ہے۔ جوہی اس سے انقطاع ہوا، زندگی ختم ہوگئی۔ طبعی زندگی کی طرح انسان کی "انسانی زندگی" کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یہ حیات اور شعارِ ایسا نہیں کہ اسے جب جی چاہا اختیار کر لیا اور جب جی چاہا چھوڑ دیا۔ اسے تو مسلسل اختیار کئے رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے استقامت شرط ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبَّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَنْزِلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ (البقرہ ۱۹۶)۔ جن لوگوں نے اس حقیقت کا اقرار اعلان کر دیا کہ ہمارا رب صرف اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار و اعلان پر جم کر کھڑے ہو گئے، تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے، یعنی دعوائے ایمان کے بعد استقامت بنیادی شرط ہے۔ یہ ہے فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ - ساری عمر مسلم رہنے سے مراد۔

اس کے بعد قرآن کریم بالواسطہ یہودیوں کو مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تمہارے اسلاف کا مسلک۔ اس کے برعکس، تم اس عقیدہ پر جیسے بیٹھے ہو کہ تمہیں دنیا کی تمام خوشگواریاں اور عاقبت کی شادابیاں محض اس لئے مل جائیں گی کہ تم اُن برگزیدہ ہستیوں کی اولاد ہو! یہ عقیدہ یکسر باطل ہے جس کی تمہارے پاس کوئی سند نہیں ہو سکتی۔ وہ اُن سے کہتا ہے کہ:-

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيۙ . قَالُوْا نَعْبُدُ الْهٰكُ وَالِهَ الْبٰطِلِ اِۤبْرٰهٖمَ .

۲
۱۳۳

وَاسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ الْهٰٓا وَاَحَدًا وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ . (۲/۱۳۳)

کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے مورث اعلیٰ (حضرت یعقوبؑ) نے (جن کے لقب، اسرائیل کی نسبت سے تم اپنے آپ کو بنی اسرائیل کہتے ہو) مرتے وقت اپنی اولاد کو کیا وصیت کی تھی؟ تمہیں معلوم نہ ہو تو آؤ ہم تمہیں بتائیں۔ اس نے ان سے پوچھا تھا کہ تم میرے بعد کس کی محکومیت (عبدیت) اختیار کرو گے؟ انہوں نے جواب میں کہا تھا کہ ہم اسی خدا کے قوانین کی اطاعت کریں گے جس کی اطاعت ہمارے آبا و اجداد۔ ابراہیمؑ، اسمعیلؑ، اسحاقؑ کرتے رہے ہیں اور جس کی محکومیت خود آپ نے اختیار کی تھی۔ وہی ایک صاحبِ اقتدار ایسا ہے جس کی محکومیت اختیار کرنا وجہ شرفِ انسانیت ہے۔ ہم اس کے قوانین کے سامنے سر تسلیم خم کریں گے اور اسی طرح اس نظام کو مسلسل مستحکم بنائیں گے جسے انہوں نے قائم کیا تھا۔ اس کے بعد کہا:-

رَتَلْتَ اٰمَةً قَدْ خَلَتْ . لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ . وَلَا تَسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ . (۲/۱۳۴)

۲
۱۳۴

یہودیوں سے کہا کہ یہ ہیں تمہارے اسلاف جن میں سے ہر ایک نے قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کی اور اس طرح وہ نوازشاتِ خداوندی کے سزاوار قرار پائے۔ لیکن تم ہو جو یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ محض ان کی نسل میں ہونے کی بنا پر تم ان تمام خوشگوار یوں سے بہرہ یاب ہو جاؤ گے جو تمہارے اجداد و اسلاف کو ان کے حسنِ عمل کے نتیجہ میں ملی تھیں، یا درکھو! ہر فرد کے لئے اس کے اپنے اعمال کے نتائج ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ باپ کے حسنِ عمل کے نتائج بیٹے کو وراثتاً مل جائیں، چہ جائیکہ کسی قوم کے صدیوں پہلے گزرے ہوئے اسلاف کے اعمال کے نتائج ان کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوتے جائیں اور یہ سلسلہ قیامت جاری رہے۔ قطعاً نہیں۔ یہ محض خوش فہمی اور فریبِ نفس ہے۔ جو کچھ انہوں نے کیا اس کے ثمرات ان کے لئے تھے، جو کچھ تم کرو گے اس کے نتائج تمہارے لئے ہوں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ظہورِ نتائج کے وقت تم سے پوچھا جائے کہ تمہارا سلاف

ہر ایک کے اپنے اعمال

کے اعمال کس قسم کے تھے، اور جب تم ان کے اعمالِ حسنہ کی تفصیل بتاؤ تو کہا جاتے کہ جاؤ۔ ان کے حسنِ عمل کے ثمرات و برکات کے تم حقدار ہو۔ ان سے بہرہ یاب ہو جاؤ۔ ایسا سمجھنا خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے عکسِ خلاف ہے۔ وہ لوگ اپنے اعمال اپنے ساتھ لے کر دنیا سے گزر گئے۔ ان کا بدلہ انہیں ملے گا۔ تمہارے اعمال کے نتائج تمہارے سامنے آئیں گے۔ تم سے پوچھا تک نہیں جائے گا کہ تم کس کی اولاد ہو اور تمہارے اسلاف نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے تھے۔

اس آیتِ جلیلہ میں قوموں کے عروج و زوال سے متعلق ایک عظیم بنیادی اصول بتایا گیا ہے۔ زندہ قوموں کی ہر نئی نسل اپنے اسلاف کے عملی سرمایہ کو لے کر، اپنی سعی و کوشش سے ان کے قائم کردہ نظام کو آگے بڑھاتی ہے اور یوں، اس تسلسلِ سعی و کوشش سے، وہ ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی اور بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی ہے لیکن جب کسی قوم کی قوتِ عمل مغلوج ہو جاتی ہے تو وہ خود کچھ نہیں کرتی اور اپنے اسلاف کے درخشندہ کارناموں کو گننا گنا، اور اچھا اچھا کر اپنے آپ کو اطمینان (یعنی فریب) دے لیتی ہے کہ وہ دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں۔ وہ فخر یہ کہتی ہے کہ یہ قومیں جو آج آگے بڑھ رہی ہیں، انہوں نے یہ سب کچھ تمہارے ہی اسلاف سے لیا ہے۔

آج ہماری حالت ایسی ہو چکی ہے جب ہم سے کہا جاتا ہے کہ دیکھو! اقوامِ مغرب نے علم و ہنر اور تسخیرِ فطرت میں کس قدر ترقی کی ہے اور وہ کس طرح مصافِ زندگی میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں، تو بجا ہے اس کے ہم اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنی پستی سے نکلنے کی کوشش کریں، ہمارا جواب یہ ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے آج اس قدر ترقی کر لی ہے تو پھر کیا ہوا؟ ہمارے اسلاف نے ان سے بھی کہیں بڑھ کر تحقیقات کی تھیں۔ ان کی ترقی انہی کی تحقیقات کی رہیں منت ہے اور اس جواب سے ہم اپنے آنا (EGO) کی تسکین کر لیتے ہیں حالانکہ اس کی حقیقت فریبِ نفس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

اس آیت میں دوسرا اہم اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ تم اس جھگڑے میں مت پڑو کہ تمہارے اسلاف میں سے کون بڑا تھا اور کون چھوٹا۔ کون حق پر تھا اور کون ناحق۔ ہم تم سے یہ پوچھیں گے ہی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ لَا تَسْتَلُونَّ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ ہم یہ پوچھیں گے کہ تم نے کیا کیا تھا؟ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ۔ ان کے اعمال ان کے لئے، تمہارے اعمال تمہارے لئے۔

لیکن مذہب کا تو دار و مدار ہی شخصیتوں پر ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں ساری کشتیں اسلاف کے متعلق ہوتی

رہتی ہیں۔ ہر فرقہ کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے فرقہ کے بانی اور اس کے واژین کو افضل اور انشرف ترین ثابت کر دے۔ ہم ہزار برس سے اسی قسم کی بحثوں میں الجھے چلے آئے ہیں اور خوش ہیں کہ ہم بڑا معرکہ مار رہے ہیں اور کبھی نہیں سمجھتے کہ ہم اسے جس خدا کے "دین" کی بہت بڑی خدمت قرار دیتے ہیں، اس خدا کا ارشاد اور اعلان یہ ہے کہ لَا تَسْتَلُونَا عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ "ہم تم سے ان بزرگوں کے متعلق کچھ نہیں پوچھیں گے۔ اگر خدا کا یہ ارشاد ہمارے سامنے ہو تو یہ سارے فرقہ دارانہ نزاعات بحث و تحیص، مناظرے اور مجادلے، جنگ و جمل سب ختم ہو جائیں۔ ان جھگڑوں سے تو مترشح ہوتا ہے گویا ہم کہہ رہے ہوں کہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا نے ایسا کہہ دیا ہے کہ ہم تم سے تمہارے بزرگوں کے متعلق کچھ نہیں پوچھیں گے لیکن یہ (معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ) ہمیں دھوکے میں رکھنے کے لئے ہے۔ وہاں سب سے پہلا سوال یہی ہو گا کہ فلاں بزرگ کے متعلق تمہارا عقیدہ کیا ہے۔ اس لئے ہمیں اس سوال کے جواب کے لئے پوری طرح تیاری کر کے خدا کے سامنے جانا چاہیے۔

یاد رکھیے۔ اس قسم کے خیالات اور معتقدات، قوم کو عالم کردار سے ہگیا نہ رکھنے کی سازشیں ہیں۔ قرآن کریم

نوع انسان کو شخصیت پرستی کے طوق و سلاسل سے آزاد کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس لئے وہ ہر شخص سے اس کے جوہر ذاتی کے متعلق پوچھتا ہے، اضافی نسبتوں کے متعلق نہیں۔

آپ نے دیکھا کہ اس ایک اصول کی رو سے، وہ انسان کو کس کس قسم کی غلامیوں کے پھندے سے آزادی دلا دیتا ہے؟ اس نے شخصیت پرستی کی غلامی کی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ لیکن ہم نے بعد میں زنجیروں کے انہی ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے اپنی مڑگان عقیدت سے اکٹھا کیا اور اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ سخت زنجیروں میں جکڑ لیا۔

خدا ایں سخت جان را یار بادا کہ افتاد است از بام بلبند

(۱۰)

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، خدا کی طرف سے تمام انبیاء کو دین ایک ہی ملا تھا۔ وہ دین اللہ تھا۔ یعنی

خدا کا عطا کردہ الدین۔ اسے پھر سن رکھیے کہ قرآن کریم نے الدین (اسلام) کو دین اللہ (۱۱) دیکر مقامات،

اللہ کا دین — کہا ہے۔ اس کی نسبت (اور تو اور) کسی رسول کی طرف

بھی نہیں کی۔ رسول خدا کے دین کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے آتے تھے۔ وہ کوئی اپنا دین نہیں لاتے تھے لیکن جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو ہر مذہب کی نسبت اس کے بانی کی طرف ہو جاتی ہے۔ مذہب پر طبقہ

دین اللہ

اس کی اولین نسبت، اس شخصیت کی طرف کر دیتا ہے جسے وہ بزعم خویش اس کا بانی قرار دیتا ہے حالانکہ رسول کسی مذہب کے بانی نہیں ہوتے تھے (وہ مذہب لاتے ہی نہیں تھے اس لئے اس کے بانی کیسے ہو سکتے تھے۔ وہ دین لاتے تھے اور چونکہ دین خدا کا عطا کردہ ہونا تھا اس لئے وہ اس دین کے بھی بانی نہیں ہوتے تھے۔) اس طرح مختلف مذاہب آپس میں ٹکراتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد، ایک ہی مذہب میں مختلف فرقے پیدا ہو جاتے ہیں جن میں سے ہر فرقہ کی نسبت اس کے بانی (حقیقی یا منزعومہ) کی طرف کی جاتی ہے اور یوں ان فرقوں میں سرسچٹل ہوتی رہتی ہے۔ یہودی مذہب، اور عیسائی مذہب، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے لئے ہوئے دین خداوندی کی محرف شکلیں تھیں۔ یہ دونوں حضرت ابراہیمؑ کو اپنا مورث اعلیٰ قرار دیتے تھے (حضرت عیسیٰؑ بھی بنی اسرائیل ہی سے متعلق تھے)۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ دین خداوندی کی دعوت دیتے تھے اور ان کی اسی دعوت (ملت ابراہیمی) کی طرف، رسول اللہ (قرآن کریم کے ذریعے) یہود و نصاریٰ کو بلا رہے تھے۔ لیکن وہ کہتے تھے کہ:-

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى تَهْتَدُوا. قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ
حَنِيفًا. وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ. (۲۵)

یہ کہتے ہیں کہ تم مذہب یہودیت یا مذہب عیسائیت اختیار کرو تو سمجھا جائے گا کہ تم سیدھے راستے پر چل رہے ہو۔ ان کے کہا کہ یہ تمہاری خود ساختہ گروہ بندیاں ہیں جو تمہارے اپنے وضع کردہ مذہب کی پیدا کردہ ہیں۔ ہدایت، ملت ابراہیمی (دین خداوندی) اختیار کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ (یہودیت اور عیسائیت کی گروہ بندیوں کی تفصیل، جلد دوم صفحہ ۳۵۰۔ زیر آیات ۶۲-۶۱ دی جا چکی ہے)

اس آیت میں، حضرت ابراہیمؑ کی خصوصیت حنیف بتائی گئی ہے اور یہ دین کی اصل و اساس ہے حنیف کے معنی ہوتے ہیں اپنی توجہات کو تمام اطراف سے ہٹا کر، ایک نقطہ، ایک نصب العین، ایک مرکز پر مرکوز کر دینا۔ اپنی توجہ کو ہر دوسری سمت ہٹانا، لا الہ ہے، اور ایک مرکز (دین خداوندی) پر مرکوز کرنا، **حنیف کا مفہوم** | اِلَّا اللّٰہ۔ اسی کو دوسری جگہ کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ سے تعبیر کیا گیا ہے (۲۵۶)۔ ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت ضروری ہے۔ یعنی پہلے ہر غیر خداوندی تصور، نظریہ، عقیدہ، مسلک سے منہ موڑنا، اور جب اس طرح انسانی فکر و نظر کی لوح صاف ہو جائے تو پھر اس پر ایمان باللہ کا نقش ثبت کرنا۔ اگر غیر خداوندی تصورات و نظریات کا ذرا سا شبہ بھی باقی رہ جائے تو یہ شرک ہوگا۔ دین میں شرک کا سایہ تک نہیں رہتا۔ حضرت ابراہیمؑ نے کفر بالطاغوت کی یہ تمام منازل ایک ایک کر کے طے کیں۔ (دیکھئے ۶۹-۷۵) اور جب اس طرح ان تمام اطراف

سے منہ موڑ لیا تو پھر اعلان کیا کہ :-

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ - (۲)

میں ہر غیر خداوندی تصور اور عقیدہ سے ہزار ہو کر، اپنی تمام توجہات کا مرکز صرف اس ذاتِ بے ہمتا کو سمجھتا ہوں جو

جملہ کائنات کو عدم سے وجود میں لائی ہے۔ میں اس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہ ہے میرا مسلک۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ دین اللہ میں شرک کا شائبہ تک نہیں ہوتا، اور جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں توحید باقی نہیں رہتی۔ لہذا ہر مذہب شرک پر مبنی ہوتا ہے۔ مذہب میں فرقے ہوتے ہیں، اور فرقہ بندی قرآن کریم کی رو سے شرک ہے۔ (تفصیل جلد اول صفحہ ۱۷۷، زیر آیت ۲ گزر چکی ہے)۔ لہذا دین میں نہ مختلف مذاہب ہوتے ہیں، نہ فرقے۔ جہاں فرقے ہوں سمجھ لیجئے کہ وہاں نہ دین ہے نہ توحید۔

یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے مذہبی گروہ بندیوں سے ہٹ کر، تمام نوع انسان کو دین کی دعوت دی تھی۔ اس دعوت کا فطری نتیجہ (یا تقاضا) اس حقیقت پر ایمان لانا اور اس کا اعلان کرنا تھا کہ تمام انبیاء کرام خدا کی طرف سے ہی (اور واحد) دین لے کر آئے تھے۔ اور ان کی اس حیثیت (یعنی نبوت و رسالت) میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ امت مسلمہ سے کہا کہ یہودی اور عیسائی تو اپنے اپنے گروہ بندانہ مسلک کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ تم اس مسلک کی دعوت دو کہ :-

قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرٰهٖمَ
وَإِسْمٰعِیْلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ
مُوسٰی وَعِیْسٰی وَمَا أُوتِيَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَبِّهِمْ۔ لَا نَفْرِقُ
بَیْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ - (۳)

۲
۱۳۶

تم ان سے کہو کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ کون سا مسلک ہے جسے اختیار کر کے ہم تمہاری خود ساختہ گروہ بندی اور نسل پرستی سے بلند ہو چکے ہیں۔ وہ مسلک یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس فضا بظہ حیات پر ایمان رکھتے ہیں جو اس نے اس رسول کی وساطت سے ہماری طرف بھیجا ہے۔ (یہ اپنی اصل واساس کی رو سے اسی قسم کا فضا بظہ زندگی ہے جس قسم کا فضا بظہ اس سے پہلے) حضرت ابراہیمؑ و اسمعیلؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ نیز حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف اور دیگر انبیائے بنی اسرائیل بلکہ تمام انبیاء کی طرف نازل ہوا تھا۔ ہم ان تمام حضرات انبیاء کرامؑ

کو ایک ہی سلسلہ کی کڑی سمجھتے ہیں اور منصبِ نبوت کے حامل ہونے کی جہت سے ان میں کسی قسم کا فرق نہیں کرتے۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کرتے، اگرچہ مدارج کے اعتبار سے ان میں فرق ضرور ہے (۳۱)۔ یہ ہے وہ مسلک جس کی رو سے ہم خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں۔ یعنی ان قوانین کی جن میں انسانی آمیزش کا شائبہ تک نہیں۔

اس میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ سابقہ کتابوں پر ایمان کا مطلب کیا ہے۔ اس کی بابت جلد اول ص ۱۴۳ زیر آیت (۴) وضاحت کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ جلد دوم صفحہ ۲۶۵۔ آیت (۲۶) میں بتایا گیا ہے کہ ہر نبی کو خدا کی طرف سے کتاب ملی تھی۔ یہ عقیدہ باطل ہے کہ رسول کتاب کے ساتھ آتا تھا اور نبی بلا کتاب۔ اس آیت میں جن انبیاء کرام کا نام لیا گیا ہے ان میں صحتِ ابراہیمی اور کتابِ موسیٰ اور کتابِ عیسیٰ کا ذکر تو قرآنِ کریم میں آیا ہے۔ باقی انبیاء کی کتابوں کا کوئی ذکر نہیں آیا، لیکن کہا گیا ہے کہ ان کی طرف بھی کتابیں نازل ہوئی تھیں۔ اور ”وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ“ میں جامع طور پر کہہ دیا کہ تمام انبیاء کو کتابیں ملی تھیں۔

اس وضاحت کے بعد کہا کہ:-

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا. وَإِنْ تَوَلَّوْا
فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ. فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ
الْعَلِيمُ. (۲۶)

اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو اس وقت یہ خدا کے متعین کردہ راستے پر گامزن ہونگے۔ اور اگر یہ اس سے اعراض برتیں گے تو ان کا یہ اعراض اس راستے سے الگ ہو جانے کے مرادف ہوگا جس پر حضراتِ انبیاء کرام چلتے آئے ہیں۔ اگر انہوں نے اس راستے سے اعراض برتا تو یہ تمہاری مخالفت سسل کرتے رہیں گے۔ لیکن تمہیں اس کی کوئی پرداہ نہیں کرنی چاہیے۔ ہمارے نظام میں جس کی تم اطاعت کرتے ہو، اتنی قوت ہے کہ وہ تمہیں ان کی ضروریوں سے محفوظ رکھے۔ اس لئے کہ یہ اس خدا کا نظام ہے جو سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔

”فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا“ ایک عظیم حقیقت کی کثاف ہے۔ دنیا میں (کم و بیش) تمام اہل مذاہب خدا کو بھی مانتے ہیں اور حیاتِ آخرت کو بھی۔ لیکن قرآن ان کے اس ایمان کو ایمان

ہی تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ خدا اور آخرت کا جو تصور خود خدا نے (قرآن میں) پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق ایمان حقیقت ایمان کہلا سکتا ہے۔ (ایمان کا مفہوم جلد اول صفحہ ۱۰۷ آیت ۲) میں واضح کیا جا چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ جنہیں اہل کتاب کہہ کر پکارتا ہے، ان سے بھی اسی انداز کے ایمان کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کی وضاحت جلد اول صفحہ ۱۰۷ آیت (۱) اور صفحہ ۱۰۸ آیت (۲) میں آچکی ہے جہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ ”برہم سماجی اسلام“ جسے (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے خاص مصلحتوں کے تحت پیش کیا تھا، قرآنی اسلام کے یکسر خلاف تھا۔

اسلام کا یہ ہمہ گیر تصور تھا جس کے متعلق کہا کہ :-

صِبْغَةَ اللَّهِ - وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عِبْدُونَ - (۱۳۸)

۲
۱۳۸

یہ اللہ کا رنگ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کے رنگ سے زیادہ حسین رنگ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ ہم اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہیں کرتے۔

صِبْغَةَ کے معنی ”رنگنے کا طریق“ ہوتے ہیں۔ پھر اسے خود ”رنگ“ کے معنوں میں بھی استعمال کرنے لگے۔ دین

خداوندی کو صِبْغَةُ - رنگنے کا طریق یا خدا کا رنگ - کہہ کر دین کی غرض و غایت اور

صِبْغَةَ اللَّهِ

منتہی و مقصود کے طول طویل مباحث کو جس حسن ایجاز کے ساتھ ایک لفظ میں سمٹا دیا گیا ہے

یہ قرآن ہی کا اعجاز ہو سکتا تھا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ دین کی غایت اور انسانی زندگی کا منتہا مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کے معنی یہ ہیں کہ اس میں (علیٰ حد بشریت) صفات خداوندی کی نمود ہوتی جائے، یا یوں کہیے کہ اس کی پہچان یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس میں کس حد تک صفات خداوندی منعکس ہوتی ہیں (اس کی تفصیل جلد دوم صفحہ ۲۵۷ زیر آیت (۲) عنوان نفس انسانی میں سامنے آچکی ہے)۔ اسے خدا سے یک رنگی اور ہم آہنگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ نیا رنگ کیا کرتا ہے؟ کپڑے پر کتنے ہی داغ دھبے یا مختلف رنگوں کے نقوش و آثار ہوں، نیا رنگ، اگر وہ گہرا ہے تو ان تمام نقوش و اثرات پر غالب آکر کپڑے کو یک رنگ (یعنی ہموار اور یکساں) کر دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر، جب ذات کی نشوونما ہوتی ہے تو انسانی کردار میں عجیب قسم کی یکسانیت اور ہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے عصر حاضر کی اصطلاح میں متوازن شخصیت (BALANCED PERSONALITY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اس یکسانیت یا متوازنیت کے لئے ضروری ہے کہ کپڑے کو پورے کا پورا اسی رنگ میں ڈبو یا جلے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (۲۸) اے مہمیانِ ایمان! تم دین خداوندی میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اسی کو توحید کہا جائے گا۔ یعنی کپڑے کا یک رنگ ہو جانا اور اس

میں کسی دوسرے رنگ کا شائبہ تک باقی نہ رہنا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ رنگ گہرا بھی ہو اور کچا بھی۔ اگر یہ رنگ پھیکا ہے تو اس سے سابقہ نقوش و آثار صرف دھیمی پڑ جائیں گے، مٹیں گے نہیں اور اگر کچا ہو تو کچھ عرصہ کے بعد یہ نیا رنگ اُڑ جائے گا اور سابقہ داغ دھبے پھر سے ابھر کر سامنے آجائیں گے۔ (صدرِ اقل کے بعد) ہمارے ساتھ یہی ہوا۔ ہم نے اپنے اوپر جو دین کا رنگ چڑھایا، تو وہ پھیکا بھی تھا اور کچا بھی۔ نتیجہ یہ کہ تھوڑے سے عرصہ کے بعد خارجی اثرات سے (جو خاص سازش کے ماتحت پھیلائے گئے تھے) وہ رنگ اڑ گیا اور قبل از اسلام کے داغ دھبے، سب ابھر کر اوپر آ گئے۔ اگر ہماری آنکھیں کھلی ہوتیں (یعنی ہم عقل و بصیرت سے کام لیتے) اور قرآنِ کریم کی روشنی ہمارے سامنے ہوتی، تو ہمیں نظر آ جاتا کہ صبغۃ اللہ باقی نہیں رہا۔ لیکن ہوا وہ جسے قرآنِ کریم نے ان جامع الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ..... (۱۶)۔ ہمارے پست جذبات نے ان باطل نقوش کو اس قدر مرتی اور پرکشش بنا دیا کہ ہم نے اسی فریب نگاہ کو حقیقت سمجھ لیا۔ یہی ہیں وہ نقوش جنہیں ہم صبغۃ اللہ سمجھ کر سینے سے لگائے لگائے پھر رہے ہیں، اور نہیں سمجھتے کہ یہ سب غیر اللہ کے رنگ ہیں۔

عیسائیوں کے ہاں ایک رسم ہے جسے اصطباغ (یا بپتسمہ) کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے بھی وحیِ خداوندی کی رو سے صبغۃ اللہ کا استعارہ پیش کیا تھا۔ اس سے انکی مراد انسانی سیرت کو خدائی رنگ۔۔۔ رنگنا تھا۔ لیکن بعد میں جب وہ رنگ اڑ گیا تو اس اصطباغ۔ (اصطباغ صبغہ) نے بپتسمہ کی رسم اختیار کر لی۔ اس رسم کی رو سے، عیسائی گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے پر رنگ (یا بعض اوقات) ”مقدس پانی“ چھڑک دیتے ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ اس سے اس بچے سے وہ آلائش دھل جاتی ہے جو اس کے اولیں ماں باپ (آدم و حوا) کی لغزش کا نتیجہ تھی اور جسے ہر انسانی بچہ اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ان چھینٹوں سے (عیسائیوں کے عقیدہ کی رو سے) وہ آلائش دور ہو جاتی ہے اور بچہ ”خدا کی بادشاہت“ میں داخل ہونے کا مستحق بن جاتا ہے۔ ہم ان کی اس رسم پر ہنستے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ہم خود کس طرح اسی قسم کے فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ ہم نے بھی تو مذہبی رسوم کے نقوش کو صبغۃ اللہ سمجھ رکھا ہے۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ:-

جزایں کہ پورِ خلیل است و آذری داند

چہ گزمت ز مسلمان نامسلمانے

(اقبال)

(۱)

اس کے بعد یہود و نصاریٰ سے کہا کہ یہ ہے خدا کا صحیح تصور جسے ہم پیش کرتے ہیں:-

قُلْ أَتَحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا أَعْمَالُنَا

۲
۱۳۹

وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ - (۱۳۹)

کہا کہ ان سے کہو کہ کیا اس وضاحت کے بعد بھی تم ہم سے جھگڑتے ہو اور کہتے ہو کہ جب ہم پہلے ہی خدا کو مانتے ہیں تو پھر ہم سے خدا پر ایمان لانے کا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے؟ کہا کہ آؤ! ہم تمہیں بتائیں کہ تمہارے خدا کے ماننے اور ہم سے ماننے میں کیا فرق ہے۔ بنیادی فرق یہ ہے کہ تم اس خدا کو مانتے ہو جس کی ربوبیت، رحمت، ہدایت حتیٰ کہ جنت، نوم بنی اسرائیل تک محدود ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے جلد دوم صفحہ ۳۰۷۔ آیت ۲۰۶-۲۰۷)۔ لیکن ہم جس خدا کو مانتے ہیں وہ رَبُّنَا (ہمارا بھی رب) ہے اور رَبُّكُمْ (تمہارا بھی رب)۔ یعنی ہم خدا کی عالمگیر ربوبیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ (جلد اول صفحہ ۱۰۷۔ آیت ۱)۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ تم خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہودی کہتے ہیں کہ وہ جو کچھ جی میں لے کر میں جنت ان کے لئے ریزِ رُزُو (مختص) ہو چکی ہے۔ (دیکھئے جلد دوم صفحہ ۲۲۹۔ آیت ۸)۔ اور عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اپنی جان دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ (دیکھئے جلد دوم صفحہ ۲۳۹۔ آیت ۸)۔ لیکن ہم یہ مانتے ہیں کہ ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا خود مددگار ہے اور اس کے نتائج اس کے سامنے آکر رہیں گے۔

قطع نظر دیگر امور، تم دیکھو کہ دین کے ان دو بنیادی ستونوں (ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت) کے تمہارے تصور اور ہماری تصویر میں کس قدر فرق ہے۔

(۰)

”وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ“ کا ایک اور مفہوم بھی ہے۔ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۲۷۔ زیر آیت (۲) میں قرآن فہمی کے تین طریقوں کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں پہلا طریقہ تو علم و بصیرت کی رُو سے افہامِ تفہیم کا ہے۔ دوسرا طریقہ استنتاجی ہے یعنی قرآنی نظام کو عملاً متشکل کر کے اس کے نتائج کو اس کے دعوے کی صداقت کے لئے بطور شہادت اور ثبوت پیش کرنا۔ اسی سلسلہ میں نبی اکرمؐ نے اپنے مخالفین سے کہا تھا کہ اگر تم دلائل و براہین سے میرے دعویٰ کی صداقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں تو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہو مجھے اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ کون سا نظام مبنی بر صداقت ہے (۱۳۱)۔ اس مقام پر بھی اسی طریق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جب

استنتاجی طریق

کہا گیا کہ اگر تم اس قدر واضح دلائل کے بعد بھی اپنی ضد پر اڑے بیٹھے ہو تو پھر جاؤ۔ تو اپنے پروگرام پر عمل کرو۔ یہیں اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ ہم خالصتہً اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہیں گے۔

(۱۰)

اس کے بعد ان کے اس دعویٰ کو پھر دہرایا جسے آیت (۱۳۲) میں پیش کیا گیا تھا۔ یعنی :-
أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ
كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ - قُلْ أَعْلَمُ أَعْلَمُ أُمُّ اللَّهِ - وَمَنْ أَظْلَمُ
مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةَ عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ - وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُونَ - (۱۳۲)

۲
۱۳۱

کیا اس کے بعد بھی یہ لوگ یہی کہہ جاتے ہیں کہ ابراہیمؑ، اسمعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور دیگر انبیاء بنی اسرائیلؑ یہودی تھے یا نصرانی؟ ان سے کہو کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں، خدا کی طرف سے عطا شدہ علم (وحی) کی بنا پر کہتے ہیں۔ اور تم یا تو محض قیاسی باتیں کرتے ہو، اور یا حقیقت کو چھپاتے ہو۔ تم خود ہی فیصلہ کرو کہ جو شخص اس بات کو چھپائے جس کا علم اُسے خدا کی طرف سے ملا ہو، اس سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے؟ لیکن تم ہم سے تو یہ باتیں چھپا سکتے ہو، خدا سے کس طرح چھپا سکتے ہو؟ وہ خوب جانتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو اور ایسا کیوں کرتے ہو!

جہاں تک حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کتمانِ حقیقت کا تعلق ہے، دوسرے مقام پر اسے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ تورات اور انجیل تو حضرت ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوئی تھیں۔ لہذا وہ یہودی یا نصرانی کیسے ہو سکتے ہیں (۱۳۲) یہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جو لاکھ پردوں میں چھپائے بھی چھپ نہیں سکتی۔ لہذا اس قسم کے کتمانِ حقیقت سے کیا حاصل؟ (یہودیوں کی کتمانِ حق کی مذموم عادت کے متعلق جلد دوم - صفحہ ۲۰۸ - آیت ۲۴ میں بھی ذکر آچکا ہے)۔

(۱۱)

اس کے بعد پھر آیت (۱۳۳) کو دہرایا گیا :-

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ - لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ - وَلَا

۲
۱۳۱

تَسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ . (۱۱۲)

اس آیت میں جو بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے اس کا قوموں کی موت و حیات سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ اسے جتنی بار بھی سامنے لایا جائے کم ہے۔ اسلاف پرست یا ماضی پرست قوم، شاہراہ حیات پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ایک زندہ قوم کی زندگی میں تسلسل ہونا ہے اور اسی تسلسل کا نام تاریخ ہے۔ اس لئے اس قوم کا اپنی تاریخ سے منقطع ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (تاریخ کی اہمیت کے متعلق جلد دوم ص ۵۷۱۔ زیر آیت ۲ تفصیل سے لکھا جا چکا ہے) لیکن تاریخ کے ساتھ رابطہ اور چیز ہے اور ماضی پرستی اور شے۔ ماضی پرستی، تقلید کا دوسرا نام ہے۔ تقلید کی تباہیوں کے متعلق، جلد اول صفحات ۶۷ و ۶۸ و ۶۹۔ زیر آیات (۱/۱)؛ (۲/۱)؛ (۳/۱) لکھا جا چکا ہے۔ قرآن کریم اس قسم کی آیات کو اس لئے بار بار سامنے لاتا ہے کہ قوم، ماضی پرستی کے فریب میں کھو کر، کشمکش حیات سے گریز کی راہیں نہ تراش لے۔

ماضی پرستی

زمانہ نزول قرآن کریم میں تو یہودیوں کو ماضی پرستی کی تباہ کاریوں کی یاد دلانے کی ضرورت تھی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ان آیات کا اطلاق — بلکہ زیادہ شدت سے اطلاق — خود ہم پر ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے از بس ضروری ہے کہ ہم ان آیات پر غور کر کے سوچیں کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔

اس آیت پر قرآن کریم کا پہلا پارہ ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں پاروں کی تقسیم مضامین کے اعتبار سے نہیں۔ تقسیم حفظ میں آسانی یا حوالوں کے لئے بعد میں اختیار کی گئی تھی۔ چونکہ ہمارے ہاں بالعموم پاروں کے شمار کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے، اس لئے میں نے اس کا ذکر کر دیا ہے کہ اس آیت پر پہلا پارہ ختم ہو جاتا ہے۔

پہلا پارہ ختم

تیسرا باب

مرکزیت — کعبہ

آیات — $\frac{2}{162}$ تا $\frac{2}{152}$

- ۱۔ کعبہ کے مرکز قرار دینے کے خلاف یہودیوں کے اعتراضات۔
- ۲۔ وضعی روایات جو بالبداهت یہودیوں کی تراشیدہ نظر آتی ہیں۔
- ۳۔ امت مسلمہ کی تشکیل اور اس کی خصوصیات کبریٰ۔
- ۴۔ نسل۔ ننگ۔ زبان۔ وطن کی نسبتوں کے بجائے خالص نظریہ کے اشتراک کی بنا پر امت واحدہ۔
- ۵۔ اس امت کا مرکز محسوس کعبہ ہے۔
- ۶۔ یہی ان کا قبلہ ہے۔ یعنی اس مقصد حیات کی محسوس علامت جسے زندگی کے ہر شعبے میں گاہوں کے سامنے رہنا چاہیے۔
- ۷۔ مقصود بالذات اس محسوس مرکز کی معنویت ہے نہ کہ عمارتی خوبصورتی۔



شروع دوسرا پارہ

تیسرا باب

مرکزیت — کعبہ

سابقہ باب میں، معمارِ کعبہ، حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ جلیلہ و جبہ فروغ دیدہ ہوا تھا۔ اب خود کعبہ کی داستان ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام ایک نظامِ حیات کا نام ہے جس کے لاینفک عناصر ترکیبی حسب ذیل ہیں:-

(۱) وحیِ خداوندی پر مشتمل ایک مکمل، غیر متبدل، محفوظ ضابطہ حیات (قرآنِ کریم) جو زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے اور جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء، تمام نوعِ انسان کے لئے شمعِ ہدایت ہے۔

(۲) اس ضابطہ زندگی کی صداقت پر ایمان رکھنے والے افراد پر مشتمل ایک 'امت'، جو نسلی، قومی، وطنی امتیازات سے بلند ہے۔ اس میں کوئی فرقہ نہیں۔ کوئی پارٹی نہیں۔

(۳) اس امت کی ایک مملکت جس میں یہ ضابطہ حیات عملی نظام کی شکل اختیار کرے۔

(۴) اس مملکت کی ایک مرکزی اتھارٹی جو اس نظام کو قرآنی خطوط پر قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کی ذمہ دار ہے۔ اور

(۵) اس مملکت کا ایک محسوس مرکز جسے کعبہ کہا جاتا ہے اور جس کی تاسیس حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی۔

نبی اکرمؐ کی حیاتِ نبویؐ کا پہلا دور (جسے مکتی دور کہا جاتا ہے) اس امت کے ابتدائی بیہولی کی تشکیل کا دور تھا۔ اس زمانہ میں (یوں کہتے کہ) اس نظام کا خمیر تیار ہو رہا تھا۔

قریش مکہ

کعبہ ایک بُت کہہ تھا جس کے متوالی قریش تھے۔ کعبہ کی اس تولیت سے انہیں بڑی امتیازی زندگی حاصل تھی۔ یوں کہتے کہ پوسے عرب کی امامت (لیڈرشپ) انہیں میسر تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جس نظام کا تصور رسول اللہ پیش فرما رہے ہیں، اگر وہ قائم ہو گیا تو کعبہ کی تولیت ان کے ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ اس لئے وہ اس دعوت کے سخت مخالف اور شدید دشمن تھے۔ تیرہ سالہ مکی دور کے بعد، آپ (اور آپ کی جماعت) نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی کیونکہ وہاں کی فضا اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار تھی۔ قریش کو اس کا احساس تھا کہ اگر یہ نظام کسی ایک جگہ بھی قائم ہو گیا تو کعبہ کی تولیت اور اس سے وابستہ مفادات ان کے ہاتھ سے جاتے رہیں گے۔ اس لئے انہوں نے اس کی مخالفت کی سرگرمیاں تیز کر دیں اور ان کی جولانیاں میدان جنگ تک پہنچ گئیں۔ سات سال کی مسلسل لڑائیوں کے بعد آخر الامر مکہ فتح ہوا اور کعبہ (جو پہلے نظری طور پر اس نظام کا مرکز تھا) عملاً اس کی تحویل میں آگیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس مملکت کا دار الخلافہ تو مدینہ ہی رہا لیکن اس نظام کا مرکز کعبہ قرار پایا یہ اس لئے کہ مملکت کے دار الخلافہ کے محلات وقوع (مقامات) تو مختلف مصالح کے تحت بدلے جاسکتے ہیں لیکن اس نظام کی حامل امت کے فکر و نظر کے مرکز کا اپنے مقام پر محکم رہنا ضروری تھا۔ اگر اس کا محل وقوع بھی دار الخلافوں کے ساتھ بدلتا رہتا تو یہ مرکز مقامی بن کر رہ جاتا۔ سابقہ صفحات میں دیکھا جا چکا ہے (زیر آیت ۱۲۵) کہ کعبہ کو عالمگیر انسانیت (الناس) کا مرکز قرار دیا گیا تھا۔ اس کی عالمگیریت کا بھی تقاضا تھا کہ یہ نئے نئے دن اپنے محلات وقوع بدلتا نہ رہے۔

عرب میں اہل کتاب میں سے یہودیوں کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ وہاں کی معیشت ان کے ہاتھ میں تھی۔ اور

مدینہ میں بالخصوص انہیں بڑی قوت حاصل تھی۔ قریش کے علاوہ، یہ بھی اسلامی نظام کے

مدینہ کے یہودی

سخت مخالف تھے۔ اس سے ان کا نظام سرمایہ داری درہم برہم ہو جاتا تھا۔ ان کے

زمانہ عروج میں، یروشلم (بیت المقدس) ان کا دار السلطنت تھا۔ ظہور اسلام کے وقت ان کی سلطنت تو باقی نہیں رہی تھی لیکن یروشلم بدستور ان کی عقیدت مند یوں کا مرکز تھا۔ عیسائیوں کو یہودیوں کے ساتھ سخت عداوت تھی۔

اس لئے کہ ان کے عقیدہ کی رُو سے (یہودیوں نے ان کے نبی (بلکہ خدا کے بیٹے) کو صلیب پر لٹکا دیا تھا۔ جب یروشلم عیسائیوں کے قبضہ میں آیا تو انہوں نے اس میں یہودیوں کے مقدس مقامات (بالخصوص مہکبیل سلیمانی) کی

اینٹ سے اینٹ بجادی، اور ان کے کھنڈرات ان کے دہر عروج کی مرثیہ خوانی کے لئے باقی رہ گئے، اور وہ بھی

اس شکل میں کہ عیسائی وہاں کوڑا کرکٹ پھینکا کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بیت المقدس بدستور یہودیوں کی

عقیدت کا مقدس (نظری) مرکز تھا۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ ایک آنے والا آئے گا اور عیسائیوں کو وہاں

سے نکال کر، بیت المقدس کو پھر سے اس کا حقیقی (بلند) مقام عطا کر دیا۔ اس لئے وہ ہر طریقہ سے اس مقام کی تقدیس، عظمت اور اہمیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

اسلام نے جب انبیائے بنی اسرائیل کی نبوت کی تصدیق اور احترام کو جزو ایمان قرار دیا تو یہودیوں کو خیال ہوا کہ مسلمان بیت المقدس کو اپنی عقیدت کا مرکز (قبلہ) قرار دیں گے، بالخصوص اس لئے کہ کعبہ بیت کدہ بن چکا تھا اور توحید پرست، ایک بتکدہ کو اپنی عقیدت کا مرکز کبھی نہیں بنا سکتے تھے۔ لیکن جب مسلمانوں نے کعبہ ہی کو اپنا قبلہ قرار دیا (حالانکہ وہ اس وقت قریش کے قبضہ میں تھا) تو ان کا یہ فیصلہ ان پر سخت شاق گزرا۔ چنانچہ انہوں نے جھٹ سے اعتراض کر دیا کہ (یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ) انہوں نے بیت المقدس جیسے مقدس اور متبرک مقام کو چھوڑ کر، کعبہ کو قبلہ کیسے قرار دے لیا؟ (قبلہ، یعنی مرکزِ ملت کی اہمیت کے متعلق جلد دوم صفحہ ۲۱۶۔ زیر آیت (۱۱۴) گفتگو ہو چکی ہے۔ نیز میری کتاب معراجِ انسانیت میں قبلہ سے متعلق باب میں) اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ (جیسا کہ جلد دوم صفحہ ۲۰۵ آیات (۱۱۴-۱۱۵) میں بتایا جا چکا ہے) یہودیوں نے دین کو نسلی بنا دیا تھا اس لئے بیت المقدس ان کا قومی مرکز بن کر رہ گیا تھا۔ اور اسلام عالمگیر انسانیت کا دین تھا اس لئے اس کے مرکز کو نسلی، قومی، جغرافیائی نسبتوں سے ماورا رہنا چاہیے تھا۔ یعنی کعبہ کو قبلہ قرار دینے کی حقیقی وجہ، لیکن یہ بات نسل پرست یہودیوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے یہ اعتراض کر دیا۔ اور ان کے اسی اعتراض سے اس داستان کا آغاز ہوتا ہے۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي
كَانُوا عَلَيْهَا. قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ. يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ - (۱۱۴)

۲
۱۴۲

یہ سمجھ بوجھ سے کام نہ لینے والے (یہودی) اعتراض کرتے ہیں کہ جب اہل کتاب کا قبلہ (مرکز) بیت المقدس موجود تھا، تو مسلمانوں نے اس سے روگردانی کر کے، کعبہ کو اپنا مرکز (قبلہ) کیوں قرار دے لیا؟

آگے بڑھنے سے پہلے، یہاں ایک ضمنی نکتہ غور طلب ہے۔ اس آیت میں یہودیوں کو سفہا کہہ کر پکارا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس دین (قرآنی نظام) کی دعوت کیا تھی اور یہودی اس کی مخالفت کیوں کرتے تھے۔ یہ دعوت تھی اُس کعبہ کو مرکز قرار دینے کی جسے ملتِ حنیفہ کے مؤسس (اولیٰ) حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا۔ بالفاظِ دیگر، یہ دعوت تھی ملتِ ابراہیمی کے احیاء کی۔ یہودی اپنی نسبت تو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منور کرتے تھے لیکن وہ تمسک اپنے قومی مرکز ہی سے رکھنا چاہتے تھے۔ بالفاظِ دیگر، وہ ملتِ ابراہیمی

سے اعراض برتتے تھے۔ قرآن کریم نے ملتِ ابراہیمی سے اعراض برتنے کو سفاہت سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ آیت (۱۲۱) میں دیکھا جا چکا ہے۔ وَمَنْ يَرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ اِبْرٰهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ..... یہ وجہ ہے جو یہاں یہودیوں کو سفاہا کہا گیا ہے۔

اس کے بعد آئیے اس اعتراض کی طرف جو یہودیوں کی طرف سے عائد کیا گیا تھا۔ اس اعتراض میں بیت المقدس کی عظمت و اہمیت کو برقرار رکھنے کے علاوہ ایک اور جذبہ بھی کارفرما تھا۔ یہودی بنی اسرائیل (یعنی حضرت اسحقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ) کی اولاد تھے اور عرب (قریش) حضرت اسمعیلؑ کی اولاد۔ بنی اسرائیل کو بنی اسمعیل کے ساتھ مخاصمت بلکہ عداوت شروع سے چلی آرہی تھی۔ اس حسد تک عداوت کہ اگرچہ وہ ایک آنے والے کے نہایت شدت سے منتظر تھے، انہوں نے نبی اکرمؐ کی دعوتِ نبوت سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ آپؐ کا نسب تعلق بنی اسمعیل سے تھا۔ داعیِ اسلام (حنور نبی اکرمؐ) تو ایک طرف وہ جبیل کے بھی اس لئے مخالف ہو گئے تھے کہ وہ بنی اسمعیل کی طرف وحی کیوں لے گیا ہے۔ (جلد دوم صفحہ ۳۸۷۔ آیت ۹۸-۹۷)۔ کعبہ کو مرکز قرار دینے سے (ان کے خیال میں) بنی اسمعیل کو بڑی اہمیت حاصل ہو جاتی تھی۔ وہ اس لئے بھی مسلمانوں کے اس فیصلہ کے خلاف تھے (حالانکہ یہ فیصلہ تو خود خدا کا تھا۔ مسلمانوں کا اپنا نہیں تھا)۔

ان کے اس اعتراض کا جواب، اصولی طور پر، یہ کہہ کر دے دیا کہ بیت المقدس، بنی اسرائیل کا قومی مرکز ہے۔ اور اسلام، تمام بنی نوع انسان کو ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ سوظاہر ہے کہ اس عالمگیر دعوت کا مرکز وہی ہونا چاہیے جو مشرق و مغرب (ساری دنیا) کو محیط ہو، نہ وہ جو کسی خاص نسل یا قوم کا منتہائے نگاہ ہو۔ اسی مقصد کے پیش نظر، خدا نے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، اس امت کی راہ نمائی صحیح راستے کی طرف کر دی، (اس امت کی یہ خصوصیت اگلی آیت میں سامنے آجائے گی)

قرآن کریم نے تو کعبہ کو تمام نوع انسان کے قلب و نگاہ کا نصب العین، اور ان کی مہنیت اجتماعیہ کا مرکز قرار دے کر، قوی مراکز کی اہمیت کو ختم کر دیا، لیکن یہودیوں نے بیت المقدس کی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لئے جو سازش کی وہ بڑی کامیاب رہی۔ یہ سازش تھی جھوٹی روایات وضع کر کے انہیں مسلمانوں کا جزو ایمان بنا دینا۔ چنانچہ تحویل قبلہ (بیت المقدس کی جگہ کعبہ کو قبلہ بنانے)

کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کی معتبر ترین حدیث کی کتابوں میں جو روایات درج ہیں، ان کا ملخص یہ ہے کہ مکہ کی تیرہ سالہ (نبوت کی) زندگی میں حضورؐ، بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ اگرچہ چاہتے ہی تھے

کہ رُخ کعبہ کی طرف کیا جائے۔ اس کے لئے آپؐ نے شکل یہ اختیار کی کہ حرم کعبہ میں نماز کے لئے اس طرح کھڑے ہونے کہ کعبہ بھی سامنے ہے اور بیت المقدس بھی۔ (کعبہ اور بیت المقدس سیدھ میں پڑتے تھے) جب آپؐ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں یہ شکل نباہنا مشکل ہو گیا اس لئے کہ اب بیت المقدس (یروشلم) اور مکہ دو مخالف سمتوں میں پڑتے تھے۔ اگر منہ بیت المقدس کی طرف کرتے تو کعبہ کی طرف پشت ہو جاتی اور اگر منہ کعبہ کی طرف کرتے تو بیت المقدس کی طرف پیٹھ ہو جاتی۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ آپؐ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے، اگرچہ آپؐ اسے دل سے پسند نہیں کرتے تھے۔ قریب سترہ ماہ، اور بعض روایات کی رُوسے، قریب دو سال تک آپؐ اسی بیچ سے نماز ادا کرتے رہے۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے حکم آیا کہ آپؐ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کریں۔ یہ حکم اُس وقت آیا جب آپؐ نماز (ظہر یا عصر) کی امامت فرما رہے تھے اور دو رکعتیں پڑھ چکے تھے حکم آنے پر آپؐ نے اپنا رُخ بدلا اور اس کے ساتھ ہی مقتدیوں نے بھی رُخ بدلا۔ رُخ بدلنے کا نقشہ اس طرح ذہن میں لائیے کہ اگر پہلے منہ شمال کی طرف تھا تو اب منہ جنوب کی طرف کرنا پڑا۔ مقتدیوں نے اپنا رُخ تو کھڑے کھڑے بدل لیا ہوگا لیکن ظاہر ہے کہ امام (حضورؐ) کو مسجد کا نصف چکر کاٹ کر دوسری جانب امامت کے لئے جانا پڑا ہوگا۔ (صمنّا) مدینہ میں ایک مسجد ہے جسے ”مسجد دو قبلتین“ کہا جاتا ہے۔ (یعنی دو قبلوں والی مسجد)۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہ مسجد تھی جس میں یہ واقعہ پیش آیا۔ بہر حال اس طرح، بیت المقدس کی جگہ کعبہ مسلمانوں کا قبلہ قرار پایا۔ (احادیث کے حوالوں ساتھ یہ تمام تفصیل تفسیر ابن کثیر، شروع پارہ دوم میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ابن کثیر نے یہ تفصیل دینے کے بعد لکھا ہے :-

مرفوع حدیث میں ہے کہ یہودیوں کو ہم سے اس بات پر بڑا حسد ہے کہ خدا نے ہم کو جمعہ کے دن کی توفیق دی اور یہ اس سے بھٹک گئے۔ اور اس پر کہ ہمارا قبلہ یہ ہے اور وہ اس سے گمراہ ہو گئے۔ اور بڑا حسد ان کو ہماری آئین کہنے پر بھی ہے جو ہم امام کے پیچھے کہتے ہیں۔

(تفسیر ابن کثیر۔ پارہ دوم۔ اردو ترجمہ مسجد)

یعنی ان احادیث کی رُوسے (جو خود ہماری کتب روایات موجود ہیں) حضورؐ قریب پندرہ سال تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اسی وجہ سے بیت المقدس کو (ہمارے) قبلہ اول کہا جاتا ہے۔ آپؐ نے دیکھا کہ یہودیوں نے کس طرح بیت المقدس کی اہمیت کو ہمارے ایمان کا جزو بنا دیا؟ اس سلسلہ میں معراج کے واقعہ سے متعلق روایات بھی قابل غور ہیں۔

معراج سے متعلق روایات

اس واقعہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے :-

رسول اللہ کو پیغمبری کے منصب پر فائز ہونے تقریباً بارہ سال گزر چکے تھے۔ ۵۲ سال کی عمر تھی۔ حرم کعبہ میں سوئے ہوئے تھے۔ یکایک جبریل فرشتے نے آکر آپ کو جگا دیا۔ نیم خفتہ اور نیم بیداری کی حالت میں آپ کو زمزم کے پاس لے گئے۔ سینہ چاک کیا۔ زمزم کے پانی سے دھویا۔ پھر اسے علم اور بردباری اور ایمان اور یقین سے بھر دیا۔

(مودودی صاحب کا ماہ نامہ ترجمان القرآن - باب ۱۹، ص ۱۹۷)

سب سے پہلے آپ اس ٹکڑے پر غور فرمائیے کہ بارہ سال کی مدت نبوت کے بعد آپ کا سینہ صاف کیا گیا۔ اور اسے علم۔ بردباری۔ دانائی اور ایمان و یقین سے بھرا گیا۔ گویا زمانہ نبوت کے پہلے بارہ سال تک حضور کا سینہ نہ تو (معاذ اللہ) صاف تھا اور نہ ہی اس میں علم، بردباری، دانائی حتیٰ کہ ایمان و یقین تھا۔ (استغفر اللہ) آگے بڑھیے۔

اس کے بعد آپ کی سواری کے لئے ایک جانور پیش کیا گیا جس کا رنگ سفید اور قد گدھے سے بڑا اور نچر سے چھوٹا تھا۔ براق کی رفتار سے چلتا تھا۔ (یہ مختلف منازل طے کرتا ہوا، چوتھی منزل پر پہنچا۔ جہاں بیت المقدس تھا۔ وہاں براق کا سفر ختم ہوا۔ وہاں آپ نے ان تمام انبیاء کو موجود پایا جو ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے پہنچنے ہی نماز کے لئے صفیں بندھ گئیں۔ سب منتظر تھے کہ امامت کیلئے

کون آگے بڑھتا ہے جبریل نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا اور آپ نے سب کو نماز پڑھائی۔ (ایضاً)

یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ جملہ انبیاء کرام کا یہ اجتماع کعبہ میں نہیں ہوا۔ بیت المقدس میں ہوا جہاں حضور کو کعبہ سے اٹھا کر لے جایا گیا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس روایت کی رو سے نہایت لطیف پیرایہ یہی کس طرح کعبہ پر بیت المقدس کی افضلیت ثابت کر دی گئی ہے؟

یہاں یہ کہا گیا ہے کہ حضور نے تمام انبیاء کی امامت کرائی۔ ظاہر ہے کہ ان میں حضرت موسیٰؑ بھی شامل

تھے۔ لیکن یہودی سازش آگے بڑھی اور حضورؐ نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے

نمازیں کیسے فرض ہوئیں | روایت کا باقی حصہ یوں بیاں کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ شب معراج میں —

میں واقعہ معراج کی تفصیل احادیث کے تمام مجموعوں میں درج ہیں۔ لیکن ہم نے انہیں مودودی صاحب کے حوالے سے لکھنا زیادہ مناسب سمجھا ہے۔ کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ صرف ایسی روایات درج کرتے ہیں جنہیں ان کی نگاہ بصیرت صحیح قرار دیتی ہے۔ ویسے بھی انہیں عام طور پر دور جدید کا ”بلند پایہ مفسر“ سمجھا جاتا ہے۔

بارگاہِ خداوندی سے۔

مجھ پر نماز فرض کی گئی۔ یعنی دن اور رات میں پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ پھر میں واپس ہوا اور موسیٰ کے پاس آیا۔ موسیٰ نے پوچھا کہ تم کو کیا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھ کو رات دن میں پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ تمہاری امت رات دن میں پچاس نمازیں ادا کرنے کی قوت نہیں رکھتی۔ خدا کی قسم! میں تم سے پہلے لوگوں کو آزمایا چکا ہوں اور بنی اسرائیل کی اصلاح اور معالجہ میں کافی کوشش کر چکا ہوں لیکن وہ اصلاح پذیر نہ ہوئے۔ تم اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ اور امت کے لئے تخفیف چاہو۔ چنانچہ میں پھر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوا اور دس نمازیں کم کر دی گئیں۔ میں پھر موسیٰ کے پاس آیا اور انہوں نے پھر یہی کہا۔ میں پھر دربارِ الہی میں حاضر ہوا اور دس نمازیں کم کر دی گئیں۔ میں پھر موسیٰ کے پاس آیا اور انہوں نے پھر یہی کہا۔ میں پھر بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہوا اور دس نمازیں اور کم کر دی گئیں۔ میں پھر موسیٰ کے پاس آیا اور انہوں نے پھر بھی یہی کہا۔ میں پھر دربارِ خداوندی میں حاضر ہوا اور دس نمازیں رات دن میں باقی رہ گئیں۔ میں پھر موسیٰ کے پاس آیا اور انہوں نے پھر بھی یہی کہا۔ میں واپس ہوا اور بارگاہِ الہی میں حاضر ہوا اور رات دن میں پانچ نمازوں کا حکم دیا گیا۔ میں موسیٰ کے پاس واپس ہوا تو انہوں نے پھر یہی کہا۔ میں نے کہا کہ اب مجھ کو رات دن میں پانچ نمازوں کا حکم دیا گیا ہے۔ موسیٰ نے کہا، تمہاری امت رات دن میں پانچ نمازیں بھی ادا نہ کر سکے گی۔ تم اپنے پروردگار کے پاس جاؤ اور درخواستِ تخفیف چاہو۔ میں نے کہا، میں نے بار بار اپنے پروردگار سے تخفیف کا سوال کیا ہے۔ اب مجھ کو مشرم آتی ہے۔ میں اس پر راضی ہوں اور خدا کے اس حکم کو تسلیم کرتا ہوں۔

(ترجمان القرآن - نومبر ۱۹۷۶ء - نیز مشکوٰۃ - اردو ترجمہ صفحہ ۳۷-۵، جلد دوم)

آپ اس روایت پر غور کیجئے اور دیکھتے کہ حضرت موسیٰ کے سامنے، حضور نبی اکرم کس طرح (معاذ اللہ) طفلِ مکتب دکھائی دیتے ہیں! اور اس کے ساتھ ہی آپ اس بات پر بھی غور کیجئے کہ اس سے خود خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے جو پہلے اس قسم کے ناممکن العمل احکام دے دیتا ہے اور پھر ان میں بار بار تخفیف کرتا جاتا ہے! (معاذ اللہ) صاف نظر آتا ہے کہ یہ روایات یہودیوں کی وضع کردہ ہیں۔ ان کی رو سے انہوں نے کعبہ کے مقابلہ میں (اپنے قبلہ بیت المقدس کی افضلیت ثابت کر دی اور حضور نبی اکرم کے مقابلہ میں (اپنے پیغمبر) حضرت موسیٰ کی عظمت! اور ہم ہیں کہ ان روایات کو سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی تحویل قبلہ کی، اور اس ضمن میں ان روایات کو سامنے لایا گیا تھا جن میں کہا گیا ہے کہ حضور قریب پندرہ سال تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے اور اس کے بعد کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا۔ اگر تھوڑا سا بھی غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ یہ روایات بالبداهت وضعی ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ آپ مکہ میں پیدا ہوئے۔ کعبہ وہاں موجود تھا۔ وہ توحید کا مرکز بیشک نہیں تھا لیکن عربوں کا مرکز تھا، بنی اسماعیل کا مرکز تھا۔ قریش اس کے متوالی تھے۔ خود حضور بھی قریشی تھے۔ تاریخ میں کہیں نہیں ملتا کہ کبھی کسی عرب (قریش) نے کعبہ کو چھوڑ کر بیت المقدس کی طرف رُخ کیا ہو! وہ تو ساری دنیا کو کعبہ کی طرف آنے کی دعوت دیتے تھے۔ وہ بیت المقدس کی طرف رُخ کیسے کر سکتے تھے! کعبہ کو اس زمانے میں اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ یمن کے عیسائی گورنر نے یہ دیکھ کر کہ کعبہ، اس کے تعمیر کردہ معبد کے مرکز بننے کے راستے میں حائل ہے، اسے مسمار کرنے کی غرض سے مکہ پر فوج کشی کر دی۔ قرآن کریم میں سورۃ الفیل اس کی شاہد ہے۔ یہ اس سال کا واقعہ ہے جب حضور پیدا ہوئے تھے۔ (قبل از نبوت) چالیس سال حضور نے اسی فضا میں بسر کئے جو کعبہ کی اہمیت سے اس قدر معمور تھی۔ اور وہ بھی ایک عام عرب کی طرح نہیں۔ قریش کے ممتاز ترین قبیلہ، بنی ہاشم کے نہایت معزز اور واجب التکریم فرد کی حیثیت سے۔ آپ سوچتے کہ اس زمانے میں بھی کعبہ کی کس قدر اہمیت آپ کے دل میں جاگزیں ہوگی۔ پھر عربوں کو اس کا بھی علم تھا (اور وہ اس پر فخر کرتے تھے) کہ کعبہ ان کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے جد امجد حضرت اسماعیلؑ کے ہاتھوں تعمیر ہوا تھا۔

آگے بڑھتے۔ زمانہ قبل از اسلام میں بھی وہاں ایسے افراد موجود تھے جو اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کے متبع قرار دیتے تھے اور اسی نسبت سے خلیفہ کہلاتے تھے۔ یہ خدائے واحد کے پرستار تھے۔ جب حضور منصب نبوت پر فائز ہوئے تو آپ کو ملت ابراہیمی کے اتباع کا حکم ہوا۔ (دیکھیے۔ آیت ۲۵۔ مع —) کیا اس کے بعد آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی اسے باور کر سکتے ہیں کہ حضور پندرہ سال تک کعبہ کو چھوڑ کر بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے ہوں گے؟ روایات یہ بھی کہتی ہیں کہ آپ بیت المقدس کی طرف رُخ تو کر لیتے تھے لیکن آپ کی دلی خواہش یہی تھی کہ اپنا رُخ کعبہ کی طرف ہی کریں۔ بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو اپنے اس مسک (یعنی بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے) کو خود اپنے فیصلہ سے اختیار کیا تھا۔ اگر اپنے فیصلے سے اختیار کیا تھا تو پھر کعبہ کی طرف رُخ کرنے کی دل میں خواہش کے کیا معنی؟ اگر آپ کا جی کعبہ کی طرف رُخ کرنے کو چاہتا تھا تو آپ کو اپنا فیصلہ بدلنے میں کیا امر مانع تھا؟ دوسری صورت یہ تھی کہ بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم خدا کی

طرف سے دیا گیا تھا۔ سو اول تو قرآن میں کہیں ایسا حکم نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ ارشاد خداوندی کی تعمیل تھی تو کیا اسے ایک لمحہ کے لئے بھی باور کیا جاسکتا ہے کہ حضورؐ اس حکم کی تعمیل (معاذ اللہ) طوعاً و کرہاً کرتے تھے۔ دلی خواہش اس کے خلاف تھی (استغفر اللہ!) کیا خدا کے رسولؐ، ارشاد خداوندی کی تعمیل اس طرح کیا کرتے تھے؟ اور اس کے بعد اس قیامت بالائے قیامت کو دیکھیے کہ حضورؐ، حکم خداوندی کی (طوعاً و کرہاً) تعمیل اور اپنی دلی خواہش میں منہاجمت (COMPROMISE) کی صورت یہ پیدا کر لیتے تھے کہ نماز میں ایسے مقام پر پکھڑے ہو جاتے جہاں کعبہ بھی سامنے ہے اور بیت المقدس بھی سامنے۔ چلئے! خدا بھی راضی ہو گیا اور اپنے دل کی تسکین بھی ہو گئی۔ (معاذ اللہ!)

ناطقہ سر بگڑیاں کہ اسے کیا کہیے!

لیکن مدینہ میں آکر مشکل پڑی۔ آپؐ غور کیجئے کہ یہ سترہ ماہ یا دو سال کا عرصہ، حضورؐ نے (معاذ اللہ) کس کرب اور ضیق میں گزارا ہو گا۔ جی چاہتا تھا کعبہ کی طرف رخ کرنے کو اور حکم خداوندی کی تعمیل میں رخ بیت المقدس کی طرف کرنا پڑتا۔ بھنا! (ان روایات کی رُو سے) یہ کہنا پڑے گا کہ بالآخر، خدا نے رحیم کو آپؐ کی اس حالت پر ترس آگیا اور اس نے کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دے کر آپؐ کو اس کشمکش سے نجات دلائی! (میرے اللہ! تیری پناہ)

عام طور پر پوچھا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی تفسیریں کھنڈے والے ایسے جید امام تھے انہوں نے اس قسم کی تفسیریں کیسے لکھ دیں۔ اور اگلا سوال یہ کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ کرنے والے اتنے اتنے بڑے عالم تھے، انہوں نے ایسے ترجمے کس طرح کر دیئے اور ان سوالات کا جواب دو لفظوں میں دیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ اس سب کی ذمہ دار یہ وضعی روایات ہیں جب ان روایات کے متعلق یہ عقیدہ قائم کر لیا جائے کہ یہ حضورؐ نبی اکرمؐ کے ارشادات گرامی ہیں تو قرآن کا مفہوم ان سے ہٹ کر یا ان کے خلاف کس طرح لیا جاسکتا تھا۔ روایات میں ہے کہ حضورؐ پندرہ سال تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم ہوا۔ جب مفسرین نے قرآن کریم کی تفسیریں لکھیں تو وہ قرآن مجید کی کسی آیت کا مفہوم اس کے خلاف لے ہی نہیں سکتے تھے چنانچہ انہوں نے انہی کے مطابق تفاسیر مرتب کر دیں۔ اس طرح ہماری تفاسیر قرآن سے دور چلی گئیں۔ ان تفاسیر کی رُو سے قرآن کریم جس طرح سمجھا گیا، ترجمہ کرنے والوں نے اس کے مطابق آیات کا ترجمہ کر دیا۔ اس کی تین مثال ہمارے سامنے ہے۔ قرآن کریم کی آیت ہے :-

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا - (۱۴۲)

روایات اور تفاسیر میں لکھا تھا کہ پندرہ سال تک بیت المقدس قبلہ رہا۔ اس کے بعد اسے تبدیل کرنے کا حکم آیا۔ اس کی رو سے آیت کا ترجمہ یوں کیا گیا۔

اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے، جس پر وہ تکتے۔

(ترجمہ مولانا محمود الحسن مرحوم)

اگر ذہن، روایات (اور ان پر مبنی تفاسیر) سے متاثر نہ ہوتا تو اس کا سیدھا سادہ ترجمہ یوں کیا جاتا کہ :-

یہ بے وقوف لوگ (یہود) کہیں گے کہ مسلمانوں کو کس چیز نے پھیر دیا اُس قبلہ سے جس پر وہ (یہود) ہیں — یعنی یہود کے قبلہ سے۔

میں اس مقام پر گراؤں کہ ان بحثوں میں نہیں الجھنا چاہتا کہ "قَبْلَتِهِمُ اللَّتٰی كَانُوا عَلَیْهَا" کا یہ ترجمہ کس طرح صحیح ہے۔ (کوئی سمجھنا چاہے گا تو انفرادی طور پر اُسے سمجھا بھی دوں گا)۔

مشہور ہے کہ ایک غلطی کے جواز کے لئے کئی مزید غلطیاں کرنی پڑتی ہیں۔ جب یہ سمجھا گیا کہ پندرہ سال تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے، تو اس سے لامحالہ یہ خیال پیدا ہوا کہ حضورؐ نے ایسا خدا کے حکم ہی سے کیا ہوگا۔ لیکن قرآن کریم میں تو ایسا حکم کہیں نہیں! اس پر یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ وحی جلی اور وحی خفی۔ وحی جلی تو قرآن کے اندر درج ہے اور وحی خفی احادیث میں ہے۔ یہ وحی بھی، وحی قرآنی کی مثل ہے (مشئلہ معہ قرآن کی مثل، قرآن کے ساتھ)۔ بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم وحی خفی کی رو سے ملا ہوگا۔ (وحی کی ان اقسام کے متعلق دیکھتے مطالب الفرقان۔ جلد اول ص ۱۴۱۔ آیت ۲)

لیکن یہاں مشکل آن پڑی کہ احادیث میں اس چیز کو بطور واقعہ تو بیان کیا گیا ہے (کہ حضورؐ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے) لیکن اس کا حکم وہاں بھی نہیں ملتا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ وحی خفی کے لئے ضروری نہیں کہ وہ بالفاظ کتب احادیث میں درج ہو۔ حضورؐ نے اس پر جو عمل کر کے دکھایا اسے وحی کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اس لئے بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم اگر بہ نقص صریح کہیں نہیں ملتا تو اس سے کچھ ہرج واقعہ نہیں ہوتا حضورؐ کا اُس طرف منہ کر کے نماز پڑھنا اس کے وحی ہونے کی سند ہے غرض، ایک غلط (وضعی) روایت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے، اس قدر الجھنیں پیدا کرنی پڑیں۔ سچ ہے۔

خشیتِ اول چوں نہد مسامحہ تاثرِ تاملی رد و دیوار کج

قرآن کو روایات کے تابع رکھنے کے بجائے، اگر روایات کو قرآن کے تابع رکھا جاتا، تو نہ، معاندین اسلام کی

اس قسم کی روایات کو جزو دین بنانے کی سازش کامیاب ہو سکتی، نہ ہی امت اس قدر الجھنوں اور تفرقہ کا شعار ہوتی۔ (امت نے جب بھی اس حقیقت کو سمجھ لیا، قرآن کریم بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گا اور یہ ہر قسم کے انتشار اور تشمت، تفرقہ اور اختلاف سے محفوظ ہو جائے گی)۔

ان روایات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے میں وضع ہوئی تھیں جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تھا اور قبلہ سے مقصود وہ مکان یا مقام رہ گیا تھا جس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتے۔ دین میں، قبلہ سے مقصود نظام خداوندی (یا قرآنی مملکت) کا مرکز محسوس تھا جو محور تھا امت کی تمام سرگرمیوں کا۔ اگر قبلہ کا یہ مفہوم سامنے ہوتا تو اس کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ حضور نمازیں اپنا رخ کس طرف کرتے تھے۔ کعبہ تو وہ نقطہ ہا کعبہ تھا جس سے متمسک ہو کر مسلم افراد نے ایک امت کی شکل اختیار کرنی تھی۔ چنانچہ اس کی تصریح اگلی آیت میں یوں کر دی کہ :-

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ
وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲/۱۴۳)

اس آیت جلیلہ میں کَذَلِكَ کا لفظ بڑا پر معنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے اس طرح ہم نے تمہیں ایک امت بنا دیا۔ یعنی تعین قبلہ وہ عملی طریق (PROCESS) تھا جس سے تمہارے بچھے ہوئے ذرے ایک چٹان بن گئے۔ یہ اس مرکز کی کشش ثقل تھی جس سے تم سب ایک نقطہ سے وابستہ اور باہم دگر چوست ہو گئے۔ یہاں کعبہ کو اس امت کی وجہ جامعیت بتایا گیا ہے۔ دوسرے مقام پر اس امت کا ذکر کرتے ہوئے، جبل اللہ کو وجہ جامعیت قرار دیا گیا ہے۔ جبل اللہ کی اصطلاح (جس کے لفظی معنی اللہ کی رسی یا بندھن ہیں) بڑی جامع ہے۔ اس میں پورے کا پورا نظام آجاتا ہے۔ وہاں کہا یہ گیا ہے کہ :-

وَأَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُم مِّنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ. (۲/۱۴۴)

تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم سب سب، بلا استثناء، اجتماعی طور پر، اس نظام کے ساتھ، محکم طور پر وابستہ رہو اور اپنے اندر فرقے یا پارٹیاں مت پیدا ہونے دو، کہ فرقہ پرستی شرک ہے (۲/۱۴۴) اور پارٹی بازی خدا کا عذاب (۲/۱۴۵)۔ تم ذرا اپنی قبل از اسلام کی حالت کو سامنے لاؤ جب تم ایک امت کے بجائے فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ تم

ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ خدا نے تمہاری اس حالت میں ایسا نظام زندگی عطا کیا جس سے تم میں ظاہر داری کا میکانیکی طور پر اتحاد ہی نہیں ہوا بلکہ تمہارے دل ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے اور تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے تمہارا اس طرح ایک نظام کے تابع ایک برادری بن جانا کتنا بڑا انعام خداوندی تھا۔ تم اس سے پہلے ہلاکت اور تباہی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکے تھے کہ اس نظام خداوندی نے تمہیں اس میں گرنے سے بچالیا۔ (۱۶: ۲۹، ۳۰) اس طرح اللہ اپنے قوانین و ضوابط اور ان کے نتائج و ثمرات واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ زندگی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے رہے۔

(اس کے بعد اس امت کا ذکر ہے۔ لیکن وہ آیت (۱۶: ۲۹) ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

آیہ زیر نظر میں کہا گیا ہے کہ کَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّ سَطٰطًا لِّتَكُوْنُوْا شٰهَدًاۙ عَلٰی النَّاسِ وَّ يَكُوْنُ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شٰهِيْدًاۙ۔ (۱۶: ۲۹) ”اس طرح (یعنی کعبہ کی مرکزیت سے) ہم نے تمہیں ایک ایسی امت (قوم) بنا دیا جو عالمگیر اور بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔“ ایسی بین الاقوامی کہ دنیا کی تمام قومیں، تم سے یکساں فاصلے پر (EQUI-DISTANT) ہیں۔ نہ تم کسی کی طرف یونہی جھکے ہوئے ہو، نہ کسی کی طرف سے یونہی کشیدہ۔ تمہارے نزدیک، عدل و انصاف کے نقطہ نگاہ

امت کی خصوصیات

سے تمام اقوام یکساں ہیں۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم ان تمام اقوام کے اعمال و کردار کا محاسبہ کرتے رہو کیونکہ تمہارا منہا ہے مقصود، تمام نوع انسان میں وحدت پیدا کرنا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ خود تمہارے اعمال و کردار پر نگاہ رکھنے والا بھی کوئی ہو جو دیکھتا ہے کہ تمہارا قدم، خدا کے مقرر کردہ راستے سے ادھر ادھر نہیں اٹھ رہا۔ یہ ہے اس نظام کا خاکہ۔ قرآن کریم تمہاری وحدت کا نظریاتی (IDEOLOGICAL) مرکز، کعبہ اس کا محسوس مرکز۔ اور اس نظام کی مرکزی اتھارٹی، اس کا اقتداری مرکز۔ اور فریضہ اس امت کا اقوام عالم کے کردار پر محاسبہ نگاہ رکھنا۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُوْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ..... (۲۴: ۲۱) ”تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوع انسان کی بہبود اور بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم ان تمام امور کو جنہیں کتاب اللہ صمیم تسلیم (RECOGNISE) کرتی ہے، قانوناً نافذ کرو اور جنہیں وہ غلط قرار دیتی ہے، ان سے لوگوں کو قانوناً روکو۔“

یہاں اس آیت کا سامنے لانا ضروری ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:-
 وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
 وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ - (۲۴۱)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ:-

اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلائی رہے نیک کاموں کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں
 کا۔ اور منع کرے برائی سے۔ وہی پیچھے اپنی مراد کو۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسن مرحوم)

اور اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اس سے مراد علماء کی جماعت ہے جس کا امت میں موجود رہنا ضروری ہے تاکہ
 وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتی رہے۔ آپ غور کیجئے کہ اس مفہوم

آیت کا غلط مفہوم [کی رو سے، اسلام میں اس مذہبی پیشوائیت کے وجود کو سند و دام عطا کر دی گئی
 جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ مفہوم قرآنی تعلیم کے خلاف ہے اور بوجہ غلط فہمی پہلے یہ دیکھئے کہ اس آیت
 سے ذرا ہی آگے وہ آیت ہمارے سامنے آتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ
 تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ - (۲۴۱) تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوع انسان کی بھلائی کے لئے
 پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اس آیت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ [ساری کی ساری امت کا بتایا گیا ہے نہ کہ امت کے کسی خاص گروہ
 کا۔ اگر آیت (۲۴۱) کا مفہوم یہ لیا جائے کہ امر بالمعروف و نہی

عن المنکر، امت کے ایک گروہ کا فریضہ ہے، پوری کی پوری امت کا نہیں۔ تو یہ دونوں آیتیں (۲۴۱ اور ۲۴۲)
 ایک دوسرے سے متضاد ہو جائیں گی، اور قرآن کریم کے اس دعویٰ کے خلاف کہ اس میں کہیں تضاد نہیں (۲۴۲)۔
 دوم۔ قرآن کریم نے ”امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اسلامی مملکت کا فریضہ قرار دیا ہے نہ کہ علماء کے گروہ
 کا۔ اس کا ارشاد ہے:-

الَّذِينَ اِنْ مَكَانَهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَامَرُوا بِالْمَعْرُوفِ
 وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ - وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُورِ - (۲۴۲)

یہ (سومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہو جائے گا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور اتانے زکوٰۃ کا
 نظام قائم کریں گے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں گے اور ان کے تمام معاملات قوانینِ خداوندی

کے مطابق طے پائیں گے۔

اس آیت کی تشریح جلد اول ص ۱۰۷ زیر آیت (۲۱۱) کی جا چکی ہے جہاں واضح کیا گیا ہے کہ یہ فرائض اپنی آزاد مملکت ہی میں ادا کئے جاسکتے ہیں۔ اس مقام پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلامی حکومت کا فرضیہ ہے۔ اور چونکہ یہ حکومت پوری کی پوری امت پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے درحقیقت امت ہی اس فرضیہ کو ادا کرتی ہے۔ جب تک دین کا یہ نظام قائم رہا، یہ فرضیہ اس نظام (مملکت یا حکومت) کی طرف سے ادا ہوتا رہا جب دین مذہب میں تبدیل ہو گیا اور اسلامی نظام باقی نہ رہا تو بادشاہت اور مذہبی پیشوائیت میں بٹوارے کی رو سے نمازیں پڑھانے، زکوٰۃ وصول کرنے کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرضیہ علماء کے حصے میں آ گیا جسے وہ وعظ و نصیحت کے ذریعے سرانجام دینے لگے۔ اس آیت کا یہ مفہوم اس وقت وضع کیا گیا۔ غور کیجئے کہ جس فرضیہ کی ادائیگی کے لئے قرآن، اپنی مملکت کا قیام شرط قرار دے، وہ وعظ و نصیحت کے ذریعے کس طرح ادا ہو سکتا ہے؟ اس میں تو آمر اور نہی کے الفاظ آتے ہیں۔ آمر کے معنی حکم دینے اور نہی کے معنی حکماً روکنے کے ہیں۔ وعظ و نصیحت سے جس طرح لوگ معروف کو اختیار کرتے اور منکر سے باز رہتے ہیں اس کا مشاہدہ ہم ہر روز کرتے ہیں!

سوم۔ اس آیت (۲۱۱) کے آخر میں کہا گیا ہے اُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ ”یہی لوگ کامیاب ہوں گے اور فلاح پائیں گے“۔ اگر آیت کا مفہوم یہ لیا جائے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرضیہ ایک خاص گروہ (مذہبی پیشوا، ادا کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مفلحون بھی یہی گروہ ہوگا۔ باقی امت نہیں۔ یہ مفہوم قرآن کریم کی ساری تعلیم کے خلاف ہے۔ وہ جماعت مومنین کو مفلحون قرار دیتا ہے۔ قَدْ اَخْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ۔ (۲۱۳) اور اسی قسم کی دیگر بے شمار آیات)۔ اس سے بھی واضح ہے کہ یہ فرضیہ ساری امت کا ہے نہ کہ امت کے کسی خاص گروہ کا۔

آیت (۲۱۱) کا ترجمہ یہ نہیں کہ تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرضیہ سرانجام دے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ”تم ہی وہ جماعت ہو جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرضیہ سرانجام دے سکتی ہے“ کیونکہ ”معروف و منکر“ کا ضابطہ (قرآن مجید) تمہارے ہی سپرد کیا گیا ہے۔ لغوی تفصیل میں الجھے بغیر اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس آیت میں، صِرْبُ کا حرف تبعیض کے لئے نہیں آیا۔ تبیین کے لئے آیا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تبعیض کا مفہوم لینے سے قرآن مجید میں تضاد لازم آ جاتا ہے اور تبیین کے مفہوم کی رو سے قرآن کے دیگر مقامات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ایسے مقامات میں ہمیشہ وہ مفہوم لینا چاہیے جس سے قرآن میں تضاد

واقع نہ ہو۔ میرا ملک بہر حال یہی ہے۔

اسلام میں جماعتی زندگی کس طرح اساسی حیثیت رکھتی ہے، اس کے متعلق جلد دوم صفحہ ۲۱۱-۲۱۲۔ زیر آیت (۳۳)، وضاحت سے لکھا جا چکا ہے۔ اس مقام پر اتنا اضافہ کافی ہو گا کہ اس جماعت (جماعتِ مومنین) کی اہمیت کو قرآن کریم نے باصرار و تکرار

جماعتِ مومنین کی اہمیت

نمایاں کیا ہے۔ ایک جگہ حضور نبی اکرم سے کہا گیا کہ: **هُوَ الَّذِي آتَاكَ بِنَصْرِهِ** **وَبِالْمُؤْمِنِينَ**۔ (۳۳)۔ یعنی خدا وہ ہے جس نے اے رسول! اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین کو تیری تائید و تقویت کا موجب بنایا، آپ دیکھتے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے تنہا اپنی نصرت کو، حضور کی قوت و تائید کا ذریعہ نہیں قرار دیا۔ اس کے ساتھ جماعتِ مومنین کی رفاقت کو بھی اس کا موجب بتایا ہے۔ ذرا آگے چل کر اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا کہ: **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ**۔ (۳۴)۔ یعنی اے رسول! خدا اور یہ جماعتِ مومنین جو تیرا اتباع کرتی ہے، تیرے لئے کافی ہے، یہاں بھی یہ نہیں کہا کہ اس مشن کی کامیابی کے لئے رسول کے ساتھ صرف خدا کافی ہے۔ کہا کہ اس مقصد کے لئے خدا اور جماعتِ مومنین کافی ہیں۔ اس سے آپ دیکھا کہ اس نظام میں جماعت کو کس قدر اہمیت حاصل ہے؛ انہی حضرات کو قرآن کریم نے ”وَالَّذِينَ مَعَهُ“ کہہ کر پکارا ہے (۳۴)۔ یعنی حضور کے رفقاء۔ انہی کو صحابہ کرام کے لقب گرامی سے پکارا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے صحابہ کبار کا مقام کیا ہے، اس کی بابت متعلقہ مقام پر گفتگو کی جائے گی جو حضرات اسے بلا توقف دیکھنا چاہیں وہ میری کتاب — شاہکار رسالت — میں پہلا باب (گرد گاہ خیال)؛ ملاحظہ فرمائیں۔

بہر حال، ہم کہہ رہے تھے کہ کعبہ، اس امت کا قبلہ، نصب العینِ حیات ہے (یعنی وہ نقطہ جسے ہر وقت نگاہوں کے سامنے رکھا جائے، چونکہ اس کعبہ کی تاسیس حضرت ابراہیم کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، اس لئے قرآن کریم نے انہیں اس امت کا اولین ہیولی (FIRST CRYSTAL) یا خیم صالح قرار دیا ہے۔ اس حقیقت کو اس نے ایسے معجزانہ انداز سے بیان کیا ہے کہ جوں جوں نگاہ بصیرت اس پر غور

اس امت کا موسس

کرتی ہے، روح و جد میں آجاتی ہے۔ فرمایا کہ:-

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا۔ (۳۵)

ابراہیم دیکھنے میں تو ایک فرد تھا لیکن درحقیقت اس کی ذات میں ایک ایسی امت سموئی ہوئی تھی جو اپنی تمام توانائیوں کو خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے وقف ہو چکی تھی۔ جس طرح بیج میں پورا درخت سمو یا ہوا ہوتا ہے، اسی طرح (حضرت) ابراہیم کی ذات میں یہ امتِ مسلمہ سموئی ہوئی تھی۔ اس نظام کی ابدار ابراہیم تھا اور اس کا مقصد: **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً**

وَاحِدَةً (۲۴۳)۔ تمام نوع انسان کا ایک امت بن جانا۔ کعبہ اس امت واحدہ اور اس عالمگیر برادری کا مرکزِ ثقل ہوگا۔ کعبہ (قبلہ) کی اس اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے آئینہ نظر کے باقی ماندہ حصہ کی طرف آئیے۔ فرمایا:-
 وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ
 يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ. وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى
 اللَّهُ. وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ إِيْمَانَكُمْ. إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَخَبِيرٌ
 تَحِيْمٌ. (۲۴۳)

مفہوم اس کا یہ ہے :-

تعیینِ قبلہ (مرکز) کا سوال بڑا اہم تھا۔ یہ سوال 'درحقیقت'، قومی مرکز کی جگہ، انسانیت کے عالمگیر مرکز کے اختیار کرنے کا سوال تھا۔ اس لئے جس قبلہ کو (اے رسول!) تو نے اختیار کیا ہے، اُسے ہم نے اس لئے قبلہ بنایا ہے تاکہ دونوں قسم کی ذہنیتیں الگ الگ ہو جائیں اور یہ واضح ہو جائے کہ وہ کون ہے جو رسول کے اتباع میں، اپنا رخ پھیر کر، ہر قسم کی قومی نسبتوں کو چھوڑ کر، خالص انسانیت کی نسبت اختیار کرتا ہے۔ اور وہ کون ہے جو قومی نسبت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

یہ تبدیلی، فی الواقعہ، ان لوگوں پر گراں گزرنی تھی جن کے دل ابھی تک قومیتوں کے تنگ دائرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان تنگناؤں سے نکلنا اُسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اپنے ذاتی رجحانات کے بجائے قانونِ خداوندی کو اپنا راہ نما بنالے۔

قومیت کے تنگ دائرے میں رہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ انسانیت کی وسعتوں میں پھیل جانے سے اس کا جتنہ کمزور ہو جاتا ہے اور اس سے بڑا نقصان پہنچتا ہے (۲۴۹)، لیکن تم ان کی باتوں میں نہ آ جانا۔ عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود پر تمہارا ایمان کبھی رانگن کا نہیں جائے گا۔ خدا کے قانون کے مطابق چلنے سے انسان، تخریبی قوتوں سے بھی محفوظ رہتا ہے اور اسے سامانِ نشوونما بھی بافراط ملتا ہے۔

اگر قبلہ سے مقصد صرف اتنا ہی ہوتا کہ نماز میں رخ کس طرف کیا جائے، تو یہ کون سی ایسی بات تھی جو لوگوں

پر اس قدر گراں گزرتی اور جسے اتباعِ رسول کے مانپنے کا پیمانہ یا معیار قرار دیا جاتا؟ یہ

درحقیقت قومیت کی تشکیل کا ایک نیا معیار تھا۔ یہ ایک نیا نظریہ زندگی (IDEOLOGY)

تعیین قبلہ کا مقصد

تھا جس سے تمام سابقہ نظریات منسوخ ہو جاتے تھے۔ نوعِ انسانی، نسل، رنگ، زبان، وطن اور مذہب ہی فرقہ بندیوں

کی بنا پر مختلف گروہوں میں بٹی ہوئی تھی جن میں کاہر گروہ دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار چلا آ رہا تھا۔ قرآن کریم نے انسانی تفریق و تقسیم کے ان تمام معیاروں کو ختم کر کے، نظریہ حیات کی بنیاد پر ایک عالمگیر برادری کی تشکیل کا تصور پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی مخالفت ان لوگوں کی طرف سے ہوئی لازمی تھی جن کے مفادات اپنے اپنے گروہوں کیساتھ وابستہ تھے۔ اس سے تعین قبلہ کی حقیقت اور اہمیت سامنے آ جاتی ہے۔ یہی تھی اس کی وہ اہمیت جس نے قلبِ نبویؐ کو وقفِ اضطراب کر رکھا تھا۔ مدینہ میں وہ مملکت قائم ہو گئی تھی جس میں نظامِ خداوندی کو مشہودِ انداز سے دنیا کے سامنے آنا تھا۔ اس نظام کا مرکز کعبہ تھا، اور وہ قریش کے قبضہ میں تھا۔ اس تصور سے حضورؐ کے قلبِ مطہر کی کیا کیفیت تھی، اسے قرآن کریم نے اپنے مخصوص محاکاتی انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ :-

قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ. فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا. (۲/۱۴۴)

”ہمیں اس کا بھی علم ہے کہ تمہارے دل میں کس طرح بار بار یہ آرزو ابھر رہی ہے کہ جس مقام (کعبہ) کو اس نظام کا مرکز قرار دیا گیا ہے، اسے ہماری ہی تحویل میں ہونا چاہیے۔“ نظامِ ہمارا اور اس کا مرکز اس نظام کے دشمنوں کے قبضہ میں، یہ کوئی عجیبی ہوئی بات نہیں۔ ”ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس شدتِ آرزو، اور اضطرابِ قلبی کی وجہ سے، تیری نگاہیں کس طرح بار بار ہماری طرف اٹھتی ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ بارالہا! اس مرکز کو ہماری تولیت میں دلائے! یہ ٹھیک ہے ایسا ہی ہونا چاہیے اور ایسا ہو کر رہے گا۔ لیکن ہمارے قانونِ مشیت کی رو سے اس میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ لیکن کعبہ کو قبلہ قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ وہ جس نظریہ حیات کی علامت (SYMBOL) ہے، وہ (نظریہ) ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہے اور اس طرح اس کی اہمیت اور عظمت دلوں میں ابھی طرح جاگزیں ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے ضروری نہیں کہ کعبہ طبعی طور پر بھی تمہاری تحویل میں ہو۔ سو، اس دوران میں تمہارے کرنے کا کام یہ ہے کہ :-

قَوْلَ وَجْهِكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ. وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ..... (۲/۱۴۴)

تم اپنی تمام توجہات کو اسی نقطہ پر مرکوز کر دو۔ یعنی اس نظریہ کی اہمیت جس کی علامت کعبہ ہے اور کعبہ کو غیر خداوندی قوتوں سے آزاد کرنے کی ضرورت پر مرکوز۔ تم اپنی جماعت کے افراد سے کہہ دو کہ تم خواہ دنیا کے کسی گوشے میں ہو، اور زندگی کے کسی شعبہ میں مصروفِ تنگ و تاز ہو، تمہاری نگاہوں سے یہ مقصد اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے تمہاری جماعت میں یک نگرہی اور ہم آہنگی پختہ سے پختہ تر ہوتی جائے گی اور حصولِ مقصد کی خواہش نیز سے

تیز تر بناؤ تاکہ وہ وقت آجائے جب کعبہ کو اپنی تحویل میں لینے کے لئے تمہیں سرکف میدان میں اترنا پڑے۔ اقبال کے الفاظ میں ۱۵

بالشہ درویشی و ساز و دمام زن چوں بختہ شوی خود را، بر سلطنتِ جم زن
تربیتی مرکز مصر میں جب بنی اسرائیل فرعون کی غلامی کے پٹج میں جکڑے ہوئے تھے اور حضرت موسیٰ، اس عذاب سے نجات دلانے کے لئے، ان کی تعلیم و تربیت کر رہے تھے، تو اس وقت اسی قسم کا پروگرام ان کے لئے بھی تجویز کیا گیا تھا جب کہا کہ:-

وَاَوْحَيْنَا اِلٰی مُوسٰی وَاٰخِيهِ اَنْ تَسُوْا الْقَوْمَ مَكًّا بِمِصْرَ مُيُوسًا وَاَجْعَلُوْا
 بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ . وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ . (۱۱۴)

اس لئے ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی (ہارون) کو حکم دیا کہ مصر میں جس جگہ تمہاری قوم ہے وہیں ان کی ذہنی اور قلبی تربیت شروع کر دو۔ (فرعون اس کی اجازت نہیں دے گا کہ تم اپنی جماعت کے لئے کوئی تربیتی مرکز قائم کرو جہاں ان کے اجتماعات ہو سکیں۔ اس لئے تم فی الحال اپنی جماعت کے افراد کے گھروں کے اندر ہی یہ سلسلہ شروع کر دو۔ انہی کو قبلہ بنا کر نظامِ صلوٰۃ کی ابتدا کر دو۔ اور اپنی جماعت کو اس نظام کے نتائج و ثمرات کی خوشخبری دیتے رہو تاکہ ان کے حوصلے بلند اور مستحسین جوان رہیں)۔

اس سے (ضمناً) یہ بھی واضح ہو گیا کہ نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے طریقِ نبویؐ کیا ہوتا ہے۔ افراد کی تعلیم و تربیت جس سے وہ نفسیاتی تغیر پیدا ہو جائے جس کے بغیر کوئی خارجی تغیر رونما نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو قبلہ، اس جماعت کی تربیت گاہ بھی ہوتا ہے۔ نیز اس آیت میں جہاں ”اقیموا الصلوٰۃ“ آیا ہے، اس سے نظامِ صلوٰۃ کا تصور بھی سامنے آ جاتا ہے۔ (وہ تصور جس کی تشریح، جلد اول صفحہ ۱۱۴-۹۷۔ زیر آیت (۱۱۴) کی جا چکی ہے) اس کے بعد کہا کہ:-

وَإِنَّ الَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ
 وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ . (۱۱۵)

اصل یہ ہے کہ یہ اہل کتاب بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ تمہاری یہ دعوت ان کے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک حقیقت ہے (اس لئے کہ خود ان کے ہاں اس کا ذکر موجود ہے)۔ لیکن اس کے باوجود، یہ محض منہ اور تعصب کی بنا پر اس کی مخالفت کئے جا رہے ہیں۔ ہم ان کی ایک ایک

حرکت سے باخبر ہیں۔

اس سے ایک ہی آیت بعد کہا گیا ہے کہ یہ اسے اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح باپ اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے۔ لہذا ان کی مخالفت بر بنائے جہالت یا ناواقفیت نہیں، تعصب اور عداوت کی بنا پر ہے۔

(۱)

اس سے واضح ہو گیا کہ تعین قبلہ کا صحیح مفہوم کیا تھا اور یہودیوں کو اس پر اس قدر شدید اعتراض کیوں تھا کہ مسلمانوں نے، بنی اسرائیل کے قبلہ کی جگہ کعبہ کو اپنا قبلہ قرار دے لیا ہے۔ یہ درحقیقت دین کا اختلاف تھا۔ نظام زندگی کا اختلاف تھا۔ نظریہ حیات کا اختلاف تھا۔ مقصود و منہی کا اختلاف تھا۔ قبلہ تو محض اس کی محسوس علامت تھا۔ اس لئے فرمایا کہ:-

وَلَيْنَ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ
وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ. وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ -
وَلَيْنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذَا
لَمِنَ الظَّالِمِينَ . (۲۴۱)

۲
۱۲۵

یہ ظاہر ہے کہ جہاں خدا اور تعصب کا رفرما ہو، وہاں دلیل و برہان کچھ اثر پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لئے، اگر تو ان کے سامنے دنیا جہان کی دسیلیں بھی پیش کر دے، یہ پھر بھی تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے۔ اور تم ہی تم (علم و بصیرت کے خلاف) ان کے قبلہ کی پیروی کر سکتے ہو۔ ان کی تو خود اپنی حالت یہ ہے کہ (متمناری مخالفت میں تو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں لیکن) اپنے اپنے قبلے الگ رکھتے ہیں اور ایک مرکز پر جمع ہی نہیں۔

بہر حال، ایک عالمگیر انسانیت کی طرف دعوت دینے والا، ان لوگوں سے مفاہمت کر ہی نہیں سکتا جو قومیتوں کے تنگ دائرے میں مقید ہوں۔ اگر (بفرض حال) وحی کی زد سے حقیقت حال کا علم ہو جانے کے بعد بھی، تو ان کی خواہشات کا اتباع کرنے پر آمادہ ہو جائے، تو تیرا شمار انہی میں سے ہو گا جو قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کرتے ہیں۔

تصریحی طور پر، اس مقام پر ذکر یہودیوں اور عیسائیوں کا چلا آ رہا ہے۔ ان کی باہمی دشمنی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یروشلم ان دونوں کا مقدس شہر تھا۔ اسی میں یہودیوں کا قبلہ تھا اور اسی میں عیسائیوں کا۔ لیکن عیسائیوں نے

مخالفت کا متحدہ محاذ | یہودیوں کے قبلہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اور وہاں، ان کے مہیکل (معبد) کے کھنڈرات کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ یہ (عیسائی) یہودیوں کو اس شہر میں داخل ہونے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے۔ باہمی عداوت کا تو یہ عالم، لیکن اسلام کی دعوت کی مخالفت میں۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی، تاسیخ کی یہ حقیقت بڑی تعجب انگیز ہے کہ باطل پرست گروہ، ایک دوسرے کے غلوں کے پیاسے بھی کیوں نہ ہوں، حق کی مخالفت میں سب متحد ہو جاتے ہیں۔ خود ہمارے ہاں کے مختلف مذہبی فرقوں کو دیکھئے۔ ان میں مسلسل سرسپول ہوتی رہتی ہے لیکن قرآنی دعوت کی مخالفت کے لئے سب اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس حقیقت کی مزید وضاحت کر دی جس کی طرف احصالاً آیت (۲۴۱) میں اشارہ کیا گیا تھا کہ:-

الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْكِتَابَ يَعْرفُونَكَ مَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ. وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ - (۲۴۱)

یہ لوگ ان حقائق سے اچھی طرح باخبر ہیں اور تمہاری دعوت کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح انسان اپنے بیٹوں کو پہچان لیتا ہے۔ (اس لئے کہ تمہاری آمد کی پیش گوئیاں ان کی مسینہ آسمانی کتابوں تک میں موجود ہیں) لیکن ان کے علماء و مشائخ کا گروہ دیدہ دلاستہ انہیں چھپاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، نبی اکرمؐ کے ظہور کے متعلق یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں پیش گوئیاں موجود تھیں۔ اور وہ (مسخ اور تحریف شدہ حالت ہی میں سہی) موجودہ تورات (عہد نامہ عتیق) اور انجیل (عہد نامہ جدید) میں بھی پائی جاتی ہیں۔ زمانہ نزول قرآن میں، اہل کتاب کے دعاوی کی تردید کے لئے ان کی کتابوں سے اسناد و دلائل پیش کرنا ضروری تھا کیونکہ وہ اسی کو فیصلہ کن معیار قرار دیتے تھے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک، عیسائیوں کے ساتھ مناظروں میں یہ انداز بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن اب اس کی چنداں اہمیت نہیں رہی۔ اب دنیا، منقولات (کتابی اسناد) کے بجائے، معقولات (علمی اور عقلی دلائل) کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ اس لئے

استدلالی دور | اب دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے استدلالی

(RATIONAL) طریق کی ضرورت ہے۔ ”دیگر مذاہب کے مقابلہ“ میں ہی نہیں، ”کیونکہ اب نفس مذہب کی اہمیت ہی کم ہوتی جا رہی ہے“، بلکہ دنیا کے ارباب علم و بصیرت کو اس کا قائل کرنے کے لئے کہ اقوام عالم اس وقت جس جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں، اس سے نکلنے کے لئے، قرآنی نظام کے سوا کوئی چارہ کار

ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے سامنے حق و صداقت کو پیش کرنے کا وہ دور ابھر کر مشہور ہو رہا ہے جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ :-

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ
الْحَقُّ . . . (۱۴۴)

جوں جوں انسانی علم بڑھتا جائیگا اور نئے حقائق منکشف ہوتے جائیں گے — وہ خارجی کائنات سے متعلق ہوں یا انسان کی داخلی دنیا سے سلق — وہ سب قرآن کے دعاوی کی زندہ شہادتیں بنتے جائیں گے اور یوں دنیا دیکھ لے گی کہ قرآن کا ہر دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے۔

میں بھی اثباتِ حق و صداقت کے لئے اس علمی اور فکری طریق کو ترجیح دیتا ہوں اور قرآنی حقائق کو اپنی بصیرت کے مطابق، علمی اور عقلی دلائل کی رو سے پیش کرتا ہوں۔ یہ وجہ ہے کہ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ بعثتِ نبی اکرمؐ کے متعلق جو کچھ کتبِ سابقہ میں آیا ہے اسے یہاں درج کیا جائے۔ دنیا نظامِ محسوس کے لئے تڑپ رہی ہے۔ اس لئے اسے اب (کتبِ سماوی کی پیش گوئیوں کی رو سے) ظہورِ محمدی کے قائل کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ دلائل مانگتے ہیں۔ اُن کتابوں کے حوالے نہیں۔ بہر حال، نبی اکرمؐ اور حضورؐ کی وساطت سے جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ :-

الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ - (۱۴۴)

حقیقت تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تم تک پہنچ چکی ہے۔ تم اس سے متک رہو۔ ان کٹھنیاں

کہنے والوں سے بحث و جدل کی ضرورت نہیں۔

تمہارا فرضیہ، حقیقت کو ان تک پہنچا دینا تھا۔ سو اس سے تم سبکدوش ہو گئے۔ اب ان سے بحث و جدل بے کار ہے۔ جو جان بوجھ کر حقیقت کی مخالفت کرتا جاتے، بحث و نظر اُسے کیا فائدہ دے گی ؟

(۱۰)

مطالب الفرقان، جلد اول میں، صلوة کے سلسلہ میں بتایا جا چکا ہے کہ غیر مرنی اور غیر محسوس نظریات جب

عملی شکل اختیار کرتے ہیں تو اس کے لئے جسمانی حرکات یا محسوس علامات ناگزیر ہوتی ہیں۔ (دیکھئے جلد اول صفحہ ۱۲۲)۔

زیر آیت ۲۱)۔ لیکن جب دینِ مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو وہ نظریاتی

نگاہوں سے گم ہو جاتے ہیں اور ان کی محسوس علامات ان کی جگہ مقصود بالذات

مقصد اور محسوس علامات

بن جاتی ہیں۔ یوں مذہب میں، دین، بے جان پیکر، بے روح جسد، یا مٹی شدہ لاش بن کر رہ جاتا ہے۔ گزشتہ آیات میں، کعبہ کی اہمیت کا ذکر مسلسل ہو رہا تھا، اور یہ سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہے گا۔ لیکن قرآن کریم نے اس مسلسل داستان کے عین درمیان، ڈرا کر، اور یوں کہیے کہ موضوع سے ذرا ہٹ کر، اس خطرہ کا ازالہ کر دیا جو محسوس علامات کے مقصود بن جانے سے لاحق ہوتا تھا اور جس کا شکار جملہ اہل مذاہب ہو چکے تھے۔ اس نے رک کر کہا کہ کعبہ کی معنوی عظمت بجا اور درست، لیکن دیکھنا ایسا نہ ہو کہ تم اس عمارت کی خصوصیات بیان کر کے، دیگر اہل مذاہب کے مذہبی مراکز پر اس کی افضلیت ثابت کرنے لگ جاؤ۔ یاد رکھو،

وَلِكُلِّ وَجْهَةٌ لَّهُمْ مَوْلًىٰ ۚ فَلَا تَتَّبِعُوا الْخَيْرَاتِ - (۲۸)

۲
۱۴۸

ہر قوم نے اپنے لئے کوئی نہ کوئی مذہبی مرکز تجویز کر رکھا ہے۔ محسوس طور پر کعبہ کی عمارت کی بھی اتنی ہی حیثیت ہے۔ دیکھنا تم اسی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا۔ اصل مقصد یہ ہے کہ تم ایسے کتنے کام سرانجام دیتے ہو جو نوع انسانی کی منفعت کا باعث ہو رہا ہے اور تمہاری ذات میں وسعت پیدا کرنے کا موجب ہوں۔ اسے شرف و افضلیت کا پیمانہ قرار دے کر دیکھو کہ تم دیگر اقوام سے کس قدر آگے ہو۔ نہ اس بنا پر کہ تمہارا کعبہ کس قدر خوشنما، مزین، آراستہ پیراستہ شاندار اور خوبصورت ہے۔

چند آیات آگے جا کر، قرآن کریم نے اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کر دیا جب کہا کہ :-
لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ -
وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا -
وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ - أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ - (۲۷)

یہ لوگ، دین کے مقصد سے بے گناہ ہو جاتے ہیں اور چند رسوم و مناسک کو اصل دین سمجھ کر ان کی پابندی کو اس کی غایت سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن تم کہیں اس فریب میں نہ آ جانا۔ تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھو کہ تانوں خداوندی کی رو سے، وسعت و کشادگی راہ (جس سے انسان معیار خداوندی پر پورا اترتا ہے) یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف [اگرچہ امت میں وحدت اور یک جہتی پیدا کرنے کیلئے

اس قسم کے محسوس شکار کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن یہ مقصود بالذات نہیں ہوتے۔ مقصود اُس نظام کا قیام ہے جس کے اصول اساسی یہ ہیں:-

اللہ پر ایمان، قانونِ مکافات اور حیاتِ آخری پر ایمان، ان کا تسنیٰ قوتوں پر ایمان جو مشیت کے پروگرام کو بروئے کار لانے میں واسطہ بنتی ہیں۔ انبیاء کرام پر ایمان جن کی وساطت سے خدا کا پیغام انسانوں تک آتا رہا ہے اور ان کی وساطت سے ملی ہوئی کتابوں پر ایمان۔ (۲)

اس ایمان (آئیڈیالوجی) کے بعد عملی دنیا میں یہ روش کہ مال و دولت کی محبت کے باوجود اسے دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دینا (۳) — وہ رشتہ دار ہوں یا ایسے لوگ جو معاشرہ میں لاوارث اور تنہا رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جلتے، یا ان میں کام کاج کی استعداد باقی نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جو کسی وجہ سے زادِ سفر سے محروم رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کی کمائی، ان کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہو۔ ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اپنی دولت کو وقف کر دینا۔ مختصر الفاظ میں، نظامِ صلوة کو قائم کرنا کہ تمام ضرورت مندوں کو سامانِ نشوونما ملتا رہتا ہے۔ اپنے عہد و پیمان کا احترام کرنا اور قول و قرار کا پکا ہونا۔ لیکن اگر مخالف قوتیں آمادہٴ پیکار ہو جائیں تو پھر مصائب و مشکلات کا نہایت ثابت قدمی اور استقامت سے مقابلہ کرنا، اور خوف و ہراس کو پاس نہ کھینکنے دینا۔

جو لوگ اس روش پر استقامت سے کام لیں رہتے ہیں، وہ اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہوتے ہیں اور انہی کو یہ کہنے کا حق ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوئے خطرات کی گھاٹیوں سے بچتے ہیں (نہ وہ جو چند رسومات کے مجموعہ کا نام دین رکھ کر ان کی ادائیگی سے جنت کا وارث بننے کا دعوے کرتے ہیں)۔

دین میں، ظواہر، محسوس علامات، جہت اور مکان مقصود بالذات نہیں ہوتے لیکن (جیسا کہ اوپر کہا، اور سابقہ صفحات میں آیت ۲ کے تابع بھی لکھا جا چکا ہے) مذہب میں یہی ظواہر عین مقصد قرار پا جاتے ہیں جب اسلام دین تھا تو اس میں کعبہ کی عمارت اور دیگر ملحقات اور متعلقات کی حیثیت (تنی ہی تھی۔ لیکن اب ہمارے ہاں بھی ظواہر، عین دین بن چکے ہیں۔ کعبہ کی (پتھروں اور چونے گچ کی) عمارت کی تقدیس ہمارا جزو ایمان بن چکی ہے۔) عقیدہ یہ بھی ہے کہ حجرِ اسود کو حضرت آدم جنت سے اپنے ساتھ لائے تھے) اور اس

عمارت کی تزئین و آرائش، اور مناسک حج کی میکانیکی ادائیگی، مقصودِ شریعت۔ مسابقت فی الخیرات کا تصور جو نظامِ خداوندی ہی میں ممکن تھا، نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو چکا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ کعبہ کی عمارت تمہاری تحویل میں نہ بھی ہو، تو بھی اس کی غرض و غایت اگر تمہاری نگاہوں کے سامنے نہ ہو تو اس سے تمہاری ہئیتِ اجتماعیہ قائم رہے گی۔

أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا. إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (۲/۱۲۸)

تم کہیں بھی ہو گے، اس طرح تم میں حقیقی اجتماعیت پیدا ہو جائے گی کیونکہ، حقیقی اجتماعیت کا مدار انفرادی نظر (اینڈیا لوجی) کی ہم آہنگی پر ہے۔ کعبہ تو اس کی محسوس علامت ہے۔ یہ معیارِ خدا کا مقرر کردہ ہے۔ اس نے ہر مقصد کے لئے معیار اور پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔

اس کے بعد قرآن پھر اس نکتہ کی طرف آگیا جس کی توضیح سابقہ آیات میں، کئے چلا آ رہا تھا۔ یعنی یہ کہ :-
وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ. وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ. وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ۔ (۲/۱۲۹)

کعبہ تمہاری تحویل میں ہو یا نہ ہو، تم اس کی غایت اپنے سامنے رکھو۔ تم دنیا میں کہیں بھی ہو، اپنی تمام توجہات کو اسی مقصد اور غایت پر مرکوز رکھو۔ یہ تمہارے خدا کا مبنی بر حقیقت پیغام ہے۔ اس کے مطابق عمل کئے جاؤ۔ اس کا نتیجہ خدا کے قانونِ برحق کے مطابق مرتب ہو کر رہے گا۔ اس سے تم میں وہ نفسیاتی تبدیلی واقع ہو جائے گی جو خارجی تبدیلی کی شرطِ اولین یا اس تبدیلی کی علت (CAUSE) ہے۔

اس نکتہ کی اہمیت کے پیش نظر اسے بار بار دہرایا گیا اور کہا کہ :-

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ. وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَحْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي. وَلَا تَمَنَّا بِكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔ (۲/۱۵۰)

تم کہیں بھی ہو، اور وہاں سے کہیں بھی جانے کا ارادہ کرو، اپنے قلب و نگاہ کا مرکز کعبہ ہی کو رکھو۔ اسے ذہنی طور پر اپنا قبلہ بناتے رکھو۔ اسے رسول! تم بھی ایسا ہی کرو اور تمہاری جماعت کے افراد بھی ایسا ہی کریں۔ یہ تم سب کا اجتماعی پروگرام ہو۔ اگر تم ایسا کرتے رہے تو تمہاری سعی و عمل کے ایسے درخشندہ نتائج سامنے آ جائیں گے جو تمہارے نظام کی صداقت کا زندہ ثبوت بن جائیں گے اور کسی کو اس سے محال انکار نہیں ہوگا۔ بھران کے جو اس کی مخالفت میں ظلم و استبداد پر ترائیں لیکن تمہیں ان سے ڈرنے اور خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ڈرنا صرف اس سے چاہیے کہ کہیں قانون خداوندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹ جلتے۔ ہم نے تو یہ ضابطہ قوانین دیا ہی اس لئے ہے کہ تمہیں زندگی کی تمام خوشگواریاں حاصل ہوں اور تمہارا ہر قدم منزل مقصود کی طرف اٹھتا جائے۔

کَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمُ الْآيَاتِ نَا وَيُزَكِّيْكُمْ
وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ (۱۵۱)

اور اس مقصد کے لئے ہم نے تمہاری طرف اس رسول کو بھیجا ہے کہ یہ ہمارا پیغام تم تک پہنچائے۔ تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے یعنی یہ بتائے کہ خدا کا قانون (کتاب) کیا ہے اور اس کی غرض و غایت (حکمت) کیا۔ یعنی وہ کچھ بتائے جسے تم اس سے پہلے نہیں جانتے تھے۔ اگر تم اس سے واقف ہوتے تو وحی کے بھیجنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اور اس کے ساتھ ہی تمہاری تربیت اس طرح کرے کہ تمہاری ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ تم اس پروگرام پر عمل پیرا ہو اور پھر دیکھو کہ منزل کس طرح خود کھینچ کر تمہاری طرف نہیں آجاتی۔

المختصر:-

فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ وَاَشْكُرْ لِي وَلَا تَكْفُرُون (۱۵۲)

تم اس طرح، ہمارے مقرر کردہ نصب العین حیات کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا، اَذْكُرْكُمْ۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے اور گہرے غور و فکر کا متقاضی۔

لفظ ذکر کا ایک مفہوم سابقہ صفحات میں آیت (۱۴۱) کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے دوسرے معنی ہیں

کسی کے حقوق کی حفاظت کرنا، شرف و عظمت عطا کرنا، سورہ مؤمنون میں ہے کہ ذِكْرُهُمْ مَّعْرِضٌ عَنْ ذِكْرِہُمْ

ذکر کا وسیع تر مفہوم

ان عقل کے اندھوں کو دکھینو۔ ہم ان کے ہاں ان کی بڑائی اور عظمت، شرف و مجد، سرفرازی اور سر بلندی کا سامان

لے کر آئے ہیں (یعنی وہ ضابطہ ہدایت جو انہیں یہ سب کچھ عطا کر دے گا)، اور ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اُس عظمت اور سرفرازی سے منہ موڑ رہے ہیں اس سے اعراض برت رہے ہیں، (نیز ۱۱۴) سورہ انبیا میں ہے۔ لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (۱۱۴)۔ ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں، اگر تم ذرا عقل و فکر سے کام لو، تو تمہیں نظر آئے گا کہ خود تمہارا ہی ذکر ہے، اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ قرآن جو کچھ بیان کرتا ہے وہ انسانی زندگی ہی سے متعلق ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس میں خود تمہاری عزت و عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ ذرا آگے چل کر، حضور نبی اکرمؐ کی لسان مبارک سے کہلوا یا: هٰذَا ذِكْرٌ مِّنْ مَّعْنٰی وَ ذِكْرٌ مِّنْ قَبْلِیْ۔ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ (۱۱۴)۔ جو مسلک حق و صدا میری جماعت اختیار کر رہی ہے اور جسے انبیاء سابقہ کے متبعین نے اختیار کیا تھا، اس کے نتیجہ میں جو شرف و محمد انہیں حاصل ہوا وہی انہیں بھی حاصل ہوگا۔ سورہ زخرف میں ہے: اِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِکَ (۱۱۳)۔ اس قرآن میں، اے رسولؐ! تیرے لئے اور تیری قوم کے لئے شرف و عظمت کا سامان مضمر ہے۔

ذکر کے اس مفہوم کی روشنی میں زیر نظر آیت کی طرف آئیے جس میں کہا گیا ہے کہ: فَاذْكُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ۔ (۱۱۶)۔ اس کے معنی صاف ہیں کہ تم میرے مقرر کردہ پروگرام کو اپنے سامنے رکھو۔ اسے اپنا نصب العین جیات قرار دے لو۔ میں اس کے بدلے (نتیجہ) میں تمہیں شرف اور عظمت عطا کر دوں گا۔

تقدیر کے متعلق، جلد اول میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۵۵۔ آیت ۱؛ صفحہ ۱۶۳ آیت ۲؛ صفحہ ۱۸۱ آیت ۲؛ صفحہ ۲۴۴ آیت ۲)۔ اس مقام پر صرف اتنا دہرا دینا کافی ہوگا کہ آغاز کار (INITIATIVE)

انسان کی طرف سے ہوتا ہے اور خدا کا قانون اس کا اتباع کرتا ہے۔

آغاز کار انسان کے ہاتھ میں ہے (اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ یہاں یہ کہا کہ فَاذْكُرُوْنِیْ۔ تم میرے مقرر کردہ پروگرام کو اپنے سامنے رکھو۔ اَذْكُرْکُمْ۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہیں شرف و عظمت عطا کر دوں گا۔ تم یہ کر دو گے تو میں یہ کر دوں گا۔ تقدیر۔ یعنی قانون اور اس کے نتیجے کا ربط باہمی ان دونوں فطوریات میں واضح ہو جاتا ہے۔ اور اسی سے حقوق (RIGHTS) اور ذمہ داریوں (RESPONSIBILITIES)

کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ حقوق و ذمہ داریوں کے پورا کرنے سے ثابت ہوتے ہیں۔ جو شخص اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا، اس کا کوئی حق ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس پر کوئی ذمہ داری عائد کی جائے اسے

اس امر کا یقین محکم ہو کہ اگر میں نے اس ذمہ داری کو پورا کر دیا تو میرا یہ حق ثابت ہو جائے گا۔ مجھے یہ کچھ مل کر رہے گا۔ اگر اسے اس کا یقین نہ ہو تو وہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوگا۔ اس اعتماد اور یقین دہی کے لئے قرآن کریم میں بار بار کھبا گیا ہے کہ اللہ کبھی وعدہ خلائی نہیں کرتا۔

آپ نے دیکھا کہ اس ایک نکتہ سے وہ تمام الجھنیں کس طرح دور ہو جاتی ہیں جنہوں نے اس وقت دنیا میں اس قدر انتشار اور فساد پھیلا رکھا ہے۔

فَلَا تَكُونُوا مِثْلَ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَانُوا عَلَىٰ يَدِ الْوَيْلِ ۖ

وَأَشْكُرُوا لِلَّهِ ۖ وَلَا تَكْفُرُوا ۚ (۱۵۲)

ہمیں جو ایسی عظیم نعمت دی گئی ہے، اس کی قدر کرو۔ اس ضابطہ کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔

شکر کا مفہوم، جلد دوم صفحہ ۲۶۳، زیر آیت (۱۵۲)، بتایا جا چکا ہے۔ یہاں کھبا گیا ہے کہ ہم نے کہا ہے کہ اگر تم ہمارے مقرر کردہ پروگرام کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لو گے تو ہم تمہیں زندگی کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں عطا کر دیں گے۔ لیکن اسے یاد رکھو کہ تمہیں ان نعمتوں کا شکوہ اور شکوہ کرنا ہوگا، یعنی انہیں خدائی راہنمائی کے مطابق، منفعت عامہ کے لئے کھلا رکھنا ہوگا۔ دبا کر بیٹھ نہیں جانا ہوگا۔ حج کے سلسلہ میں جو کچھ تھا کہ تم اقوامِ عالم کو دعوت دو کہ آکر دیکھیں کہ ہمارا نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ۔ (۲۲)۔ تو اسی کا نام ”شکر“ ہے جس کی ضد ”کفر“ ہے۔ کفر کے معنی چھپانا اور دبانے ہیں۔



پرتحاب

زمگاہِ حیات

آیات — ۲/۱۵۳ تا ۲/۱۷۶

- | | |
|--|--|
| (۱) نظامِ خداوندی کی راہ میں پیش آنے والے خطرات کا مقابلہ۔ | (۶) لعنت، ہرگز کے۔ |
| (۲) درود کا مفہوم۔ | (۷) باز آفرینی کے مواقع۔ |
| (۳) شعارِ اللہ صفا و مرہ۔ | (۸) خدا کے ساتھ محبت کا غلط مفہوم۔ |
| (۴) قرآن مجید واضح کتاب ہے، اس میں کوئی ابہام نہیں۔ | (۹) حبِ اللہ اور عرس کی تقریبات۔ |
| (۵) قرآنی حقائق کو چھپانے کی کوششیں۔ | (۱۰) حبِ اللہ کا قرآنی مفہوم۔ |
| (۱۱) ناسخ و منسوخ کا عقیدہ۔ | (۱۱) تناسخ کا عقیدہ باطل ہے۔ |
| (۱۲) وحی خفی اور جلی کا عقیدہ۔ | (۱۲) فحشاء اور سیئات کا مفہوم۔ |
| (۱۳) فقہ۔ | (۱۳) مسلکِ تقلید کی تباہ کاریاں۔ |
| (۱۴) باطنی معانی۔ | (۱۴) حرام اور حلال کا نظریہ حرام اشیاء کی فہرست۔ |
| | (۱۵) مذہبی پیشوائیت کا کاروبار۔ |



چوتھا باب

رزمگاہِ حیات

سابقہ باب میں یہ حقیقت سامنے آگئی ہے کہ :-

(۱) اسلامی نظام کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ اس نظام کا مرکزِ محسوس (کعبہ) اس جماعت کی تخیل میں رہے جو اس نظام کے قیام کی ذمہ دار ہے۔

(۲) مخالف قوتوں کی انتہائی کوشش ہوگی کہ یہ مرکز اس جماعت کے ہاتھ میں نہ جانے پاتے۔ اس لئے ان قوتوں سے تصادم ناگزیر ہوگا۔

(۳) اس تصادم سے عہدہ برآ ہونے کے لئے پوری تیاری کی ضرورت ہوگی اور اس تیاری کے سلسلہ میں قدم اول اپنے اندر نفسیاتی تغیر پیدا کرنا ہوگا۔

(۴) نفسیاتی تغیر کے ضمن میں یہ سمجھ رکھنا ضروری ہے کہ وہ تغیر، خود بخود مقصد حاصل کر کے نہیں دے دیتا۔ اس سے وہ صلاحیتیں بیدار اور وہ توانائیاں متحرک ہو جاتی ہیں جو حصولِ مقصد کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اس تصادم کا مقابلہ ان صلاحیتوں اور توانائیوں کے بل بوتے پر کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی اصطلاح میں، اس نفسیاتی تغیر کا نام اگر ایمان ہے تو حصولِ مقصد کے لئے ان صلاحیتوں کی نمود اور اس توانائی کا شہود اعمالِ صالحہ کہلاتے گا۔

آئندہ آیات میں اس تصادم اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے اس اصول کو نمایاں کیا گیا ہے کہ :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ . إِنَّ اللَّهَ

مَعَ الصَّبْرِ - (۱۵۳)

اس نظام کی اتامت کی راہ میں (جو محدود گروہوں اور قوموں کے مفاد کے خلاف عالمگیر انسانیت کے مفاد کا علمبردار ہے) بڑی بڑی رکاوٹیں پیش آئیں گی اور سخت مشکلات کا سامنا ہوگا (مفاد پرست گروہ اسے آسانی سے قائم نہیں ہونے دیں گے)۔ ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے دو باتوں کو یاد رکھو۔ ایک تو یہ کہ کچھ بھی ہو۔ استقامت اور ثبات کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دو اور دوسرے یہ کہ مخالفین خواہ کوئی راہ اختیار کریں، تم اُسی راستے پر چلو جو تمہارے خدا نے تمہارے لئے تجویز کیا ہے۔ اس سے تمہیں قانونِ خداوندی کی رُوس سے، بڑی تقویت حاصل ہوگی۔ جماعتِ مومنین سے کہا یہ گیا ہے کہ ان مشکلات پر قابو پانے امدان تصادمات کا مقابلہ کرنے کے لئے دو باتوں کا یاد رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ خطرات کتنے ہی حوصلہ شکن اور مشکلات کیسی ہی ہوش رُبا کیوں نہ ہوں، استقامت اور ثبات کا کا دامن تمہارے ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ تمہارے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائے اور دوسرے یہ کہ مخالفین خواہ کوئی راہ اختیار کریں، تم اُسی راستے پر چلتے جانا جسے تمہارے خدا نے تمہارے لئے متعین کیا ہے کوئی غلط راہ اختیار نہ کرنا۔ اس سے تمہیں بھرپور توانا پنا حاصل ہو جائیں گی۔

استعانت بالصبر والصلوة

اس آیت میں تین الفاظ آئے ہیں۔ استعانت، صبر اور صلوة۔ استعانت کا مفہوم، جلد اول صفحہ ۳، زیر آیت (۱۴) بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سے مراد ہوتی ہے قوانینِ خداوندی کے اتباع سے انسانی صلاحیتوں اور توانائیوں کا نشوونما پانا اور ان میں کامل اعتدال اور توازن پیدا ہو جانا۔

صبر کا مفہوم، جلد دوم صفحہ ۲۲۲، زیر آیت (۱۵۳) سامنے آچکا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں خطرات کے مقابلہ میں اس طرح کھم کھڑے ہو جانا کہ پائے استقامت میں ذرا سی لغزش نہ آنے پائے۔ اپنی ذات کو ایسا متوازن بنالینا کہ حوادثِ زمانہ کے ہچکولے اسے ذرا کبھی ڈانواں ڈول نہ کر سکیں اور صلوة کی پوری تشریح جلد اول صفحہ ۹۵، زیر آیت (۲) سامنے آچکی ہے۔ اصولی طور پر اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کا مسلسل اتباع کئے جانا۔ کسی کے ساتھ بالالزام وابستہ اور پیوست رہنا۔

وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ کے الفاظ آیت (۱۵۳) میں بھی آچکے ہیں۔ (دیکھیے جلد دوم صفحہ ۲۲۲) ولما ان (الفاظ) کے بعد کہا گیا تھا کہ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ۔ (۱۵۳)۔ صبر اور صلوة کے ذریعے اعانت طلبی بڑا اہمیت آزا مرحلہ اور بڑی کٹھن منزل ہے اس لئے عام لوگوں پر یہ مہم بڑی گراں گزرتی ہے۔

اسے وہی لوگ سر کر سکتے ہیں جو دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرتے ہیں اور جو ان کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج کے احساس سے خائف رہتے ہیں۔ یہاں پھر ان الفاظ (صبر اور صلوة) کو دہرایا گیا اور ان کے بعد کہا گیا کہ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ - (۱۵۳)۔ خدا کی رفاقت، اس کے قوانین کی رُو سے چلنے والی تائید و تقویت صرف اپنی کو ملتی ہے جو خطرات کا مقابلہ استقامت اور استقلال سے کریں۔ اس اصول و وضاحت کے بعد کہا کہ یہ خطرات بڑے لرزہ انگیز ہوتے ہیں۔ ان میں ہر قسم کے مصائب جھیلنے اور ہر طرح کے نقصانات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں بعض اوقات جان تک کی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا — لیکن اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ :-

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌۢ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّ لٰكِنْ لَا تَشْعُرُوْنَ - (۱۵۴)

یاد رکھو! دنیا میں نظامِ خداوندی کو متشکل کرنا پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کی راہ ہوتی ہے۔ اس میں، اور تو اور جان تک بھی دے دینی پڑتی ہے۔ لیکن جو اس جدوجہد میں جان دیتا ہے، وہ مرنے نہیں — اُسے مردہ سمجھنا ہی نہیں چاہیے (۱۵۴)۔ وہ حیاتِ جاوداں سے بہرہ یاب ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح تم اس طبعی زندگی کا ادراک حواس کے ذریعے کر سکتے ہو — یعنی تم دیکھ سکتے ہو کہ فلاں شخص زندہ ہے یا نہیں — اُس زندگی کا ادراک اس طرح نہیں کر سکتے۔ وہ محسوسات کی دنیا سے باہر کی چیز ہے۔ (البتہ اس کے امکان کو سمجھ سکتے ہو)۔

جو ان خطرات کا سامنا اور ان تضادات کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دے دیتے ہیں؛ وہ مرتے نہیں۔ انہیں مردہ

سمجھنا ہی نہیں چاہیے (۱۵۴)۔ وہ حیاتِ جاوداں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ لیکن

مقتولین فی سبیل اللہ | جس طرح تم انسان کی طبعی زندگی اور موت کا ادراک حواس کے ذریعے کر سکتے ہو

— یعنی تم دیکھ سکتے ہو کہ فلاں شخص زندہ ہے یا مردہ — راہِ حق میں جان دینے والوں کی زندگی کا ادراک

اس طرح نہیں کر سکتے۔ ان کی وہ زندگی محسوسات کی دنیا سے ماوراء ہے۔ تم عقل کی رُو سے اس کے امکان کو تو سمجھ

سکتے ہو، اس کی کنہ و حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ یعنی یہ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ زندگی کس قسم کی ہے۔ شعور کے متعلق

جلد اول صفحہ ۲۔ زیر آیت (۲)، بتایا جا چکا ہے کہ اس سے بالعموم مراد، ادراک بالحواس ہوتا ہے۔ یعنی (SENSE - PERCEPTION)۔ اس ذریعہ علم سے تم ان کی اُخروی زندگی کی کنہ و حقیقت نہیں سمجھ سکتے۔

خدا کی راہ میں جان دینے والوں کو ہمارے ہاں شہید جمع شہداء کہا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں ان کے لئے یہ لفظ نہیں آیا۔ اس میں ان کے لئے "مقتولین فی سبیل اللہ" کی اصطلاح آئی ہے جس کی تشریح جلد اول صفحہ ۲۵ آیت (۱۶) پر کی جا چکی ہے۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ انہیں مردہ مت کہو۔ آیت (۱۶) میں ہے کہ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا۔ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ۔ (۱۶) ان لوگوں کے متعلق گمان تک بھی نہ کرو کہ وہ مر گئے۔ وہ خدا کے ہاں زندہ ہیں اور وہاں انہیں رزق بھی عطا ہوتا ہے۔ "مقتولین فی سبیل اللہ" کی حیات کے متعلق اپنے مقام پر گفتگو کی جائے گی۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ وہ اُس دُعا میں زندہ ہوتے ہیں جسے آخرت کہہ کر پکارا گیا ہے اور جسے یہاں عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ (اپنے خدا کے ہاں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان کا ہماری دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اُن کی اُس زندگی کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ۔ وَ لَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ۔ (۱۷)۔ تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اسے سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کے متعلق بحثیں اور مناظرے ہوتے رہتے ہیں اور دعوے کئے جاتے ہیں کہ ہم نے انہیں یہاں دیکھا اور وہاں دیکھا ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ (دہلیں پاکستان اور بھارت) کے زمانے میں تو ان سبز عماموں اور سفید گھوڑیوں والوں کے شریک جہاد ہونے اور انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے افسانے عام زبان زدِ خلالت تھے لیکن یہ سب "افسانے" تھے جن کے خلاف میں نے اُسی زمانے میں لکھا تھا۔ (ضمناً) اُس جنگ میں چونکہ ہماری فتح ہوئی تھی اس لئے اس میں تو انہیں شریک ہوتے اور "راوی کے پل پر ہم پھینکتے" سب سے دیکھا لیکن ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہمیں شکست ہوئی تو یہ کسی کو نظر نہ آئے!! بہر حال ہم کہہ رہے تھے کہ مقتولین فی سبیل اللہ کی زندگی کی حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔ نہ ہی ان کا کوئی تعلق ہماری دنیا سے ہوتا ہے۔ وہ "عِنْدَ رَبِّهِمْ۔" (اپنے رب کے ہاں) زندہ ہوتے اور سامانِ نشوونما (رزق) پاتے ہیں۔ اگلی آیت میں کہا کہ:-

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَ
الْأَنْفُسِ وَالْثَمَرَاتِ۔ وَبَشِيرِ الصَّابِرِينَ۔ (۱۸)

۲
۱۵۵

ان تصادمات میں کہیں جنگ و قتال اور دیگر خطرات کا اندیشہ ہو گا۔ کہیں سامانِ خورد و نوش کی کمی ہو گی کہیں مال و

جان کا نقصان ہو گا۔ کہیں باغ اور کھیت اجڑیں گے۔ یہ تمام خطرات اور نقصانات حقیقت

استلزام مفہوم ہمارے لئے یہ دیکھنے کے مواقع بہم پہنچائیں گے کہ ہمارے ذات کی کس قدر نشوونما ہو چکی

ہے اور تم میں مقابلہ کی کس قدر صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ جو لوگ ان دشوار گزار مراحل میں ثابت قدم رہیں گے ان کے لئے کامیابی اور کامرانی کی خوشخبریاں ہوں گی۔

(ابتلا کا مفہوم جلد دوم ص ۲۴۴۔ زیر آیت (۲/۱۶۴) اور زیر نظر جلد میں زیر آیت (۲/۱۶۴) پیش کیا جا چکا ہے۔)

الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ . (۱۵۶)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جو مصائب اور انبوہ نوائب میں ان کی نگاہیں اس نقطہ سے ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہٹیں گی کہ ہمارا مقصد زندگی، نظامِ خداوندی کا قیام ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر رکھا ہے (۲/۱۶۴) کیا مال اور کیا جان ہم نے اپنا سب کچھ خدا کے ہاتھ بیچ دیا ہوا ہے (۲/۱۶۴)۔ یہ ہمارا اپنا ہے ہی نہیں۔ اس لئے اسے اس کے اصلی مالک (خدا) کے حوالے کر دینے میں ہمیں تامل کیا ہو سکتا ہے؟ مشکلات آتی ہیں تو آئیں، ہمارا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھے گا (۲/۱۵۶)۔ وہی ہمارا مقصود و منہی ہے اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں گے۔ مصیبتوں سے ڈر کر کسی اور طرف سُخ نہیں کریں گے۔

”إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ کا صحیح مفہوم بڑا اہم اور گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ اس کی تفصیلی تشریح جلد اول میں کی جا چکی ہے۔ دیکھئے ص ۲۴۴۔ آیت (۲/۱۵۶) ص ۲۴۳۔ آیت (۲/۱۵۶) ص ۲۴۳۔ بالخصوص ص ۲۴۴۔ آیت (۲/۱۵۶)۔ جہاں مذکورہ بالا مفہوم کی وضاحت ملے گی۔

اس کے بعد ہے :-

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّهَدُونَ . (۱۵۷)

یہی وہ جماعت ہے جو اپنے رب کے نزدیک مستحق ہزار تبرک و تہنیت ہے۔ انہی کے لئے سامانِ نشوونما کی فراوانیاں اور سچا کرم کی گہریابیاں ہیں اور ان کا منزل مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ (نیز دیکھئے جلد اول ص ۲۴۵۔ آیت ۲/۱۵۷)۔ آیت کا مطلب واضح ہے لیکن اس میں ”صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ“ سے نگاہ کا رخ ایک اور گوشے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو بڑا اہم ہے اور خصوصی غور و فکر کا مستحق۔

سورہ احزاب کی حسب ذیل آیت آپ نے ہزاروں مرتبہ سنی ہوگی۔ اسے وعظ کی ہر مجلس میں، میلاد کی ہر محفل میں، نعت خوانی کے ہر اجتماع میں دہرایا جاتا اور انتہائی خلوص اور عقیدت سے پڑھا اور سنایا جاتا ہے یعنی :-

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ
وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۲۳)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے :-

تحقیق اللہ اور فرشتے اس کے درود بھیجتے ہیں اور پر نبی کے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو، درود بھیجو اور اس کے اور سلام بھیجو سلام بھیجنا۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدین)

آیت کے الفاظ میں ”يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ“ سوال یہ ہے کہ اس کا ترجمہ ”درود بھیجنا“ کیسے کیا گیا۔ درود کا لفظ

عربی زبان کا نہیں۔ لفظ نماز کی طرح یہ بھی قدیم فارسی (پہلوی) زبان کا ہے۔ ایران کے محوس

دروں اصطلاحات، صلوٰۃ اور صلوات نکا ہوں سے اوجھل ہو گئیں۔ ایسی اوجھل کہ اب ان کا تصور تک

ذہن میں نہیں آتا۔ (نماز کے متعلق جلد اول صفحہ ۱۲۲۔ آیت (۲) میں گفتگو ہو چکی ہے) نتیجہ یہ کہ وہ انفتلابی

پر و گرام جو ان اصطلاحات میں مضمر تھا، گم ہو گیا۔ صلوٰۃ کا مفہوم، خاص طریق پرستش میں محدود ہو گیا اور صلوات

اللہ علیہم۔ کا مقصود، درود پڑھنے میں تبدیل ہو گیا۔ بیسیوں قسم کے درود تصنیف ہوئے اور ہر درود

کے وظیفے کے مختلف طریق وجود میں آ گئے۔ کچھ حلی، کچھ خفی۔ کچھ کتابوں میں، کچھ سینہ بسینہ۔ کچھ روایات کے

ذریعے، کچھ علم لدنی (باطنی علم) کی رو سے۔ درود شریف کی فضیلت میں کتابوں پر کتابیں لکھی گئیں۔ چنانچہ اب کیفیت

یہ ہو چکی ہے کہ درود شریف اور اس کی برکات ایسا مسئلہ بن چکے ہیں کہ ان کے متعلق کچھ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت

ہی محسوس نہیں ہوتی حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اس کے حقیقی (قرآنی) مفہوم کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کرے تو دہائی

مچا دی جاتی ہے کہ اس کے ایمان میں خلل واقع ہو گیا ہے۔ اسے ان شیطانی وسوسوں سے فوراً توبہ کرنی چاہیے۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ مقام کس قدر نازک اور پرخطر کیا دشوار گزار ہے۔ لیکن قرآن کریم کے طالب العلم ہونے اور

اس کے مفہوم کو واضح طور پر بیان کرنے کی وجہ سے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں ان تمام مقامات کا مفہوم

قرآن کی روشنی میں سامنے لاؤں۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو یہ قرآن سے بددیانتی کے مرادف ہوگا جو بارگاہ خداوندی

میں سکین ترین جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے محفوظ رکھے۔

میں شروع سے یہ کہتا چلا آ رہا ہوں کہ قرآن کریم کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ اپنی اپنی استعداد

اور بصیرت کے مطابق، اور چند شرائط کے تحت، اس کا مفہوم بیان کیا جاسکتا ہے۔ جب یہ صورت عام قرآنی مفردات (الفاظ) کی ہے تو اس کی اصطلاحات کا معاملہ اس سے بھی زیادہ اہم اور مشکل ہے۔ قرآنی اصطلاحات بڑی جامع اور خاص تصورات کی حامل ہیں اس لئے ان کی جگہ کوئی اور اصطلاح استعمال نہیں کی جاسکتی۔ اگر ایسا کیا جائے تو ہم قرآن سے دُور ہٹ جائیں گے۔ مثلاً ہم نے قرآنی اصطلاح صلوٰۃ کی جگہ نماز کی اصطلاح وضع اور اختیار کی تو (ایک بار) فکر و بصیرت جانتے ہیں کہ ہم قرآنی تصور صلوٰۃ سے کس قدر دور چلے گئے۔ یہ وجہ ہے جو میں تاکید اکہا کرتا ہوں کہ ہمیں قرآنی اصطلاحات کی جگہ دوسری اصطلاحات کبھی اختیار نہیں کرنی چاہئیں۔

قرآنی اصطلاحات

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، نماز اور درود (وغیرہ) قدیم پہلوی زبان کے الفاظ ہیں جو مجوسیوں کے مذہب میں عام مستعمل تھے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی (عربی زبان کی) اصطلاحات کی جگہ یہ اصطلاحات اُس وقت رائج ہوئیں جب اسلام ایران میں پہنچا۔ اس امر کی تحقیق کرنا اسلام کی تاریخ (مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ) مرتب کرنے والے کی ذمہ داری ہوگی کہ قرآنی اصطلاحات کی جگہ یہ مجوسی اصطلاحات کن عوامل و عناصر کے ذریعے اسلام میں درآئیں، انہیں رائج کرنے کے لئے کیا کیا کوششیں کی گئیں اور اس سے مقصد کیا تھا۔ میں نے اپنی کتاب — شاہکار رسالت — کے آخری باب میں مختصراً اس پر روشنی ڈالی ہے لیکن یہ موضوع اس سے زیادہ تفصیلی تحقیق کا متقاضی ہے۔ اس قسم کی (اسلام کی) تاریخ مرتب کرنے کا خیال ایک عرصہ سے میرے ذہن میں ہے لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ جو پروگرام اس وقت میرے زیرِ نظر و ترتیب ہے، وہ مجھے اس کی فرصت دے گا یا نہیں۔ اس ضمن میں میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ :-

ہزاروں حسرتیں ایسی کہ ہر حسرت پہ دم بکھلے بہت بکھلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم بکھلے
میں نے یہ الفاظ اس لئے صفحہ قرطاس پر رقم کر دیئے ہیں کہ اگر کوئی صاحبِ ہمت، الدین کے صحیح تصور کو
امت کے سامنے لانے کا ارادہ کرے، تو اسے معلوم ہو کہ اس تحقیق میں اسے قدیم اول کس سمت کو اٹھانا ہوگا۔

(۰)

اس تمہید کے بعد آئیے آیت اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (۳۳) کے قرآنی مفہوم کی طرف۔ اس آیت کو تو آپ نے (جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے) ہر منبر و محراب اور ہر مذہبی محفل و مجلس سے ہزاروں مرتبہ سنا ہوگا۔ لیکن اس آیت سے چند ہی آیات پہلے، ایک اور آیت ہے جسے آپ نے بہت کم سنا ہوگا۔

وہ آیت یہ ہے:-

هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ . وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيْمًا . (۲۳۳)

اس کا ترجمہ شاہ رفیع الدین یوں کرتے ہیں۔

(اے جماعتِ مومنین، اللہ) وہ ہے جو رحمت بھیجتا ہے اور پڑھتا ہے اور فرشتے اس کے توحہ نکالے تم کو اندھیروں سے طرفِ روشنی کے۔ اور ہے ساتھ ایمان والوں کے مہربان۔

آپ مہرِ دست، اس آیت کے صرف پہلے حصے کو لیجئے۔ یعنی هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ۔ کو۔ آیت (۲۳۴) میں کہا گیا تھا کہ "إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ"۔ اور آیت (۲۳۵) میں ہے هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ۔ یعنی اللہ اور اس کے ملائکہ جو عملِ نبی کے ساتھ کرتے ہیں، وہی عمل وہ جماعتِ مومنین کے ساتھ بھی کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اگر اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں تو وہ اسی طرح مومنین پر بھی درود بھیجتے ہیں۔ (الفاظِ دونوں آیتوں میں ایک ہی ہیں)۔ آپ دیکھئے کہ شدّٰنِ کریم کی ان دو آیتوں میں جو ایک ہی سورہ میں، تھوڑے سے فاصلہ پر واقع ہوئی ہیں) اللہ اور اس کے ملائکہ کی طرف سے جو بات نبی کے لئے کہی گئی ہے وہی بات مومنین کے لئے بھی کہی گئی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں، نبی اکرم پر درود بھیجنے کا ذکر تو اس کثرت سے ہوتا ہے لیکن مومنین پر درود بھیجنے کا کہیں مذکرہ نہیں ہوتا۔ ہم پہلے آیت — هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ (۲۳۳) کو لیتے ہیں۔ کیونکہ اس کا مفہوم واضح ہو جانے سے آیت (۲۳۴) کا مفہوم خود بخود سامنے آجائے گا۔

مفرداتِ امامِ راغب میں صَلَّی عَلَیْہِ کے معنی لکھے ہیں، تعظیم کرنا، دعا دینا، حوصلہ افزائی کرنا۔

پروان چڑھانا، نشوونما کرنا۔ کسی قسم کی خرابی یا فساد پیدا نہ ہونے دینا (لَقَا الْقُرْآنَ) صَلَّی عَلَیْہِ کے معنی

میں سے کون سا معنی زیادہ موزوں ہے۔ آیت (۲۳۳) میں کہا یہ گیا ہے کہ: هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ۔ اللہ اور اس کے ملائکہ، مومنین کے ساتھ "صلی علی" کا عمل کرتے ہیں تاکہ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ اس سے واضح ہے کہ خدا اور ملائکہ کی طرف سے "صلی علی" کا عمل ایسا ہے جس سے جماعتِ مومنین تاریکیوں سے روشنی کی طرف آجاتی ہے۔

ظلمت (تاریکیوں) سے نور کی طرف آنے کا مطلب کیا ہے، اسے سورہ ابراہیم کی اس آیت میں واضح کیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ.... (۱۲۸) ہم نے موسیٰ کو اپنا ضابطہ قوانین دے کر اس مقصد کے لئے (مصر واپس) بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو ظلمت سے نور کی طرف نکال لائے: قوم بنی اسرائیل، مصر میں فرعون کی محکومیت کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ان کی اس حالت کو قرآن کریم نے ظلمت کہہ کر پکارا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو وہاں بھیجا گیا کہ وہ اس مظلوم و مقہور قوم کو فرعون کی غلامی کے شکنجے سے چھڑا کر آزادی کی فضا سے بسط کی طرف لے آئے۔ اسی سورہ میں چار آیتیں پہلے کہا گیا ہے کہ: كُتِبَ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ۔ (۱۲۹) اے رسول! ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف اس لئے نازل کی ہے کہ اس کے ذریعے تو نوع انسان کو ظلمت سے نور کی طرف لے آئے۔ "سورہ بقرہ میں ہے اللہ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ.... (۱۳۰) اُس جماعت (مومنین) کو اللہ کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہے جو انہیں ظلمت سے نور کی طرف لے جائیگی۔"

ان تصریحات سے واضح ہے کہ هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَیْكُمْ وَمَلَائِكَةُ اللّٰہ اور اس کے ملائکہ کا ایسا عمل ہے جس سے یہ جماعت ہر نوع غلامی سے رستگاری حاصل کر کے، صحیح آزادی اور حریت کی فضا میں بال کشا ہو جائے گی۔ ایسا نظام قائم کر لے گی جس میں نہ کوئی کسی کا محتاج ہو نہ محکوم۔ اس نظام کا قیام خود منشاء خداوندی ہے لیکن یہ قائم ہوتا ہے ایک جماعت کے ہاتھوں۔ جو جماعت اس مقصد کو لے کر اٹھتی ہے اسے خدا کی نصرت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُخْرِجْ أَقْدَامَكُمْ (۱۳۱)۔ اے جماعت مومنین! اگر تم خدا کی مدد کے لئے اٹھ کھڑے ہو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ اور وہ مدد کیا ہوگی۔ وہ تمہیں ثابت قدمی عطا کرے گا۔ تمہارے پاؤں میں بے غزش نہیں آنے دے گا، کہا کہ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ۔ (۱۳۲)۔ جماعت مومنین کی مدد کرنا، ہم پر واجب ہو جاتا ہے۔ خدا کی یہ مدد جس سے اس جماعت کو ثبات و استقامت حاصل ہو جاتی ہے، ملائکہ کی وساطت سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ جنگ بدر جیسے زلزلہ انگیز معرکہ کے سلسلہ میں، کہا کہ خدائے ملائکہ کو حکم دیا کہ فَشَبَّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا.... (۱۳۳)۔ جماعت مومنین (مجاہدین) کو ثبات و استقامت عطا کر دو۔ اسی کو نصرت خداوندی کہا گیا ہے۔ (۲۴-۲۵ : ۱۲۳-۱۲۲)۔ (ملائکہ کے متعلق جلد دوم، باب اول صفحہ ۶۶ پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے)۔

تصریحاتِ بالا کی روشنی میں آیت (۳۳) کا مفہوم واضح ہو گیا۔ اس میں سلسلہ کلام یوں چلا آتا ہے کہ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا (۳۳)۔ اے جماعتِ مومنین! تمہارا فرض یہ ہے کہ تم اس ضابطہ قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے بھی رکھو اور دنیا میں اس کا زیادہ سے زیادہ چرچا بھی کرو۔ وَ سَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (۳۳)۔ اور اس کی عملی تنفیذ کے لئے دن رات سرگرم عمل رہو۔ هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا (۳۳)۔ اگر تم ایسا کرتے رہے تو خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید و نصرت تمہیں حاصل رہے گی۔ تمہاری سعی و عمل کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی۔ تمہارے نظام میں کسی قسم کا خلل اور فساد واقع نہیں ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم زندگی کی ہر قسم کی تاریکیوں سے نکل کر جگمگاتی روشنی میں آ جاؤ گے اور تمہاری صلاحیتیں نشوونما پاتی چلی جائیں گی۔

یہاں سے ہم آیت (۳۴) کی طرف آ جاتے ہیں جس میں کہا کہ إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ۔ اس نبی کو خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید و نصرت حاصل ہے جیسا کہ فرمایا۔ وَيَنْصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَظِيمًا (۳۴)۔ اے رسول! اللہ تمہیں ایسی نصرت عطا کرے گا جس سے تمہیں غلبہ اور مکن حاصل ہو جائے۔ إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا..... (۳۵) ہم اپنے رسولوں اور جماعتِ مومنین کی اسی دنیاوی زندگی میں مدد کیا کرتے ہیں۔

آیت کے پہلے حصہ میں کہا کہ إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ۔ اس نبی کو اللہ اور اس کے ملائکہ کی نصرت حاصل ہوگی۔ لیکن دوسری جگہ رسول اللہ سے کہہ دیا کہ يٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۳۶)۔ اے رسول! تمہارے لئے صرف اللہ کی مدد کافی نہیں۔ اس کے ساتھ اس جماعت کی مدد بھی ضروری ہے جو تمہارا اتباع کرتی ہے۔ یعنی رسول اللہ کے مشن کے کامیاب ہونے کے لئے اللہ، اس کے ملائکہ اور جماعتِ مومنین کی تائید و نصرت کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے کہا کہ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ۔ (۳۷) اے جماعتِ مومنین! خدا کے اس پروگرام کو پروان چڑھانے کے لئے تم بھی اس رسول کی مدد کرو۔ دوسری جگہ ہے۔ تَعَزَّوْا وَتَوَقَّروْا..... (۳۸)۔ اس کی مدد کرو۔ اس کی عظمت کو قائم رکھو۔

مومنین رسول اللہ کی مدد کیے کریں گے؛ فرمایا۔ صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۳۹)۔ تم اس کی مدد کرو۔ وہ اس طرح کہ تم اس کی اطاعت کرو جیسا کہ اطاعت کرنے کا حق ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ عَزَّوَجَلَّ

وَنَصْرُوهُ وَاتَّبِعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ ۖ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ (۱۵۷) ”تم اسے تقویت پہنچاؤ۔ اس کی مدد کرو۔ وہ اس طرح کہ تم اس کتاب روشن کا اتباع کرو جسے اس کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ اس طرح تمہارا مشن کامیاب ہو جائے گا۔“

اب پوری آیت کو سامنے لائیے :-

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (۲۳)

یہ حقیقت ہے کہ خدا اور اس کے ملائکہ اس نبی (کے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے اس) کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس کی مدد کرتے ہیں۔ اے جماعت مومنین! تم بھی اس کی مدد کرو۔ وہ اس طرح کہ اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔

یہ ہے وہ آیت جس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے :-

اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر۔ اے جماعت مومنین! تم بھی اس پر درود اور سلام بھیجو۔

اور درود اور سلام بھیجنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ..... الخ کے الفاظ دہراتے رہو۔ دن رات اس میں مشغول رہو۔ آپ نے غور فرمایا کہ یُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ۔ کا ترجمہ ”درود بھیجنا“ کر کے، کس طرح ایک عظیم عملی انقلاب آفریں پروگرام کو چند الفاظ دہراتے رہنے میں تبدیل کر دیا؟ — تا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات — وہ قوم جس نے دنیا کے ہر باطل نظام کی بساط الٹ کر ان کی جگہ نظام خداوندی کو ممکن کرنا تھا، کس طرح چند الفاظ کو دہرا کر نجات حاصل کرنے کو اپنا مقصد حیات بنا کر بیٹھ گئی!۔

اس تبدیلی کے لئے کچھ زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑی۔ ”تلاوتِ قرآن مجید“ کا ترجمہ کر دیا، ”قرآن پڑھا کرو“ اَقِمْوْا الصَّلٰوةَ۔ کا ترجمہ کر دیا، ”نماز پڑھا کرو“۔ اور صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا اَسْلِمًا۔ کا ترجمہ کر دیا، ”رسول پر درود و سلام بھیجا کرو۔ یعنی چند الفاظ پڑھا کرو۔ یوں یہ دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ ”کیا کرو“ کو ”پڑھا کرو“ میں تبدیل کر دیا۔ وہی آیت جو شعلہ جوالہ تھی، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔

مست رکھو ذکر و فکر صبح و شام میں اسے پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے

جہاں تک محض پڑھنے، یعنی الفاظ دہراتے رہنے کا تعلق ہے، اس کا سلسلہ بہت پیچھے جاتا ہے۔ علم الانسان کے

کے ماہرین کا خیال ہے کہ انسانی زندگی کا پہلا دور، عہدِ پرستش (AGE OF WORSHIP) تھا۔ اس سے اگلا دور، عہدِ سحر (AGE OF MAGIC)۔ اس دور میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ بعض الفاظ میں (ان کے معانی میں نہیں بلکہ ان الفاظ میں) خاص تاثیر ہوتی ہے۔ اگر ان الفاظ کو خاص طریقہ سے دہرایا جائے تو وہ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے دورِ جہالت کے ان باطل تصورات کو ختم کر دیا لیکن ہم (قرآن کو چھوڑنے کے بعد) پھر اُس عہدِ سحر کی طرف لوٹ گئے۔ قرآنی آیات کے ورد و تظہیر اور ان کے الفاظ کو دہراتے رہنے کا مسلک، سب اُس دور کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں، جلد دوم، ص ۱۷۱۔ آیت (۲۸) دیکھئے ”درود پڑھنا“ بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ یہ کچھ کرنے کا کام تھا۔ محض پڑھنے کا نہیں۔

(۱۰)

ہم نے دیکھا ہے کہ ”صَلَّى عَلَى“ کے معنی حوصلہ افزائی کہنا اور دعا دینا بھی ہیں۔ سورۃ التوبہ میں ہے کہ ان اعراب میں ایسے لوگ ہیں جو اس نظام کے قیام کے لئے ”بطیبِ خاطر“ مالی امداد دیتے ہیں۔ ان کا اس سے مقصد ہوتا ہے قُرْبُیِّ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوَاتِ الرَّسُولِ۔ (۹)۔ خدا کے ہاں بلند درجات اور رسول کی طرف سے حوصلہ افزائی۔ یہ کس طرح سے ہوتی ہے، اس کے لئے رسول اللہ سے کہا کہ نَخُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيَهُمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ۔ اِنَّ صَلَوَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ (۹)۔ تم ان کے عطیات قبول کر لیا کرو، مناسب تعلیم و ترتیب سے ان کے قلب و نگاہ کی تطہیر اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرو۔ اور ان کے اچھے کاموں کی تحسین و ستائش سے ان کی حوصلہ افزائی کیا کرو۔ یاد رکھو! تمہاری تحسین (شادباش یعنی شادباش) ان کے لئے بڑی تسکینِ خاطر کا موجب ہوتی ہے۔

اور اس کے بعد آئیے آئیہ زیرِ نظر کی طرف جس میں کہا گیا ہے کہ اُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ۔ (۱۰)۔ یہ وہ سرفردش ہیں، جن پر خود خدا، تحسین و تبریک کے پھول نچا کر کرتا اور ان کی ذات کی مزید نشوونما کا سامان ہم پہنچاتا ہے۔

(۱۱)

کعبے سے متعلق آیات کے درمیان، محافظینِ کعبہ (نظامِ اسلامی کے خدام) کی صفات بیان کرنے کے بعد، پھر ایک آیت حج کے ضمن میں سامنے لائی گئی۔ کہا۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ۔ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوْ اعْتَمَرَ

۲
۱۵۸

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا. وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ۔ (۱۵۸)

اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے :-

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ سو جو کوئی حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ کا، تو کچھ گناہ نہیں اس کو کہ طواف کرے۔ ان دونوں میں اور جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی تو اللہ قادر دان ہے سب کچھ

جاننے والا۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسن)

اس آیت میں حج، عمرہ، صفا، مروہ، جناح کے الفاظ محتاج تشریح ہیں۔ حج کے متعلق، کعبہ کے سلسلہ میں سابقہ صفحات (دوسرا باب صفحہ ۵۶) میں ضمناً بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ اسلامی نظام میں امت کی "سالانہ کانفرنس" ہے۔ اس کی تفصیل حج سے متعلق آیات کے ضمن میں متعلقہ مقام پر پیش کی جائے گی۔

لفظ الحج کا مادہ (ح۔ ج۔ ج) ہے جس کے بنیادی معانی (۱) ارادہ کرنا، (۲) روکنا، (۳) جھگڑا کرنا، اور (۴)

دلائل پیش کرنا ہیں۔ آخری معانی نے اعتبار سے قرآنی دلائل کو الْحُجَّةُ الْمُبَالِغَةُ،

"حقیقت رس و دلیل" (۱۵۸) کہا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان معانی کی رو سے، حج، امت

حج کا مفہوم

کے اس اجتماع کو کہا جائے گا جہاں نظام خداوندی سے متعلق جملہ اہم معاملات کا فیصلہ دلائل و حجّت کی رو سے کیا جائے۔ مشاورتی نظام میں اس قسم کے اجتماعات نہایت ضروری ہوتے ہیں۔ میری بصیرت کے مطابق، اس نظام نے ایک عالمگیر سالانہ اجتماع ضروری قرار دیا تھا، اور سال بھر میں چھوٹے چھوٹے اجتماعات عند الضرورت اس پر مستزاد۔

ان اجتماعات کو عمرہ کہا جاتا ہے۔ عمرہ (مادہ ع۔ مر۔ مر) کے بنیادی معانی آباد کرنا، باقی رکھنا،

خرابی سے محفوظ رکھنا ہیں۔ ان معانی سے عمرہ کے اجتماعات کا مقصد خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی

عمرہ

ان اجتماعات میں اس بات پر غور و فکر کیا جائے گا کہ یہ نظام کس طرح ہر قسم کی خرابی اور کمزوری سے محفوظ رہ کر مستحکم تر ہونا جائے۔

لفظ جُنَاح کے متعدد معانی ہیں جن کی تشریح اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔ اس وقت صرف اتنا کہ دینا کافی

ہوگا کہ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ فارسی زبان میں گناہ بن گیا، اور بعض یہ کہتے ہیں کہ لفظ

جُنَاح کا مفہوم

گناہ، عربی میں آکر جُنَاح بن گیا۔ حقیقت کچھ بھی ہو، ہمارے ہاں اس کے معنی گناہ کئے جاتے

ہیں۔ ہمارے موجودہ مذہب (اسلام) میں گناہ کا لفظ بھی اس کی ضد، ثواب کی طرح، ایسا مبہم سا ہے جس کا کوئی متعین

مفہوم سامنے نہیں آتا۔ دراصل یہ لفظ (جناح) ان معانی میں استعمال ہوتا ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں، چنداں مضائقہ نہیں۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے آپ دیکھیں گے کہ وہاں اس کا یہی مفہوم موزوں ہے۔

صفا اور مروہ مکہ سے ملحق دو پہاڑیاں ہیں حج کے سلسلہ میں ان پہاڑیوں کے درمیان سات چکر لگانا (جسے سعی بین الصفا والمروہ کہا جاتا ہے) حج کے ارکان میں شمار ہوتا ہے۔ یعنی ایسا کرنا ضروری ہے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تورات کے بیان کردہ قصہ کی رُو سے (جس کا اتباع ہماری کتب روایات میں بھی کیا گیا ہے) جب اس مشکیزہ کا پانی ختم ہو گیا جسے حضرت ابراہیمؑ، اپنی بیوی (حضرت ہاجرہ) اور شیرخوار بچے (حضرت اسمعیلؑ) کو لوق و دق صحرا میں چھوڑ کر چلے گئے تھے، تو مامتا کی ماری ماں (حضرت ہاجرہ) پانی کی تلاش میں ان وادیوں میں سرگرداں پھرتی تھیں۔ کبھی ایک پہاڑی پر چڑھتیں، کبھی دوسری پر سعی بین الصفا والمروہ کو سنت حضرت ہاجرہ کے اتباع میں، ارکان حج میں واجب سمجھا جاتا ہے۔

لیکن زیر نظر آیت میں تو یہ نہیں کہا گیا کہ ان پہاڑیوں (کی وادیوں) میں طواف کرنا لازمی ہے۔ اس میں تو کہا یہ گیا ہے کہ ان میں طواف (گھومنے پھرنے) میں کوئی حرج نہیں (یا گناہ) کی بات نہیں۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ عرب جاہلیہ میں عام عقیدہ یہ تھا کہ یہ ایسے مقدس مقامات ہیں جن میں گھومنا پھرنا منع ہے۔ قرآن کریم نے اس باطل عقیدہ کی تردید کی۔ اور کہا کہ ان میں گھومنے پھرنے میں کوئی گناہ کی بات نہیں۔ ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں کامرود جب عقیدہ (کہ ان پہاڑیوں میں طواف ارکان حج میں سے ہے۔ یعنی لازمی ہے) قرآنی آیت کے خلاف ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ ان میں چلنے پھرنے میں کوئی گناہ (یا حرج) کی بات نہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جس طرح قریش نے خانہ کعبہ کو بتوں سے بھر رکھا تھا، اسی طرح انہوں نے ان پہاڑیوں پر بھی دو بت نصب کر رکھے تھے اور ان کی تعظیم کے لئے وہ ان کا طواف کیا کرتے تھے۔ اسلام نے جب وہ بت اکھٹوائے تو مسلمانوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طرح بت پرستی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اسی طرح اب ان پہاڑیوں کا طواف بھی ممنوع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس خیال کی تردید کے لئے کہا کہ ایسا نہیں۔ ان کا طواف ممنوع نہیں۔

لیکن یہ توجیہ کچھ عجیبی نہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ کہا کہ ان کا طواف ممنوع نہیں۔ ایسا کرنے میں کوئی حرج یا مضائقہ نہیں، لیکن ہمارے ہاں اسے ارکان حج کے زمرہ میں شامل کر کے، لازم قرار دے دیا گیا۔ یعنی کہا یہ گیا کہ جس طرح تم حالت کفر میں ان کا طواف ضروری سمجھتے تھے، اسی طرح اسے اب بھی ضروری سمجھو۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قرآن کریم کی آیت کی روشنی میں، ہمارا خیال اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ (زمانہ کفر میں) قریش، ان وادیوں کو رہتوں کا مسکن ہونے کی وجہ سے، مقدس خیال کرتے تھے اور ان میں گھومنا پھرنا ممنوع سمجھتے تھے۔ قرآن کریم نے اس غلط عقیدہ کی تردید کی اور فرمایا کہ یہ بھی باقی پہاڑیوں اور وادیوں کی مانند ہیں۔ ان میں تقدس کی کوئی بات نہیں۔ تم ان میں بلا تامل چلو پھرو۔ ایسا کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔

البتہ قرآن کریم نے صفا اور مرثوہ کو (کاروان حجاج کے ہمراہ جانے والے جانوروں کی طرح ۲۲) شعائر اللہ کہہ کر پکارا ہے (۱۵۸) اور ان شعائر کا ادب ملحوظ رکھنے کی تاکید کی ہے (۲۲ : ۵)۔ شعائر کے متعلق جلد اول ص ۱۲۲ آیت (۲۲) میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ کسی مجرد (ABSTRACT) حقیقت یا نظریہ کی محسوس علامات (SYMBOLS) ہوتے ہیں۔ مثلاً مملکت کا جھنڈا۔ شعائر کی حیثیت سے وہ بڑا واجب الاحترام ہوتا ہے لیکن اس کے کپڑے یا بانس کو کوئی تقدس حاصل نہیں ہوتا۔ وہ جھنڈا بوسیدہ ہو جائے اور اس کے کپڑے کو اتار پھینکا جائے، تو اس کپڑے کی حیثیت دوسرے کپڑوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ وہ کپڑا واجب التکریم نہیں ہوتا۔ اسی طرح قرآن کریم نے کہا کہ یہ پہاڑیاں منجملہ شعائر اللہ ہیں۔ لیکن اس سے ان کے ارد گرد کی زمین یا ان کے پتھر ایسے مقدس نہیں ہو جاتے کہ ان میں چلنا پھرنا ممنوع ہو۔ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) حج میں ساتھ لے جانے والے موشیوں کو بھی شعائر اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ انہیں مقدس نہ سمجھ لیا جائے۔ ان سے دوسرے جانوروں کی طرح کام لو اور پھر انہیں ذبح کر کے ان کا گوشت کھاؤ۔ (۲۲ : ۳۷)

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان پہاڑیوں کو شعائر اللہ کیوں قرار دیا گیا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ خانہ کعبہ کی طرح ان کی تعظیم بھی حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے چلی آرہی تھی، اگرچہ زمانہ ظہور اسلام کے وقت ان کے مقاصد مسخ ہو چکے تھے قرآن کریم نے ان کے مقاصد کا صحیح تعین کر دیا لیکن ان کے محسوس علامات ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھا۔ اس کے بعد جب دین، مذہب میں بدل گیا اور اسلامی نظام باقی نہ رہا، تو مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور ان علامات کی تعظیم مقصود بالذات بن گئی۔ اس لئے قرآن کریم نے انہیں شعائر اللہ قرار دینے کے ساتھ یہ واضح کر دیا کہ اصل مقصد یہ ہے کہ تم اپنے دل کی کامل رضا مندی سے خیر کے کاموں میں کس قدر حصہ لیتے ہو۔ یہی وہ کام ہیں جن کے بھرپور نتائج خدا کے قانون مکافات کی رو سے حاصل ہوں گے۔ اس خدا کے قانون مکافات کی رو سے جو جانتا ہے کہ تم کا خیر میں کس قدر حصہ لیتے ہو اور ان رسوم و مناسک کی میکا کی تعظیم کس قدر کرتے ہو۔

یہ ہے وہ حقیقت (یعنی مقصود اور رسوم کا بنیادی فرق) جسے مذہب میں نگاہوں سے اوجھل رکھا جاتا ہے۔

یہ (کتمانِ حقیقت) کس قدر جرمِ عظیم ہے، اس کے متعلق فرمایا کہ :-

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا
بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ
اللَّهُعُنُونَ. (۲/۱۵۹)

خدا نے بَیِّنَات اور ہدایت کو اپنی کتاب میں نہایت وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ جو لوگ ان پر پردے ڈال دیں گے وہ زندگی کی شیرینیوں سے محروم ہو جائیں گے۔

یہاں کہا گیا ہے کہ خدا نے بَیِّنَات اور ہدایت کو اپنی کتاب میں واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔ ہدایت کے متعلق جلد اول صفحہ ۱۵۹ (۱/۵) میں شرح و بسط سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ دوسری چیز ہے بَیِّنَات۔

بَیِّنَات - واحد بَیِّنَةٌ کا مادہ (ب۔ ی۔ ن) ہے جس کے معنی ہیں (۱) الگ الگ کر دینا۔ (۲) اُبھارنا۔

نمایاں کرنا۔ اَلْبَيَانُ کے معنی ہیں کسی بات کا کھل کر، واضح طور پر سامنے آ جانا۔ بَیِّنَةٌ کے

بَیِّنَات

معنی ہیں واضح دلیل۔ مُبَيِّنٌ کے معنی ہیں ظاہر کرنے والا۔ واضح کرنے والا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو کِتَابٌ مُبَيِّنٌ بھی کہا ہے (۱/۵)۔ یعنی نہایت واضح ضابطہ حیات، اور تَبَيَّنَا

لِكُلِّ شَيْءٍ بھی (۱۹/۱۰)۔ ہر بات کو واضح کر دینے والی کتاب۔ یعنی اپنے مطالب میں بھی واضح اور جملہ حقائق کو واضح

کرنے والی بھی۔ سورہ النمل میں ہے۔ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ

وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ۔ (۲۱/۱۰)۔ ہم نے اس ضابطہ حیات کو تیری طرف نازل کیا ہے تاکہ جو کچھ لوگوں کے لئے نازل

کیا گیا ہے، تو اُسے ان پر ظاہر کر دے اور تاکہ وہ اس میں غور و فکر سے کام لیں۔ (نیز ۱۶/۱) اس سے ظاہر

ہے کہ :-

(۱) خدا نے اپنے رسول کی طرف کتاب نازل کی (۱) (أَنزَلْنَا إِلَيْكَ)

(۲) لیکن یہ کتاب درحقیقت تمام نوری انسان کی طرف نازل کی گئی ہے۔ (مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ)

اس لئے :-

(۳) رسول اللہ کا فریضہ تھا کہ اسے اپنے تک ہی محدود نہ رکھے بلکہ اسے لوگوں پر ظاہر کر دے۔ (لِتُبَيِّنَ

لِلنَّاسِ)۔ اسے ان تک پہنچا دے : يَبْلُغُ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (۲۱/۱۰)

خود اس کتاب کے متعلق بتا دیا کہ :-

(۱) یہ تَبَيِّنَاتٌ لِّكُلِّ شَيْءٍ ہے۔ (۱۶)۔ یعنی جن امور کا بذریعہ وحی بتانا ضروری تھا، انہیں اس میں

واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ لہذا یہ کتاب خود مکتفی اور مکمل ہے، اور اپنے مطالب

کو واضح کر دینے کے لئے کسی اور بذریعہ کی محتاج نہیں۔

قرآن واضح کتاب ہے،

(۲) یہ کتاب تمام نوع انسان کے لئے اظہار حقیقت ہے۔ (بَيَانٌ لِّلنَّاسِ)۔ (۱۳)

(۳) اس میں صحیح اور غلط راستے بالکل واضح اور الگ الگ ہو گئے ہیں۔ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۱۷)

(۴) یہ کتاب مبہن ہے۔ یعنی بالکل واضح۔ (۱۵)

(۵) یہ روشنی ہے۔ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ (۱۵)۔ روشنی، اپنے آپ کو

دکھانے کے لئے کسی ذریعے کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ خود روشنی ہوتی ہے اور ہر اس شخص پر جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے،

دوسروں چیزوں کو روشن کر دیتی ہے۔ اس سے ہر شے اپنی اصلی شکل میں، نکھر اور ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ اسی لئے اسے

تَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ (۱۶) بھی کہا گیا ہے۔ یعنی ہر شے کو الگ الگ کر کے دکھا دینے والی۔ (فَصَّلَ کے معنی الگ

الگ کر دینا ہوتے ہیں)۔

(۶) اس کی وضاحت خود خدا نے اپنے ذمہ لی تھی۔ ثُمَّ اِنَّا عَلَيْنَا بَيَانُهُ (۱۶)۔ اس کے مطالب

کو خدا نے کس طرح واضح کیا ہے اسے بھی خود ہی بتا دیا جب کہا کہ وَكَذٰلِكَ نَصْرَفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا اَدْرَسَتْ

وَلَيْسَ بَيْنَهُ لِقَوْهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۱۷)۔ ہم اس طرح قرآن کی آیات کو پھیر پھیر کر، بار بار، سامنے لاتے ہیں تاکہ کہیں

کہ تو نے واقعی بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر دیا ہے۔ اس طرح ہم اس کے مطالب کو ان لوگوں پر واضح کر دیتے ہیں۔

جو علم و بصیرت سے کام لیں۔ بتینات (دلائل) انہی لوگوں کے لئے مفید ہو سکتے ہیں جو غور و تدبر اور علم و دانش

سے کام لیں۔

یہ تھی اس علم کی حقیقت جسے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے، نبی اکرمؐ کی وساطت سے، تمام نوع انسان کی

راہنمائی (ہدایت) کے لئے عطا کیا۔ اس میں کوئی ستر مستور نہیں۔ کوئی پوشیدہ راز نہیں۔ صاف، واضح، ظاہر، بتین،

کتاب۔ خود بھی روشن اور ہر دیدہ بینا کے لئے روشنی۔ اس میں کوئی ابہام نہیں، کوئی التباس نہیں، کوئی مشکوک

بات نہیں۔ یہ اپنے مطالب آپ واضح کرتی ہے اور اس کے لئے کسی خارجی سہارے کی محتاج نہیں۔ (جہاں تک

اس کے اصولوں کی روشنی میں جزئی احکام متعین کرنے کا سوال ہے، اس کی بابت جلد اول ص ۱۲۵، آیت (۲) میں

وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے)۔ اس سلسلہ میں صمنّا جلد اول ص ۲۶۱، آیت (۲)؛ جلد دوم ص ۲۲۸، آیت (۲)

اور ص ۳۶۶۔ آیت (۲) میں بھی ذکر آچکا ہے۔

یہ ہے وہ کتاب مبین، جس کے متعلق کہا کہ جو لوگ اس کے حقائق کو چھپاتے ہیں، وہ خدا کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے، خود ہی زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کتاب اللہ (وحی خداوندی) کو چھپانے کا ایک طریق وہ تھا جسے سابقہ اہل کتاب نے اختیار کیا تھا۔ یعنی خود کتاب میں تحریف کر دینا۔ قرآن کریم کے سلسلہ میں یہ طریق تو کامیاب نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔ اس کے حقائق اور تعلیم کو چھپانے کے لئے اور طریقے اختیار کئے گئے۔ مثلاً:-

(۱) یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات منسوخ ہیں۔ یعنی انہیں صرف پڑھا جائے گا، حکم ان کا منسوخ ہو چکا ہے۔ یہ تحریف فی الکتاب کا بالکل انوکھا لیکن بڑا کامیاب طریق ہے۔ (تفصیل اس کی جلد اول ص ۱۲۶-۱۲۵۔ زیر آیت (۲))

قرآنی تعلیم کو چھپانے کے طریق

گزر چکی ہے۔

(۲) پھر یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دوئیں ہیں۔ ایک وحی حلی یا متلو اور دوسری وحی خفی یا غیر متلو۔ وحی حلی تو قرآن مجید میں درج ہے اور وحی خفی کتب روایات میں ہے۔ (تفصیل اس کی جلد اول ص ۱۳۱۔ آیت (۲)۔ اور جلد دوم ص ۱۸۷۔ آیت (۲) میں آچکی ہے)۔

وحی خفی کے متعلق کہا گیا کہ یہ قرآن مجید کے ساتھ، قرآن مجید کی مثل ہے۔ اس کے احکام کو منسوخ بھی کر سکتی ہے اور ان پر قاضی بھی ہے۔ قاضی کے معنی یہ ہیں کہ قرآنی احکام کے متعلق جو فیصلہ روایات دیں گی، اُسے شریعت خداوندی کہا جائے گا۔

(۳) روایات (یا احادیث) کے بعد فقہ سامنے آتی ہے۔ فقہ ان احکام کو کہتے ہیں جو مختلف ائمہ فقہ (امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے شاگردوں) نے مدون کئے۔ فقہ کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ اس کے احکام، قرآنی احکام کو منسوخ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ فقہائے حنفیہ کے مسلم امام، ابوالحسن عسکری نے کہا ہے کہ ”ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماقول ہے یا منسوخ ہے“ (تاریخ فقہ اسلامی، علامہ نھری، اردو ترجمہ شائع کردہ۔ دار المصنفین اعظم گڑھ۔ ص ۲۲۱)۔

ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی جن آیتوں کو منسوخ سمجھا جائے یا جنہیں احادیث یا فقہ منسوخ ٹھہرا دے، وہ نہ صرف

مکتوم (چھپائی ہوئی) ہوں گی، بلکہ وہ تو سرے سے معدوم ہی ہو جائیں گی۔ موجود تو وہی آیات سمجھی جاسکتی ہیں جن کا حکم زندہ اور واجب العمل ہو۔

(۴) جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے، تو وحی کی زندہ حقیقتیں، رسمی نقل و حرکت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس میں رسوم باقی رہ جاتی ہیں اور مقاصد معدوم ہو جاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیں کہ انہی رسوم کی ادائیگی جو دین میں حصول مقاصد کا ذریعہ تھیں مقصود بالذات بن جاتی ہے اور اس پر قوم مطمئن ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ کتمان کتاب اللہ کا سب سے بڑا اور مؤثر ترین ذریعہ مذہب کا وجود ہے جو مذہبی پیشوائیت کے سہارے قائم رہتا ہے۔ قرآن کریم نے ان کے متعلق جو کہا ہے کہ وَیُصَدِّدُوْنَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (۲/۱۶۹) یہ لوگ، خدا کی طرف سے جانے والے راستے میں روک بن کر بیٹھ جاتے ہیں، تو اس سے یہی مراد ہے۔ یہ کتاب اللہ کو سامنے آنے ہی نہیں دیتے۔

(۵) کتمان کتاب اللہ کے یہ طریق تو ارباب شریعت نے وضع اور اختیار کئے۔ اصحاب طریقت ایک قدم آگے بڑھے۔ انہوں نے کہا کہ قرآن مجید کے وہ معانی ہیں ہی نہیں جو اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کے باطنی معانی ہیں جو ہم پر، خدا کی طرف سے، کشف والہام کے ذریعے وانسگاف کئے جاتے ہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ اور ان کے باطنی معانی کا یہی فرق ہے جسے (مولانا) روم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

ما زِ قرآن مغز را برداشتیم استخوان پیش سگان انداختیم (معاذ اللہ)

باطنیت کے متعلق جلد دوم۔ آیت (۲/۱۶۹) پر بحث کی جا چکی ہے۔

آپ غور فرمائیے کہ کتمان کتاب اللہ کے لئے کس کس قسم کے نگاہ فریب پردے وضع کئے گئے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ خدا کی یہ کتاب عظیم، محض تلاوت (اس کے الفاظ کو دہرا کر) "ثواب" حاصل کرنے کے لئے رہ گئی ہے اور یہ نگاہ فریب پردے اس قدر مقدس بن چکے ہیں کہ اگر ان کی طرف انگلی بھی اٹھائیے تو قیامت برپا کر دی جاتی ہے۔

قرآن مجید نے کہا ہے کہ جو لوگ کتمان کتاب اللہ کرتے ہیں، وہ کسی اور کا کچھ نہیں بگاڑتے، وہ خود ہی زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ (لعنت کے معنی جلد دوم ص ۳۰۰ زیر آیت (۲/۱۶۹)۔

بیان کئے جا چکے ہیں، یہاں کہا کہ: اُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ السَّعِيْرُونَ (۲/۱۶۹) زندگی کی خوشگواریاں دو طریق سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ ایک کتاب اللہ کے مطابق زندگی بسر کرنے سے براہ راست۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوں، ان کے سانچہ روابط قائم رکھنے سے۔

لعنت ہر طرف سے

کتمانِ کتاب اللہ کے ترکیب خود تو اس کے متعلق زندگی بسر کر ہی نہیں سکتے جو لوگ اس کے مطابق زندگی بسر کرتے، یا کرنا چاہتے ہیں یہ ان کے سب سے بڑے دشمن ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں کسی گوشے سے بھی ثمراتِ حیات نصیب نہیں ہو سکتے۔

اس کے بعد سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا انسان کی یہ محرومی ابدی ہوتی ہے۔ کہا کہ ایسے لوگوں کی دوسری ہوتی ہیں۔ ایک وہ :-

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُّوْا فَاُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ۔
وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔ (۱۶۱)

اگر تم کسی وقت ایسا کر بیٹھو، تو یہ نہ سمجھ لینا کہ بس، اب یہ محرومی ابدی ہے۔ نہیں! ایسا ہرگز نہیں۔ تم جب بھی اُس مقام پر واپس آ جاؤ جہاں سے تمہارا قدم غلط سمت کو اٹھ گیا تھا، اور صحیح راستے پر چل پڑو، اور اس طرح، اس نظام کو پھر سے عملاً متشکل کر کے نمایاں طور پر دنیا کے سامنے لے آؤ، تو اس کی برکات پھر تمہاری طرف لوٹ آئیں گی۔ اس لئے کہ خدا کا قانون، اپنی برکات و ثمرات کو لئے، اُس قوم کی طرف تیزی سے بڑھ آتا ہے جو اُس کی طرف رُخ کرتی ہے، اور اس کے لئے برومندی کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔

جو لوگ یہ محسوس کر کے کہ ہمارا قدم غلط راستے کی طرف اُٹھ گیا تھا، اس سے لوٹ جائیں اور صحیح راستہ اختیار کر لیں، انہیں یہ ثمرات حاصل ہو سکتے ہیں۔ خدا (معاذ اللہ) منتقمِ مزاج نہیں کہ وہ چڑ جائے کہ انہوں نے غلط راستہ کیوں اختیار کر لیا تھا، اس لئے ان کے لئے باز یابی کی کوئی صورت نہیں۔ وہ تو اپنی مخلوق کی نشوونما چاہتا ہے۔ اس لئے جب بھی کوئی قوم اس کی کتاب (صنابطہ قوانین) کی طرف لوٹتی ہے، اس کے خوشگوار نتائج سے متمتع ہو جاتی ہے۔ (توبہ، اور رحمت کا مفہوم جلد اول ص ۲۶۔ آیت (۱۶۱)۔ اور جلد دوم ص ۲۶۶۔ آیت (۱۶۱) میں بیان کیا جا چکا ہے)۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو :-

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارًا أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ
اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ (۱۶۱)

لیکن جو قوم ایسا نہیں کرتی، اور عمر بھر غلط روش پر ہی چلے جاتی ہے، تو وہ یقیناً اس صنابطہ قانون کی برکات سے فطرت کی قوتوں کی تائید سے، اور اُن تمام انسانوں کے تعاون سے محروم رہ جاتی ہے، جنہوں نے اس باب میں اُن کا ساتھ دینا تھا۔

یہ لوگ ساری عمر غلط راستے پر چلتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ قبر تک پہنچ جاتے ہیں۔ (ملائکہ کے متعلق دیکھئے جلد دوم ص ۶۶)

خُلِدِينَ فِيهَا۔ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ (۱۶۲)

اس قوم کی یہی حالت رہتی ہے۔ اس کی تباہیوں اور بربادیوں میں کوئی کمی نہیں ہوتی حتیٰ کہ ان پر موت وارد ہو جاتی ہے، اور چونکہ موت سے باز آفرینی کا امکان ختم ہو جاتا ہے، اس لئے انہیں زندگی میں جو مہلت کا وقفہ حاصل تھا وہ بھی باقی نہیں رہتا۔

ہم یہاں دہرا دیں کہ یہ سب کچھ کہا گیا ہے اس قوم کے متعلق جو کماں کتاب اللہ جیسے سنگین جرم کی فرنگ ہو۔ اقوام سابقہ نے اس باب میں جو کچھ کیا، اور اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا، اسے چھوڑ نیے۔ آپ یہ دیکھئے کہ ہم نے جس طرح کتاب اللہ کو مختلف رنگین پردوں کے پیچھے چھپایا، اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم صدیوں سے غلامی و محکومی اور محتاجی و محرومی کی زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں۔ نظام خداوندی کے

ہماری حالت

قیام سے ہمیں جو نعمائے حیات میسر آئی تھیں، اُن کا تو ذکر ہی کیا، مذہب میں چونکہ عقل و فکر سے کام لینا جرمِ عظیم اور مادی دنیا سے نفرت، تقویٰ شعاری قرار پاتا ہے اس لئے ہم فطرت کی قوتوں سے بھی متمتع نہیں ہو سکے۔ (اب رہی انسانوں کی طرف سے مدد و محتاج اور محروم قوم کا دنیا میں کوئی حامی و ناصر اور یار و مددگار نہیں ہوتا۔ طاقتور قومیں انہیں اپنے مطلب کے لئے بطور آلہ کار استعمال کرتی ہیں اور اس کے عوض اپنی چھوٹی ہوئی ہڈیاں ان کی طرف پھینک دیتی ہیں۔ یہ ہے وہ الم انگیز عذاب جس میں ہم صدیوں سے مبتلا چلے آ رہے ہیں، اور چونکہ مذہب (شرعیات اور طریقتوں) ہمیں تھکیاں دے دے کر سلاتے رہتے ہیں کہ خدا کے مقرب بندوں کی یہی نشانیاں ہیں، اس لئے ہم اپنی غلط روش کو چھوڑنے کا خیال تک بھی دل میں نہیں لاتے۔

قوانین خداوندی سے اعراض بستنے والی قوموں کی یہ حالت یونہی اتفاقیہ نہیں ہو جاتی۔ یہ خدا کے اس قانونِ مکاناتِ عمل کا حتمی، لازمی نتیجہ ہوتی ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ کائنات میں اس کے قانون کے سوا کسی کا قانون نافذ العمل نہیں۔

وَالْهُكْمُ لِلَّهِ وَاحِدٌ۔ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ۔ (۱۶۳)

کائنات میں قانون صرف ایک ہی کا جاری و ساری ہے۔ یعنی خدا کا قانون جس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار

نہیں۔ اس کی مشیت کا پر وگرام یہ ہے کہ کائنات نشو و نما حاصل کرتے ہوئے، ارتقائی منازل طے کرتی

جائے۔

یہ ہے خدا کی رحمت کا مفہوم۔ (جلداول ص ۱۸۰۔ آیت (۱)۔) جو قومیں اس کے قوانین پر پردے ڈال کر اپنے خود ساختہ قوانین و ضوابط کی پیروی کریں گی، وہ آخر الامر تباہ اور برباد ہو کر رہیں گی۔ اس کا ثبوت؟ اس کا ثبوت خود یہ کارگر کائنات ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَالاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ
الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ
مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ
دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَّاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ
لَايَةٌ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ - (۱۶۴)

تم نے یہ دیکھنا ہو کہ کائنات میں کس طرح خدا نے واحد کا قانون کار فرما ہے۔ اور وہ قانون کس طرح تعمیری نتائج مرتب کرتا ہے، تو اس کے لئے کائنات کی حیرت انگیز مشینری پر غور کرو اور دیکھو کہ اس کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق کس طرح عمل میں آئی ہے۔ دن اور رات کی گردش مدام کس نظم و ضبط سے جاری ہے۔ اتنے اتنے بڑے جہاز، منفعت بخش سامان سے لدے ہوئے، کس طرح سینہ بھر پرتے پھرتے ہیں (اور وہ کون سا قانون ہے جو انہیں اس طرح تھامے ہوئے ہے)۔ اُس صاف اور شفاف پانی کو دیکھو جو بادلوں سے برستا ہے اور زمین مردہ کو حیات آواز عطا کرتا ہے۔ نیز اس حقیقت پر بھی غور کرو کہ صفحہ ارض پر، انواع و اقسام کے چلنے پھرنے والے ذی حیات کس طرح پھیل رہے ہیں۔ ہوائیں کس طرح، خاص خاص موسموں میں، اپنی سمت بدلتی ہیں۔ بادل کس طرح زمین اور آسمان کی درمیانی فضا میں، قانون فطرت کی زنجیروں میں جکڑے، ادھر سے ادھر کھینچے چلے جاتے ہیں۔

ان تمام مظاہر فطرت پر غور کرنے سے انسان ایک ہی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ کائنات کا نظم و ضبط ایک ہی ذی اقتدار ہستی کے کنٹرول میں ہے۔ لیکن اس نتیجہ پر وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جو عقل و فکر سے کام لیں۔

اشیاء کائنات چونکہ مجبور پیدا کی گئی ہیں اس لئے وہ قوانین خداوندی کی بے چون و چرا اطاعت کئے جاتی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کائنات کی یہ محیر العقول مشینری اس حسن و خوبی کے ساتھ سرگرم عمل چلی جا رہی ہے۔ لیکن انسان کو صاحب اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے، اور وہ اس مرحمت خداوندی کا بڑا غلط استعمال کرتا ہے۔ اس کی حالت

یہ ہے کہ :-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ
وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ - (۱۶۵)

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے :-

بعض لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو۔ ان کی محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی۔ اور
اللہ والوں کو اس سے زیادہ تر محبت ہے اللہ کی۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسن)

”محبت“ کا جو تصور ہمارے ہاں ہے، اس کی رُو سے سوچئے کہ اللہ کے ساتھ محبت رکھنے کا مطلب کیا ہے؟ آپ
کسی اُن دیکھی، غیر مرئی، غیر محسوس چیز کے ساتھ محبت نہیں کر سکتے۔ بسیط خلاق
خدا کے ساتھ محبت

(ABSTRACT REALITIES) یا مجرد نظریات کی عظمت کا احس
آپ کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے لیکن اسے بھی ”محبت“ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ ذاتِ خداوندی وہ ہے کہ اسے دیکھنا
تو ایک طرف، وہ — برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم — ہے۔ (۱۶۵)۔ اسے کسی محسوس شے کے ساتھ تشبیہ بھی
نہیں دی جاسکتی۔ اسے مثال کے ذریعے بھی سمجھایا نہیں جاسکتا۔ (۱۶۶)۔ لہذا اس کے ساتھ اس قسم کی محبت کیسے ہو
سکتی ہے؟ لیکن ہمارے ہاں اہل تصوف نے اللہ کے ساتھ محبت کو اصل دین قرار دیا اور پھر اس بنیاد پر ایسی ایسی
تصویراتی عمارتیں استوار کیں جو طلسمِ ہوش رُبا کو بھی شرمائیں۔ اللہ کو محبوب بلکہ معشوق قرار دیا اور اسے بالکل انسانی
معشوق کی شکل میں پیش کیا۔ اسے عشقِ حقیقی کہہ کر بکا را گیا اور اس کا اولین رُزنیہ عشقِ مجازی بتایا گیا۔ ”عشقِ مجازی“
کیا ہے؟ امرِ پرستی! آپ فارسی شعر کا صوفیانہ کلام دیکھئے۔ وہ ”معجوں“ کی محبت سے ٹپا پڑا ہے۔ ساری شاعری اُنکے
خط و خال، لب و رخسار، زلف و کاکل کے گرد گھومتی ہے۔ وہیں سے یہ اندازِ مد و شاعری میں در آیا۔ جب ان حضرات
سے پوچھتے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ سب مجازات ہیں جو خدا کے ساتھ عشق و محبت کا رُزنیہ اولیں ہے۔ اس رُزنیہ اولیں کو
تو سب سمجھتے اور دیکھتے ہیں، لیکن رُزنیہ آخریں کو آج تک نہ کسی نے دیکھا ہے، نہ سمجھا۔ زیادہ کریدئے تو کہا جاتا ہے کہ
یہ رموز و اسرار الفاظ میں بیان نہیں کئے جاسکتے — ذوقِ این بادہ ندانی بخدا تا نچشی — جو تن لاگے سوتن جانے۔
— اس کی منزلِ آخریں فنا فی اللہ بنائی جاتی ہے۔ یعنی — عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — اسی کا نام وصال
ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان حضرات کی وفات کو وفات نہیں کہا جاتا، وصال کہا جاتا
ہے اور پھر اُن کا ”عرس“ منایا جاتا ہے۔ ”عرس“ کے معنی شادی ہیں۔ (تقریبِ عروسی

وصال اور عرس

کے الفاظ ہمارے ہاں عام استعمال ہوتے ہیں، اسی قسم کی ہیں وہ تصوراتی عمارتیں جو حُب اللہ کی بنیاد پر استوار کی جاتی ہیں۔ تصوف پر تفصیلی بحث جلد دوم میں۔ زیر آیت (۱۶۲) گزر چکی ہے۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اصل یہ ہے کہ عیسائیت میں (GOD IS LOVE) کا عقیدہ تھا۔ (یعنی خدا محبت ہے)۔ اسی نے ہمارے ہاں ”حُب اللہ“ کا لبادہ اوڑھ لیا اور عین دین بن گیا۔ اس قسم کے تمام تصورات دوسروں سے مستعار لئے ہوئے ہیں۔

اب آیۃ قرآن کریم کی طرف۔ اَلْحُبُّ (مادہ ح۔ ب۔ ب) کے متعدد معانی ہیں جن میں سے تین چار زیادہ اہم ہیں۔ یعنی (۱) کسی چیز کو لازم پکڑنا۔ اس کے ساتھ مستحکم طور پر رہنا۔ (۲) کسی کام کے نتائج کا ابھر کر سامنے آ جانا، جیسے کہا جاتا ہے۔ اَحَبُّ الزَّرْعِ۔ کھیتی کے خوشوں میں دانے پڑ گئے۔ (۳) چاہنا یا پسند کرنا۔ اور (۴) کسی کی حفاظت کرنا۔ اسے بچانا رکھنا۔

ان معانی کی رُو سے ظاہر ہے کہ انسان کے خدائے محبت کرنے سے مراد ہوگی، کتاب اللہ یا قوانین خداوندی کو محکم طور پر پکڑنا۔ یعنی ان کی لزوم و استقامت کے ساتھ اطاعت کرنا۔ قرآن کریم نے اسی حُب اللہ کا قرآنی مفہوم اس کو اعتصام بجمل اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ (۱۶۲)۔ اور خدا کے انسان سے محبت کرنے کے معنی ہوں گے انسان کی حفاظت کرنا۔ اسے بچانا رکھنا۔ اس کے حسن عمل کو نتیجہ خیز بنانا۔ اسی کو خدا کی پسندیدگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ۔ (۱۶۲)۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ خدا کے ساتھ محبت کا طریقہ یہ ہے کہ تم میرا اتباع کرو۔ دوسرے مقام پر ہے کہ: مَنْ يُطِيعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اطَاعَ اللّٰهَ۔ (۱۶۳)۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے درحقیقت خدا کی اطاعت کی، اس سے واضح ہے کہ آیت (۱۶۲) میں جو کہا گیا ہے: اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ، تو اس کے معنی اللہ کی اطاعت کرنا ہیں یعنی آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اگر تم اللہ کی اطاعت کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کے رسول کا اتباع کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا: يُحِبُّكُمْ اللّٰهُ وَ يَخْفِضْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ۔ وَاللّٰهُ عَفُوٌّ رَّحِيْمٌ۔ (۱۶۴) اللہ تم سے محبت کرے گا، یعنی تمہاری لغزشوں کے مضر اثرات سے تمہاری حفاظت کرے گا۔ وہ حفاظت اور رحمت کرنے والا ہے۔ اس آیت میں دیکھئے۔ بندوں کی طرف سے خدا کے ساتھ محبت کے معنی اس کی اطاعت کرنا ہیں، اور خدا کی طرف سے بندوں کے ساتھ محبت کے معنی: بندوں کی حفاظت کرنا، انہیں سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔ ان کے حسن عمل کی کھیتوں میں دانے پیدا کرنا ہیں۔ محبت کے یہ تمام معانی اوپر دیئے جا چکے ہیں۔

سورہ المائدہ میں ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ - (۵۶)** اے جماعتِ مؤمنین! جو کوئی تم میں سے دینِ خداوندی سے پھر جائے تو (وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔) **فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ كَوْمَةً لَا تَعْلَمُ - (۵۷)**۔ خدا ان کی جگہ ایسی قوم کو لے آئے گا جو خدا کی اطاعت کریں گے۔ اور خدا ان کی حفاظت کرے گا۔ ان کی خصوصیات یہ ہوں گی کہ وہ اس نظام کے ماننے والوں کے سامنے برہنہ کی طرح نرم اور شاخِ ثمر بار کی طرح خمیدہ ہوں گے لیکن اس نظام کے مخالفین کے مقابلہ میں فولاد کی طرح سخت (۵۸) وہ اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں گے اور کسی (مخالف) کی طعن و تشنیع سے اثر پذیر نہیں ہوں گے۔ یہاں سے **يُحِبُّونَهُ** (ان کا خدا سے محبت کرنا) کا مفہوم واضح ہے۔ باقی رہا **يُحِبُّهُمْ** (یعنی خدا کا ان سے محبت کرنا) تو اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ: **ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ (۵۹)** وہ نوازشاتِ خداوندی کے مستحق قرار پائیں گے۔ ان کی سعی و عمل ثمر بار ہوگی۔ ”محبت“ کا مزید مفہوم ایک آیت بعد ان الفاظ سے واضح کر دیا کہ **وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ - (۶۰)** اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) سے روگردانی کرے گا تو..... یعنی یہاں ”خدا کے ساتھ محبت“ کے مقابلہ میں **تَوَلَّى** کا لفظ آیا ہے جس کے معنی روگردانی کرنا۔ اعراض برتنا۔ نافرمانی کرنا ہیں۔

ان اور ان جیسی دیگر آیات سے واضح ہے کہ بندوں کی خدا کے ساتھ محبت کے معنی ہیں۔ احکامِ خداوندی کی ثبات و استقامت کے ساتھ اطاعت کرنا۔ اور خدا کی بندوں کے ساتھ محبت کے معنی ہیں، خدا کی طرف سے ان کی حفاظت اور نشوونما کا سامان بہم پہنچنا۔ ان اطاعت کرنے والوں کی مختلف مقامات پر خصوصیات بتائی گئی ہیں (مثلاً) **إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ - (۶۱)** اللہ حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ دیگر مقامات پر انہیں **تَوَّابِينَ (۶۲)** **مُتَطَهِّرِينَ (۶۳)** **مُتَّقِينَ (۶۴)** **صَابِرِينَ (۶۵)** وغیرہ کہہ کر پکارا ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں آیہ زیرِ نظر (۶۵) کا جتنا حصہ پہلے درج کیا گیا ہے۔ یعنی **وَمِنَ النَّاسِ..... مُحِبًّا لِلَّهِ -** اس کا مفہوم یہ ہوگا۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے علاوہ اور ہستیوں کے متعلق سمجھتے ہیں کہ وہ انہی اختیارات و اقتدارات کے مالک ہیں جو خدا کو حاصل ہیں۔ وہ ان کے احکام و ارشادات کی اسی طرح اطاعت کرتے ہیں جس طرح خدا کے قوانین کی اطاعت کرنی چاہیے۔ لیکن جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں وہ نہایت شدت سے ان

تو ان کی اطاعت کرتے ہیں اور کسی انسان کو خدائی اختیارات میں شریک نہیں کرتے۔ وہ ان قوانین کے سوا کسی کی اطاعت نہیں کرتے۔

”اَنْذَا اَمِنْ دُونِ اللّٰهِ“ کا مفہوم جلد اول ص ۲۹۸۔ زیر آیت (۲) دیا جا چکا ہے۔ آیت کا باقی حصہ یہ ہے:-

وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا اِذْ يَرْوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ - (۱۶۵)

۲
۱۶۵

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے، وہ ان لوگوں کی سمجھ میں اس وقت نہیں آ سکتا۔ جب ان کی اس غلط روش کے نتائج ان کے سامنے آئیں گے تو اس وقت یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ فی الواقع کائنات میں اقتدار و اختیار خدا کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کسی اور کو نہیں۔ اس کے قوانین کو چھوڑ کر انسانوں کے وضع کردہ احکام پر عمل پیرا ہونے اور اس طرح انسانوں کو خدا کا درجہ دیدینے کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد کہا:-

اِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَاَوَّاءُ الْعَذَابِ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ - (۱۶۶)

۲
۱۶۶

اس وقت یہ دیکھیں گے کہ جن حکمرانوں، لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں کی یہ پیروی کیا کرتے تھے وہ کس طرح ان سے کنارہ کش ہو رہے ہیں۔ وہ سہارے کس طرح ٹوٹ رہے ہیں جو انہوں نے اُن سے وابستہ کر رکھے تھے اور ان کے باہمی رشتے کس طرح منقطع ہو رہے ہیں۔

جب ان لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں کی حقیقت بے نقاب ہو جائے گی تو اس وقت ان کے معتقدین اور متبعین (FOLLOWERS) کی کیفیت کیا ہوگی، فرمایا:-

وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ اَنْ لَّنَا كَرَّةٌ فَنتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنْهُمْ - كَذٰلِكَ يُرِيهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ - وَمَا هُمْ بِمُخْرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ - (۱۶۷)

۲
۱۶۷

اُس وقت یہ لوگ کہیں گے کہ اگر وقت کا دھارا ایک بار پیچھے کی طرف مڑ جائے تو ہم بھی ان لیڈروں اور پیشواؤں سے اسی طرح آنکھیں پھیر لیں جس طرح انہوں نے آج ہم سے آنکھیں پھیر لی ہیں۔

یوں ان کی غلط روش کے نتائج بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آ جائیں گے اور یہ دیکھ لیں گے کہ جن ہستیوں

کو وہ اپنے لئے اس قدر حکم سہارے سمجھتے تھے، انہوں نے انہیں کس قدر عاجز و ناتواں بنا ڈالا ہے۔ ایسا عاجز و ناتواں اور افسردہ و واماندہ کہ ان میں اس تباہی سے نکلنے کی سکت ہی نہیں رہی۔

کس قدر حسرتناک ہے ان کا یہ انجام! پُر فریب سہاروں پر تکیہ کرنے والوں کا ایسا ہی انجام ہوا کرتا ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ جب ان کے لیڈروں کی فریب دہی کا پردہ چاک ہو گا تو یہ کہیں گے کہ اگر ایک بار وقت کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں لوٹتا | لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان کی یہ حسرت پوری نہیں ہو سکے گی۔

اس میں ایک عظیم نکتہ بیان کر دیا گیا ہے جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے یہ بات واضح ہے کہ — گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں — ماضی کبھی مستقبل نہیں بن سکتی۔ زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں لوٹتا۔ زمان (TIME) آگے کی طرف جاتا ہے، پیچھے کی طرف نہیں۔

یونانیوں کے ہاں زندگی کا تصور دائری (CYCLIC) تھا، اس لئے ان (کے ہاں کے بعض فلاسفرز) کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد انسان بار بار اس دنیا میں آتا ہے۔ اسے تناسخ کا عقیدہ کہتے ہیں۔ ہندوؤں نے ان کے ہاں سے یہ نظریہ مستعار لیا اور ”آواگون“ کے نام سے اسے اپنے مذہب کا جزو بنالیا۔ اس نظریہ کا ابطال جلد اول ص ۴۷ آیت (۱۱) میں کیا جا چکا ہے۔ قرآن کریم بالتصریح کہتا ہے کہ مرنے کے بعد انسان اس دنیا میں دوبارہ نہیں آ سکتا۔ سورہ مومنون میں ہے۔

تناسخ کا عقیدہ باطل ہے

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ - لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ - كَلَّا - إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا - وَمِنْ قَبْلُ أَتَيْهِمْ بِدُخَانٍ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ (۹۹-۱۰۰)
 تا آنکہ جب ان لوگوں کے سر ہانے (جو غلط راستے پر چلتے تھے) موت آکھڑی ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار! اگر تو مجھے ایک بار پھر دنیا میں واپس بھیج دے تو میں بہت اچھے اچھے کام کروں۔ اس سے کہا جائے گا کہ یہ تیری آرزو سے غام ہے۔ اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ ان مرنے والوں کے پیچھے قیامت تک پردہ حائل ہے۔ اب یہ پیچھے نہیں جا سکتے۔

سورہ شعراء میں ہے کہ اہل جہنم قیامت میں کہیں گے کہ اے اللہ! لَنَا كَرَّةٌ فَنَكُونُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ۔ (۲۶)
 ہم کہیں ایک بار پھر دنیا کی طرف لوٹ سکیں تو ہم بھی ایمان لانے والوں سے ہو کر بتائیں۔ (نیز ۳۱ ذ ۳۲)
 وقت کا دھارا پیچھے کی طرف مڑا ہی نہیں کرتا۔ یہ یا تو ایک مقام پر ٹرک جاتا ہے (جیسے جسم کی موت کے سلسلہ

ہیں) اور یہ آگے بڑھتا ہے (انسانی ذات کے اس دنیاوی زندگی سے آگے بڑھ جانے کی صورت میں)۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

زندگی جوئے روان است و رواں خواہد بود ایں مئے کہنہ جوان است و جوان خواہد بود

اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید تشریح جہنم سے متعلق مقام میں سامنے آئے گی۔ آیہ زیرِ نظر (۱۶۷) میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ سیاسی لیڈر اور مذہبی پیشوا، عوام کو سبز باغ دکھا کر اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں اور عوام کے سامنے یہ حقیقت اس وقت آتی ہے جب ان کی ان فریب کاریوں کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت ان کی غلط روش کے نتائج ان کی تباہی کا موجب بن چکے ہوتے ہیں، اس لئے ان کے واویلا مچانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ (اس میں خود عوام کی کس حد تک ذمہ داری ہوتی ہے۔ اسے اس مقام پر بیان کیا جائے گا جہاں جہنم میں عوام اور ان کے لیڈروں کے مکالمات کا ذکر آئے گا۔ جو حضرات اسے بلا تاخیر دیکھنا چاہیں، وہ میری کتاب "جہانِ فدا" میں جہنم کا عنوان ملاحظہ فرمائیں۔

(۱)

اس کے بعد بتایا کہ یہ اپنے آپ حاکم بن بیٹھنے والے اور خدائی فوجدار (مذہبی پیشوا) کرتے کیا ہیں:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ - إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ - إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۱۶۸-۱۶۹)

یہ لوگوں کو سبق پڑھاتے رہتے ہیں کہ تم معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرو اور صرف اپنے مفاد کا خیال رکھو اور زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹے جاؤ۔ اور تم ظریفی یہ کہ یہ اپنے اس خود ساختہ مسک کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ فرمودہ خداوندی ہے۔ یہ شریعتِ حق ہے۔

اے نوعِ انسان! دیکھنا تم کہیں ان قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے والوں، مفاد پرستوں کے پیچھے نلگ جانا۔ ان کی بات نہ ماننا۔ یہ تمہارے بھلے کی نہیں کہتے۔ یہ تمہارے کھلے ہوتے دشمن ہیں۔ خدا کا فرمان یہ نہیں کہ تم سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لو اور اس طرح معاشرہ میں ایسی شکل پیدا کر دو کہ کسی کے ہاں دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں اور کسی کو ایک وقت کی روٹی تک میسر نہیں۔ اس کا فرمان یہ ہے کہ تم خدا کے عطا کردہ رزق کے سرچشموں کو تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کھلا رکھو اور اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لو۔ یہ رزقِ خداوندی کے حلال اور طیب طریق

حلال اور طیب رزق

سے کھانے کا طریق ہے۔

حلال اور طیب رزق کی تفصیلی بحث سابقہ جلدوں میں آچکی ہے۔ اسے ایک بار پھر سامنے لے آئیے۔ [حوالوں کے لئے دیکھیے۔ جلد اول صفحہ ۲ آیت (۲/۲)؛ صفحہ ۲۳۶ آیات (۱۱-۱۲)؛ صفحہ ۲۹۴-۳۰۵ آیت (۲/۲)؛ صفحہ ۳۵۵ آیت (۲/۲)۔ جلد دوم صفحہ ۲۸۳ آیت (۲/۲)۔]

طیب کا لفظ پہلے آچکا ہے۔ (جلد دوم صفحہ ۲۸۳ آیت (۲/۲)۔ اور شیطان کے متعلق تفصیلی بحث جلد دوم۔ باب اول صفحہ ۱ میں گزر چکی ہے۔ حلال کا لفظ تشریح طلب ہے لیکن ذرا آگے چل کر [آیت (۲/۲) میں] حرام کا لفظ آتا ہے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ حلال و حرام دونوں کی وضاحت دیاں کی جائے اس کے لئے تھوڑا سا توقف فرمائیے۔ سورہ اور فحشاء کے الفاظ پہلی بار آئے ہیں اور وضاحت طلب ہیں۔

پہلے فَحْشَاءُ کو لیتے۔ اَلْفُحْشُ (مادہ ف۔ ح۔ ش) کے بنیادی معنی ہیں حد سے بڑھ جانا۔ زیادتی کر بیٹھنا۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر معیوب، قابلِ مذمت اور بے حیائی کے کاموں کے لئے استعمال ہونے لگا۔

لیکن فَحْشَاءُ کے معنی سُجّل کے ہیں۔ (شاید اس لئے کہ عربوں کے نزدیک سُجّل سب سے زیادہ امرِ شنیع تھا)۔ اس کی وضاحت آیت (۲/۲۸) سے ہوتی ہے جہاں کہا گیا کہ اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔ شیطان تمہیں ڈراتا ہے کہ اگر تم نے فاضلہ دولت کو دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیا، تو تم غریب اور محتاج ہو جاؤ گے۔ اس لئے وہ تمہیں سُجّل کی تلقین و تاکید کرتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس، نظامِ خداوندی تمہیں اس کی ضمانت دیتا ہے کہ تم ہر قسم کی احتیاج سے محفوظ رہو گے اور تمہیں رزق فراوان ملتا ہے گا۔ یہ اس خدا کی طرف سے ضمانت دی جاتی ہے جس کے اسباب و ذرائع رزق بڑے وسیع ہیں اور وہ ہر ایک کی ضروریات کا علم بھی رکھتا ہے۔

قرآن کریم کے دیگر مقامات میں بھی اسے دہرایا گیا ہے کہ قِيَاتَهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ..... (۲/۲۲) اس کے برعکس، اِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ..... (۲/۲۹)۔ خدا سُجّل کا حکم نہیں دیتا بلکہ بے گناہی عَنِ الْفَحْشَاءِ..... (۲/۲۹) اس سے روکتا ہے۔ وہ نظامِ خداوندی کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ..... (۲/۲۹)۔ نظامِ صلوٰۃ سُجّل (خود غرضی۔ مفاد پرستی) اور قابلِ نفرت امور کو روکتا ہے۔ واضح رہے کہ فحشاء کا لفظ سُجّل کے علاوہ دیگر قابلِ مذمت امور کے لئے بھی آتا ہے۔ اس کی

مثالیں متعلقہ مقامات پر سامنے آئیں گی۔

آیت (۱۴۹) میں دوسرا تشریح غلب لفظ السُّوء ہے جس کی جمع السَّيِّئَاتُ ہے۔ سُوء کی ضد حَسَنَةٌ ہے۔

سَيِّئَات کے معنی اور سَيِّئَات کی ضد حَسَنَات۔ یہ الفاظ قرآن کریم میں بکثرت آتے ہیں۔ ہمارے ہاں حَسَنَات کے معنی نیکیاں اور سَيِّئَات کے معنی برائیاں کہے جاتے ہیں۔ لیکن نیکی اور بدی

کا جو محدود مفہوم ہمارے ہاں رائج ہے، قرآن کی ان اصطلاحات کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔ علم لغت نے کہا ہے کہ حُسْن سے مراد ہوتی ہے کسی چیز کے تناسب و توازن (PROPORTION) کا صحیح صحیح ہونا۔ اس کے

مقابل لفظ فُسَادُ آتا ہے جس کے معنی ہیں معاشرہ کا غیر متوازن ہو جانا۔ قرآن کریم میں، قارون کے قصہ کے سلسلہ میں، نظام سرمایہ داری کو الفساد کہہ کر پکارا گیا ہے اور اس کے مقابل میں حُسْن کا لفظ آیا ہے (۱۴۹) اس مقام

پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ حَسَنَةٌ اور حَسَنَات کے معنی ہوں گے ایسے کام جن سے انسان کی اپنی ذات اور معاشرہ کا حسن۔ یعنی توازن و تناسب۔ برقرار رہے، اور

(اس کے مقابلہ میں) سَيِّئَةٌ اور سَيِّئَات کے معنی ہوں گے ایسے کام جن سے انسان کی ذات اور معاشرہ کا حسن (توازن) بگڑ جائے۔ اس سے واضح ہے کہ حَسَنَةٌ اور سَيِّئَةٌ کا حقیقی مفہوم، ان کے مروجہ معانی (نیکی، بدی) کے مقابلہ میں کس قدر وسیع اور جامع ہے۔ جب انسانی ذات میں توازن پیدا ہو جائے (جسے BALANCED

PERSONALITY کہتے ہیں) تو اس سے اس کی سیرت و کردار میں حسن پیدا ہو جاتا ہے اور جب کوئی معاشرہ متوازن ہو جائے تو اسے زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس، جس کسی فرد کی ذات کا توازن بگڑ جائے تو

نفسیاتی مریض ہو جاتا ہے اور اس کی سیرت اور کردار غیر صحت مندانہ ہو جاتے ہیں اور جب کسی معاشرہ کا توازن بگڑ جائے تو اس سے زندگی کے ہر گوشے میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ (میں نے مفہوم القرآن میں صحیح توازن کے لئے ”ہمواریاں“

اور بگڑے ہوئے توازن کے لئے ”ناہمواریاں“ کی اصطلاحات استعمال کی ہیں)۔

حَسَنَات اور سَيِّئَات کے سلسلہ میں اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل اس جہاں کی متعلقہ

مقامات پر سامنے آتی جائے گی۔

السُّوء اور الفحشاء کے ان معانی سے، آیت (۱۴۹) کا وہ مفہوم واضح طور پر سمجھ میں آجائے گا جسے اوپر

لکھا گیا ہے اور اس سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ رزقِ حلال و طیب سے کیا مراد ہے۔ نشانہ خداوندی یہ ہے کہ اس نے جو سامانِ زینت بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے (مِمَّا فِي الْأَرْضِ) اس کی تقسیم اس طرح سے ہو کہ وہ ہر شخص

کو اس کی ضروریات کے مطابق، بلا منتِ غیرے، ملتا جائے اور یوں معاشرہ کا توازن نہ بگڑے۔ اس میں ناہمواریاں نہ پیدا ہوں۔ لیکن مفاد پرست، خود غرض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھ لیں، اور اس طرح معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کر دیں۔ یہ لوگ نوعِ انسان کے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ یہ اس قسم کا (ناہمواریاں پیدا کرنے والا) نظام قائم کرتے ہیں، اور مذہبی پیشوائیت آگے بڑھ کر اسے سند الوہیت عطا کر دیتی ہے۔ یعنی وہ یہ فتویٰ دیدیتے ہیں کہ نظامِ سرمایہ داری منشاءِ خداوندی کے عین مطابق ہے۔ نزولِ قرآن مجید سے پہلے تو اس کی وجہ جہالت ہو سکتی تھی کیونکہ ان کے پاس منشاءِ خداوندی معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ان کے پاس خدا کی کوئی کتاب اصلی جنتیقی، (غیر محرف) شکل میں موجود نہیں تھی۔ لیکن نزولِ قرآن کے بعد تو یہ صورت نہیں رہی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد ان کے پاس، اس غلط اور باطل نظام کی تائید کے لئے دلیل یا سند کیا ہے؟ وہی دلیل اور سند جو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے شروع سے پیش کی جاتی رہی ہے اور آج بھی پیش کی جاتی ہے یعنی

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ . (۲۰)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے (قرآن میں) نازل کیا ہے، اس کا اتباع کرو، تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی راستے پر چلتے جائیں گے جس راستے پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ یعنی خواہ ان کے اسلاف نہ عقل و بصیرت رکھتے ہوں اور نہ ہی وحی کے راستے پر گامزن ہوں، یہ پھر بھی انہی کے نقوشِ قدم پر چلتے جائیں گے! یا للعجب۔

مسکبِ اسلاف کی کورانہ تقلید کے متعلق، مطالب الفرقان، جلد اول میں بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اسے

ایک نظر دیکھ لیا جائے (حوالوں کے لئے دیکھئے منہ: آیت ۱۷، ص ۱۶۴۔ آیت ۲۰، ص ۱۶۵)

مسکبِ تقلید

آیت (۲۰)۔ زندگی کی علامتِ حرکت ہے، اور موتِ جمود سے پہچانی جاتی ہے۔ اسلام میں بت پرستی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے اوثان کا لفظ آیا ہے۔

(۲۰) جو وثن کی جمع ہے۔ وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود و قفل، عدمِ حرکت۔ جامد و غیر متحرک

وثن کے معنی

ہو جانا۔ بت کو وثن اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک جگہ جامد ہوتا ہے۔ اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نہجِ زندگی جس میں حرکت نہ رہے، وہ جامد ہو جائے، وثن ہے۔ جب فترائی

صنابطہ حیات کو عمل میں لایا جائے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکتِ پیہم اور سعیِ مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ”حرکتِ پیہم“ کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ، قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانے کے بدلتے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتے چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحرکیٹ (DYNAMIC MOVEMENT) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی مقام پر رک جائے، اس میں جمود پیدا ہو جائے، تو یہ وثنیت ہوگی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا جائے جیت ہے کہ ہم نے تو قرآنِ کریم کے اس عظیم نکتہ کو پس پشت ڈال دیا۔ لیکن مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ چنانچہ (ہمارے دور کا نامور فلاسفر) وائیٹ ہیڈ لکھتا ہے :-

بت پرستی مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانے کا نام ہے۔

اس قسم کی بت پرستی میں ایک زندہ اور متحرک نظامِ حیات کے نظریات اور مناسک کی تسکین باقی رہ جاتی ہیں اور ان کے معانی، مفہوم اور مقاصد نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ یہ مذہب، دین کی مٹی شدہ لاش ہوتا ہے جس کے محافظ نہ سہی پیشوا ہوتے ہیں۔ ان بے روح رسوم اور بے جان معتقدات کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق یہی مفکر لکھتا ہے :-

زندگی کے بے جان سپیکروں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست روز و ال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرائے چلے جاتے ہیں۔ اس سے تہذیب و ترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔ (ایضاً ص ۳۵)

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان، بلا سوچے سمجھے، بلا اختیار و ارادہ، اپنے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں آگے بڑھنے اور کچھ اور بننے کی صلاحیت نہیں رہتی (ان میں اس کی صلاحیت ہوتی نہیں کیونکہ وہ صاحب اختیار و ارادہ نہیں ہوتے)۔ بھڑ، جو کچھ آج سے پانچ لاکھ سال پہلے بھٹی، وہی کچھ آج ہے۔ بھڑ کا بچہ بھڑ ہی بن سکتا ہے۔ یہ ہوتا ہے اسلاف کے مسلک و منہاج کی کورانہ پیروی کا نتیجہ خواہ وہ حیوانات میں ہو، اور خواہ اسے انسان نما حیوان اختیار کریں۔ قرآنِ کریم نے اس مسلک کے سمجھانے کے لئے یہی مثال دی ہے جب کہا ہے کہ :-

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَ
نِدَاءً - صُمُّ بُكْمٌ عُمْىٰ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ - (۲/۱۴۱)

مذہبی پیشواؤں اور ان کے پیچھے چلنے والے (مقلدین) کی مثال یوں سمجھئے کہ بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہے جس کے پیچھے چرواہا ہے۔ چرواہے نے اپنے بڑے بوڑھوں سے کچھ آوازیں سیکھ رکھی ہیں۔ بلا الفاظ، اور کچھ الفاظ یاد کر رکھے ہیں بلا مطلب۔ وہ یہ آوازیں نکالتا اور ان الفاظ کو دہراتا رہتا ہے، اور بھیڑ بکریاں جو ان آوازوں پر لگی ہوتی ہیں، ان کے مطابق ادھر ادھر مڑتی رہتی ہیں۔ نہ چرواہے کو اس کا علم ہوتا ہے کہ ان آوازوں کا منطوق اور ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے، اور نہ ہی وہ بھیڑ بکریاں ان آوازوں کا مطلب سمجھنے کی اہل ہوتی ہیں۔ یہ میں تقلید آবার کرنے والے بہرے، گوئگے، اندھے، عقل و فکر سے کام نہ لینے والے۔ اُولَٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ۔ یٰۤاَنۡسَا

حیوانی روش

نہیں حیوان ہیں۔ مَبۡلُۢمٌ هُمۡۤ اَحۡسَلُ - (۲/۱۴۱) بلکہ ان سے بھی گئے گزشتے، کہ حیوان تو مَعۡنٰی ہوتے ہیں کیونکہ انہیں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی حاصل نہیں ہوتی اور یہ انسان نما حیوان، ان صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہوئے، حیوانوں کی روش اختیار کئے رہتے ہیں۔

اس کے بعد کہا :-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُلُوۡا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَاشْكُرُوۡا لِلّٰهِ اِنۡ
كُنۡتُمۡ اِبۡرَآءًا تَعۡبُدُوۡنَ - (۲/۱۴۲)

اے جماعتِ مومنین! دیکھنا تم کہیں ایسی روش اختیار نہ کر لینا اور ان کی اس قسم کی باتوں پر کان نہ دھرنا کہ ہمارے اسلاف نے اسے حلال قرار دیا ہے اور اسے حرام۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، جو رزق خدا نے عطا کیا ہے، اسے خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق، حلال و طیب طریق سے کھاؤ پیو اور اس کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق صرف میں لاؤ۔ یہ اس بات کی شہادت ہوگی کہ تم خدا کی اطاعت کرتے ہو، ان کے اسلاف کی نہیں۔

مسکب اسلاف کو دینِ خداوندی سمجھنے والے مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ بیٹھے حرام اور حلال کی فہرستیں مرتب کرتے رہتے اور انسانی آزادی کو اپنی خود ساختہ زنجیروں میں جکڑتے رہتے ہیں۔ تم اُسے حلال سمجھو جسے خدا نے حلال قرار دیا ہے اور اُسی کو حرام جسے اس نے اپنی کتاب میں حرام کھڑا کیا ہے۔ اور یہ فہرست بڑی مختصر ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس فہرست کی طرف آئیں، حرام اور حلال کا نظریہ قرآنی روشنی میں سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ دین میں اسے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

حرام اور حلال کا نظریہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اس کے ارشاد کے مطابق ہر ابن آدم۔ ہر انسان بحض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ - ہم نے بنی آدم کو تکریم عطا کی ہے۔ ۱۷/۱) اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ اس پر اپنی مرضی چلائے۔ اسے اپنے احکام کے تابع رکھے: مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُونِ اللَّهِ (۱۸/۲) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں خواہ اللہ نے اُسے ضابطہ قوانین، یا حکومت یا نبوت ہی کیوں نہ دی ہو، کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ سے ورے میری محکومیت اختیار کرو! لہذا قرآن کریم کی رو سے کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی لگائے۔

لیکن زندگی میں بعض پابندیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان پابندیوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً:۔
(الف) ڈاکٹر مرضی سے کہہ دیتا ہے کہ تم نے اتنے دنوں تک گوشت نہیں کھانا۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر کے اس فیصلہ کی پابندی کسی کے حکم کی اطاعت نہیں۔ یہ اس کا ایک فنی مشورہ اور مشفقانہ ہدایت ہے جسے ماننا یا نہ ماننا ہمارے اپنے بس کی بات ہے۔ اسے ماننے سے ہمارا بھلا ہوگا۔ نہ ماننے سے نقصان ہوگا۔ ہم اسے بطیب خاطر مانتے ہیں۔ اس سے ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

(ب) ہمارے ملک کی مجلس قانون ساز جو ہمارے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے، ایک قانون بناتی ہے اور حکومت اسے نافذ کرتی ہے (مثلاً یہ قانون کہ سڑک پر بائیں ہاتھ چلو) اس قانون پر پابندی بھی درحقیقت کسی دوسرے کے حکم کی پابندی نہیں۔ ہمارے اپنے ہی فیصلہ کی پابندی ہے۔ لہذا اس سے بھی ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

لیکن اس کے برعکس، ایک شخص کہتا ہے کہ اسلام کی رو سے فلاں چیز کا استعمال حرام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص نہ صرف اپنے زمانے کے کروڑوں مسلمانوں پر پابندی لگاتا ہے بلکہ قیامت تک آنے والی امت مسلمہ کو اس حکم کی زنجیر میں اس طرح جکڑتا ہے کہ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں مجرم قرار پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شدید پابندی کے لئے کوئی واضح اور متعین سند (AUTHORITY) ہونی چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے یہ اتھارٹی کیا ہے؟

قرآن کریم نے اس قسم کی پابندی کے لئے "حرام کا لفظ استعمال کیا ہے جو "حلال" کی ضد ہے۔ حلال کے معنی ہیں تیاں کھول کر آزاد کر دینا۔ اس لئے حرام کے معنی ہونے کسی کو کسی بات سے روک دینا، منع کر دینا، اس پر پابندی لگا دینا۔

قرآن کریم نے حرام اور حلال کے بارے میں واضح احکام دیئے ہیں۔ اس نے سب سے پہلے اصول یہ بیان کیا ہے کہ خوشگوار سامانِ رزق کی ہر شے حلال ہے بجز ان کے جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہو۔ سورۃ بقرہ میں ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنَّ كُنتُم
إِتِبَاءَ تَعْبُدُونَ - إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخَنَازِيرِ وَمَا
أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ (۲/۱۷۳)

اے ایمان والو! جو کچھ اللہ نے بطور رزق دیا ہے اس میں سے طیبات (خوشگوار چیزوں) کو کھاؤ اور اللہ کا شکر کرو اگر تم صرف اسی کی محکومی اختیار کرتے ہو۔ اس نے تم پر صرف مردار اور (بہتا ہوا) خون اور سور کا گوشت اور جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے پکارا جائے، حرام کیا ہے۔ یہاں صرف کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے۔ سورۃ اعراف میں اُن کے ساتھ اشیاء مستعملہ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ فرمایا :

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲)
(ان سے) کہو کہ وہ کون ہے جس نے زینت کی چیزوں کو، جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور خوشگوار سامانِ زینت کو حرام قرار دیا ہے ؟

اس سے آگے ہے :-

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ (۲۴/۳۱)

ان سے کہو کہ میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ ان آیات سے ظاہر ہے کہ :-

(۱) کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔

(۲) خدا کے علاوہ اس کا حق کسی اور کو حاصل نہیں۔

(۳) اس نے زینت کی کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا۔

(۴) اشیائے رزق میں سے جنہیں حرام قرار دیا ہے اُن کی خود ہی تصریح کر دی ہے۔

لہٰذا لفظ حرام کے دیگر استعمالات اپنے اپنے مقام پر آئیں گے۔

ان تصریحات کے بعد اب آیہ زیر نظر کی طرف آتے ہیں کہ کیا ہے :-

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخُزْزِيرِ وَمَا أُهْلَ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ - (۲/۱۴۳) - نیز (۱۴/۱۱۵)

خدا نے تم پر صرف یہ چار چیزیں حرام قرار دی ہیں۔ مردار۔ خون۔ خنزیر کا گوشت۔ اور مردہ چیز جسے خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔

پھر اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کھانے پینے کے لئے کچھ اور نہ ملے اور تم جان بچانے کے لئے مجبور ہو جاؤ اور تمہاری نیت قانون شکنی یا لذت یا بانی کی نہ ہو تو اس صورت میں ان چیزوں کو بقدر ضرورت کھا لینے میں مضائقہ نہیں۔ چونکہ اس میں تمہاری نیت قانون شکنی کی نہیں، اس لئے اس سے تمہاری ذات پر جو اضطلال واقع ہونا تھا، قانون خداوندی پر محکم یقین تمہیں اس سے محفوظ رکھے گا اور تمہاری ذات کی نشوونما پر مضر اثر نہیں پڑے گا۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی کھانے پینے کی حرام چیزوں کا ذکر آیا ہے، یہی چار چیزیں گنائی گئی ہیں۔ البتہ بعض آیات میں ان کی مزید تشریح کی گئی ہے۔ مثلاً سورۃ المائدہ میں مَيْتَةً (مردار) کی تصریح کرتے ہوئے کہا۔ وَالْمُسْخِنَةَ وَالْمَوْقُودَةَ وَالْمُتَرَدِّيَةَ وَالنَّطِيحَةَ وَمَا أَكَلَ السَّبْعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ..... (۵/۱۱۵) یعنی جو جانور طبعی موت مر جائے (میتہ) اس کے علاوہ جو گلا گھونٹ کر مر جائے۔ چوٹ کھا کر مر جائے جو اوپر سے گر کر مر جائے، کسی جانور کا سینک لگنے سے مر جائے یا جسے درندوں نے بھاڑ کھایا ہو۔ یہ بھی حرام ہیں۔ ہاں اگر ان جانوروں کو مرنے سے پہلے ذبح کر لیا جائے تو پھر ان کا کھانا جائز ہے۔ وَمَا ذَرِيعَ عَلَى النَّصَبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَنفِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ - نیز جن جانوروں کو استھانوں پر چڑھاوے کے طور پر ذبح کیا جائے، وہ بھی حرام ہیں۔ یعنی اُن مقامات پر جو لوگوں نے نذر نیاز کے لئے مقرر کر رکھے ہیں یا جن کا گوشت پانسو کے ذریعے تقسیم کیا جائے (عہد جاہلیہ میں یہ بھی جوئے کی ایک قسم تھی۔ تفصیل اس کی میسرہ کے ضمن میں آئے گی جہاں بتایا جائے گا کہ قرعہ اندازی یا فانی لینا بھی از روئے قرآن ممنوع ہے)۔ آیت (۵/۱۱۵) میں کہا گیا ہے کہ جو شکار، شکاری جانور تمہارے لئے پکڑیں، وہ بھی حلال ہے۔

آیت (۵/۱۱۵) میں دَمَ کہا گیا ہے۔ (یعنی خون)۔ آیت (۵/۱۱۵) میں دَمًا مَسْفُوحًا، کہہ کر اس کی وضاحت

کردی۔ یعنی بہتا ہوا ہو۔

آیت (۵) میں ”فَمِنْ اضْطُرَّ“ کہا تھا۔ یعنی جو مجبور ہو جائے۔ آیت (۵) میں، ”فَمِنْ اضْطُرَّ“ فَمِنْ اضْطُرَّ کہہ کر اس کی وضاحت کردی۔ یعنی جو بھوک کی وجہ سے مجبور ہو جائے۔ آیت (۵) میں اضطراری حالت کے بعد کہا۔ ”غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ“۔ بَاغ کے معنی ہیں حد سے بڑھ جانے والا۔ قانون شکنی کرنے والا۔ بغاوت کرنے والا۔ عَاد کے معنی بھی حد سے تجاوز کرنا ہیں۔ آیت (۵) میں ”غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ“ کہا۔ یعنی اِثْم (قانون شکنی کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے نہیں) معنی واضح ہیں۔ یعنی اضطراری حالت کے معنی ہیں، بھوک کی وجہ سے مجبور ہو جانا۔ لہذا، ایسی حالت میں حرام چیز کو اتنا ہی کھانا جائز ہوگا جس سے بھوک رفع ہو جائے۔ اس سے زیادہ کھانا۔ یا محض لذت کے لئے کھانا، حد سے تجاوز ہو جائے گا۔

کھانے پینے کی جن چیزوں کو خدا نے حرام قرار دیا ہے، ان میں تین چیزیں تو مادی ہیں۔ یعنی مُردار، خون اور خنزیر کا گوشت اور چوتھی چیز اعتقادی۔ یعنی ہر وہ حلال شے جسے غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا جائے، حرام ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں فرمایا۔ ”فَكُلُوا مِمَّا ذُكِّرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ“ اِنْ كُنْتُمْ بِلَا مِلَّةٍ مُّؤْمِنِينَ۔ (۱۱۹)۔ جس چیز پر خدا کا نام لیا جائے اسے ہی کھاؤ۔ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ قوانین خداوندی پر تمہارا ایمان ہے۔ ذرا آگے جا کر کھاء وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا كُمِذُ كَرَّ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ (۱۲۰)۔ جس چیز پر خدا کا نام نہ لیا جائے، اسے مت کھاؤ۔ ان آیات میں اگرچہ اس کی تصریح نہیں کی گئی لیکن جس سلسلہ میں یہ حکم دیا گیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کا تعلق حلال جانوروں کے ذبح کرنے سے ہے۔ آیت (۱۲۰) سے اس مفہوم کی تائید ہو جاتی ہے۔ ان آیات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ :-

(۱) کھانے پینے کی چیز جسے غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا جائے، حرام ہو جاتی ہے۔

(۲) حلال جانوروں کو ذبح کرتے وقت اگر اللہ کا نام نہ لیا جائے تو ان کا گوشت کھانا جائز نہیں۔ وہ اسی صورت

میں جائز ہو سکتا ہے جب اس پر خدا کا نام لیا جائے۔ یعنی خدا کا نام لینا لازمی ہے۔

ان امور کا تعلق عقیدہ سے ہے۔ لیکن آپ اس ستم ظریفی کو ملاحظہ فرمائیے کہ ہمارے ہاں مُردار اور سَوْر کا کھانا تو

ایک طرف، ان کا نام تک لینا بھی قابل نفرت سمجھا جاتا ہے لیکن پیروں، نفیروں کے نام کی نذر نیاز اور مزاروں بقیروں

پر چڑھائے ہوئے چڑھاوے، نہ صرف یہ کہ انہیں شیر بادری کی طرح حلال اور طیب سمجھا جاتا ہے بلکہ انہیں متبرک

قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ غیر اللہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے نہ نص صریح حرام ہوتے ہیں۔ مَّا أَهْلًا بِهِ لِيُخَيِّرَ اللَّهُ (۲۱۶)۔ میں، اُہْلًا کا مادہ (ہ۔ ل۔ ل۔ ل) ہے جس کے بنیادی معنی آواز بلند کرنا یا پکارنا ہیں۔ [ابتدائی تاریخوں کے چاند کو ہِلَال] اس لئے کہتے ہیں کہ جو اسے دیکھ لے وہ آواز بلند اس کا اعلان کرتا ہے۔ ہمارے ہاں هَلَّلَ کے معنی تہلیل یعنی لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔ کہنے کے ہیں [پکارنے کا عملی مفہوم، غیر اللہ کی طرف منسوب کرنا ہے۔

سورۃ انعام میں ہے۔ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْهِمْ (۱۱۶)۔ خدا نے واضح طور پر کہہ دیا کہ کیا کیا چیزیں حرام ہیں۔ ان کے سوا سب چیزیں حلال ہیں۔ سو جب کسی جانور کو خدا کا نام لے کر ذبح کر دیا جائے تو اس کا کھانا از روئے دین خداوندی حلال ہو جائے گا۔ اسے کسی کے فتوے کی رو سے حرام سمجھنا، قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ تمہارے مرغوب خاطر نہ ہو یا طبی طور پر مضر صحت ہو۔ (یعنی تمہارے لئے طیب نہ ہو)۔ اس سے واضح ہے کہ (بجز اضطراری حالت کے) حرام چیزوں کو تو کھایا ہی نہیں جاسکتا، لیکن ہر حلال شے کا کھانا لازمی اور فرض نہیں۔

حالت احرام میں صید البر۔ بھی حرام ہے۔ (۱) ذ (۵-۹۴)۔ اس کی تفصیل حج کے ضمن میں سامنے آئے گی۔

سورۃ المائدہ میں ہے۔ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ

لَهُمْ (۵)۔ اہل کتاب کے ہاں کا کھانا تمہارے لئے حلال

اہل کتاب کے ہاں کا کھانا

ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اہل کتاب کے ہاں کا ہر کھانا حلال ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ہاں کا وہی کھانا مسلمانوں کے لئے حلال ہوگا جسے مشرآن نے حرام قرار نہیں دیا، ورنہ یہ بات تو عجیب ہوگی کہ (مثلاً، اپنے ہاں سور کا گوشت پکاؤ تو وہ حرام ہو، اور وہی گوشت کسی عیسائی کے ہاں پکا ہو تو وہ حلال قرار پا جائے۔ کسی چیز کے حلال ہونے کی جو شرائط قرآن مجید نے عاید کی ہیں، اگر کسی اہل کتاب کے ہاں کا کھانا ان شرائط پر پورا اترتا ہو تو اس کا کھانا حلال ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ یہودی احب نوروں کو اُسی

طرح ذبح کرتے ہیں جس طرح مسلمان ذبح کرتے ہیں، اور وہ اس پر خدا کا نام بھی لیتے ہیں۔ (اسے ان کی اصطلاح میں کوشر کہا جاتا ہے)۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس حلال جانور کے گوشت کا کھانا مسلمانوں کے لئے حلال ہوگا۔ لیکن اس میں دوسری شرط یہ بھی ہے کہ **وَكُلُوا مِمَّا حَلَلْتُ لَكُمُ** (۲/۱۷۳)۔ وہ بھی تمہارے ہاں کے کھانے کو حلال سمجھیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اہل کتاب کے ہاں کے حلال کھانے کی جو اجازت دی گئی ہے تو اس کی دہان کے ساتھ تمدنی روابط ہیں۔

قرآن کریم نے اہل کتاب کے ہاں کے کھانے کی تخصیص کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ غیر اہل کتاب کے ہاں کا کھانا کسی صورت میں بھی جائز نہیں، خواہ وہ حلال ہونے کی شرائط کو پورا بھی کیوں نہ کرتا ہو۔

(۱)

قرآن کریم نے جن تین مادی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں مُردار اور خون کے متعلق کوئی بات نہیں کی جاتی۔ البتہ لحم خنزیر (سورہ کے گوشت) کے متعلق اکثر بحث کی جاتی ہے۔ اس لئے

لحم خنزیر

کہ (ان کے ایک آدھ فرقہ کے سوا) عیسائی اس کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی طرف

سے اکثر اعتراض ہوتا ہے کہ مسلمان اسے کیوں حرام سمجھتے ہیں۔ انگلستان میں رہنے والے مسلمانوں کی طرف سے اس ضمن میں مجھے اکثر استفسارات موصول ہوتے رہتے ہیں۔ اس موضوع پر ہمارے اہل قلم کی طرف سے لکھا تو بہت کچھ گیا ہے لیکن اس کے خلاف بنیادی دلائل دو ہی دیئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ جانور (خنزیر) بڑا بے حیا ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے گوشت میں ایسے جراثیم ہوتے ہیں جو انسان کے لئے مضر صحت ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ میں ان دلائل سے مطمئن نہیں۔ جہاں تک اس کے بے حیا ہونے کا سوال ہے، تو یہ دلیل بڑی بودی ہے، حیا اور بے حیائی تو انسانی خصوصیات ہیں۔ حیوانات میں نہ اس کا احساس ہوتا ہے، نہ تمیز۔ باقی رہا اس کے گوشت کا مضر صحت ہونا، سو مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں اس موضوع پر گفتگو کرنے کا اہل (COMPETENT) نہیں۔ یہ الگ سائنس ہے جو میرا میدان نہیں۔ لیکن جو کچھ مسلمان محقق اس کے متعلق لکھتے ہیں، عیسائی ریسرچ کرنے والے اس کی شدت سے تردید کرتے ہیں۔ میں اس دلیل سے اس لئے بھی مطمئن نہیں کہ کئی جانور ایسے ہوں گے جن کا گوشت انسانی صحت کے لئے لحم خنزیر سے بھی زیادہ مضر ہوگا۔ اگر علتِ حرمت یہی تھی تو قرآن کریم میں بہت سے ایسے اور جانوروں کو بھی حرام قرار دینا چاہیے تھا، اس میں خنزیر کی تخصیص کیا کھنی؟

جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، اس کی علتِ حرمت، طبعی (PHYSICAL) نہیں، جذباتی اور نظریاتی ہے۔ آپ دنیا کی کسی قوم، اور کسی زمانے کے لٹریچر کو دیکھئے (خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی) اس میں سور کو انتہائی قابلِ نفرت جانور قرار دیا گیا ہوگا۔ حتیٰ کہ یہ لفظ گالی کے طور پر استعمال کیا گیا ہوگا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس جانور کے خلاف اس قسم کی عالمگیر نفرت کی وجہ کیا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ نفرت، زمانہ قدیم سے، ہر قوم میں چلی آ رہی ہے۔ یہودیوں کے ہاں تو خیر یہ حرام ہی ہے، لیکن عیسائی، جو اسے بڑے شوق سے کھاتے ہیں، وہ بھی (You SWINE) گالی کے طور پر بولتے ہیں۔ اور (PIG - HEADED) بھی۔ انجیل میں، حضرت عیسیٰ کی زبان سے کہا گیا ہے کہ ”اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو“ (متی - ۶)۔ ابتداءً عیسائی بھی سور کے گوشت کو حرام سمجھتے (اور ختنہ کراتے) تھے کیونکہ وہ شریعتِ موسوی کے پابند تھے۔ لیکن بعد میں جب یہودیوں کو خلاف ان کی نفرت شدت اختیار کر گئی تو انہوں نے، اُن کے علی الرغم، سور کا گوشت کھانا شروع کر دیا اور ختنہ کرنا بند کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود، سور کے خلاف ان کا جذبہ نفرت بدستور رہا۔ یوں نظر آتا ہے جیسے اس جانور کے خلاف یہ جذبہ، (بجز وحشی قبائل کے) نوعِ انسان کے تحت الشعور میں چلا آ رہا ہے۔ (جیسے مردار خوار۔ اور خوشخوار، قابلِ نفرت سمجھے جاتے ہیں)۔ میرا خیال ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانوں کے اس جذبہ کا احترام کرتے ہوئے اسے حرام قرار دیا ہے۔ (حرام اور احترام کا مادہ بھی ایک ہی ہے)۔

ایک دفعہ ایک انگریز (عیسائی) مفکر مجھے ملنے کے لئے آیا، اور منجملہ دیگر امور، اس نے خنزیر کے گوشت کی حرمت کے متعلق بھی بات چھیڑ دی۔ حسبِ معمول اس نے کہا کہ ہمارے ہاں خنزیروں کی اس طرح پرورش کی جاتی ہے کہ ان کے گوشت میں کوئی چیز مضرت رساں نہیں ہوتی۔ کیا آپ اس قسم کے گوشت کو بھی حرام قرار دیں گے؟ میں نے کہا کہ میرے نزدیک اس کے حرام ہونے کی علت، مادی نہیں، جذباتی ہے۔ اس نے کچھ خندہ استہزاء سے کہا کہ مادی چیزوں میں جذباتی علت کا کیا سوال؟ میں نے نہایت متانت سے کہا کہ کیا آپ اپنی حقیقی بہن سے شادی کریں گے؟ اس نے کہا کہ یہ آپ نے کیا سوال کر دیا؟ اپنی بہن سے شادی کون کر سکتا ہے؟ میں نے کہا کہ معاف فرمائیے! اپنی بہن اور کسی اور لڑکی میں جس کے ساتھ آپ بلا تکلف شادی کر سکتے ہیں، عورت ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ سو جب دونوں کا جسم ایک جیسا ہوتا ہے، تو بہن کے ساتھ شادی کیوں نہیں ہو سکتی؟ وہ خاموش ہو گیا اور اسے اعتراف کرنا پڑا کہ علتِ حرمت کی وجہ، مادی سے کہیں زیادہ جذباتی ہوتی ہیں۔

سو میرے نزدیک، قرآنِ کریم نے کھانے پینے کی جن چیزوں، اور جن رشتوں کو حرام قرار دیا ہے، اس کی وجہ

یہ ہے کہ اس نے انسان کے ان جذبات کا احترام کیا ہے جو نوع انسان کے تحت الشعور میں عام طور پر، بطور قدر مشترک متواتر چلے آ رہے تھے۔ لیکن یہ بہر حال عمیری توحید ہے جس کے ساتھ ضروری نہیں کہ آپ بھی متفق ہوں، لیکن جس بات کے متعلق نہ کسی مسلمان کو اختلاف کی اجازت ہے، نہ شک و شبہ کی گنجائش، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، اس لئے یہ حرام ہیں۔ اگر ان کی علت حرمت ہماری سمجھ میں آجاتی ہے تو صوالہ مراد۔ اس سے ہماری ذہنی تسکین ہو جاتے گی۔ لیکن اگر یہ اطمینان بخش طور پر سمجھ میں نہیں بھی آتی، تو بھی یہ حرام ضرور رہیں گی۔ ہر سوسائٹی اور تنظیم کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں جو شخص اس سوسائٹی کا ممبر رہنا چاہتا ہے، اسے ان اصولوں کو ماننا ہوگا۔ اگر ان پر اس کا دل نہیں ٹھکتا، تو اسے اس سوسائٹی سے الگ ہو جانا چاہیے۔ حرام اور حلال، اسلامی سوسائٹی کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ جو شخص اس سوسائٹی میں رہنا چاہتا ہے اسے قرآن کے حرام کردہ کو حرام سمجھنا ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اس کے حرام کو حرام نہ سمجھیں اور اس کے باوجود اس کی قائم کردہ سوسائٹی (امت مسلمہ) کے رکن بھی رہیں۔ یہ ہے حرام اور حلال کی بنیادی اہمیت۔

(۱)

آپ نے غور فرمایا کہ دین میں حلال و حرام کا مسئلہ کس قدر بنیادی اور اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اسے اس قدر وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس نے بہ شد و مد پکار پکار کر کہا ہے کہ کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار خدا، اور صرف خدا کو ہے۔ الدین میں یہ اختیار کسی اور کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں کتاب اللہ کے حرام کردہ کو حرام قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جب دین، مذہب میں بدل جاتا ہے تو مذہبی پیشوائیت سب سے پہلے، اس خدائی اختیار پر چھاپے مارتی ہے، وہ خدا کی متعین کردہ فہرست کو تو پس پشت ڈال دیتی ہے اور اپنی الگ فہرستیں مرتب کر کے انہیں شریعت خداوندی کے نام سے مشہور کر دیتی ہے اور انہی کی پابندی لوگوں سے کراتی ہے۔ اسی کو تھیا کر لے لے رہے ہیں۔ یعنی خدا کے نام پر مذہبی پیشواؤں کی حکومت۔ اسے قرآن کریم نے جرم عظیم قرار دیا ہے جب فرمایا۔

لَاَ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا. أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ. وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ. (۲: ۱۷۴)

جو لوگ خدا کے حرام کردہ کو پس پردہ ڈال کر، حرام و حلال کی اپنی فہرستیں مرتب کرنے لگ جائیں اور اس طرح خدائی اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے کر، انہیں دنیاوی مفاد حاصل کرنے کا ذریعہ بنالیں، تو وہ بظاہر کتنے ہی مرفذ الحال اور مقدس کیوں نہ دکھائی دیں، لیوں سمجھو کہ وہ سامانِ زیست حاصل نہیں کر رہے، انگاروں سے اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔ آج تو یہ بڑے فرحاں و نازاں پھر رہے ہیں، لیکن ظہورِ نجات کے وقت تم دیکھو گے کہ خدا ان سے بات ممکن نہیں کرے گا۔ یعنی اُس کے قانون کی رُو سے ملنے والی سعادتیں اور خوشگواریاں ان سے آنکھ تک نہیں ملائیں گی اور ان کی انسانی صلاحیتیں دبی کی دبی رہ جائیں گی۔ یہ بڑا ہی الم انگیز عذاب ہوگا۔ اس وقت انہیں اس کا احساس اور اندازہ ہوگا کہ انہوں نے شرفِ انسانیت کو جن داموں بیچا تھا وہ کس قدر حقیر اور کم مایہ تھے۔

یہ اس لئے کہ :-

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلٰةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ
فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ - (۲: ۱۴۵)

یہ اس لئے کہ انہوں نے خدا کی متین کردہ سیدھی راہ کو بیچ کر غلط راستوں کو خریدا۔ خدا کی حفاظت کے بدلے میں تباہیاں مول لیں۔ ذرا سوچو کہ سب کچھ دیکھتے بھل جاتے، تباہیوں کے جہنم کی طرف بڑھے چلے جانا، کتنی بڑی دیدہ دلیری کا کام ہے۔ یہ اپنی قوتِ برداشت کے متعلق کس قدر غلط فہمی میں ہیں۔ اس کا کس قدر غلط اندازہ لگا رہے ہیں۔ یہ اس تباہی کا مقابلہ کر ہی نہیں سکیں گے۔

مذہبی پیشوائیت اور ان کے کاروبار کے متعلق سابقہ دو جلدوں میں بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ دیکھیے بالخصوص جلد اول ص ۳۳۔ آیت (۱/۳)؛ ص ۶۲۔ آیت (۱/۲)؛ ص ۲۳۵۔ آیات (۲/۱۱-۱۲)؛ ص ۲۵۶۔ آیت (۲/۱۶) اور جلد دوم ص ۱۹۴۔ آیت (۲/۱۸)؛ ص ۲۳۴۔ آیت (۲/۲۹)۔

ان کا ایسا انجام کیوں ہوگا؟

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ . وَاِنَّ الَّذِیْنَ اٰخْتَلَفُوْا
فِی الْكِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ - (۲: ۱۴۶)

اس لئے کہ خدا نے جو کتاب نازل کی ہے وہ اُٹل حقیقت ہے جس میں اختلاف کا شائبہ تک نہیں۔ (۲/۱۴۶) لیکن جب انسان اپنے ذہن سے شریعتیں وضع کر کے اس کتاب میں اختلاف پیدا کرنے لگ جائیں، تو پھر وہ صحیح

راستے سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟
 اگر ہر معاملہ میں غلط اور صحیح کا معیار، خدا کی کتاب کو قرار دیا جائے، تو فیصلوں میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
 لیکن جب اس کتاب کی جگہ، ذہن انسانی کے وضع کردہ معیار لے لیں تو پھر بات بات پر اختلاف ہو گا۔ یہ وجہ
 ہے کہ الدین میں کوئی فرقہ نہیں ہوتا، اور مذہب، فرقوں کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا۔ خدا نے مذہبی پیشوائیت کو جو
 ”کاروبار“ قرار دیا ہے تو یہ ایک بہت بڑی حقیقت کا اظہار ہے۔ کاروباری حلقے ہمیشہ ایک دوسرے کے رقیب
 اور حریف ہوتے ہیں۔ یہ کاروبار کا تقاضا ہوتا ہے۔ الدین میں ساری کی ساری امت کا نصب العین ایک ہونا ہے۔
 مذہب میں ہر فرقہ کے پیش نظر اپنا اپنا مفاد ہوتا ہے۔
 اس مفاد طلبی کے لئے مذہبی پیشوائیت کیا کرتی ہے، اسے اگلے باب میں بیان کیا جائے گا۔



پانچواں باب

بَیِّنَات اور کِتَابُ

دلائل اور قوانین

آیت —	۲	تا	۲	۱۸۸
-------	---	----	---	-----

۱۔ دلائل۔ قوانین اور شمشیر کا باہمی تعلق

۲۔ اعمالِ صالحہ کی تفصیل

۳۔ اسبابِ ذلت

۴۔ زکوٰۃ کی مزید تشریح

۵۔ انسانی جان کی قدر و قیمت

۶۔ قصاص کا حکم

۷۔ قرآن اور حدیث

۸۔ صیام (روزوں) کے احکام اور غایت

۹۔ نزولِ قرآن

۱۰۔ خدا کی کبریائی کا قیام

۱۱۔ دعا کا تفصیلی مفہوم

۱۲۔ قربِ خداوندی کا مفہوم

۱۳۔ معراجِ نبویؐ کا مفہوم

۱۴۔ مرشدِ خدا کی ذات ہے۔

پانچواں باب

بینات اور کتاب

دلائل اور قوانین

سورہ الحديد میں ہے :-

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ. وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ۔ (۵۷)

اس مقصد کے لئے خدا نے ایسا انتظام کیا ہے کہ وہ مختلف اقوام کی طرف اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجتا ہے اور ہر رسول اپنے ساتھ ضابطہ قوانین بھی لاتا ہے۔ وہ (رسول) اس ضابطہ قوانین کی رو سے ایسا معاشرہ قائم کرتے ہیں جس میں ہر شخص کا عمل ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرے اور یوں لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔ اس معاشرہ کے استحکام کے لئے خدا نے ضابطہ قوانین کے ساتھ، شمشیرِ غارہ، شکاف (فولاد) بھی نازل کی ہے جس میں بڑی سختی ہوتی ہے اور چونکہ یہ سختی عدل و انصاف کے نظام کے قیام اور مظلوموں کی حفاظت کے کام آتی ہے اس لئے یہ نوعِ انسان کے لئے مضرت رساں ہونے کے بجائے بڑی منفعت بخش ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کون سے وفا شعار بندے ہیں جو اس نظامِ خداوندی کی مدد کرتے ہیں جو اس کے رسولوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے حالانکہ اس کے درخشندہ نتائج ہنوز، مرنے کی شکل میں ان کے سامنے نہیں آتے ہوتے اور وہ اپنے یقینِ محکم کی بنا پر اس کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں کرتے ہیں۔ یوں خدا کا وہ نظام جو اپنے اندر غلبہ اور قوت رکھتا ہے، ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔

اس آیت میں تین چیزوں کو منزل من اللہ بتایا گیا ہے۔ البتات - الشکب اور الحدید۔ ان کے منزل من اللہ ہونے کی تشریح تو آگے چل کر آئے گی، یہاں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس ترتیب سے ان تینوں چیزوں کا ذکر آیا ہے وہ نظام خداوندی کی تشکیل کے پروگرام کی ترتیب وار کڑیاں یا مدارج (STAGES) ہیں۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بتیات (دلائل) اور کتاب (قوانین) دونوں قرآن کریم کے اندر ہیں۔ قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک حکم دیتا... یا قانون سلنے لاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے اور اس کی تعمیل کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسے اس نے حکمت کہہ کر بھی پکارا ہے۔ وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (۳۳) دیگر متعدد آیات)۔ نظام خداوندی کی دعوت میں پہلا مرحلہ بتیات (دلائل) کا ہوتا ہے۔ رسول اپنے مخالفین کو دلائل و براہین کی رو سے سمجھاتا تھا کہ ان کی غلط روش کا نتیجہ کس قدر نقصان دہ اور تباہ کن ہوگا، اور صحیح راستہ اختیار کرنے کے ثمرات کس قدر خوشگوار ہوں گے۔ جو لوگ عقل و بصیرت کی رو سے ان دلائل سے مطمئن ہو کر اس (رسول) کی دعوت کی صداقت کو تسلیم کر لیتے

دلیل، قانون اور شمشیر

وہ اس رسول کی جماعت (امت) میں شامل ہو جاتے۔ ان افراد کو وہ قوانین اور ان کی غرض و غایت بتاتی جاتی جن کے مطابق انہوں نے زندگی بسر کرنی تھی۔ اس طرح انہیں اس نظام کی عملی تشکیل کے لئے تیار کیا جاتا۔ لیکن مفاد پرست گروہ اس نظام کی تشکیل کی مخالفت کرتے اور اسے ختم کرنے کے لئے قوت کے استعمال پر اتر آتے۔ اس وقت ضروری ہو جاتا کہ ان کی مذاقت قوت کے ذریعے کی جاتی۔ یہ نمیری شیخ الحدید یعنی شمشیر کے استعمال کی ہوتی۔ علامہ اقبالؒ نے کتاب اور حدید (قرآن اور شمشیر) کے باہمی تعلق کو اپنے مخصوص، بلیغ اور نہایت دلآویز انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ — مومناں را تیغ با قرآن بس است !

ابن دو قوت حافظ یک دیگر اند کائنات زندگی را محور اند

ایک قوت قانون کی ہے اور ایک قوت شمشیر کی۔ نظام خداوندی میں یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی محافظ ہوتی ہیں۔ شمشیر قرآن کی حفاظت کرتی ہے کہ حق کی مخالفت قوتیں اسے بے بس نہ بنا دیں۔ اور قرآن، شمشیر کی خطا کرتا ہے کہ اس کا بسا کا نہ استعمال نہ ہونے پائے۔ اس کی قوت قانون خداوندی کے تابع ہے۔ اس وقت تک ہمارے سامنے بتیات آئے ہیں۔ اب قانون اور شمشیر کا مرحلہ آتا ہے۔ مطالب الفرقان جلد اول ص ۱۲۲۔ زیر آیت (۲) میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ احکام خداوندی کی تعمیل کے لئے انسان کے دل سے ایک جذبہ ابھرتا ہے لیکن اس جذبہ کا اظہار محسوسات کے ذریعے ہوتا ہے — انسانی جسم کی حرکات و سکنات یا شعائرہ (SYMBOLS)

قوانین خداوندی کے احترام کی شکلیں ہیں۔ یہ حرکات و سکنات یا شعائر مقصود بالذات نہیں ہوتے بلکہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ (مثلاً) اپنے ریل کے ذریعے کہیں جانا ہو تو اس کے لئے ٹکٹ خریدنا ہوتا ہے۔ ٹکٹ خرید کر آپ عازم سفر ہو جاتے ہیں اور اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ٹکٹ خرید کر آرام سے گھر بیٹھے رہیں تو آپ قیامت تک اپنی منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتے خواہ ٹکٹ کو کتنا ہی حفاظت سے کیوں نہ رکھیں۔ الدین میں نگاہ مقصود (منزل) پر ہوتی ہے

ذریعہ اور مقصد کا باہمی تعلق

اور شعائر اس تک پہنچنے کی محسوس علامات ہوتی ہیں۔ لیکن مذہب میں یہی شعائر مقصود بالذات بن جاتے ہیں۔ اور مذہبی پیشوا ان محسوس علامات کو عین دین کہہ کر ان کی اہمیت کو دلوں میں جاگزیں کرنے رہتے ہیں۔ یعنی وہ اس ٹکٹ کو نہایت مقدس قرار دیکر اس کی حفاظت کی سخت تاکید کرتے رہتے ہیں۔ زیر نظر جلد کے دوسرے اور تیسرے ابواب میں کعبہ پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کعبہ کو نظام خداوندی کا مرکز محسوس قرار دیا گیا اور جماعتِ مؤمنین کو تاکید کی گئی کہ وہ دنیا میں کہیں بھی ہوں اس مرکز کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیں تاکہ اس نظام کے ساتھ ان کی وابستگی قائم رہے۔ اس کی محسوس شکل کے پیش نظر یہ انداز اختیار کیا گیا کہ صلوٰۃ کے اجتماعات میں ہر ایک کا رُخ کعبہ کی طرف ہے اور یوں کعبہ قبلہ کی حیثیت اختیار کر لے۔

اور رُخ جانب کعبہ اس کی محسوس علامت

بھئی اور رُخ جانب کعبہ اس کی محسوس علامت۔ جب دین مذہب میں تبدیل ہو گیا تو کعبہ کی حیثیت نماز میں "منہ طرف قبلہ شریف" کی رہ گئی اور اس کی اہمیت کا یہ عالم کہ کسی نمازی کا رُخ ذرا ادھر ادھر ہو جائے تو دُعا ہی مچا دی جائے کہ تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ رُخ سیدھا کر کے نماز پھر پڑھو۔ لیکن اس حقیقت کو کبھی سامنے نہیں لایا جاتا کہ اس سلسلے پر وگرام سے مفقہ تھا۔ قرآن کریم نے بار بار متنبہ کیا ہے کہ دیکھنا کہیں ان محسوس شعائر کو مقصود بالذات نہ بنا لینا چنانچہ سابقہ صفحات میں زیر آیت (۱۱۵) کہا گیا کہ تم کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا کہ خدا مغرب کی سمت (کعبہ میں) رہتا ہے۔ کیونکہ اس نے اُسے اپنا گھر (بیت) کہہ کر پکارا ہے۔ خدا نہ مشرق میں رہتا ہے نہ مغرب میں۔ مشرق و مغرب جملہ کائنات اس کی ملکیت ہے اور وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ زیر نظر آیت میں اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کر دیا جب کھار :-

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ - (۱۱۶)

بَرّ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔

لفظ بَرّ کا ترجمہ نیچے کیا جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ جلد دوم صفحہ ۱۱۹ زیر آیت (۱۱۶) بتایا جا چکا ہے، اس کا مفہوم اس سے

وسیع تر ہے۔ اسے آپ کشاد اور کامیابی کی راہ کہہ سکتے ہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ کشاد، کامیابی اور فائز المرامی کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ غور کیجئے کہ یہ بھی حکم ہے کہ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَكَ: (پہلا: ۱۷۷)۔ تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنا رخ اس کی طرف رکھو اور یہ بھی کہ کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف؛ پہلا حکم ایک بلند مقصد کے حصول کے ذریعے (MEANS) کے طور پر ہے اور دوسرا اس تنبیہ کے لئے کہ تم اس ذریعہ کو مقصد زندگی (END) نہ سمجھ لینا۔ پہلا حکم (مثال کے طور پر) یہ ہے کہ ٹکٹ ضرور خریدو، اور دوسرا حکم یہ کہ ٹکٹ کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا۔ مقصود و مطلوب تو منزل تک پہنچنا ہے، ٹکٹ صرف اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے دین اور مذہب کے فرق کو کس طرح چار لفظوں میں واضح کیا کہ رکھ دیا اور مذہبی پیشوائیت کی غلط نگہی کا پردہ چاک کر دیا۔

جب یہ کہا کہ کشاد کی راہ یہ نہیں تو اس سے فطری طور پر دل میں یہ خیال ابھرا کہ اگر کشاد کی راہ یہ نہیں تو پھر کشاد کی راہ کون سی ہے؟ قرآن مجید نے فوراً اس سوال کا جواب یہ کہہ کر دے دیا کہ: وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ كَشَادُكَ رَہِیْہَ كے راہ یہ ہے کہ

اور اس سے یہ سمجھ لیجئے کہ جو کچھ اگلے الفاظ میں کہا گیا کس قدر اہم ہے۔ یوں کہتے کہ وہ دین کا ملغص ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے الگ الگ ٹکڑوں میں سامنے لایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ: وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيِّنَ۔ (۲/۱۷۷)

کشاد کی راہ اس کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر، قانونِ مکافاتِ عمل اور حیاتِ آخری پر، ملائکہ پر، انبیاءِ کرام پر جن کی وساطت سے خدا کا پیغام انسانوں تک آتا رہا ہے۔ اور ان کی وساطت سے ملی ہوئی کتابوں پر۔

ایمان کا مفہوم کیا ہے، اسے جلد اول ص ۱۷۷ زیر آیت (۲/۱۷۷) بیان کیا جا چکا ہے۔ اللہ پر ایمان کا مفہوم ص ۱۷۷ زیر آیت (۲/۱۷۷) انبیاءِ کرام، کتب سابقہ اور آخرت پر ایمان کا مطلب ص ۱۷۷ زیر آیت (۲/۱۷۷) میں ملائکہ کے متعلق جلد دوم ص ۱۷۷ پر گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس کے دہانے

اجزائے ایمان کی ضرورت نہیں، بجز اس کے کہ قرآن کریم کی رو سے اجزائے ایمان یہی پانچ ہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ ایمان جذبہ تحرک ہوتا ہے عملِ صالح کا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ہر جگہ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ کو لازم و ملزوم کر دیا ہے۔

نہ ایمان بلا عمل کچھ قیمت رکھتا ہے نہ اعمال بلا ایمان نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں۔ جب تک آپ کو اس بات کا یقین نہ ہو کہ ٹکٹ خرید کر ریل پر سوار ہو جانے سے آپ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے، آپ نہ ٹکٹ خریدیں گے نہ ریل پر سوار ہوں گے۔

یوں ایمان انسان کے لئے جذبہ محرک بنتا، یا اسے آمادہ بہ عمل کرتا ہے۔ اور اگر آپ اس یقین کے ہوتے ہوتے بھی نہ ٹکٹ خریدیں اور نہ ریل پر سوار ہوں، تو بھی آپ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ یوں ایمان بلا عمل کچھ قیمت نہیں رکھتا۔ مردہ آں ایمان کہ ناید در عمل۔

اس ایمان کے بعد عمل کے مختلف اجزاء سامنے لائے گئے ہیں۔ فرمایا۔

وَاتَّقِ الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَالْإِنْسَانَ عَلَىٰ سَبِيلِ
وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ۔ (۲/۱۷۷)

جو شخص مال و دولت کی کشش کے باوجود اسے دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے۔ وہ ان کے رشتہ دار ہوں یا قرب و جوار میں بسنے والے دیگر افراد۔ یا ایسے لوگ جو معاشرہ میں تنہا یا لا دارث رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جاسے۔ یا ان میں کام کرنے کی صلاحیت یا استعداد باقی نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جو زاد سفر سے محروم رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کی کمائی ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ناکافی ہو۔ یا جو لوگ دوسروں کی غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں۔ انہیں آزادی دلانے کے لئے کشادگی راہ ان کی ہے جو اس قسم کے مقاصد کے لئے اپنی ذات و ضرورت دولت کو وقف کر دیں۔

ان اجزاء کا مفہوم تو واضح ہے لیکن چونکہ قرآن کریم انہیں البتہ کشادگی راہ کے بنیادی اور لازمی ارکان کی حیثیت سے بیان کیا ہے اس لئے ان کی تھوڑی سی مزید وضاحت غیر از محل نہ ہوگی۔ اس لئے بھی کہ آئندہ چل کر یہ اصطلاحات بار بار سامنے آئیں گی۔

ایتائے مال علیٰ حبسہ۔ یعنی مال و دولت کی کشش کے باوجود اسے دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دینا۔

۱۔ (فٹ نوٹ صفحہ ۱۵) یہ جو ہمارے ہاں ایمان کی تفصیل یوں بتائی جاتی ہے کہ "المنت بالله وملتہ شکہ وکتبہ ورسلم وبقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ والبعث بعد الموت۔ تو اس میں "ولقد خیرہ وشرہ"۔۔۔ کا اضافہ خارج از قرآن ہے اور مسئلہ تقدیر کو جو ایمان قرار دینے کی عجز و انکارش۔ تفصیل اس کی میری تصنیف۔ کتاب التقدير۔ میں ملے گی۔

ان احسن الذی تشریح | اسے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ۔ (۲۳) ”تم کامیابی (بر) سے ہمکنار ہونہیں سکتے جب تک تم اپنی پرکشش متاع کو (دوسروں کی ضروریات کے لئے) کھلا نہ رکھو“ انفاق فی سبیل اللہ کے متعلق جلد اول ص ۱۰۱ زیر آیت (۲۳)، شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے۔ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیا جائے۔ یہاں اتنا اضافہ کافی ہو گا کہ جب نظام اسلامی قائم ہو جائے تو پھر ہر شخص کی رائے اور ضرورت کھاتی اس نظام کی تحویل میں چلی جائے گی جو اسے ان مقاصد (یا ان جیسے دیگر مقاصد) کے لئے اجتماعی طور پر صرف کرے گا۔ لیکن جب وہ نظام ہنوز قائم نہ ہو تو انفاق انفرادی طور پر ہو گا۔ قرآن کریم میں انفرادی انفاق (جسے صدقہ اور خیرات کہہ لیجئے) سے متعلق احکام اس عبوری دور کے لئے ہیں جب وہ نظام زیر تشکیل ہو۔

انفاق کے لئے ابتداء ذوی القربی سے کی گئی ہے۔ اس کے عمومی معنی ہوں گے ”تنہا سے قرب و جوار میں بسنے والے ضرورت مند لوگ“ لیکن اصطلاحی طور پر القربی کے معنی ہوتے ہیں رشتہ داری۔ اس لئے ذوی القربی کے معنی ہوں گے رشتہ دار۔ قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ اصلاح کا آغاز ہر فرد کے قریبی دائرے سے کرتا ہے اور پھر اسے وسعت دے کر پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ اس نے انفرادی انفاق کے لئے بھی ابتدا اس سے کی کہ تم اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑاؤ اور ان میں جو صاحب احتیاج ہوں ان کی امداد کرو۔ اور پھر اس سلسلہ کو آگے بڑھائے جاؤ۔

یتامیٰ | ہمارے ہاں یتیم سے مراد صرف وہ بچے لئے جاتے ہیں جن کے ماں باپ مر جائیں۔ لیکن عربی زبان (اور قرآن کریم) میں یہ لفظ ان لوگوں کے لئے بھی آتا ہے جو معاشرے میں تنہا رہ جائیں۔ آپ غور کیجئے۔ قرآن کریم نے اس ایک لفظ سے کتنی وسیع حقیقت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اس کی تشریح جلد دوم ص ۳۹۷ آیت (۲۱۷) میں کی جا چکی ہے۔ اس نے، بھرے معاشرہ میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے والوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچ دیا کہ یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (۲۱۷) ”اس قدر قربا کی موجودگی میں یتیم“ بھری دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے والا! اُف! کس قدر حُزن انگیز ہے تنہائی کا یہ احساس! فانی کے الفاظ میں :-

عالم کی فضا پوچھو محروم تمہارا سے بیٹھا ہوا دنیا میں اٹھ جائے جو دنیا سے
لہذا کشادگی راہ اس پر کھلے گی جو ہر اس شخص کا ساتھی بن جائے جو اپنے آپ کو معاشرہ میں تنہا محسوس کرے۔

مساکین

ہمارے ہاں مسکین کا تصور عجیب و غریب قسم کا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مادہ (س۔ ک۔ ن) ہے جس کے معنی ہیں ساکن ہو جانا۔ حرکت کا باقی نہ رہنا، اس لئے انفرادی طور پر مسکین وہ شخص ہوگا جس کا چلتا ہوا کاروبار کسی وجہ سے رُک جائے یا جس میں کام کاج کرنے کی سکت نہ ہے اور یوں وہ محتاج ہو جائے اور اجتماعی طور پر مسکین وہ قوم ہوگی جس پر مسکنت کا عذاب طاری ہو جائے۔ یعنی جس میں قوتِ عمل نہ ہے۔ جس پر جمود و تعطل طاری ہو جائے۔ یہاں ان لوگوں کی مالی امداد کرنے کے لئے کہا گیا ہے جن کا کاروبار رُک جائے۔ یا جو محنت کرنے سے طبعی طور پر معذور ہو جائیں۔ (تفصیل اس کی جلد دوم صفحہ ۳۰۵ آیت (۱۱۰) میں گزر چکی ہے۔)

ابن السبیل

سبیل کے معنی راستہ ہیں اور ابن السبیل کے عمومی معنی مسافر کے لئے جاتے ہیں۔ لیکن عربوں کے ہاں یہ اصطلاح بالخصوص اس مسافر کے لئے استعمال کی جاتی تھی جس کا زادِ سفر ختم ہو جائے۔ اور اس طرح وہ اس ملک کے باشندوں کی مدد کا محتاج ہو جائے جس میں وہ سفر کر رہا ہو۔ آگے بڑھنے سے پیشتر اس حقیقت کو پیش نظر رکھئے کہ قرآن کریم نے جن لوگوں کی مالی امداد کی تاکید کی ہے ان میں مسلمان و غیر مسلم کی کوئی تمیز و تخصیص نہیں۔ مدد کا محتاج کوئی بھی ہو، اہل ایمان پر اس کی امداد ضروری ہو جاتی ہے۔ اگلی شق ہے :-

سائلین

ہمارے ہاں سائل (سوالی) سے مراد مانگنے والے ہوتے ہیں جنہیں فقیر بھی کہا جاتا ہے۔ عربی لغت میں لفظ سوال کے معنی احتیاج کے ہوتے ہیں۔ اس لئے سائل کے معنی ضرورت مند یا صاحبِ احتیاج کے ہیں۔ مسکین اور سائل میں یہ عمومی فرق سمجھے کہ مسکین تو وہ ہے جو کام کاج سے معذور ہو جائے لیکن سائل وہ ہے جو کام تو کرے لیکن اس کی کھائی اس کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہو۔

یہاں پھر اس کی وضاحت کر دی جائے کہ احتیاج کی یہ شکلیں غیر قرآنی نظام میں پیدا ہوں گی۔ قرآنی نظام میں ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری نظامِ معاشرہ پر ہوگی۔ تفصیل جلد اول صفحہ ۱۰۰۔ زیرِ آیت (۱۱۰) میں گزر چکی ہے۔ اگلی شق ہے :-

فی الرقاب

الرَّقَبَةُ گردن کو کہتے ہیں۔ اور رَقَبَہ کے معنی ہیں اس نے اس کی گردن میں رستی ڈال کر اسے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اس لئے فی الرقاب کے معنی ہیں غلام۔ ہمارے دور میں غلامی (SLAVERY) کی وہ شکل اب کم و بیش ختم ہو گئی ہے جسے عہدِ جاہلیت کی لعنت کہا جاتا تھا۔ لیکن اس نے اب جو مہذب شکل اختیار کی ہے (یعنی کسی قوم کی قوم کو اپنا محکوم بنا لینا) وہ اس سے بھی زیادہ اذیت رساں اور وجہِ تذلیلِ انسانیت ہے۔ اس لئے اب فی الرقاب میں وہ قومیں بھی آجائیں گی جن کی آزادی سلب کر لی گئی ہو اور

وہ اپنی آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہوں۔ ان کی مدد کرنا جماعتِ مومنین (اسلامی مملکت) کا فریضہ ہو گا۔ جہاں تک زمانہ نزولِ قرآن میں عربوں میں رائج غلامی کا تعلق ہے قرآنِ کریم نے اسے کس طرح ابدی طور پر ختم کر لیا اسکی بابت جلد اول ص ۲۴ آیت (۲) اور جلد دوم ص ۳۵۸ آیت (۵۸) میں لکھا جا چکا ہے۔ جو غلام اور لونڈیا **غیر رقبۃ** عربی معاشرے میں پہلے سے موجود تھے قرآنِ کریم نے ہر موقع پر انہیں آزاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے لئے اس نے تحریرِ رقبۃ کی اصطلاح استعمال کی ہے یعنی غلام اور محکوم کو آزاد کرنا (مثلاً) قتلِ خطار کے کفارہ کے طور پر تحریرِ رقبۃ (۳۴)۔ لغو قسموں کے توڑنے کا کفارہ تحریرِ رقبۃ (۵۹)۔ ظہار (بیبیوں کو ماں وغیرہ کہہ دینے کی لغویت) کا کفارہ تحریرِ رقبۃ (۵۸) اسی طرح قرآنِ کریم نے صدقات کے مصارف میں بھی فی الرقاب کو مستحق امداد قرار دیا ہے۔ سوچتے کہ جو قرآن قدم قدم پر غلاموں کو آزاد کرنے کی تاکید کرتا ہو، وہ دوسروں کو غلام بنا لینے کی اجازت دے گا؟ لیکن ان لوگوں کا کیا علاج جو آج بھی جنگ میں قید شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنا لینے کو شریعت کا حکم قرار دیتے ہیں؟ (دیکھیے جلد دوم ص ۳۵۶ آیت (۲)۔ یہ ہیں وہ امداد کے مستحق جن کی مالی امداد کو قرآنِ کریم نے بہتر کی راہ قرار دیا ہے۔ ان شقوں کا دیگر متعدد مقامات پر بھی ذکر آیا ہے۔ ان میں سے دو ایک مقامات کا یہاں ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سورة البلد میں ہے کہ ہم نے انسان کو حیوانات کے مقابلہ میں صاحبِ ارادہ کیا بنایا کہ اس نے سمجھ لیا کہ مجھے اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو گیا ہے میں جس طرح جی چاہے زندگی بسر کروں۔ مجھے کسی قاعدے اور قانون کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ وہ تن آسانی کی زندگی گزارنے اور مفاد پرستی کی آسان راہ اختیار کرنے کو پسند کرتا ہے۔ فَلَا تَحْتَمِلْ الْعُقْبَةَ (۹۰) اور بہت طلب اور صبر آزمائے راستہ اختیار نہیں کرنا چاہتا۔ اس راستے کے لئے العقبة **دین کی گھائی** کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں پہاڑ کی گھائی پر چڑھنا۔ یہ دین کی راہ کی بڑی جربز اور جامع تشبیہ ہے۔ پہاڑ پر ایک تو بھاگ کر نہیں چڑھا جاتا، قدم قدم، آہستہ آہستہ بتدریج چڑھا جاتا ہے۔ پھر اس میں سانس پھول جاتی ہے۔ تھکان بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ راستہ انسان کو بلند یوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یہی دین کی راہ ہے۔ اس کے بعد بھاگ دو مَا آذُرُكَ مَا الْعُقْبَةُ (۹۱) تو خود نہیں جان سکتا کہ العقبة کیا ہے۔ اسے تمہیں ہم بتاتے ہیں۔

اب دیکھتے کہ دین کی اس دشوار گزار، بہت طلب راہ کی تفصیل کیا ہے۔ فرمایا فَلْتَرَقِبْ (۹۱)۔ یہ کہ انسان صرف اپنی فکر نہ کرے۔ بلکہ یہ دیکھے کہ کوئی انسانی گردن کسی مستبد قوت کی غلامی اور محکومی کے شکنجے میں تو

نہیں جکڑی ہوتی۔ لہذا، کرنے کا پہلا کام یہ ہے کہ ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ اطاعت اور محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی اختیار کی جائے جس میں ہر انسان گردن اٹھا کر چلے جس میں ہر ایک کو حریت اور آزادی حاصل ہو۔

اس گھاٹی کا اگلا قدم کیا ہے۔ اَوْ اطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ - (۹۱)۔ جب اور جہاں مستبد قوتیں رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے کر کمزور انسانوں کے لئے بھوک اور داماندگی کو عام کر دیں۔ یعنی سامانِ زلیات ایک خاص طبقہ کے لئے مخصوص ہو جائے تو وہ نظام ان لوگوں کے رزق کا اہمیتام کرے جنہیں محتاج بنا دیا گیا ہو۔

تیسرا قدم یہ کہ جب اور جہاں ایسا باطل معاشرہ قائم ہو جس میں کمزور انسان ہزار ہا انسانوں کے درمیان بہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا اور بے یار و مددگار پائے۔ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ - (۹۲)۔ تو یہ نظام ان بے یار و مددگار انسانوں کا رشتیق و یار بنے اور انہیں تنہا محسوس نہ ہونے لے۔

اور چوتھا قدم۔ اَوْ مَسْكِينًا ذَا مَقْرَبَةٍ - (۹۳)۔ جس معاشرہ میں یہ حالت ہو کہ ایک معذور انسان بھی اپنی روٹی کمانے کے لئے دن بھر مٹی میں لتھڑا رہے۔ یعنی محنت کش طبقہ کی یہ حالت ہو، اس معاشرہ کو بدل کر ایسا نظام قائم کرے جس میں ہر فرد اپنی معاش کی طرف سے بے فکر ہو جائے۔ یہ ہے الْعَقَبَةُ کی تشریح۔ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے، یہ راستہ بڑا اہمیت طلب ہے اور تنہا نہیں کاٹا جاسکتا۔ یہ اجتماعی سفر ہوتا ہے۔ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَصَّوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ - (۹۴)۔ ایسا شخص اس کارواں میں شامل ہو جاتا ہے جس کے افراد خدا کے نظامِ ربوبیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو تاکید و تلقین کرتے رہتے ہیں کہ وہ اس راہ میں ثابت قدم رہیں اور خدا کے عطا کردہ سامانِ نشوونما میں دوسروں کو بھی شریک کریں۔ اُولَٰئِكَ الصَّالِبُ الْمُمْتَنَّةُ - (۹۵)۔ یہ ان لوگوں کا گروہ ہے جو صاحبِ یمن و سعادت ہیں جنہیں زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوں گی۔

سورہ الفجر میں ہے کہ انسان اگر وحی کی راہ نمائی کو چھوڑ دے تو وہ بڑا تکوّن مزاج اور عجلت پسند ہو جاتا ہے اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَاكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّيْ اَكْرَمَنِ - (۹۶)۔ جب ایسے شخص کو خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس کی اس سرفراہی میں کتنے اور عوامل شریک ہیں۔ اور یہ ان سب کی اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں کسی اور کا کیا عمل دخل ہے؟ یہ خدا کا فضل ہے جس سے اس نے مجھے نوازا ہے۔ یعنی اس کے لئے نہ کوئی قاعدہ مقرر ہے نہ قانون۔ وہ جسے چاہے، عزت اور آسائش

عطا کر دے۔ وَآمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّكَ أَهَٰنٌ - (۸۹)۔ لیکن جب اس کی زندگی دوسرا رخ بدلتی ہے اور اس پر رزق کی تنگی ہو جاتی ہے تو وہ چنچنے چلانے لگ جاتا ہے کہ خدا نے مجھے خواہ مخواہ ناحق بلا سبب ذلیل و خوار کر دیا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یہ تمہاری غلط نگہی ہے جو تم سمجھ رہے ہو کہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے یونہی بلا سبب اور بلا قاعدہ ہو جاتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ خدا نے تمہیں ناحق یونہی ذلیل کر دیا۔ ناحق ذلیل نہیں کر دیا۔

کَلَّا بَلْ لَّا تُكْرَمُونَ الْيَتِيمَ - (۹۰)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے معاشرہ ایسا قائم کر رکھا تھا جس میں عزت کا معیار دیانت و شرافت نہیں بلکہ جھوٹ اور پارٹی تھا جس کی پارٹی زیادہ قوت والی تھی اس کی عزت و توقیر ہوتی تھی۔ جو تنہا رہ جاتا تھا (یتیم)، اس کی کوئی عزت نہیں کرتا تھا۔ تکریم اور عزت کے معیار بدلنے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تم ذلیل و خوار ہو رہے ہو۔

یتامی کی عزت نہ کرنے کا نتیجہ

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ جھوٹ کی مضبوطی اور اکثریت کا معیار عزت و اقتدار ہونا عہد جاہلیت ہی کی روش نہیں۔ اس دور تہذیب و تمدن میں بھی حکومت و سطوت اور قوت اور عزت کا یہی معیار ہے۔ آج جمہوریت (ڈیموکریسی) کو ساری "مہذب" دنیا میں بہترین اور مستحکم انداز تمدن سمجھا جاتا ہے۔ جمہوریت اس کے سوا کیا ہے کہ جس پارٹی کو اکثریت حاصل ہو، زمام اقتدار اس کے ہاتھ میں آجائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قوت، جاہ و شہرت، عزت اور دولت سب زمام اقتدار کے ساتھ بندھے چلے آتے ہیں۔ جو ہر ذاتی اور سیرت و کردار کی پاکیزگی کو کوئی پوچھتا نہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، جمہوریت وہ نظام

جمہوریت کا بنیادی نقص

ہے جس میں :-

بندوں کو گنا کرتے ہیں تو لانا نہیں کرتے

دوسرے یہ کہ قرآن کریم نے اتنا ہی نہیں کہا کہ جو تنہا رہ جائے اس کی خبر گیری کیا کرو۔ کہا یہ ہے کہ جو تنہا رہ جائے اسے ذلیل مت سمجھو۔ اس کی عزت کرو۔ یعنی معیار تکریم، پارٹی یا جھوٹ یا قبیلہ یا خاندان قرار نہ دو۔ جو ہر ذاتی وجہ توقیر سمجھو۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُ - (۴۹)۔ سب سے زیادہ واجب التکریم وہ جس کا کردار سب سے بلند ہو۔ دوسری جگہ کہا (۹۳) آمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ - (۹۳) جو تنہا رہ جائے۔ اسے دھتکارا نہ کرو۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جائے گا کہ قرآنی نظام میں تنہا رہ جانے والوں کے محض روٹی کپڑا کا انتظام نہیں کیا جائے گا۔ انسان ہونے کی جہت سے ان کی عزت بھی کی جائے گی۔ بالفاظ دیگر انہیں اس معاشرہ میں رزق کریم حاصل ہوگا۔ — باعزت سامانِ زلیست۔

بتایا جا رہا تھا کہ خدا کسی قوم کو یونہی ذلیل و خوار نہیں کر دیتا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس قوم نے ایسا معاشرہ قائم کر رکھا تھا جس میں (۱) یتیم کی عزت نہیں ہوتی تھی اور (۲) لَا تَحْطُؤْنَ عَلَىٰ طَعَامِ الْيَسِيْرِيْنَ - (۹۹) جس کی چلتی گاڑی کسی حادثہ کی وجہ سے رُک جاتی تھی صاحب استطاعت لوگ نہ اس کی خود مدد کرتے تھے نہ دوسروں کو اس کے لئے آمادہ کرتے تھے۔ یہاں پھر اس نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنی نظام میں سائل و محتاج کے رزق ہی کا انتظام نہیں کیا جاتا، ان کی عزت اور خود داری پر بھی حرف نہیں آنے دیا جاتا۔ اس میں وَ أَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳)۔ سائل اور محتاج کو قابلِ نفرت نہیں سمجھا جاتا۔

(۰)

بات یہ چلی آرہی تھی کہ کامیابیوں کے راستے اس طرح کشادہ نہیں ہوتے کہ تم پرستش کی چند رسوم کو میکانیکی طور پر ادا کر لو اور سمجھ لو کہ ہم فریضہ خداوندی کی ادائیگی سے سبکدوش ہو گئے۔ کامیابیوں کے راستے ان پر دا ہوتے ہیں جو ہر صاحبِ احتیاج کی مدد کرتے اور محکموں اور غلاموں کی آزادی کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کے بعد کہا۔

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ (۱۰۰)

۲
۱۴۴

اور اس کے ساتھ وہ لوگ ہی ایسا نظام قائم کرتے ہیں جن میں تمام افراد معاشرہ احکام و قوانین خداوندی کا اتباع کرتے جاتیں۔ نظامِ صلوٰۃ کے متعلق جلد اول ص ۹۷-۹۸۔ زیر آیت (۱۰۰) تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ اس کے بعد کہا۔

وَالْآتَى الزَّكَاةَ (۱۰۱)

۲
۱۴۴

وہ ایتائے زکوٰۃ کرتے ہیں۔ اس کی تشریح جلد اول ص ۱۵۰۔ زیر آیت (۱۰۱) اور جلد دوم ص ۲۰۰ زیر آیت (۱۰۱) کی جا چکی ہے جہاں بتایا گیا ہے کہ نظامِ خداوندی کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام افرادِ انسانیہ کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے اور ان کی انسانی صلاحیتیں پروان چڑھتی جاتیں۔

یہاں ایک نکتہ اور بھی قابلِ غور ہے۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ کا مفہوم فقط اتنا رہ گیا ہے کہ جمع شدہ دولت کا ایک ضعیف سا حصہ سال کے بعد بطورِ خیرات دے دیا جائے۔ لیکن اس آیت میں کہا گیا ہے کہ کامیابیوں کی راہ ان پر کھلتی ہے جو اَتَى الْمَالَ دوسروں کی مدد کے لئے اپنا مال دیتے ہیں۔ اور اس کے بعد کہا۔ وَالْآتَى

الزَّكَاةَ جو زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اگر زکوٰۃ سے مراد مال دینا ہی ہوتا تو یہ بات **زکوٰۃ کی مزید تشریح** "اَتَى الْمَالَ" سے پوری ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد اَتَى الزَّكَاةَ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ، ایتائے مال سے کچھ الگ چیز ہے۔ یا یوں کہیے کہ فقط اَتَى الْمَالَ

سے ایتلے زکوٰۃ کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا۔ (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) ایتلے زکوٰۃ سے مراد ہے انسانی ذات یا صلاحیتوں کی نشوونما کا اہتمام کرنا۔ اس کے لئے روپیہ خرچ کرنے کی بھی ضرورت ہوگی لیکن یہ چیز اس مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہوگی۔ خود مقصد نہیں ہوگی۔

(۱)

اب آگے بڑھیے۔ کہا کہ کامیابیوں کی راہ اُن پر وا ہوگی۔

وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا (۲۴)

۲
۱۷۷

اس کے عام معنی یہ کیے جاتے ہیں کہ وہ لوگ جو اپنے وعدوں کو پورا کرتے ہیں۔ لیکن وعدہ اور عہد

میں ایک اہم فرق ہے۔ وعدہ تو ہر (PROMISE) کو کہتے ہیں۔ یہ عام طور پر انفرادی

ہوتا ہے۔ لیکن عہد کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کی مسلسل حفاظت اور خبر گیری کرنا۔ اسکی

ایفاء عہد

پیہم نگہداشت کرنا۔ اور (۲) ذمہ داری۔ لہذا، عہد کے معنی ہوں گے اپنی ذمہ داریوں کی پیہم نگہداشت کرنا۔ اس سے ایفاء عہد کا مفہوم سمجھ میں آجائے گا۔

سورہ المؤمنون میں، مومنوں کی چند ایک بنیادی خصوصیات کا ذکر ہے۔ ان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ۔ وَ

الَّذِينَ هُمْ لَا مَانِعِيَهُمْ وَهُمْ يَمْنَعُونَ۔ (۲۳)۔ وہ اپنی امانات اور عہد کی نگہداشت کرتے ہیں۔ اس

میں دو چیزیں امانات اور عہد الگ الگ آتی ہیں۔ اس میں ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔

جب سے انسان نے تمدنی زندگی شروع کی وہ ایک مثالی نظام حکومت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ اس

نے عقل کے تجرباتی طریق کی رو سے مختلف نظام وضع اور اختیار کئے اور جب وہ ناکام ثابت ہوئے تو ان کی جگہ

دوسرے نظام اپنائے۔ اس کی یہ سلسل ناکام کوششیں بالآخر اس نظام پر منتج ہوئیں جسے جمہوری نظام کہا جاتا ہے

اور جو آج کل ساری (مہذب) دنیا میں رائج ہے اور جسے فکر انسانی کا شاہکار سمجھا جاتا ہے جمہوری نظام کی بنیاد

نظریہ میثاق (THEORY OF SOCIAL CONTRACT) پر استوار ہے جس کا بانی روسو

(ROUSSEAU. 1712 - 1778 A.D) کو قرار دیا جاتا ہے: اگرچہ اس سے پہلے آریز اور لاک جیسے مفکرین

نے بھی اس کا تصور پیش کیا تھا۔ اس نظریہ کی رو سے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ مملکت اور افراد مملکت میں ایک میثاق

(معاہدہ) ہوتا ہے جس کی رو سے افراد اپنے ذمہ کچھ فرائض لے لیتے ہیں اور ان کے عوض

نظریہ میثاق

مملکت ان افراد کے حقوق ادا کرتی ہے لیکن اس نظریہ کا بنیادی سقم یہ ہے کہ اس میں افراد

اور مملکت کو دو الگ الگ فریق تصور کر لیا جاتا ہے۔ جبھی تو ان میں میثاق قرار پاتا ہے۔ میثاق ہمیشہ دو فریقوں کے مابین ہوتا ہے۔ لیکن مملکت یا حکومت تو افراد ہی پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے وہ افراد سے الگ، ایک فریق (فریق مقابل) کس طرح بن سکتی ہے؟

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، نظریہ میثاق کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس کا بانی روسو ہے لیکن جن کی نگاہیں تاریخ کے وسیع افق پر ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ نظریہ روسو سے صدیوں پہلے قرآن مجید نے پیش کیا تھا اور وہ اس قسم سے منزہ تھا جو روسو کے نظریہ میں پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے نظام مملکت کے بنیادی تصور کے متعلق کہا ہے کہ۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآثَارِهِمُ الْجَنَّةَ (۹)۔ اللہ مومنین سے ان کی جان اور مال خرید لیتا ہے اور ان کے عوض انہیں جنت عطا کر دیتا ہے؟ یہ ہے وہ میثاق جو خدا اور مومنین کے مابین طے پاتا ہے۔ اس کی رو سے خدا اور مومنین دو الگ الگ فریقوں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں ایک فریق (مومنین) کچھ فرائض (OBLIGATIONS) اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ یعنی عند الطلب

مال اور جان حاضر کر دینا۔ اور دوسرا فریق (خدا) انہیں کچھ حقوق (RIGHTS) عطا کر دیتا ہے۔ یعنی الجنۃ۔ آیت (۲۳) میں مومنین کے ان فرائض کو "امانات" کہہ کر

پکارا گیا ہے۔ یعنی وہ فرائض جن کی ادائیگی کے بعد ان افراد کو ہر طرح کے امن کی ضمانت مل جاتی ہے۔ اسے قرآن کریم میں الجنۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اَدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا تَخْوَفُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ..... (۹)۔ تم جنت میں داخل ہو جاؤ جس میں تمہیں نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن؟ (اس کی تشریح جلد دوم ص ۱۳۳۔ آیت (۲۳) میں کی جا چکی ہے) آپ نے دیکھا کہ اس نظریہ میثاق میں دو فریق موجود ہیں جن میں ایک کے ذمے امانات ہوتی ہیں (یعنی فریق مقابل کے سپرد کچھ کر دینا) اور دوسرے کے ذمہ عہدہ (یعنی اس کے بدلے میں کچھ ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لینا)۔ فریق اول (خدا) فریق ثانی (مومنین) کو اس امر کا یقین دلاتا ہے کہ اس کی طرف سے اس عہد کی خلاف ورزی کبھی نہیں ہوگی۔ فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَكُمْ (۲۳)۔ لیکن اس عہد کے پورا کرنے کی ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ فریق مقابل بھی اپنے عہد (ذمہ داریوں) کو پورا کرے۔ فرمایا۔ اَوْفُوا بِعَهْدِي أُؤْفَ بِعَهْدِكُمْ۔ (۲۳) تم اپنا عہد پورا کرو، میں اپنا عہد پورا کروں گا۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہو گا کہ خدا تو ایک بسیط حقیقت (ABSTRACT REALITY) ہے۔

وہ اس میثاق میں عملاً فریق کس طرح بن سکے گا؟ یہ تو محض ذہنی نظریہ یا عقائد کا میثاق ہو گا جو محسوس شکل (CONCRETE FORM) میں استوار نہیں ہو سکے گا۔ لیکن اللہ نے خود ہی یہ واضح کر دیا کہ یہ محض نظری میثاق نہیں ہو گا۔ عملی

اور محسوس میثاق ہوگا۔ اور وہ اس طرح کہ نظامِ خداوندی کا سربراہ (یا اربابِ حل و عقد) جو خدا کی جانب سے (ON BEHALF OF ALLAH) یہ عہد کرے گا، وہ اس کے پورا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ سورۃ الفتح میں ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ، يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۔ (۲/۱۷۷) اے رسول! (آیت ۹ میں بیان کردہ میثاق کی رو سے) جو مومن اپنی جان اور مال کو تیرے ہاتھ فروخت کرتے ہیں وہ درحقیقت انہیں خدا کے ہاتھ بیچ رہے ہوتے ہیں۔ اس معاہدہ کی توثیق کے لئے ان کے ہاتھ پر تیرا ہاتھ نہیں ہوتا درحقیقت خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو سربراہ نظامِ خداوندی، خدا کی جانب سے یہ معاہدہ کرتا ہے وہ ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا عہد کرتا ہے جو انسانوں کے سلسلہ میں خدا نے اپنے اوپر رکھی ہیں۔ (تفصیل ان امور کی جلد اول ص ۱۱۱ آیت (۲) میں گزر چکی ہے)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ آیت (۲) میں جو کہا گیا ہے کہ وَالْمُؤْمِنُونَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا اٰلَهُمْ اَوْ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ جو ذمہ داریاں اپنے سر پر لیتے ہیں انہیں پورا کرنے ہیں۔ یہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جو ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔ اس نظام میں اسلامی حکومت اس طرح قائم ہوتی ہے۔ اس میں ذمہ دار ارکان سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے عہد کو پورا کرو اور دیگر افراد مملکت سے تاکید کی جاتی ہے کہ تم اپنی امانت میں خیانت نہ کرو۔ (۲/۱۷۷)۔

(۱)

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، بنیات اور کتاب (دلائل اور قوانین و احکام) کے بعد اگلا مرحلہ شمشیر کا آلت ہے۔ یعنی مفاد پرست گروہ اس نظام کی مخالفت میں میدانِ جنگ تک میں اتر آئیں گے اور اس نظام کے حامیوں پر یہ فریضہ عائد ہو جائے گا کہ وہ ان کی مدافعت بذریعہ شمشیر کریں۔ یہ مرحلہ بڑا جانگداز اور مشقت طلب ہوگا۔ اس لئے کشادگی راہ طلب کرنے والوں کی اگلی خصوصیت یہ بتائی :-

وَالصَّبْرُ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۔ (۲/۱۷۷)

یہ وہ لوگ ہیں جو مصائب و مشکلات کا مقابلہ نہایت استقامت سے کرتے ہیں اور تراحم و تقاضا

کے وقت جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میدانِ جنگ میں

الْبَأْسُ سُبْحَتُ مَصِيبَتِ، بالخصوص میدانِ جنگ میں پیش آنے والی مشکلات کو کہتے ہیں۔ اربابِ لغت نے کہا ہے کہ الْبَأْسُ مال و دولت کے نقصان کو کہتے ہیں اور الضَّرَّاءُ جسمانی نقصان کو۔

ان تصادمات میں مصائب اور نقصانات کی تفصیل آیت (۲۴۶) میں سامنے آچکی ہے۔ یہاں بھی اسی قسم کے مصائب اور ضیاع و زیاں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہاں بھی بَشِيرِ الصَّبْرِینَ کہا گیا تھا، یعنی خوشگوار لیوں کی نوید جانفزا ہے ان کے لئے جو ایسے صبر آزما مراحل میں ثبات و استقامت کا ثبوت دیتے اور اس طرح خدا کی تبریکِ تہنیت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ (۲۴۷)۔ یہاں کہا کہ :-

أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (۲۴۸)

۲
۱۷۷

یہ ہیں وہ جو اپنے دعوتی ایمان کو سچ کر دکھاتے ہیں اور انہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو متقی کہہ کر پکاریں۔ یعنی یہ کہیں کہ وہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوئے راہِ حیات میں آنے والے خطرات سے محفوظ رہتے ہیں۔

آپ "أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا" پر غور کیجئے اور جھوم جھوم جالیئے۔ بات یوں شروع کی گئی تھی کہ کثاد کی راہ یہ نہیں کہ تم احکامِ خداوندی کے طواہر کی کس قدر پابندی کرتے ہو۔ طواہر (رسوم و مناسک) کی ادائیگی تو نہایت آسانی سے ہو سکتی ہے۔ ان کی ادائیگی دعوتی ایمان کا ثبوت نہیں۔ اس کا ثبوت وہ لوگ پیش کرتے ہیں جو دین کے مقاصد کے حصول کے لئے اپنی جان اور مال کو قربان کر دیتے ہیں۔ انہی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مومن اور متقی کہیں۔ یہ ہے دین اور مذہب میں فرق !

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذال اور مجاہد کی اذال اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فصاحت
کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور (اقبال)

مذہب میں ساری نیکیاں "منہ طرف قبلہ شریف" میں سمٹ آتی ہیں اور مذہبی پیشوائیت کا جہادِ عظیم نمازیوں کا رُخ سیدھا کرنا قرار پا جاتا ہے۔ ان نمازیوں کا جن میں سے (امام سمیت) ہر ایک کا قبلہ مقصود الگ الگ ہوتا ہے۔ یہ وہ "باجامعت نماز" ہوتی ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا تھا کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّى (۲۴۹) تم خیال کرو گے کہ یہ سب ایک جماعت ہیں۔ یہ ایک جماعت نہیں۔ ان کے صرف جسم ایک قطار میں نظر آتے ہیں، دل ان کے ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔

خدا کا اعلان ہے کہ اس قسم کی طواہر پرستی (كَيْسَ الْبِرِّ) کوئی نیکی نہیں۔ لیکن جنت کی اجارہ دار مذہبی پیشوائیت پکار پکار کر کہتی ہے کہ یہی اصل نیکی ہے۔ تم (معاذ اللہ) خدا کی باتوں پر نہ جاؤ۔ تم وہی کیے جاؤ جو ہم کہتے ہیں۔ ہم تمہیں جنت میں داخل ہونے کا سٹریٹ لکٹ دے دیں گے !

بنیات کے بعد اب کتاب کی طرف آئیے۔ لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے ایک تہذیب ضروری ہے۔
 پیچھے سے بات ذرائع اور مقاصد کی چلی آرہی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ اگر ذرائع کو مقصد سمجھ لیا جائے تو ایسے لوگوں
 کی سعی و عمل کی کھیتیاں کبھی پروان نہیں چڑھ سکتیں۔ ان کی ساری محنت اکارت جاتی ہے۔ اس سے ذہن میں یہ
 خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ ذرائع بیکار ہیں۔ ان کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں۔ اور جب اس خیال کو تقویت پہنچانے، بلکہ
 مقدس بنانے کے لئے تصوف آگے بڑھے، تو ذرائع (مادی اسباب) سے نفرت برتنا اور انہیں ترک کر دینا،
 دین کا انتشار و مقصود قرار پا جاتا ہے۔ قرآن کریم طبری پر حکمت کتاب ہے۔ اور اس قسم کے وساوس پہلے سے اس کے
 پیش نظر ہوتے ہیں۔ وَ نَحْنُ مَا تَوَسَّوْا بِهِ خَفْسَهُ (۱۶۶)۔ خدا کا ارشاد ہے۔ (یعنی ہم انسان کے دل میں
 پیدا ہونے والے وساوس کو بھی جانتے ہیں)۔ چنانچہ وہ ایسے مواقع پر اس قسم کے وساوس کے ازالہ کا ساتھ ہی انتظام
 کر دیتا ہے۔ سابقہ آیات میں یہ کہا گیا تھا کہ حق کی مدافعت میں مصائب و مشکلات کا استقامت سے مقابلہ کرنے
 والے سچے مومن ہیں۔ اور اگر وہ اس مقابلہ میں جان دے دیں تو وہ حیات جاوید کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اس سے
 یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم کے نزدیک انسانی جان کی چنداں اہمیت یا قدر و قیمت نہیں۔ اگلی آیت میں جو
 اب ہمارے زیرِ نظر آئے گی، اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔

ہم نے ذریعہ اور مقصد کے تعلق کو سمجھانے کے لئے ریلوے ٹکٹ اور منزل مقصود تک پہنچنے کی مثال دی تھی۔
 اس سلسلہ میں ایک اور مثال لیجئے۔ آپ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے گھوڑے پر سفر کرتے
 ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں مقصد منزل تک پہنچنا ہے اور گھوڑا اس مقصد کے حصول کا ذریعہ۔
 تصوف نے کہا کہ گھوڑا بے کار شے ہے بلکہ حصول مقصد کے راستے میں رکاوٹ۔ اس لئے اسے ہلاک کر دینا چاہیے۔
 ترک دنیا اور نفس کشی کا یہی مفہوم ہے۔ سیکور تصوف نے کہا کہ گھوڑا ہی مقصد حیات ہے۔ ساری توجہ اس پر مرکوز
 کر دینی چاہیے۔ یعنی زندگی اسی دنیا کی زندگی، اور اس کا مقصد انسانی جسم کی آسائش و زیبائش ہے۔ قرآن کریم نے
 ان دونوں نظریات کی تردید کی اور کہا کہ گھوڑا اگرچہ منزل مقصود نہیں لیکن منزل تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ اسی لئے
 اس کی نگہ پر داخت، پرورش اور حفاظت بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم کی رو سے موجودہ زندگی میں انسان کا مقصد
 اس کی ذات کی نشو و نما ہے۔ لیکن یہ نشو و نما (زندگی کی موجودہ سطح پر) مادی اسباب و علائن اور انسانی جسم و جان کے
 ارتباط ہی سے ممکن ہے۔ اس لئے تسخیرِ مادہ اور جسم و جان کی پرورش و حفاظت بھی نہایت ضروری ہے۔ انسان
 کی طبعی زندگی اور اس کی ذات کا باہمی تعلق کیا ہے، اس کے متعلق جلد اول ص ۱۱۱-۱۱۲ آیت (۱۶۶) و صفحہ ۱۶۲،

مادی اسباب کی اہمیت

آیت (۲/۲۰۶) صفحہ ۲۰۶ آیت (۲/۲۰۶) صفحہ ۲۵۰ آیت (۲/۲۰۶) - نیز جلد دوم باب اول میں نفس کے عنوان میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے اور دنیا اور آخرت

کے باہمی تعلق کے متعلق جلد اول صفحہ ۲۵۳ آیت (۲/۲۰۶) کے تحت - یہاں پیش نظریہ نکلتا ہے کہ قرآن کریم انسان کی طبعی زندگی کو مقصود بالذات تو قرار نہیں دیتا لیکن وہ اس کی حفاظت کو ضروری ٹھہراتا ہے۔ اس کے نزدیک اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کس قدر ہے اس کا اندازہ اس ایک آیت سے لگائیے جس میں اس نے کہا ہے کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا۔ (۲/۲۰۹) جس نے کسی ایک جان کو بھی ہلاک کر دیا، بجز اس کے کہ وہ جرم قتل یا فساد برپا کرنے کے جرم کی سزا کے طور پر ہو۔ تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوعِ انسانی کو ہلاک کر دیا۔ اور جس نے کسی ایک جان کو بھی تلف ہونے سے بچایا، یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کو زندگی عطا کر دی۔ ”دوسری جگہ ہے: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِنَاحٍ۔ (۲/۲۰۹)۔

انسانی جان کی قدر و قیمت

”انسانی جان کو خدا نے قابلِ احترام قرار دیا ہے (اس کا ناحق ضائع کرنا، حرام قرار دیا ہے) اس لئے کسی کو ناحق قتل مت کرو (ناحق کے معنی ہیں خلافِ قانونِ خداوندی)۔ انسانی جان کی حفاظت اور قتل و جہاںم کی روک تھام کے سلسلہ میں کہا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ
الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ فَمَنْ
عَفَىٰ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتَّبِعْ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَّاءُ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ
ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ
عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ (۲/۱۷۸)

اسے جماعتِ مؤمنین! تم پر قصاص لازم قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس کے بغیر کسی کی جان محفوظ نہیں رہ سکتی ہے۔ لہذا یہ نہایت ضروری ہے کہ جرم قتل کے مرتکب کو معاشرہ کی طرف سے سزائے سزا کے سلسلہ میں عدل اور مساوت کے بنیادی اصولوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ یعنی اس میں جھوٹے اور بڑے، آزاد اور غلام، مرد اور عورت کی کوئی تمیز نہیں ہوگی۔ سوال مقتول یا قاتل کی پوزیشن کا نہیں۔ اصل سوال تقاضائے عدل کا ہے جس کی رُو سے ہر انسان کی جان یکساں واجبِ احترام اور قیمتی ہے۔

قصاص کا حکم

(مثلاً) قاتل اگر آزاد مرد ہے تو وہی آزاد مرد سزا پائے گا۔ اگر قاتل غلام ہے تو اسی غلام کو سزا دی جائے گی۔ اگر وہ عورت ہے تو اس کا عورت ہونا اسے سزا سے نہیں بچا سکے گا۔ اسے بھی

سزا بھگتنی پڑے گی۔ جرم قتل کی دو صورتیں ہیں۔ قتل عمد (بالارادہ) اور قتل سہو (نادانستہ۔ بلا ارادہ) اول الذکر کی صورت میں جرم کی سزا موت ہے یا جرم کی نوعیت کے لحاظ سے موت سے کم کوئی سزا (۹۳-۹۴)۔ خون بہا لے کر اسے چھوڑ نہیں دیا جائے گا۔ لیکن اگر قتل عمد نہیں کیا۔ یونہی سہو ہو گیا ہے، تو اس صورت میں (۹۶) کے مطابق دیت۔ خون بہا۔ ادا کرنا ہوگا۔ اس دیت کی رقم سے اگر مقتول کا وارث برضا و رغبت کچھ چھوڑنا چاہے تو اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے (۹۷)۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ جو کچھ ملے ہو جائے مجرم اس کی پابندی کرے اور حُسن کارا انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ قتل سہو کے لئے دیت مقرر کرنے میں تمہارے رب کی طرف سے قانون میں رعایت رکھ دی گئی ہے تاکہ اس سے تمہاری صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے مواقع حاصل ہو سکیں۔ لیکن چونکہ اس طرح معاملہ ملے ہو جانے کے بعد زیادتی کرے تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔

اس آیت میں پہلا لفظ کُتِبَ ہے۔ لفظ کتاب کے متعلق جلد اول ص ۱۷۸ آیت (۲/۱۷۸) میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی ضابطہ احکام و قوانین کے ہیں۔ اس آیت میں لفظ کُتِبَ سے یہ مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے معنی ہیں ”تم پر لازم قرار دیا گیا ہے، تمہیں اس کا حکم دیا جاتا ہے، تمہارے لئے یہ قانون مقرر کیا جاتا ہے“ قرآن کریم میں دیگر مقامات پر بھی احکام کے سلسلہ میں یہ لفظ آیا ہے۔

کُتِبَ کے معنی

اس میں دوسرا غور طلب لفظ قصاص ہے۔ عام طور پر اس کے معنی سزا کئے جاتے ہیں لیکن اس کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ اس مادہ (ق. ص. ص) کے معنی ہیں۔ کسی کا پیچھا کرنا۔ کسی کا تعاقب کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت کا فرض یہ ہے کہ کوئی جرم (UNTRACED) نہ رہ جائے، کوئی مجرم قانون کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ ملزم کا تعاقب کیا جائے تا آنکہ وہ گرفتار ہو جائے۔ اس کے بعد اس پر مقدمہ چلے گا۔ اس کا فیصلہ قانون کے مطابق ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ عدالت میں ملزم، مجرم نہ ثابت ہو، اس لئے اسے کوئی سزا نہ ملے۔ لیکن اس سے قصاص کا فرض ادا ہو جائے گا۔

اس حکم کی رو سے قصاص کو اَلَّذِينَ اَمَنُوا کا فرض قرار دیا گیا ہے۔ یعنی اسلامی معاشرہ کا فرض یہ۔ لہذا، اس میں جرائم کا بدلہ لینے کو متعلقہ افراد پر نہیں چھوڑا گیا۔ اسے معاشرہ کا فرض قرار دیا گیا ہے جس معاشرہ میں قانون کی حکمرانی (RULE OF LAW) ہو، اس میں جرم اور اس کے مواخذہ کی یہی صورت ہونی چاہیے۔ اس میں

جرم، متعلقہ افراد کے خلاف نہیں ہوتا، خود حکومت کے خلاف ہوتا ہے۔ اس میں مستغیث افراد نہیں ہوتے خود حکومت ہوتی ہے۔ عصر حاضر کی اصطلاح میں اسے (CROWN ... VS ...) کہا جائے گا۔ لہذا، آیت کے اتنے طعنے کے معنی یہ ہوتے کہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرم قتل کے مرتکب کا پیچھا کرے۔ اسے سزا دے۔

اس سے آگے ہے۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأَنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ۔ اس حصہ کا تعلق بھی سزا سے نہیں بلکہ اس میں اس اہم اصول کو بیان کیا گیا ہے کہ اس باب میں مجرم اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے۔ مجرم خواہ کتنا ہی بڑا اور مقتول کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، عدل کے معاملہ میں دونوں کو یکساں سمجھا جائے، اس لئے کہ ہر انسانی زندگی (وہ مرد آزاد کی ہو یا غلام کی، عورت کی ہو یا مرد کی) یکساں قیمتی ہے۔

خونِ شہ زنگیں تراز مزدورِ مسیت

اسے پھر دہرا دینا ضروری ہے کہ آیت کے اس حصے میں اسلام کا اصول مساوات بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اس سے یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی مرد آزاد (حُر) قتل کر دیا گیا ہے تو اس کے بدلے کسی مرد آزاد (حُر) کو قتل کیا جائے، خواہ قاتل کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر مقتول غلام ہے تو کسی غلام کو پھانسی چڑھایا جائے، خواہ قاتل مرد آزاد ہی کیوں نہ ہو۔ یہ مفہوم بالبداهت غلط ہے۔ قرآن کریم نے یہاں عام اصول مساوات پر زور دیا ہے اور اس کے لئے اصولِ انداز بیان اختیار کیا ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ سزا کے معاملہ میں قاتل اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی خیال نہ کیا جائے۔

اس کے بعد ہے فَمَنْ عَفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتَّبِعْ بِهِ الْمَعْرُوفَ وَأَدَّاعِرَ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِّنْ ذَّنْبِكُمْ وَرَحْمَةٌ مِّنْ رَبِّكَمُ۔ جس شخص کو اپنے بھائی کی طرف سے معافی دے دی جائے تو اسے چاہیے کہ قاعدے کے مطابق اس کی پیروی کرے اور حسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ یہ تمھارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ ظاہر ہے کہ سزا کا اس میں بھی ذکر نہیں سزا میں سے کچھ معاف کر دینے کا ذکر ہے۔ ”کچھ معاف کر دینا“ (شئی) اس کی دلالت کرتا ہے کہ اس کا تعلق سزائے موت سے نہیں، اس لئے کہ سزائے موت میں سے ”کچھ معاف کر دینے“ (اور کچھ باقی رہنے دینے) کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ”کچھ معاف کر دینے“ کی شکل اُسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ سزا، مال (جرمانہ) کی ہو۔ اسے دیت یا خون بہا کہا جاتا ہے۔

یہ ہے وہ القصاص جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ :-

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّٰۤاُولِيَ الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ

تَتَّقُوْنَ۔ (۲/۱۷۹)

۲
۱۷۹

اے ارباب عقل و بصیرت اگر تم غور سے دیکھو گے تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ القصاص کے نظام عدل میں

تمہاری قوم کی اجتماعی حیات کا راز پوشیدہ ہے۔ اس سے تم خطرات سے محفوظ رہ سکتے ہو۔

قرآن کریم مناسب تعلیم و تربیت سے قلوب و اذیان میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس سے افراد معاشرہ خود بخود قانون کی خلاف ورزی (ارتکاب جرم) سے محترز رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایسے افراد بھی ہو سکتے ہیں جن کے قلب و دماغ میں اس قسم کی تبدیلی نہ پیدا ہوتی ہو اور وہ جرائم کے مرتکب ہوں۔ ان کی اصلاح اور معاشرہ کو ان خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے سزا ناگزیر ہو جاتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر قرآن کریم کی روشنی میں مختصر الفاظ میں جرم اور سزا کا فلسفہ سامنے لایا جائے۔

قرآن کریم میں دو قسم کے احکام ملیں گے۔ ایک اخلاقی اور دوسرے تعزیری۔ تعزیری سے مراد ہیں ایسے احکام

جسے سوسائٹی کا جرم قرار دیا جائے اور اخلاقی احکام سے ایسے احکام مراد ہیں جن کی

جرم و سزا کا فلسفہ | خلاف ورزی معاشرتی جرم قرار نہ پائے مثلاً، لَا تَمْسُ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا۔ (۲/۱۷۹)۔

(زمین میں اکڑ کر نہ چلو) قرآن کا حکم ہے۔ لیکن یہ ایسا حکم نہیں جس کی خلاف ورزی معاشرہ کا جرم قرار دیا جائے۔ اسی سورت میں دوسرا حکم ہے۔ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی۔ (۲/۱۷۹)۔ زنا کے قریب مت جاؤ۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کی خلاف ورزی معاشرتی جرم ہوگی۔ واضح ہے کہ احکام کی اخلاقی اور تعزیری تقسیم، محض زیر نظر سوال کے سمجھنے کے لئے کی گئی ہے ورنہ قرآن کریم کے ہر حکم کی بنیاد اصلاح اخلاق پر ہے۔ اور اخلاق سے مراد ہے انسانی ذات کی نشوونما کے ذرائع۔

تعزیری احکام بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کی سزا بھی قرآن نے خود ہی تجویز کر دی ہے (مثلاً، زنا) اور دوسرے وہ جن کی سزا اس نے خود تجویز نہیں کی بلکہ اسے اسلامی نظام پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ حالات کے مطابق ان کی سزا خود متعین کرے۔ مثلاً، اس نے الخمر (عرف عام میں شراب) کے استعمال سے منع کیا ہے لیکن اس حکم کی خلاف ورزی کی سزا مقرر نہیں کی۔

یہ مسئلہ بڑا غور طلب ہے کہ قرآن کریم نے جن احکام کی سزا خود مقرر نہیں کی، ان میں سے کون کون سے ایسے ہیں

جنہیں تعزیری احکام کی فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب کوئی ایک فرد نہیں دے سکتا۔ نہ ہی کسی فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی حکم کی خلاف ورزی کو معاشرتی جرم قرار دے کر اسے مستوجب سزا ٹھہرائے۔ یہ فیصلہ اسلامی نظام کے کرنے کا ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ جو فیصلے اسلامی نظام کرے گا ان میں وقتاً فوقتاً بد تقاضائے حکمت، تبدیلیاں کی جاسکیں گی۔ احکام ہی نہیں، قرآن کریم نے جن امور کو بطور اصول بیان کیا ہے، یا جو حدود مقرر کی ہیں، ان کی خلاف ورزی کی مخصوص شکلوں کو جرم قرار دینا بھی اسلامی نظام کا فریضہ ہے۔ حدود سے مراد ہے اعمال کا وہ دائرہ جس کے اندر رہنے کی آزادی ہے۔ لیکن جس سے تجاوز کرنا منع ہے۔ حدود اور اصول ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

اسلامی نظام کا فریضہ ہے کہ وہ معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کرے جس میں ہر فرد اپنے بنیادی حق، اپنی ہر متاع زیست کو اس طرح محفوظ سمجھے کہ اسے اس باب میں ذرا سا تردد، فکر یا تشویش لاحق نہ ہو۔ اسے اس کے متعلق پورا پورا اطمینان اور یقین حاصل ہو۔ قرآنی نظام کا لازمی نتیجہ اس قسم کی فضا کا وجود میں لانا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نظام میں افراد معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (یہ)۔ اس میں انہیں نہ خوف ہو گا نہ حزن۔ وہ اس فضا کو قرآنی اقدار کے مطابق تعلیم و تربیت، اور افراد معاشرہ کو بنیادی ضروریات زندگی کی طرف سے بے فکر کر دینے سے پیدا کرتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود معاشرہ میں بعض افراد ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو "نفسیاتی مریض" ہوں اور ان کا "پاگل پن" افراد معاشرہ سے امن و اطمینان کا احساس چھین لے۔ ایسے مریضوں کا علاج ضروری ہے اور جب تک وہ پورے طور پر شفا یاب نہ ہوں افراد معاشرہ کو ان کے جنون کے پیدا کردہ خطرات سے محفوظ رکھنا از بس لازمی۔ یہ علاج اکثر و بیشتر ان مریضوں (مجرموں) کی قلبی اور ذہنی اصلاح سے ہو جاتا ہے لیکن بعض اوقات اس کے لئے بطور آخری اقدام تھوہین ترہیب کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ کئی نفسیاتی امراض ایسے ہیں جن کا علاج خوف کی احساس دہی سے کیا جاتا ہے۔ اس طریق علاج کو سزا کہا جائے گا۔ اس سے مقصد اولاً، ممکن العمل حد تک خود اس مجرم کی اصلاح ہوتی ہے اور ثانیاً ان کی اصلاح جن کے تحت الشعور میں ارتکاب جرم کے جراثیم پرورش پا رہے ہوں۔ سزا بطور انتقام کا تصور غیر قرآنی ہے۔

یہ تو رہ سزا کا ایک مقصد۔ اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ مجرم نے جس شخص کو نقصان پہنچایا ہے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے۔ مثلاً ایک شخص نے کسی کے ہاں چوری کی ہے۔ اگر عدالت نے اس مجرم کو دس سال قید کی بھی سزا دے

دی تو اس سے اس مظلوم کے نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اس شخص کا نقصان پورا کیا جائے۔ اگر مال سرور قہ برآمد ہو گیا ہے تو اُسے واپس دلایا جائے۔ اگر وہ برآمد نہیں ہوا تو مملکت اُسے خود مہیا کرے یا اس کی قیمت ادا کرے۔ قرآنی تصور ”جرم و سزا“ کی رُو سے مستغنیٰ مجرم کے خلاف مدعی نہیں ہوتا۔ وہ نظام معاشرہ (حکومت) کے خلاف مدعی ہوتا ہے۔ مملکت نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی ہر متاع کی حفاظت کریگی۔ اگر اس متاع پر کسی نے ہاتھ ڈال دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نظام مملکت نے اس شخص سے وعدہ خلافی کی ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک ”مجرم“ نظام مملکت ہے نہ کہ وہ خاص فرد جس نے از نکاب جرم کیا ہے۔ یہ نظام مملکت کے دیکھنے کی چیز ہے کہ وہ اس نقصان کو مجرم سے پورا کرانا ہے یا خود پورا کرنا ہے۔ مظلوموں کو اس سے واسطہ نہیں۔ نظام مملکت کا فرضیہ مظلوم یا اس کے وارثوں کا پشت پناہ بننا اور ان کی مدد کرنا ہے۔ فَقَدْ جَعَلْنَا لِيُؤْتِيَهُ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفُ فِي الْقَتْلِ اِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا۔ (پہلا)۔ اگر نظام معاشرہ مظلوم کے نقصان کی تلافی نہیں کرتا تو وہ اس کا پشت پناہ کیسے بن سکتا ہے، اور حامی و ناصر ہونے کا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ہر نقصان کی تلافی روپے سے نہیں ہو سکتی۔ لیکن نظام مملکت کو بہر حال اس کی تلافی کی شکل پیدا کرنی ہوگی، بشرطیکہ وہ نقصان اس شخص کی غفلت یا تساہل کی وجہ سے نہ ہوا ہو۔ اس کی تلافی بھی کرنی ہوگی اور اس کے ساتھ اس کا انتظام بھی کہ آئندہ معاشرہ میں ایسا نہ ہو۔

اوپر کہا گیا ہے کہ تعزیری سزائوں سے مقصود یہ ہے کہ ارتکاب جرم کے نفسیاتی مریضوں کا علاج ہو جائے۔ نفسیاتی علاج کی کامیابی کی اولین شرط یہ ہے کہ مریض کو مرض کا احساس ہو جائے۔ یعنی مجرم دل سے اعتراف کرے کہ اس نے غلطی کی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر مجرم کے دل میں فی الواقعہ یہ احساسِ ندامت بیدار ہو جائے تو اس کی اصلاح کی امید ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ ”سزا دینے“ کے بجائے معاف کر دیتا ہے اور پھر اس پر نگاہ رکھتا ہے کہ وہ شخص اپنی اصلاح کرے اور ایسا کرنے میں معاشرہ اس کی ہر ممکن مدد کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سزا سے پہلے عفو (درگزر کر کے اصلاح کرنے) کی گنجائش رکھی ہے۔ وہ ”سزا“ اس صورت میں تجویز کرتا ہے جب مجرم میں اس کے سوا اصلاح کا امکان نہ ہو۔

قرآن کریم ”بدنی سزائیں“ (CORPORAL PUNISHMENT) تجویز کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ چور کو جیل خانے بھیج دے جہاں اسے ردی ٹکڑا ملتا ہے اور اس کے بیوی بچے بھوکے مرجاتیں۔ یعنی جرم وہ کرے اور سزا یہ بے گناہ سبکتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خوف جس سے عادی مجرموں کی اصلاح کا امکان ہو سکتا ہے۔

باجس سے امکانی مجرموں کو ارتکاب جرم سے باز رکھا جاسکتا ہے، بدنی سزا ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔

اب ان اصولوں کو دیکھتے جنہیں قرآن کریم اس باب میں بنیادی قرار دیتا ہے۔

(۱) قصاص۔ اس کے معنی جرم کی سزا دینا نہیں۔ اس کے معنی ہیں مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ وہ بلا گرفت نہ

رہ جائے۔ یعنی قرآنی نظام میں کسی مجرم کو (UNTRACED) نہیں رہنا چاہیے۔ وہ اس قسم کے محکم نظام تفتیش میں حیات اجتماعی کا راز بتاتا ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَا اُولٰٓئِیَ الْمَلٰٓئِیَہِ (۲/۱۷۹)

(۲) عدل۔ یعنی فیصلہ کرتے وقت مجرم کی پوزیشن، عدل کے تقاضے پر کسی طرح اثر انداز نہ ہونے پائے۔ اَلْحَرٰمُ

بِالْحَرٰمِ۔ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ۔ (۲/۱۸۰) کا اصول ہمیشہ کارفرما رہے۔

(۳) جرم کی سزا، جرم کی نوعیت کے مطابق ہونی چاہیے۔ اس سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ

سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ (۲/۱۸۱) یہ بھی اس صورت میں جب اس کے بغیر اصلاح کا امکان نظر نہ آئے۔

(۴) جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے، ملزم کو بے گناہ سمجھنا اور معاشرہ کو اس کے متعلق حسن ظن سے کام لینا

چاہیے۔ سورہ نور میں ہے کہ مدینہ میں بعض لوگوں نے کسی عورت کی خلاف تنہمت تراشی کی اور لوگ اُسے لے اڑے۔

اس پر قرآن کریم نے یہ ہدایت دی کہ تم نے جب یہ افواہ سنی تھی تو تمہارا رد عمل یہ ہونا چاہیے نَحَاكَ هٰذَا اِفْلٰكٌ مَّبِیْنٌ

... بُہْتَانٌ عَظِیْمٌ۔ (۲۴/۱۶) یہ ایک متعل راہنمائی ہے کہ ملزم کے متعلق سو ظن سے کام نہیں لینا چاہیے۔ جب ملزم

کے متعلق (اثبات جرم سے پہلے) سو ظن کی بھی ممانعت ہے تو دوران تفتیش اسے کسی قسم کی اذیت دینا کس طرح جائز

قرار پاسکتا ہے۔ ایسا کرنا بجائے خویش جرم ہے۔

کسی قانون کے نافذ ہونے سے پہلے اگر کوئی کام ایسا ہو گیا ہو، جو اس قانون کے خلاف ہو تو اُسے جرم قرار نہیں

دیا جاسکتا۔ بالفاظ دیگر کسی قانون کا اطلاق کسی سابقہ تاریخ سے نہیں ہو سکتا۔ اس کا اطلاق اس کے نفاذ کے بعد سے ہوگا۔

قرآن کریم میں کئی ایک احکام کے سلسلہ میں کہا گیا ہے۔ اِلَّا مَا خَدَّ سَلَفَ۔ (۲/۱۷۷)۔ جو اس سے پہلے ہو گیا،

اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

جس فعل کے ارتکاب میں دل کا ارادہ شامل نہ ہو (یعنی عمدہ نہ کیا گیا ہو) اس پر مواخذہ نہیں ہوگا۔ سورہ احزاب

میں ہے۔ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ فِیْمَا اَخْطَاْتُمْ بِہِ وَلَٰئِکُمْ مَّا تَعَمَّدَتْ

قُلُوبُکُمْ۔ (۳۳/۳)۔ جو کچھ تم سے سہوا ہو جائے اس پر مواخذہ نہیں۔ مواخذہ اس پر ہے جس میں تمہارے دل

کا ارادہ شامل ہو۔

لیکن لاپرواہی بھی ایک جرم ہے اور قابلِ سرزنش۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں قتلِ خطا (سہواً) کی سزا بھی تجویز کی ہے۔ اگرچہ وہ سزا جرمِ قتل کی نہیں۔ بطور کفارہ کے ہے۔ (۱۶۴)

بڑے بڑے جرائم سے بچنے والوں سے اگر کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہو جائے تو وہ قابلِ معافی ہوتی ہے۔ سورہ النجم میں ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبَائِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا لَّغَمَرٍ - (۵۳)۔

جو لوگ بڑے بڑے جرائم سے بچتے ہیں، ان سے کبھی کوئی معمولی سی لغزش ہو جائے تو وہ قابلِ عفو ہے۔

سزا تجویز کرتے وقت مجرم کی ذہنی سطح، تعلیم و تربیت اور معاشرتی احوال و کوائف کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسی بنا پر قرآن نے (اُس زمرے کی) لونڈیوں کی جرمِ زنا کی سزا شریف عورتوں سے نصف قرار دی تھی۔ (۲۴) کیونکہ جس ماحول میں وہ پرورش پاتی تھیں اس کے پیشِ نظر ان سے بلند اخلاق کی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ اس کے برعکس رسول اللہ کے گھرانے کی خواتین سے کہا گیا کہ اگر ان سے کوئی جرمِ سرزد ہوا تو اس کی سزا دگنی ہوگی۔ (۲۲)

قرآن کریم جس قسم کا معاشرہ قائم کرتا اور اس میں افراد معاشرہ کی تربیت جس انداز سے کرتا ہے اس سے وہ توقع رکھتا ہے کہ اگر کسی سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے گی تو وہ خود اس کا اعتراف کر لے گا اور صحیح صحیح بات کہہ دے گا، خواہ وہ اس کے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جاتے (۱۳۴)۔ اس آئیہ جلیلہ میں قرآن کریم نے شہادت کے سلسلہ میں ایسا بلند اصول پیش کیا ہے جس کی موجودگی میں عدل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی۔ (اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں)۔

قرآن مجید کے پیشِ نظر مجرم کی اصلاح ہے، اس لئے وہ اس کے دل میں جرم کے مذموم ہونے کا احساس بیدار کرنے کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ ایک عجیب و غریب اصول پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَنْ يَكْسِبْ اِثْمًا فَاِثْمًا يَكْسِبْهُ عَلٰى نَفْسِهٖ - (۱۳۳)۔ جو کسی کے خلاف ظلم و زیادتی کرتا ہے۔ وہ بزرگم خویش سمجھتا ہے کہ اس نے اس سے کسی دوسرے کو نقصان پہنچایا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ جرمِ خود اپنی ذات کے خلاف کرتا ہے اور اس کا نقصان خود اس کی ذات کو ہوتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جرم سے خود مجرم کی اپنی ذات پر ایسا نقصان رساں اثر پڑتا ہے جس کی تلافی کسی خارجی سزا سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اگر مجرم کسی ترکیب سے اپنے آپ کو سزا سے بچائے تو کبھی اس سے جو نقصان اس کی ذات کو ہوا ہے وہ اس سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکاناتِ عَالَمِہُ الْاَعْيٰنِ وَمَا خُفِيَ الصُّدُوْرِ - (۱۳۴) ونگاہ کی خیانتوں اور

دل کے پوشیدہ خیالات تک واقف ہے۔“ یہ ہے وہ تعلیم جس سے وہ مجرم کے دل میں احساسِ ندامت بیدار کرتا ہے۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو اسے سزا دینے کے بجائے اصلاح کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

جیسے ہاں ایک محاورہ ہے: ”مال صدقہ جان، جان صدقہ آبرو“، یعنی مال و دولت بھی اپنی قیمت رکھتے ہیں لیکن اگر کبھی ایسا وقت آجائے کہ مال اور جان میں (TIE) پڑ جائے۔ یعنی ان میں سے ایک ہی محفوظ رہ سکے، تو اس وقت جان بچانے کے لئے مال صرف کر دینا چاہیئے۔ اور اگر کبھی ایسا وقت آجائے کہ جان اور آبرو میں (TIE) پڑ جائے تو آبرو کی حفاظت کے لئے جان تک بھی قربان کر دینی چاہیئے۔

قرآن کریم بھی مال و دولت کی اہمیت کا اعتراف کرتا ہے۔ اس نے مال کے متعلق کہا ہے کہ: **بَجَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا**۔ (یعنی، مال سے انسان (اقوام) اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ لیکن مال کی غلط تقسیم سے جو کبھی خرابیاں پیدا ہوتی اور نابسایاں آتی ہیں ان کی روک تھام اور ازالہ کے لئے قرآن کریم نے پورا معاشی نظام متعین کر دیا ہے۔ اس کی تفصیل جلد اول ص ۱۵۱، آیت (۲۱) اور ص ۲۹۷، آیت (۲۲) میں گزر چکی ہے۔ جب وہ نظام قائم ہو جاتا ہے تو نہ کسی لے پاس زائد از ضرورت دولت رہتی ہے نہ جائیداد۔ یہ سب اس نظام کی تحویل میں چلا جاتا ہے اور وہ نظام تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔ لیکن جب تک وہ نظام قائم نہ ہو، وہ اس عبوری دور میں مال و دولت کے صرف اس کی ملکیت، اور تقسیم کے متعلق ضروری احکام بھی دیتا ہے۔ ان میں سب سے مقدم حکم وصیت کا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ۔ (۲۱)

تمہیں اس کا حکم دیا جاتا ہے، تمہارے لئے یہ قانون مقرر کیا جاتا ہے کہ جب تم دیکھو کہ تمہاری موت قریب ہے، اور تم اپنے پیچھے کچھ مال و دولت چھوڑ رہے ہو تو تم اپنے والدین اور دیگر اقرباء کے لئے (یعنی جنہیں بھی تم اپنا قریبی سمجھو خواہ وہ تمہارے رشتہ دار ہوں یا نہ) قاعدے کے مطابق وصیت کر جاؤ۔ ایسا کرنا تمام متقین (مسلمانوں) پر فریضہ خداوندی ہے۔

اس آیت سے وصیت کے حکم کی اہمیت واضح ہے۔ اس میں پہلے **كُتِبَ عَلَيْكُمْ** کہا گیا ہے۔ یعنی تمہیں اس کا

وصیت کا حکم | حکم دیا جاتا ہے۔ اور پھر آخر میں دہرایا گیا ہے۔ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ۔ ایسا کرنا متقین پر (یعنی جو بھی کتاب اللہ کو اپنا راہ نما سمجھتے ہیں۔ (۲)۔ ان پر لازم ہے۔ یہ فریقہ خداوندی ہے جس کا ادا کرنا ان پر واجب ہے۔ اس سے اس حکم کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم کا عمومی انداز یہ ہے کہ وہ احکام اور قوانین اصولی شکل میں دیتا ہے اور ان کی جزئیات خود متعین نہیں کرتا۔ (اس کی حکمت جلد اول ص ۹۶۔ زیر آیت (۲) بیان کی جا چکی ہے)۔ لیکن بعض احکام ایسے ہیں جن کی جزئیات بھی اس نے خود متعین کر دی ہیں۔ وصیت سے متعلق حکم میں جس «معروف» (قاعدہ) کا ذکر ہے اس کا تعین بھی قرآن نے خود ہی کر دیا ہے۔ سورہ المائدہ میں ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِّنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةُ الْمَوْتِ تَحْسِبُونَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمُونَ بِاللَّهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ وَلَا تَنْتَكُمُ شَهَادَةُ اللَّهِ إِذَا لَمِ الْأَشْهُمُ الْأَشْهُمُ فَإِنْ عُتِرَ عَلَىٰ أَهْمَا اسْتَحَقَّ أَثْمًا فَإِذَا حُرِبَ يَتُومٌ مِّنْهُمَا مِنَ الَّذِينَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْأُولَىٰ فَيُقْسِمُونَ بِاللَّهِ لَشَهَادَتُنَا أَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَا إِذَا أَهْمُ الظَّالِمِينَ (۲۵۵)

پہلے کہا گیا ہے کہ ہم نے بالعموم دین کے اصول دیتے ہیں، ان جزئیات متعین کر کے نہیں دیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم نے کسی قانون کی جزئیات بھی متعین نہیں کیں۔ بعض اہم قوانین کی جزئیات اور عملی طریق ہم نے متعین کر دیئے ہیں، ان میں قانون وصیت و شہادت بھی ہے۔ اس باب میں یاد رکھو کہ اگر تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجائے اور وہ وصیت کر رہا ہو (کیونکہ وصیت کرنا فرض ہے) (۲۵۵)۔ تو اس کے لئے گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ سو تم اپنے لوگوں میں سے دو ایسے گواہ مقرر کرو جو انصاف پسند ہوں۔ لیکن اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور ایسی جگہ پر جہاں تمہارے اپنے آدمی موجود نہیں اور دلوں موت کا سامنا ہو جائے تو پھر دو سادہ لوگ ہی گواہ بنالو۔ پھر جب ان کی شہادت کی ضرورت پڑے تو تمہارے سچ انہیں صلوة کے بعد پھر لیں۔ اگر تمہیں شبہ ہو کہ وہ ویسے سچ نہیں کہیں گے تو وہ قسم کھا کر کہیں کہ ہم نے اس گواہی کے عوض کسی سے کچھ نہیں لیا خواہ وہ ہمارا قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہی ہم سچی شہادت کو چھپائیں گے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو مجرم ہوں گے۔

اگر یہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے سچی گواہی نہیں دی تو جس پارٹی کے خلاف انہوں نے غلط گواہی دی تھی۔

اس پارٹی کے دو گواہ سامنے آئیں اور خدا کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی سابقہ گواہوں کے مقابلہ میں زیادہ سچی ہے۔ ہم حق سے ذرا بھی تجاوز نہیں کریں گے۔ اگر ایسا کریں تو ہم مجرم قرار دیئے جائیں۔

اس ضمن میں مزید شریح کرتے ہوئے فرمایا:-

فَمَنْ كَبَدَلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ
يُبَدِّلُونَهُ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ - فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوَصِّ
جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ
رَّحِيمٌ (۱۸۲-۱۸۱)

وصیت دو عادل گواہوں کے سامنے ہونی چاہیے (پہم) اگر کوئی شخص وصیت سننے کے بعد اس میں رد و بدل کر دے تو ایسے لوگ (قانون کی نگاہ میں) مجرم ہوں گے۔ (انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ بات زبانی ہوئی تھی اس لئے کے معلوم کہ متوفی نے کیا کہا تھا اور ہم نے کیا بیان دیا ہے لیکن وہ یہ بھول گئے کہ اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ بلکہ وہ کسی طرف بیجا طعن پر جھک گیا ہے تو اسے چاہیے کہ متعلقین میں مصالحت کی صورت پیدا کر دے۔ یہ وصیت بدل دینے کے جرم کے مرادف نہیں ہوگا۔ قانون میں اس قسم کی گنجائش رکھ دینا مغفرت و رحمت خداوندی کا تقاضا تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف مصالحت کی کوشش ہوگی اور کوشش بھی وصیت کرنے والے کی زندگی میں۔ اس میں قول فیصل وصیت کرنے والے ہی کا ہوگا۔

وصیت کے متعلق قانون واضح ہے۔ لیکن ایسے واقعات بھی ہو سکتے ہیں جن میں کسی کو وصیت کرنے کا وقت نہ ملا ہو یا وصیت کرنے کے بعد ترکہ میں کچھ اضافہ ہوا ہو جسے اس کی وصیت (COVER) کرتی ہو تو ایسی صورتوں میں بجائے اس کے کہ ورثہ خود اپنے طور پر فیصلہ کریں کہ ترکہ کس طرح تقسیم کیا جائے اور یوں باہمی جھگڑوں کا دروازہ نہ کھل جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ورثہ کے حصے خود ہی مقرر کر دیئے۔ وراثت کے متعلق یہ احکام سورہ نسا کی آیات ۱۱، ۱۲ میں صراحت سے دیئے گئے ہیں۔ لیکن ہر حصہ کے بعد کہا گیا ہے۔ مَن تَبَعْدَ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ - (پہم د ۱۳) یعنی یہ تقسیم اس صورت میں ہوگی جب متوفی کا قرضہ ادا کرنے اور اس کی وصیت پوری کرنے کے بعد کچھ بچے۔ اگر اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط ہے تو تقسیم وصیت کے مطابق ہوگی نہ کہ قانون وراثت کے مطابق۔ یہاں بھی دیکھئے۔ وصیت کو تبدیل کرنے کی اجازت خدا نے بھی نہیں دی۔

- تشریحات بالاکل رو سے اپنے دیکھ لیا کہ قرآن کریم کی رو سے وصیت کرنے کا حکم کس قدر تاکید ہے۔
- (۱) اس نے اس حکم کے سلسلہ میں پہلے کُتِبَ عَلَيْكُمْ کہا۔ یعنی تمہیں اس کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور آخر میں کہا کہ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ۔ متقیوں پر ایسا کرنا واجب ہے۔ یہ فرضیہ خداوندی ہے۔
- (۲) وصیت کے متعلق کہا کہ یہ پورے کے پورے ترکہ کے لئے کی جائے گی، ہاں اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ کوئی شخص وصیت نہ کر پایا ہو یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہو، تو پھر اس کی تقسیم قرآنی قانون وراثت کی رو سے ہوگی۔
- (۳) وصیت کرنے والے کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے رشتے داروں یا غیر رشتہ داروں میں سے جس کے حق میں چاہے اور جس قدر مال کی چاہے وصیت کر دے۔

لیکن آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ قرآن کریم کے اس قدر واضح حکم اور اس کی تشریحات کے علی الرغم ہمارے ہاں ”قانون شریعت“ یہ ہے کہ وصیت صرف ایک تہائی (۱/۲) ترکہ کے لئے کی جاسکتی ہے

قانون شریعت

اور وہ بھی ان رشتہ داروں کے حق میں نہیں جو وراثت میں حصہ پا سکتے ہیں۔ اور اس حکم کی بنیاد ایک روایت پر رکھی جاتی ہے۔ جب کہا جائے کہ اس باب میں اللہ کا حکم اس قدر واضح ہے اور اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ لَا مَبْدَلَ لِكَلِمَاتِهِ۔ (۱۱۳) احکام خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا تو خدا کے حکم میں یہ تبدیلی کس طرح جائز قرار پاسکے گی تو اس کے جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ اس روایت نے قرآن کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ علامہ حافظ محمد ایوب (مرحوم) اپنے کتابچہ ”فتنہ انکار حدیث“ میں لکھتے ہیں :-

نبی کے قول کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب حجت ہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے کُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ۔ (۱۱۲) مہا ہے اوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے۔ اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اُسے موت آئے۔ رسول اللہ نے فرمایا۔ لَا وَصِيَّةَ لِلنَّسَبِ۔ وراثت کے لئے وصیت نہیں ہے اور تو اتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وراثت کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا اور قول رسول قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔

(۱۱۵) بحوالہ مقام حدیث صفحہ ۵

آپ غور فرمائیے کہ ہمارے ہاں کتاب اللہ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ایک

حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے

طرف خدا کا نہایت واضح حکم اور غیر متبدل حکم ہے۔ دوسری طرف

ایک روایت ہے جسے رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یعنی یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ فی الواقعہ رسول اللہ نے ایسا فرمایا تھا۔ اس کی صرف نسبت حضور کی طرف کی جاتی ہے۔ وہ روایت آپ کی وفات کے قریب دو اڑھائی سو سال بعد لوگوں کی زبانی حدیثوں کے مجموعوں میں درج ہو جاتی ہے اور کہہ دیا جاتا ہے کہ اس نے اللہ کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے اور اسی بنا پر یہ عقیدہ وضع کر لیا جاتا ہے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ اور اگر کوئی یہ کہہ دے کہ یہ حدیث رسول اللہ کی ہو نہیں سکتی کیونکہ حضور کا کوئی قول یا عمل قرآن کریم کے خلاف نہیں ہو سکتا تو اسے منکر حدیث قرار دے کر ملحد اور بے دین ٹھہرایا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ محمد اویب (مرحوم) نے اپنے کتابچہ کا نام ہی ”فتنہ انکار حدیث“ رکھا تھا۔

یہ عقیدہ کہ رسول اللہ خدا کے حکم کو منسوخ کر دیا کرتے تھے، اس قدر زلزلہ انگیز ہے کہ اس سے تَكَادُ السَّمُوتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًا۔ (۱۹)۔ ”آسمان پٹ پٹ پڑیں۔ زمین شق ہو جائے۔ اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔“ قرآن کریم میں ہے۔ وَإِذَا نُسَخَتْ مِنْكُمُ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا إِنَّا كُنَّا بِهَذَا غَافِلِينَ أَوْ بَدَّلْنَا آيَاتِنَا بِلَاغٍ لِّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔ ”جب ان مخالفین اسلام کے سامنے احکام خداوندی پیش کئے جاتے ہیں تو یہ لوگ جو خدا کے سامنے جلنے کی امید نہیں رکھتے،

ایسا عقیدہ ذاتِ رسالت کے خلاف اتہام ہے

ہمنوا ہوں گے کہ، یا تو اس قرآن کے بدلے کوئی اور قرآن پیش کرے اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو کم از کم اس میں کوئی تبدیلی کر دے۔“ آپ غور فرمایا کہ معاندین اسلام کا حضور سے مطالبہ کیا تھا، یہ کہ آپ قرآن کے احکام کو منسوخ کر کے ان کی جگہ اور احکام دے دیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کے جواب میں کیا کہا گیا۔ قُلْ — خدا نے رسول اللہ سے کہا کہ تو اس کے جواب میں ان سے کہہ دے کہ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْكَ آيَةٍ تَفْسِي۔ ”یہ میرے حیطہ اختیار ہی میں نہیں کہ میں اس میں کوئی تبدیلی کروں۔“ اگر یہ کتاب میری تصنیف ہوتی تو میں اس میں رد و بدل کر سکتا تھا۔ لیکن یہ تو خدا کی کتاب ہے۔ میں خدا کی کتاب میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کیسے کر سکتا ہوں۔ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ۔ ”میں تو خود اس کتاب کا اتباع کرتا ہوں۔“ میرا فرض احکام خداوندی کی اطاعت کرنا ہے۔ اس لئے میں ان میں ... رد و بدل کیسے کر سکتا ہوں۔ إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ مَرَّتِي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ۔ (۲۰)۔ ”اگر میں اس میں کوئی رد و بدل کروں تو یہ حکم خداوندی کی معصیت ہوگی جس کی پاداش میں مجھے ایسی سخت سزا ملے گی جس کے تصور سے بھی میں کانپ اٹھتا ہوں۔“

یہ تھا احکام قرآن کے سلسلہ میں حضور کا عقیدہ اور مسلک اور اب اُسی رسول کے نام لیوا بڑے فخر سے کہتے ہیں

کہ حضورِ احکامِ خداوندی کو مسوخ کر دیا کرتے تھے اور ایسا کہتے وقت انہیں اس کا قطعاً خیال نہیں آتا کہ انہوں نے ایک دن خدا کے حضور جانا ہے اور وہاں رسول اللہ بھی موجود ہونگے۔ جب حضورؐ یو چھپیں گے کہ تم نے میرے خلاف اس قسم کی گستاخی کی جرات کس طرح کی تو اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟ اس قسم کی جرات کی شعوری یا غیر شعوری طور پر، وہی وجہ ہو سکتی ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا اِيسَا كُفَيْتَ كِي دَہٰی لَوْکَ جَرَاتُ کَر سکتے ہیں جنہیں اس کا خیال ہی نہ ہو کہ انہوں نے ایک دن خدا کے حضور جانا ہے۔ ایسا کہنے میں حافظ محمد آلیوب (مرحوم) منفرد نہیں۔ یہ ہمارے ہاں کی مروجہ شریعت کا مسئلہ فیصلہ ہے جو صدیوں سے نافذ العمل چلا آ رہا ہے اور آج بھی فیصلے اسی کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہی ہے وہ قوم (یعنی ہم مسلمان) جس کے متعلق قرآن کریم میں ہے: وَقَالَ الرَّسُولُ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا۔ (۲۵) حضورؐ رسالتِ خدا سے فریاد اور شکایت کریں گے کہ بارالہ! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا۔ اسے چھوڑ دیا تھا۔

اس قسم کے خلاف قرآن عقائد وضع کرنے اور ان کی بنا پر قرآن کو چھوڑ دینے سے ہمارا جو حشر آخرت میں جا کر ہوگا، وہ تو ایک طرف رہا۔ اس سے جو ابھیں اس زندگی میں پیدا ہوتی ہیں وہ بھی کچھ کم الم انگیز نہیں میرے سامنے اس قسم کے واقعات اکثر آتے رہتے ہیں۔ ایک میاں بیوی اچھے خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے اولاد کوئی نہیں بچی۔ ایک وسیع مکان تھا جس کے ایک حصے میں وہ خود رہتے تھے اور باقی حصہ کرایہ پر دے رکھا تھا۔ خاوند کی موت کے بعد اس کی لاوارث بیوہ کا اس مکان کے سوا (معاش کا) کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ خاوند کے بھائی بڑا درجنیں عرف عام میں مشربک کہا جاتا ہے اور جو لفظ دشمن کے مراد ہے،

روح فرسا واقعات

ان کے سخت دشمن تھے۔ خاوند نے مرتے وقت وصیت کر دی کہ مکان کی واحد مالک اس کی بیوہ ہوگی۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بھائی بڑا درجنیں عرف عام میں مشربک کہا جاتا ہے۔ (بیوہ صرف (۱۰) حصہ کی مالک ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسے نکال کر کیا۔ وہ در بدر کی ٹھوکریں کھاتی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ کیا خدا کا یہی انصاف ہے؟ میں اس مظلوم کو کس طرح سمجھانا کہ یہ خدا کا انصاف نہیں۔ ان اربابِ شریعت کا انصاف ہے جن کا شعار یہ ہے کہ يَكْتُمُونَ بِاَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ وہ خود فتویٰ لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ حکمِ خداوندی ہے اور یہ دھندا اس لئے کرتے ہیں کہ: لِيَسْتَرْوْاْ بِهِ ثُمَّ قَلِيْلًا۔ (۲۶) تاکہ اس سے کچھ پیسے کالیں۔ انہوں نے اسے اپنا ذریعہ معاش بنا رکھا ہے۔

یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ ہمارا فتویٰ نہیں۔ یہ رسول اللہ کا فیصلہ ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ رسول اللہ ایسا

فیصلہ کبھی نہیں دے سکتے تھے۔ وہ تو (قرآن کریم کی سند کی رو سے) خدا سے پناہ مانگتے

تھے کہ وہ خدا کے کسی حکم کو تبدیل کرنے کی جرأت کریں۔ یہ روایات یقیناً وضعی ہیں۔

ائمہ کا فیصلہ

پھر یہ فرماتے ہیں کہ یہ ہمارے ائمہ کرام کا فیصلہ ہے۔ اس کے متعلق ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے دل میں ان ائمہ حضرات کا اس قدر احترام ہے کہ ہم اس قسم کے خلاف حکم خداوندی فیصلوں کو ان کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اگر اس پر بھی ان کا اصرار ہے کہ یہ انہی حضرات کا فیصلہ ہے تو ہم اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ان کا اور ان کے خدا کا معاملہ ہے۔ ہم تو احکام خداوندی کے خلاف کسی کے قول کو بھی سند اور حجت نہیں مان سکتے۔

سند سے آگے بڑھ کر یہ حضرات اس صرخی خلاف قرآن مجیم کی تائید میں دلائل پر اتر آتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ رشتہ داروں کے حق میں وصیت کرنے سے دوسرے رشتہ داروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ موحجے کہ

اس اعتراض کے معنی یہ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے کہا تھا **لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ** (۱۸۱) **حق تلفی** والدین اور دیگر رشتہ داروں کے لئے وصیت فرض قرار دی جاتی ہے، تو اسے (معاذ اللہ) اتنا بھی معلوم

نہیں تھا کہ اس سے دوسرے رشتہ داروں کی حق تلفی ہو جائے گی۔ اس ترنیم نے (پناہ بخدا) خدا کی اس چوک کی تلافی کر دی۔ (معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ)

جہاں تک رشتہ داروں کے حق کا تعلق ہے، تو یہ واضح ہے کہ کسی شخص کی ملکیت میں کسی اور کا حق ہوتا ہی نہیں۔ صاحب ملکیت کو اس کے تصرف کا پورا پورا اختیار ہوتا ہے۔ سو جب اس کی ملکیت میں کسی اور کا حق ہی مسلم نہیں تو حق تلفی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے ترکہ کی تقسیم کے جو حصے مقرر کر دیئے ہیں تو اس لئے کہ اگر ترکہ بلا وصیت رہ جائے تو یہ تنازعات کا موجب نہ بن جائے۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ قرآن کریم (۱۸۱) میں جہاں وراثت کے حصوں کا ذکر ہے تو ہر حکم کے ساتھ اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ **مَنْ كَبَدَ وَصِيَّةً**۔۔۔۔۔ یہ تقسیم وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی۔ اگر وصیت پوری کرنے کے بعد کچھ نہیں بچتا تو وراثہ کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس لئے کہ متوفی کو اپنی ملکیت پر پورا پورا حق حاصل تھا۔ اگر وہ کسی وجہ سے اپنے اس حق کو کما حقہ استعمال نہیں کر سکا تو پھر اس کے ترکہ کی تقسیم قرآنی احکام کے مطابق ہوگی۔

یہ حضرات اسے تسلیم کرتے ہیں کہ وہ شخص اپنی زندگی میں اپنی پوری جائیداد جس کے نام چاہے بہہ کر سکتا ہے اس

ہبہ کر سکتا ہے

سے بھی انہوں نے تسلیم کر لیا کہ اسے اپنی جائیداد کے تصرف میں پورا پورا حق حاصل ہے۔ اس میں اس کے کسی رشتہ دار کا حق مستم نہیں۔ لیکن ہبہ کرنے میں ایک الجھن یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس سے یہ شخص اپنی جائیداد سے اپنی زندگی میں محروم ہو جاتا ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ اس نے کتنا عرصہ اور زندہ رہنا ہے اور جس کے حق میں جائیداد ہبہ کر دی گئی ہے اس کا اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک ہوگا۔ چنانچہ ایسے واقعات بھی سامنے آتے رہتے ہیں کہ اچھا بھلا خوشحال آدمی اپنی جائیداد ہبہ کر دینے کے بعد زندگی کے آخری ایام میں نان شبینہ تک کا محتاج ہو گیا۔

اللہ (خبیر و علیم) نے ان تمام مصلح کو سلمنے رکھ کر وصیت کا حکم دیا تھا جسے ہمارے اربابِ شریعت نے منسوخ قرار دے کر یہ تمام الجھنیں پیدا کر دیں۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ مروجہ قانونِ وصیت میں تبدیلی کر کے اسے قرآنِ کریم کے مطابق بنا دیا جائے، لیکن مذہبی پیشوائیت کی طرف سے مخالفت کی وجہ سے اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ اب پاکستان میں ایک عجیب صورت سامنے آرہی ہے۔ دستورِ پاکستان میں یہ بنیادی شق رکھی گئی ہے کہ مملکت کا کوئی قانون، کتابِ سنت کے خلاف نہیں ہوگا اور جو مروجہ قوانین کتاب و سنت کے خلاف ہیں انہیں ان کے مطابق مرتب کر دیا جائے گا۔ دیکھنا چاہیے کہ وصیت کے متعلق ایسا قانون کس طرح مرتب ہوگا جو کتاب کے بھی مطابق ہو اور سنت کے بھی کتاب (قرآن مجید) کا فیصلہ ہے کہ وصیت پورے کے پورے ترکہ میں کی جاسکتی ہے اور ورثہ کے حق میں بھی۔ اس کے برعکس سنت دروایت کا فیصلہ ہے کہ وصیت صرف (۱) حصہ میں کی جاسکتی ہے اور وہ بھی غیر ورثہ کے حق میں۔ ورثہ کے حق میں نہیں کی جاسکتی۔ آپ سوچئے کہ کیا کوئی ایسا قانون بن سکتا ہے جو کتاب کی شرط کو بھی پورا کرے اور سنت کی شرط کو بھی؟ ان سطور کی تسوید کے وقت تک تو حکومت کی طرف سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہوا۔ معلوم نہیں کہ جب یہ کتاب شائع ہو کر قارئین تک پہنچے اس وقت صورت حال کیا ہو؟ میں قارئین سے درخواست کروں گا کہ آپ اس وقت قانون سازی کے فرائض انجام دینے والے حضرات سے دریافت کیجئے گا کہ وصیت کے متعلق ایسا قانون کس طرح مرتب ہوگا جو کتاب اور سنت دونوں کی شرائط پر پورا اترے؟

آخر میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ وصیت، ہبہ، ترکہ، وراثت وغیرہ سے متعلق تمام بحثیں اسی دور سے تعلق رکھتی ہیں جب ملک میں قرآن کا معاشی نظام رائج نہ ہو۔ قرآن کے معاشی نظام میں نہ کسی کے پاس فاضلہ مال و دولت

یا جائیدادیں ہوں گی، نہ ان کی (DISPOSAL) کے متعلق سوالات پیدا ہوں گے۔ اگر کسی کا کوئی ترکہ ہوگا تو وہ ان اشیائے مستعملہ تک محدود ہوگا جنہیں حکومت نے ذاتی ملکیت میں رکھنے کی اجازت دے رکھی ہوگی۔

(۰)

اس کے بعد قرآن کریم کے لگے حکم کو لیجئے :-

ہمارے زمانے میں ہر سلطنت میں اپنی اپنی مستقل فوج (STANDING ARMY) ہوتی ہے۔ قدیم زمانے میں بھی نسبتاً متمکن ممالک میں یہی کیفیت ہوتی تھی۔ لیکن قرآن کریم نے یہ تصور دیا کہ امت کا ہر فرد قابلِ مجاہد (سپاہی) ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام افراد امت مستقل فوج کی طرح چھاؤنیوں میں تو نہیں رہیں گے۔ یہ اپنے اپنے گھروں میں رہیں گے۔ اور مختلف کام کاج کرتے رہیں گے اور جب جنگ کے لئے آواز دی جائے گی تو یہ فوج کی شکل اختیار کر لیں گے۔ اس شکل میں اس کی البتہ ضرورت ہوگی کہ سال میں کچھ عرصہ ایسا رکھا جائے جس میں انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنایا جائے۔ عسکری پابندیوں کی مشق کرائی جائے۔ (جس طرح آجکل ریزرو فوج کے سپاہیوں کو سال میں کچھ وقت کے لئے ٹریننگ کیسپس میں جا کر تربیت حاصل کرنی ہوتی ہے)۔ اس کے لئے ماہِ صیام تجویز کیا گیا۔ فرمایا :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۲)

اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیتے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلی اقوام کے لئے فرض قرار دیئے گئے تھے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کے قابل ہو سکو اور سفرِ زندگی میں خطرات سے محفوظ رہ سکو۔

صیام (مادہ ص۔ و۔ ہ) کے معنی ہیں رک بانا۔ باز رہنا۔ بھر جانا۔ قرآن کریم نے کھانے پینے کی چند

چیزوں کو حرام قرار دے کر باقی چیزوں کو حلال و طیب کہا (۱)۔ حرام اشیاء پر تو (بجز اضطراری حالت کے)

مطلق پابندی ہے لیکن سپاہیانہ زندگی ایسی ہے جس میں ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں (اور بالعموم ہوتے ہیں) جن

میں حلال و طیب چیزوں کے استعمال سے بھی رکنا پڑتا ہے۔ حالتِ جنگ میں یا تو وہ ملتی ہی نہیں، یا کھانے پینے

کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ سپاہیانہ زندگی کا خوگر ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ حالتِ امن میں ان چیزوں کے استعمال

پر کچھ وقت کے لئے خود پابندی عائد کر لی جائے تاکہ قوتِ برداشت بڑھے۔ اس کا نام سے صوم (جمع صیام)۔ ہم

سمجھتے ہیں کہ اس کا ترجمہ ”روزہ“ کرنے کے بجائے ضبطِ نفس (ڈسپلن) کیا جائے تو وہ قرآنی مفہوم سے زیادہ

صوم

قریب ہوگا۔ سورہ احزاب میں مومن مردوں اور عورتوں کی جن نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں الصَّامِتِمْہِیْنَ وَ الصَّامِتَاتِمْہِیْنَ بھی ہے (۳۳) اس کا ترجمہ ”روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں“ قرآنی مفہوم کو واضح نہیں کر سکتا۔ اس کا مفہوم ہوگا ”ہر اس بات سے مُک جانا والے جس سے مُکنے کے لئے کہا جائے“ یعنی اپنے آپ پر ضبط رکھنے والے۔ ڈسپلن کے پابند۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ دین شروع سے ایک ہی چلا آ رہا ہے۔ اس لئے جہاں تک ابدی احکام کا تعلق ہے وہ بھی ہر رسول کی وساطت سے یکساں دیئے گئے تھے۔ مجاہدانہ زندگی ہر زمانے میں دین خداوندی کا تقاضا تھی اس لئے ان رسولوں کی امتوں پر بھی اسی طرح صیام فرض قرار دیئے گئے تھے جس طرح امت مسلمہ پر (اِکْمَا کُتِبَ عَلَی الدِّیْنِ مِنْ قَبْلِکُمْ)۔ (بنی اسرائیل میں صوم میں کھانے پینے کے علاوہ بات چیت کی بھی ممانعت تھی۔) دیکھئے ۱۶۱، ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ پابندی خدا کی عائد کردہ تھی یا ان کے ارباب شریعت نے خود اس کا اضافہ کر لیا تھا۔ یہودی شریعت کے احکام جس قدر سخت تھے ان سے نظر آتا ہے کہ وہ ان کے احبار فقہاء کے جذبہ آمریت کے وضع کردہ تھے۔ بہر حال اس باب میں یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ پابندی خدا کی طرف سے عائد کردہ تھی یا ان کی فقہ کا حکم تھا۔ قرآن کریم میں تذکرہ حضرت زکریا کے متعلق جو کچھ آیا ہے (۱۳۱) اس سے البتہ یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ پابندی خدا کی طرف سے عائد کردہ تھی۔ قرآن کریم نے بہر حال بات چیت کرنے کی ممانعت نہیں کی۔

صیام سے متعلق آیت (۱۶۱) کے اخیر میں کہا گیا ہے۔ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔ اور دو آیتیں آگے چل کر: لَسْکَیْرُوْا اللّٰہَ عَلٰی مَا هٰذَا سَکْرٌ اور لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ (۱۶۲)۔ ہم ان تینوں غایات کی تشریح آیت (۱۶۳) میں کرینگے۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ قرآنی احکام کے ساتھ جو (ل) یا (لَعَلَّکُمْ تاکہ) کے الفاظ آتے ہیں تو یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ایسی اہمیت کا کہ اس سے دین اور مذہب کا فرق کھڑکھڑا کر دینا آجاتا ہے۔ مذہب میں صرف حکم دیا جاتا ہے۔ یہ نہیں بتایا جاتا کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اس سے ہوگا کیا؟ اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے تو ارباب شریعت کی آنکھوں میں خون اتر آئے گا۔ دہن کف آلود ہو جائے گا۔ غصے سے کانپنے لگ جائیں گے اور چیخ کر کہیں گے کہ بھل جا رہا ہوں۔ خدا کے حکم کے بارے میں پوچھتے ہو کہ ایسا کیوں کہا گیا ہے؟ ایسا پوچھنے والا مرتد ہو جاتا ہے۔ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

ان کے اس قسم کے ردِ عمل کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اس کیوں کا جواب ان کے پاس ہوتا نہیں اور وہ بجائے اس کے کہ اپنی کوتاہی فہم کا اعتراف کریں، اسے غصے کے پردے میں چھپانا اور ”حمیت دینی“ سے تعبیر کرنا چاہتے ہیں۔ اسکے

برعکس دین میں خدا اپنے ہر حکم کے ساتھ خود یہ بتاتا ہے کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اس کا فائدہ کیا ہوگا۔ سب دین میں درحقیقت ”حکم“ نہیں دیا جاتا۔ قانون دیا جاتا ہے اور قانون کہتے ہی اسے ہیں کہ ”اگر یہ کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا“ اس (تو) کو قانون دینے والے خدا نے خود ہی واضح کر دیا تاکہ انسان کسی غلط فہمی یا خود فریبی میں نہ رہے۔ اگر (تو) نہ بتایا جائے تو انسان کبھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی تعمیل صحیح طور پر نہ ہو رہی ہو، لیکن اس کے پرکھنے (ٹسٹ کرنے) کے معیار کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسی طور پر کرتا چلا جائے جس سے نہ صرف یہ کہ کوئی منفعت بخش نتیجہ برآمد نہ ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ الٹا نقصان ہو (انسان کی سعی و عمل کا رائیگاں چلے جانا بھی تو کچھ کم نقصان دہ نہیں ہوتا)۔ خدا نے احکام (تواین) دیتے تو ساتھ ہی خود بتا دیا کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا تاکہ انسان سانچے کے ساتھ ٹسٹ کرنا جانتے کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے۔ (اس سلسلہ میں جلد اول ص ۱۸۶ آیت (۲) خدا کے صحیح تصور کا عنوان اور متعدد مقامات پر قانون مکافات عمل بھی دیکھیے)۔ یہ ہے کتاب و حکمت کا باہمی تعلق۔ کتاب کے معنی قانون اور حکمت سے مراد یہ ہے کہ اس قانون کی غرض و غایت کیا ہے۔ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ یہ مفہوم ہے احکام کے ساتھ (۱) یا (تعلککم) کا۔

اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ
مِّنْ اَيَّامٍ اٰخَرَةٍ عَلَى السَّادِّينَ يُطِيقُوْنَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مَسْكِيْنٍ
فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لِّهٖ وَاَنْ تَصُومُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ . (۲/۱۸۶)

۲
۱۸۶

یہ صیام (روزے) گنتی کے دنوں کے ہیں۔ پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اس گنتی کو پورا کرے۔ لیکن اگر شکل یہ ہو کہ ایک شخص نہ تو بیمار ہے اور نہ ہی حالت سفر میں لیکن طبعی طور پر اس کی مستقلاً حالت یہ ہے کہ وہ روزے کو بے مشقت نباہ سکتا ہے (تو اس کے لئے دوسرے دنوں میں روزے پورے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)۔ اسے چاہیے کہ روزے کے عوض کسی حاجت مند کی روٹی کا انتظام کر دے.....

یہاں کہا کہ روزے گنتی کے دنوں کے ہیں۔ یعنی یہ (REFRESHER COURSE) ایک مدت معینہ کے لئے

ہوگا۔ اس مدت کی وضاحت اگلی آیت میں کر دی جہاں کہا کہ: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ . (۲/۱۸۷)۔ جو کوئی تم میں سے اپنے گھر پر ہو تو وہ مہینے بھر کے روزے رکھے۔ یعنی

احکام کی تفصیل

اس کی مدت ایک ماہ ہے۔

ان دو آیتوں کے ملا لینے سے صیام کے متعلق احکام کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یعنی :-

(۱) یہ مدت ایک ماہ کی ہے۔

(۲) اس مدت میں جو شخص اپنے گھر پر ہو — فَمَنْ شَهِدَ کے یہی معنی ہوتے ہیں۔ وہ مہینہ بھر کے روزے رکھے۔

(۳) اگر وہ بیمار ہے یا حالتِ سفر میں تو وہ صحت یاب ہونے یا سفر سے واپس آ جانے کے بعد یہ مدت پوری کرے۔ اب ایک اور (CATEGORY) باقی رہ جاتی ہے۔ یعنی ایک شخص گھر پر بھی ہے، بیمار بھی نہیں (سفر میں بھی نہیں)، لیکن وہ خلقی طور پر (CONSTITUTIONALLY) اتنا کمزور ہے کہ وہ بھوک پیاس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یا کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہے جس سے شفا یاب ہونے کی امید نہیں۔ یا کبرسنی کی وجہ سے نحیف ہوتا چلا جا رہا ہے، یا کوئی اور ایسی معذوری ہے جس کی وجہ سے وہ اس ماہ کے بعد بھی روزے نہیں رکھ سکتا۔ تو وہ کیا کرے؟ اسکے متعلق کہا کہ وہ اس کا فدیہ ادا کر دے تاکہ وہ طبعی طور پر نہیں تو کم از کم ذہنی طور پر امت کے اس اجتماعی پروگرام میں شریک ہو جائے (واضح ہے کہ ہم نے یہاں روزے رکھنے کے الفاظ موضوعِ مفہوم کی رُو سے لکھ دیئے ہیں ورنہ جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے، یہ سب اس ٹریننگ کورس کا پروگرام ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ مریض صحت یاب ہونے اور مسافر سفر سے واپسی کے بعد یہ گنتی پوری کرے، تو مملکت کا عسکری نظام ایسے لوگوں کے لئے خصوصی کورس کا انتظام کرے گا۔

یہ جو ایک استثنائی صورت بتائی گئی ہے — یعنی وہ لوگ جو بمشقت روزہ رکھ سکیں۔ تو ظاہر ہے کہ اس کا فیصلہ ایسا شخص خود ہی کر سکتا ہے۔ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے کہا کہ اگر کوئی کیس 'بین' (BORDER LINE) کا ہے۔ یعنی وہ کر بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ تو اس کے لئے کہا کہ وہ قانون کی طرف نہ جائے بلکہ اپنے لئے آپ ہی فیصلہ کرے۔ اگر وہ دیکھے کہ مشقت تو ضرور ہوگی لیکن بائیں ہمہ وہ روزہ نباہ لے گا، تو بہتر یہی ہوگا کہ وہ روزہ رکھے کیونکہ جو مقصد روزہ سے حاصل ہو سکتا ہے وہ فدیہ سے نہیں ہو سکتا بشرطیکہ تم روزہ کی حکمت سے واقف ہو۔

بات بالکل واضح ہے۔ آیت کے الفاظ ہیں۔ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مَسْكِينٍ (۲۱۷) عربی زبان کے ہر مشہور اور مستند کتب لغت، مثل تاج العروس، محیط، مفردات امام راغب، اقرب الموارد وغیرہ اس

پر متفق ہیں کہ الحَقَّاق اس قوت کو کہتے ہیں جس سے کوئی کام بے مشقت کیا جاسکے۔ اس سے انہوں نے لکھا ہے کہ
الَّذِينَ يُطِيقُونَہ کی تفسیر قرآن کریم میں جہاں آیا ہے لَا تَحْتَسِبْنَا مَا لَنَا طَاقَةٌ لَّنَا (۲۱۶)
 تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم پر ایسی ذمہ داری نہ ڈال جس کے اٹھانے
 کی ہم میں قدرت ہی نہ ہو۔ اس کے معنی ہیں ایسے کام جنہیں ہم بے مشقت کر سکیں۔ اس آیت (۲۱۶) کی تفسیر میں مصر
 کی شہرہ آفاق تفسیر المنار میں (جسے مفتی عبدہ اور ان کے شاگرد مفتی السید رحمان نے مرتب کیا تھا) لکھا ہے:-

عرب اطاق الشی اس وقت کہتے ہیں جب قوت اتنی کم ہو کہ اس کی وجہ سے کسی کام کے کرنے میں شدید
 مشقت کا متحمل ہونا پڑے۔ اَلَّذِينَ يُطِيقُوْنَہ سے مراد ہیں ضعیف۔ بوڑھے۔ اباہج جن کے امراض کے
 اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ وہ کاریگر یا مزدور جن کا پیشہ مشقت انگیز کاموں میں ہو نیز وہ مجرم جنہیں مشقت کے
 کاموں پر لگایا گیا ہو۔ ان لوگوں پر جب روزہ رکھنا شاق ہو اور وہ فدیہ دے سکیں تو وہ اس حکم میں داخل ہیں۔
 (المنار۔ جلد ۲۔ ص ۱۵۶۔ بحوالہ لغات القرآن متا)

بات بالکل واضح ہے۔ لیکن ہمارا قدامت پرست طبقہ اس کی تفسیر میں کیا کہتا ہے اسے بھی دیکھتے جلیے۔ وہ
 کہتے ہیں کہ:-

اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے کی فرضیت بھی بتدریج عائد کی گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں مسلمانوں
 کو صرف تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ مگر یہ روزے فرض نہیں تھے۔ پھر سترہ میں رمضان کے
 روزوں کا یہ حکم نازل ہوا مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں
 اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ بعد میں دوسرا حکم نازل ہوا۔ اور عیلم
 رعایت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن مریض اور مسافر اور حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڑھے لوگوں کے
 لئے جن میں روزے کی طاقت نہ ہو، اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا۔

ان حضرات کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ نے جو حکم پہلے نازل کیا تھا اس میں کہا کہ:-

جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں تو وہ فدیہ دے دیں۔

یعنی جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت کے باوجود روزہ نہ رکھیں وہ فدیہ دے دیں۔ بالفاظ دیگر جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت

کے باوجود روزہ نہ رکھیں، وہ تو فدیہ دیں اور جو لوگ اس کی برداشت کی طاقت نہ رکھتے ہوں وہ فدیہ نہیں دے سکتے انہیں روزہ رکھنا ہوگا۔ اس کے بعد (معاذ اللہ - ثم معاذ اللہ) اللہ میاں کو خیال آیا کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا کہ جو لوگ روزہ رکھ سکتے ہوں وہ بے شک روزہ نہ رکھیں، فدیہ دے دیں، لیکن جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں وہ بالضرور رکھیں انہیں فدیہ دینے کی اجازت نہیں۔ اسے محسوس کرنے کے بعد اس نے اپنے پہلے حکم کو منسوخ کر دیا اور دوسرا حکم یہ دیا کہ وہ پہلی عام رعایت منسوخ سمجھی جائے۔ فدیہ کی اجازت مریض اور مسافر اور حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڑھے لوگوں کے لئے ہے جن میں روزے کی طاقت نہ ہو۔

ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ :-

(۱) قرآن کریم میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ پہلی رعایت والی آیت منسوخ کر دی گئی ہے۔ قرآن کریم میں تو اس کی کسی آیت کے منسوخ کئے جانے کا ذکر یا اشارہ تک نہیں ہے

(۲) مسافر اور مریض کے لئے فدیہ کی آیت کا ذکر کہاں ہے؟ قرآن مجید نے انہیں یہی کہا ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کریں۔

اسی ضمن میں ایک اور مثال بھی دیکھئے۔ قرآن حکیم نے کہا ہے :- فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (۲/۱۸۵) یعنی اس مہینہ میں جو شخص اپنے گھر پر ہو وہ انہی دنوں میں روزے رکھے اور جو سفر پر ہو وہ گھر۔ واپس آ کر گنتی پوری کرے عربی لغت میں شَهِدَ کے معنی گھر پر موجود ہونا اور غَائِب کے معنی سفر پر چلے جانا ہیں۔ دیکھئے لغات القرآن ۹۸۔ لیکن اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے :-

جو شخص اس مہینے کو پائے اس کو لازم ہے کہ وہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے بلکہ

جو شخص اس مہینے کو پائے۔ یعنی جو شخص اس مہینے میں زندہ ہو وہ روزے رکھے جو اس سے پہلے مر جائے وہ بے شک روزے نہ رکھے !

آپ غور کیجئے کہ یہ حضرات خدا کی اس کتاب عظیم کے ساتھ کیا کچھ کرتے ہیں؟ ان ہی جیسوں کے متعلق اقبالؒ نے باصد سوز و گداز کہا تھا :-

کہ پیغام خدا گفتند مارا
خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

زمین بر صوفی و ملا سلاے
ولے تاویل شان در حیرت انداخت

(۰)

اگر کوئی مؤرخ ہر قسم اثرات سے الگ ہو کر یکسر غیر جانبدارانہ طور پر تاریخ انسانیت پر نگاہ ڈالے اور یہ دیکھے کہ وہ کون سا واقعہ ہے جسے اس پوری تاریخ میں سب سے بڑا عظیم انقلاب انگیز قرار دیا جاسکتا ہے، تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ وہ واقعہ نزولِ قرآنِ کریم ہے۔ یہ بات محض بر بنائے عقیدت نہیں کہہ رہا جن (غیر مسلم) مؤرخوں اور مفکرین نے تعصب اور جانبداری سے الگ ہٹ کر تاریخ انسانیت پر غور کیا ہے وہ از خود اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ میں نے اس کی تفصیل اپنی کتاب — معراج انسانیت — میں دی ہے۔ یہاں دو ایک شہادات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ کارلائل اپنی شہرہ آفاق تصنیف ہیر ورائنڈ ہیرو ورشپ میں لکھتا ہے :-

نزولِ قرآن عظیم ترین انقلابی واقعہ

اولین دورِ جہالت سے گزر کر اب ہم ایک مختلف قسم کے انسانوں اور مذہب کی ایک نرالی دنیا کی طرف آتے ہیں۔ یعنی عرب میں دین محمدی کی اشاعت کی طرف۔ ایک بہت بڑا انقلاب! ایسا انقلاب جس نے نوعِ انسانی کی عام حالت اور ان کے تصورات کی زندگی میں عجیب تبدیلی اور محیر العقول تبدیلی پیدا کر دی۔

تاریخ تہذیب کا مشہور مؤرخ (DORSY) اپنی تصنیف (CIVILISATION) میں لکھتا ہے کہ :-

عربوں کا ظہور ایک عظیم داستان ہے اور دنیا کی تاریخ میں یقیناً ایک غیر معمولی واقعہ —۔۔۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر عرب نہ ہوتے تو دورِ حاضرہ کی تہذیب بھی کہیں نہ ہوتی۔ (ص ۲۳۲ ز ۲۳۹)

گبن جیسا مؤرخ جب ظہورِ اسلام کے مرحلہ پر پہنچتا ہے تو کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ :-

اب ہماری نگاہ اس ناقابلِ فراموش انقلاب پر مرکوز ہے جس نے اقوامِ عالم پر ایک نرالہ لیکن دائمی نقش چھوڑا۔

اور (THE MAKING OF HUMANITY) کا نامور مصنف (BRIFFAULT)

کہتا ہے :-

وہ روشنی جس سے تہذیب کی شمع دوبارہ جلائی گئی، یونانی اور رومی ثقافت کی ان چمکاریوں سے نہیں لی گئی جو یورپ کے کھنڈرات میں مسلگ رہی تھیں۔ نہ ہی باسفورس کے کنارے ”زندہ موت“ سے۔ یہ روشنی شمال

کی طرف سے نہیں بلکہ جنوب کے حملہ آوروں سے لی گئی۔ یہ روشنی عرب کے اٹھتی۔ (P. ۱۸۳)

تاریخ عالم کا مصنف (W. N. WEECH) اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

مغرب میں پاپائے روم کلیسا پر اپنے اقتدار کا مدعی تھا۔ مشرق میں قیصر کا یہی دعویٰ تھا جس کا بطلان مصر اور

شام کر رہے تھے۔ اس طرح عیسائیت کی صفوں میں ہلک انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن وقت آچکا تھا کہ ان صفوں

کو کسیر معدوم کر دیا جائے کیونکہ اب ایک عظیم روحانی قوت عرب کے نمودار ہونے والی تھی۔ (P. 250)

اور مشہور مفکر (PRINGLE KENNEDY) ان الفاظ میں کہ :-

چند ہی سال کے عرصے میں (فتنہ و فساد کا) یہ نقشہ کس طرح بدل گیا؟ کس طرح شہرہ تک یہ دنیا اُس دنیا سے

مختلف ہو گئی جو اس سے پہلے تھی؟ نوع انسانی کی تاریخ میں یہ باب ایک نمایاں خصوصیت کا حامل ہے۔

(ARABIAN SOCIETY AT THE TIME OF MOHAMMAD. P. 18)

قرآن کریم یہ انقلاب، اینٹوں اور پتھروں کی دنیا میں نہیں لایا۔ دلوں کی دنیا میں لایا۔ اس نے انسان کی نگاہوں کا زاویہ

بدل دیا۔ اس نے اس کا نصب العین حیات بدل دیا۔ اس نے اس کے مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دی۔ اس نے اس کی

زندگی کے معیار بدل دیے۔ خیر و شر کے پرکھنے اور نفع و نقصان کے ماپنے کے نئے پیمانے عطا کر دیے۔ اس نے انسانوں کی

خود ساختہ پرانی اقدار کو جنس کا سد اور زبرِ کم عیار قرار دے کر نئی اقدار کے سکے رائج کر دیے۔ اسی لئے اس کے خدا

نے کہا کہ اس زمانے میں جب تمام کائنات تاریکیوں میں ڈوب رہی تھی اس تابندہ سحر کو نئی اقدار کے ساتھ بھیجا۔ اِنَّا

اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (۱) دنیا کی تمام قومیں کوئی نہ کوئی تیوہار مناتی ہیں۔ اللہ نے امتِ مسلمہ سے بھی ایک

تیوہار منانے کے لئے کہا۔ آپ جانتے ہیں وہ تیوہار جس عظیم واقعہ کی یاد منانے کے لئے تجویز کیا تھا۔ کون سا تھا؟

نزولِ قرآن کا عظیم النظیر واقعہ۔ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَ شِفَاءٌ لِّمَا فِي

الصُّدُورِ وَ هُدًى وَ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ - قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَ

بِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (۱۰۵)

اے نوع انسان! تمہاری طرف تمہارے نشوونما دینے والے کی جانب سے وہ عطا بطہ حیات آگیا جس میں ہر اس کشمکش

لہ یہاں محض اشارات سے کام لیا گیا ہے۔ تفصیل اُس وقت سامنے آئے گی جب ہم قرآن کے موضوع پر گفتگو کریں گے۔

کا علاج موجود ہے۔ جو کمبائے دونوں کو وقتِ اضطراب رکھتی ہے اور جو ہر اس قوم کی جو اسے اپنا ضابطہ زندگی قرار دیتی ہے، کامیاب ہونی کی راہ کی طرف راہ نمائی کر دیتا اور انہیں سامانِ نشوونما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔

اسے رسول ان سے کہو کہ اس قسم کے ضابطہ حیات کا بل جانا خدا کے فضل و رحمت سے ہے۔ تم کسی قیمت پر بھی اسے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا تمہیں چاہیے کہ اس کے ملنے پر تم جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ ہر اس متذرع حیات سے زیادہ گراں بہا ہے جسے تم اپنے لئے جمع کرتے رہتے ہو۔ یعنی زندگی کی ہر متاع سے زیادہ قیمتی۔ (۲۱۱)

پھر جس طرح وہ واقعہ جس کی یادیں یہ جشنِ مسرت تجویز کیا گیا، دنیا جہان سے نرالا تھا اس جشن کے منانے کا طریق بھی منفرد تھا۔ دین کا مقصد یہ ہے کہ نوعِ انسان کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلا کر انہیں صرف اقدارِ خداوندی کا پابند بنایا جائے۔ اس مقصد کے لئے اُس نے ایک قوم (امت) تیار کی جو ہر اس قوت کا مقابلہ کرے جو انسانیت کو محکوم و مغلوب رکھنا چاہے۔ مجاہدین کی اس جماعت کے تربیتی کورس کے لئے صیام کا پروگرام تجویز کیا گیا اور کہا کہ یہ پروگرام اُن دنوں رُوئے عمل لایا جائے جب نزولِ قرآن کی ابتداء ہوئی تھی۔ فرمایا:-

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ. هُدًى لِّلنَّاسِ وَ
بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ (۲۱۲)

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا۔ وہ قرآن جو نوعِ انسان کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ایسی راہ بتاتا ہے جو علم و بصیرت پر مبنی ہے اور جو مستقل اقدار کے ایسے پجانے پیش کرتا ہے جو حق اور باطل کو الگ کر دیئے ہیں۔

(الفرقان اور القدر کی تفصیل اپنے مقام پر بیان کی جائے گی)

اس سے واضح ہے کہ اس پروگرام کے لئے رمضان کے مہینے کا انتخاب کیوں عمل میں لایا گیا۔ اس لئے کہ اس میں اس ضابطہ حیات کے نزول کی ابتداء ہوئی تھی جسے نظامِ زندگی بنانے کے لئے صیام کا تربیتی کورس تجویز کیا گیا تھا۔ اس لئے کہا:-

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ. وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ. يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ
الْعُسْرَ. وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ (۲۱۳)

سو جو شخص اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے چاہیے کہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ لیکن جو گھر پر تو ہو لیکن

مریض ہو۔ یا جو سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ یہ رعایتیں اس لئے ہیں کہ خدا تمہارے لئے آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ سختی اور تنگی پیدا نہیں کرنا چاہتا۔

(اس لئے تم دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لیا کرو)۔

اس آیت میں صیام کی غرض و غایت یہ بتائی گئی ہے :-

لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۱۸۶)

اور اس سے پہلے۔ تَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۱۸۵)

ان اصطلاحات کی تشریح کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ روزوں سے متعلق بقایا احکام کو بھی اسی جگہ بیان کر دیا جائے۔ یہ احکام (۱۸۶) میں یوں دیئے گئے ہیں۔ (درمیان میں جو آیت (۱۸۶) لائی گئی ہے، اسے بھی بعد میں پیش کیا جائے گا)۔

أَحَلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتُمُوا الصِّيَامَ إِلَىٰ اللَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرُبُوهَا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لِبَنِي الْإِنْسَانِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (۱۸۷)

یہ بھی سمجھ لو کہ روزہ دن ہی دن کا ہے۔ رات کے وقت نہ کھانے پینے کی ممانعت ہے نہ بیویوں کی طرف جوع کرنے کی۔ بیویوں سے جنسی اختلاط "قرب خداوندی" کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا (یہ بھی مسلک خانقاہیت کا پیداکرہ تصور ہے)۔ میان بیوی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایسا قریبی رشتہ کہ ان کے درمیان کوئی تیسرا حائل نہیں ہو سکتا۔ اللہ جانتا ہے کہ نفس انسانی کے تقاضے کیا ہیں اور مسلک رہبانیت میں انسان کے دل میں کس کس قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ خود اپنے آپ سے خیانت کرتا رہتا ہے (۱۸۷)۔ لہذا خدا کا قانون اس بارے میں انسانوں کی خود ساختہ حدود سے آگے بڑھتا ہے اور تمہارے دل میں جو وساوس پیدا ہو رہے تھے ان سے درگزر کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ تم رات کے وقت منشاء قانون خداوندی کے مطابق اپنی

بیویوں کے پاس بھی جاسکتے ہو، تا آنکہ صبح کی سفیدی رات کی سیاہی سے نمایاں ہو جائے۔ اس کے بعد رات تک روزہ پورا کرو۔ لیکن اگر تم اس ٹریننگ کے کسی خاص کورس کے لئے تربیت و اطاعت کے مراکز (مساجد) میں رُکے ہوئے ہو، تاکہ تم ابھی ہوئے معاملات کو اچھی طرح سلجھا سکو تو پھر تم ان راتوں میں بھی بیویوں سے اختلاط نہ کرو (اور اپنی توجہ کو پوری کیسوتی سے معاملات پیش نظر پر مرکوز رکھو) بس یہ ہیں وہ حدود جو اس باب میں قانونِ خداوندی نے مقرر کر دی ہیں۔ ان کی نگہداشت کرو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام و قوانین کو نمایاں طور پر بیان کر دیتا ہے تاکہ لوگ ان کی پوری پوری نگہداشت کر سکیں۔

اس میں **وَأَنْتُمْ عَلَيْكُمْ فِي الْمَسَاجِدِ** کے الفاظ مزید غور کے متقاضی ہیں۔ مساجد کے متعلق آیت (۲/۱۱۴) میں پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ ان سے مراد وہ مراکز ہیں جن میں اسلامی نظام کے متعلق جملہ امور طے پائے جاتے ہیں اور **عَلَيْكُمْ** کے متعلق کہا جا چکا ہے (زیر آیت (۲/۱۱۵) کہ اس کا مطلب ہوتا ہے وہ لوگ جو مملکت کے ابھی ہوئے معاملات کو سنوارنے کے لئے کیسوتی کے ساتھ مصروف غور و فکر ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صیام کے پروگرام میں عام شرکت کرنے والوں کو اس کی اجازت ہوگی کہ وہ (چاہیں تو) رات کو اپنے اپنے گھر چلے جایا کریں لیکن ایسے ارباب فکر و نظر اور اصحاب حل و عقد جن سے خصوصی مشاورت کی ضرورت ہوگی، انہیں عند الضرورت راتوں کو بھی روک لیا جائے گا۔ اسے اعتکاف سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہاں حدود اللہ کی اصطلاح بھی سامنے آتی ہے۔ یعنی پابندیوں کی لائنیں — مقصود تو یہی ہے کہ ان لائنوں (حدود) سے تجاوز نہ کیا جائے لیکن برنبلے احتیاط کہا گیا۔ **فَلَا تَقْرَبُوهَا** — ان سے ذرا فاصلے پر ہی رہو تو اچھا ہے تاکہ غلطی سے بغرض سے پاؤں ان کے باہر نہ جا پڑے۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم تعمیل احکام کے لئے کس قدر حکیمانہ انداز اختیار کرتا ہے!

اس آیت سے صیام سے متعلق احکام مکمل ہو گئے۔ انہیں بغرض تجدید یادداشت مختصر الفاظ میں دہرایا جاتا ہے۔

(۱) ماہِ رمضان کے پورے مہینے کے روزے فرض ہیں۔ آیت (۲/۱۸۵) میں خلیصہ کی (کا) اس کا تعین کر دیتی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ روزے تین دن کے یا نو دن کے ہیں وہ از روئے قرآن صحیح نہیں۔

(۲) ہر وہ شخص جو گھر پر موجود ہوا ورنہ درست و توانا ہو۔ اس پر روزہ فرض ہے۔ وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو بے مشقت روزہ نباہ سکیں۔ اس کا فیصلہ خود ان ہی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ان کی حالت کیسی ہے۔ ایسا شخص روزے کا فدیہ دے دے جو ایک محتاج کا کھانا ہے۔

(۳) مریض تندرست ہونے کے بعد اور مسافر گھر پر واپسی کے بعد باقی گنتی پوری کرے۔ یعنی اس مہینے میں سے جتنے روزے رہ گئے ہوں۔ ان کی گنتی پوری کر لے۔

(۴) جب رات کی تاریکی اور صبح کی روشنی متمیز ہو جائے اس وقت سے لے کر رات تک روزہ دار کے لئے کھانے پینے اور جنسی اختلاط کی ممانعت ہے۔

(۵) یاد رہے کہ دین کے نظام میں ماہِ صیام جہاد کی نیاری کے لئے تربیتی کورس اور ایک اجتماعی پروگرام ہے۔ اس میں عام مجاہدین کی دل کے وقت کی حاضری ضروری ہوگی لیکن اہل الشوریٰ کو راتوں کو بھی اپنے مراکز میں روک لیا جائے گا۔ اس پروگرام کی بہ حسنِ تمام تکمیل کے بعد وہ جشنِ مسرت منایا جائے گا جسے عید الفطر کہا جاتا ہے۔

(۱۰)

اس سلسلہ میں عقبہ تفصیلات سے پہلے ایک ضمنی نکتہ کا سامنے لانا بھی ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کی صراحت

کر دی ہے کہ اس کے نزول کا آغاز ماہِ رمضان کی ایک رات میں ہوا ہے جسے لیلۃُ القدر کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی یہ رات رمضان کے مہینے کی ایک رات ہے۔ قرآن مجید نے متعین طور پر نہیں بتایا کہ یہ رات کونسی ہے۔

ہم میں آج کل جو تیوہار رائج ہیں ان میں ایک تیوہار شبِ بارات کا بھی ہے۔ باقی تیوہاروں کے متعلق تو پھر بھی

کچھ نہ کچھ بتایا جاتا ہے کہ وہ کس واقعہ کی یاد میں منائے جاتے ہیں لیکن شبِ بارات (برات) کے متعلق

کچھ نہیں بتایا جاتا، بجز اس کے کہ یہ بڑی بابرکت رات ہے اور اس میں آنے والے سال کے

انسانی مقدرات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اور اسی سے اس تیوہار کی، لم کا سراغ مل جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے اپنی کتاب۔ شاہکار رسالت۔ کے آخری باب میں شرح و بسط سے لکھا ہے، جب اصل ایرانی

مسلمان ہوئے تو وہ اپنے سابقہ مذہب، مجوسیت کے عقائد، نظریات حتیٰ کہ رسوم و مناسک تک کو ساتھ لائے۔ اس

طرح قرآنی اسلام کی جگہ عجی اسلام وجود میں آگیا جو اب تک مروج ہے۔ تقدیر کا عقیدہ اور آتش پرستی مجوسی مذہب کے

بنیادی ارکان تھے۔ برآمدہ اہلِ مجوس کا ایک ممتاز خاندان تھا۔ مسلمان ہونے پر انہوں نے ایسی عظمت حاصل کی کہ عہدِ

عباسیہ میں منصبِ وزارت تک پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے قدیم مسلک۔ عقیدہ تقدیر اور آتش پرستی کے اظہار کے

لئے شبِ بارات کے جشن کی طرح ڈالی (لفظ بارات یا بارات کے معنی قسمت کے ہیں۔ ہم اپنے ہاں کہتے کہ۔ یہ میری بارات

میں ہی نہ تھا)۔ یہ تھی اس تقریب کی اور بخلِ حیثیت۔ لیکن یہ مسلمانوں کا ایک اہم تیوہار بن چکی ہے اور اس رات کی تقدیس

کے لئے کئی ایک روایات وضع کر لی گئی ہیں۔ روایات کی حد تک تو پھر بھی بات قابلِ فہم تھی، لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اس کی تائید میں قرآنِ کریم کی ایک آیت بھی پیش کر دی جاتی ہے۔ یعنی :-

حَمْدٌ - وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ - اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ -
فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيمٍ - (۲/۱۸۴)

خدا سے حمید و مجید کا ارشاد ہے کہ یہ ضابطہ ہدایت اپنی صداقت پر آپ شاہد ہے۔ اس کا آغاز ایک ایسی رات میں ہوا جو بڑی ہی مبارک ہے۔ یہ کتاب ہمارے اسی پروگرام کے مطابق نازل ہوئی جس کی رو سے ہم شروع ہی سے انسانوں کو ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اسی میں ان تمام امور کو جو آسمانی حکمت پر مبنی ہیں۔ غلط امور سے الگ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

ان آیات کو شبِ برات کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں جو کہا گیا ہے کہ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيمٍ - تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس رات ہر ایک کی قسمت کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

جب کہا جائے کہ قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي اُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ - نزولِ قرآن کی ابتداء رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی تو وہ رات جس میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا کوئی سی بھی ہو، اسے بہر حال رمضان کے مہینے کی ایک رات ہونا چاہیے۔ اور شبِ بارات شعبان کے مہینے میں آتی ہے۔ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ شعبان کے مہینے کی اس رات کو قرآنِ کریم لوحِ محفوظ سے آسمانِ اقل پر نازل ہوا اور پھر رمضان میں یہ آسمانِ اول سے دنیا میں نازل کیا گیا۔

یہ ہے نمونہ ان تفسیروں کا جو ہمارے ہاں زیبِ داستاں کے لئے وضع کی گئی ہیں۔ سچ کہا تھا اَقْبَالَ

نئے کہ :-

احکامِ ترے حق ہیں مگر اپنے مفتر
تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پانڈ

اس ضمنی نکتہ کے بعد آجائے صیام کی غرض و غایت کی طرف۔

(۱۰)

قرآنِ کریم نے صیام کی تین غایات بتائی ہیں۔ یعنی یہ بتایا ہے کہ اس پروگرام کا مقصد کیا ہے۔ اس سے ہوا کیا۔

لے تو اسی بات تھی اندیشہِ عجم جسے

لے پانڈ : مجوسیوں کی ایک مقدس کتاب -

صیام کی غایت

اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس سلسلہ میں اُس نے تین باتیں کہی ہیں: **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ** - (۱۸۳) **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ** (۱۸۴) اور **تُكْبِرُوا اللّٰهَ عَلَى مَا هَذَا مَكْرُ** (۱۸۵) بقویٰ کا مفہوم جلد اول ص ۵۷ آیت (۱۸۴) میں بتایا جا چکا ہے۔ یعنی راستے کے خطرات سے بچ کر چلنا۔ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنا۔ لہذا صیام کے پروگرام کا پہلا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم خطرات کا مقابلہ کرنے اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ پنہاری قوتِ برداشت بڑھ جائے گی اور تمہارے اندر ڈسپلن پیدا ہو جائے گا۔

اس کا دوسرا نتیجہ **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ** ہے۔ شکر کا مفہوم جلد دوم ص ۲۶۳ زیر آیت (۱۸۵) میں بیان ہو چکا ہے۔ اس کا مطلب ہونا ہے انسانی کوششوں کا بھرپور نتیجہ برآمد ہونا۔ لہذا کہا یہ گیلہ ہے کہ صیام کے پروگرام سے تم میں جو برداشت کی قوت اور ڈسپلن کی صلاحیت پیدا ہوگی، اس سے تمہاری کوششیں پوری طرح ثمر بار ہو جائیں گی۔

اس سے سوال یہ اُبھرا کہ کوششیں تو کسی مقصد کے حصول کے لئے ہوتی ہیں۔ وہ مقصد کیا ہے جس کے لئے یہ جانکاہ کوششیں کی جائیں گی اور وہ بھرپور نتائج مرتب کریں گی۔ اس مقصد کو **تُكْبِرُوا اللّٰهَ** کی نہایت جامع اصطلاح میں سمٹا کر بیان کر دیا۔ اصل یہ ہے کہ **تُكْبِرُوا اللّٰهَ** دین کی غایت اور جماعتِ مومنین (امتِ مسلمہ) کا منتہائے مقصد ہے۔ یہ امت جیتی ہے تو اس کے لئے، اس کی تمام جدوجہد ہوتی ہے تو اسی کے لئے اور مرنے والی ہے تو اسی کی خاطر۔

تُكْبِرُوا اللّٰهَ سے مراد ہے خدا کی کبریائی قائم کرنا۔ کبریائی سے کیا مراد ہے، اس کے متعلق جلد اول ص ۲۳ آیات

(۱۱۲-۱۱۳) میں تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے لیکن چونکہ زیرِ نظر آیت میں یہ بات پہلی دفعہ سامنے

آئی ہے اس لئے مختصر الفاظ میں اس کا دہرا دینا غیر از محل نہ ہوگا۔

خدا کی کبریائی

کبریائی کے معنی ہیں انتہائی بلندی۔ ایسا غلبہ اور تسلط جس کے اوپر کسی کا غلبہ اور تسلط نہ ہو۔ کلی اختیارات کا مالک۔ آخری اختیاراتی صاحب اقتدار مطلق (ABSOLUTE POWER) کا مالک۔ آجکل کی سیاسی اصطلاح میں اسے (SOVEREIGN POWER) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سورہ بقرہ میں ہے :-

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۱۱۲)

خارجی کائنات اور انسانی دنیا میں کبریائی اسی کی ہے۔ وہ انتہائی غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ حکمت پر

بنی ہے۔

خارجی کائنات میں خدا کے غلبہ اور اقتدار کے متعلق کسی ثبوت اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ اس میں ہر جگہ اس کے مقرر کردہ قوانین کی حکومت ہے، اور ایسی حکومت کہ اس سے بالاکسی کا اقتدار نہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کے ہم ہی نہیں مغرب کے وہ سائنسدان بھی معترف ہیں جو خدا کو بھی نہیں مانتے۔ وہ بھی اس کے معترف ہیں کہ کائنات میں جن قوانین کی کافرمانی ہے ان سے بالاکوئی قوانین نہیں۔ وہ ان قوانین کو قوانین فطرت کہہ کر پکارتے ہیں۔ ہم انہیں خدا کے مقرر کردہ قوانین فطرت کہتے ہیں۔ ان قوانین کی کبریائی سے انہیں بھی انکار نہیں۔ سو خارجی کائنات میں خدا کی کبریائی مسلم ہے۔ جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق ہے اس کے لئے بھی خدا نے قوانین متعین کر دیئے ہیں لیکن یہاں یہ قوانین از خود نافذ العمل نہیں۔ یہ انسانی ہاتھوں سے نافذ ہوں گے۔ ان قوانین کو انسانی دنیا میں نافذ کرنا خدا کی کبریائی کو ثبت (ESTABLISH) کرنا کہلاتے گا۔ یہ جماعتِ مومنین امتِ مسلمہ کا فریضہ ہے۔ اس کو خدا کی حکومت یا دین کا نظام کہتے ہیں جسٹونزبی کرم کو منصبِ نبوت پر سرفراز کرنے کے بعد (میرے اندازے کے مطابق) پہلا حکم یہ دیا گیا کہ قُمْ فَانْذِرْ اُٹھ اور لوگوں کو غیر اللہ کے قوانین کی عملداری کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔ وَرَبِّكَ فَكَبِّرْ (۱۱۲) اور اپنے نشوونما دینے والے کی کبریائی کو مستط اور ثبت کر۔ دوسری جگہ ہے۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (۱۱۳) اس کی کبریائی کا حقہ ثبت کر۔ اور اس کا مطلب یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ لَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ (۱۱۴) ”غلبہ اور اقتدار میں کوئی اس کا شریک نہ ہو“ خدا کی یہی کبریائی ہے جس کی بنا پر اُس نے اپنے آپ کو المتکبر (۱۱۵) کہا ہے۔ اور کسی جگہ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالُ (۱۱۶)۔ متعال کے معنی بھی انتہائی غلبہ اور اقتدار کا مالک ہیں۔ دیگر مقامات میں الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ بھی کہا ہے۔ (۱۱۷) د

نظامِ خداوندی کا غلبہ

(۱۱۳ د ۱۱۲)

سوال یہ سامنے آیا کہ خدا کے اس غلبہ و اقتدار کے ثبوت ہونے کا عملاً مفہوم کیا ہے۔ فرمایا کہ خَالِحُكُمْ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ (۱۱۸)۔ حکومت صرف خدا کی ہو۔ کیونکہ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ وہی ہے۔ اس لئے حکمِ الحاکمین وہی ہوگا۔ (۱۱۹)۔

بات یہاں تک بھی نظری اور اعتقادی سی دکھائی دیتی ہے۔ یعنی کیا خدا کو الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ یا احکم الحاکمین مان لینے اور کچھ دینے سے مقصد پورا ہو جاتا ہے؟ کہا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کَلِمَةُ اللَّهِ رَحِمَتْ الْعُلَمَاءَ (۱۲۰) بالادستی خدا کے قوانین کو حاصل ہو غلبہ و تسلط ان ہی کا ہو۔ حکومت انہی کی ہو۔ اس طرح کی حکومت

کہ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُونَ (۲۱)۔ دنیا کے ہر صاحب اقتدار سے پوچھا جاسکتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن خدا سے ایسا نہیں پوچھا جاسکتا۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے چار لفظوں میں کبھی عظیم حقیقت بیان کر دی ہے۔ سیاسی اصطلاح میں..... (SOVEREIGNTY) کی تعریف یہ ہے۔

(ACCOUNTABILITY TO NONE)

جو کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس قسم کا اقتدار مطلق صرف خدا کو حاصل ہو سکتا ہے اور کسی کو نہیں۔

کلمۃ اللہ کے متعلق کہا کہ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَعَدًا۔ لَا مَبْدَلَ لَکَلِمَتِہٖ۔ (۲۶) یہ قوانین خداوندی مکمل بھی ہیں اور غیر متبدل بھی۔ ان کے مجموعہ کا نام کتاب اللہ ہے (یعنی قرآن مجید) لہذا خدا کی حکومت، اس کے غلبہ و تسلط، اس کے اقتدار مطلق، اس کی کبریائی سے مراد ہوگا اس کی کتاب کی حکومت۔ لیکن ظاہر ہے کہ انسانی دنیا میں قوانین کی حکومت از خود قائم نہیں ہو سکتی۔ یہ بہر حال انسانوں کے ہاتھوں قائم ہوگی۔ جو جماعت اس کتاب کی حکومت قائم کرنے کی ذمہ داری لے گی اسے جماعتِ مومنین کہا جائے گا۔ اس لئے فرمایا کہ وَمَنْ لَّمْ یَحْکَمْ بِمَا أَنزَلَ اللّٰهُ فَأُولَٰئِکَ هُمُ الْکَافِرُونَ۔ (۳۹) (جو کتاب اللہ کی حکومت قائم کرتے ہیں انہیں مومن کہا جاتا ہے)۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ کافر کہلاتے ہیں۔ جب حکومت اس کتاب کے مطابق قائم ہوگی تو اسے الدین - یعنی نظامِ خداوندی کہہ کر پکارا جائے گا۔ حضراتِ انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد اسی دین کا قیام، اور دیگر ادیان (نظامِ ہائے زندگی) پر اس کا غلبہ و استیلا تھا۔

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِاِلْہٰدِیْ وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْہِرَ عَلٰی الدِّیْنِ کَلِمَہٗ۔ وَتُوْکِرَہٗ الْمُشْرِکُوْنَ۔ (۴۱)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو حق پر مبنی نظامِ حیات اور منابطہ ہدایت دے کر بھیجا تاکہ وہ نظامِ دنیا کے ہر باطل نظام پر غالب آجائے۔ خواہ یہ امر ان لوگوں پر کتنا ہی شاق کیوں نہ گزرے جو خالص قوانینِ خداوندی کی حکومت پسند نہیں کرتے۔

چونکہ یہی نظام ہے جو منشاءِ تخلیقِ انسانی کو پورا کر سکتا ہے۔ یعنی اس کے تابع انسان وہ کچھ بن سکتا ہے جو کچھ بننے کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے، اسی لئے، آخر الامر اسے دیگر نظامِ ہائے حیات پر غالب آکر رہنا ہے۔ اس لئے فرمایا۔

کَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي۔ (۵۹) خدا نے اس کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ اسے واجب قرار دے رکھا ہے کہ آخر الامر ایسا ہو کر رہے گا۔ خدا غالب آکر رہے گا۔ خدا کے غالب آنے کا عملی مفہوم یہ ہے کہ وہ رسول غالب آکر رہیں گے جن کا مقصد حیاتِ نظامِ خداوندی کو قائم کرنا ہے۔ (تفصیل جلد دوم ص ۳۲۰۔ آیت (۲/۱۸۷) میں گزر چکی ہے)۔

لیکن رسول اکیلا تو ایسا نہیں کر سکتا۔ اس پر وگرام کی تکمیل رسول اور اس کے رفقاء کی اجتماعی کوششوں سے ہوگی۔ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ۔ (۶۰)۔ یہ سب مل کر اس فریضہ کو سرانجام دیں گے۔ چنانچہ جس آیت میں کہا: کَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي۔ (۵۹) اس سے اگلی آیت میں یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ رسول اور جماعتِ مومنین حزبِ اللہ (خدا کی پارٹی) ہے اور یاد رکھو: فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ۔ (۶۱)۔ آخر الامر غلبہ حزبِ اللہ ہی کو ہوگا۔ یہی وہ جماعت ہے جس کے متعلق کہا کہ أَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ۔ (۶۲) اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۶۳)۔ چونکہ تم مومن ہو۔ یعنی خدا کی کبریائی کو ثابت کرنے کے ذمہ دار۔ اس لئے تم سب پر غالب رہو گے۔ جب قانونِ خداوندی کی حکمرانی ہوگی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو لوگ اپنی کبریائی (اپنی حکومت) قائم کرنے کا داعیہ لے کر اٹھیں گے وہ راستے سے ہٹا دیئے جائیں گے۔ سَأَصْرِفُ عَنْ الْيَتِيمِ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ (۶۴)۔ ”جو لوگ الحق کے بغیر دنیا میں اپنا تسلط قائم کرنا چاہیں گے انہیں نظامِ خداوندی جھاڑ جھنکار کی طرح راستے سے ہٹا دیگا۔ یہ ہے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔ کا عملی مفہوم۔

آپ نے غور فرمایا کہ خدا کی کبریائی نے سمٹ سمٹا کر عملی شکل کیا اختیار کی؟ وہ حکومت جس میں اقتدار مطلق کتابِ اللہ کو حاصل ہو، جن لوگوں کے ہاتھوں یہ حکومت قائم ہو اس احتیاط کی بنا پر کہ کہیں ان کے دل میں یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ انہیں حق کبریائی (حق حکومت) حاصل ہو گیا ہے انہیں تاکید کر دی کہ تم ساری دنیا سے پکار کر کہہ دو۔ اعلان کر دو۔ (PROCLAMATION) کے طور پر براڈ کاسٹ کر دو اور دن رات براڈ کاسٹ کرتے رہو کہ

اللَّهُ أَكْبَرُ!

دنیا میں کسی انسان کو کبریائی حاصل نہیں۔ حتیٰ کہ ہمیں بھی نہیں۔ کبریائی صرف خدا کے لئے ہے۔

اللہ اکبر کا مفہوم

حکمران ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

سروری زیا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے

آپ نے غور فرمایا کہ ”اللہ اکبر“ کس قدر انقلاب آفرین نعرہ ہے۔ کیسی فلک شگاف حقیقت ہے۔ کس قدر ”یاغیانہ“ اعلان ہے۔
— یعنی ہر انسان کے حق حکومت کے خلاف نعرہ بغاوت — وہ جو رسول اللہ کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں انسانیت جکڑی چلی آرہی ہے (۱/۲) تفصیل اس اجمال کی کتنی ہی وسیع اور طویل کیوں نہ ہو وہ سمٹ کر ان دو لفظوں میں آجاتی ہے کہ — اللہ اکبر !

اور یہ بتایا صیام کے پروگرام کا مقصد۔ یعنی اَللّٰهُ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ۔ تاکہ تم اس قابل ہو سکو خدا کے عطا کردہ (DIRECTIVES) کے مطابق وہ نظام قائم کر دو جس میں تم ساری دنیا میں اعلان کر سکو کہ کبریائی (حق حکومت) صرف خدا کو حاصل ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ دین میں صیام سے مفہوم و مقصود کیا تھا؟

اور پھر اس پر بھی غور فرمایا کہ مذہب میں اگر صیام کا مفہوم کیا رہ گیا ہے سچ کہا تھا کہنے والے نے کہ:-

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے

نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے (اقبالؒ)

(ضمناً) مروجہ روزوں میں کھانے پینے وغیرہ کی پابندی سے تو حکم خداوندی کی تعمیل بدیہی تھی۔ وہ کر لی گئی۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ کا مقصد اپنے آپ کو متقی پرہیزگار کہہ لینے سے حاصل کر لیا۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ کے متعلق کہہ لیا کہ جمعۃ الوداع درحقیقت بارگاہ خداوندی میں ہدیہ تشکر پیش کرنے کے لئے ہے کہ اس نے ہمیں روزے رکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ لِيَتَذَكَّرُوا اللّٰهُ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ۔ ذرا مشکل مرحلہ تھا۔ اس کے متعلق یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دلایا کہ یہ جو نماز عید میں چھ زائد تکبیریں کہی جاتی ہیں اس سے یہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے! اور ظاہر ہے کہ یہ مقاصد کفار کی حکومت میں بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ انگریزوں کی عملداری میں مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی یہی کہا تھا اور پھر تحریک پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء کا بھی یہی موقف تھا۔

صیام کے پروگرام کے علاوہ قرآن کریم نے حج کے پروگرام کے متعلق بھی فرمایا کہ اَللّٰهُ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ۔ (۲/۲)۔ یعنی اس کی غایت بھی خدا کی کبریائی ثبت کرنے کا عملاً پروگرام ہے۔ اس کی تفصیل حج سے متعلق احکام کے ضمن میں سامنے لائی جائے گی۔ اس وقت ذہن ایک اور نکتہ کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ وہاں یہ آیت حج کی تقریب پر جانور ذبح کرنے کے ضمن میں آئی ہے۔ اور اس سے پہلے کہا ہے۔ سَخَّرَهَا لَكُمْ۔ (۲/۲)۔ خدا نے ان جانوروں کو تمہارے زیرِ تسخیر کر دیا ہے۔ ذرا انگو رتصوّر کے سامنے لائیے اس نقشہ کو کہ ایک جانور کو آپ نے لٹایا ہوا ہے۔ اس کی گردن کو

فَرِحَ كَقَدْرَةِ اللَّهِ أَكْبَرُ پاؤں سے دبا رکھا ہے۔ وہ بالکل بے بس، ہر طرح سے آپ کے قابو میں ہے۔ چھری آپ کے ہاتھ میں ہے جو ابھی اس کی گردن پر چلا دی جائے گی۔ ذرا سوچئے کہ یہ تمام عناصر ایسے ہیں جن سے انسان کے دل میں اپنے بڑا ہونے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ عین اُس وقت کہا کہ چھری چلاتے وقت کہو :-

اللَّهُ أَكْبَرُ!

بڑا میں نہیں، بڑی خدا کی ذات ہے۔ کبر یا آئی اسی کے لئے ہے۔ اسی لئے وضاحت سے کہہ دیا کہ حلال جانور کا گوشت بھی تمہارے لئے حلال اسی صورت میں ہو گا کہ تم چھری چلاتے وقت اس کا اعلان کرو کہ کبر یا آئی میرے لئے نہیں، خدا کے لئے ہے۔

یہ سخا دین کا عطا کردہ تصور۔ اور اب جس طرح جانور ہمارے عام ”مذبح خانوں“ میں اور خود حج کی تقریب پر ذبح کئے جاتے ہیں، اس کے متعلق کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔

(۱)

صیام (روزوں کے احکام) کے بعد بات وہیں نہیں چھوڑ دی۔ اس کے بعد بھی کچھ کہا ہے۔ اور جو کچھ کہا ہے اس سے صیام کی پابندی کا مقصد اور بھی نتھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ کہا کہ تم نے کھانے پینے کے معاملہ میں ہمارے حکم کے مطابق کچھ پابندیاں اپنے اوپر عائد کی تھیں۔ جب تم اس طرح پابندیوں کے خوگر ہو گئے ہو تو ایک پابندی کا حکم اور بھی سنو! اور وہ یہ ہے کہ :-

**وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ إِلَى الْحُكْمِ
لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَ أَنْتُمْ
تَعْلَمُونَ۔ (۲)**

۲
۱۸۸

روزے کا مقصد یہ تھا کہ تم میں ایسا ضبط نفس پیدا ہو جائے کہ تم زندگی میں ہر جائز اور ناجائز میں تمیز کر سکو۔ اور تنہاری خواہش نفس یا مفاد پرستی کا تقاضا خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، ناجائز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔ (مثلاً) ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر مت کھاؤ۔ یا اگر معاملہ عدالت تک پہنچ چکا ہے تو ایسا نہ کرو کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ کرالو جس سے دوسروں کا مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے حالانکہ تم جانتے ہو کہ اس طرح حاصل کردہ مال و دولت کا انجام کیا ہوتا ہے؟

روزے میں کیا ہوا تھا؟ دن بھر روٹی اور پانی مٹھائے سامنے پڑے تھے۔ تم ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ وہی روٹی اور پانی جب افطار کے بعد تنہا سامنے آئے تو تم نے انہیں بلا تکلف کھا پی لیا۔ روٹی پانی تو وہی تھے۔ ان میں یہ فرق کیسے پیدا ہو گیا! اس طرح کہ دن میں انہیں ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ رات کو یہ پابندی اٹھا دی تھی۔

مال و دولت شکل و صورت کے اعتبار سے ہر جگہ اور ہر ایک کے پاس ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ ناجائز مال (رزقِ حرام) پر خدا کی طرف سے پابندی عائد ہوتی ہے اور جائز مال (رزقِ حلال) پر وہ پابندی نہیں ہوتی۔ تو کیا یہ بات تأسف انگیز نہ ہوگی کہ جس روٹی پر (روزے میں) پابندی ہو، تم اُسے تو نہ کھاؤ لیکن جس مال پر پابندی عائد ہو اسے ہڑپ کر جاؤ۔ مومن کا یہ شعار نہیں ہوتا۔ وہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ہر پابندی کی کیسا نگہداشت کرتا ہے۔ صیام کے پروگرام کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔

مالِ حرام

(۱)

احکامِ صیام کے درمیان ایک آیت اور تھی جسے ہم نے التواری میں رکھا تھا۔ اُسے اب سامنے لایا جاتا ہے۔

فرمایا:-

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ. أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ
إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ. (۲۴)

۲
۱۸۶

جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو۔ سو میں تو قریب ہوں۔ قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا کو

جب مجھ سے دعا مانگے۔ تو چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور یقین لائیں مجھ پر تاکہ نیک راہ پر آئیں۔

(ترجمہ مولانا محمود الحسنیؒ)

جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے اس آیت کا تعلق ”دعا مانگنے“ سے نہیں لیکن چونکہ آیت کے عام ترجمہ کی رو سے اسے ”دعا مانگنے“ کے لئے قرآنی سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے دعا کا مفہوم اسی مقام پر ذرا وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔ میں نے اسے اپنی کتاب ”کتاب التقدير“ میں شرح و بسط سے لکھا ہے۔ وہیں سے اسے مختصاً یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ بعد میں اس آیت کا صحیح مفہوم سامنے لایا جائے گا۔ (دعا کے متعلق ضمناً جلد اول ص ۳۸-۳۹ پر بھی لکھا جا چکا ہے)۔

ہمارے ہاں ”دعا مانگنے“ سے عام مفہوم یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے بارگاہِ خداوندی

دعا کا مفہوم میں التجا کرے۔ اسی کو خدا سے مرادیں مانگنا بھی کہا جاتا ہے۔ دعا کے اس مفہوم کے خلاف جو شکوک پیدا ہوتے اور اعتراضات ابھرتے ہیں، ہم پہلے انہیں سامنے لاتے ہیں۔

اگر عقیدہ یہ ہو کہ انسان کی زندگی میں جو کچھ ہوتا ہے، اسے خدا نے پہلے سے لکھ دیا ہوتا ہے، اور (قسمت کا لکھا) اٹل ہوتا ہے، تو پھر دعا کے کچھ معنی ہی نہیں رہتے۔ مثلاً ایک شخص کے متعلق پہلے سے طے شدہ ہے کہ اس نے اتنے دن بیمار رہ کر مر جاتا ہے۔ اب اس کے لئے، وہ خود یا اس کے متعلقین لاکھ دعائیں کریں، قسمت کے لکھے میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ وہ اتنے دن بیمار رہے گا اور اس کے بعد مر جائے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ نہیں، دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے تو پھر یہ عقیدہ غلط قرار پائے گا کہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے۔ جو فیصلہ بدل سکتا ہے۔ خواہ وہ دعا سے بدلے یا تدبیر سے۔ وہ

اس سے پیدا ہونے والے شکوک اٹل نہیں کہلا سکتا۔ اور اس کے ساتھ ہی، اس عقیدہ کی رُو سے، خود اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی عجیب سا تصور سامنے آتا ہے کہ پہلے اس نے ایک بات کا فیصلہ کر دیا اور کہہ دیا کہ ہمارا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ اس کے بعد وہ انتظار کرنے لگا کہ اگر اس شخص نے (یا اس کے متعلقین نے) ہم سے درخواست کی تو ہم اپنا فیصلہ بدل دیں گے، اور اگر یہ خاموش ہے تو وہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ سوچئے کہ خدا کے متعلق اس قسم کے تصور سے کیسے انکسار لاحق ہوتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ پہلے سے ہر بات طے شدہ نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہر معاملہ کا فیصلہ ساتھ کے ساتھ کرتا ہے تو اس سے اور بھی زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً زید اور بکر کا باہمی مقدمہ ہے جس کا فیصلہ عدالت نے کرنا ہے۔ زید حق پر ہے اور بکر جھوٹا ہے۔ دونوں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی دعا قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ مقدمہ کا فیصلہ لامحالہ ایک ہی کے حق میں ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کی دعا قبول ہوگی۔ اگر کہا جائے کہ اس کی دعا قبول ہوگی جو زیادہ گڑ گڑا کر دعا مانگے، تو ہو سکتا ہے کہ بکر زیادہ خشوع و خضوع سے دعا مانگے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا جو حق پر نہیں اور مقدمہ کا فیصلہ اس کے خلاف ہوگا جو حق پر ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا جو حق پر ہے (یعنی زید کی) تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زید دعا مانگتا تو پھر کیا ہوتا؟ پھر خدا بکر کا ساتھ دیتا کیونکہ اس نے دعا مانگی تھی اور زید نے دعا نہیں مانگی تھی؟

اور اگر کہا جائے خدا بہر حال، حقدار کا ساتھ دے گا، تو اول یہ چیز واقعہ کی خلاف ہے۔ ہمارے ہاں عدالتوں سے آئے دن ایسے فیصلے صادر ہوتے رہتے ہیں جو حق کے خلاف ہوتے۔۔۔ ہیں۔ حتیٰ کہ کئی بے گناہ بچپانسی کے تختے

پر چڑھا دیتے جاتے ہیں۔ لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ خدا حق کا ساتھ دیتا ہے تو اس صورت میں دعا کا پھر کوئی مطلب نہ رہا۔ حقدار دعا کرے یا نہ کرے، خدا بہر حال اس کا ساتھ دے گا۔ اور جو حق پر نہیں، وہ لاکھ دعائیں کرے، خدا اس کی سننے کا نہیں۔

اگر کہا جائے کہ خالی دعا نہیں بلکہ دعا کے ساتھ تدبیر بھی ضروری ہے۔ دعا سے تدابیر کامیاب ہو جاتی ہیں۔ تو اس سے پھر وہی دشواری لاحق ہو جاتی ہے۔ زید اور بکر دونوں تدبیر کرتے ہیں لیکن بکر اس کے ساتھ دعا بھی کرتا ہے اور زید دعا نہیں کرتا۔ تو کیا، اس صورت میں بکر کی تدبیر کارگر ہو جائے گی کیونکہ اس نے دعا بھی کی تھی اور زید ناکام رہ جائے گا کیونکہ اس نے دعا نہیں کی تھی (حالانکہ وہ حق پر تھا)۔

یہ ہیں وہ اشکال جو ہمارے ہاں کے مروجہ عقائد کی رُو سے، دعا کے سلسلہ میں ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ہمارے سامنے سورہ بقرہ کی وہ آیت آتی ہے جسے دعا اور اس کی قبولیت کے ضمن میں بنیادی طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن جس کا غلط مفہوم ان دشواریوں میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ..... (۱۸۶)

اور اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

(اے رسول! جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں جب

کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار (کو سنتا اور اسے) قبول کرتا ہوں۔

اس ترجمہ کی رُو سے دشواری یہ پیش آتی ہے کہ ہم روز دیکھتے ہیں کہ مظلوم و مقہور، غریب و نادار، بکیں و بے بس مصیبت زدہ لوگ گڑ گڑا گڑا کر خدا سے دعائیں مانگتے ہیں لیکن ان کی مصیبت رفع نہیں ہوتی۔ ان کی ساری عمر ظلم و ستم سہتے مصیبتوں میں کٹ جاتی ہے۔ لہذا، اس امر واقعہ کی موجودگی میں یہ کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ خدا ہر پکارنے والے کی پکار سنتا اور اس کی دعا قبول کرتا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ سنتا تو سب کی ہے لیکن کرتا وہی ہے جو دعا مانگنے والے کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ لہذا اگر کسی کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ جو کچھ ہوا ہے اس کے حق میں وہی بہتر تھا۔ لیکن یہ جواب (قطع نظر اس سے کہ ستم رسیدہ، مصیبت زدہ، برسرِ حق مظلوم انسان کا اس سے حقیقی اطمینان نہیں ہو سکتا، بڑے دور رس (تخریبی) نتائج کا موجب بن جاتا ہے ایک مظلوم انسان، ظالم کی دست درازیوں کے خلاف خدا سے دعا کرتا ہے اور اس کے بعد دیکھتا ہے کہ اس کی حالت ذرا بھی بہتر نہیں ہوئی، بلکہ اس مستبد ظالم کے ظلم میں اور اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے تو (مذکورہ بالا جواب کی رُو سے)

اسے سمجھ لینا چاہیے کہ ظالم کا ظلم اس کے حق میں بہتر اور خدا کی منشا کے عین مطابق ہے۔ اس لئے اسے اب نہ اس کے مظالم کے خلاف لب کشائی کرنی چاہیے اور نہ ہی اس سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچنی۔ غور کیجئے کہ اس قسم کے عقائد، ظالموں کو کس طرح بدگام چھوڑ دینے کا موجب بن جاتے ہیں۔ اس سے پہلے، ان ظالموں کے خلاف، مظلوموں کے دل میں (کم از کم) انتقام کے جذبات تو ابھرتے تھے اور ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے دستِ ظلم سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر سوچ لیتے۔ لیکن اس عقیدہ کے بعد تو صورت یہ ہو گئی کہ مظلوم نہ صرف ظلم و زیادتی کو دل کے پورے سکون کے ساتھ برداشت کرے گا بلکہ ظالم کے حق میں دعائے خیر بھی کرے گا کہ وہ اس کے لئے بہتری کے سامان پیدا کر رہا ہے! یا للعجب! آپ نے دیکھا کہ مستبد قوتیں، محکوموں اور زیر دستوں کے لئے کس کس قسم کے عقائد وضع کرتی رہتی ہیں۔ تاکہ وہ انہیں ذبح کریں اور یہ ان کے شکر گزار ہوں۔

اس سے بھی آگے بڑھتے تو یہ عقیدہ سامنے آتا ہے کہ خدا ہر ایک کی نہیں سنتا۔ وہ اپنے مقبول بندوں کی دعائیں

قبول کرتا ہے۔ اسی عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ آپ کو ہر

”حضرت صاحب“ کے آستانِ عالیہ پر مصیبت زدہ

خدا اپنے مقبول بندوں کی دعائیں سنتا ہے

اور آفت رسیدہ لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے جو گڑ گڑا، گڑ گڑا کر، ہاتھ باندھے، اور اکثر، ان کے پاؤں چومتے درخواست کرتے ہیں کہ یا حضرت! میرے لئے دعا کیجئے ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ برباد ہو جاؤں گا اور یہ سلسلہ ”حضرت صاحب“ کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا، ان کی وفات کے بعد جسے وفات نہیں بلکہ وصال کہا جاتا ہے، یعنی ان کا اپنے محبوب — خدا — سے جا کر مل جانا، ان کے مزار شریف سے وابستہ ہو جاتا ہے، جہاں ان سے مسجدوں میں گر گر کر التجائیں کی جاتیں، اور مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے تو جواب میں کہا جاتا ہے کہ ہم گنہگار بندے ہیں اس لئے ہماری خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ یہ حضرات مقررین بارگاہِ خداوندی ہیں، اس لئے خدا ان کی بات مانتا ہے۔ (یہ عقیدہ بھی رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی قرآن مجید کی وہ آیت بھی پڑھی جاتی ہے جسے ہم نے اوپر درج کیا ہے یعنی وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ - أُجِيبُ دَعْوَةَ السَّاعِدِ إِذَا دَعَانِ.... ”جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں“

ظاہر ہے کہ خدا کے مقررین کی وساطت سے خدا تک درخواست پہنچانے کا یہ عقیدہ ہمارے

السُّلْطَانُ ظَلَّ اللَّهُ عَلَى الْأَرْضِ كَاعْقِيهِ

دور ملکیت کی تخلیق ہے۔ اس دور میں ذہنوں میں یہ بٹھایا گیا کہ السلطان ظل اللہ علی الارض۔ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جس قسم کا سایہ زمین پر دیکھا گیا اسی قسم کی اس کی ”اصل“ آسمان پر تصور کر لی گئی۔ اس سایہ کی رُو سے، خدا کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ ظاہر ہے۔ یہاں کے بادشاہوں کی طرح وہ (شاہنشاہ حقیقی) بھی ایک آمر مطلق سمجھا جاتا ہے۔ نہ کسی قاعدے کا پابند نہ قانون کا۔ جسے چاہا بکڑ لیا جسے چاہا نواز دیا۔ جسے چاہا بخش دیا جسے چاہا باندھ لیا۔ اسی سلسلہ میں بادشاہ کا دربار سامنے آیا جس میں سب سے پہلے حاجب و دربان کھڑے ملتے تھے۔ پھر اہل دربار میں سے مصاحب، امراء، وزراء۔ اور پھر مقربین بارگاہ سلطانیہ سامنے آتے تھے۔ کسی عام آدمی کے لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اپنی درخواست براہ راست سلطان المعظم تک پہنچا سکے۔ اس کے لئے اسے مقربین کے وسیلے کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہی نقشہ ہم نے دربار خداوندی کا متعین کر لیا۔ اس کی رُو سے، خدا تک بات پہنچانے کے لئے اس کے مقربین کی وساطت ضروری قرار پائی۔ یہ ہے وہ ضرورت جس کے پیش نظر خدا تک دعا پہنچانے کے لئے کسی ”حضرت صاحب“ کے وسیلہ کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ ہماری درخواست بھی خدا تک پہنچاتے ہیں اور اس کے ساتھ سفارش بھی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی بات مان لیتے ہیں اور ہماری درخواست (دعا) منظور ہو جاتی ہے۔ درخواست کے ساتھ کچھ نذر نیاز بھی دینی پڑتی ہے، بعینہ جس طرح بادشاہوں کے حضور نذرانہ گزارنا پڑتا ہے یا ان کے مقربین کی ”خدمت“ کرنی پڑتی ہے۔

یہ ہے خدا کا وہ تصور جو شہنشاہیت نے ہمارے ذہنوں پر مرتسم کیا اور جس نے رفتہ رفتہ مقدس عقائد کی شکل اختیار کر لی۔ مرور زمانہ سے یہ عقائد اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئے کہ اب اگر ان کے خلاف کوئی بات کہی جائے تو ارباب شریعت کی طرف سے اس پر کفر والحاد کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں، اور دامن طریقت سے وابستگان پر کیکپی طاری ہو جاتی ہے کہ معلوم ”حضرت صاحب“ کی طرف سے کیسا غضب نازل ہو جائے گا۔ حالانکہ ان حضرات کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے کہ عِبَادُ اَمَّا لَكُمْ (۱۹۹) وہ تمہارے ہی جیسے (انسان) خدا کے بندے ہیں۔ اور جن مزاروں پر جا کر مرادیں مانگی جاتی ہیں، یا انہیں خدا تک بات پہنچانے کا واسطہ قرار دیا جاتا ہے ان کے متعلق کہا ہے کہ تم انہیں لاکھ پکارو، وہ تمہاری بات ہی نہیں سن سکتے۔ اور اگر (بقرضِ محال) وہ سن بھی لیں تو اس کا جواب ہی نہیں دے سکتے (۲۰۵)۔ تم انہیں جو کچھ پکار پکار کر کہتے ہو، وہ اس سے قطعاً بے خبر ہوتے ہیں۔ (۲۱۰) انہیں تو خود اپنے متعلق بھی اتنا علم نہیں ہوتا کہ اَيَّانَ يُبْعَثُونَ۔ (۲۱۱) وہ کب اٹھائے جائیں گے، جو اپنے حال سے بھی بے خبر ہیں وہ تمہاری کیا سنیں گے اور کیا مدد کریں گے؟

اب آئیے اس سوال کی طرف کہ دعائیں قبول کن لوگوں کی ہوتی ہیں اور کس طرح ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے

اس آیت کو لیجئے جس کا ایک حصہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ یعنی ”جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں ان کے

دعائیں کس کی قبول ہوتی ہیں

قریب ہوں۔ ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں“ اس کے بعد ہے کہ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ۔ (۲۶) ان سے کہو کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری مانگ پوری ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم میری راہنمائی (قوانین) کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھو، اور میری اطاعت کرو (میری باتوں کا جواب دو) اس طرح کامیابی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے آجائے گا۔

سورہ شوریٰ میں ہے۔ يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۲۲)۔ ”دعائیں قبول ان کی ہوتی ہیں جو ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کریں“۔ یعنی ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی اور فطری نتیجہ کامیابی ہوتا ہے اور یہی دعا سے مقصود ہوتا ہے۔

سورہ مومن میں ہے کہ تم مجھے پکارو۔ میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ لیکن اتنی بات سن رکھو۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ۔ (۲۶)۔ جو لوگ میری اطاعت سے سرکشی اختیار کریں گے (ان کی دعائیں قبول نہیں ہوں گی) وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ سورہ اعراف میں خدا کو پکارنے کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ اِنَّهُ لَا يَجِبُ الْمُعْتَدِيْنَ۔ (۵۵)۔ وہ انہیں پسند نہیں کرتا جو حدود سے تجاوز کر جائیں۔ یاد رکھو! جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت سے انکار کریں، ان کی دعائیں بے کار ہو جاتی ہیں (۲۶)۔ دعاؤں کی مقبولیت کے لئے ایمان شرطِ اول ہے اور ایمان کے متعلق بھی سن رکھو کہ ”انہی لوگوں کے متعلق سمجھا جائے گا کہ وہ فی الواقعہ ایمان لائے ہیں جن کی کیفیت یہ ہو کہ جب ان کے سامنے قوانینِ خداوندی پیش کئے جائیں تو وہ سر تسلیم خم کر دیں اور پھر خدا کی صفتِ ربوبیت کو وجہِ حد و ستائش بنانے کے لئے پوری پوری جدوجہد کریں اور کسی حالت میں بھی اطاعتِ خداوندی سے سرکشی اختیار نہ کریں۔ وہ لوگ اس جدوجہد میں راتوں کی نیند تک بھی اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ يٰۤاَعُوْذُ رَبِّهِمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ (۳۲)۔ وہ اس طرح بیم و رجاء دونوں حالتوں میں خدا کو پکارتے ہیں اور جو کچھ خدا نے انہیں دے رکھا ہوتا ہے، اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔

سورہ آل عمران میں اسی حقیقت کو بڑے دلآویز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم متعلقہ آیات کا مفہوم مفہوم القرآن

سے پیش کرتے ہیں۔ فرمایا:-

جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیے ہیں ان کے لئے کائنات کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں، قوانینِ خداوندی کی حکیمیت اور ہمہ گیریت کی نشانیاں ہیں۔

ان صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے، بیٹھے، لیٹے قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کے تخلیقی پروگرام پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے بعد، علیٰ وجہِ البصیرت پکاراٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارِ گہ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرے کے لئے۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو کسی شے کو بے مقصد اور بلاغرض و غایت پیدا کر دے۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم، علمی تحقیقات اور عملی تجارب کے بعد، اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب سے محفوظ رہیں۔

جو قومیں اس قسم کی تحقیقات ذکر نے سے اشیائے کائنات کی نفع بخشियों سے محروم رہتی ہیں، ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں ٹھلس جاتی ہیں اور وہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی ذلیل و خوار قوموں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا

لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں دنیا کی تباہی کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ بلکہ نوعِ انسان کی رومیت عامہ کے لئے صرف میں لایا جائے۔ ابا کچھ وہی قوم کر سکتی ہے جو خدا کی رہنمائی پر یقینِ محکم رکھے۔

لہذا، ان اربابِ عقل و بصیرت کی پکار یہ بھی ہوتی ہے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے ایک پکارنے والے کو یہ کہنے سنا کہ آؤ! اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی صداقت پر ایمان لاؤ۔ ہم نے اس کی دعوت پر لبیک کہا اور خدا پر ایمان لے آئے۔

اس کے بعد ان اربابِ علم و ایمان کے سینے میں اس قسم کی آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں (وہ دعائیں مانگتے ہیں) کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم سے اگر کوئی بھول چوک ہو جائے تو اس کے مضرت رساں نتائج سے ہمیں محفوظ رکھنا اور ہماری چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں اور تدبیری غلطیوں کے اثرات مٹاتے رہنا اور ہمارا انجام ان لوگوں کی رفاقت میں کرنا جن کے سامنے زندگی کی وسعت اور کشادگی کی راہیں کھل چکی ہوں۔

لے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے (وحی کی رُوسے) جن خوشگوریوں اور سرفرازیوں کا وعدہ کیا ہے ان سے ہمیں بہرہ یاب کرنا اور ایسا ذکرنا کہ اعمال کے ظہورِ نتاج کے وقت ہم دنیا کی نکاہوں میں ذلیل و خوار ہو جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تو وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔ (۱۸۹-۱۹۳)

دعائیں مانگنے والوں کی خصوصیات کو بھی آپ نے دیکھ لیا اور ان کی دعاؤں کو بھی۔ اب خدا کی طرف سے اس کا جواب سنئے۔ ارشاد ہوا:-

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّمَّنْ ذَكَرْتُ أَوْ أَنتِثُ (۱۹۳)

خدا نے ان کی دعاؤں کا یہ جواب دیا کہ (ہم نے تمہاری دعاؤں کو سُٹن لیا ہے۔ لیکن تم یا درکھو کہ) ہم کسی کام کرنے والے کی محنت کو ضائع نہیں کرتے۔ وہ مرد ہو یا عورت۔ ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے خدا کی طرف سے دعاؤں کا جواب اور ان کی قبولیت کی شرط۔

(۱)

یہ تو سچی عام مومنین کی کیفیت۔ اب ذرا حضرات انبیاء کرامؑ کی دعاؤں کی قبولیت کی صورت بھی ملاحظہ کر لیجئے تاکہ بات اور بھی واضح ہو جائے۔

حضرت نوحؑ کے متعلق کہا کہ جب ان کی قوم نے ان کی سخت مخالفت کی تو نادانانہ اُس نے ہمیں پکارا۔ فَلَنَعْمَ الْمُجِيبُونَ۔ (۲۱۰)۔ تو ہم دعاؤں کا بہترین جواب دینے والے ہیں۔ ان کی دعا کا کیا جواب دیا گیا تھا بغور سے سنئے۔ فَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ أَنِ اصْنَعِ الْفُلَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔ (۲۱۱) ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ تم ہماری زیر نگرانی، ہماری ہدایت کے مطابق ایک کشتی بناؤ۔ یعنی حضرت نوحؑ کی دعا کے جواب میں یہ نہیں کہا گیا کہ تم آرام سے بیٹھے رہو۔ ہم تمہاری حفاظت کا انتظام کر دیں گے۔ انہیں وہ تدبیر بتا دی جس سے وہ اور ان کی جماعت آنے والے سیلاب سے محفوظ رہ سکیں۔

جب حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ وہ فرعون کی طرف جائیں اور بنی اسرائیل کو اس کے پیچھے استبداد سے نجات دلائیں، تو انہوں نے اس مہم کی سختی اور اس میں پیش آنے والے خطرات کے احساس سے خدا سے متعدد تائیدی اسباب ذرائع کی دعا کی تاکہ وہ ان کی تقویت کا موجب بنیں۔ اس کے جواب میں کہا۔ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يٰمُوسٰی (۲۱۲) اے موسیٰ! جو کچھ تو نے مانگا ہے ہم نے تجھے عطا کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب خدا نے اس طرح کہہ دیا ہو کہ ہم نے تیری دعا قبول کر لی اور تیری مانگ پوری کر دی ہے تو پھر کچھ کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن اس کے

ساتھ ہی ان سے کہہ دیا کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوكَ بِاٰیٰتِنَا فِیْ ذٰكِرٰتِنَا (۲۸۶)۔ تم دونوں حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی (حضرت ہارونؑ) فرعون کی طرف جاؤ اور یاد رکھو! جو پروگرام تمہیں دیا گیا ہے اس کے بروئے کار لانے میں ذرا سی بھی سستی نہ کرنا۔ دوسری جگہ ہے۔ قَالَ قَدْ اُجِیْبْتُ دَعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِیْمَا وَ لَا تَتَّبِعِیْ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۲۸۷)۔ ”خدا نے کہا کہ میں نے تمہاری دعا کو قبول کر لیا ہے اب تم اس پروگرام پر جم کر کھڑے ہو جاؤ اور یاد رکھو، تم کبھی اُن لوگوں کا اتباع نہ کرنا جو حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

اسی طرح جب حضرت موسیٰؑ نے یہ دعا کی کہ ان کی امت کو دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں عطا کر دی جائیں تو جواب میں کہا گیا کہ ایسا ہو جائے گا بشرطیکہ یہ لوگ نبی آخر الزمان کا اتباع کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری حسرت ساری کائنات پر چھائی ہوتی ہے لیکن انسانوں میں سے وہ انہی کو ملتی ہے جو ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں۔ ان کی پوری پوری نگہداشت کریں اور دوسروں کے لئے سامانِ نشوونما مہیا کریں۔ (۱۵۷-۱۵۸)

حضرت زکریاؑ نے بیٹے کے لئے دعا کی تو انہیں اس کی خوشخبری اسی وقت دے دی گئی۔ لیکن یہ دعا پوری اس طرح ہوئی کہ اَصْحٰلُكُمْ اِلَیْهِ رَٰجِعُوْنَ (۲۸۹)۔ ان کی بیوی میں جو نقص تھا جس کی وجہ سے ان کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی، اس کی اصلاح ہو گئی تھی

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ جن دعاؤں کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ ہم نے انہیں قبول کر لیا، ان کے سلسلہ میں بھی یہ تاکید کر دی کہ ان کی کامیابی کے لئے جن طبعی اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے انہیں ہم پہنچایا جائے اور اپنے پروگرام پر ثبات و استقامت سے عمل پیرا ہوا جائے۔ یہ نہیں کہ دعا مانگ لی اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ اسی قسم کی دعاؤں کے متعلق سورہ رعد میں ہے کہ تم ذرا اس پیاسے کا تصور سامنے لاؤ جو اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے دریا کے کنارے کھڑا ہے۔ کیا ایسے شخص کی پیاس بجھ جائے گی؟ کبھی نہیں۔

لب دریا پیاسا | پیاس اس کی بجھے گی جو آگے بڑھ کر پانی سے چلو بھرے اور اسے پی لے۔ پانی کیٹھ

ہاتھ پھیلا کر کھڑے رہنے سے قیامت تک پیاس دور نہیں ہو سکتی۔ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ (۲۹۰)۔ جو لوگ قانونِ خداوندی کی صداقت سے انکار کرتے ہیں ان کی دعائیں رائیگاں جاتی ہیں۔

اس مقام پر کہا جائے گا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ اپنی جگہ بجا اور درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خدا کی خدائی میں مظلوموں اور مصیبت کے ماروں کی کوئی داد فریاد نہیں! ان کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں۔ ان کی پریشانیوں کا کوئی علاج نہیں۔ ان کی دعاؤں کا سننے والا کوئی بھی نہیں؟ قرآن

مظلوموں کی دعائیں کیسے سُنی جاتی ہیں

ان سوالوں کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کی دعائیں سُنی جاتی ہیں اور مستبُول بھی کی جاتی ہیں۔ لیکن اس کا طریق کچھ اور ہے۔ وہ طریق کیا ہے، اسے غور سے سُنئے۔

برسہا برس کی محنت شاقہ اور تنگ و تازِ پیہم کے بعد مدینہ میں جماعتِ مومنین کی اپنی مملکت قائم ہو گئی لیکن جو مسلمان ہنوز مکہ میں محصور تھے، قریش کی طرف سے ان پر مظالم کا سلسلہ شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ اس انتہائی بے کسی اور مظلومیت کے عالم میں انہوں نے خدا سے دعا کی کہ ”بارالہا! ہماری مدد کر اور ہمارے لئے ان ظالمین کے جور و ستم سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت پیدا کر دے“ انہوں نے خدا سے دعا کی، اور آپ کو معلوم ہے کہ خدا نے کیا کیا؟ خدا نے مدینہ کی جماعتِ مومنین سے کہا کہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ اے جماعتِ مومنین! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں اُٹھتے۔ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ کیا تم سنتے نہیں کہ مکہ کے مظلوم و مقہور، بے بس، کمزور و ناتواں، مرد و عورتیں، بچے کس طرح گڑ گڑا کر ہم سے فریاد کر رہے ہیں کہ بارالہا! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والوں نے اس قدر ظلم و استبداد پر کمر باندھ رکھی ہے۔ اے مملکتِ اسلامی کے علمبردارو! کیا تم ان کی ان دعاؤں کو نہیں سُن رہے؟ اور اگر سُن رہے ہو تو پھر کس بات کے انتظار میں ہو۔ تم ان کی امداد کے لئے اُٹھتے کیوں نہیں۔ تم نہیں سُن رہے کہ وہ ہم سے کس الحاح و زاری سے کہہ رہے ہیں کہ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصْرًا۔ (پھر) وہ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ تو اپنی طرف سے ہمارے لئے کوئی یار و مددگار پیدا کر۔ کوئی حامی و ناصر بھیج۔

غور کیجئے، مکہ کے مظلوم خدا سے فریاد کرتے ہیں۔ خدا کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ براہِ راست ان کی امداد کر دیتا اور انہیں دشمنوں سے نجات دلا دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اس مملکت، اس حکومت، اس نظام سے کہا جو اُس کے نام پر، اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوا تھا کہ تم ان کی پکار کا جواب دو۔ تم ان کی مدد کے لئے اُٹھو۔

یہ ہے مظلوموں کی دعاؤں کے قبول ہونے کا صحیح طریقہ۔ یہی جماعتِ مومنین جو اب مدینہ میں تھی، تیرہ برس تک قریش کے بے پناہ مظالم کا تختہ مشق بنی رہی۔ انہوں نے اس زمانے میں خدا سے کچھ کم دعائیں تو نہیں مانگی ہوں گی؛ لیکن چونکہ اس وقت دنیا میں کوئی نظام ایسا نہیں تھا جو مظلوموں کی

مظلوموں کی دعائیں اسلامی مملکت سنتی ہے [وادرسی کے لئے وجود میں آیا ہو اس لئے ان کی مدد کا

کوئی سامان نہ ہو سکا۔ ان سے کہا جاتا رہا کہ تم بہت و استقلال سے کام لے کر اپنے پروگرام پر چبے رہو۔ ایک دن تمہاری حکومت قائم ہو جائے گی تو ان مشکلات کا حل خود بخود مل جائے گا اور اس طرح تمہاری اپنی مشکلات ہی حل نہیں ہو جائیں گی، تم ان مظلوموں کی امداد کے قابل بھی ہو جاؤ گے جو ہم سے (خدا سے) نصرت و اعانت کی دعائیں مانگیں گے۔ دیکھیے اس حقیقت کو قرآن کریم نے دوسری جگہ کس بلیغ انداز سے بیان کیا ہے۔ فرمایا۔ اَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاہُ وَيَكْثِفُ السُّوءَ۔ کہو! کہ وہ کون ہے جو قلبِ مضطر کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو دور کر دیتا ہے؟ وہ اس کے لئے کیا کرتا ہے۔ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ (۲۱)۔ ”وہ تمہیں حکومت و مملکت عطا کر دیتا ہے۔“ یہ ہے طریقِ خداوندی جس سے مظلوموں کی مصیبتیں رفع ہوتی ہیں۔ (واضح رہے کہ یہ حکومت بھی محض دعائیں مانگنے سے عطا نہیں ہو جاتی۔ بہ ان کے ایمان و اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔) (۲۲)

دوسرے مقام پر اسی جماعتِ مومنین کے متعلق کہا ہے۔ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّہُمْ وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ وَاَمْرُهُمْ شُورٰی بَيْنَہُمْ وَاَمْرًا مِّنْہُمْ يَنْفَعُوْنَ (۲۳)۔ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس سے احکام و قوانین کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں۔ انہی کی روشنی میں اپنے امور مملکت باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں اور جو سامانِ زلیات انہیں خدا نے دے رکھا ہو، اسے رفاہِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہاں بھی (مشاورت باہمی) سے اشارہ اسی نظامِ مملکت کی طرف ہے جسے مونیہ سے ظلم اور نا انصافی دور کرنے کے لئے متشکل کیا جاتا ہے۔ یہی وہ طریق تھا جس سے بنی اسرائیل کو، قومِ فرعون کے مظالم سے نجات دلائی گئی تھی۔ سورہ قصص میں ہے کہ

فرعون اپنی مملکت میں دھاندلی کی انتہا کر رکھی تھی۔ وہ اپنی قوت کو مستحکم رکھنے کے لئے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا اور اس طرح ان میں سے ایک پارٹی (بنی اسرائیل) کو کمزور سے کمزور کر کیے چلا جاتا تھا (کہ وہ ابھرے نہ پائیں) اس کے لئے وہ کرنا یہ کھا کہ اس قوم کے اس افراد کو جن میں اُسے جو سردار مانتے تھے، ذلیل و خوار کر کے غیر مؤثر بنا دینا، اور جو ان جو سروں سے عاری ہوتے انہیں ابھارنا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس طرح وہ ان میں

ناہمواریاں پیدا کتے چلا جاتا۔

اس سرکشی اور فساد انگیزی کے پیش نظر ہمارے قانون مکافات کا فیصلہ یہ تھا کہ جس قوم کو وہ اس قدر کمزور کیے جا رہے تھے، اسے اپنی نعمتوں سے نوازا جائے۔ یعنی انہیں ملک میں سرداری اور سروری عطا کر دی جائے اور انہیں

ایک ایسے خطہ زمین کا مالک بنا دیا جائے جہاں ان کی اپنی حکومت ہو۔ (۲۸-۲۹)

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ مظلوموں اور بے کسوں کو خدا سے دعا مانگنے کی ضرورت کہاں اور کب پیش آتی ہے۔ اس کی ضرورت پیش آتی ہے اس غلط معاشرہ میں جہاں کوئی بات قاعدے اور قانون کے مطابق نہ ہوتی ہو۔ ہر جگہ

دھاندلی ہو رہی ہو۔ کسی حقدار کو اس کا حق نہ ملے۔ جہاں

مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہ ہو۔

دعا مانگنے کی ضرورت کب پڑتی ہے؟

جہاں اس شخص کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے۔ جہاں غنڈہ گردی ایسی ہو کہ شریف انسانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو جائے۔ جہاں افراتفری اور فساد نفسی کا یہ عالم ہو کہ جو کہیں اتفاق سے گر جائے سب اُسے روندتے چلے جائیں، کوئی اس کے اٹھانے کی فکر نہ کرے۔ جہاں کسی کو اس کا خیال نہ ہو کہ کس کے بچے بھوکے ہیں اور کس کے تن پر کپڑا نہیں۔ جہاں مفلس مریض اس لئے پن آتی موت مر جائے کہ اس کے پاس علاج کے لئے پیسہ نہیں تھا، اور بیوہ ماں اپنے جوان بیٹے کی موت پر اس فکر میں گھلی جا رہی ہو کہ اسے گور و کفن کیسے مل سکے گا اور اب میرا کیا بنے گا۔ یہ ہے وہ معاشرہ جہاں بے کسوں اور ناداروں کو قدم قدم پر خدا سے دعائیں کرنی پڑتی ہیں کہ اس کے سوا ان کے سامنے امید کا کوئی اور سہارا نہیں ہوتا۔ یہی ہے وہ معاشرہ جس سے متاثر ہو کر کہنے والے نے کہا ہے کہ:۔

جو نہیں آشنا مصیبت کا درد و غم کا نہ جو شکار ہوا
جس پر کوئی کبھی نہ وقت پڑا جو نہ اٹھا اٹھ کے رات کو رو یا

وہ نہیں جانتا دُعا کیا ہے؟

اسے معلوم کیا خدا کیا ہے؟

جب معاشرہ صحیح خطوط پر (مستقل اقدار خداوندی، پر متشکل ہو تو اس میں ہر بات کا فیصلہ قاعدے اور قانون کی مطابق ہونا ہے ہر حقدار کو اس کا حق ملتا ہے اور بغیر کسی پریشانی اور تردد کے ملتا ہے۔ نہ کسی پر کوئی ظلم ہونا ہے نہ دھاندلی۔ اس میں ہر فرد کی ضروریات زندگی ملکیت کی طرف سے پوری ہوتی چلی جاتی ہیں، اس لئے اس میں نہ کوئی محتاج

ہوتا ہے نہ بے نوا۔ اس میں نہ کوئی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے نہ بے سہارا۔ ایسے معاشرہ میں کسی کو خدا سے وہ کچھ مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی جس کے لئے ہم قدم قدم پر اپنے آپ کو محتاج اور لاچار پاتے اور خدا سے التجائیں کرتے ہیں۔ اس حقیقت کبریٰ کو حضرت عمر فاروقؓ نے ایسے بلیغ اور عمیق انداز میں بیان کیا ہے کہ جب بھی اس پر غور کیا جائے، روح وجد میں آجاتی ہے۔ آپؓ نے فرمایا تھا کہ لوگو! سن رکھو :-

مجھے خلافت کا فریضہ اس لئے سونپا گیا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دوں۔

اللہ اکبر! کتنی بلند حقیقت کو کیسے سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے مطلب واضح ہے کہ قیام خلافت کا مقصد یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کی کوئی ضرورت رُک نہ رہے جب کیفیت یہ ہوگی تو پھر کسی شخص کو اپنی ضروریات کے لئے خدا سے دعا کرنے کی حاجت ہی نہیں رہے گی۔ اور اگر کوئی شخص اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے دعا کرتا پایا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے فریضہ کی سرانجام دہی میں فاصر رہا ہوں اور وہ شخص میرے خلاف گویا خدا سے شکایت کر رہا ہے۔ اس لئے مجھے فوراً احتسابِ خویش کرنا ہوگا اور اس امر کی کوشش کہ میری شکایت بارگاہِ خداوندی تک نہ پہنچے پاتے ضرورت مند کی ضرورت اس سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔

یہ ہوتی ہے اس معاشرہ کی کیفیت جو وحی کی راہنمائی میں متشکل ہوتا ہے۔ اس میں کسی کو اپنی انفرادی ضروریات

کے لئے خدا سے کچھ مانگنا ہی نہیں پڑتا جسے سب کچھ از خود

مل رہا ہو، اسے مانگنے کی کیا ضرورت ہوگی! یہی وجہ

مومنین کی سب دعائیں اجتماعی ہوتی ہیں

ہے کہ قرآن کریم میں مومنین کی جس قدر دعائیں مذکور ہیں سب اجتماعی ہیں، انفرادی نہیں۔ یہ اجتماعی دعائیں کس مقصد کے لئے کی جاتی ہیں، اس کا اندازہ خود ان دعاؤں سے لگ سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے مومنین کی چند ایک دعائیں :-

(۱) اے رب العالمین! ہمیں زندگی کی سیدھی اور سہوار راہ دکھا دے۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تیرے صحابہ کرم

کی بارش ہوئی تھی۔ (۱-۵۰)

(۲) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس دنیا میں بھی حسنات عطا فرما اور آخرت میں بھی حسنات (۱۱۱)

(۳) مجاہدین کی دعائیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ثبات و استقامت عطا فرما تاکہ ہمارے قدموں

میں لغزش نہ آنے پاتے۔ اگر ہم نے کہیں بھول چوک ہو جائے تو اس کے نقصان سے ہماری حفاظت فرما دے۔ اور

ہمیں مخالفین پر کامیابی عطا فرما۔ (۲-۲۵) د (۳-۱۳۷)

(۴) اے ہمارے پروردگار! ہمارے سہو و نسیان سے درگزر فرما۔ ہم جہالت اور غفلت کے اس بوجھ تلے ندب جائیں جن کے نیچے اقوام سابقہ دب گئی تھیں۔ ہمیں اتنی قوت عطا فرما دے جس سے ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ ہمیں ان لوگوں پر غلبہ و نصرت عطا کر دے جو تیرے نظام کے مخالف ہیں۔ (۲/۱۸۶) z (۱۵)۔

(۵) اے ہمارے رب! ایسا نہ ہو کہ صحیح راستہ مل جانے کے بعد ہمارے قدم پھر غلط راستے کی طرف اٹھ جائیں۔ تو ہمیں سامانِ نشوونما عطا فرما تا رہ۔ (۳)۔

(۶) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے جو وعدے اپنے رسولوں کی وساطت سے ہم سے کیے ہیں انہیں پورا کر دے۔ (۱۹۳-۱۹۲) ۳

(۷) ہمارا شمار صالحین کے زمرے میں ہو۔ (۲/۲۸۵)۔ ظالمین کے زمرے میں نہ ہو۔ (۲/۲۸۶)۔

(۸) ہمارے اور ہمارے مخالفین کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ (۲/۲۸۷)۔ [یہ حضرت شعیبؑ اور ان کے متبعین کی دعا تھی۔ انبیاءؑ اور ان کی جماعتیں، مخالفین کے ساتھ تصادمات میں اسی قسم کی دعائیں مانگا کرتی تھیں]۔

(۹) متبعین حضرت موسیٰؑ کی دعا کہ بارالہ! ہمیں ظالمین کا سختہ مشق نہ منا پڑے۔ (۲/۲۸۸)۔ یہی دعا حضرت ابراہیمؑ کے ساتھیوں کی تھی۔ (۲/۲۸۹)۔ عذابِ جہنم سے محفوظ رہنے کی دعائیں۔ (۲/۲۹۰)۔

(۱۱) بیوی بچے آنکھوں کی ٹھنڈک کا موجب بنیں (گھر کی زندگی سکون و اطمینان کی ہو) اور ہم متفقین کے امام قرار پائیں۔ (۲/۲۹۱)۔

(۱۲) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں بھی مغفرت عطا فرما اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ رخصت ہو چکے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ایسا کر دے کہ ہمارے دلوں میں اپنے بھائیوں کے لئے کدورت نہ رہے۔ (۲/۲۹۲)۔

(۱۳) جنت میں مومنین کی دعائیں کہ ہمارے نور کو مکمل کر دے۔ (۲/۲۹۳)۔

یہ ہونا ہے انداز مومنین کی دعاؤں کا۔ ان کی ساری دعائیں اجتماعی ہوتی ہیں جن سے پورے معاشرہ، عجمت نظام کی خبرنگالی کے خدمات چھلک کر باہر آتے ہیں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دعائیں اجتماعی ہی ہوں گی، ان سے ہوتا کبائے؟ ان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ بہ سوال

اہم ہے اور غور سے سمجھنے کے قابل اس لئے کہ یہی وہ محور ہے جس کے گرد دعا کا سارا مسئلہ گردش کرتا ہے۔

(۱)

کوئی کام کرنا ہو، اس کے لئے سب سے پہلے ہمارے دل میں آرزو پیدا ہوتی ہے۔ دنیا میں عمل کی بنیاد آرزو ہے جس قدر یہ آرزو شدید ہوگی اسی قدر ہمارا ارادہ مستحکم ہوگا۔ اور جس قدر ارادہ مستحکم ہوگا اسی نسبت سے ہم اس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کریں گے۔ علامہ اقبالؒ نے بچوں کے لئے ایک نظم لکھی ہے جسے ہم ابتدائی مدرسہ کے ہر طالب علم کی زبان سے ہر روز سنتے ہیں۔ یعنی وہ نظم جس کا پہلا شعر یہ ہے کہ :

لب پر آتی ہے دعا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدا یا میری !

اس شعر کے مصرعہ اول میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ (یوں تو) بچوں کے لئے ہے لیکن اس میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے وہ بڑی عمیق ہے۔ یعنی جب انسان کی دلی تمنا، حروف و الفاظ کی شکل میں زبان پر آتی ہے، تو اُسے دعا کہا جاتا ہے۔ جتنی گہری تمنا اتنی ہی غلصہ دعا۔ جتنی شدید آرزو، اتنی ہی پُر کیف پکار۔ نفسیات کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ آرزوؤں کی بیداری سے انسان کے اندر کس قسم کی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ پھر جس قسم کی وہ آرزو اُسی قسم کی نفسیاتی تبدیلی۔ اس نفسیاتی تبدیلی سے انسان کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے، خارجی دنیا میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :

ایک منزل رانمی دانی ز راہ
قیمت ہر شے ز اندازِ نگاہ
نوعِ دیگر ہیں جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

بہر حال، یہ حقیقت ہے کہ انسان کی شدتِ آرزو سے اس کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جو اس کا اندازِ نگاہ بدل دیتی ہے اور اس کی آرزو میں جس قدر ارتکاز پیدا ہوتا ہے، اسی قدر اس میں توانائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ جو عشق کی اک جست قصہ تمام کر دیتی ہے، وہ شدتِ آرزو ہی کی پیدا کردہ توانائی کی رو سے ہوتا ہے۔ اس باب میں جب ہم ”زمانہ جاہلیت“ کے عربوں کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے

لے عشق کی اک جست نے طے کر دیے قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بکراں سمجھا تھا میں (اقبالؒ)

کہ تمدن و تہذیب سے اس قدر عاری اور فلسفہ و منطق سے اس قدر نابلد ہونے کے باوجود ان کی نگاہ کس قدر بلند اور ان کی فکر کس قدر عمیق تھی۔ اور اس کے مظاہرہ کا ان کے ہاں ایک ہی ذریعہ تھا۔ یعنی ان کی زبان۔ سان عربی مبین۔ وہ (باور یہ نشین) جب اپنے مولشیوں کا دودھ دوتے تو تھوڑا سا دودھ تھنوں میں باقی چھوڑ دیتے۔ یہ دودھ اس دودھ کے نیچے اتارنے کا موجب بن جاتا جسے اس مولشی نے اوپر چڑھا لیا تھا۔ اس طرح چھوڑے ہوئے دودھ کو وہ اَلْذَّائِعِیۃ کہتے۔ اس سے دُعا کا مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے۔ یعنی وہ کیفیت جو انسانی جذبات کو ابھارنے اور اس میں حرکت پیدا کرنے کا موجب بنے، جس سے اس کی مضمر توانائیاں (چھپایا ہوا دودھ)، مشہود ہو کر باہر نکل آئیں۔ شدتِ آرزو سے جس کا دوسرا نام دُعا ہے، یہ ہوتا ہے۔

آرزو کے سلسلہ میں دو باتیں بنیادی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آرزو ہے کس قسم کی۔ انسان کے دل میں مختلف آرزوئیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے مومن کے سامنے ”صحیح آرزو“ کا جو معیار رکھا ہے وہ یہ ہے کہ **وَلَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ** (۱۶۶)۔ تم وہی چاہو جو خدا چاہتا ہے۔ تم اپنی آرزوؤں کو مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھو جس بات کو خدا بڑا سمجھتا ہے، تم بھی اُسے بڑا سمجھو۔ جسے وہ اچھا سمجھتا ہے تم بھی اُسے اچھا سمجھو۔ تم ویسا بننے کی کوشش کرو جیسا خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ۔ قرآن کریم کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ —

آنچه حق می خواہد آں ساز و ترا — یہ تمہیں وہ کچھ بنادے گا جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ تم بنو۔ لہذا سب سے پہلا ضروری مرحلہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ جو آرزو ہمارے دل میں پیدا ہو رہی ہے وہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر وہ ویسی نہ ہو تو اُسے تبدیل کر کے مستقل قدر سے ہم آہنگ کر لینا چاہیے۔

اگلا قدم یہ ہے کہ اس آرزو، اس مقصد، اس معیار کو ہر وقت سامنے رکھا جائے۔ قرآن کریم نے مومنین کا جو شعار بتایا ہے وہ اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں: **یَذْكُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ اِذَا جَاؤُاْ تُحُتَّ، بَیْطُتے، لَیْطُ،** تو ان میں خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ اس سے ان کی آرزو میں سختی بھی پیدا ہوتی جاتی ہے اور اس کی پاکیزگی بھی ملوث نہیں ہونے پاتی۔ قرآن کریم نے سورہ **حَمۡد** میں اس حقیقت کو زیادہ واضح الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ **اِنَّ السَّیِّئِیْنَ قَالُوْا رَبَّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَفْصَاوْا۔** وہ لوگ جو دل کے کامل یقین و اطمینان سے کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور پھر اس دعویٰ پر مستقل مزاجی سے قائم رہتے ہیں۔ اس میں ذرا سا بھی تزلزل نہیں آنے دیتے۔ **تَنْزِلُ عَلَیْہِمُ الْمَلَٰئِکَةُ۔**

ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے جو ان سے کہتے ہیں کہ تم مت خوف کھاؤ۔ مت غمگیں ہو۔ اور اس عاقبتی زندگی کی خوشخبری لو۔ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق اور مددگار ہیں اور مستقبل کی زندگی میں بھی۔ اس کے بعد ہے: وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُىْ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُوْنَ: (۳۰-۳۱)۔ اس میں جو تم چاہو گے وہ ہوگا۔ جو مانگو گے وہ ملے گا۔ اس میں تمہاری ہر آرزو پوری ہوگی۔ ہر دعا قبول ہوگی۔

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُىْ۔ بہت بڑا وعدہ ہے۔ جو کچھ تم چاہو گے وہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان تصریحات کے مطابق جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں، مومن، چاہے گا ہی وہی جو مستقل اقدارِ خداوندی (مشیتِ ایزدی) کے مطابق ہوگا، اس لئے وہ کسی غلط بات کو چاہے گا ہی نہیں۔ اور وہ مانگے گا ہی وہی جس کے دینے کا خدا نے مومنین سے وعدہ کر رکھا ہے۔ یعنی ہر قسم کی خوشگواریاں، سرفرازیاں، رزقِ کریم، غلبہ و تسلط، قوت و اقتدار، یعنی قرآنی معاشرہ کی تمام برکات۔

آپ نے غور فرمایا کہ مومنین کی دعائیں کیسی ہوتی ہیں اور وہ پوری کس طرح سے ہوتی ہیں۔ یہ دعائیں اس جماعت کی ہوتی ہیں جو دنیا میں خدا کے نظام کی تشکیل و استحکام کے لئے اٹھے اور سفرِ حیات، وحیِ خداوندی کی روشنی میں طے کرتی جائے۔ سینے میں مقدس آرزوؤں کا ہجوم۔ دل میں حصولِ مقصد کی تڑپ، نگاہوں کے سامنے واضح نصب العین۔ بازوؤں میں قوت اور قدموں میں استقامت۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کی ذات، (علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مومن کی انتہائی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اس کے خیالات، ارادے، مقاصد، مطامع، زاویہ نگاہ اور منہاں نظر، سب مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ اسی حقیقت کو میں نے اپنی کتاب ”ابلیس آدم“ میں ان الفاظ کے پیرہن میں پیش کیا تھا:-

دعا کیلئے؟ سازِ فطرت کے نغمہ ازل سے ہم آہنگ ہونے کی حسین تمنا۔ عروسِ حقیقت کے حسنِ جہاں آرا روجاں نواز کی دلکش رعنائیوں سے کیرنگی کی مچلتی ہوئی آرزو۔ چکوروں کے سینے میں چاند کو اپنے اندر سمو لینے کی لہکشاں گیر و فلک پیمایاں والہانہ امنگ۔ قلبِ پروانہ میں شمعِ فردزاں کے انداز و اسلوبِ جذب کر لینے کا وجدانگیز ورقِ قص آفریں جوش و خروش، یعنی انسانی خودی کا اپنی متناہیت کو لامتناہیت (حیاتِ جاوداں) میں بدل لینے کا بینا بانہ ولولہ اور اسی ولولہ کی تسکین کے لئے قطرہٴ شبنم کی، سورج کی شعاعوں سے بازوؤں سے شاہیں کی طلب۔ بغور دیکھتے تو ایمان، دعا، اور عملِ تینوں ایک ہی شمع کی کرنیں اور ایک ہی کھول کی پکھڑیاں ہیں۔ ایمان اس

حقیقت کے اعتراف کا نام ہے کہ انسانی سیرت کی بلندی کا راز، نظامِ عالم کے مرکزِ خیر و خوبی سے ہم آہنگی میں پوشیدہ ہے۔ دعا، اس ہم آہنگی و یک رنگی کی شدید ترغیب ہے اور عمل اس ترغیب کا زندہ مظاہرہ اور اس کے حصول کے لئے کوششِ پیہم۔

یہی ہیں مومنین کی وہ دعائیں جو ستباب ہوتی ہیں۔ انہی کے ہاتھوں نظامِ خداوندی کا قیام عمل میں آتا ہے۔ وہ نظام، جس میں کسی کو اپنی انفرادی ضرورت اور حاجت کے لئے، راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دعائیں نہیں کرنی پڑتیں۔ یہ نظام، ان کی دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دیتا ہے، وہ اس کا انتظام کرتا ہے کہ ہر صاحبِ احتیاج کی دعا (مانگ) بابِ خداوندی سے ٹکرائے سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔

باقی رہی ملائکہ کی تائید، سو اس کے لئے قرآنِ کریم نے واضح کر دیا ہے کہ لَتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ۔ (۱۰) اس سے انسان کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے جس سے اس کے قلب کو سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ وَ يُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ۔ (۱۱)۔ اور سکونِ قلب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے قدموں میں ثبات و استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ ہے جو کچھ دعا سے ہوتا ہے یعنی اس سے انسان کے اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ کس قدر قابلِ رشک ہے وہ انداز جس میں اقبالؔ نے، اتنی بڑی رفیع و منیع اور عمیق و دقیق حقیقت کو، دو مصرعوں میں واشگاف کر دیا ہے کہ جس سے بلیغ اور دلکش انداز، تصویر میں نہیں آ سکتا — آپ بھی سنئے اور وجد میں آ جائیے کہا ہے کہ دے

تیری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے۔
اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اس باب میں حرفِ آخر ہے۔ (قضا سے یہاں مراد قانونِ خداوندی ہے)۔

(۱۰)

باقی رہا ہمارا ایک دوسرے کے لئے دعا کرنا، تو یہ درحقیقت ان کے حق میں ہماری نیک آرزوؤں کا اظہار ہوتا ہے جس سے انہیں سکون حاصل ہوتا ہے۔ معاملات کی دنیا میں، اسے اخلاقی تائید (MORAL - SUPPORT) کہا جاتا ہے۔ اس سے خود اس شخص کے اندر ایک قسم کی نفسیاتی قوت بیدار ہو جاتی ہے جس کے اثرات نہایت خوشگوار ہوتے ہیں۔ جس محبوبِ جان نواز کے دیکھنے سے (غالب کے الفاظ میں) مریض کے منہ پر رونق آجائے، اس سے چار کلماتِ تسلی یا دو الفاظِ تحسین

ایک دوسرے کیلئے دعائیں کرنا

سُننے سے جو قلبی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی حیثیت، مردہ کے لئے دُلعے خیر کی ہے۔ اس سے مردہ پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا، اس کے پسماندگان کے غم و اندوہ میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے معاشرتی روابط کا یہی فائدہ ہوتا ہے۔ اس سے انسان اپنے آپ کو معاشرہ میں تنہا محسوس نہیں کرتا اور سخت سے سخت جانکاه مصیبت میں بھی اس کا حوصلہ قائم رہتا ہے۔ اسی لئے حضور نبی اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ یہ لوگ جب اپنے عطیاتِ نیرے پاس لائیں تو انہیں قبول کرنے کے بعد صَلِّ عَلَیْہُمْ۔ انہیں شاباش دیا کر۔ ان کے اس عمل کو (APPRECIATE) کیا کر۔ انہیں دعا دیا کر۔ اس لئے کہ اِنَّ صَلَّوْۤتُکَ سَکُنٌ لَّہُمْ۔ (۹۰)۔ ”تیری دعا ان کے لئے بڑی موجب تسکین ہوتی ہے“

(۰)

قرآن کریم میں حضراتِ انبیاء کرامؑ کی بعض انفرادی دعاؤں کا بھی ذکر آیا ہے۔ مثلاً حضرت ایوبؑ نے اپنی انتہائی تکلیف میں خدا کو پکارا، اور خدا نے ان کی مصیبت کو رفع کر دیا۔ (۸۳-۸۴)۔ حضرت یونسؑ نے اپنے غم و الم کی اندوہناکیوں میں خدا کو پکارا اور انہیں مصیبت سے نجات مل گئی۔ (۸۸-۸۹)۔ سو اول تو قرآن کریم نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی کہ ان کے مصائب و آلام دور کرنے کے لئے کس قسم کے اسباب پیدا کئے گئے تھے۔ دوسرے (اور یہ بات بنیادی ہے) کہ نبوت ایک ایسا مقام ہے جس کی کنہ و ماہیت کا سمجھنا کسی غیر از نبی کے لئے ممکن نہیں۔ ہم جان ہی نہیں سکتے کہ خدا اور نبی کا باہمی تعلق کس قسم کا ہوتا تھا۔ خدا نبی سے کس طرح ہمکلام ہوتا تھا۔ نبی خدا سے کس طرح باتیں کرتا تھا۔ لہذا، جس حقیقت کا ہم ادراک ہی نہیں کر سکتے، اس کے متعلق بحث و گفتگو سے کیا حاصل!

(۰)

اس کے بعد آئیے آیہ زیرِ نظر (۱۸۶) کی طرف۔ روزہ میں کھانے پینے اور جنسی اختلاط سے احتراز کیا جاتا ہے۔ تصوف کے پیدا کردہ نظریہ کی رُو سے ذہن اس طرف منتقل ہو سکتا تھا کہ ترکِ لذتِ اذی و مادی اشیاء کے پرہیز سے انسان خدا کا مقرب بن جاتا ہے۔ آپ نے کبھی اس پر غور کیا کہ ہمارے ہاں منقہ کا ترجمہ کیا جاتا ہے ”پرہیزگار“۔ یہ اسی (تصوف کے پیدا کردہ) تصور کا اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نکتہ کی وضاحت کر دی کہ ان لذت و حظاظ سے مجتنب رہنے اور مشقتیں برداشت کرنے سے خدا کا قرب حاصل نہیں ہو جاتا۔ وَ اِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔ (۱۸۶)۔ ”اے رسول! جب میرے بند سے تم سے میرے متعلق دریافت کریں تو ان سے کہہ کہ میں ہر وقت

ان کے قریب ہوں“

قرب (نزدیکی) ایک تو فاصلہ کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ دو مادی چیزوں کے درمیان ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے خدا کے قرب سے مراد فاصلہ کے اعتبار سے نزدیکی نہیں۔ وہ کسی مقام میں ممکن نہیں کہ انسان آگے بڑھ کر اس کے قریب ہو جاتا ہے۔

ضمناً، معراجِ نبوی کا عام تصور یہ ہے کہ حضور نبی اکرمؐ مکہ سے سفر کر کے آسمانوں کو طے کرتے ہوئے عرشِ الہی تک پہنچے اور وہاں خدا سے ملاقی ہوتے۔ اس نظریہ کے خلاف بنیادی اعتراض یہ وارد ہوتا

ہے کہ اس سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ خدا کسی خاص مقام پر ممکن ہے جہاں جا کر اس سے ملا جاتا

معراجِ نبوی

ہے۔ یہ نظریہ خدا کے اس تصور کے خلاف ہے جو قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔ میں (IMMINANCE) اور (TRANSCENDANCE OF GOD) کی فلسفیانہ بحثوں میں الجھنے بغیر اتنی وضاحت پر اکتفا کروں گا کہ قرآن کریم نے خدا کے متعلق کہا ہے کہ **هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ** (۲/۱۷۶)۔ تم جہاں بھی ہو خدا تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ **قُرْبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَيْدِ** (۱۱۴/۱)۔ ہم انسان کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ **وَلَكِنْ لَا تَبْصُرُونَ** (۲۱/۵۶) لیکن تم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ لہذا، آیت (۲/۱۸۶) میں ”إِنِّي قَرِيبٌ“ سے مراد خدا کا مکان (SPACE) کے اعتبار سے نزدیک ہونا نہیں۔ اصل یہ ہے کہ (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) ہمارے ہاں خدا کا تصور بادشاہوں کو سامنے رکھ کر تراشا گیا ہے۔ بادشاہوں کے مقربین فاصلہ کے اعتبار سے بھی اس کے نزدیک بیٹھتے تھے جو سب سے زیادہ مقرب ہوتا تھا اس کی نشست بادشاہ کے قریب تر ہوتی تھی۔ اب بھی حکومتوں میں (بادشاہ نہ ہونے کے باوجود) سفراء، وزراء، حکام، عمال وغیرہ کے لئے **WARRANT OF PRECEDENCE** (یعنی نشستوں کی ترتیب) مقرر ہوتی ہے اور اسے بڑی اہمیت

دی جاتی ہے۔ دربارِ خداوندی کا کچھ اس قسم کا تصور ہمارے ذہنوں میں بھی منقوش

مقربینِ بارگاہِ خداوندی

ہے اور اولیاء اللہ (یعنی مقربینِ بارگاہِ خداوندی) اپنے معتقدین سے بیان کرتے

ہتے ہیں کہ ذاتِ مخلصِ خداوندی میں کون کس جگہ تشبیہ فرماتا تھا۔ اس قسم کے تمام تصورات غیر قرآنی اور دوسروں کے

لہ قرآن کریم میں حضورؐ کے عرشِ معلیٰ پر جانے کا ذکر نہیں۔ معراجِ نبوی حضورؐ کے کمالاتِ نبوت کی معراج ہے تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

ہاں سے مستعار تے ہوتے ہیں۔ سُبْحَانَ اللَّهِ تَعَالَى عَمَّا يَصِفُونَ۔ ذاتِ خداوندی انسانوں کے پیدا کردہ اس قسم کے تصورات سے بلند و بالا ہے۔ خدا کا وہی تصور صحیح ہے جسے خود خدا نے اپنے متعلق قرآن کریم میں دیا ہے۔ اس تصور کی رُو سے قربِ خداوندی سے مراد ہوگی اطاعتِ خداوندی کی رُو سے حاصل شدہ مدارج۔ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (۹۶) خدا کی اطاعت کر اور اس طرح اس کا قرب (مدارجِ عالیہ) حاصل کرے۔ يَكُلِّي دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوا (۹۶) خدا کے ہاں ہر ایک کے مدارج اس کے اعمال کی رُو سے متعین ہوتے ہیں جو اعمالِ حسنہ میں سب سے آگے وہی سب سے زیادہ مقرب۔ السَّابِقُونَ السَّابِقُونَ۔ اُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ (۹۶)؛ دوسری جگہ انہیں الْمُتَنَافِسُونَ۔ کہا ہے یعنی دوسروں سے سبقت لے جانے والے، جو حیاتِ جاوید کے سرِ چشمہ سے سیراب ہوں گے۔ (۸۳-۲۸) سورہ توبہ میں ہے کہ نظامِ خداوندی کے استحکام کے سلسلہ میں مالی امداد رسولِ اللہ کی طرف سے مخین و آفرین (صَلَوَاتِ الرَّسُولِ) اور قُرْبَتِ عِنْدَ اللَّهِ — (۹۹) کا موجب ہوتی ہے۔ یہاں قربت کے ساتھ عِنْدَ اللَّهِ (خدا کے ہاں) نے بات واضح کر دی کہ اس سے مراد خدا کے ہاں بلند مدارج ہیں۔ دوسری جگہ اس کی وضاحت یہ کہہ کر دی کہ وہی مال وجہِ تقربِ خداوندی ہے جسے اس کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ محض مالدار ہونے سے انسان خدا کا مقرب نہیں بن سکتا۔ اعمالِ صالح کی رُو سے مقرب بن سکتا ہے۔ (۳۴)۔ نہ ہی کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو خدا کا مقرب بنا سکتا ہے۔ یہ تو خدا کی اطاعت ہے جس سے یہ تقرب حاصل ہوتا ہے۔ (۳۹-۲)

(۵)

لیکن آیت زیرِ نظر (۱۸۶) میں ”قربِ خداوندی“ کا مفہوم کچھ اور ہے۔ آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ اِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أَحْيِبُّ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ اے رسول! جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو کہہ کہ میں ہر وقت ان کے قریب ہوں۔ وہ اس طرح کہ جب بھی کوئی اپنی راہنمائی کے لئے مجھے آواز دیتا ہے تو میرا قانونِ ہدایت جو قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کی پکار کا جواب دیتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ صحیح راستہ کون سا ہے۔

متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے کہ کتابِ اللہ کا مقصد اور منصب یہ ہے کہ جب انسان غررِ زندگی میں

کسی دورا ہے پر پہنچے اور اسے یہ معلوم کرنا ہو کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرے جس سے وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتے تو قرآن کریم اس کی راہنمائی اس راستے کی طرف کر دیتا ہے۔ اس آیت میں اسی حقیقت کو محاکاتی انداز میں بڑے دلنشین پیرایہ میں بیان کیا گیا

یہ جواب قرآن سے ملتا ہے

ہے۔ ایک مسافر دورا ہے پر کھڑا ہے اور اسے صحیح راستے کا یقینی طور پر علم نہیں۔ اسے دور کوئی شخص دکھائی دیتا ہے وہ اسے پکار کر آواز دیتا ہے اور راستے کے متعلق دریافت کرتا ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مسافر دورا ہے پر کھڑا ہو اور وہاں کوئی آدمی ایسا نہ ہو جس سے وہ راستے کی بابت دریافت کر سکے، یا جس سے وہ پوچھے وہ اس کی آواز کا جواب ہی نہ دے۔ یا جواب دے تو یہ کہ مجھے راستے کا علم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ سفر زندگی میں ہم انسان کی یہ حالت نہیں ہونے دیں گے۔ وہ کسی دورا ہے پر راستے کے متعلق پوچھے، ہم اُسے جواب دینے کے لئے وہاں موجود ملیں گے اور اس سے کہہ دیں گے کہ یہ (GUIDE BOOK) ہے اس میں فلاں صفحہ لٹوا، تمہیں راستے کا پتہ نشان مل جائے گا۔ یہ کبھی نہیں ہوگا کہ کسی مسافر کے سوال کا جواب اس کتاب سے نہ ملے نَمَا فَتَرَطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (۱۱)۔ کوئی جواب طلب بات ایسی نہیں جسے اس کتاب میں بغیر جواب کے چھوڑ دیا گیا ہو۔

آیت (۱۵) میں کہا گیا تھا کہ رمضان کے مہینے میں نہ دن قرآن کی استذکار ہوتی۔ یعنی اس کتاب کی ابتدا جو غلط اور صحیح راستوں کو الگ الگ کر کے بتا دیتی ہے۔ اور اس سے اگلی آیت (۱۶) میں کہا کہ پوچھنے والوں سے کہو کہ تم اس کتاب سے اپنے سوال کا جواب مانگو۔ پھر دیکھو کہ اس سے کس طرح اس کا واضح جواب ملتا ہے کہ اِنَّا رَتَقِي قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ - (۱۷)۔ اس سے تم پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ تمہارا خدا کس طرح تم سے قریب بھی ہے اور تمہارے ہر سوال کا جواب بھی دیتا ہے۔ یہ آیت درحقیقت قرآن کریم کی اس خصوصیت کی وضاحت کرتی ہے۔

(ضمناً) یہ حقیقت متعدد مقامات پر سامنے لائی جا چکی ہے کہ ختم نبوت کے بعد خدا سے ہم کلامی کا ذلیعہ اس کی کتاب ہے۔ ہمیں جو کچھ خدا سے پوچھنا ہو اس کی کتاب سے پوچھنا چاہیے۔ یہ کتاب ہمارے ہر سوال کا جواب دیگی (خود ستائی کے طور پر نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری بلکہ بطور تحدیث نعمت عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ خدا کے اس حقیر بندے نے جو سوال بھی اس کتاب سے پوچھا اس کا اسے کافی اور وافی جواب اس سے مل گیا۔ یہ سائل اس کی بارگاہ سے کبھی محروم نہیں لوٹا۔ اُجِیْبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَا - (۱۸) ہم ہر سائل کے سوال کا جواب

دیتے ہیں) اس پیچیدہ کا ذاتی تجربہ ہے — ہم تو دیتے ہیں کوئی مانگنے والا ہی نہیں۔ ایک عظیم حقیقت ہے۔ اس سے مانگو تو سہی۔ پھر دیکھو کہ وہ کس طرح — شعلہ شعلہ بہ بجشد، شر شر نہ دہد — اس کے بعد ایک ایسی بات کہی گئی ہے جس سے ننگہ تصور میں پھول کھلنے اور بہاریں مسکرانے لگ جاتی ہیں۔ انداز وہی محاکاتی ہے۔ کہا کہ تم نے ہم سے کچھ مانگا اور ہم نے جھولیاں بھر بھر کر دیا۔ فَلَيْسَتْ جَبُولًا (۱۸۶) ہم بھی تم سے کچھ مانگتے ہیں۔ سوال کرتے ہیں۔ کیا تم ہمارے سوال کا جواب نہیں دو گے؟ ہماری مانگ پوری نہیں کرو گے؟

خدا کی مانگ پوری کرو | سبحان اللہ! یہ انداز جس قدر شانِ محبوبیت لئے ہے، اُسے بس محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ کے پکیر میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔

خدا کی وہ مانگ کیا ہے؟ وَلْيُؤْمِنُوا بِيٰٓ— (۱۸۶) یہ کہ تمہیں جو جواب ہمارے ہاں سے (یعنی کتاب سے) ملا ہے اس کی صداقت پر یقین کرو۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس سے خدا کا کچھ سنور جاتے گا۔ اس کا کوئی بگڑا ہوا کام بن جائے گا۔ کیا اس نے یہ سوال کسی اپنے مقصد کے حصول کی خاطر کیا تھا۔ کہا کہ نہیں! اس سے تمہیں کچھ اور بنانا مقصود تھا۔ تم نے پوچھا تھا کہ صحیح راستہ کون سا ہے۔ ہم نے اس کا پتہ نشان بتا دیا۔ تمہیں اس کا علم ہو گیا۔ لیکن سہی معلوم ہے کہ صحیح راستہ معلوم ہو جانے کے بعد ضروری نہیں ہوتا کہ وہ شخص اس راستے کو اختیار بھی کر لے اور اس پر چل بھی پڑے۔ دنیا میں کتنے لوگ ہیں جنہیں یہ اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ فلاں چیز مجھے نقصان پہنچاتی ہے اور فلاں فائدہ دیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ نہ نقصان رساں چیز کو چھوڑتے ہیں نہ نفع بخش کو اختیار کرتے ہیں۔ سقراط کا یہ قول علی تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے کہ (KNOWLEDGE IS VIRTUE) ”علم ہی اصل نیکی ہے“ اس کے برعکس غالب نے جو بات کہی ہے وہ واقعہ کے مطابق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

جاننا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعتِ ادھر نہیں آتی

قرآن کہتا ہے کہ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ تم صرف جانتے ہو کہ فلاں چیز مضرت رساں ہے یقین اس کا یقین نہیں کہ اس سے تمہارا واقعی نقصان ہو جائے گا۔ کسی بات کا محض علم ہونے اور اس کی مضرت رسائی پر یقین ہونے میں بڑا فرق ہے۔

قرآن کریم نے کہا کہ تمہیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ صحیح راستہ کون سا ہے لیکن تم اس راستے پر گامزن اسی صورت میں ہو گے جب تمہیں اس امر کا یقین ہو کہ صرف وہی راستہ ایسا ہے جس سے تم بخیر و عافیت منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔ اس کے سوا کوئی راستہ ایسا نہیں۔ وَلْيُؤْمِنُوا بِيٰٓ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔ (۱۸۶) اے رسول!

ان سے کہو کہ کتاب اللہ کے بتاتے ہوئے راستے کے صحیح ہونے پر دل کی گہرائیوں سے یقین رکھیں۔ لَعَلَّهُمْ
رُشْدُکے معنی | یُرْشِدُونَ۔ تاکہ یہ اس راستے کو محکم طور پر اختیار کر سکیں۔ اس پر جم کر گامزن ہو سکیں۔ رُشْد
 کے معنی ہیں صحیح بات کے معلوم ہو جانے پر اسے جم کر، محکم طور پر اختیار کر لینا۔ قرآن کریم کی
 خصوصیت یہ ہے کہ وہ غلط اور صحیح راستے کو نمایاں طور پر واضح کر دیتا ہے۔ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔
 (۲۵۶)۔ اور پھر ایسا تغیرِ نفس پیدا کر دیتا ہے جس سے انسان اس راستے کو محکم طور پر اختیار کر لیتا ہے۔ ”پھر طبیعت
 آجاتی ہے“ چونکہ یہ راستہ قرآن اور صرف قرآن سے ملتا ہے اس لئے مرشدِ خدا کی ذات ہے۔ وَ مَنْ
 يُضِلِّ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُرْشِدًا۔ (۱۶)۔ جو اس کے راستے کو چھوڑ دیتا ہے اس کا کوئی حامی و مددگار اور مرشد
 نہیں ہو سکتا۔

(۱)

جن روزوں (صیام) کو فرض قرار دیا گیا ہے ان کا ذکر تو انہی آیات میں ہے۔ ان کے علاوہ قرآن مجید میں
 بعض روزوں کا بطور کفارہ بھی ذکر آیا ہے اور وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) مناسک حج میں کچھ کمی رہ جانے کے سلسلہ میں (۳ + ۷) دس روزوں کا حکم (۱۶۶)

(۲) قتلِ خطا میں دو ماہ کے روزوں کا حکم۔ (۹۲)

(۳) قسم توڑنے کے کفارہ کے طور پر تین دن کے روزوں کا حکم۔ (۵۹)

(۴) ”ظہار“ کے کفارہ کے طور پر دو ماہ کے روزوں کا حکم۔ (۵۸)

(۵) حالتِ احرام میں شکار کرنے کے کفارہ کے طور پر روزوں کا حکم (۹۵)

(۲)

واضح رہے کہ یہودی شریعت میں روزے میں بات چیت کرنے کی بھی ممانعت تھی۔ (۱۹)



چھٹا باب

حج-جہاد-ہجرت

ایات — $\frac{2}{189}$ تا $\frac{2}{218}$

- (۱) حج کا اجتماع — آل ورلڈ مسلم کانفرنس۔
- (۲) مرضات اللہ کا مفہوم۔
- (۳) قتال (جنگ) کے مقاصد اور ہدایات۔
- (۴) قرآن اور مذہبی آزادی۔
- (۵) ارتداد کا غلط تصور۔
- (۶) قوت اور حکمت کا امتزاج۔
- (۷) اسلام کا منتہی — وحدتِ انسانیت
- (۸) حصولِ جنت کی آسان راہیں۔
- (۹) جہاد کی اہمیت۔
- (۱۰) ہجرت کا مفہوم۔
- (۱۱) جہاد کے خلاف سازشیں۔
- (۱۲) انسانیت کی نجات صرف قرآنی نظام میں ہے۔

چھٹا باب

حج کا عالمگیر اجتماع اور اس کی غایت

حضور نبی اکرم سے دریافت کیا گیا کہ مسلمان کی زندگی کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ مسلمان کی زندگی یہ ہے کہ جب جہاد (یعنی قتال فی سبیل اللہ — خدا کی راہ میں جنگ) ہو رہا ہو تو اس میں شامل ہو، اور جب وہ نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ مسلمان کے سامنے زندگی کا ایک بلند نصب العین ہوتا ہے — یعنی دین (نظام) خداوندی کو تمام باطل نظاموں پر غالب کرنا — اور اس کی ساری زندگی اس نصب العین کے حصول (یعنی اس نظام کے قیام اور اس کے بعد اس کے تحفظ، استحکام اور بقا) کے لئے وقفِ جدوجہد ہوتی ہے۔ جنہیں عام الفاظ میں "عبادات" کہا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت اسی پروگرام کی مختلف کڑیاں ہوتی ہیں۔ صیام اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کا ذکر سابقہ باب میں آچکا ہے۔ مہینہ بھر کے اس تربیتی کورس کی تکمیل کے بعد جشنِ مسرت (عید الفطر منایا تو پھر اس پروگرام کی اگلی کڑی کا آغاز ہو گیا۔ یہ کڑی ہے — حج کا اجتماع۔ کعبہ کی اہمیت اور حج کا عمومی تعارف، دوسرے باب میں کرایا جا چکا ہے۔ وہاں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ حج درحقیقت نمائندگانِ امت کی سالانہ عالمگیر کانفرنس ہے جس میں اسلامی نظام سے متعلق مختلف گوشوں کا جائزہ لیا جاتا ہے، دلائل و براہین کی رُو سے تمام امورِ مملکت پر بحث و تہمیس ہوتی ہے اور آئندہ سال کے لئے پروگرام مرتب کیا جاتا ہے۔ نمائندگانِ امت کے علاوہ، دوسرے لوگوں کو بھی مبصرین کی حیثیت سے اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ آکر دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

زمانہ قبل از اسلام میں عربوں کے ہاں حج کا اجتماع ہوتا تھا۔ قریش جو کعبہ کے متولی تھے، وہ اس کا اہتمام کرتے تھے اور دور و نزدیک کے لوگ جوق درجوق اس میں شریک ہوتے تھے۔ کعبہ، بتکدہ تھا جس میں مختلف قبیلوں کے بُت نصب تھے۔ یہ قبائل اپنے اپنے بتوں کی پوجا کرتے۔ ان کے استھانوں (آستانوں) پر جانور ذبح کرتے

اور کام پرستی کے عجیب و غریب مظاہرے ہوتے اور اس طرح یہ سب اس میلے میں شریک ہو جاتے۔ میلہ، تجارتی مرکز کا بھی کام دیتا۔ عرب، حج کے بین القبائل اجتماع کا اہتمام تو ذی الحجہ کے مہینے میں کرتے لیکن رجب کے مہینے میں چھوٹے پیمانے پر بھی ایک اجتماع ہوتا جسے وہ عُمَرہ سے تعبیر کرتے۔

عمرہ

عرب کا علاقہ بالعموم بے برگ و گیاہ ریگستان پر مشتمل تھا (اور اب بھی ویسا ہی ہے) اس لئے وہاں کے رہنے والوں کی معیشت کا دار و مدار، زیادہ تر لوٹ مار پر تھا۔ یہ لوٹ مار، رہزنی اور قزاقی (قافلے لوٹنے) کی شکل میں بھی ہوتی اور جنگ میں مال غنیمت حاصل کرنے کی صورت میں بھی۔ اس لئے اس ملک میں سفر کرنا بڑے خطرات کا سامنا کرنا تھا۔ لیکن حج کے اجتماع کی اہمیت کے پیش نظر انہوں نے ایک بین القبائلی معاہدہ کر رکھا تھا جسے آج کی اصطلاح میں (CONVENTION) کہہ لیتے ہیں اس معاہدہ کی رُو سے حج سے پہلے (ذی قعدہ)، حج کی تقریب پر (ذی الحجہ) اور حج کے بعد (محرم) کے تین مہینے، اور اُدھر عمرہ کے سلسلہ میں رجب کا مہینہ، شہر الحرام تسلیم کئے جاتے تھے۔ یعنی ایسے مہینے جن میں ہر قسم کی لوٹ مار اور جنگ و جدال حرام ہوگی۔ کعبہ کے متولیوں (مذہبی پیشواؤں) نے اسے بھی کس طرح کاروبار کا ذریعہ بنا رکھا تھا، اس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ ان کی اس روش کہن یا عادت مستمرہ کے مطابق، اسلام میں بھی حج کے اجتماع کے لئے ذی الحجہ کا مہینہ رہنے دیا گیا اور حرمت کے چار مہینوں میں جنگ پر پابندی کو بھی قائم رکھا لیکن اس اجتماع کے مقصد اور اس کی روح کو یکسر بدل دیا۔

نظام خداوندی کے مخالفین، اس نظام کی راہ میں شروع سے روٹے اٹکاتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن حج کے اجتماع کے ضمن میں ان کی یہ مخالفت شدید ترین شکل اختیار کر لیتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے بین القبائلی معاہدہ کو بھی بالائے طاق رکھ کر ان مہینوں میں بھی جنگ پر اُتر آتے تھے۔ زیرِ نظر باب کا مرکزی موضوع تو حج کے متعلق تفصیل ہے لیکن مخالفین کی اس روش کے پیش نظر جس کا ذکر ابھی ابھی کیا گیا ہے، اس میں جنگ کے متعلق بھی چند ایک ہدایات آگئی ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان دونوں عنوانات کو الگ الگ کر لیا جائے۔ کیونکہ دونوں یکساں اہم بھی ہیں اور تفصیل طلب بھی۔ ہم پہلے حج کو لیتے ہیں۔ فرمایا:-

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْآهْلِ . قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ .
وَكَيْسَ الْبِرِّ بَانَ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ

۲
۱۸۹

مِنْ أَتَقَىٰ - وَأَتُوا الصُّيُوتَ مِنْ آبَائِهَا - وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ - (۱۸۹)

مفہوم اس آیت کا یہ ہے۔ ہم نے شہرِ رمضان (رمضان کے مہینے) کے متعلق کہا ہے کہ اس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوتی اور اس لئے اسے صیام کے پروگرام کے لئے متعین کیا گیا۔ اس سے لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ بعض مہینے مبارک ہوتے ہیں اور بعض نحس۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ماہ و سال، زمان کی گردش دولابی کے مظہر ہیں۔ ان میں سعد و نحس کا کوئی سوال نہیں۔ ان کا مقصد تو محض مختلف کاموں، بالخصوص حج کے لئے وقت کا تعین ہے اور بس۔ (آیت کے باقیماذہ حصہ کا مفہوم آگے چل کر بیان ہوگا)۔

احلال کے معنی ہیں آواز بلند کرنا۔ چونکہ عربوں کے ہاں مہینے کی ابتداء چاند کی پہلی تاریخ سے ہوتی تھی، اس لئے جو شخص سب سے پہلے چاند دیکھ لیتا وہ اونچی اونچی آواز سے لوگوں کو اس سے مطلع کرنا۔ (عبید کے چاند کے سلسلہ میں ہمارے ہاں اب بھی اکثر ایسا ہوتا ہے)۔ اس سے نئے چاند کو ہلال کہنے لگے۔ عربوں جیسی صحرائی قوم میں جہاں حساب کتاب رکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا، مہینوں اور دنوں کا حساب چاند ہی کی رُو سے ہو سکتا تھا اس لئے ان کے ہاں قمری مہینے اور قمری سال کا رواج تھا۔ لیکن قرآن کریم نے کہا کہ ماہ و سال کے حساب کے لئے چاند کی کوئی تخصیص نہیں شمسی اور قمری دونوں قسم کے سال رکھے جاسکتے ہیں۔ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ حُسْبَانًا - (۱۸۹)۔ "سورج اور چاند دونوں سے حساب کا کام لیا جاسکتا ہے" دوسری جگہ ہے۔ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ

قمری اور شمسی کیلنڈر

حُسْبَان (۱۸۹)۔ سورج اور چاند دونوں، مقررہ حساب اور قاعدے کے مطابق چل رہے ہیں اس لئے دونوں سے گنتی شمار کا کام لیا جاسکتا ہے۔ حساب رکھنے کا کوئی خاص اہتمام نہ ہو، مثلاً کیلنڈر اور جنریاں (تو چاند کی رُو سے حساب رکھنے میں آسانی ہوتی ہے کیونکہ وَقَدَرًا مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ اللَّيْلَيْنِ وَالْيُسْبَابِ - (۱۹۰) اس کی مقرر منازل (اس کے بڑھنے گھٹنے کی شکلیں) حساب میں آسانی پیدا کر سکتی ہیں۔ دوسری طرف کہا کہ رات اور دن کی گردش سے بھی حساب رکھا جاسکتا ہے۔ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ اللَّيْلَيْنِ وَالْجِبَابِ - (۱۹۱)۔ اور یہ ظاہر ہے کہ رات اور دن کا اختلاف، سورج کی رُو سے رونما ہوتا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے، تقویم (کیلنڈر) شمسی بھی ہو سکتی ہے۔ قمری بھی۔ (جیسا کہ کہا جا چکا ہے) عربوں جیسی بادیاہ نشین قوم کے لئے قمری تقویم زیادہ آسان تھی (ہمارے ہاں اب بھی دیہات میں چاند کے مطابق تاریخوں کا حساب رکھنے میں آسانی سمجھی جاتی ہے) لیکن زرعی نظام میں اس میں ایک دقت پیش آ جاتی ہے۔ زراعت کا پروگرام موسموں کے دامن سے وابستہ ہوتا ہے اور موسموں کا تغیر سورج کے حساب سے ہوتا ہے نہ کہ چاند کے

حساب کے۔ رمضان کا مہینہ کبھی سردی میں آجاتا ہے کبھی گرمی میں۔ لیکن گندم کی کٹائی کے لئے تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کبھی سردی کے مہینے میں ہو کبھی گرمی کے۔ اس لئے زرعی نظام، سورج ہی سے وابستہ رہ سکتا ہے۔ ویسے بھی سورج کی روشنی، زمین، سورج کے گرد (تقریباً) ۲۹۵ دنوں میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے (جسے سال کہا جاتا ہے) اور اس طرح ہر مہینہ ہمیشہ اسی موسم میں آتا ہے۔ زمین کے اس چکر کو پورا کرنے میں جو تھوڑا سا فرق رہ جاتا ہے اسے ہر چار سال کے بعد، فروری کے مہینے میں ایک دن کا اضافہ کر کے پورا کر لیا جاتا ہے۔ اسے (LEAP YEAR) کہا جاتا ہے۔ لیکن قمری سال تو شمسی سال سے دس دن کم ہوتا ہے جس کے معنی، ہر تین سال کے بعد ایک مہینے کا فرق، اور ہر چھتیس سال کے بعد ایک سال کے فرق کے ہیں۔ زرعی معیشت میں اگر قمری سال رائج ہو تو انہیں ہر تین سال کے بعد ایک ماہ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے تاکہ قمری سال موسموں کے لحاظ سے شمسی کے برابر ہو جائے۔ یہودیوں کے ہاں ایسا ہی ہوتا تھا اور عربِ جاہلیہ میں بھی ایسا ہی۔ (ہندوؤں کے ہاں ابھی تک یہی سسٹم جاری ہے۔ ان کے ہاں ہر تین سال کے بعد قمری سال بارہ کی بجائے تیرہ ماہ کا شمار کیا جاتا ہے۔ اسے ٹوند کا سال کہا جاتا ہے)۔

لیکن عربوں کے ہاں (زراعت کے علاوہ) مہینوں کا تعین ایک اور نقطہ نگاہ سے بھی اہم، بلکہ اہم ترین تھا۔ وہ یہ کہ ان کے ہاں سال میں چار مہینے حرام (واجب الاحترام) تھے جن میں جنگ و جدل بھی بند تھی اور لوٹ مار بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ مہینے متعین بھی ہونے چاہئیں اور ہر ایک کو معلوم بھی۔ دو سال تک تو یہ مہینے متعین اور معلوم تھے لیکن تیسرے سال جب ایک مہینے کا اضافہ ہوتا (جس کا کوئی نام نہیں ہوتا تھا)، تو مذہبی پیشواؤں کے لئے ”کام رو بار“ کا بڑا عمدہ موقعہ ہاتھ آجاتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ان تیرہ مہینوں میں کون کون سے چار مہینے حرام سمجھے جائیں۔ یہ انتظام بنو کنانہ کی ایک جماعت کے سپرد تھا جنہیں نَسَاءُ کہتے تھے۔ نَسَاءُ یا نَسِیَّ کے معنی ہیں کسی چیز کو پیچھے پٹا دینا، مؤخر کر دینا۔ چونکہ ان مہینوں میں تغیر و تبدل کا اثر بڑے بڑے سرداروں اور تاجروں پر پڑتا تھا اس لئے ان کے مفاد کی خاطر نَسَاءُ

نَسِیَّ کا اعلیٰ مفہوم

کرتے یہ کہ کسی سال کسی مہینے کو حرام قرار دے دیتے، کسی سال کسی مہینے کو۔ اس سے معاشرہ میں بڑی گڑبڑ مچتی۔ قرآن مجید کے الفاظ میں یہ لوگ کرتے یہ کہ یُحِلُّوْاْ مَا وَیَحْرِمُ مَوْلٰیہُمْ عَامًا وَّ یُحْرِمُوْاْ مَا یُحِلُّ مَوْلٰیہُمْ عَامًا طُوْاْ عِدَّةً مَّا حَرَّمَ اللّٰہُ فِیْ حِلِّہُمْ مَّا حَرَّمَ اللّٰہُ۔ زَیِّنَ لَّہُمْ سُوْءًا عَمَلًا لِّہُمْ۔ (۳۱)۔ یعنی یہ لوگ ایک ہی مہینے کو ایک سال جنگ کے لئے جائز قرار دے دیتے اور دوسرے سال اسے ناجائز ٹھہرا دیتے۔ اس طرح ان چار مہینوں کی گنتی تو پوری کر دیتے جن میں جنگ کو حرام قرار دیا گیا تھا لیکن مہینوں کو ادھر ادھر کر دیتے۔ یعنی

علماء خدا کے حرام کئے ہوئے کو حلال ٹھہرا دیتے اور سمجھتے یہ کہ ہم کسی جرم کے مرتکب نہیں ہوتے۔ جب اسلامی نظام قائم ہوا تو اس نے مذہبی پیشواؤں کی دنگی چالبازیوں اور دیسہ کاریوں کے ساتھ اس تغیر و تبدل کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ اِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا..... (۹)۔ یاد رکھو! مہینوں میں اس طرح تقدم و تاخر کر دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ تو ان معاہدات کا عملی انکار ہے جو تم نے باہمی کر رکھے ہیں۔ اس سے قانون ٹیکن لوگ بڑی غلط راہوں پر چل نکلتے ہیں۔ لہذا، اعلان یہ کیا بارہ مہینے کا سال جاتا ہے کہ:-

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ..... (۹)

نظام خداوندی کی رُو سے، سال کے بارہ مہینے ہوں گے۔ تیرہ کبھی نہیں ہوں گے۔ یہ گنتی خدا کے اس قانونِ فطرت کے مطابق ہے جو اس نے تخلیقِ ارض و سما کے وقت مقرر کیا تھا۔ ان میں چار مہینے حرام (واجب الاحرام) ہیں۔ یاد رکھو! اب سے یہی محکم قانون رائج رہے گا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ اعلان حج کے عظیم اجتماع میں، نظام خداوندی کے نمائندہ، حضرت ابو بکر صدیقؓ کی طرف سے کیا گیا۔ اور اس نے نظام کہن کی بساط الٹ کر رکھ دی۔ اس میں کہا یہ گیلہ ہے کہ قانونِ فطرت کے مطابق سال کے بارہ مہینے ہی ہونے چاہئیں۔ قانونِ فطرت یہ ہے کہ زمین، سورج کے گرد ایک سال میں چکر پورا کرتی ہے۔ اسی مدت کو بارہ پر تقسیم کر دینے سے کیلنڈرِ فطرت کے مطابق ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد شمسی کیلنڈر کی رُو سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے شمسی کیلنڈر تجویز کیا تھا جس سے موسموں کا تعین بھی ٹھیک ٹھیک ہو جاتا ہے اور حرمت کے مہینوں کا بھی۔

لیکن ہمارے ہاں ہوا یہ کہ سال کے مہینے تو بارہ مقرر کر لئے گئے لیکن کیلنڈرِ قمری رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سابقہ قمری کیلنڈر میں ہر تیسرے سال ایک ماہ کے اضافہ سے، شمسی اور قمری سالوں میں جو ہم آہنگی ہو جاتی تھی، وہ بھی باقی نہ رہی اور شمسی حساب سے بارہ مہینوں کے سال سے جو فوائد حاصل ہونے لگے وہ بھی حاصل نہ ہو سکے۔ ہمارے ہاں یہ سلسلہ اب تک رائج ہے۔ میں نے یہ تحقیق کرنے کی بڑی کوشش کی کہ یہ معلوم ہو سکے کہ قرآنِ کریم کے اس اعلان کے بعد، جس سے (میری بصیرت کے مطابق) شمسی تقویم ہی ثابت ہوتی ہے، بارہ مہینوں والا قمری سال کس طرح رائج رہا یا رائج ہو گیا لیکن مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ تاریخ یہ تو بتاتی ہے کہ سنِ ہجری، حضرت عمرؓ کے زمانہ

میں اختیار کیا گیا تھا، لیکن یہ کہیں سے معلوم نہیں ہو سکا کہ بارہ مہینوں والا قمری سال کیسے رائج ہوا۔ ہمارے ہاں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ جو روش جتنی پرانی ہو جائے وہ اتنی ہی مقدس ہو جاتی ہے اور اسے کوئی چھو تک نہیں سکتا۔ اس بنا پر ہمارے ہاں قمری کیلنڈر کے متعلق یہ عقیدہ قائم ہو گیا ہے کہ یہ اسلامی کیلنڈر ہے اور شمسی کیلنڈر غیر اسلامی ہے لیکن جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے اس سے بڑی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ وجہ ہے جو ہمارے ہاں مذہبی تقاریب کے لئے قمری کیلنڈر رائج ہے اور ”دنیاوی امور“ کے لئے شمسی کیلنڈر ظاہر ہے کہ یہ تضاد دور ہونا چاہیے۔ لیکن مجھے یا کسی فرد یا کسی فرقہ کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اس قسم کے اجتماعی معاملات میں کوئی تغیر و تبدل کر سکے۔ اگر کبھی اسلامی نظام قائم ہو گیا تو اسے اس کا حق حاصل ہو گا کہ وہ ایسے معاملات پر نظر ثانی کرے اور قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے ایسے قوانین وضع اور اختیار کرے جو زمانہ حاضرہ کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔

(۲)

اب آئیے آئینہ زیر نظر کے بقایا حصہ کی طرف۔ پوری آیت یوں ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاِهْلِيَّةِ - قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ - وَ
 لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ
 مَنِ اتَّقَى وَآتُوا الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ
 تُفْلِحُونَ - (۲۴۹)

ہم نے اوپر کہا ہے کہ روزے رمضان کے مہینے کے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ بعض مہینے مبارک ہوتے ہیں اور بعض منحوس، اس لئے انہوں نے، اے رسول! تم سے اس کی بابت دریافت کیا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ مہینوں (یا دنوں) میں سعد و نحس کا خیال تو ہم پرستی ہے۔ ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان سے اوقات کا تعین ہو جاتا ہے۔ اور اس کے فوائد ظاہر ہیں۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ حج کب ہو گا۔

ان سے واضح طور پر کہہ دو کہ دین میں تو ہم پرستی کو کوئی دخل نہیں۔ مثلاً یہ جو تم سمجھتے ہو کہ حج کے دوران، مکانوں میں سامنے کے دروازے سے نہیں آنا چاہیے، پچھواڑے سے آنا چاہیے (تو یہ محض توہم پرستی ہے) سعادت اور کثا دکی راہیں اس قسم کی توہم پرستانہ رسوم سے وابستہ نہیں ہوتیں۔ کثا دکی راہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ تم کس حد تک قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہو اور تم میں کیریکٹر کی کتنی

بلندی پیدا ہوتی ہے۔ لہذا، تم ان جہالت آمیز باتوں کو چھوڑ دو اور جس طرح اور دنوں گھروں میں دروازہ دل کے راستے آنے ہو اسی طرح حج کے دنوں میں بھی آؤ جاؤ۔

قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور معمول کے مطابق زندگی بسر کرو۔ یہی کامیابی کا طریقہ ہے۔

اوہام پرستی جہالت کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ یہ ان لوگوں میں بھی ہوتی ہے جو اپنی نسبت کسی معروف مذہب کی طرف نہ کرتے ہوں۔ مثلاً افریقہ کے وحشی اور جنگلی قبائل۔ اور ان لوگوں میں بھی جو کسی مذہب

توہم پرستی کنیف دلا

کی طرف منسوب ہوں، جیسے (مثلاً) ہم آجکل کے مسلمان۔ اسلام، علم و بصیرت پر مبنی دین ہے۔ وہ اپنے ہر حکم کے متعلق بتانا ہے کہ ایسا کیوں کہا جا رہا ہے اور اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ اس لئے وہ ہر قسم کی جہالت کو دور کرتا اور توہم پرستی کو مٹا دیتا ہے۔ یاد رکھیے، جہالت اور دین یکجا نہیں رہ سکتے۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ حج کے دوران اگر انہیں کسی ضرورت کے لئے گھر آنا پڑتا تو باہر کے دروازے سے گھر میں داخل نہ ہوتے، گھر کے پیچھے... کوئی دروازہ ہوتا تو اس سے اندر آتے اور یا پھر دیوار بچاؤ کر۔ یہی عرب جب اسلام لے آئے تو ان سے کہا کہ اب پرانی اوہام پرستی کو چھوڑ دو۔ کثاد کی راہیں اس قسم کی توہم پرستانہ رسوم سے وابستہ نہیں۔ کثاد کی راہ یہ ہے کہ تم کس قدر قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہو۔ اور یہی وہ طریق ہے جس سے انسان کی کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہیں۔

اس سے پہلے یہی الفاظ (لیس الہی) اس نظریہ کی تردید میں کہے گئے تھے کہ دین کے احکام، میکافہ کی طور پر بجا لانے سے ثواب حاصل ہو جاتا ہے۔ (۱۷۲) قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ جس طرح زمانہ جاہلیت کی رسمیں توہم پرستی ہیں، اسی طرح دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کے ارکان و احکام بھی توہم پرستی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ قرآن کریم اپنے ہر حکم کے ساتھ (الحکم) کہتا ہے۔ یعنی ایسا کرنے سے یہ ہوگا۔ جہالت کی توہم پرستی یا مذہبی رسوم و اعمال، اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا؟ یعنی اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، دین کے احکام پر بھی محسوس تسکون میں عمل پیرا ہوا جاتا ہے۔ اس کے مظاہر بھی ہوتے ہیں جنہیں شعائرِ اللہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ دین کے شعائر کی نگہداشت، اور مذہب کے اوہام کی میکافہ کی طور پر ادائیگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دین کے شعائر و رسوم، اس کے نظام کی مختلف کڑیاں اور اس کے بلند و بالا نصب العین کے حصول کے ذرائع ہوتے ہیں مذہب میں یہ ارکان مقصود بالذات سمجھے جاتے ہیں۔ اسی کو توہم پرستی کہتے ہیں۔ یعنی ان کی اہمیت انسان کے ذہن اور فطریات (یا اندھے عقائد) پر مبنی ہوتی ہے۔ علم و بصیرت اور دلائل و براہین پر نہیں۔ یاد رکھئے! ہر وہ عمل جو ”کیوں“ کا معقول

جواب نہ دے سکے، تو ہم پرستی کے زمرے میں آجاتا ہے۔

اس کے بعد حج کی جزئیات کی طرف آئیے۔

حج کا اجتماع اسلامی نظام کا رکن رکین ہے اس لئے اس کا انتظام و انصرام امت مسلمہ کے ذمہ ہوگا اور یہ ایسی طور پر مختص ہوگا اس امت کے نمائندگان کے لئے، لیکن قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ سے جو کہا تھا کہ عالم انسانیت کو اس کی دعوت دو، تو اس سے مترشح ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو بھی دعوت دی جاسکے گی

حج اور غیر مسلم | کہ وہ مبصرین کی حیثیت سے اس میں شریک ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہ نظام ان کی فلاح و بہبود کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ سورہ حج میں ہے :-

وَ اٰذِنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰٓى كُلِّ صٰمِرٍ يَّٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲-۲۳)

(ہم نے ابراہیمؑ سے کہا کہ) وہ لوگوں میں اعلان کر دے کہ وہ حج کی تقریب پر یہاں آئیں۔ دنیا کے دور دراز گوشوں سے لمبی لمبی مسافرتیں طے کرتے، پیادہ یا ایسی سواریوں پر جو سفر کی مشقت سے خنک کر چور ہو جائیں۔ وہ آئیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہ نظام ان کی (یعنی نوع انسان) کی منفعت عامہ کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

دوسری جگہ ہے :-

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ الْيَدِ سَبِيْلًا . وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفِيْرٌ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ . (۲۴)

سو جو لوگ بھی اس مقام تک پہنچنے کی راہ پائیں، وہ یہاں جمع ہوں بشرطیکہ ان کا یہاں جمع ہونا خالص خدا کے لئے ہو، مگر وہ بندگان مصلحتوں کے لئے نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قسم کے نظام اور اس کے اس قسم کے اجتماعات کی عادت سے انکار کریں، وہ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ خدا تو تمام اقوام عالم سے بے نیاز اور مستغنی ہے۔

یہاں کہا یہ گیا ہے کہ اس اجتماع میں شرکت کے لئے شرط اولیں یہ ہے کہ اس سے مقصد پیش نظر انسانیت کی بہبود ہو۔ کسی کی مخالفت اور تخریب نہ ہو۔ (بشرط سے یہی مراد ہے۔ یعنی خدا کے مقرر کردہ مقصد کے حصول کے لئے)۔ دوسری جگہ اس کی تصریح اس طرح کر دی کہ

جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءً ۙ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْمُبَادِرُ . وَمَنْ شَرِدْ فِيْهِ بِالْحَادِ بُطْلَمٌ ۚ فَاِنَّهٗ

مِنْ عَذَابِ الْيَمِّ (۲۲)

ہم نے اس مقام اور اس اجتماع کو، یہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھا ہے۔ لیکن جو شخص، اگر وہ یا قوم یہاں یہ ارادہ لئے ہوئے آئے کہ ایسا جھگڑا قائم کیا جائے جس میں کمزور اقوام پر ظلم اور زیادتی کی جائے، تو وہ اس اجتماع کے مقصدِ عظیم سے دور ہٹ جائے گا۔ اور اسے اس کی سخت سزا دی جائے گی۔

یہ شرائط، اس اجتماعِ عظیم کے سلسلہ میں بھی نافذ ہوں گی اور ان چھوٹے چھوٹے اجتماعات کے لئے بھی جو عند الضرورت منعقد کئے جائیں۔ انہیں عمرہ کہا جاتا ہے، خواہ وہ اسی اجتماع کی ذیلی کمیٹیاں ہوں یا دوسرے اوقات میں منعقد ہونے والی کمیٹیاں۔ (۱۶۶)

یہاں شرطِ اولین یہ عائد کی گئی ہے کہ اس میں شامل ہونے والے اس کے مقصد پر متفق ہوں اور کسی پر ظلم و زیادتی کے لئے جمع نہ ہوں۔ چونکہ قریشِ مکہ (جنہیں مشرکین کہہ کر پکارا گیا ہے) اس نظام اور اس کے مقاصد کی شروع سے مخالفت کرتے چلے آ رہے تھے، اس لئے اعلان کر دیا گیا کہ وہ اس میں شامل نہیں ہو سکیں گے (۹ ز ۹)۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا اعلان اُسی وقت کیا جاسکتا تھا جب مکہ، اسلامی نظام کی تحویل میں آگیا ہو۔ اس سے پہلے تو حالت یہ تھی کہ یہی مشرکین (قریشِ مکہ) خود مسلمانوں کو کعبہ کے قریب نہیں آنے دیتے تھے (۱۶۶) چنانچہ یہ اعلان فتحِ مکہ کے بعد، پہلے اجتماعِ عظیم میں کیا گیا۔ اسی لئے اسے قرآنِ کریم میں یَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ (۹) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس اجتماع (حج) کا حقیقی مفہوم کیا تھا۔ آج اقوامِ عالم جن مقاصد کی تلاش، لیگ آف نیشنز (آنجہانی) اور اقوامِ متحدہ (U.N.O.) جیسے اداروں میں کر رہی ہیں، قرآنِ کریم نے اس

حج کا مقصد

کا تصور آج سے چودہ سو سال پہلے پیش کر دیا تھا، اس فرق کے ساتھ کہ اس نے (اقبال کے الفاظ میں) جمعیتِ اقوام کی جگہ "جمعیتِ آدم" کا تصور دیا تھا۔ جمعیتِ اقوام، کمزور قوموں کے خلاف ظلم اور زیادتی کے لئے وجود میں لائی جاتی ہے۔ حج نوعِ انسان کی منفعت کے لئے۔ اسی لئے یہ واضح کر دیا کہ اس میں جو قوم، ظلم اور زیادتی کی نیت سے شامل ہوگی، نہ صرف یہ کہ اسے اس سے نکال دیا جائے گا بلکہ اس کی الم انگیز سزا بھی دی جائے گی۔

یہ ہے نوعِ انسان کے عالمگیر اجتماع کا وہ نقشہ جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔

آگے چل کر بتایا جائے گا کہ اس اجتماع میں شریک ہونے والوں کے خورد و نوش کا (اُس زمانے کے حالات کے پیش نظر) کیا انتظام تجویز کیا گیا تھا۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اس میں شامل ہونے والوں سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے ساتھ فالتو جانور لائیں جو ان کے کھانے پینے کے کام آئیں۔ اور جو لوگ اس میں شریک نہ ہوں، وہ اپنے صحائف ان لوگوں کے ہاتھ بھیج دیں۔

اب آئیے ان رسوم اور شعائر کی طرف جن کا اس اجتماع کے سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ (واضح رہے کہ چونکہ آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ کا تعلق حج سے نہیں اس لئے انہیں یہاں پیش نہیں کیا جا رہا۔ انہیں بعد میں سامنے لایا جائے گا۔ فرمایا:-

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ - فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحَلَّهُ - فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ - فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ - تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ - ذَلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلَهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ - وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ - (۱۹۶)

تم نے دیکھا کہ نظام عدل و مساوات کے قیام اور استحکام کے لئے کس قدر جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تقاضا کرتا ہے، اجتماعات ہوتے ہیں جن میں باہمی مشاورت سے اس عظیم پروگرام کی تکمیل کے طریقے سوچے جائیں۔ انہی اجتماعات کا نام حج اور عمرہ ہے۔

ان اجتماعات کا مقام، ہمتا ہے نظام کا مرکز، یعنی کعبہ ہے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ تم وہاں پہنچنے سے روک دیئے جاؤ، تو تم سے جو کچھ آسانی سے ہو سکے، تحفہ وہاں بھیج دو (تاکہ وہ ان لوگوں کے کام آئے جو اس مقصد کے لئے وہاں جمع ہوئے ہیں)۔ جب تک یہ صحائف اپنی منزل تک نہ پہنچ جائیں، تم بھی (ان لوگوں کے ساتھ قلبی ہم آہنگی قائم رکھنے کے لئے) حجامت نہ بنواؤ۔ جب وہ وہاں پہنچ جائیں تو پھر تم (ان لوگوں کی مطابقت کرتے ہوئے) اپنے سر کے بال منڈواؤ۔ لیکن اگر تم میں سے کوئی مریض ہو، یا اُس کے سر میں کوئی تکلیف ہو، تو وہ اس کے بالوں میں روزے رکھ لے یا کوئی عطیہ دیدے یا کوئی اور عمل خیر کرے جسے وہ اپنے اوپر واجب قرار دے لے پھر جب تم حالت امن میں ہو (اور ان اجتماعات میں خود شریک ہو سکو)، تو تم میں سے جو شخص حج اور عمرہ دونوں سے

مستفید ہونا چاہیے، لہذا جو تحفہ میسر آئے ساتھ لے جائے۔ جسے کوئی تحفہ ذیل سکے تو وہ حج کے دوران میں تین دن کے اور واپسی برسات دن کے، روتے رکھ لے، اور یوں دس دن کے روزے پورے کر لے۔ یہ اس کے لئے ہے جس کے اہل و عیال اس کے ساتھ کعبہ میں موجود نہ ہوں۔

باد رکھو! ان اجتماعات سے اصل مقصد تو قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنا ہے، لیکن ان تفسریات پر بعض رسوم بطور تلقی شعائر اختیار کر لی جاتی ہیں۔ ان سے مقصود، باہمی یک رنگی اور ہم آہنگی ہوتا ہے جس کا مظاہرہ محسوس شکلوں میں ہی ہو سکتا ہے۔ رسوم اپنی نگاہ اصل مقصود پر رکھو۔ یعنی قوانین خداوندی کی نگہداشت پر۔ اگر ایسا نہ کرو گے (اور محض رسومات ہی کو اصل مقصود سمجھنے لگ جاؤ گے) تو اس کا نتیجہ سخت تباہی ہوگا۔

اس سے پہلے (۱۹۰ میں) بتایا جا چکا ہے کہ تقویم (کیلنڈر) کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ اس سے اجتماع حج کی تاریخوں کا تعین ہو سکے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ حج کا اجتماع تو ذی الحجہ کے مہینے میں مقرر ہوا تھا لیکن اس سے ایک ماہ قبل اور ایک ماہ بعد بھی حرمت کے مہینے مقرر کر دیئے گئے تھے تاکہ لوگ امن و عافیت سے آنے جانے کا سفر کر سکیں۔ اور نستی کی رسم قدیم کو ختم کر دینے کا مطلب یہ تھا کہ ان مہینوں میں تغیر و تبدل نہ کیا جاسکے۔ اسی لئے اگلی آیت میں کہا:

الْحَجَّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ ۖ فَمَنْ قَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفْتٌ وَلَا فُسُوقٌ
وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۚ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ
خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ وَاتَّقُونِ يَا أُولِيَ الْأَلْبَابِ (۲۱۶)

حج کے اجتماعات کے مہینے معلوم و متعین ہو لے چاہئیں۔ پھر جو شخص اس فرض کو اپنے ذمے لے، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تمام شرائط پوری کرے۔ ازاں جملہ یہ بھی کہ اس اجتماع میں کوئی بات یا یہ ثقاہت سے گری ہوئی نہیں ہونی چاہیے۔ نہ فحش کلامی یا دیگر جنسی میلانات کی باتیں۔ نہ درشت کلامی یا کوئی اور معیوب حرکت۔ نہ ناہمی مشاورت میں، دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے لئے یوہی باتیں بڑھاتے جانا اور مساطرا نہ جنگ و جدل پر اتر آنا۔ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہونی چاہیے۔ مختصر اہل سمجھو کہ یہ اجتماعات نوع انسان کی منفعت بخشیدوں کی تنجا ویز سوچنے کے لئے ہیں (۲۱۶)۔ سوان میں کوئی بات ایسی نہ ہو جو کمٹیں اس مقصد سے دور لے جائے۔ یاد رکھو! تمہارا ہر عمل خدا کے قانون مکافات کی نگاہ میں ہونا ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ اس سفر کے لئے تمہارا سے پاس زاد راہ بھی ہو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ تم وہاں

بھیک مانگنے کی ذلت سے محفوظ رہو گے۔

نیز ان اجتماعات میں شریک انہی کو ہونا چاہیے جو عقل و بصیرت کی رو سے سوچ سکیں کہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کس طرح کی جاسکتی ہے (اور انہیں عملاً نافذ کرنے کی صورتیں کیا ہیں)۔

یہ مفہوم اس قدر واضح ہے کہ اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ البتہ ایک نکتہ خصوصی توجہ کا متقاضی ہے۔ آیت کے اخیر میں کہا گیا ہے کہ **وَ اتَّقَوْنَ لِلّٰہِ الْاَلْبَابَ** (۲/۱۹۷) یہاں تقوٰے کے لئے صاحب عقل و بصیرت ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

عربی لغت میں، **اَلْتَّيْبُ**۔ ایسی تیز اور خالص عقل کو کہتے ہیں جو جذبات کی آمیزش سے پاک ہو۔ اس کی جمع **اَلْبَاب** ہے۔ لہذا، **اولی الالباب** ان صاحبان عقل و بصیرت کو کہیں گے جو جذبات سے الگ ہٹ کر، معاملات پر عقل خالص کی رو سے غور و فکر کریں۔ علامہ اقبالؒ نے عقل کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ عقل خود ہیں اور عقل جہاں ہیں۔ عقل خود ہیں وہ جو انسان کو صرف اس کے ذاتی اور انفرادی مفاد کے حصول کی تدبیر بتاتی ہے، اور عقل جہاں ہیں وہ جو اسے نوع انسان کی رلوبیت عامہ پر آمادہ کرتی ہے۔ جب انسانی عقل، قرآن کریم کی روشنی میں روبعل ہو تو وہ عقل جہاں میں بن جاتی ہے۔ قرآن کریم مومنین کو **اولی الالباب** کہہ کر پکارتا ہے۔ مثلاً سورۃ الطلاق میں ہے: **فَاَتَّقُوا اللّٰہَ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا۔ (۱۵۹)** اسے ارباب عقل و بصیرت! یعنی وہ گروہ جو ایمان لائے ہو، قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اس مقصد کے لئے خدا نے تمہاری طرف یہ ضابطہ ہدایت بھیجا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، ایمان کے لئے عقل و بصیرت کی ضرورت ہے۔ لیکن اسی عقل کی جو وحی خداوندی کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرے۔ انسانی عقل اور وحی کی روشنی کی مثال، انسان کی آنکھ اور سورج کی سی ہے۔ سورج کی روشنی تو عالم گیر ہوتی ہے۔ لیکن اس سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو بینا ہو اور اپنی آنکھیں کھل رکھے۔ دوسری طرف، انسانی آنکھ روشنی کے بغیر بے کار ہے۔ وہ کبھی صحیح راستہ متعین نہیں کر سکتی۔ [اس ضمن میں جلد اول میں تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔ دیکھئے صفحہ ۵۵]

آیت (۱/۱)؛ ص ۱۱۔ آیت (۲/۱)؛ ص ۲۵۸۔ آیت (۲/۱۷۷)

تقریب حج کے سلسلہ میں ضروری ہدایات دیتے ہوئے۔ درمیان میں ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرا دی جب کہا کہ

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ (۱۹۸)

۲
۱۹۸

اس حقیقت کو فراموش نہ کرو کہ یہ اجتماعات کوئی "یاترا" کی قسم کی چیز نہیں کہ وہاں دنیاوی معاملات

کی کوئی بات نہ ہو سکے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہم ان اجتماعات میں، قلت کے لئے سامانِ نشوونما اور معاشی وسائل کے طلب و اخذ کے لئے جدوجہد کرو۔

یہاں اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ان اجتماعات کا مقصد محض اعتقاداً اور رسماً ایک فریضہ ادا کرنا یا "گناہ بخشوانا" نہیں۔ یہ تو (اقبال کے الفاظ میں) از کلید دین در دنیا کشاد — دین کی چابی سے دنیا کے ہر دروازے کو کھولنے کا نظام ہے۔ اس لئے اس اجتماع میں اپنے اقتصادی اور معاشی مسائل کو بھی پیش نظر رکھو۔ (مثلاً) اپنی مصنوعات کی نمائش لگاؤ۔ دوسری قوموں کے نمائندوں کے ساتھ معاشی اور تجارتی معاہدات کرو۔ چنانچہ (۲۲) میں کہا گیا ہے کہ جو زاید از ضرورت جانور اپنے ساتھ لاؤ، ان سے سفر میں بھی فائدے اٹھاؤ۔ یعنی ان پر مال تجارت اور مصنوعات وغیرہ لا کر لاؤ۔ (اس اہم نکتہ کو دو ہی آیات آگے چل کر (۲۳) میں نہایت حسن و خوبی سے واضح کیا گیا ہے۔ اس کے لئے آپ تھوڑا سا توقف فرمائیں)۔

آیت (۲۴) کا باقی حصہ یہ ہے :-

فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ - وَاذْكُرُوا

۲
۱۹۸

كَمَا هَذَا كُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ - (۲۴)

جب تم ان مسائل کے طے کر لینے کے بعد عرفات کے میدان سے واپس آ جاؤ تو مشعر الحرام کے قریب آ کر پھر جمع ہو اور جو ہدایات کہیں وہاں دی گئی ہیں، عقل و شعور کی روشنی میں ان پر غور و فکر کرو۔ تم اس سے پہلے خیال کرتے تھے کہ حج محض ایک یاترا ہے۔ یہ تمہاری غلط فہمی تھی۔ یہ نظام خداوندی کا اہم گوشہ ہے جس کا بنیادی تعلق تمہاری تمدنی، معاشرتی اور معاشی زندگی سے ہے۔

حج کی پوری غرض و غایت اس آیت کے اندر مرکوز ہے، باقی نظام رسوم و مناسک اس کے لوازمات ہیں۔ اس میں عرفات اور مشعر الحرام کی اصطلاحات انتہائی غور و فکر کی متقاضی ہیں۔ انہیں سمجھنے کے لئے بات ذرا پیچھے سے شروع کی جائے گی۔

رمضان کے مہینے میں، اسلامی نظام کے قیام و استحکام کے لئے تربیتی کیرس کا اہتمام ہوا۔ اس میں سپاہیانہ زندگی کے جو گرہ ہونے کے علاوہ، خصوصی شہسواروں میں (جنہیں اعتکاف فی المساجد کہا گیا ہے) (۲۵) اپنے اپنے مقامی

مسائل پر غور و فکر کیا گیا۔ جشن نزولِ قرآن (عید الفطر) کے اجتماع میں ان نمائندگان کو چنا گیا جو ملت کے آئندہ اجتماعِ عظیم (حج) میں شرکت کریں گے۔ یہ نمائندگان (اور ان کے علاوہ اپنے طور پر مبصرین) عازمِ حج ہوئے۔ ابتدائی کارروائی کے بعد کانفرنس کا اصلی سیشن ایک وسیع و عریض میدان میں ہونا طے پایا۔ وہاں سب سے پہلے مختلف ممالک (کرہ ارض) کے دور دراز گوشوں سے آئے ہوئے نمائندگان کا باہمی تعارف ہوا۔ اسی باہمی تعارف کی نسبت سے

عرفات

اسے عرفات کا میدان کہہ کر پکارا گیا۔ (عرفات۔ عرف۔ تعارف)۔ اس تعارف کے بعد سیشن کے صدر نے، جو مرکزی مملکتِ اسلامیہ کا سربراہ یا اس کا نمائندہ ہوگا، خطبہٴ صدارت ارشاد فرمایا۔ اس میں اس نے مملکت کی سالِ گزشتہ کی کارروائی پر روشنی ڈالی اور آئندہ سال کے پروگرام کے بنیادی خط و خال کی وضاحت کی۔ اس پروگرام کو اپنے ساتھ لیکر، یہ نمائندگان، ”مشعر الحرام“ میں جمع ہوئے۔ مشعر کے معنی ہیں وہ مقام جہاں عقل و شعور کی رو سے معاملات پر بحث و تحقیق کی جائے۔ اور چونکہ ان معاملات کا تعلق نظامِ خداوندی سے ہوگا، اس لئے اسے حرام — یعنی واجب الاحترام بھی قرار دیا — یہاں یہ نمائندگان حسب ضرورت دو یا تین دن تک قیام کریں گے۔ اس پروگرام کی عملی جزئیات اور ان کے سلسلہ میں باہمی تعاون و تناسر کے سلسلے میں بحث و تحقیق بھی ہوگی، اور ایک دوسرے کی ضیافتیں بھی — آج دوپہر کا کھانا، نمائندگانِ پاکستان کی طرف سے رات کا کھانا اہل افغانستان کی طرف سے (وقس علی ذالک)۔ ان ضیافتوں کے لئے وہ جانور ذبح ہوں گے جنہیں یہ لوگ اس مقصد کے لئے ساتھ لائے تھے یا جو دوسرے لوگوں نے تحفہً بھیجے تھے — (جانور ہی نہیں، کھانے پینے کی دوسری چیزیں بھی بطور ہدیہ — تحفہ)۔ اس قسم کے تفصیلی تبادلہٴ خیالات کے بعد یہ لوگ اپنے اپنے ملکوں کی طرف واپس چلے جائیں گے اور یوں حج کے اجتماع کی تکمیل ہو جائے گی۔

مشعر الحرام (منیٰ) میں چند دنوں تک قیام ہے گا۔ فرمایا:-

وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ - فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ - وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقَى - وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ

تُحْشَرُونَ - (۲۳)

اس مقام پر گنتی کے دنوں تک قیام رہنا چاہیے۔ جن لوگوں کو واپسی کی عجلت ہو وہ دو دن کے بعد وہاں سے خست ہو جائیں۔ جو زیادہ دیر بٹھریں وہ واپسی میں تاخیر کر دیں۔ نہ ایسا کرنے میں کوئی ہرج کی بات ہے نہ ویسا کرنے میں مقصد تو پروگرام کی تکمیل ہے جتنے وقت میں ہو جائے۔ اس تمام دوران میں دیکھنا یہ چاہیے کہ تمہارا

ہر قدم اس نضب العین کی طرف اٹھ رہا ہو جس کے حصول کے لئے تم یہاں اکٹھے ہوئے ہو۔

سورہ حج میں ہے کہ مشعر الحرام کے قیام کے دوران یہ لوگ کھائیں پئیں بھی۔

ثُمَّ الْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَالْيَوْفُوا نَذْرَهُمْ وَالْيَطَّوْفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ۔ (۲۳)

اور باہمی مشاورت سے ایسی تدابیر بھی سوچیں جن سے ان کی ملی زندگی کی کٹافتیں دور ہو جائیں اور وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں جنہیں انہوں نے نوع انسان کی بہبود کے سلسلہ میں اپنے اوپر لے رکھا ہے، اور اس طرح یہ ملت اس مرکز کی نگہبان بن جائے جو دنیا میں انسانوں کی حریت و آزادی اور قوت و اقتدار خداوندی کا نشان ہے اور جسے اس باب میں شرفِ اولیت اور سبقت حاصل ہے۔

اس میں ایک لفظ تَفَثُ آیا ہے۔ اس کے معنی امیل کچیل (کٹافت) دور کرنے کے ہیں۔ ان معانی کی رُو سے، کہا یہ جاتا ہے کہ اس کا مطلب ناخن کتر وانا، بغل اور زیر ناف کے بال صاف کرنا، سر کے بالوں کی امیل کچیل دور کرنا ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حج کے سلسلہ میں اتنے دنوں تک دن رات کی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد اس میں

نہانے دھونے کا مفہوم بھی ہو، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مشعر الحرام میں خطبہ عرفات میں دیئے گئے پروگرام کی جزئیات پر جو بحث و تحقیق ہوگی تو اس ضمن میں تَفَثُ کے

ملی کٹافت دور کریں

معنی ملت کی کٹافتیں دور کرنے کی تدابیر سوچنا ہوں گے۔ حج کا اجتماع ہی ملی مسائل کا حل سوچنے کے لئے ہوتا ہے۔

اس آیت (نیز ۲۴) میں کعبہ کو بیت العتیق کہا گیا ہے۔ العتیق عربی لغت میں بڑا جامع لفظ ہے جس کے معنی حریت، آزادی، شرافت، نجابت، عزت، حسن و جمال کے آتے ہیں۔ اس اعتبار سے کعبہ کے بیت العتیق ہونے کے معنی ہوں گے اُس نظام کا مرکز جو نوع انسان کے لئے ان خصوصیات کا حامل ہو۔ وہ نظام جو عالمگیر انسانیت کو ان خصائص کبریٰ کی ضمانت دے۔ نیز اس کے معنی ہوتے ہیں ایسی نادی

بیت العتیق

جس پر کسی کا اثر و غلبہ نہ ہو۔ اس کے معنی خود قوت بھی آتے ہیں۔ چونکہ سبقت، یعنی سب سے آگے ہونا، بجائے خوش ایک اعلیٰ خصوصیت ہے، اس لئے اس کے معنی سبقت یا قدیم ہونے کے بھی آتے ہیں بغور فرمائیے کہ قرآن کریم نے اس ایک لفظ میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جس کا ضامن نظامِ خداوندی ہے۔

کعبہ کو بیت المعمور بھی کہا گیا ہے (۲۵)۔ یعنی خدا کا آباد گھر۔ یا برکات و سعادات سے معمور گھر۔ بیت الحرام بھی (۲۶) یعنی واجب الاحترام گھر۔ اسی کو متعدد مقامات پر مسجد الحرام کہہ

بیت المعمور

بھی پکارا گیا ہے۔ (مثلاً ۲۴۱۔) دیگر مقامات)۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بتی (میرا گھر) کہا ہے۔ انسی نسبت سے اس نے اپنے آپ کو رب البیت کہا ہے (۲۴۱)۔ یعنی اس گھر کا مالک۔ (کعبہ کے متعلق دیگر تصریحات پہلے گزر چکی ہیں)۔

(۱۰)

حج کے ضمن میں، بعض چیزوں کو شعائر اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ شعائر کی معنوی بحث جلد اول ص ۱۲۲ زیر آیت (۲) میں گزر چکی ہے۔ اور صفا اور مرثوہ کے شعائر اللہ ہونے کا ذکر اسی جلد میں آیت (۲۴۱) کے تحت آچکا ہے۔ اس کے علاوہ، سورہ مائدہ میں ہے :-

شعائر اللہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحْلُوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِينَ الْبَيْتِ الْحَرَامِ يَنْتَعُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ (۲۴۱)

اے جماعتِ مومنین! جن چیزوں کو اس نظام کی محسوس علامات قرار دیا جائے، ان کی بے حرمتی مت کرو۔ اس لئے کہ ان کی بے حرمتی اس امر کی دلیل ہوگی کہ تمہارے دل میں نظامِ خداوندی کا احترام نہیں۔ نیز جن مہینوں میں جنگ کا سلسلہ ملتوی کیا جاتا ہے، ان کی بھی بے حرمتی مت کرو۔ ان کا احترام ملحوظ رکھو۔ جو جانور یا شخاف حج کی تقریب کے سلسلہ میں بھیجے جائیں، وہ بھی شعائر... میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان کی بھی بے حرمتی نہ کرو۔ یا جو لوگ اس اجتماع میں شرکت کے لئے جائیں تاکہ وہاں ملت کے معاشی مفاد اور زندگی کو قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ کرنے کی تدابیر پر غور و فکر کریں، ان کا بھی احترام کرو۔

بیت الحرام، شہر الحرام اور ان تحفوں اور جانوروں کے احترام کا ذکر (۲۴۱) میں بھی آیا ہے۔ ان جانوروں کے شعائر اللہ ہونے کے متعلق (۲۴۱) میں بھی کہا گیا ہے۔ آیت (۲۴۱) میں کہا گیا ہے کہ جو شعائر اللہ کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کے دل میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت (تقویٰ) کا جذبہ ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ شعائر اللہ اپنی ذات میں مقدس یا محترم نہیں ہوتے۔ ان کا احترام اس امر کی دلیل ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں قوانینِ خداوندی کے احترام کا جذبہ موجزن ہے۔ ان شعائر کی تعظیم اسی جذبہ کا مظہر ہوتی ہے۔ (۲۴۱)

(۱۱)

حج کے اجتماع میں احرام باندھا جاتا ہے۔ اس کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا۔ البتہ سورہ مائدہ میں ہے کہ شکار کرنے کی ممانعت ہے وَأَسْتَمُ الْحُرْمِ (۲۴۱) جب تک تم حالتِ احرام میں ہو۔ یعنی اس اجتماع

احرام

تَحَجُّجِ كِي تَقْرِیبات ختم ہو جانے کے بعد کہا کہ
ثُمَّ أَفِضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ. إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ
رَحِيمٌ۔ (۲/۱۹۹)

(-)

قربانی

قرآن کریم بتاتا ہے کہ خدا کا قرب حاصل کرنے کے لئے کچھ نذرانہ پیش کرنے کی رسم زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ چنانچہ اس نے سورہ مائدہ میں تمثیلاً ایک قصہ یوں بیان کیا ہے۔

وَأَتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَى آدَمَ بِالْحَقِّ - إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُسَقَبْ مِنَ الْآخَرِ - قَالَ لَا قُوَّةَ لَكَ - قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ - (٥٤)

اے رسول! ان سے آدم کے دو بیٹوں کا قصہ ٹھیک ٹھیک بیان کر دو (قصہ تو یہ تو رات میں بھی مذکور ہے لیکن اس میں بہت سی رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں اس لئے اسے ٹھیک ٹھیک بیان کیا جاتا ہے)۔ ان دونوں بھائیوں نے (اپنے خیال اور عقیدہ کے مطابق) خدا کا تقرب حاصل کرنے کے لئے قربانیاں پیش کیں۔ ان میں سے (ان کے عقیدہ کے مطابق) ایک کی ”قربانی“ قبول ہو گئی اور دوسرے کی نہ ہوئی۔ اس پر اسے غصہ آگیا اور وہ اپنے

بھائی سے کہنے لگا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ اس نے کہا کہ اللہ متقیوں کی پیش کش قبول کیا کرتا ہے۔

اس میں لفظ قُرْبَانًا آیا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس سے مراد کسی جانور کا ذبح کرنا ہو۔ اس کا ترجمہ ”پیش کش“ زیادہ موزوں ہوگا۔ جس طرح بتوں کے استھانوں پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں، اسی قسم کی کوئی یہ چیز بھی ہو سکتی ہے۔ بہر حال قُرْبَانًا کا لفظ یہاں آیا ہے۔

یہودیوں کے ہاں البتہ ”سوختنی قربانی“ کا رواج تھا۔ معتقدین اپنی اپنی پیش کش مبیکل میں لاتے تھے۔ یہ مختلف قسموں کے کچوان بھی ہوتے تھے۔ پھل پھلواری اور سبزی ترکاری بھی۔ اور بعض اوقات ذبیحہ کے لئے جانور بھی۔ انہیں نذر یا قربانی کہا جاتا تھا۔ کاہن اس میں سے کچھ حصہ آگ میں جلاتا تھا۔ عقیدہ یہ تھا کہ اس کی خوشبو سے خدا خوش ہوتا ہے۔ (دیکھئے عہد نامہ عتیق۔ کتاب احبار۔ باب ۲۳)۔ اسلام میں ایسا کوئی حکم نہیں تھا۔ یہودیوں کا اسلام کے خلاف ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اگر یہ وہی دین ہے جسے حضرت موسیٰ نے پیش کیا تھا تو اس میں سوختنی قربانیوں کا حکم کیوں نہیں؟ سورۃ آل عمران میں ہے، اَلَّذِیْنَ خَالَوْاْ اِنَّ اللّٰهَ عٰهَدَ اِلَیْہِمْ اَلَّا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَاْتِیْنَا بِقُرْبٰنٍ تَّامَّلُوْهُ الشَّارُ۔۔۔۔۔ (۲۳)۔ ”یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تم اس رسول پر ایمان نہ لاؤ جب تک یہ ایسی قربانی (کا حکم) نہ لاتے جسے آگ کھا جائے“ قرآن کریم میں قُرْبَانًا کا لفظ انہی دو مقامات پر آیا ہے مسلمانوں کے سلسلہ میں قربانی کا لفظ کہیں نہیں آیا۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ کعبہ وادی حجاز میں واقع ہے جہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ (وادی غیر ذی ندرع - ۳۱)۔ اسی مقام پر ہزاروں، لاکھوں افراد پر مشتمل حج کا اجتماع ہونا تھا۔ ہر سہ ماہی کو بھی کھانے کو بمشکل ملتا تھا، اتنے کثیر اجتماع کے خود و نوش کا انتظام کیا کر سکتے تھے؟ اس کے لئے، ان آنے والوں کو اپنا انتظام آپ ہی کرنا تھا۔ اُس زمانے میں کھانے پینے کا بہترین اور ممکن العمل انتظام یہی ہو سکتا تھا کہ یہ لوگ فالتو جانور (یعنی اپنی سواریوں سے زائد جانور) ساتھ لائیں۔ انہیں عند الضرورت یہاں ذبح کریں۔ خود بھی کھائیں اور دوسروں کو بھی کھلائیں۔ قرآن کریم میں بتقریب حج جانور ذبح کرنے کا یہی مقصد بتایا گیا ہے۔ ان فالتو جانوروں کو ساتھ لانے کے سلسلہ میں کہا ہے:-

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰی اَحْبَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ یَجْعَلُہَا اِلٰی السَّبِیْتِ الْعَتِیْقِ - (۲۲)

ان جانوروں کے متعلق یہ تصور ذکر لینا کہ یہ ان سانڈوں کی طرح ہیں جنہیں یہ لوگ اپنے بتوں کے لئے وقف کر دیتے ہیں (مقدس بن گئے ہیں۔ بالکل نہیں۔ یہ عام جانوروں کی طرح ہیں جن سے تم دوران سفر، سواری یا بار برداری کے سلسلہ میں مختلف کام لیتے ہو۔ ان سے بھی اسی قسم کے کام لو تا آنکہ یہ تمہاری منزل مقصود اکعبہ تک پہنچ جائیں۔

اس کے بعد

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي آيَاتٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ - فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطِيعُوا أَمْرَ الْفَقِيرِ - (۲۳)

انہیں حج کے دنوں میں، اللہ کا نام لے کر ذبح کرو۔ ان کا گوشت خود بھی کھاؤ اور اگر وہاں کوئی مصیبت زدہ محتاج ہو، تو اسے بھی کھلاؤ۔

ذرا آگے چل کر کہا :-

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّنْ شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ - فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافٍ - فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطِيعُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ - كَذَلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ - (۲۴)

وہ اونٹ (جنہیں تم ساتھ لاتے ہو) شعائر اللہ میں تو شامل ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس طرح یہ تمہارے لئے مقدس بن جاتے ہیں۔ یہ تمہارے فائدے کے لئے ہیں۔ انہیں اللہ کا نام لے کر قطار در قطار ذبح کرو اور جب وہ ذبح ہو کر کسی پہلو پر گر پڑیں تو ان کا گوشت خود بھی کھاؤ اور دوسرے مصیبت زدہ محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ ہم نے ان مویشیوں کو تمہارے تابع تسخیر کر دیا ہے تاکہ تم دکھانے پینے کی طرف بے فکر ہو کر اپنے بلند مقصد کے حصول کے لئے ایسی کوشش کر سکو جو بھروسہ مند کام کی حامل ہو۔

ان اونٹوں اور دیگر مویشیوں کو شعائر اللہ (واجب الاحترام) اس لئے قرار دیا گیا کہ اُس زمانے میں مویشیوں کی لوٹ مار عام تھی۔ (غنیمت کے لفظ کا مادہ ہی غنم ہے جس کے معنی بھیڑ بکریاں ہیں)۔ حجاج کے ان قافلوں میں یہ مویشی کثرت سے شامل ہوتے تھے۔ انہیں لوٹ مار کرنے والوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لئے کہہ دیا کہ یہ شعائر اللہ ہیں، کوئی ان کی طرف ہنگامہ نہ دیکھے۔ انہیں بخیر و عافیت ان کی منزل گاہ - کعبہ - تک پہنچنے دیں۔ اسی لئے ان کے گلے میں نشان کے طور پر پٹہ (قلادہ) بھی ڈال دیتے تھے کہ یہ پہچانے جاسکیں۔ (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) جو لوگ خود حج کے لئے نہیں جاتے تھے وہ اپنی طرف سے کچھ تحائف حاجیوں کے ساتھ کر دیتے تھے۔ ان تحائف میں جانور بھی ہوتے تھے، اور کھانے پینے کی بعض دوسری اشیاء بھی۔ انہیں ہدیہ (تحفہ) کہا جاتا تھا۔ ان ہدایا کو بھی کعبہ تک پہنچایا جاتا تھا۔ یعنی یہ وہیں پر کام آنے کے لئے ہوتے تھے۔ آیات (۱۹۶) اور (۱۹۵) میں بھی انہی ہدایا اور قلاب کا ذکر ہے۔ اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ حج کے لئے جانے والوں کا کوئی قافلہ کعبہ تک نہ پہنچ سکے، تو ان ہدایا کو وہاں

بھیج دیا جائے (۱۱۱)۔ کیونکہ یہ حجاج کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ حج کی تقریب پر جانور ذبح کرنے کا مقصد خورد و نوش کی ضروریات پورا کرنا ہے۔ چونکہ قربانیوں کے متعلق زمانہ قدیم سے یہ خیال ذہنوں میں راسخ چلا آ رہا تھا کہ ان کا خون، گوشت پوست، مہبودوں تک پہنچتا ہے۔ اس لئے، اس خیال سے کہ مسلمانوں کے تحت الشعور میں بھی اسی قسم کا کوئی عقیدہ کر وٹیں نہ لے رہا ہو، واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:-

لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ - كَذَلِكَ
سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَذَا مِنْكُمْ - وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ - (۱۱۲)

(اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لو کہ یہ جانور تمہاری ضروریات پورا کرنے کے لئے ہیں۔ یہی ان کے اس موقع پر ذبح کرنے سے مقصود ہے)۔ اللہ تک ان کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ اُس کے ہاں تو صرف یہ دیکھا جاتا ہے، کہ تم اس کے قوانین کی کس حد تک نگہداشت کرتے ہو۔ اس نے ان جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم (اپنی طبیعتی ضروریات کی طرف سے بے فکر ہو کر) خدا کے اس ضابطہ قولہ میں کو، جس سے اس نے تمہاری رہنمائی کی ہے، دنیا کے تمام قوانین و ضوابط پر غالب کر سکو (۱۱۲)۔ جو لوگ اس طرح، قوانین خداوندی کے مطابق، حسن کارنامہ انداز سے زندگی بسر کریں گے، ان کے لئے نہایت خوشگوار نتائج کی بشارتیں ہیں۔

حج کی تقریب پر جانور ذبح کرنے کا ذکر انہی آیات میں آیا ہے۔ اس سے آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ جس طرح آج کل حج کے موقع پر لاکھوں کی تعداد میں جانور ذبح کر کے پھینکے چلے جاتے ہیں اور اسے حکم خداوندی کی تعمیل تصور کیا جاتا ہے، یا عید الاضحیٰ کی تقریب پر جس طرح قربانیاں دی جاتی ہیں، ان کا دین سے کیا تعلق ہے؟ مروجہ مذہب میں ان قربانیوں کی سندیں کچھ روایات پیش کی جاتی ہیں۔ چونکہ میرے پیش نظر صرف قرآن مجید کی تشریح و تفسیر ہے اس لئے ان روایات کے متعلق بحث کرنا میرے مقصد سے خارج ہے۔ ویسے بھی روایات کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار قرآن کریم ہے۔ ان قربانیوں کی تائید میں البتہ قرآن مجید کی دو آیات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ ان کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ان میں پہلی آیت سورہ الانعام کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ۔

قُلْ إِن صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ - (۱۱۳)

اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ

ان سے کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنّا اللہ ہی کے لئے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے۔

اس میں لفظ نَسَكَ کے معنی قربانی کئے جاتے ہیں۔ لغت میں اس مادہ (ن۔س۔ك) کے معنی پاک اور صاف کرنا ہیں۔ نَسَكَ الثَّوْبَ۔ اس نے کپڑے کو دھو کر پاک اور صاف کر لیا۔ اَرْضُ نَاسِكَتٌ۔

نَسَكَ سرسبز و شاداب زمین جس پر حال ہی میں بارش ہوئی ہو۔ ان بنیادی معانی کی رو سے اس سے مفہوم کسی معاملہ کی درست اور ٹھیک کر لینا ہوتا ہے۔ نَسَكَ السَّبْخَةَ کے معنی ہیں اس نے زمین شور کو درست کیا۔ اسے جھاڑ جھنکار سے صاف کیا۔ نَسَكَ إِلَى طَرِيقَةٍ جَمِيلَةٍ اس نے اچھا طریقہ اختیار کر لیا اور پھر اس پر مداومت کی۔ راستہ اختیار کر لینے کی جہت سے کلام عرب میں نَسَكَ ہر اُس مقام کو کہتے ہیں جس پر عام طور پر آمد و رفت جاری ہو۔ یہیں سے اس کے معنی روش اور رسم کے ہو گئے۔ اور امور و مراسم حج کو بھی مناسب حج کہنے لگے۔ شاہ عبدالقادرؒ اس کے معنی ”عبادات“ کرتے ہیں۔ اور (مولانا) ابوالکلام آزادؒ ”عبادت کے سچے طریقے“ ”خالص اور سچے طور طریقے“ اس کا صحیح مفہوم ہے۔ ان معانی کی رو سے آیہ زیر نظر کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی :-

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میرے تمام فرائض زندگی اور ان کے ادا کرنے کے طور طریقے، مختصراً میری ساری زندگی حتیٰ کہ میری موت بھی خدا کے تجویز کردہ پروگرام کے لئے وقف ہے۔

مروجہ قربانی کی تائید میں سورۃ الکوتر کی آیت — فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ — بھی پیش کی جاتی ہے۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے — ”نماز پڑھ اپنے رب کے آگے اور قربانی کر“۔ ”قربانی کر“ ترجمہ کیا جاتا ہے **وَانْحَرْ** ہے۔

لُغَت کی رو سے نَحَرَ سینے کے اوپر کے حصے کو کہا جاتا ہے۔ صاحب تاج العروس نے مختلف تفاسیر کی سند سے وَانْحَرْ کے متعدد معانی لکھے ہیں۔ مثلاً (۱) نماز میں کھڑا ہو کر سینے کو باہر کی طرف نکالنا۔ (۲) نماز میں دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھنا۔ (۳) نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا۔ (۴) نماز میں نحر تک ہاتھ اٹھانا۔ (۵) اپنے سینے کو قبلہ رخ کر کے کھڑے ہونا۔ (۶) خواہشات کا قلع قمع کرنا۔

اونٹ کے ذبح کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کھڑے کھڑے، اس کے نحر (سینے کے اوپر کے حصے) کے قریب، حلق کی رگ پر نیزہ مارتے ہیں۔ اس سے نَحَرَ الْبَعِيرِ کے معنی آتے ہیں، اس نے اونٹ کو اس طرح ذبح کیا۔

لیکن لغت میں اَلنَّحْرُ و اَلنَّحْرِيُّ کے معنی ہیں ماہر، عقل مند، تجربہ کار، ہر بات کو سمجھ کر سوچ کر اختیار کرنے والا، اور اس پر مضبوطی سے عمل کرنے والا۔ چنانچہ کہتے ہیں نَحَرْتُ الشَّيْءَ عَلِمْتُ۔ میں علم کی رو سے اس معاملہ

پر حاوی ہو گیا۔

ان معانی کی رُو سے، سورۃ الکوثر کا مفہوم یہ ہوگا کہ اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ۔ اے رسول! ہم نے تجھے قرآن جیسی نعمت عطا کی ہے جو سرچشمہ ہے دنیا بھر کی برکات و سعادات کا۔ اس میں حکمت اور بھلائی کی لامتناہی باتیں ہیں جو زمانے کے ساتھ ساتھ ابھرتی اور سامنے آتی چلی جائیں گی۔ اس خیر کثیر میں کبھی کمی واقع نہیں ہوگی۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ اب تیرے لئے ضروری ہے کہ تو اپنے رب کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہے۔ خدا کے نظام ربوبیت کے قیام کے لئے اپنے فرائض منصبی کو بطریق احسن ادا کرے۔ جملہ معاملات پر علم و عقل اور تجربہ و مشاہدہ سے پوری طرح حاوی ہو اور اس کے ساتھ ہی اپنی جماعت کے لوگوں کے کھانے پینے کا بھی انتظام کرے۔ اِنَّا سَخَّرْنَا لَكَ هَؤُلَاءِ لَبَدًا۔ (۱۹۹) اس وقت تو حالت یہ ہے کہ تیری جماعت کمزور سی ہے اور مخالفین بڑی قوت اور کثرت کے مالک ہیں لیکن آخر الامر تو دیکھے گا کہ جو لوگ تیرے نظام کی مخالفت کر رہے ہیں، ان کا نام و نشان تک مٹ جائے گا اور یہی نظام جو نوع انسان کے لئے خیر کثیر کا سرچشمہ ہے، آگے چلے گا۔

یہ ہے ہماری بصیرت کی رُو سے، اس سورۃ میں وَانْحَرْ کا مفہوم۔ اس سے مروجہ قربانی کی سند لینا بعید از کار سی بات ہے۔ لیکن اگر اس آیت میں وَانْحَرْ سے مراد "اونٹ کا ذبح کرنا" لیا جائے تو اس سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ہجرت کے بعد جب رسول اللہ مدنیہ تشریف لائے تو حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی جماعت (انصاف اور مہاجر دونوں) غریب اور کمزور تھی اور مدنیہ میں یہودیوں کا بڑا زور تھا۔ ایسے حالات میں کمزور جماعتیں ہمیشہ طاقتور جماعتوں کے سہارے ڈھونڈتی ہیں اور اس کے لئے اپنے اصولوں تک کو قربان کر دیتی ہیں۔ یہودیوں کے ہاں اونٹ حرام تھا اور مسلمانوں کے ہاں حلال۔ وہ اونٹ کے ذبیحہ کو قابل اعتراض سمجھتے تھے۔ وہ مدنیہ میں اپنی قوت کی بنا پر سمجھتے تھے کہ مسلمان ان سے دب کر رہیں گے اور اونٹ کو ذبح کرنے سے محتاط رہیں گے۔ قرآن کریم نے عین اس مقام پر حکم دیا کہ مدنیہ میں "اونٹ ذبح کرو" یعنی دین کے معاملہ میں یہودیوں سے مفاہمت کا خیال نہ کرو چنانچہ اس کمزور جماعت نے تھوڑے ہی دنوں میں اتنی قوت پیدا کر لی کہ یہودی (جو اپنی فتنہ پردازیوں سے باز نہیں آتے تھے) مدنیہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ [اس ضمن میں بعض نے کہا ہے کہ عبرانی زبان میں "کوشر" حلال ذبیحہ کو کہتے ہیں۔ اَلْكَوْثَرُ (۱۹۹) اسی سے عرب ہے۔ اس اعتبار سے اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ (۱۹۹) کے معنی ہوں گے "ہم نے تجھے (اونٹ) بطور حلال ذبیحہ کے عطا کیا" لیکن ہم نے اس مفہوم کو ترجیح نہیں دی]۔

اور اگر وَانْحَرْ سے مراد بالضرورة "قربانی" لینا ہے تو قرآن کریم کی رُو سے ان شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہوگا۔

ایک تو یہ کہ تحریف اور نٹ ذبح کرنے کو کہتے ہیں، کسی اور جانور کے ذبح کرنے کو نہیں۔ اس لئے ”قربانی“ صرف اونٹوں کی دی جائے گی۔ دوسرے یہ کہ (جیسا کہ سابقہ آیات میں بتایا جا چکا ہے) قرآن کریم نے ان جانوروں کے ذبح کرنے کا مقام کعبہ قرار دیا ہے۔ اس لئے یہ ”قربانی“ صرف حج کے مقام پر کی جائے گی اور تیسرے یہ کہ قرآن کریم نے بالتقریح کہا ہے کہ اس سے مقصد یہ ہے کہ ان کا گوشت تم خود بھی کھاؤ اور وہاں کے محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ لہذا صرف اتنے اونٹ ذبح کئے جائیں گے جن کا گوشت کھانے کے کام آسکے۔ بنا بریں جس طرح آجکل حج کی تقریب پر لاکھوں کی تعداد میں بھیڑ بھریاں ذبح کر کے زمین میں دبا دی جاتی ہیں اور تمام دنیا میں عید الاضحیٰ کی تقریب پر جانور ذبح کئے جاتے ہیں قرآن کریم سے اس کی تائید کسی طرح بھی نہیں ہوتی۔

(۱۰)

سنتِ ابراہیمی | قربانی کے سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ یہ سنتِ ابراہیمی کا اتباع ہے اور ذبحِ عظیم کے واقعہ سے اس کی سند لائی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں یہ واقعہ یوں مذکور ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے باں کبرسنی میں ایک لڑکا (حضرت اسمعیلؑ) پیدا ہوا۔ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ - (۳۳)۔ جب وہ بیٹا باپ کے ساتھ کام کاج (بھاگنے دوڑنے) کے قابل ہوا تو آپ نے اپنے ایک خواب کی رو سے سمجھا کہ خدائے حکم دیا ہے کہ اس بیٹے کو (اللہ کی راہ میں) قربان کر دیا جائے۔ آپ نے بیٹے سے کہا کہ

يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اِنِّىۤ اَرٰى فِى الْمَنَامِ اَنِّىۤ اَذْبَحُكَ - فَاَنْظُرْ مَاذَا تَرٰى - (۳۴)

اے میرے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ کہو تمہارا کیا خیال ہے۔

بیٹے نے جواب میں عرض کیا :-

يٰۤاَبَتِ اَفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ - سَتَجِدُنِىۤ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ - (۳۵)

ابا جان! جس بات کا اشارہ آپ کو ملا ہے، آپ (اسے) اگر حکمِ خداوندی سمجھتے ہیں تو) بلا تامل کر گزریئے۔

انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔

باپ نے بیٹے کو زمین پر لٹا دیا۔ چھری ہاتھ میں لی — فَلَمَّا اسْلَمَا وَنَلَّهٗ لِلْجَبِّیْنِ - (۳۶) تو نادیدلہ ہم نے اسے آواز دی اور کہا۔ یٰۤاِبْرٰهِيْمُ اے ابراہیم! (۳۷)

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّعْمٰیَا - اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ - اِنَّ هٰذَا لَهٗوَ الْبَلٰۤؤُا الْمُبِیْنُ - (۳۸-۳۹-۴۰)

تو نے اپنے خواب کو حقیقت سمجھ کر اپنے بیٹے کو سچ سچ ذبح کرنے کے لئے لٹا دیا۔ (یہ ہمارا حکم نہیں تھا۔ یونہی تمہارا خواب تھا) اس لئے ہم نے تمہیں اور تمہارے بیٹے کو اس نقصان سے بچالیا، اس لئے کہ جو لوگ ہمارے قوانین کے مطابق حسن کارانداز سے زندگی بسر کرتے ہیں ہم انہیں اس قسم کے نقصانات سے بچالیا کرتے ہیں۔

یہ خدا کی طرف سے ایک واضح انعام تھا جو ابراہیمؑ پر کیا گیا۔

باقی رہا وہ بیٹا جو بیکر تسلیم و رضا تھا۔

وَقَدَّيْنَاهُ بِذَبْحٍ عَظِيمٍ (۳۴)

ہم نے اسے ایک بہت بڑی قربانی کے لئے بچالیا۔

ذبحِ عظیم

اس طرح جان دے دینے کی قربانی تو ایک ثانیہ سے ختم ہو جاتی تھی۔ ہم نے اس سے ایک بہت بڑی قربانی لی۔ وہ قربانی یہ تھی کہ ملک شام کی سرداری کے بجائے ہم اپنے اس گھر کی پاسبانی کی خدمت اس کے سپرد کرنے والے تھے جو عرب کی بے برگ و گیاہ وادی میں واقع تھا اور جسے قیامت تک دنیا بھر کے توحید پرستوں کا مرکز بنا رکھا تھا۔ (۳۵)

پھر جو قربانی (حضرت) ابراہیمؑ دینا چاہتا تھا وہ اس کے بیٹے حضرت اسمعیلؑ تک محدود رہتی۔ لیکن جس قربانی کے لئے ہم نے اسے زندہ رکھا اس کا سلسلہ اس کی نسل میں بھی جاری رہنا تھا جسے (حضرت اسمعیلؑ کے بعد) اس گھر کا پاسبان بننا تھا۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ (۳۶) ذریت حضرت اسمعیلؑ اور اولاد حضرت اسمعیلؑ کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اول الذکر کے مقابلہ میں حضرت اسمعیلؑ اور ان کی اولاد کی یہ قربانی کس قدر عظیم تھی۔

قرآن مجید میں تو یہ واقعہ اسی طرح مذکور ہے لیکن تورات میں ہے کہ

ابراہام نے اپنا ہاتھ بڑھا کر چھری لی کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دے۔ اس وقت خدا کے فرشتے نے اُسے آسمان سے پکارا کہ اے ابراہام! اے ابراہام! وہ بولا میں حاضر ہوں۔ پھر اس نے کہا کہ تو اپنا ہاتھ لٹکے پر مت بڑھا اور اسے کچھ مت کر کہ اب میں نے جانا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے۔ اس لئے کہ تو نے اپنے بیٹے۔ ہاں! اپنے اکلوتے کو مجھ سے دریغ نہ کیا۔ تب ابراہام نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے۔ تب ابراہام نے جا کر اس مینڈھے کو لیا اور اس کو اپنے بیٹے کے بدلے میں سوختی قربانی کے لئے چڑھایا۔

(کتاب پیدائش - ۲۲)

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جو قربانیاں حج اور عید الاضحیٰ کی تقریب پر دی جاتی ہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے انہیں کس طرح سنتِ ابراہیمیؑ کا اتباع کہا جاسکتا ہے؛

حج کے سلسلہ میں حجرِ اسود کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے لیکن قرآن کریم میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اکثر واعظ کہا کرتے ہیں کہ اس مقدس پتھر کو حضرت خوا اپنے ساتھ جنت سے لائی تھیں۔ یہ (اقبال کے الفاظ میں) محض ”زیب داستان“ ہے بعض کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک (دوسرے رنگ کا) پتھر دیوارِ کعبہ کے ایک کونے میں اس لئے لگا دیا تھا کہ اس سے طواف کے وقت، چمکندہ کے شمار میں آسانی رہے۔ کچھ لوگوں کا خیال اس طرف گیا ہے کہ سامی اقوام میں رواج تھا کہ جب کسی معاہدہ کو محکم طور پر استوار کرنا ہوتا تو فریقین ہاتھ پر ہاتھ مارتے۔ حج کی تقریب پر، حاجی خدا سے اپنا عہد استوار کرنے کے لئے قدیم رواج کے مطابق، اپنا ہاتھ اس پتھر پر مار کر، اطمینان کر لیتے کہ ہم نے خدا سے اپنا عہد استوار کر لیا ہے۔ یہ ہر دو توجیہات قرین قیاس ہیں۔ ایک تحقیق یہ ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں ایک عرب تاجر، بسلسلہ تجارت فلسطین گیا اور وہاں، حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب قبر سے ایک پتھر تبرکاً اٹھا لایا اور اسے دیوارِ کعبہ میں نصب کر دیا۔ پہلے تو اس کی صرف تعظیم ہوتی رہی اور پھر اس کی پرستش شروع ہو گئی۔ پتھر کی پرستش شروع ہونی کتنی کہ مختلف قبائل نے اپنے اپنے بت کعبہ اور اس کے حطیم میں نصب کر دیئے۔ اور یوں خدا کا گھر بت کدہ بن گیا۔

ان میں سے کوئی توجیہ بھی صحیح ہو، قرآن کریم میں بہر حال حجرِ اسود کا کوئی ذکر نہیں۔ نہ ہی اس نے اسے شعاۃ اللہ میں شمار کیا ہے۔

اور سب سے آخر میں وہ رسم جس کے بغیر کہا جاتا ہے کہ فریضہ حج کی تکمیل نہیں ہوتی۔ یعنی رمی الجمار یعنی تین شیطانوں کو پتھر مارنا، جو لوگ حج کے لئے نہیں جاتے تھے، وہ پہلے تو اس ”فریضہ کی ادائیگی“ کی بابت سنا ہی کرتے تھے لیکن اب ٹی۔ وی (ٹیلی ویژن) کی بدولت اسے ساری دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ دیکھتی ہے اور.....

اس رسم کا ذکر بھی قرآن کریم میں کہیں نہیں۔ واعظوں کی زبانی یہ روایت سنائی دیتی ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے حضرت اسمعیلؑ کو قربانی کے لئے کرچلے تو راستے میں شیطان نے انہیں درغلانا چاہا۔ وہ اس مقصد کے لئے قریب آتا تھا، اور حضرت ابراہیمؑ اسے پتھر مار کر بھگا دیتے تھے۔ سات مرتبہ ایسا ہوتا آنکہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس سنتِ ابراہیمیؑ کے اتباع میں ہر حاجی، ان شیطانیوں کو (جو پتھروں کی شکل میں وہاں نصب ہیں) سات سات کنکریاں مارتے ہیں۔ اس روایت کا وضعی ہونا بدیہی ہے۔

قرآن کریم میں سورۃ الفیل دیکھتے ہیں کہ عیسائی گورنر ابرہہ، نے ارادہ کیا کہ کعبہ کو مسمار کر دیا جائے۔ اس مقصد

کے لئے وہ ایک لشکر جبار لے کر، جس کے ساتھ پاتھی بھی تھے [جن کی نسبت سے اس لشکر کو اصحاب اقیل کہہ کر پکارا گیا ہے (۱۹۹)]، جانب مکہ روانہ ہوا۔ بجلتے اس کے کہ وہ یمن سے مکہ کا کھلا راستہ (امام مہین) اختیار کرتا، اس نے خفیہ راستہ اختیار کیا جو پہاڑیوں کے پیچھے پیچھے مکہ تک پہنچ جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اہل مکہ کے تین غداروں نے اسے اس راستہ کا پتہ نشان بتایا تھا۔ اس نے یہ خفیہ تدبیر تو اختیار کر لی لیکن فطرت کے غمازوں نے اس کی پردہ دری کر دی۔ چیلوں اور کرگسوں (گدھوں) کے جھنڈ، فضائے آسمانی میں اس

ہاتھیوں والے کا لشکر

لشکر کے اوپر اڑتے چلے آئے۔ اس قسم کے جانوروں کی فطری ذکاوت انہیں بتا دیتی ہے کہ آگے چل کر میدان جنگ میں انہیں بافرط سامانِ خوراک میسر آئے گا۔ اس لئے وہ لشکروں کے ساتھ ساتھ اڑتے چلے جاتے ہیں۔ اہل مکہ نے ان پرندوں کے جھوم سے بھانپ لیا کہ پہاڑیوں کے پیچھے کوئی جمعیت آرہی ہے۔ وہ پہاڑیوں کے اوپر چڑھ گئے اور وہاں سے اس لشکر پر اس شدت سے پتھراؤ کیا کہ لشکر اور اس کے ہاتھیوں کا بھر کس نکل گیا۔ یہ واقعہ نبی اکرمؐ کے سن پیدائش کا ہے (یعنی نبوت سے چالیس سال پہلے کا)۔ عربوں کی تاریخ میں یہ واقعہ ایسی اہمیت کا حامل تھا کہ انہوں نے اس کی یادگار قائم کرنا ضروری سمجھا۔ اس کے لئے انہوں نے کیا یہ کہ ان پہاڑیوں کے دامن میں جہاں سے انہوں نے پتھراؤ کیا تھا، مناسب مقامات پر نشانات نصب کر دیئے۔ حج کے موقع پر لوگ جمع ہوتے تو اُس اہم قومی پتھراؤ کی یاد میں، ان نشانات کو کنکریوں کا ہدف بناتے، بعض کا خیال ہے کہ ان نشانات سے مطلوب وہ تین غدار تھے جنہوں نے ابراہیمؑ کو اس خفیہ راستے کا پتہ نشان بتایا تھا اور قوم نے انہیں اس سازش کی پاداش میں سنگسار کر دیا تھا۔ انہوں نے بعد میں آنے والی نسلوں کو یہ یاد دلانے کے لئے کہ غداروں کا حشر کیا ہوتا ہے، ان نشانات پر پتھراؤ کی رسم جاری کی۔ علامہ اسلم جیراچوری (علیہ الرحمۃ) نے اپنے سفرنامہ حج میں لکھا ہے کہ ابراہیمؑ کے رہبر ابو رغال ثقفی کی قبر مکہ اور طائف کے درمیان، مقام مغس پر واقع ہے۔ ہر عرب جو وہاں سے گزرتا ہے، اس پر رجم کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رغال ثقفی ان تین غداروں کا سرغنہ ہو جن کے نشانات پر حج میں رجم کیا جاتا تھا۔

یہ توجیہ جی کو لگتی ہے اور عرب جاہلیہ کی حمیت قومی کی آئینہ دار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس رجم نے بعد میں موجودہ شکل اختیار کر لی ہو۔ عرب جاہلیہ کے رجم میں ”کیوں“ کا جواب بہر حال موجود تھا لیکن اب جو اس نے مذہبی رسم کی شکل اختیار کر رکھی ہے، اس میں ”کیوں“ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہر حال قرآن کریم میں اس کا بھی کوئی ذکر نہیں۔

یہ ہیں حج سے متعلق احکام جو قرآن مجید میں مذکور ہیں جس مقصد کے لئے انہیں مقرر کیا گیا تھا، یعنی حج کی غرض و غایت کو سامنے رکھیے، اور اس کے بعد موجودہ حج کی تقریب اور اس سے متعلق رسوم و مناسک کو، اور پھر سوچئے کہ دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کے ارکان کیا انداز اختیار کر لیتے ہیں؟ اقبالؒ نے انہی اجتماعات کے متعلق آہ سرد کھینچ کر کہا تھا کہ

عیدِ آزاداں، شکوہ ملک و دیں عیدِ محکوماں، ہجومِ مومنین

اور اس ”شکوہ ملک و دیں“ کی طرف قرآن کریم نے اگلی متعلقہ آیت میں اس طرح اشارہ کیا ہے۔ پہلے کہا:-

فَإِذَا قُضِيَتْ مَنَاسِكُكُمْ فَادْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ
أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا (۲۱)

حج سے واپسی کے بعد تم یہ نہ سمجھ لو کہ جو فرض تم پر واجب تھا وہ ادا ہو گیا۔ اب تم پر کوئی مزید ذمہ داری باقی نہیں رہی! وہاں سے واپسی پر بھی تم قوانینِ خداوندی کو ہر وقت اپنے پیش نظر رکھو۔ اسی طرح جیسے تم اس سے پہلے اپنے اسلاف کے ملک کو اپنے سامنے رکھا کرتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت اور گہرائی کے ساتھ۔ اس سے یہ مقصد بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے تم اپنے نسلی امتیازات کو فخریہ بیان کیا کرتے تھے۔ اب اس کی جگہ اس کا ذکر کر دو کہ تم قوانینِ خداوندی کی کس حد تک پابندی کرتے ہو کہ وجہ عزت و تکریم یہی ہے۔ (۲۱)

تقریب، اجتماعات، کانفرنسیں، مختلف قوموں (اور ان کی مملکتوں کی طرف سے) منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں اکثر سیکولر سٹیٹ ہوتی ہیں جن کے پیش نظر صرف اپنے دنیاوی مفادات ہوتے ہیں۔

فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ
مِنْ خَلَقٍ (۲۱)

وہ لوگ بھی ہیں جن کے پیش نظر صرف دنیاوی مفاد ہوتے ہیں۔ انہیں یہ مفاد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن مستقبل (آخرت) کی خوشگوار یوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

ان کے برعکس

وَمِنْهُمْ مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ
حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲۱)

دوسرے لوگ وہ ہیں جن کی طلب و آرزو یہ ہوتی ہے کہ انہیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوں اور

آخری زندگی کی ستریں بھی اور وہ ہر قسم کی تباہیوں سے محفوظ رہیں۔

یہ ہیں نظامِ خداوندی پر ایمان رکھنے والے جس کے استحکام کی خاطر یہ اس قسم
دُنیا اور آخرت کی خوشگواریاں کے اجتماعات منعقد کرتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا - وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ - (۲۳)

یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے اعمال کے مطابق دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگوار یوں میں حصہ مل جاتا ہے۔ خدا کا قانونِ مکافات کسی کا عمل منافع نہیں کرتا۔ وہ ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب کرتا جاتا ہے۔ البتہ ان کے نتائج کی نمود اور اظہار اپنے موقع پر ہوتا ہے۔

ان ہر دو گروہوں کے متعلق، مطالب الفرقان جلد اول منہ ۱۵-۱۶ آیت (۲۳) زم ۲۵۳، آیت (۲۳) اور ص ۲۷۱ - آیت (۲۳) میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

یہاں قرآن کریم نے ان دو گروہوں کا ذکر کیا ہے جن کے اعمال (کاموں) کے نتائج سامنے آ جاتے ہیں۔ سیکولر نظریہ حیات کے حامل، اور دینِ خداوندی پر ایمان رکھنے والے۔ دیگر مقامات پر اس نے ایک تیسرے گروہ کا ذکر بھی کیا ہے جن کے متعلق کہا ہے کہ خَیِطَتْ أَعْمَالُهُمْ - فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیَمَةِ وَزْنًا۔ (۲۴) ان کے تمام اعمال رائیگاں جاتے ہیں حتیٰ کہ ظہورِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت ان کے اعمال کا وزن معلوم کرنے کے لئے میزان تک کھڑی نہیں کی جائے گی بے نتیجہ اعمال کے وزن کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ قرآن کریم کے مختلف مقامات پر اس گروہ کی مختلف خصوصیات اور علامات بیان کی گئی ہیں۔ لیکن جس ضمن (CONTEXT) میں ہم اس آیت کو یہاں لائے ہیں اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس میں خود ہمارا ہی ذکر ہے۔ آپ سوچئے کہ ایک سال کے حج کے اجتماع میں دنیا بھر کے مسلمان کس قدر صعوبات اور تکالیف برداشت کر گئے شریک ہوتے ہیں۔ اس پر کس قدر روپیہ اور وقت صرف ہوتا ہے، کتنی اموات بھی ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد حاصل کیا ہوتا ہے؟ نہ دنیاوی مفاد نہ دینی (نظامِ خداوندی کی) کامیابیاں : أُولَٰئِكَ خَیِطَتْ أَعْمَالُهُمْ یہ سب کیا کرایا رائیگاں جاتا ہے۔ لیکن وَهُمْ یَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ یُحْسِنُونَ صُنْعًا۔ اس اجتماعِ عظیم میں شرکت کرنے والے اپنے جی میں سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ اور یہی وہ خوش عقیدگی ہے جو ہر سال لوگوں کو کشاں کشاں دہاں لے جاتی ہے۔ اگر ہمارے سامنے قرآنی معیار ہوتا تو یہی حج ساری دنیا میں نظامِ خداوندی قائم کرنے کا موجب بن جاتا اور اس طرح ہمیں دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں نصیب ہو جاتیں۔

بات ہو رہی تھی ان دو گروہوں کی۔ ان میں سے ایک گروہ سیکولرز کا ہوتا ہے۔ یعنی وہ چمکھٹے بندوں خدا۔ وحی مستقل اقدار و حیاتِ آخرت کا انکار کرتا ہے۔ وہ نہ خود دھوکے میں رہتا ہے، نہ دوسروں کو دھوکا دیتا ہے۔ لیکن سیکولرازم کے حامیوں کا ایک اور گروہ ہوتا ہے جو (مسلمان کہلاتا ہے)۔ خدا۔ وحی اور آخرت پر ایمان کا مدعی ہوتا ہے۔ لیکن دل سے ان کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس لئے اس کے پیش نظر مقصد دنیاوی مفاد ہی ہوتا ہے۔ اس غرض سے کہ کہیں عوام بدک نہ جائیں، وہ مذہب کے ظاہر کا شدت سے پرچار کرتا رہتا اور اس سلسلہ میں اپنی اسلامی خدمات کا ڈھول بجاتا رہتا ہے لیکن دین کی اصل و غایت کی صداقت اس کے قلب میں قطعاً نہیں ہوتی۔ یہ ہے وہ گروہ جس کے متعلق فرمایا :-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ (۲: ۲۰۳)

جب یہ لوگ دنیاوی معاملات اور امورِ مملکت کے متعلق گفتگو کریں گے تو وہ اپنی ملمع ساز باتوں سے تمہیں

ورطہ حیرت میں ڈال دیں گے۔ وہ اپنے دعاوی میں سچا ہونے کے ثبوت میں قدم قدم

پر خدا کو گواہ ٹھہرائیں گے۔ حالانکہ ان کے دل (نظامِ خداوندی کی طرف سے) دشمنی اور

ملمع ساز مسلمان

خصومت کے جذبات سے لبریز ہوں گے (کیونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے قیام میں ان کی فنا ہے)۔

یہ اپنے آپ کو پکے اور سچے مسلمان ظاہر کرنے والے۔ یہ بات بات پر خدا کی قسمیں کھانے والے، ایسا کیوں کرتے ہیں بعض

اس لئے کہ لوگ اقتدار کی چابیاں ان کے ہاتھ میں دے دیں۔ یہ لوگوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر اقتدار ان کے ہاتھ

میں آجائے تو یہ عوام کی بہبود کے لئے یہ کریں گے۔ اسلام کی خدمت کے لئے وہ کریں گے۔ وہ اس طرح عوام کو دھوکا دیکر

اپنا اُتو سیدھا کر لیتے ہیں۔ اور

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ . وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ (۲: ۲۰۵)

جب حکومت ان کے ہاتھ آجاتی ہے تو ان کی ساری کوشش اس لئے ہوتی ہے کہ ملک کا امن و نظام درہم برہم

ہو جائے۔ فصلیں تباہ ہو جائیں۔ نسل انسانی ہلاک ہو جائے۔ نہ معاشی نظام مستحکم رہے نہ عمرانی۔ انہیں صرف اپنے

مفادات کا خیال ہوتا ہے۔ اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ ملک اور قوم کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ حالانکہ جس خدا کی

یہ بار بار قسمیں کھاتے اور اسے گواہ بنا کر پیش کرتے تھے، انہیں علم ہے کہ وہ کبھی اسے پسند نہیں کرتا کہ ملک میں

تباہی اور ویرانی پھیل جاتے۔

فساد اور اصلاح کا قرآنی مفہوم، جلد اول صفحہ ۲۲۹۔ آیت (۲:۴) میں واضح طور پر پیش کیا جا چکا ہے۔ چونکہ یہ لوگ اپنے دعویٰ کی تائید میں خدا کو بطور گواہ پیش کیا کرتے تھے، لوگ، ان کی فساد انگیزیوں سے تنگ آکر، اس کے سوا کیا کر سکتے تھے کہ انہیں خدا کی یاد دلاتیں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ.

وَلَبِئْسَ الْيَمَادُ (۲:۴)

جب ان سے کہا جائے کہ وہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کریں تو نشہ حکومت کی بدستیاں اور جھوٹی عزت کا خیال، اصلاح کے بجائے، انہیں اور خرابیوں کے لئے اکساتا ہے۔ ان کا مقام تباہی اور بربادی کا جہنم ہے جہاں انسانیت ذبح ہوتی ہے۔ اُن اکتنا بُرا ہے یہ انجام۔

اس آیت میں قرآن کریم نے، آئین و قوانین کو بالائے طاق رکھ کر، حکومت کرنے والے مستبد، سرکش، عنان تاب، اربابِ قوت کی سائیکالوجی کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان لوگوں کے ذہن میں قوت کے سوا کسی تدبیر کا تصور تک نہیں ہوتا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ان کی اندھا دھند بدعنوانیوں سے ملک تباہ ہو رہا ہے، تو ان کے دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ ہم سے قوت کے استعمال میں کچھ کمی رہ گئی ہے اس لئے یہ خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان کی اصلاح یا ازالہ کے لئے وہ اور سختی برتتے ہیں۔ زیادہ شدت سے

مستبد حکمران

قوت کا استعمال کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ خرابیاں اور بڑھتی جاتی ہیں۔ جتنی کہ یہ اپنی قوم کو اپنے ساتھ لے کر تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گرتے ہیں۔ یہ بھی تباہ ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ان کی قوم بھی۔ اسی لئے تو قرآن کریم، قوم کو متنبہ کر دیتا ہے کہ اگر ملک میں خرابیاں عام ہو رہی ہیں تو تم اس خیال سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھے رہو کہ ان خرابیوں کے ذمہ دار ہم تھوڑے ہیں۔ جب تباہ ہوں گے تو وہی لوگ ہوں گے جو ان خرابیوں کے ذمہ دار ہیں۔ قرآن نے کہا کہ اس خود فریبی میں مبتلا مت رہو۔ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً۔ (۲:۴)۔ اس تباہی سے بچنے کا اجتماعی طور پر انتظام کرو۔ کیونکہ جب وہ آتی ہے تو صرف انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتی جو ان خرابیوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ سارے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔ یہ ابتلا ساری قوم کے لئے ہوتا ہے۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ۔ (۲:۴) جلد دوم صفحہ ۲۵۶۔ آیت (۲:۴) میں بتایا جا چکا ہے کہ اِثْم کے معنی ایسے کام ہیں جو انسان میں اضمحلال پیدا کر دیں، جن سے قوتوں میں کمی واقع ہو جائے۔

اِثْمُ کا مفہوم

جن سے افسردگی اور واماندگی پیدا ہو جاتے۔ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ مستبد اور سرکش حکام، قوت کے غلط استعمال سے معاشرہ میں خرابیاں پیدا کر دیتے ہیں تو اس سے معاشرتی ضعف پیدا ہو جاتا ہے، اس کا ازالہ اصلاح احوال سے نہیں کرتے، اور زیادہ قوت کے استعمال سے کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں اور زیادہ اضطلال پیدا ہو جاتا ہے۔ (جب ہم خمر، شراب کی ممانعت سے متعلق آیت پر آئیں گے تو وہاں اِثْمُ کا مفہوم نکھر کر سامنے آجائے گا)۔ یہاں اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ شراب پینے سے (بظاہر) انسان کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد خمار یہ بتاتا ہے کہ اس کی قوت کس قدر کم ہو گئی ہے۔ اسے اِثْمُ کہا جاتا ہے۔ شراب کا عادی، اس کمزوری کو دور کرنے کے لئے شراب کا اور زیادہ استعمال کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کا اِثْمُ (کمزوری، ضعف، اضطلال) اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ تا آنکہ وہ اسے ایک دن ہلاکت کے جہنم میں دھکیل دیتی ہے۔ مستبد نظام حکومت کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ اپنی غلطیوں کے ازالہ کے لئے اور زیادہ شدت سے قوت کا استعمال کرتا ہے۔ اس سے مملکت میں مزید اضطلال (اِثْمُ) پیدا ہو جاتا ہے۔ غلط کوشی کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تا آنکہ وہ حکومت اور اس کے ساتھ وہ قوم، تباہی کے جہنم تک جا پہنچتی ہے۔ اس میں اخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ۔ (دہر قوت، اضطلال بڑھاتی ہے۔

یہ تو ہے غلط بین و غلط کوشش مستبد حکمران۔ ان کے برعکس :-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ . وَاللَّهُ رَءُوفٌ

بِالْعِبَادِ - (۲۵۸)

آیت (۲۵۸-۲۵۹) میں جن دو گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ایک گروہ کا تفصیلی تعارف سابقہ صفحات میں کر دیا جا چکا ہے۔ مذکورہ صدر آیت میں دوسرے گروہ کا ذکر آتا ہے۔ اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔ ”ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے آپ کو رضا جوئی باری تعالیٰ یا خدا کی خوشنودی کی خاطر بیچ دیتے ہیں۔ اور اللہ اپنے بندوں کے ساتھ بہت مہربان ہے“ قبل اس کے کہ ہم ”مرضات“ کا صحیح مفہوم پیش کریں، یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم نے آیت (۲۵۸) کے تحت بتایا تھا کہ قرآنی نظام میں مملکت کا نظریہ میثاق کا ہے۔ یعنی اس میں خدا اور انسان کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی رو سے انسان اپنی جان اور مال ”خدا کے ہاتھ“ بیچ دیتا ہے اور اس کے بدلے میں خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے۔ آیت زیر نظر میں بھی اسی ”بیع و شری“ کا ذکر ہے۔ (صُمْنَا) لفظ شری کے معنی بیچنے اور خریدنے دونوں کے آتے ہیں۔ آیت (۲۵۹) میں اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ تھا۔ یعنی خدا

مومنین سے خرید لیتا ہے۔ اور آیتہ زیر نظر میں ”مَنْ تَشْتَرِني“ آیا ہے۔ یعنی جو شخص اپنے آپ کو بیچ دیتا ہے۔ اس وضاحت کے بعد آیت کے مفہوم کی طرف آئیے۔ اس میں تشریح طلب لفظ مرضات ہے جس کا عمومی ترجمہ رضا جوئی یا خوشنودی باری تعالیٰ کیا جاتا ہے۔ اس مفہوم کی رو سے آپ نے ”منتقی پرہیزگار“ لوگوں کی زبان سے اکثر اس قسم کے الفاظ سنے ہوں گے کہ ”اللہ اس سے خوش ہوتا ہے“ یا ”عبادت سے مقصد خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہے“ دوسری طرف ایسے الفاظ کہ ”اس قسم کی باتوں سے خدا ناراض ہو جاتا ہے“ اللہ کی ناراضگی سے ڈرو وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے الفاظ سے خدا کے متعلق بڑا غلط تصور پیدا ہوتا ہے۔ خوشی یا ناراضگی وغیرہ انسانی جذبات ہیں، اور ذاتِ خداوندی اس قسم کے جذبات سے منزہ اور ماوراء ہے۔ خدا کے صحیح تصور کے متعلق جلد اول مسئلہ ۵۴ (۱) آیت (۱) از مسئلہ ۵۴۔ آیت (۱/۲) نیز مسئلہ ۵۴ آیت (۱/۲) میں مختصر الفاظ میں بات ہو چکی ہے۔ اس ضمن میں جلد اول میں تقدیر کا عنوان بھی دیکھ لینا چاہیے۔ (۱۶۳ ز ۱۵۱ ز ۱۴۴) نیز جلد دوم میں نفس سے متعلق بحث بھی۔ اور جلد اول میں قانونِ مکافاتِ عمل ۱۵۲-۱۴۶ بھی۔ بایں ہمہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اہم نکتہ مزید وضاحت کا متقاضی ہے۔

مرضات اللہ

جب ذہن انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں تھا تو اس نے دیوی دیوتا، یا خدا کا تصور ایسا ہی قائم کیا جیسا وہ اپنے سامنے بادشاہ کو دیکھتا تھا، اس لئے کہ اس کے نزدیک بادشاہ سے بڑھ کر قوت اور اقتدار کا مالک کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ذہن نے خدا کو بھی، بادشاہ کی طرح، ایک تخت پر بٹھایا۔ اس کے ارد گرد، مقربین کو جمع کیا۔ اور اس تک پہنچنے کے لئے حاجب و دربان بھی مقرر کئے۔ اگر انسان نے اپنی کوئی درخواست اس کے حضور پیش کرنی ہو تو ضروری ہوگا کہ اس کے ساتھ کوئی نذرانہ بھی پیش کرے اور پھر اس درخواست کو اس کے مقربین کی وساطت سے اس تک پہنچائے تاکہ وہ درخواست دہندہ کی سفارش بھی کریں۔ ان درخواستوں کے فیصلے، یا خدا کے دیگر احکام، کسی قاعدے یا قانون کے پابند نہیں ہوتے۔ اس کا انحصار بادشاہ کے مزاج پر ہوتا ہے۔ وہ خوش ہو گیا تو جاگیر کے طور پر گاؤں بخش دیا۔ ناراض ہو گیا تو گدھوں کے ہل چلوادیئے۔ سعدی کے الفاظ میں:

مزاجِ شاہان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ”گا ہے بسلا سے برنجند و گا ہے بدُشنامے“

خوشنودی باری تعالیٰ

خلعت برنجند کبھی سلام کرنے پر ناراض ہو جانے ہیں اور کبھی گالی دینے پر انعام و اکرام کی بارش کر دیتے ہیں۔ لہذا، بندوں کی تمام تر کوشش یہ ہونی چاہیے کہ کسی طرح خدا کو راضی کر لیں۔ اسے خوش رکھیں۔ ایشور کی بھگتی، ڈنڈوت، پوجا پاٹ، اس کے چرنوں (قدموں) میں شردھا (عقیدت) کے پھول چڑھانا۔ دیناؤں کے استخوانوں پر قربانیاں

دینا۔ سب اس غرض سے تھا کہ کسی طرح الشیور پر ماتم یا دیوی دیوتاؤں کو خوش رکھا جائے۔ وہ اپنے جھگڑوں سے راضی ہیں۔ قرآن کریم نے خدا کے متعلق یہ باطل تصور مٹایا اور اس کی جگہ یہ تصور پیش کیا کہ اس نے کچھ قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق یہ کارگہ کائنات اس نظم و ضبط کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ انہیں تقدیراتِ الہیہ کہا جاتا ہے۔ مطالب الفرقان کی پہلی اور دوسری جلد میں اس موضوع پر مختلف مقامات میں بڑی شرح و بسط سے بحث کی جا چکی ہے۔ ان مجلدات کی فہرست سے ان مقامات کو دیکھ لیا جائے۔

رَضِیَ - رِضْوَانًا و رِضًا کے معنی ہوتے ہیں کسی کے ساتھ دل کی پوری رضامندی سے متفق ہو جانا۔ ہم آہنگ ہو جانا۔ مطابقت پیدا کر لینا۔ بیع و شری کے معاملہ میں یہ ہم آہنگی یا باہم متفق ہو جانا، مشہود طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ معاملے ہی اس وقت ہوتا ہے جب فریقین باہم گرد متفق ہو جائیں۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرآنی تصور کی رُو سے، خدا اور مومنین کا معاملہ، بیع و شری کا ہوتا ہے۔ لہذا یہ دونوں باہم گرد متفق ہو جاتے ہیں۔ اسی کو رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ وَ رِضْوَانُ اللہِ (۱۰۱) دو دیگر مقامات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ادھر کہا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غیر متبدل قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق یہ کارگہ کائنات اس حسن و خوبی کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔ یہ اس لئے اس حسن و خوبی کے ساتھ سرگرم عمل ہے کہ اشیائے کائنات کو ان قوانین کے مطابق چلنے کے لئے مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ اسی قسم کے قوانین اس نے انسانی زندگی کے لئے بھی مقرر کئے ہیں۔ لیکن انسان کو اس نے اس کا اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان کے خلاف چلے۔ جب انسان ان قوانین کی متابعت یا مطابقت (ہم آہنگی) کی زندگی بسر کرتا ہے تو اسے (تَبَعَ رِضْوَانُ اللہِ) (۱۰۲) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی اس نے قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کر لی اور جب وہ ان قوانین سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو ان کی رُو سے ماحصل ہونے والی خوشگواریاں اور سرفرازیاں اس کی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔

یہی معنی رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ وَ رِضْوَانُ اللہِ (۱۰۱) کے ہیں۔ یہ قوانین، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں، اس لئے

رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ وَ رِضْوَانُ اللہِ

اتباعِ رضوان اللہ کے معنی اتباعِ قرآن کریم کے ہوں گے۔ سورہ محمد میں اس نکتہ کو واضح کر دیا گیا ہے۔ کفار کے متعلق پہلے کہا۔ کَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللہُ (۱۰۳) وہ ما نزل اللہ (قرآن مجید) سے نفرت کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد یہ کہہ کر وضاحت کر دی کہ کَرِهُوا رِضْوَانُ اللہِ (۱۰۴)۔ وہ "رضوان اللہ" سے نفرت کرتے ہیں۔

ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے تخلیق کائنات (جس میں انسان بھی شامل ہے) خدا کے ایک عظیم پروگرام کی

کڑی ہے۔ انسان کے سوا، دیگر اشیائے کائنات مناسب پرورش سے خود بخود وہ کچھ بن جاتی ہیں جو کچھ انہیں بنانا مقصود ہے۔ مثال کے طور پر، بکری کے بچہ کی مناسب پرورش کی جائے تو وہ خود بخود بکری بن جاتا ہے۔ اسے کچھ اور بننے کا اختیار ہی نہیں۔ دوسرے الفاظ میں، یوں کہیں گے کہ کائنات کی ہر شے خود بخود منشاء خداوندی کے مطابق بن جاتی ہے۔ جہاں تک انسان کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کا تعلق ہے، انسانی بچہ بھی (بکری کے بچہ کی طرح) مناسب پرورش سے، انسانی پیکر اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن صرف یہ پیکر انسان کے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ حیوان، صرف اتنے سے انسان نہیں بن جاتا، اسے اپنی کوشش سے انسان بننا ہوتا ہے۔ غالب کے الفاظ میں، ”آدمی کو انسان“ بننا پڑتا ہے۔ اور وہ انسان بن سکتا ہے ان قوانین کے اتباع سے جنہیں خدا نے اس کے لئے مقرر کیا ہے۔ اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جی چاہے تو آدمی سے انسان بن جائے اور جی چاہے تو آدمی کا آدمی رہتے ہوئے، دیگر حیوانات کی سی زندگی جئے اور حیوانات کی سی موت مر جائے۔ خدا کے پروگرام میں وہ اسی صورت میں فٹ آسکے گا جب وہ آدمی سے انسان بن جائے۔ قرآن کریم اسے ایسا بنادیتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں قرآن کرتا یہ ہے کہ،

آنچه حق می خواهد، آن سازد ترا

جب آدمی انسان بن جاتا ہے تو اس وقت کہا جاسکتا ہے کہ وہ منشاء خداوندی کے مطابق بن گیا۔ اسی منزل میں پہنچنے والوں کے متعلق کہا جائے گا کہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ۔

اس مقام پر پہنچ کر کہا جاسکتا ہے کہ اگر قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا منہتی و مقصود یہی ہے کہ ہم ایسی مخلوق بن جائیں جو منشاء خداوندی کو پوری کرے جو اس کے معیار پر پوری اترے، تو یہ وہی بات ہو گئی کہ اس تمام تنگ و تاز کا منہتی، خدا کے کسی مقصد کی تکمیل ہے۔ اس میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم اس کے کسی مقصد کے لئے اس قدر جان کاہ مشقتیں برداشت کریں۔ ہم کیوں آدمی سے انسان بنیں؟ ہم آدمی پیدا ہوئے آدمی کی زندگی بسر کر کے، آدمی ہی مر جانا چاہتے ہیں۔ انسان بننے میں ہمارا فائدہ کیلئے؟

انسان بننے میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔ خدا کا نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آدمی سے انسان بن جانے والا خدا کی ایک اسکیم میں بھی فٹ بیٹھ جاتا ہے اس لئے خدا اسے اس کے لئے منعرب کر لیتا ہے۔ سمجھنے کے لئے اس کی مثال یوں لیجئے کہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر آپ سے کہتا ہے کہ اگر آپ فلاں بیرونی ڈگری (FOREIGN DEGREE) حاصل کر آئیں تو آپ کو یونیورسٹی کے فلاں شعبہ کا سربراہ مقرر کر دیا جائے گا۔ آپ دن رات کی محنت شاقہ سے وہ ڈگری حاصل کر لیتے ہیں اور آپ کو حسبِ وعدہ، اس شعبہ کا سربراہ مقرر کر دیا جاتا ہے۔ آپ نے اس ڈگری کے حاصل کرنے سے اس یونیورسٹی

پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اس کا کوئی بگڑا ہوا کام نہیں سنوارا۔ آپ نے اپنی قابلیت میں اضافہ کیا اور اس معیار پر پورے اتنے حواس شعبہ کی سربراہی کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ اس طرح اس کے لئے آپ کا انتخاب عمل میں آگیا۔ یوں آپ اس یونیورسٹی کے پروگرام میں بھی فٹ بیٹھ گئے۔

یہی مثال قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے آپ کے آدمی سے انسان بن جانے کی ہے۔ اس سے آپ ہی کا کچھ سنوتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے قدم قدم پر کہہ دیا کہ مَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ. وَمَنْ ضَلَّٰ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا. (۱۶۱) جو شخص صحیح راستہ اختیار کرتا ہے وہ خود اپنے فائدے کے لئے ایسا کرتا ہے جو غلط راستے پر چلتا ہے وہ اس سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْعَالَمِينَ. (۱۶۲)۔ خدا جملہ کائنات سے مستغنی ہے نہ تمہارا ہے انسان بننے سے اس کا کچھ سنوتا ہے، نہ تمہارے حیوان کے حیوان رہنے سے اس کا کچھ بگڑتا۔ بلکہ وہ تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ يَمْنُونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا. قُلْ لَا تَمْنُوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللَّهُ يَمْنُ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ. (۱۶۳)۔ اے رسول! یہ لوگ تجھ پر احسان دھرتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں۔ ان سے کہو کہ اپنے اسلام کا مجھ پر احسان مت دھرو۔ یہ تو بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی راہ دکھا دی۔ لہذا اگر تم واقعی اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہو تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم خدا کے ممنون احسان ہو، نہ یہ کہ اپنے اسلام لانے کا احسان دھرو۔

اس انسان کا اپنا ہی فائدہ ہے

مرضات کا لفظ دو تین اور مقامات پر بھی آیا ہے۔ سورہ بقرہ ہی میں ہے۔ وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَشْبِيهًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ۔ (۲۴۵)۔ جو لوگ اپنی محنت کی کمائی کو کھلا رکھتے ہیں تاکہ اُسے قانون خداوندی کے مطابق صرف کیا جائے۔ یہ تو مرضات اللہ کا مفہوم ہو گیا۔ اگلے دو لفظوں نے بات بالکل واضح کر دی کہ قوانین خداوندی سے مطابقت (مرضات اللہ) کا نتیجہ کیا ہو گا۔ تَشْبِيهًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ۔ اس سے تمہاری ذات کو استحکام حاصل ہو جائے گا۔ آپ نے دیکھ لیا کہ جو کچھ ”لِمَرْضَاتِ اللَّهِ“۔ کہا جاتا ہے اس سے انسان کا اپنا ہی کچھ سنوتا ہے۔

سورہ النساء میں ہے کہ منافقین تخریب کے لئے خفیہ مشورے کرتے ہیں۔ ان کے برعکس مومنین، نوع انسان کی بھلائی کے کاموں کے لئے باہمی مشورے کرتے ہیں۔ ان مشوروں کے متعلق کہا کہ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا. (۲۴۶)۔ جو لوگ قوانین خداوندی سے مطابقت کی خاطر ایسا

کریں گے انہیں اس کا بہت بڑا اجر ملے گا۔

سورۃ الممتحنہ میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ نظام خداوندی کے دشمن ہیں ان سے دوستداری کے تعلقات وابستہ نہ کرو۔ اس کے بعد ہے کہ ذرا سوچو کہ اس قسم کی متضاد باتیں کبھی کیجا ہو سکتی ہیں؟ اس قسم کی باتیں کہ **اِنْ كُنْتُمْ حَرَجْتُمْ جِهَادًا فِى سَبِيلِنَا وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِنَا فَتَسْرُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ** (۲: ۱۷۷) تم ہماری راہ میں ہمارے قوانین کا اتباع کرتے ہوئے، جہاد کے لئے نکلو، اور اس کے ساتھ خفیہ طور پر ان دشمنانِ دینِ خداوندی سے دوستی کے تعلقات بھی وابستہ کر لو؟ یہ ناممکن ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ان مقامات سے ”مرضات اللہ“ کا مفہوم کس طرح واضح ہو جاتا ہے؟ یعنی قوانینِ خداوندی کے مطابق۔ ان قوانین کی اطاعت کرتے ہوئے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ”رضائے باری تعالیٰ“ کا مفہوم کیا ہے۔ اور اسی سے زیرِ نظر آیت کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ یعنی

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِى نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ - وَاللَّهُ رَعُوفٌ
بِالْعَبَادِ - (۲: ۱۷۷)

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو خدا کے ساتھ اپنے معاملہ کو پورا کرنے کے لئے، اپنے آپ کو (یعنی اپنی جانوں تک کو) اس کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ اس سے ان کی ذات کی نہایت لطیف انداز سے نشوونما ہو جاتی ہے اور وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

اپنی جانوں کو خدا کے ہاتھ فروخت کر دینے کے مرحلہ پر ہم ان آیات کی طرف آ جاتے ہیں جن میں قتال کا حکم آجائے اور جن کی تشریح کو ہم نے ملتوی کر دیا تھا۔ یعنی آیات ۱۹ تا ۱۷۹ -

(جیسا کہ متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے) قرآنِ کریم کی رو سے نظامِ حیات یہ ہے کہ

(۱) ہر فرد، اپنی خداداد صلاحیت و قابلیت، اور اپنی محنت و کوشش سے پیدا کردہ متاعِ زندگی کو حدودِ اللہ کے اندر رہتے ہوئے، صرف کرے۔ اس سے اس کی سیرت میں پاکیزگی اور گیر کیڑ میں بلندی پیدا ہو جائے گی۔

(۲) اس قسم کے افراد جب ایک نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کا ارادہ کریں گے تو اس سے ایک ایسی امت (قوم) وجود میں آجائے گی جو اس نظامِ خداوندی کو عملاً قائم کرے گی جو عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔

(۳) مفاد پرست قوتیں اس نظام کے قیام کے راستے میں ہر قسم کی مزاحمت کریں گی۔ ان کی اس مزاحمت کا مقابلہ

کرنا اس امت کا فرضیہ ہوگا۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی جہد مسلسل۔ سنی پیہم۔ مومن کی ساری زندگی اسی (جہاد) کی عملی تعبیر ہے۔

(۴) اس جہد مسلسل میں ایک مرحلہ وہ بھی آجاتا ہے جہاں ان مخالف قوتوں کی مدافعت کے لئے میدان جنگ میں اترنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسے قتال (یعنی جنگ) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قتال، جہاد کی آخری منزل ہے لیکن ہر مقام پر جہاد کے معنی قتال نہیں۔ یعنی بعض مقامات پر جہاد اور قتال مرادف معانی کے لئے آئیں گے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر مقام پر جہاد سے مراد قتال ہو۔

قتال کے مقاصد و ہدایات

(۵) چونکہ اسلام نام ہی جہاد (اور اس کی آخری منزل) قتال کا ہے۔ یعنی قرآن کریم کے مقرر کردہ مقاصد کے حصول کے لئے جہد مسلسل اور عند الضرورت، جان تک دیدینے کا۔ اس لئے سارا قرآن، ان سے متعلق ہدایات و تصریحات سے بھرا پڑا ہے۔ نابریں، ان تمام مقامات کا ایک جگہ احصاء مشکل ہے۔ یہاں ہم قرآن کریم کی رو سے جنگ کے مقاصد، شرائط اور اصولی ہدایات پر اکتفا کرتے ہوئے ان آیات کی طرف آجائیں گے جو سورۃ بقرہ کے متعلقہ حصہ میں آئی ہیں۔

اس سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ان آیات میں جہاں مشرکین، کفار، منافقین، اہل کتاب کا ذکر ہے اس سے اولاً مراد زمانہ نزول قرآن کے مخالفین ہیں جن کے ساتھ صدر اول کے مسلمانوں کو جنگ کرنی پڑی تھی۔ ہر زمانہ کے غیر مسلم مراد نہیں۔ ان آیات سے البتہ وہ اصول مستنبط کئے جائیں گے جن کے مطابق، ہمارے زمانے (اور ہر زمانے) کے، نظام خداوندی کے مخالفین کے خلاف، عند الضرورت جنگ کرنی پڑے گی۔ سورۃ بقرہ میں ہے:-

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا۔ إِنَّ

اللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ۔ (۲/۱۹۰)

۲
۱۹۰

جنگ کے سلسلہ میں اس سب سے پہلے اصول کو یاد رکھو کہ تم انہی سے جنگ کرو جو تمہارے خلاف جنگ پر اتر آئیں اور اس طرح تمہارے لئے لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ رہے (۲/۲۲)۔ یہ جنگ ”خدا کی راہ“ میں ہوگی۔ یعنی نظام خداوندی کے تحفظ کی خاطر۔ اس میں بھی قانون کی حدود سے آگے نہیں بڑھا جائے گا۔ (اور اس قانون کی وضاحت قرآن کریم میں دیگر مقامات پر کر دی گئی ہے)۔ قانون سے تجاوز کرنا، خدا کے نزدیک بڑی ناپسندیدہ بات ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:-

وَأَقْتُلُواهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجَكُمُ

۲
۱۹۱

وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ - وَلَا تَقْتُلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقْتَلُوا فِيهِ - فَإِنْ قُتِلُوا فَامْتُلُواهُمْ - كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ - (۲/۱۹۱)

جب تم ان حالات میں جنگ کے لئے مجبور کر دیئے جاؤ تو پھر پوری قوت کے ساتھ جنگ کرو اور دشمن کو جہاں پاؤ، اس کا مقابلہ کرو۔ اور جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے، تم بھی انہیں وہاں سے نکال دو۔ جنگ فی ذاتہ کوئی قابل ستائش چیز نہیں لیکن ظلم اور فساد جنگ سے بھی زیادہ تباہیوں اور خرابیوں کا موجب ہے، اس لئے ظلم اور فساد کی روک تھام کے لئے جنگ جیسے حربہ کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔

جنگ میں اس بات کا خیال رکھو کہ ہم نے کعبہ کو امن کا مقام قرار دیا ہے (۲/۱۹۵) اس لئے تم دشمن کے ساتھ کعبہ کے قرب و جوار میں جنگ نہ کرو۔ لیکن اگر دشمن وہاں بھی جنگ سے باز نہ آئے تو پھر تم بھی ان سے جنگ کرو۔ اس لئے کہ جو لوگ اس قسم کے بین الاقوامی معاہدات کا احترام نہ کریں تو ان کا علاج اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے حملے کا جواب دیا جائے۔

لیکن :-

فَإِنْ أَنْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ - (۲/۱۹۲)

اگر وہ وہاں جنگ سے رُک جائیں تو تم بھی رُک جاؤ۔ (دو دنوں کی ٹریننگ سے مقصود ہی یہ تھا کہ تم میں ایسا دُشمن پیدا ہو جائے کہ جہاں بڑھنے کا حکم دیا جائے، بڑھ جاؤ۔ جہاں رُکنے کا حکم دیا جائے، رُک جاؤ۔ خواہ آگے بڑھنے میں کتنا ہی فائدہ کیوں نہ دکھائی دے۔ اگر تم اس طرح تو انہیں خداوندی کی متابعت کرتے گئے تو) وہ تمہاری حفاظت کے اسباب بھی پیدا کر دینگا اور سامانِ نشوونما بھی بے حد و شمار بہم پہنچائے گا۔

اس کے بعد ہے :-

وَقَتْلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (۲/۱۹۳)

ان عدد و دشمنان کو ملحوظ رکھتے ہوئے تم ان کے خلاف جنگ کرو۔ تا آنکہ جو فتنہ انہوں نے ابھار رکھا ہے وہ فرو ہو جائے اور ایسی فضا پیدا ہو جائے کہ دین کے معاملہ میں کسی پر کسی قسم کا جبر و اکراہ نہ ہو (۲/۲۵۶ و ۲/۲۶۰)۔ جو چاہے اسے خالصتہً اللہ اختیار کر سکے۔

ہم نے اس آیت کا صرف اتنا حصہ دانستہ درج کیا اور بقایا کو ملتوی رکھا ہے۔ اس لئے کہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ بڑی اہم ہے اور اس کے غلط مفہوم نے اسلام کے متعلق بڑی سنگین قسم کی غلط فہمیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ

ان سے جنگ کرو۔ حَتّٰی لَا تَكُونُ فِئْتَنَةً وَتَكُونُ السَّيِّئُ لِلدِّينِ۔ اس آیت کا عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کے خلاف جنگ کرتے رہیں۔ تا آنکہ وہ اسلام قبول کر لیں اور اس طرح خدا کا دین باری دنیا میں پھیل جائے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مسلمان جہاں جاتے تھے، غیر مسلموں سے کہتے تھے کہ ”اسلام یا تلوار“۔ اگر وہ چپکے سے اسلام قبول کر لیتے تو فِتْنہا، ورنہ ان سے بڑی

اسلام یا تلوار؟

شتمیر اسلام منوایا جاتا۔ اس غلط (اور بکسرِ خلافِ اسلام) نظریہ کے عام کئے جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا کے تہذیب و تمدن میں جہاں کہیں اسلام کا نام آتا ہے، قتل و غارت گری، بربادی اور تباہی، ہلاکت و خون ریزی، جو رستمِ ظلم و استبداد کے خونین مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں جن میں نظر آتا ہے کہ وحشی اور خونخوار جنگلی انسانوں کے غول کے غول، نیزوں اور تلواروں کی جھنکار میں سیل بے پناہ کی طرح بڑھتے چلے آ رہے ہیں جن کے جلو میں، سبعیت و بربریت کے مجسمے، ہولناک جنات و عفاریت کی تسکلیں میں آگ اور خون کی ہولی کھیلنے لگے۔ ان کے نعروں کے ساتھ امنڈے چلے آ رہے ہیں۔ اور اس قہر خداوندی، اس سیلابِ بلا کے سامنے تہذیب و تمدن، علم و عمرانیات، عدل و انصاف، عفت و عصمت، مذاہب و مسالک کے پھولوں اور پھلوں کے درخت ایک ایک کر کے جڑ سے اکھڑتے چلے جاتے ہیں اور انسان کی ہزار ہا سال کی محنت و کوشش نے جو متاعِ علم و دانش جمع کی تھی وہ سب راکھ کا ڈھیر ہوتی چلی جاتی ہے۔ مظلوموں کی فریاد، یتیموں کی آہ و بکا، بیواؤں کا نالہ و فغاں آسمان تک جاتا اور ناکام نامراد واپس آ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ سب قتل و غارت گری تو اسی خدا کا بول بالا کرنے کے لئے کی جاتی تھی جہاں جہاں سے یہ قیامتِ صغریٰ گزرتی ہے، آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ بستیاں اجڑ جاتی ہیں۔ کتب خانے جل کر راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں، ان کی لٹکار ایک ہی ہے۔ یعنی اسلام یا تلوار۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کہیں ٹوٹی ہوئی صلیبوں کے انبار دکھائی دیتے ہیں اور کسی جگہ زنا کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ مندر ویران ہیں۔ گرے سمار ہیں۔ نہ برہمن کو کہیں مان ہے نہ کلیسا کے راہب کے لئے کوئی گوشہ عافیت نہ عورتیں محفوظ ہیں نہ بچے مامون۔ کچھ قتل کر دیئے گئے۔ جو باقی بچے وہ ناک میں نکیل ڈلوائے، وحشی سپرداروں کے کورے کھاتے، شناس (منڈلیوں) کی طرف گھسٹتے چلے جاتے ہیں کہ وہاں احترامِ انسانیت کو دو ٹوکوں کے عوض نیلام کر دیا جائے اور یہ عفت مآب خواتین لوندیاں بن کر ان کی ہوسِ جنس پرستی کی تسکین کا سامان مہیا کریں۔

یہ ہے وہ تصویر جو اسلام کا نام آتے ہی آنکھوں کی پتیلیوں میں سکتہ پیدا کر دیتی ہے۔ دیکھنے والے کا خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ حقارت و نفرت کے بخارات، قلب سے اٹھ کر دماغ پر چھا جاتے ہیں اور اس ننگِ انسانیت

بہیمانہ مذہب کو دنیا سے مٹانے کی مختلف تدابیر کو ذہن کی جولانگاہ بنا دیتے ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے متعلق یہ ساری بھیاں تک تصویر، پیدا کر رہے ہیں قرآن کریم کی اس آیت کی غلط تفسیر و تعبیر کی کہ تم کافروں کے ساتھ جنگ کرو تا آنکہ اسلام ساری دنیا میں پھیل جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تصویر کو بھیا تک سے بھیا تک تر بنانے اور اس کو دنیا میں عام کرنے میں، یورپ کے متعصب متورخین، مفکرین اور ارباب کلیسائے پراپیگنڈے کا بڑا دخل ہے لیکن اس کا رنگ و روغن تو خود ہمارے ہاں کی تفاسیر اور تاریخ کا بھیا کر رہا ہے اور اس کی بنیاد ہے اس (اور اسی قسم کی دیگر) آیات کی غلط تفسیروں، اور ہماری افسانوی تاریخ پر جو اسلام کا نقاب اوڑھے معاذین اسلام کی وضع کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں، ہم متقدمین کی تفاسیر و کتب تاریخ سے بکثرت مثالیں پیش کر سکتے تھے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ زیادہ مناسب اور مفید ہو گا کہ اس ضمن میں عصر حاضر کے ایک ایسے مفسر کی ”تحقیقات“ پیش کر دی جائیں جو ماڈرن کہلانے اور بڑے

مودودی صاحب کی تفسیر

روشن خیال سمجھے جاتے ہیں۔ ہماری مراد، ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے ہے جن کے قلم کا شہرہ عام ہے۔ وہ پہلے سورۃ انفال کی حسب ذیل آیت مع ترجمہ نقل کرتے ہیں :-

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلَّهُ لِلَّهِ - (۴۶)

اور تم ان سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین بالکل اللہ ہی کا ہو جائے۔

اور اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

اس آیت میں دین اسلام کے پیروں کو حکم دیا گیا ہے کہ دنیا سے لڑو اور اس وقت تک دم نہ لو جب تک کہ

فتنہ یعنی ان نظامات کا وجود دنیا سے نہ مٹ جائے جن کی بنیاد خدا سے بغاوت پر قائم ہے۔ اور پورا نظام

اطاعت و بندگی اللہ کے لئے خالص نہ ہو جائے۔

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں - پہلا ایڈیشن ص ۹۵-۹۶)

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک ”پورا نظام اطاعت و بندگی اللہ کے لئے خالص“ صرف اسلام کی دوسری ہو سکتا ہے۔ اس لئے مودودی صاحب کی اس تشریح کا مطلب واضح ہے کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ساری دنیا (تمام غیر مسلموں) سے لڑتے جائیں تا آنکہ اسلام کا غلبہ ہو جائے۔

انہوں نے اپنی کتاب تفہیمات (حصہ اول) میں جہاد فی سبیل اللہ کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا ہے اس

میں وہ پہلے اصولاً لکھتے ہیں :-

اس بحث سے یہ بات آپ پر واضح ہو گئی ہوگی کہ اسلامی جہاد کا مقصود، غیر اسلامی نظام کی حکومت کو مٹا کر اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ (محرم ۱۳۵۹ھ ایڈیشن ص ۷۹)

پھر اس اجمال کی تفصیل میں لکھتے ہیں :-

یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے خلفائے راشدین نے عمل کیا۔ جہاں مسلم پارٹی پیدا ہوتی تھی، سب سے پہلے اس کو اسلامی حکومت کے زیرِ نگیں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اطراف کے ممالک کو اپنے اصول و مسلک کی طرف دعوت دی مگر اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں، بلکہ قوت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا۔ آنحضرتؐ کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ پارٹی کے لیڈر ہوئے تو انہوں نے روم اور ایران دونوں کی غیر اسلامی حکومت پر حملہ کیا اور پھر حضرت عمرؓ نے اس حملہ کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا۔ (ص ۸۰-۸۱)۔ (نیز رسائل و مسائل - حصہ چہارم۔

پیلا ایڈیشن - ص ۱۹)

ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ عہد رسالت مآب اور خلافت راشدہ کی جنگوں کی غرض و غایت کیا تھی میں نے ان کے متعلق اپنی کتاب ”معراج انسانیت“ (یعنی سیرت حضور نبی اکرمؐ) اور ”شاہکار رسالت“ - عمر فاروقؓ میں شرح و بسط سے گفتگو کی ہے۔ اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ خود ہمارے مفسرین اور مؤرخین، اسلام کا کس قسم کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مودودی صاحب کے بیان کے مطابق، حضور نبی اکرمؐ کو جو نبی قوت حاصل ہوئی، آپ نے اس کا بھی انتظار نہ کیا کہ آپ کی طرف سے بھیجی ہوئی دعوت اسلام قبول کی جاتی ہے یا نہیں، رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا اور حضورؐ کے بعد، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے گرد و پیش کی غیر مسلم حکومتوں کے ساتھ یہی کچھ کیا۔ ان جنگوں میں گرفتار شدہ قیدی عورتوں کو کس طرح لوٹائیاں بنا کر سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا کہ وہ انہیں بلا نکاح اور بلا قید تعداد اپنے استعمال میں لائیں“ اور جب جی چاہے انہیں فروخت کر دیں، اس کے متعلق مودودی صاحب کی تصریح مطالب الفرقان جلد دوم ص ۵۹-۶۰۔ زیرِ آیت (۲۵) پیش کی جا چکی ہیں۔

مودودی صاحب نے، اپنی کتاب ”خطبات میں کبھی جہاد کے موضوع پر کافی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کا ملخص یہ

ہے کہ اسلام پہلے اپنی ایک پارٹی تیار کرتا ہے۔

اور جب وہ اس طرح اپنے آدمیوں کو تیار کر لیتا ہے تب وہ ان سے کہتا ہے کہ ہاں! اب تم رستے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہذا، آگے بڑھو۔ لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی

کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔ (خطبات - ۱۳۵۹ھ - ایڈیشن ۲۳۵)

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کیا اسلام بڑوٹھیر پھیلے؟ مودودی صاحب نے اپنی کتاب ”الجهاد في الاسلام“ میں (جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا اور جس کا ان کی جماعت کی طرف سے بڑا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے) لکھتے ہیں۔

رسول اللہ تیرہ برس تک عرب کو اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ وعظ و تلقین کا جو موثر سے موثر انداز ہو سکتا تھا،

اسے اختیار کیا۔ مضبوط دلائل دیئے۔ واضح جہتیں پیش کیں۔ فصاحت و بلاغت اور زور و خطابت سے دلوں کو گرمایا۔

اللہ کی جانب سے محیر العقول معجزے دکھائے۔ اپنے اخلاق اور پاکیزہ زندگی سے نیکی کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ اور

کوئی ذریعہ ایسا نہ چھوڑا جو حق کے اظہار و اثبات کے لئے مفید ہو سکتا تھا۔ لیکن آپ کی قوم نے آفتاب کی طرح آپ

کی صداقت کے روشن ہو جانے کے باوجود آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حق ان کے سامنے خوب ظہر

ہو چکا تھا۔ انہوں نے برائی العین دیکھ لیا تھا کہ جس راہ کی طرف ان کا بادی انہیں بلاتا ہے وہ سیدھی راہ ہے۔ اس

کے باوجود صرف یہ چیز انہیں اس راہ کو اختیار کرنے سے روک رہی تھی کہ ان لذتوں کا چھوڑنا انہیں گوارا نہ تھا جو کافراں

بے قیدی کی زندگی میں انہیں حاصل تھیں۔ لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعی اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی اور

آلا۔ کل ما شرہ او دمہ او مالہ بیدعی فھو تحت قدحی حاتین۔ کا اعلان کر کے تمام مودوثی امتیازات

کا خاتمہ کر دیا۔ عزت و افتخار کے تمام رسمی بتوں کو توڑ دیا۔ ملک میں ایک منظم اور منضبط حکومت قائم کر دی۔ اخلاقی قوانین

کو بڑور نافذ کر کے اس بدکاری اور گناہ نگاری کی آزادی کو سلب کر لیا جس کی لذتیں ان کو مدہوش کئے ہوتے تھیں۔ اور

وہ پر امن فضا پیدا کر دی جو اخلاقی فضائل اور انسانی محاسن کے نشوونما کے لئے ہمیشہ ضروری ہوا کرتی ہے، تو دلوں

سے رفتہ رفتہ بدی اور شرارت کا رنگ چھوٹنے لگا۔ طبیعتوں سے فاسد مادے خود بخود نکل گئے۔ روحوں کی کثافتیں

دور ہو گئیں اور یہی نہیں کہ آنکھوں سے پردے ہٹ کر حق کا نور صاف عیاں ہو گیا بلکہ گردنوں میں وہ سختی اور

مروں میں وہ نخوت باقی نہ رہی جو ظہورِ حق کے بعد انسان کو اس کے آگے جھکنے سے باز رکھتی ہے۔

عرب کی طرح دوسرے ممالک نے بھی جو اسلام کو اس سرعت کے ساتھ قبول کیا کہ ایک صدی کے اندر چوتھائی

دنیا مسلمان ہو گئی تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسلام کی تلوار نے ان پردوں کو چاک کر دیا جو دلوں پر پڑے ہوئے تھے

..... پس جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان بناتا ہے اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ

کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا کوئی حصہ نہیں۔ حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت

میں تبلیغ اور تلوار دونوں کا حصہ ہے۔ (الجهاد في الاسلام - ۱۹۴۳ء - ایڈیشن ۱۴۳۰ھ)

اس اقتباس کے آخر میں کہا گیا ہے کہ ”اسلام کی اشاعت میں تبلیغ اور تلوار دونوں کا حصہ ہے“ ظاہر ہے کہ اس میں ”تبلیغ“ کا لفظ محض برائے وزن بیت شامل کر دیا گیا ہے، ورنہ جہاں تک تبلیغ کا تعلق ہے، مودودی صاحب لکھ چکے ہیں کہ تبلیغ اسلام کے لئے حضور نبی اکرمؐ تیرہ سال تک مسلسل کوششیں فرماتے رہے (یعنی اپنی عمر نبوت کا قریب ساٹھ فیصد حصہ اس میں صرف کر دیا)۔ اس مقصد کے حصول کے لئے، موثر سے موثر طریق استعمال کر دیجئے۔ حتیٰ کہ خدائے معجزات تک دکھلا دیجئے لیکن وعظ و تلقین کی یہ تمام کوششیں (معاذ اللہ) ناکام رہ گئیں۔ اس کے بعد آپ تلوار سے کراٹھے تو چند دنوں میں اسلام سارے ملک میں پھیل گیا۔

یہ ہے اسلام کا وہ نقشہ جو دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

(۱۰)

یہ تو رہا غیر مسلموں کو مسلمان کرنے کا سوال۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر کوئی مسلمان، اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنا چاہے تو کیا اُسے اس کی اجازت ہوگی؟ مودودی صاحب کا اس باب میں ارشاد یہ ہے کہ اُسے اس کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔ وہ مرتد کہلائے گا اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ یعنی ایسے شخص کو قتل کر دیا جائے گا۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک کناچہ شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے ”مرتد کی سزا۔ اسلامی قانون میں“۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

یہ بات اسلامی قانون کے کسی واقعہ کار آدمی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام میں اس شخص کی سزا قتل ہے جو مسلمان ہو کر پھر کفر کی طرف پلٹ جائے۔ (اگست ۱۹۵۳ء ایڈیشن ص ۷)

وہ اپنے اس دعویٰ کی تائید میں، تاریخ سے مثالیں پیش کرتے ہیں۔ (مثلاً) وہ لکھتے ہیں:-
حضرت علیؓ کو اطلاع دی گئی کہ ایک گروہ عیسائی سے مسلمان ہوا۔ پھر عیسائی ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو گرفتار کر کے اپنے سامنے بلوایا اور حقیقت حال دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم عیسائی تھے۔ پھر ہمیں اختیار دیا گیا کہ عیسائی رہیں یا مسلمان ہو جائیں۔ ہم نے اسلام اختیار کر لیا۔ مگر اب ہماری رائے یہ ہے کہ ہمارے سابق دین سے افضل کوئی دین نہیں۔ لہذا اب ہم عیسائی ہو گئے ہیں۔ اس پر حضرت علیؓ کے حکم سے یہ لوگ قتل کر دیئے گئے اور ان کے بال بچے غلام بنائے گئے۔ (ص ۲۱-۲۰)

ایک اور مثال !

حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کے مقام پر تھے کہ آپ کو ایک شخص نے اگر اطلاع دی کہ یہاں ایک گھر کے لوگوں نے اپنے ہاں

ایک بت رکھ چھوڑا ہے اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت علیؓ خود وہاں تشریف لے گئے تلاشی لینے پر بت نکل آیا حضرت علیؓ نے اس گھر میں آگ لگا دی اور وہ گھر والوں سمیت جل گیا۔ (ص ۲۲)

یہ ہے خدا کے ارشاد 'لا اکراہ فی الدین' (دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر اور زبردستی نہیں) پر زبان سے ایمان رکھنے والوں کا "عملی اسلام" ظاہر ہے کہ یہ تمام روایات اور واقعات جنہیں مودودی صاحب اپنے نظریہ کی تائید میں پیش کر رہے ہیں، وضعی ہیں۔ لیکن ان کا ارشاد ہے کہ:-

اس باب میں پہلا شک جو مسلمانوں کے اندر پیدا ہوا وہ انیسویں صدی کے دور آخر کی تاریک خیالی کا نتیجہ تھا (ص ۱۷) واضح رہے کہ ان حضرات کے عقیدہ کی رُو سے مرتد وہی نہیں جو اسلام چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے۔ ان کے فیصلہ کی رُو سے جس شخص کے متعلق یہ حضرات فتویٰ دے دیں کہ اس کے عقائد "اسلام" کے مطابق نہیں (یعنی ان کے تصور کے اسلام کے مطابق نہیں) اسے بھی مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جاتے گا۔ اس تکفیر سازی اور اتداد بازی نے بے گناہ مسلمانوں کے خونِ ناحق کی کس طرح ندیاں بہا دیں، اس کے تذکرہ سے ہماری تاریخ کے صفحات لالہ زار ہیں مثال کے طور پر ایک عقیدہ "خلق قرآن" کو لیجئے اور پھر دیکھتے کہ اس عقیدہ کے حامیوں اور مخالفوں کا کس قدر خون بے محابا بہا گیا حالانکہ دونوں مسلمان تھے اور ان میں بعض بڑی بڑی ممتاز ہستیاں بھی تھیں۔

بادنی تعمق یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ یہ عقیدہ (یعنی مرتد کی سزا قتل ہے) جو اسلام کے قرآنی تصور کو جڑ بنیاد سے اکھڑ کر رکھ دیتا ہے، ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ ہے۔ بادشاہ اپنے جس مخالف کو ختم کرنا چاہتا، بجائے اس کے کہ اسے اپنے حکم سے قتل کر کے کلنک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پر لگاتا، وہ "علماء حضرات" کو اشارہ کر دیتا کہ اس کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیں۔ اس فتویٰ کی رُو سے وہ مرتد قرار پا جاتا اور پھر "شریعتِ حق" کی رُو سے اسے قتل کر کے حکومت محافظ دینِ متین قرار پا جاتی۔ بادشاہوں سے نیچے اتر کر، خود علماء حضرات بھی باہمی آتشِ حدود و رقابت کو فرو کرنے کے لئے یہی "مقدس حربہ" استعمال کرتے۔

آپ کہیں گے کہ یہ ازمنہ مظلمہ (DARK AGES) کی باتیں ہیں۔ موجودہ زمانے میں یہ عہد کہیں کی داستانیں بن چکی ہیں۔ اب انہیں کوئی نہیں مانتا لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ یہ تاریک دور کی باتیں نہیں، آپ کے اس روشن ترین دور میں بھی اسی شریعت کے احیاء کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ مودودی صاحب نے اپنے مذکورہ صدر کتابچہ (مرتد کی سزا) — اسلامی قانون میں) کے آخر میں موجودہ مسلمانوں کے متعلق بھی بحث کی ہے جنہیں وہ پیدا کنشی مسلمان کہہ کر پکارتے

لے سرسید کی تحریک کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اس خلاف اسلام نظریہ کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔

ہیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں :-

اس سلسلے میں ایک آخری سوال اور باقی رہ جاتا ہے جو "قتل مرتد" کے حکم پر بہت سے دماغوں میں تشویش پیدا کر دیتا ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص پہلے غیر مسلم تھا، پھر اس نے بابتیار خود اسلام قبول کیا اور اس کے بعد دوبارہ کفر اختیار کر لیا، اس کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے جان بوجھ کر غلطی کی۔ کیوں نہ وہ ذمی بن کر رہا اور کیوں ایسے اجتماعی دین میں داخل ہوا جس سے نکلنے کا دروازہ اسے معلوم تھا کہ بند ہے۔ لیکن اس شخص کا معاملہ ذرا مختلف ہے جس نے اسلام کو خود نہ قبول کیا ہو بلکہ مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے اسلام آپسے آپ اس کا دین بن گیا ہو۔ ایسا شخص اگر ہوش سنبھالنے کے بعد اسلام سے مطمئن نہ ہوا اور اس سے نکل جانا چاہے تو یہ بڑا غضب ہے کہ آپ اسے بھی منزلت موت کی دھمکی دے کر اسلام کے اندر رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف ایک زیادتی معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ پیدائشی منافقوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اسلام کے اجتماعی نظام کے اندر پرورش پاتی رہے۔ (۷۵)

یہ تو رہا مسئلہ، اب اس مسئلہ (PROBLEM) کا حل ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں :-

پس جہاں تک نفس مسئلہ کا تعلق ہے، وہ بہر حال یہی رہے گا کہ مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہونے والی اولاد مسلمان ہی سمجھی جائے گی اور قانون اسلام کی طرف سے ان کے لئے ارتداد کا دروازہ ہرگز نہ کھولا جائے گا۔ اگر ان میں سے کوئی اسلام سے پھرے گا تو وہ بھی اسی طرح قتل کا مستحق ہوگا جس طرح وہ شخص جس نے کفر سے اسلام کی طرف آکر پھر کفر کا راستہ اختیار کیا ہو۔ یہ تمام فقہائے اسلام کا متفق علیہ فیصلہ ہے اور اس باب میں ماہرینِ علمِ شریعت کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ اس معاملے کا ایک پہلو ایسا ہے جس میں مجھے کچھ سمجیدگی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ ایک مدت دراز سے ہمارا اجتماعی نظام نہایت ڈھیلا اور سست رہا۔ ہمارے ہاں کئی نسلیں ایسی گزر چکی ہیں کہ ہر نسل نے بعد کی نسل کو اسلامی تعلیم و تربیت دینے میں سخت کوتاہی کی ہے۔ خصوصاً پچھلے دورِ غلامی میں تو ہماری قومی بے شعوری اس حد کو پہنچ گئی کہ ہمارے لاکھوں افراد نے بے پرواہی کے ساتھ اور ہزاروں نے جان بوجھ کر اپنی اولاد کو کافرانہ تعلیم و تربیت کے حوالے کر دیا۔ اس وجہ سے ہمارے ہاں اسلام سے بغاوت و انحراف کے میلانات رکھنے والوں کا تناسب خطرناک حد تک بڑھ گیا ہے اور بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اگر اگے چل کر

لے فقہاء اور ماہرینِ علمِ شریعت کو بطور سند پیش کیا جا رہا ہے۔ قرآن کو نہیں۔

لے خود مودودی صاحب نے بھی اپنی اولاد کو یہی تعلیم دلوائی ہے۔

کسی وقت اسلامی نظام حکومت قائم ہوا اور قتل مرتد کا قانون نافذ کر کے اُن سب کو بزورِ اسلام کے دائرے میں مقید کر دیا گیا۔ جو مسلمانوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اسلام کے پیدائشی پیرو قرار دیئے جاتے ہیں، تو اس صورت میں بلاشبہ یہ اندیشہ ہے کہ اسلام کے نظام اجتماعی میں منافقین کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہو جائے گی جس سے ہر وقت ہر فرد کی کا خطرہ رہے گا۔

میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے واللہ الموفق للصواب، کہ جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ ”جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور مخرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تائیدِ نزعِ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں“ اس مدت کے بعد اُن سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں۔ مسلمان سمجھا جائے گا، تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے، فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جاسکتا ہے بچالیا جائے، پھر جو کسی طرح نہ بچائے جاسکیں، انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عملِ تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔ (صفحہ ۷۴-۷۵)

”جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا“ سے مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے متعلق یہ حضرات کہہ دیں گے کہ اس کے عقائد اسلام کے مطابق نہیں رہے، اسے مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جائے گا۔

(۱)

بات یہاں سے چلی تھی کہ قرآن کریم نے کن حالات میں، اور کن مقاصد کے لئے جنگ کرنے کی اجازت یا حکم دیا ہے۔ اس دلیلِ تہیدی سفر کے بعد آپ متعلقہ آیات کی طرف آئیے۔ یعنی آیات ۱۹۳-۱۹۰ کی طرف۔ ان میں دو تین بنیادی نکات سامنے آتے ہیں جن کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ یعنی

(۱) قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ - (۱۹۰)

لے اس مسئلہ پر، ادارہ، طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ ”قتل مرتد اور غلام اور لونڈیاں“ میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

(۲) الْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ - (۲/۱۹۱)

(۳) وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ - (۲/۱۹۳)

۲
۱۹۳

سورہ انفال میں ہے۔ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (۸/۳۹)

”فی سبیل اللہ“ قرآن کریم کی خاص اصطلاح ہے اور بیشمار مقامات میں آتی ہے جن کا یہاں استقصا ضروری نہیں مختصر

الفاظ میں اس کے معنی ہیں ”خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی خاطر“ یا نظامِ خداوندی کے قیام

فی سبیل اللہ کا مفہوم

اور استحکام کی خاطر۔ ان مقاصد کے حصول کی خاطر جو جماعتِ مومنین کے لئے خدا کی طرف سے

متعین کئے گئے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ان مفہیم میں الفاظ اگرچہ کچھ مختلف ہیں لیکن مقصد سب کا ایک ہی ہے۔ اس کے برعکس

”طاغوت“ کا لفظ آیا ہے۔ یہ بھی ایک جامع اصطلاح ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں حد سے تجاوز کر جانے والا۔ سرکشی اختیار

کرنے والا۔ ”طغیانی“ اسی سے ہے۔ اصطلاحی طور پر اس سے مراد ہر وہ نظریہ، نظام یا قوت ہے جو حدود و قوانینِ خداوندی

سے سرکشی برتے۔ قرآن کریم نے جنگ کے سلسلہ میں کہا ہے کہ الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُوكَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ - وَ

الَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُوكَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ ... (پہ)۔ ”مومن“ فی سبیل اللہ ”جنگ کرتے ہیں، اور

کفار فی سبیل الطاغوت۔“ یہاں سے ہر دو جماعتوں کے جنگ کے مقاصد کا فرق سامنے آ جاتا ہے۔ ان دونوں میں

کشمکش شروع سے چلی آرہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کشمکش کیا ہے اور کیوں ہے؟

طاغوت سے مراد

اللہ پر ایمان لانے والے اپنے ہاں ایسا معاشرہ (یا نظام) قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں وہ آزادانہ

قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ یہ غیر مسلموں (کفار) کے مسلک و مشرب سے کوئی تعرض نہیں کرتے صرف

اپنے ہاں اپنے مسلک کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن طاغوتی قوتیں ان کے راستے میں مزاحم ہوتی ہیں۔ وہ انہیں

اس کی اجازت نہیں دیتیں اور ویسے کام نہ چلے، تو قوت کے بل بوتے پر ان کے راستے میں کھڑی ہو جاتی ہیں جھنور بنی اگر تم نے

جب مکہ میں اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قریش اس کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم تمہیں اس کی اجازت

نہیں دے سکتے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو خالص دھاندلی ہے جب میں تنہا سے منہاج و مسلک میں دخل نہیں دیتا تو تم میرے

راستے میں کیوں کھڑے ہوتے ہو۔ قُلْ يَقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَى مَكَانَتِكُمْ اِنِّي عَامِلٌ۔ فَسَوْفَ نَعْلَمُ مَنْ مَّنْ تَكُونُ

لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ۔ اِنَّكَ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ۔ (پہ)۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق

کام کرتے جاؤ۔ مجھے اپنے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ آخر الامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے

اور دنیا دیکھ لے گی کہ ظلم اور دھاندلی پر مبنی نظام کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ لیکن یہ جو آخر میں کہا گیا تھا کہ ”نتائج خود

بتادیں گے کہ کون سا نظام کیسا ہے۔" یہی خدشہ تو انہیں کھائے جا رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر رسول اللہ کا پروگرام کامیاب ہو گیا تو اس کے درخشندہ انسانیت ساز نتائج دیکھ کر، ساری دنیا لپک کر ان کے نظام کی طرف آجائے گی۔ یہ وجہ تھی جو وہ اس کے راستے میں آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو رہے تھے۔ حضور ان سے کہتے کہ اس باب میں دھونس اور دھاندلی کا سوال ہی نہیں۔ میں بھی عقل و بصیرت، دلائل و براہین کی رو سے بات کرتا ہوں، تم بھی اسی طرح دلائل و بصیرت کی رو سے بات کرو۔ (REASONABLE) بنو۔ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔ (۲۱۱)۔ لیکن وہ جواب میں کہتے کہ کہاں کی دلیل اور کیسی برہان۔ یہاں فیصلہ قوت سے ہوگا اور یہ تم بھی جانتے ہو کہ قوت کس کے پاس زیادہ ہے۔ اس کے جواب میں ان سے فقط اتنا کہا جاتا کہ تاریخ کے اوراق سے پوچھو کہ عقل و بصیرت کے بجائے، دھونس اور دھاندلی (قوت) کے زور سے بات منوانے والوں کا حشر کیا ہوا کرتا ہے۔ وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً۔ (۲۱۲) وہ قومیں قوت اور زور میں ان سے کہیں بڑھ کر تھیں۔ لیکن وہ قوت کے نشے میں بدمست تھے۔ انہوں نے کوئی معقول بات نہ سنی اور ان لوگوں کا بدستور راستہ روکتے رہے جو اپنی منشا اور مرضی کے مطابق، قوانین خداوندی کے تابع نہج زندگی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ قرآن کریم میں دیکھتے۔ اس نے ان کے خلاف یہ فرد جرم عاید نہیں کیا کہ انہوں نے اس نئی دعوت (دین خداوندی) کو قبول کیوں نہیں کیا۔ جرم یہ عاید کیا ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرنے والوں کی مزاحمت کرتے تھے۔ انہیں اپنے لئے آزادانہ راستہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اسے قرآن کریم نے "يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اللہ کی طرف لے جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جانا۔ لوگوں کو ادھر جانے سے روکنا۔

ان کی (اور دنیا میں ہر دھاندلی کرنے والے کی) اس ذہنیت اور روش کو قرآن کریم نے "فتنہ" کہہ کر پکارا ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں، آگ میں تپانا۔ اذیت پہنچانا۔ لیکن استعمال کے لحاظ سے یہ اُس وقت **فتنہ کے معنی** بولا جاتا ہے جب کسی پر زبردستی کی جلتے رہے جب کوئی دوسرے کا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے۔ اسے اس کے راستے سے ہٹا دے خواہ وہ کسی طریق سے ہو۔ مثلاً سورہ المائدہ میں حضور سے ارشاد ہے کہ وَاحْذَرُوا أَن يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ..... (۱۱۳)۔ اس بات سے محتاط رہنا کہ یہ لوگ کہیں تمہیں وحی کے بتائے ہوئے راستے سے نہ ہٹا دیں۔ دوسری جگہ ہے۔ وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُوكَ عَنِ الذِّمِّيِّ أَوْ حَتِّيًا إِلَيْكَ..... (۱۱۴)۔ انہوں نے تمہیں کرکھا تھا کہ یہ تمہیں وحی کے راستے سے ہٹا دیں۔ ایک اور مقام پر ان منافقین سے کہا گیا کہ مَا أُنْتُمْ عَلَيْهِ بِفَاتِنِينَ۔ (۱۱۵)۔ "تم کسی کو خدا کی طرف سے بہکا، ہٹا کر نہیں لے جا سکتے۔"

ان آیات میں دیکھیے، فتنہ کا لفظ، کسی کو خدا کی راہ سے بہکا، ہٹا کر لے جانے کے لئے بولا گیا ہے۔ یہی ”صَدَّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ“ خدا کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جانا ہے۔

قریش نے اپنی مزاحمت جاری رکھی تا آنکہ نبی اکرمؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے۔ یہاں منتقل ہو جانے کے بعد، قریش سے کسی قسم کا تعلق واسطہ نہ رہا، اس لئے انہیں اپنی مزاحمت ختم کر دینی چاہیے تھی لیکن وہ اس میں اور بھی زیادہ متشدد ہو گئے۔ وہ مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ سورہ انفال میں ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ (پہ)۔ یہ مخالفین، خدا کا راستہ روکنے کے لئے مال و دولت خرچ کر رہے ہیں۔ اور جب ان کی یہ تیاریاں مکمل ہو گئیں تو انہوں نے ۲۰۰۰ مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کو پہلی بار جنگ کرنے کی اجازت دی گئی۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقْتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظَلَمُوْا۔ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِہِمْلَقَدِیْرٌ۔ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِہِم بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبَّنَا اللّٰهُ۔ (۲۲-۳۰)
ان لوگوں کو جن پر مسلسل مظالم کئے گئے جنہیں ان کے گھریلو سے نکال دیا گیا۔ اور جو وہاں سے نکل کر، اتنی دور، اگر بے، تو ان کے خلاف لشکر جہاز لے کر، حملہ کرنے کو آگئے۔ انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ ان حملہ آوروں کا مقابلہ میدان جنگ میں کریں۔ ان لوگوں کا، جن کے خلاف دشمن یہ کچھ کر رہے ہیں، بالآخر جرم کیا تھا؟۔ جرم بس یہ تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور یہ مخالفین کہتے تھے کہ ہم تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ تم اللہ کو اپنا رب تسلیم کرو۔

دوسری جگہ ہے۔ وَمَا نَقَمُوْا مِنْہُمْ اِلَّا اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ۔ (۵۶)۔ ”یہ ان سے بس اس بات کا انتقام لے رہے ہیں کہ یہ خدا پر ایمان کیوں لے آئے ہیں“ اسے قرآن نے پھر ”فتنہ“ کہہ کر پکارا ہے۔ (۵۶) اور ”صَدَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ“ یعنی خدا کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جانا۔ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِہِم بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبَّنَا اللّٰهُ۔ (۲۲-۳۰) یہ لوگ اس ططراق سے حملہ کرنے کے لئے گھروں سے نکلے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ دیکھو! ہم نے کس مقصد کے لئے یہ لشکر کشی کی ہے۔ ”یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ“ کے لئے۔ خدا کا راستہ روکنے کے لئے۔ اس مقام پر ان بے گھر بے در قلیل التعداد ہاجرین کو جنگ کی اجازت دی گئی۔ ان سے کہا گیا کہ :-

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّمِیْکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰهِ۔ (۱۰۰) (پہ)

ہاں! اب تم ان سے جنگ کر سکتے ہو۔ ان سے جنگ کرو حتیٰ کہ وہ فتنہ مٹ جائے جس کے لئے یہ ان اقدامات تک اتر آتے ہیں۔ یعنی دین کے معاملہ میں کوئی کسی پر کسی قسم کی زبردستی نہ کر سکے۔ دین کا معاملہ خالصتہً اللہ کیلئے ہو جائے جس کا جی چاہے، برضا و رغبت 'لوجہ اللہ' دین اختیار کرے۔

دوسری جگہ اسے اور بھی واضح الفاظ میں بیان کر دیا جہاں کہا کہ یَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ۔ اے رسول! یہ تمہارے رفقاء تم سے پوچھتے ہیں کہ ہمیں جواب جنگ کی اجازت دی گئی ہے تو یہ بھی بتا دیجئے کہ جن مہینوں میں جنگ کرنے کی ممانعت ہے، اس کی بابت ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ ان مہینوں میں جنگ کرنا سنگین جرم ہے۔ دوسری طرف اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھو کہ وَصَدُّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ۔ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ۔ لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکنا۔ اس کے نظام کے خلاف سرکشی برتنا مسجد حرام تک میں جنگ سے باز نہ رہنا اور لوگوں کو اس مامن سے بھی نکال باہر کرنا۔ یہ جرائم بہت زیادہ سنگین ہیں۔ یہ تو کھلی ہوئی دھاندلی ہے۔ یہ فتنہ ہے۔ اور فتنہ، جنگ سے بھی زیادہ تباہی اور فساد کا موجب ہوتا ہے اس لئے فتنہ کو مٹانے کے لئے جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ تم حیران ہو گئے کہ جب تم ان کا کچھ بگاڑتے نہیں۔ ان کی کوئی مزاحمت نہیں کرتے۔ ان کے مسلک و منہاج میں دخل تک نہیں دیتے۔ ان کا ملک چھوڑ کر، وہاں سے دور، اس دیس میں آ بیے ہو۔ تو پھر یہ تمہاری جان کے لاگو کیوں ہو رہے ہیں؟ یہ اس لئے کہ یہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ تم یہ نیا دین اختیار کر لو۔ اس لئے یاد رکھو: لَا يَزَالُونَ يَقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى تَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا۔ (۲۴)۔ جب تک ان میں قوت و استطاعت رہے گی، یہ تم سے جنگ کرتے رہیں گے تا آنکہ تمہیں اس دین سے ہٹا کر، پھر اپنے مسلک کی طرف نہ لوٹالیں۔

اور اس کے بعد، اس سلسلہ میں وہ بلند و بالا اور غیر متبدل اصول بیان کیا جسے، ہمارے خیال میں، دنیا کی

ہر مملکت کے ایوان حکومت کی پیشانی پر سنہری حروف میں کندہ کرا دینا چاہیے۔ فرمایا کہ اگر دھاندلی کے مسلک کو بلا روک ٹوک ان وہاں

مذہبی آزادی کی خاطر جنگ

چلنے دیا جائے تو دنیا سے مذہبی آزادی کا خاتمہ ہو جائے۔

لَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدَمَتْ صَوَامِعُ وَبِيْعٌ وَصَلَوَاتٌ وَ

مَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا۔ (۲۵)۔

اگر اس قسم کا انتظام نہ کیا جائے کہ بد لگام اور سرکش لوگوں کی مدافعت کے لئے امن پسند لوگ اٹھیں، تو کسی قوم کی عبادت گاہ تک دنیا میں محفوظ نہ رہے۔ زاویہ نشین راہبوں کی خانقاہیں، عیسائیوں کے گرہے، یہودیوں کے ہیکل، مسلمانوں کی مسجدیں، جن میں خدا کا نام بجزرت لیا جاتا ہے، سب ڈھا دی جائیں۔ ان پرستش گاہوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ سرکش قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی جماعت موجود رہے۔

معاہد (پرستش گاہیں) علامات ہوتی ہیں متعلقہ مذاہب کی۔ لہذا، معاہد کی حفاظت سے مراد خود ان مذاہب کی حفاظت ہے غور کیجئے۔ اسلام ان تمام مذاہب و مسالک کو باطل قرار دیتا ہے لیکن اس کے باوجود کہتا یہ ہے کہ اگر کوئی قوت کسی مذہب کو زبردستی مٹانا چاہے تو امت مسلمہ کا فرضیہ ہوگا کہ وہ اس مستبد قوت کا مقابلہ کر کے اس مذہب کی مدافعت اور محافظت کرے۔ سوچئے کہ کیا ایسا دین جو دوسروں کے مذہب کی حفاظت کے لئے اپنے پیروں کو سینہ سپر میدان جنگ میں نکل آنے کا حکم دے، اس کی تلقین کریگا دیا اسے روار کھے گا کہ غیر مسلموں کو زبردستی مشرک بنایا جائے۔ آیات بالا کے تسلسل میں اس نے کہا ہے کہ جو قوم، ان مذاہب کی مدافعت کے لئے اٹھے گی، اللہ کی نصرت اسکے شامل حال ہوگی۔ وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ۔ جو لوگ اس مقصد کے لئے سینہ سپر میدان جنگ میں نکلیں گے، یوں کہئے کہ وہ خدا کی مدد کرنے کے لئے اٹھیں گے۔ اور جب وہ خدا کی مدد کرنے کے لئے باہر نکلیں گے تو خدا پر بھی لازم ہوگا کہ وہ ان کی مدد کرے۔ اللہ ان کی مدد ضرور کریگا۔ وہ بہ نصرت خداوندی، ان سرکش قوتوں کو مغلوب کریں اور اس طرح اس قانون خداوندی کو دنیا میں ثبت کر دیں کہ۔ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ۔ (۲۴۶) دین کے معاملے میں کوئی کسی پر جبر نہیں کر سکتا۔ قَدْ تَبَيَّنَ الرَّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲۴۷) دین میں کوئی اکراہ نہیں غلط اور صحیح راستہ نکھر اور ابھر کر لوگوں کے سامنے آچکا ہے۔ فَمَنْ شَاءَ

فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ..... (۲۴۸)۔ جس کا جی چاہے اسے اختیار کرے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ بس اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنُ بِآلِ اللَّهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ۔ لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (۲۴۹)۔ جس نے طاغوت کی راہ اختیار کرنے سے انکار کر دیا اور اللہ کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لیا، تو اس نے ایک ایسا سہارا تمام لیا جو کبھی ٹوٹے گا نہیں۔

حضور نبی اکرم کا قلب درد آگیا اس احساس سے مضطرب و بے قرار رہتا تھا کہ یہ لوگ اپنی غلط روش پر اڑے رہ کر تباہی کیوں مول لے رہے ہیں۔ یہ اسلام کیوں نہیں قبول کر لیتے۔ اس پر ارشادِ باری تعالیٰ ہوا کہ آفَانْتَ تُكْرَهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ۔ (۲۵۰) کیا تو انہیں جبراً مومن بنانا چاہتا ہے؟ اگر انسانوں کو جبراً مومن بنانا

مقصود مشیت ہوتا تو خدا انہیں پیدا ہی اس طرح کرتا کہ یہ سب مومن ہوتے۔ وَ لَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآ مَنَ فِي الْآرْضِ۔ (۲۶)۔ تم دیکھتے نہیں کہ خدا نے حیوانات کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ ایک نوع کے حیوان، ایک ہی روش پر چلنے پر مجبور ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو انسانوں کو بھی ایسا ہی پیدا کر دیتا۔ لیکن اس نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ اُس نے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں اور پھر اُسے آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ جو نسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ اِنَّا هَدَيْنَا السَّبِيلَ اِمَّا شَاكَرًا وَاِمَّا كَفُورًا۔ (۲۷)۔ ہم نے اسے صحیح راستہ دکھا دیا ہے۔ اب اس کا جی چاہے تو اسے اختیار کر لے جی چاہے اُس سے منہ موڑ لے۔ وَ هَدَيْنَا السَّبِيلَ التَّجْدِيْنَ۔ (۲۸)۔ ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں جو بڑے واضح ہیں اور اس کا اختیار دیا ہے کہ یہ جو نسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ مذہب کے معاملہ میں جو ر واکراہ زبردستی سے کام لینے کے معنی ہیں انسان کے اختیار و ارادہ کو سلب کر لینا۔ یہ تو خدا کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ یعنی خدا اسے اختیار و ارادہ کا مالک بناتا ہے اور تم اس کا اختیار و ارادہ سلب کر لینا چاہتے ہو۔ یہ بدترین قسم کا استبداد ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ اس نے فرعون کو استبداد اور فتنہ و فساد کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے اور اس کا سب سے بڑا جرم یہ بتایا ہے کہ وہ خود اپنی قوم کو بھی مذہبی آزادی نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ جب اس کے دربار کے ساحرین (مذہبی پیشواؤں) نے حضرت موسیٰ کی پیش کردہ صداقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر رب موسیٰ پر ایمان لانے کا اعلان کیا تو وہ بھرے ہوئے شیر کی طرح گر جا اور کہا کہ اَمْسَلْتُ لَكُمْ اَذْنَ لَكُمْ (۲۹)۔ میں تمہارے اٹلے ہیں! تم نے میری اجازت کے بغیر اس کا دین قبول کر لیا ہے؟ تم دیکھو کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ میں تمہارے اٹلے ہاتھ پاؤں کٹوا دوں گا۔ تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا۔ تمہیں اس سے بھی زیادہ شدید عذاب دوں گا۔ اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا وہ جہاں ایک طرف ایمان کی حقیقت کو سورج کی طرح روشن کر دیتا ہے۔ دوسری طرف اس جرأت و بسالت کی بھی زندہ شہادت بن جاتا ہے جو قلب مومن میں ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ لَنْ نُّؤْتِيَكَ عَلَى مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ ایک طرف تمہارا یہ دبدبہ و وطنہ ہے جو سرا سر استبداد اور دھاندلی پر مبنی ہے۔ دوسری طرف وہ صداقت ہے جو دلائل و براہین کی روشنی میں ہمارے سامنے آچکی ہے۔ ہم تمہاری دھاندلی کو اس بصیرت افروز حقیقت پر کیسے ترجیح دے دیں؟ تمہاری عقوبت کے ڈر سے ایسا کرنا انتہائی بزدلی ہوگا۔ فَاقْضِ مَا آتَتْ قَاصٍ۔ توجو کرنا چاہتا ہے کہ گزر۔ اِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۔ (۳۰)۔ تیرا دارۂ اختیار ہے ہی کتنا؟ وہ صرف اس دنیا کی زندگی تک محدود ہے، اور زندگی کے میدان اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ ان تک تیری دسترس ہی نہیں ہو سکتی۔

یہ ہے مذہبی آزادی کے بارے میں قرآن کریم کا موقف اور اس کی تعلیم۔ اس کی رُو سے ایمان نام ہے دل و دماغ کی کامل رضامندی اور اطمینان سے صداقت قبول کر لینے کا۔ جو شخص اسلام کی پیش کردہ صداقت کو اس طرح قبول کر لے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر کسی وقت، کسی وجہ سے، اس کا یہ اطمینان باقی نہیں رہتا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا ایمان ہی باقی نہیں رہا۔ جس کا ایمان باقی نہ رہے، اس کے دائرہ اسلام کے اندر رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا، وہ بلا خوف و خطر اسلام کو چھوڑ سکتا ہے۔ اگر اس کے بعد وہ اسلامی مملکت میں رہنا چاہتا ہے تو دوسرے غیر مسلموں (ذمیوں) کی طرح وہیں رہے۔ اگر کسی اور جگہ چلا جانا چاہتا ہے تو بخوشی چلا جائے۔ یہ کہنا کہ غیر مسلم، اسلام کے دروازے میں داخل تو اپنی مرضی سے ہو سکتا ہے لیکن اس سے باہر اپنی مرضی سے نہیں نکل سکتا، اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ اس کا بنیادی اصول، حق و صداقت کے رد و قبول کے معاملہ میں انسان کو کامل آزادی عطا کرنا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ کیا قرآن کی رُو سے جنگ کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ لوگوں سے بہ جبر اسلام منوایا جائے، یا اس لئے کہ ایسا انتظام کیا جائے کہ مذہب کے معاملہ میں کوئی کسی پر کسی قسم کا جبر نہ کر سکے، اور جو نہ مذہب جس کا جی چاہے، اختیار کرے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اور اس کی تشریح جلد اول ص ۲۰۰ زیر آیت (۲) میں بھی کی جا چکی ہے۔ پھر سمجھ لیجئے کہ قرآن کو ایم کی رُو سے ایمان کے معنی ہیں کسی صداقت کو دل و دماغ کے پورے اطمینان اور رضامندی سے صحیح تسلیم کرنا۔ قرآن، اس ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا جس میں کسی قسم کی زبردستی کا ذرا سا بھی شائبہ ہو۔ زبردستی تو ایک طرف، اگر کسی کی عقل و فکر کو معطل یا مغلوب کر کے، اس سے اسلام کا اقرار لے لیا جائے تو دین خداوندی اسے بھی ایمان تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ مومن انہیں کہا جاتا ہے کہ اِذَا دُكِرُوا بِالْآيَاتِ رَبَّهُمْ لَمْ يُخَيَّرُوا عَلَيْهِمْ اَوْ عَمِيَّا (۲۵) اور تو اور جب ان کے سامنے خدا کی آیات پیش کی جائیں تو وہ ان کے سامنے بھی اندھے بہرے بن کر نہیں جھکتے۔ اس سے آپ اندازہ فرما لیجئے کہ قرآن کسی کو اس کی مرضی کے خلاف، زبردستی، اسلام کے دائرے کے اندر باندھ کر رکھنے کی اجازت دے سکتا ہے؟ وہ تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ”مرتد کی سزا قتل“ دین خداوندی کی اصل و اساس کے خلاف ہے۔ مذہب کی کامل آزادی منشور خداوندی کا اولین اعلامیہ ہے۔

ان تشریحات کے بعد، ان آیات کا صحیح مفہوم سمجھ لینا آسان ہو گا جن کے سلسلہ میں ان وضاحتوں کو ضروری سمجھا گیا تھا۔ یعنی آیات (۱۴۳-۱۴۰) جو پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ لیکن جنگ کے سلسلہ میں ایک پابندی کا ذکر اگلی

آیت میں آتا ہے۔ فرمایا۔

الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَتُ قِصَاصٌ۔ فَمَنْ اعْتَدَىٰ
عَلَيْكُمْ فَاَعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ
وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ۔ (۲/۱۹۴)

۲
۱۹۴

یہ پہلے (اسی باب کے شروع میں) بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے سال میں چار مہینے ایسے رکھے گئے ہیں جن میں جنگ ممنوع قرار پاتی ہے۔ انہیں حرمت کے مہینے کہا گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جنگ دو فریقوں کے درمیان ہوتی ہے اس لئے اس قسم کی شرائط یا پابندیاں یک طرفہ نہیں ہو سکتیں۔ یہ فریقین میں معاہدہ کی رو سے ملے پاتی ہیں۔ اور اس وقت تک قائم رہ سکتی ہیں جب تک فریقین ان پر کاربند رہیں۔ اگر ایک فریق ان کی خلاف ورزی کرے تو فریقِ ثانی ان سے خود بخود آزاد ہو جاتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ۔۔

حرمت کے مہینے

حرمت کے مہینوں کی پابندی تو ادلے بدلے کے طریق پر ہی ممکن ہے۔ اگر فریقِ ثانی اس کا احترام نہ کرے اور زیادتی پر اتر آئے تو تم بھی اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرو جیسا وہ تمہارے ساتھ کرتا ہے۔ (یعنی اس کا مقابلہ کرو اور حرمت کے خیال سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہو) مختصراً یہ کہ ان تمام امور میں تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس حقیقت کو یاد رکھو کہ قانونِ خداوندی کی تائید و نصرت انہی کے ساتھ ہوتی ہے جو ان حدود کی نگہداشت کرتے ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم بین الاقوامی معاہدات کی پابندی کی کس قدر تاکید کرتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس قسم کے احکام نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہوں۔

اس کے بعد آگے بڑھیے۔ جنگ کی صورت میں، غیر متوقع اخراجات کی ضرورت پڑ جاتی ہے جنہیں بہر حال اس

امت (قوم) ہی کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں فرمایا۔

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔ (۲/۱۹۵)

۲
۱۹۵

نظامِ خداوندی کے استحکام کی خاطر اپنی فاضلہ دولت کو بند کر کے نہ رکھو۔ کھلا رکھو۔ ایسا نہ کرو گے تو تمہاری پور کاکی پوری قوم تباہ ہو جائے گی اور جب قوم تباہ ہو جائے تو تمہارا مال و دولت کہاں باقی رہے گا؟ اصل یہ ہے کہ

جنگ میں معاشرہ کی اقتصادیات کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس توازن کو قائم رکھنا از بس ضروری ہے۔ واضح ہے کہ یہ حکم اُس زمانے سے متعلق معلوم ہوتا ہے جب ہنوز قرآن کا معاشی نظام اپنی آخری شکل میں قائم نہیں ہوا تھا۔ اس کی تکمیل کے بعد، فاصلہ دولت، انفرادی طور پر، کسی کے پاس نہیں رہی تھی۔ وہ مملکت کی تحویل میں آگئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ عام حالات میں جس قدر کوئی فرد اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات کے لئے اپنے پاس رکھے، جنگ کی حالت (EMERGENCY) میں اس میں بھی کچھ کم کرنا پڑے۔ زیرِ نظر اس قسم کے احکام ایسی صورتوں سے متعلق بھی ہو سکتے ہیں۔

(۱۰)

جج کے احکامات کے ضمن میں دو گروہوں کا ذکر ہمارے سامنے آیا تھا۔ ایک وہ جن کے پیشِ نظر صرف اس دنیا کے مفاد ہوتے ہیں اور دوسرا وہ جو دنیا اور آخرت دونوں کے مفادات اپنے سامنے رکھتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو خدا کے ساتھ جان و مال کی فروخت کا معاملہ کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں قتال سے متعلق آیات کی وضاحت ضروری سمجھی گئی۔ اس طرح جب نظامِ خداوندی کا ایک خاکہ سامنے آگیا تو فرمایا کہ :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ - إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ (۲۰۸) (۲۸)

اے جماعتِ مومنین! تم اس نظامِ خداوندی میں، جو امن و سلامتی کا ضامن ہے، اجتماعی طور پر، پورے کے پورے، داخل ہو جاؤ اور چند قدم چل کر رک نہ جاؤ۔ اسے تکمیل تک پہنچاؤ۔ نیز اس میں کسی قسم کی پیوند سازی نہ کرو اور اپنے پست جذبات کے پیچھے نہ لگ جاؤ۔ یہ روش شرفِ انسانیت کی کھلی ہوئی حریف ہے۔

اس آیت میں سِلْم اور کافۃ کے الفاظ غور طلب ہیں۔ سِلْم تو اسلام ہی ہے لیکن چونکہ یہ لفظ ہمارے سامنے پہلی دفعہ آیا ہے اس لئے اس کی اور اس کے ساتھ کافۃ کی وضاحت ضروری ہے۔

کافۃ، جس کا مادہ (ک-ف-ت) ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں۔ (۱) کسی معاملہ کی آخری حد تک پہنچ جانا۔ تھوڑا سا چل کر رک نہ جانا۔ اسے تکمیل تک پہنچانا اور (۲) تمام کا تمام۔ جمیع۔ اجتماع۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ :-

(۱) اسلام ایک کلی نظام کا نام ہے جو پوری کی پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔ گزشتہ صفحات میں صبیغۃ اللہ کی بحث میں واضح کیا جا چکا ہے [دیکھتے دوسرا باب۔ آیت (۲۸۱)] کہ انسان کو پوری کی پوری سیرت یا شخصیت کا اس

رنگ میں رنگے جانا ضروری ہے۔ ایمان کی بنیاد، انسان کے نفسیاتی تغیر پر ہے، اور نفسیاتی تغیر کے معنی یہ ہیں کہ فرد میں قلبِ ماہیت ہو جائے۔ وہ خَلْقًا اٰخَرَ (ایک نئی مخلوق) بن جائے (۲/۳)۔ وہ غالب کے کلی تغیر الفاظ میں آدمی سے انسان بن جائے۔ یہ تبدیلی جزئی نہیں ہوتی، کلی ہوتی ہے۔ وہ سیرت اور کردار کے اعتبار سے ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ کیرکٹر جزئیات میں نہیں دیکھا جاتا، بہرہیت مجموعی (MAN AS A WHOLE) میں نمودار ہوتا ہے۔ اسی کو کافۃ کہا جائے گا۔

کافۃ کے معنی یہ بھی ہیں کہ اسلام، انفرادی مذہب نہیں، اجتماعی دین، یعنی نظامِ زندگی ہے۔ اس کی وضاحت جلد دوم، صفحہ ۲۱۱-۱۱۰ زیر آیت (۲/۱۲۸) کی جا چکی ہے۔ اس نظام کی رُو سے امتِ مسلمہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ اور کافۃ کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس نظام کے حصے بخرے نہیں کئے جاسکتے۔ اسے قبول اور اختیار کیا جائے گا تو بالکل اور رد کیا جائے گا تو بالکل۔ پیوند سازی سے اسلام باقی ہی نہیں رہتا۔ اسلام میں جب پیوند سازی شروع ہوتی تو رفتہ رفتہ اس کی حالت یہ ہو گئی کہ اصلی (ORIGINAL) اسلام کا اس میں کوئی ٹکڑا تک نہ رہا۔ سارا اسلام انہی پیوندوں کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ اس لئے اگر اب اس (موجودہ) اسلام کو حقیقی اسلام میں تبدیل کرنا ہوگا، تو اس پیوندوں پر مشتمل گدڑی کو یکسر اتار پھینکنا ہوگا۔ قرآن کریم نے اسی لئے ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت کو لازمی بشرط قرار دیا ہے (۲/۲۵) اس میں شبہ نہیں کہ یہ تبدیلی ہوگی تدریجاً۔ لیکن ہوگی بالکل۔ اس سلسلہ میں جلد دوم، زیر آیت (۲/۵۷) صفحہ ۳۶۰ ملاحظہ فرمائیے۔

اور اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ انسان اپنے جذبات کو حدودِ اللہ کے ساحلوں کے اندر محصور رکھے۔ ان سے اقدارِ خداوندی کے تابع کام لے۔ اس سے وہ تغیر پیدا ہوگا جو اس میں قلبِ ماہیت پیدا کر دے گا۔

قَانَ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَ تَكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ
حَكِيْمٌ (۲/۲۰۹)

ان واضح دلائل آجانے کے بعد اگر تمہارے پاؤں میں لغزش آگئی، تو تم بھی تباہیوں کے جہنم میں جا کر و گے۔ یاد رکھو!

ہمارا قانون مکافات بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ اس کی گرفت بڑی شدید ہے۔ وہ کسی کی رعایت نہیں کرتا۔

اس آیت میں دو ایک نکات بڑے اہم ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ خدا کے ہاں قوت اور حکمت، دونوں کا امتزاج ہے۔

دوہ عزیز کے ساتھ حکیم بھی ہے۔ جب قوت اور حکمت دونوں یکجا ہوں تو اسے قانون سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قوت کے ساتھ اگر حکمت (REASON) نہ ہو، تو وہ دھاندلی بن

حکمت اور قوت

جاتی ہے۔ اور اگر حکمت کے ساتھ قوت نہ ہو تو وہ وعظ یا فلسفہ بن کر رہ جاتی ہے۔

راتے بے قوت ہمہ مکر و فسوں قوت بے رستے جہل است و جنوں

(اقبالؒ پس چہ باید کرد)

دوسرے یہ کہ اگر ایک قوم ایک دفعہ صحیح نظام کی پابند ہو جاتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے بعد وہ جو جی میں آئے کرتی رہے، اس نظام کے خوشگوار نتائج سے وہ متمتع ہوتی چلی جائے گی۔ بالکل نہیں۔ اسے نظام کے استحکام کے لئے مسلسل جدوجہد جاری رکھنی ہوگی۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَ
لَا تَحْزَنُوا وَابْشُرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ - نَحْنُ أَوْلِيَائُكُمْ فِي الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهَى أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ
نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ - (۲۴۳-۲۴۴)

جو لوگ اس حقیقت کا انکار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دیتے والا اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں پیدا کرتی۔ تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے (خدا کی کائناتی قوتیں ان کا ساتھ دیتی ہیں اور ان کے لئے باعث تقویت بنتی ہیں)۔ (۲۴۳)۔ اور اس طرح ان سے کہتی ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو نہ ہی افسردہ خاطر ہو تمہارے لئے اس جنتی معاشرہ کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے (۱۲۵-۱۲۴ : ۱۲۳-۱۲۲ : ۱۲۱-۱۲۰ : ۱۱۹-۱۱۸ : ۱۱۷-۱۱۶ : ۱۱۵-۱۱۴ : ۱۱۳-۱۱۲ : ۱۱۱-۱۱۰ : ۱۰۹-۱۰۸ : ۱۰۷-۱۰۶ : ۱۰۵-۱۰۴ : ۱۰۳-۱۰۲ : ۱۰۱-۱۰۰ : ۹۹-۹۸ : ۹۷-۹۶ : ۹۵-۹۴ : ۹۳-۹۲ : ۹۱-۹۰ : ۸۹-۸۸ : ۸۷-۸۶ : ۸۵-۸۴ : ۸۳-۸۲ : ۸۱-۸۰ : ۷۹-۷۸ : ۷۷-۷۶ : ۷۵-۷۴ : ۷۳-۷۲ : ۷۱-۷۰ : ۶۹-۶۸ : ۶۷-۶۶ : ۶۵-۶۴ : ۶۳-۶۲ : ۶۱-۶۰ : ۵۹-۵۸ : ۵۷-۵۶ : ۵۵-۵۴ : ۵۳-۵۲ : ۵۱-۵۰ : ۴۹-۴۸ : ۴۷-۴۶ : ۴۵-۴۴ : ۴۳-۴۲ : ۴۱-۴۰ : ۳۹-۳۸ : ۳۷-۳۶ : ۳۵-۳۴ : ۳۳-۳۲ : ۳۱-۳۰ : ۲۹-۲۸ : ۲۷-۲۶ : ۲۵-۲۴ : ۲۳-۲۲ : ۲۱-۲۰ : ۱۹-۱۸ : ۱۷-۱۶ : ۱۵-۱۴ : ۱۳-۱۲ : ۱۱-۱۰ : ۹-۸ : ۷-۶ : ۵-۴ : ۳-۲ : ۱-۰)۔

ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے۔ (اس لئے تمہیں یہ جنتی زندگی، اس دنیا میں بھی نصیب ہوگی اور آخرت کی زندگی میں بھی)۔ اس جنتی زندگی میں وہ سب کچھ ہوگا جسے تمہارا جی چاہے گا۔ اور وہ سب کچھ ملے گا جسے تم طلب کرو گے۔ جو چاہو گے، ہوگا۔ جو مانگو گے، ملے گا۔ یہ ہوگا نتیجہ تمہارے یقین، محکم اور عمل بہیم کا)۔

اور یہ سب کچھ ایسی عزت و توقیر کے ساتھ ملے گا جیسے میزبان اپنے مہمان کی تواضع کرتا ہے۔ اس میں خدا کی طرف سے، زندگی کے خطرات سے حفاظت کا سامان بھی ہوگا اور سامان نشوونما بھی۔

اس میں "قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ" کے ساتھ "استقامت" شرط رکھی گئی ہے۔ استقامت اس جدوجہد کے تسلسل (CONTINUITY) کا نام ہے جہاں اس تسلسل میں انقطاع آیا، اس نظام کا نقشہ بگڑ گیا اور وہ قوم اس کے انسانیت ساز ثمرات سے

محروم ہو گئی۔ اُکْلَهَا دَاثِمًا وَظَلَّهَا۔ (۳۵)۔ اس (جنتی معاشرہ) کے ثمرات اور سائے دائم رہیں گے۔“ کے یہ معنی نہیں کہ قوم جو جی میں آتے کرتی رہے، وہ باغات انہیں بدستور پھل دیتے چلے جائیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک وہ قوم اپنی جدوجہد جاری رکھے گی، ان ثمرات سے متمتع ہوتی رہے گی۔ جب اس کے پاؤں میں لغزش آجائے گی، وہ سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ سورۃ ابراہیم میں اسی حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ۔ تُؤْتِي أُكْلَهَا كُلَّ حِينٍ يُبَادِنُ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ۔ (۲۵-۲۴)

غور کر دو کہ خدا کس طرح ایک مثال کے ذریعے بات واضح کرتا ہے۔ خوشگوار نظریہ حیات کی مثال ایسے عمدہ پھل دار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں محکم اور استوار ہوں اور اس کی شاخیں فضائے سادہ میں جھولے جھول رہی ہوں۔ وہ درخت قانونِ خداوندی کے مطابق ہر موسم میں مسلسل و متواتر پھل دیتے جاتا ہے۔ اللہ بے پیکار حق تعالیٰ کو محسوس مثالوں کے ذریعے واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ انہیں سمجھ سکیں۔

یعنی وہ درخت تو ایسا ہے جس میں ہر زمانے میں بار آور کی صلاحیت ہے لیکن لوگوں کو اس کا پھل قانونِ خداوندی کے مطابق ملتا ہے۔ اور قانونِ خداوندی ہے: ”قَالُوا رَبَّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا“ اس نظریہ زندگی کی صداقت پر یقین محکم اور اس کے مطابق جدوجہد میں استقامت۔ آیت (۲۵) ”زَلَلْتُمْ“ استقامت کی ضد ہے۔ جب کوئی قوم اس جدوجہد کو ترک کر دیتی ہے، تو وہ اس شجر طیب کے خوشگوار پھلوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس درخت میں پھل لانے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ جب کوئی دوسری قوم اس مسلک کو اختیار کر لیتی ہے، تو وہ اس کے ثمرات سے متمتع ہو جاتی ہے۔ اسے قانونِ استبدال و استخلافِ قومی سے تعبیر کیا جاتا ہے جسے جلد اول ص ۱۹ زیر آیت (۲۷) بیان کیا جا چکا ہے۔ وہاں جو آیات درج کی گئی ہیں۔ (یعنی ۹ ذ ۳۴) ان میں استبدالِ قوی کے الفاظ آتے ہیں۔ سورۃ مادہ میں اسے ”ارتدادِ قومی“ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ

استبدال و استخلافِ قومی

لَوْ مَآءَ لَآئِمٌ ذَٰلِكَ فَضَّلُ اللّٰهُ يُوْتِيْهِ مَن يَّشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ - (۲۰۹)

اے ایمان والو! جو تم میں سے، نظامِ خداوندی سے پھر جائے (تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اللہ کچھ نہیں بگاڑے گا) اللہ ان کی جگہ ایسی قوم لے آئے گا جس کے افراد دنیا کی ہر شے کے مقابلہ میں، نظامِ خداوندی کو زیادہ عزیز رکھیں گے، اور ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہو گا کہ خدا بھی انہیں عزیز رکھے گا۔ ان کی خصوصیات یہ ہوں گی کہ وہ اس نظام کے ماننے والوں کے سامنے ریشم کی طرح نرم، اور شلخِ مژدہ کی طرح خمیدہ ہوں گے، لیکن اس نظام کے مخالفین کے مقابلہ میں فولاد کی طرح سخت (۲۱۰)۔ وہ اس کے نظام کے قیام اور استحکام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں گے اور کسی کی طعن و تشنیع سے نہیں ڈریں گے۔ یہ نوازشاتِ خداوندی کسی خاص گروہ کیساتھ مخصوص نہیں۔ جو قوم بھی انہیں قانونِ خداوندی کے مطابق حاصل کرنا چاہے اسے حاصل ہو سکتی ہیں، خدا کے ہاں نہ تو گروہ بندی نہ تنگ نظری ہے اور نہ ہی انعامات کی اندھا دھند تقسیم۔

واضح رہے کہ اس استبدال و استخلاف سے مراد یہ نہیں کہ جو نہی کوئی قومِ نظامِ خداوندی سے منہ موڑے گی، وہ صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی اور اس کی جگہ دوسری قوم آن کھڑی ہوگی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ”منہ موڑنے والی“ قوم زندگی کی ان خوشگوار یوں سے محروم ہو جائے گی۔ اس کے بعد جب اور جہاں بھی کوئی دوسری قوم اس نظام کے استوار کرنے کے لئے کھڑی ہو جائے گی۔ وہ ان نعمات سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سابقہ (زوالِ آشتا لیکن ہنوز زندہ) قوم اپنی غلطیوں کا احساس کر کے صحیح راستے پر واپس آجائے اور اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پالے۔ سورۃ آل عمران میں اس حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا: كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوا۟ۤ اٰيْمًا نِّهْمًا - ذرا سوچو کہ جو بد نصیب قوم صحیح راستہ اختیار کر لینے کے بعد اسے چھوڑ دے۔ وَشَهِدُوۡا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ - درآنحالیکہ اس نظام کے درخشنده نتائج نے یہ حقیقت مشہور کر دی تھی کہ جو کچھ ان کے رسول نے کہا تھا وہ مبینی بر حقیقت تھا۔ اس قوم پر زندگی کی کائناتوں کی راہ کس طرح کشادہ ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ - ایسے ظالمین پر سعادت و کامرانی کی راہیں کبھی و انہیں ہو سکتیں: اُولَٰئِكَ جَزَاؤُۡهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ - (۲۱۱)۔ اس قسم کی قوم کا حشر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ نظامِ خداوندی کے خوشگوار ثمرات سے بھی محروم رہے۔ کائناتی قوتوں کی برکات بھی اس کے حصے میں نہ آئیں اور اقوامِ عالم بھی اسے ذلیل و خوار سمجھ کر دھتکار دیں۔ یوں ان پر ہر طرف سے محرومی اور نامرادی کی پھٹکار

پڑے۔

قبل اس کے کہ ہم اگلی آیات کی طرف بڑھیں، ذرا رک کر دیکھ تولیں کہ یہ کونسی بدنصیب، سوختہ بخت قوم کا ذکر ہو رہا ہے؟ کیا یہ ہمارا ہی ذکر تو نہیں؟

آئینہ دیکھ اپنا سامنہ لے کے رہ گئے!

اس کے بعد آگے بڑھیے: خَلِيدَيْنَ فِيهَا لَا يُغْنَعُ عَنْهُمَا الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ (۲۷)۔ ذلت و خواری کا یہ عذاب ان پر مسلط رہیگا اور (خدا و رسول کا زبانی اقرار) ان کی منرا میں ذرا سی تخفیف بھی نہیں کر سکے گا۔ اور نہ ہی ان کے اعمال کے نتائج کے ظہور میں تھوڑی سی بھی تاخیر کی جائے گی۔ وہ اسی دنیا میں ان کے سامنے آجائیں گے (اور وہ قوم اپنی لاش اپنے کندھوں پر اٹھائے اٹھائے بھر گئی)۔

اب سوال یہ ہے کہ ان کے لئے اس ذلت و خواری کے عذاب سے بچنے کی کوئی صورت بھی ہوگی یا وہ ابدی

طور پر محروم و مردود ہو جائے گی! کہا کہ ان کے بچ بچنے کا امکان ہوگا؟ فرمایا:۔

باز آفرینی کا امکان

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۲۸)۔ اور اس کی شکل یہ ہے کہ جس دور ہے پر ان کے قدم غلط راستے کی طرف اٹھ گئے تھے، یہ پلٹ کر وہیں جائیں۔ وہاں سے سیدھا راستہ اختیار کریں اور خدا کے عطا کردہ صلاحیت بخش پردہ گرام پر پھر سے عمل پیرا ہو جائیں۔ اس طرح یہ ابدی ہلاکت سے محفوظ بھی ہو جائیں گے اور انہیں سامان نشوونما بھی میسر آجائے گا۔ یعنی انہوں نے دین خدا وندی (قرآنی تعلیم) میں جو آمیزشیں کر رکھی تھیں انہیں یکسر علیحدہ کر کے، پھر سے خالص قرآنی نظام زندگی اختیار کر لیں تو ان کے سچاؤ کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

اگر یک قطرہ خوں داری، اگر مشت پرے داری

بیا، من با تو آموزم طریق شاہ بازی را

لیکن۔ اور یہ لیکن بڑا کپکپا دینے والا ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَبَعَدَ إِيْمَانِهِمْ ثَمَّ آذًا دُونَ كُفْرٍ إِنَّ تَقَبَّلَ تَوْبَتَهُمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الصَّالُّونَ (۲۹)۔ لیکن یہ اگر ایسا نہ کریں اور زبان سے "یا اللہ میری توبہ، یا اللہ میری توبہ" کہتے اور عملاً اُسی غلط راستے پر چلتے رہیں اور اس میں آگے ہی آگے بڑھتے جائیں، تو پھر یہ کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ تَمَّ آثَرُ دَاوُدَ الْكُفْرًا۔ تو مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے۔ مذہب میں ہر عقیدے اور مسلک کی سند یہ ہوتی ہے کہ یہ اسلاف سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ اب

ظاہر ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا، اسلاف کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا اور اسی نسبت سے اس "قواتر" کی سند مزید مستحکم ہوتی جائے گی۔ اُسی روش پر چلتے رہنے سے باز آفرینی کی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ ایسی قوم کا انجام ابدی ہلاکت ہوتا ہے: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلَّةُ الْإِيمَانِ ذَهَبًا وَلَوْ فَتَدَى بِهِ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ۔ (۲/۲۰۹)۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس باز آفرینی کا امکان اسی دنیا کی زندگی تک ہے۔ اس کے بعد اگر یہ چاہیں کہ (حیاتِ آخری میں) زندگی کی سرفرازیاں نصیب ہو جائیں تو ایسا ہونا ناممکن ہوگا خواہ یہ اس کے بدلے میں دنیا بھر کی دولت بھی کیوں نہ دینا چاہیں۔ ان کے لئے ائمہ انگیز عذاب کی زندگی ہوگی اور کوئی ایسا نہیں ہوگا جو اس حالت میں ان کی مدد کر سکے۔

ان تصریحات کی روشنی میں، آیت (۲/۲۰۹) کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔ یعنی اگر واضح دلائل سامنے آجائے اور صحیح راستہ اختیار کر لینے کے بعد تمہارے پاؤں میں لغزش آگئی تو خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے تم بچ نہیں سکو گے۔ (قوموں کے عروج و زوال کے متعلق۔ جلد دوم ۱۵۵۔ زیر آیت (۲/۲۰۹) میں بھی بحث ہو چکی ہے)۔

یہ تنبیہ تو ان لوگوں کو کی گئی جو اسلام کی دعوت قبول کر چکے تھے۔ باقی رہے وہ جو اس دعوت کی مسلسل مخالفت کئے جا رہے تھے تو ان کے متعلق کہا کہ :-

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ۔ (۲/۲۱۰)

یہ لوگ ابھی تک انہی خیالات میں لگن ہیں جو ان کی توہم پرستیوں نے پیدا کر دیئے ہیں (مثلاً یہ کہ) قوموں کی تباہی کے لئے خدا خود بادلوں کے رتھ میں بیٹھ کر فرشتوں کے جلو میں آیا کرتا ہے اور یوں آخری فیصلہ ہوا کرتا ہے۔

اے رسول! ان سے کہو کہ قوموں کی تباہی اس طرح نہیں ہوا کرتی۔ وہ خدا کے مقرر کردہ قانونِ مکافات کی نڈ سے

ہوتی ہے۔ اس کے لئے خدا ہتھاری طرف نہیں آیا کرتا بلکہ ہتھارا ہر عمل تمہیں اس کی عدالت کی طرف کشاں کشاں لے جاتا ہے۔ تم اس کے اس قانون کے احاطہ سے باہر نہیں جا سکتے۔ تباہی اور بربادی اس طرح آیا کرتی ہے۔

ان سے کہو کہ اس کی شہادت چاہتے ہو تو :-

سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمَا آتَيْنَاهُمْ مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ وَمَنْ يُبَدِّلْ

نِعْمَةً اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ - (۲۱۱)

ان یہودیوں (بنی اسرائیل) سے پوچھو جو تمہارے گرد و پیش بھی رہے ہیں۔ انہیں قوموں کی موت اور حیات سے متعلق واضح قوانین دیئے گئے تھے۔ انہوں نے ان قوانین کا اتباع کیا تو ان پر خدا کی نعمتوں کے دروازے کھل گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ان سے اعراض برتا تو وہ نعمتیں، دولتوں اور خوار یوں میں بدل گئیں۔ اور یہ سب کچھ خدا کے اس قانونِ مکافات کی رُو سے ہوا جس کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔

زندگی کی نعمتیں کیا ہوتی ہیں اور وہ چھنتی کس طرح سے ہیں، ان کے متعلق جلد اول ص ۳۷۰ زیر آیت (۱۶) گفتگو ہو چکی ہے۔ ان نعمتوں کے چھن جانے میں قوم کے لیڈر کیا کرتے ہیں اس کی بابت (۱۶۸) دیکھیے۔

اس مقام پر فطری طور پر یہ سوال دل میں ابھرتا ہے کہ جب کوئی قوم، زندگی کی اس قدر سرفرازیوں اور خوشگوار یوں سے بہرہ یاب ہو، تو پھر وہ کیا کرتی ہے جس سے یہ تمام نعمتیں اُس سے چھین جاتی ہیں، فرمایا:-

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوْا
وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ

۲
۲۱۲

بَغْيَرِ حِسَابِ - (۲۱۲)

یہ اس طرح ہوتا ہے کہ لوگ زندگی کی بلند انسانی سطح سے انکار کر کے، حیوانی زندگی کو اصل حیات سمجھ لیتے ہیں اور اسی زندگی کی عیش سامانیاں ان کا مقصد حیات بن جاتی ہیں۔ اور یہ چیزیں انہیں بڑی جاذب، پرکشش اور حسین بن کر دکھائی دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ حیوانی سطح زندگی پر اقدار کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اقتدار تو انسانی سطح زندگی پر سامنے آتی ہیں۔ یہ لوگ بلند اقدار حیات فراموش کر دیتے ہیں اور جو لوگ ان اقدار پر ایمان رکھتے ہیں ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ ان کی مت ماری گئی ہے جو زندگی کے سہل الحصول عیش و طرب کے مقابلہ میں محض نظری اقدار کو ترجیح دیتے ہیں (یہ لوگ ان اقدار پرست مومنین کی ہنسی اس لئے بھی اڑاتے ہیں کہ اس پروگرام کے ابتدائی دور میں یہ اُن کے مقابلہ میں کمزور و ناتواں سے دکھائی دیتے ہیں، کیونکہ یہ حصولِ قوت و جاہ کے لئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال نہیں کرتے۔ لیکن جب آخر الامر معاشرہ میں آسمانی انقلاب نمودار ہو جاتا ہے تو ماری دنیا دیکھ لیتی ہے کہ جو لوگ مستقل اقدار کی نگہداشت کرتے تھے وہ ان لوگوں پر فوقیت رکھتے ہیں جو محض دنیاوی مفاد کو مقصد حیات سمجھتے تھے اور اس کے حصول میں کسی اصول و اقدار کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اس وقت یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جو قوم قانونِ خداوندی

کے مطابق سامانِ زیست حاصل کرنا چاہتی ہے اُسے کس طرح خود اس کے اپنے اندازوں سے بھی زیادہ، بلاحد و حساب رزق کی فراخیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔

یہ حقائق قوم بنی اسرائیل ہی سے مخصوص نہیں۔ نوعِ انسان کی ساری تاریخ اس کی آئینہ دار ہے۔ انسانی زندگی کا پہلا دور وہ تھا جب وہ 'بعد میں پیدا ہونے والی تمدنی زندگی سے نا آشنا تھا۔ قدرتی پیداوار پر اس کا گزارہ تھا اور وہ ہر ایک کو بافرط مل جاتی تھی کیونکہ ہنوز "میری اور تیری" کا تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔ سب ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔

وحدتِ انسانیت

یہ تھی "آدم" کی وہ جنتی زندگی جس کی تفصیل جلد دوم کے دوسرے باب پر عنوان سرگزشتِ آدم (میں گزر چکی ہے۔ اس کے بعد "میری اور تیری" کا سوال پیدا ہو گیا تو ان کے باہمی مفاد میں ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ اس طرح ان میں اختلافات پیدا ہو گئے (۱/۱۱)۔ ان اختلافات کا مٹانا تنہا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ ہر فرد، ہر گروہ، ہر قوم کی عقل اس کے اپنے مفاد کا تحفظ چاہتی ہے۔ دوسروں کا مفاد اس کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے سلسلہ وحی شروع کیا۔ اس نے حضراتِ انبیاء کرامؑ کو بھیجا کہ وہ انسانوں کو ان کی اختلافی زندگی کے تباہ کن نتائج و عواقب سے متنبہ کریں اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی نوید جانفراسنائیں۔ ہر نبی اپنے ساتھ قوانینِ خداوندی کا مبنی حقیقت ضابطہ (الکتاب) لاتا تاکہ وہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کر کے، انہیں پھر سے عالمگیر برادری بنا دے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ
وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا

فِيهِ - (۲/۱۳)

تمام انسان ایک امتِ واحدہ کی طرح رہتے تھے۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے (۱/۱۱) تو خدا نے انبیاء کرامؑ کو بھیجا شروع کیا جو انہیں اختلافات کی ہلاکت آفرینیوں اور وحدتِ امت کی نشاط انگیزیوں سے مطلع کرتے۔ ان انبیاء کے ساتھ ضابطہ حیات بھی نازل ہوتا جس کے مطابق وہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کر کے، ان میں وحدت پیدا کرتے۔

اس آیتِ جلید میں بتایا گیا ہے کہ

(۱) نوعِ انسان، شروع میں امتِ واحدہ تھی۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ ان اختلافات کو مٹانے کے لئے حضراتِ انبیاء کرامؑ آئے۔ وہ ان کے اختلافات کو ال کتاب کے ذریعے مٹاتے تھے جو انہیں خدا کی طرف سے ملتی

کھتی۔ اس سلسلہ رشد و ہدایتِ خداوندی کا منہتی یہ ہے کہ نوعِ انسانی کے اختلافات کو مٹا کر انہیں پھر سے عالمگیر برادری بنا دیا جائے۔ یہ شکلِ قرآنِ کریم کے اتباع سے پیدا ہو سکے گی۔

(۲) ہرنی اور ہر رسول کو خدا کی طرف سے کتاب ملی کھتی۔ تفصیل اس کی جلد دوم ص ۲۶۵۔ زیر آیت (۲/۵۵) گزر چکی ہے۔ اس لئے نبی یا رسول بلا کتاب کا عقیدہ قرآنِ کریم کے خلاف ہے۔

(۳) اختلافات اور تفرقہ کفر اور شرک ہے۔ قرآنِ کریم کے اس بنیادی نکتہ کے متعلق پہلی اور دوسری جلد دونوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ (مثلاً جلد اول ص ۱۷۱ آیت (۲/۱۹۳) ص ۲۱۵ آیت (۲/۲۰۶) جلد دوم ص ۲۵۹ آیت (۲/۲۰۶)۔) و دیگر مقامات جنہیں ان جلدوں کی فہرست میں دیکھ لینا چاہیے۔

(۴) جس قوم میں اختلافات اور فرقے ہوں، وہ وحیِ خداوندی کی متبع نہیں ہو سکتی۔ وحیِ خداوندی کی پیروی تو م کی پہلی اور بنیادی نشانی، اس میں وحدت ہے۔

(۵) مسلمانوں میں یہ وحدت پیدا ہو نہیں سکتی جب تک وہ ہر اختلافی معاملہ میں قرآن کو اپنا حکم تسلیم نہ کریں۔

(۲/۲۰۶ ز ۲/۲۰۷)۔

آیت (۲/۲۰۶) کا بقایا حصہ حسب ذیل ہے:-

وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ تَهُمُ الْبَيِّنَاتُ
بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ
الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۲/۲۰۶)

ہرنی اس کتاب کی رو سے جو اسے دی جاتی، وحدت پیدا کر کے چلا جاتا، لیکن اس کے بعد وہ لوگ جنہیں وہ کتاب دے جاتا کہ وہ اس کے مطابق عمل کریں، ایسی تعلیم کے باوجود باہمی ضد اور رقابت۔ یعنی ایک دوسرے سے لگے بڑھ جانے کے جذبہ سے۔ پھر اختلافات شروع کر دیتے (۲/۲۰۶ ز ۲/۲۰۷) لیکن ان میں سے جو لوگ اس ضابطہ کی صداقت پر یقین رکھتے، انہیں خدا اپنے قانون کے مطابق، اختلافات سے بچنے کی راہ دکھا دیتا۔ یہی وہ طریق ہے جس سے اللہ ہر اُس قوم کی، جو اختلافات سے بچنا چاہتی ہے، زندگی کی توازن بدوش راہ کی طرف راہ نمائی کر دیتا ہے۔

یہ طریق شروع سے چلا آ رہا ہے۔ نبی آتا۔ کتابِ خداوندی کا پیغام لوگوں تک پہنچاتا۔ جو لوگ اس پیغام کی صداقت پر ایمان لے آتے، ان کے سابقہ اختلافات مٹ جاتے۔ وہ امتِ واحدہ بن جاتی۔ وہ رسول چلا جاتا تو اس کے نام لیوا

اس کی کتاب میں تحریف کر کے امت میں تفرقہ پیدا کر دیتے۔ یہ تفرقہ، مذہبی پیشواؤں کی باہمی رقابت اور جمعہ ہازیوں کی بنا پر پیدا ہوتا۔ اس کے بعد پھر ایک اور رسول آجاتا۔ وہ خدا کی طرف سے غیر محرف ضابطہ ہدایت لے کر آتا اور اس کی رو سے پھر ایک امت واحدہ پیدا کر جاتا۔ یہ سلسلہ جاری رہتا تا آنکہ خدا نے اس سلسلہ کے آخر میں ایک ایسی کتاب نازل کر دی جس میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا۔ اس کتاب کی رو سے، خدا کے آخری نبیؐ نے ایک امت واحدہ متشکل فرمائی۔ وہ اس امت کو اس کتاب کا وارث بنا کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس کے بعد مذہبی پیشواؤں نے پھر سرا بھارا۔ وہ اس کتاب میں تو رد و بدل کر نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے ایک نیا عقیدہ وضع کر دیا کہ خدا کی وحی تمام تر اس کتاب (قرآن مجید) کے اندر نہیں۔ وحی کا بہت بڑا حصہ

ہمارے اختلافات

اس کے باہر بھی ہے۔ انہوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈالا اور اس خارج از کتاب حصہ کو وحی کا درجہ دے کر، امت میں فرقہ پیدا کر دیئے۔ ان فرقوں کو مٹانے کے لئے اب کوئی مامور من اللہ تو آئے گا نہیں کیونکہ مامورین من اللہ (انبیاء کرام) کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اور کسی مامور من اللہ کے آنے کی اب ضرورت بھی نہیں کہ مامور من اللہ خدا کی کتاب لے کر ہی آیا کرتے تھے۔ کتاب اللہ اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ جب بھی ہم نے اپنے اختلافی معاملات کے صحیح اور غلط ہونے کے لئے اس کتاب کو حکم مان لیا، ہمارے اختلافات مٹ جائیں گے۔ اور ہم پھر سے امت واحدہ بن جائیں گے۔ اور جب ہم خود امت واحدہ بن جائیں گے تو باقی دنیا کو امت واحدہ بنانے کا پروگرام مرتب کر کے اس مقصد کے حصول کے لئے مصروفِ ننگ و تاز ہو جائیں گے۔

ہم نے سابقہ صفحات میں اختلافات کا ذکر کیا ہے تو اس سے لمحہ اولین میں نگاہ، شیعہ سنی اور حنفی و مالکی (وغیرہ) کے اختلافات کی طرف اٹھتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ امت واحدہ میں اس قسم کے اختلافات بھی راہ نہیں پاسکتے لیکن قرآن کریم کے پیش نظر اختلافات کا دائرہ اس سے کہیں وسیع ہے۔ آپ ایک بار پھر آیت (۱۱۱) مع آیت (۱۱۲) پر نگاہ ڈالئے۔ ان میں کہا یہ گیا ہے کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاُخْتَلَفُوا۔ نوع انسان امت واحدہ تھی۔ اس کے بعد اس میں اختلافات پیدا ہو گئے جنہیں مٹانے کے لئے حضرات انبیاء کرامؑ کو بھیجا گیا۔ اس سے واضح ہے کہ یہ وہ اختلافات تھے (اور ہیں) جن سے نوع انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ اختلافات کیا تھے اور کس طرح رونما ہوئے تھے۔

علمائے علم الانسان والسنۃ کی تحقیق یہ ہے کہ انسانی آبادی کا اولین سرچشمہ حبیل کیسپین (CASPIAN SEA) کے اطراف و جوار کا علاقہ ہے۔ وہاں کی آبادی ایک نوع کی شکل میں تھی جس میں کسی قسم کی تفریق نہیں

تھی۔ اس کے بعد نظر آتا ہے کہ یہ نوع مختلف قبائل میں بٹ گئی۔ یہ تفریق کیسے اور کن تقاضوں کے ماتحت رونما ہوئی، کہا نہیں جاسکتا۔ ہم جلد دوم، سرگزشتِ آدم کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں کہ ابلیس نے آدم کے کان میں یہ سحر چھونکا تھا کہ تم حیاتِ جاوید اپنی اولاد کے ذریعے حاصل کر سکتے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اپنی اولاد کے ذریعے جداگانہ شخص نے آگے چل کر مختلف قبائل کی شکل اختیار کر لی۔ یہ وحدتِ انسانی میں پہلی تفریق تھی۔ اسی سے آگے چل کر نسلوں کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم عمل میں آگئی۔ اس معیار کی رو سے، نوعِ انسان کو تین شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) آریائی (ایرین)، مثلاً ہندی۔ ایرانی۔ فرنگستانی اقوام

(۲) تورانی (منگولین)، مثلاً ترکستانی۔ چینی اقوام

اور (۳) اسامی (سیمٹک)، مثلاً عرب۔ آرامی۔ عبرانی۔ سریانی۔ کلدانی وغیرہ اقوام۔

بعض علمائے انساب، نوعِ انسانی کی تقسیم اختلافِ رنگ کی بنا پر کرتے ہیں۔ مثلاً سفید نام۔ سیاہ نام یا کُش نام۔ اور زرد نام۔ ان کے برعکس، تورات کا بیان ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد جب انسانوں کی نئی زندگی شروع ہوئی تو نسلِ انسانی، حضرت نوح کے تین بیٹوں یافت۔ حام اور سام سے آگے چلی اور موجودہ اقوامِ عالم انہی کی یادگار ہیں۔ حقیقت کچھ بھی ہو، یہ واقعہ ہے کہ نوعِ انسانی کی پہلی تفریق، قبیلوں کی شکل میں رونما ہوئی جن کی بنیاد نسل پر تھی۔ لہذا، نسلی امتیاز وحدتِ انسانیت کے راستے میں پہلی روک ہے۔

جب آبادی برہمی تو مختلف قبیلوں نے نقل مکانی کر کے کسی دوسری سرزمین کو اپنا مستقر یا وطن قرار دے لیا۔ اس طرح جغرافیائی حدود یا وطنی امتیازات وحدتِ انسانی میں تفریق کا باعث قرار پائے۔ (اسی وطنی) تفریق سے زبانوں کا اختلاف بھی رونما ہوا۔

ایک قبیلہ (یا آگے بڑھ کر ایک قوم) میں تقسیم کار کے تقاضوں کی رو سے مختلف گروہوں نے مختلف کام اپنے ذمے لئے۔ اس سے پیشے و جہِ اختلاف بن گئے۔ یعنی جو تفریق معاشرہ میں تقسیمِ عمل کی ضرورت کے ماتحت وجود میں آئی تھی، اس نے آگے چل کر ذاتوں اور برادریوں کی شکل اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ ہندو دھرم نے انسانوں کو پیدائشی طور پر چار ورنوں (ذاتوں) میں تقسیم کر دیا، اور اس تفریق کو، برہما (خدا) کی متعین کردہ کہہ کر نامٹ قرار دے دیا۔

پیشوں کی تفریق، یا مختلف افراد میں کمانے کی صلاحیت کے اختلاف سے، کھائی میں فرق پیدا ہوا تو اس

سے معاشی اعتبار سے مختلف طبقات وجود میں آ گئے۔ اور جب زیادہ طاقتور یا دولت مند طبقہ نے ذرائع پیداوار کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے لیا تو اس طبقاتی تفریق کی گہریں اور بھی مضبوط ہو گئیں۔

یہ یقین وہ تفریقات جنہوں نے وحدتِ انسانیت کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ حضراتِ انبیاء کرامؑ اس تفریق و تقسیم کو مٹا کر پھر سے وحدتِ انسانیت کا پیغام لے کر آئے اور اپنے دائرہ کار کے اندر اس پر عمل کر کے بھی دکھاتے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا ہے۔ انبیاء کرامؑ کے اس مقصد کی وحدت کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا گیا ہے کہ یہ حضرات ایک ہی دین لے کر آئے تھے۔

...۔ اور اس دین کا منہجی و مقصود وحدتِ انسانیت تھا۔ لیکن فطرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہی دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا تو انہی انبیاءؑ کے نام لیوا یا ہمد گراہی تفریق اور عداوت پیدا کر لیتے تھے کہ وہ باقی تمام تفریقات سے زیادہ شدید اور محکم ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد، ایک ہی مذہب میں مختلف فرقے پیدا ہو جاتے تھے، اور ان کی بین الفرق جنگ و جدل مستقل عداوت پر منتج ہو جاتی تھی۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، حضراتِ انبیاء کرامؑ، انسانوں کے اس تفرقہ کو مٹا کر ان میں وحدت پیدا کرنے کے لئے آتے تھے۔ اور تاریخِ عالم اور قرآنِ کریم اس پر شاہد ہیں کہ ان کے اس انسانیت ساز مشن کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ یہ مخالفت کیوں ہوتی تھی؟ اس لئے کہ مفاد پرست اور استحصال پسند گروہوں کا مفاد اسی میں تھا کہ انسانوں میں یہ تفریق باقی رہے۔ یہ ہے دینِ خداوندی اور دنیاوی مفاد پرست گروہوں میں کشمکش کی اصل و بنیاد، جسے اقبالؒ نے ان دو جامع ابیات میں محصور کر دیا ہے۔ وہ دینِ خداوندی (یا وحی) کو عقلِ جہاں ہیں، اور گروہ بندیانہ مفاد پرستیوں کو عقلِ خود ہیں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔

عقلِ خود ہیں غافل از بہبودِ غیر سودِ خود بینند نہ ہمیند سودِ غیر

و حقیقت بینند سودِ ہم در نگاہش سود و بہبودِ ہم

قرآنِ کریم اس دینِ خداوندی (عقلِ جہاں ہیں) کو اپنی مکمل شکل میں آخری بار لے کر آیا اور حضور نبی اکرمؐ نے اس کی روشنی میں ایک ایسی امت کی تشکیل فرمادی جو نسل، رنگ، زبان، وطن، قومیت، مذہب کے تمام اختلافات و تفریقات کو مٹا کر وحدتِ انسانیت کا ماڈل بنی۔ اس طرح حضورؐ نے اقوامِ عالم کو سمجھا اور دکھا دیا کہ یہ ہے دنیا سے اس فساد کو مٹانے کا طریق جس نے

امتِ مسلمہ کی تشکیل

انسان کی اس جنتِ ارضی کو جہنم بنا رکھا ہے۔

حضورؐ نے اس دعوت کو پیش کیا، اور جیسا کہ ہوتا چلا آ رہا تھا، مفاد پرست گروہ ہجوم کر کے اس دعوت کی مخالفت

کے لئے اُمنڈ آئے۔ انہیں خطرہ تھا کہ اگر یہ نظام کسی ایک خطہٴ ارض میں بھی قائم ہو گیا

اس کی مخالفت | تو ان کے سلب و نہب کے دمدموں (TANKS) سے پسپا اور کچلی ہوئی انسانیت جوق در جوق اس کی طرف آ جائے گی اور انہیں دنیا میں کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔

اور یہ تھا وہ مقام جہاں اس امت سے — جو اس نظام کو عملاً متشکل کرنے کے لئے اٹھی تھی — کہا گیا کہ

تم سوچ لو کہ تمہاری منزل کس قدر کٹھن اور بکھارے راستے کس قدر دشوار گزار ہیں۔ ان راستوں کا منتہی تو بیشک

زندگی کی بہارِ آفریں جنت ہے، لیکن یہ جن صبر آزماتِ تراحمات اور بہمت شکن تصادمات سے پٹے پڑے ہیں انہیں

سامنے رکھ کر قدم اٹھانا چاہیے جب انصارِ مدنیہ کا ایک وفد حضورؐ کی خدمت میں یہ دعوت لے کر آیا کہ آپ مدینہ

تشریف لے چلیے اور وہاں سے اس دعوت کا عملی آغاز کیجیے، تو حضورؐ نے ان سے فرمایا تھا کہ تم اس کا عہد دو کہ تم

میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ وہ اس عہد کے لئے اپنے ہاتھ آگے بڑھا رہے تھے کہ ان کے سربراہ نے ان سے کہا کہ

تم نے سوچ سمجھ لیا ہے کہ اس عہد اور اس بیعت کا عملی مفہوم کیا ہے؟ سن رکھو کہ

یہ عرب و عجم کے خلاف اعلانِ جنگ کے مرادف ہے۔

اور عرب و عجم کے خلاف اسی اعلانِ جنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس اُمت سے کہا

تھا کہ

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا

مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمْ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ

الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ

قَرِيبٌ - (۲/۲۱۳)

تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تم اس نظام کو آسانی سے قائم کر لو گے اور مفت میں جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ ایسا نہیں ہوگا۔ تمہیں

بھی ان جان گداز مراحل سے گزرنا ہوگا جن سے وہ لوگ گزرے ہیں جنہوں نے

اس سے پہلے اس انقلابِ آفرینی کی کوشش کی صعوبات اور مشکلات کا

جنت ویسے ہی نہیں مل جاگی

ہجوم انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتا۔ ان کی شدت سے ان کے دل دہل جاتے یہاں تک کہ وہ اور ان کا قائد (رسول)

پکارا اٹھتے کہ بارالہا! ہماری کوششوں کے بار آور ہونے کا وقت کب آئے گا!
ایسے ایسے ہمت شکن اور روح فرسا مراحل کے بعد کہیں جا کر ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور نصرتِ خداوندی
ان کی سعی و عمل کو بار آور کرتی۔

تمہیں بھی انہی مراحل سے گزرنا ہوگا۔

حصولِ جنت کی راہ میں ان تصادمات کے متعلق جلد اول ص ۳۳۵-۳۳۶۔ زیر آیت (۲/۲۵) میں لکھا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں
سورہ آل عمران میں ہے :-

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَ
يَعْلَمَ الصَّابِرِينَ - (۳/۱۱۱)

کیا تم یہ خیال کتے بیٹھے ہو کہ جنت یونہی بیٹھے بٹھائے مل جاتے گی، اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو یہ تمہاری بہت بڑی بھول ہے۔
اس حقیقت کو حاصل کرنے کے لئے تمہیں اپنے کردار سے بتانا ہو گا کہ تم میں سے کون مسلسل جدوجہد کرتا ہے اور بال
کے مقابلہ میں ثابت قدم رہتا ہے۔

سورہ التوبہ میں ہے :-

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ
دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ - (۹/۱۱)

کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم نے ایمان کا اقرار کر لیا تو اس کے بعد کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال خام ہے۔ دعوائے
ایمان کے بعد یہ بھی دیکھا جائے گا کہ تم میں سے کون ہے جو نظامِ خدا دہی کے قیام و استحکام کیلئے مصروفِ جدوجہد رہتا
ہے اور اللہ اور اس کے رسول اور جماعتِ مومنین کے سوا کسی کو اپنا دوست اور راز دار

ایمان کیساتھ عمل | نہیں بناتا۔ یعنی زمانہ قبل از ایمان کے اس قسم کے رواج کو منقطع کر لیتا ہے۔ یاد رکھو!

خدا کی نگاہ تمہارے کاموں پر ہوتی ہے۔ دعوائی ایمان کے الفاظ پر نہیں ہوتی۔

اسی تنبیہ کو دوسری جگہ ان الفاظ میں دہرایا گیا۔۔۔ کہ أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا
وَهُمْ لَا يُفْقَهُونَ - (۲۹/۲۹)۔ کیا یہ لوگ سمجھے ہیں کہ محض اتنا کہہ دینے سے کہ ہم خدا پر ایمان لے گئے
ہیں، انہیں چھوڑ دیا جائے گا کہ اب جو جی میں آئے کرو۔ تم نے مطالبہ پورا کر دیا ہے اور اب تم سیدھے جنت میں
چلے جاؤ گے! ایسا سمجھنا خود فریبی ہے۔ ابھی تو تمہیں صعوبات و مشکلات کی جاگلس بھٹیوں میں سے گزرنا ہوگا۔

یہ شہادت کہ لغت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں سہماں ہونا
 مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ كُوجُن جَانِگد از مراحل سے گزرنا پڑا تھا ان میں سے ایک (جنگِ احزاب) کا
 نقشہ قرآن کریم نے ان ہولناک الفاظ میں کھینچا ہے :-

إِذْ جَاءُوكُم مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ
 الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللهِ الظُّنُونًا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا
 شَدِيدًا - (۳۳/۱۱)

وہ ایسا سختی کا وقت تھا کہ دشمن کے لشکر چاروں طرف سے امنڈ کر آگئے تھے۔ مقابلہ کی شدت کے تصور سے

متہاری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا اور دہشت سے متہارے
 دل اس طرح دھک دھک کر رہے تھے گویا وہ اچھل کر حلق تک آ

جنگِ احزاب میں ہولناک نقشہ

پہنچیں گے۔ جو ذرا کمزور دل واقعہ ہوتے تھے ان کے دل میں خدا کے وعدوں کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا
 ہو رہی تھیں۔ ایسے لرزادینے والے تصادم کے وقت مومنین کا جذبہ صادقہ ابھر کر سامنے آگیا اور دیکھنے والوں
 نے دیکھ لیا کہ وہ کس پامردی سے مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں۔

یہ تھا حضراتِ انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد۔ یہ تھی دین کی غرض و قایت۔ یہ تھا اس نظام کی مخالف قوتوں کی مزا
 کی شدت کا عالم اور یہ تھا دین کی حامی جماعتوں کا فریضہ حیات۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ

چو می گویم مسلمانم، بلزیم کہ دامن مشکلات لا الہ الا

رسول اللہ نے وحدتِ انسانیہ کو ایک امت کی شکل میں زندہ حقیقت بنا کر دکھا دیا۔ لیکن اس کے بعد اس امت
 کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا جو سابقہ امتوں کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے بھی دین کو مذہب میں تبدیل کر دیا اور
 وحدتِ انسانیہ کے فریضہ کو پورا کرنا تو ایک طرف، خود رنگ، نسل، زبان، وطن، قومیت کے دورِ جاہلیت
 کے بتوں کی پرستار بن کر، قوموں، پارٹیوں اور فرقوں میں بٹ گئے۔ آپ سوچئے کہ کہاں امت کا یہ مقصد کہ تمام
 اقوامِ عالم کے اختلافات مٹا کر، انہیں ایک عالمگیر برادری بنا دیا جائے اور کہاں اسی امت کی اپنی یہ حالت کہ دو
 مسلمان خاندانوں میں رُوبہ قبلہ اور ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتے؛ کیا یہ قومِ دین کی اس
 غایت کو پورا کر سکتی ہے؟ اور اس کی واحد ذمہ داری ہے مذہبی پیشوائیت جو مروجہ مذہب کو دینِ خداوندی بنا کر
 امت کو تھکیاں دے دے کر سلائے رکھتی ہے۔

مسلمان کا منتہی حصولِ جنت ہے ناں؟ دین نے حصولِ جنت کے لئے جو کچھ کہا تھا وہ آپ کے سامنے آچکا لیکن

مذہبی پیشوائیت نے حصولِ جنت کو کس قدر آسان بنا رکھا ہے اس کا اندازہ ان (وضعی) روایات سے لگ سکتا ہے جنہیں یہ حضرات

حصولِ جنت کے آسان طریقے

بہ اصرار و تکرار، جھوم جھوم کر، محراب و منبر سے سنتے رہتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ابوداؤد کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ انہیں بخش دیتا ہے۔ مسلم کی حدیث ہے کہ وضو کرنے والے کے تمام گناہ پانی کے ساتھ ٹپک جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ پانی کا آخری قطرہ ہر عضو کے آخری گناہ کو ساتھ لے کر ٹپکتا ہے۔ مسلم ہی کی ایک اور حدیث ہے کہ جو شخص پورا پورا وضو کرتا ہے تو نماز کے بعد بالکل ایسا ہو جاتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوا ہے۔

تیسری حدیث میں ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کرتا ہے اور وضو کے بعد یہ کلمات کہتا ہے: "اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ" و اشھد ان محمد عبدہ و رسولہ" تو ایسے شخص کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں؛ (مسلم)

ابن خزیمہ کی روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ تم کیا عمل کرتے ہو؟ میں نے ہمتاری جوتیوں کی آواز جنت میں سنی کہ تم مجھ سے بھی آگے چل رہے ہو۔ بلالؓ نے عرض کیا کہ دو کام میرے معمول بہا ہیں۔ ایک ہمیشہ با وضو رہتا ہوں۔ جب وضو ٹوٹ جاتا ہے تو فوراً دوسرا وضو کر لیتا ہوں اور جب وضو کرتا ہوں تو دو رکعتیں نفل ادا کر لیا کرتا ہوں۔

آپؐ نے دیکھا کہ جنت کس قدر آسانی سے مل جاتی ہے۔ یعنی وضو کیا تو تمام گناہ پانی میں بہہ گئے اور اگر ساتھ دو رکعتیں نفل پڑھ لے تو خود رسول اللہؐ سے بھی آگے آگے جنت میں پہنچ گئے۔

مسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص مؤذن کے جواب میں اذان کے الفاظ دہراتا ہے۔ لیکن حَتَّى عَلَي الصَّلَاةِ اور حَتَّى عَلَي الْفَلَاحِ کے جواب میں لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰہِ کہتا ہے تو یہ شخص جنت میں جائیگا۔ طبرانی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ تم جلتے رہتے ہو۔ لیکن جب صبح کی نماز پڑھ لیتے ہو تو وہ تم کو ٹھنڈا کر دیتی ہے یعنی دوزخ سے دور کر دیتی ہے۔ پھر ظہر تک وہی کام کرتے ہو لیکن ظہر کی نماز تم کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں اپنے درمیان فی اوقات کے گناہوں کو مٹا کر ٹھنڈا کر دیتی ہیں۔ جب تم سو رہے ہو تو تم پر کوئی گناہ

نہیں لکھا جاتا۔ یہاں تک کہ عیند سے جاگو (اور اگر رات کو دوزخ کے کام کرتے رہو تو صبح کی نماز انہیں ٹھنڈا کر دیگی)۔
ترمذی کی حدیث ہے کہ چالیس دن تک تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرنے والا دوزخ اور نفاق دونوں سے بری کر دیا جاتا ہے۔ بخاری اور مسلم دونوں میں ہے کہ جب امام سورۃ فاتحہ ختم کرتا ہے اور وَلَا الضَّالِّینَ کہتا ہے تو فرشتے آئیں کہتے ہیں۔ مقتدیوں میں سے جس شخص کی آئین ملائکہ کی آئین کے ساتھ ادا ہوئی، اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

بخاری اور امام مالک کی ایک حدیث میں ہے کہ جب امام سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَ کہہ کر رکوع سے سر اٹھائے تو تم رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہا کرو۔ جو بندہ یہ کلمہ کہتا ہے تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ یہاں تو صرف گناہ بخشنے کا ذکر تھا، مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص علاوہ فرض کے دن رات میں بارہ رکعتیں پڑھے اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنا دیا جاتا ہے۔

ترمذی کی روایت ہے کہ مغرب کی نماز کے بعد بیس رکعت نفل پڑھنے والے کے لئے جنت میں گھر بنا دیا جاتا ہے۔

ابوداؤد میں ہے کہ ظہر کے فرضوں سے پہلے جو شخص چار رکعتیں پڑھتا ہے، اس پر دوزخ کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔

مسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کر کے جمعہ کے لئے آیا اور خاموش بیٹھ کر خطبہ سنا تو اس کے گناہ نہ صرف جمعہ سے جمعہ تک بخش دیئے جاتے ہیں بلکہ تین دن کے اور زائد گناہ بھی بخش دیئے جاتے ہیں۔
”وظائف“ عجمی اسلام کا امتیاز خصوصی ہیں۔ دین اور دنیا کا کوئی معاملہ پیش آجائے، اس کے لئے نہ کسی محنت کی ضرورت ہے نہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی حاجت۔ بس ایک وظیفہ پڑھ لیجیے، مطلب حل ہو جائے گا۔ انہی وظائف سے جنت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً ناسی کی حدیث ہے کہ جس نے صبح اور مغرب کی نماز کے بعد سات مرتبہ اللّٰهُمَّ اجِرْنِي مِنَ النَّارِ (یا اللہ مجھے دوزخ سے نجات دیدے) پڑھ لیا تو دن اور رات میں کسی وقت بھی مر جائے، وہ جنت میں جائے گا۔

ترمذی میں ہے کہ جس نے بستر پر لیٹے وقت کہا: اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ وَ أَتُوبُ إِلَيْهِ۔ اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں، وہ گناہ خواہ دریاؤں کے جھاگ کے برابر ہوں یا درختوں کے پتوں کے برابر، ریگ کے ذروں کے برابر ہوں یا ان کی تعداد ایام دنیا کی مثل ہو، یعنی ابتدا و آخرت

سے قیامت تک جتنے دن ہوں، ان کی مثل بھی گناہ ہوں تو سب بخش دیئے جائیں گے۔

مسلم میں ہے کہ ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس بار سُبْحَانَ اللہ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہ، اَللّٰہُ اَکْبَر۔ کہہ لیا کرو جس نے یہ وظیفہ پڑھا اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ اگرچہ کہنے ہی کیوں نہ ہوں۔
ترمذی میں ہے کہ جس نے ہر دن میں سو بار قُلْ هُوَ اللہ۔ پڑھنے کا ورد کر لیا تو اس کے پچاس سالہ گناہ مٹ گئے۔

مسند امام احمد میں ہے کہ حضرت امام ہانیؒ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ہلکا سا وظیفہ بتا دیجئے کیونکہ میں بہت بڑھیا ہو گئی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ سُبْحَانَ اللہ سو بار پڑھا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو غلام آزاد کر دیجئے، اور وہ بھی حضرت اسمعیلؑ کی اولاد کے۔ سو بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہ پڑھا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو گھوڑے زین اور لکام سمیت مجاہدین کو دے دیئے۔ سو بار اَللّٰہُ اَکْبَر۔ کہا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو اونٹ مع نیکل وغیرہ اللہ کے راستے میں دیئے۔ اور سو بار لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ کہا کرو۔ یہ کلمہ زمین و آسمان کو ثواب سے بھر دیتا ہے۔ جس دن یہ وظیفہ پڑھے گی اس دن کسی کے اعمال بھی تیرے اعمال کے برابر آسمان پر نہ جائیں گے۔ ہاں اگر کوئی دوسرا بھی یہ وظیفہ پڑھے تو اس کے اعمال بیشک تیرے اعمال کے برابر ہوں گے۔

حاکم کی روایت ہے کہ جس نے اپنی بیماری میں چالیس مرتبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اَمْتَّ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔

پڑھا اور پھر اسی بیماری میں مر گیا تو اس کو ایک شہید کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اور اگر اس بیماری سے اچھا ہو گیا تو تمام گناہوں سے پاک ہو کر اچھا ہوتا ہے۔

شہادت

قرآنی نظام کے قیام کی جدوجہد میں ہر قربانی اپنی جگہ وزن رکھتی ہے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ گراں بہا قربانی انسان کی جان کی قربانی ہے۔ قرآن نے ان سعادت مند نفوس کو ”مقتولین فی سبیل اللہ“ (اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والے) کہہ کر پکارا ہے۔ انہیں عام طور پر شہید کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی اعمال میں شہادت کلمہ بہت بلند ہے اور مخالفین کے ساتھ ”اللہ کی راہ میں لڑنے والوں“ سے بڑھ کر سخت مقابلہ (جہاد) کرنے والا اور کوئی نہیں۔ یہی مجاہدین اور مقتولین فی سبیل اللہ تھے جنہوں نے باطل کی قوتوں کو بے دست و پا کر کے رکھ دیا تھا اس لئے ان قوتوں کو دوبارہ ابھرنے کا موقع دینے کے لئے ضروری تھا کہ مسلمان کو جہاد اور قتال فی سبیل اللہ سے ہٹا کر دیا جائے۔ اب دیکھئے کہ اس کے لئے ہماری کتب احادیث میں کس قسم کی روایات داخل کر دی گئیں۔

مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تم کن لوگوں کو شہید سمجھتے ہو! حاضرین نے عرض کیا کہ خدا کی راہ

میں مارا جائے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اس طرح تو میری امت میں شہداء کی تعداد بہت کم رہ جائے گی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ پھر شہید کون ہے؟ فرمایا جو خدا کی راہ میں مارا گیا وہ شہید، جو طاعون سے مر گیا وہ شہید، جو اسہال (دستوں کی بیماری) سے مر گیا وہ شہید، جو پانی میں ڈوب کر مر گیا وہ شہید، جو مکان گرنے سے دب کر مر جائے وہ شہید (اسی طرح ابوداؤد اور انسائی میں ہے کہ) جو نمونیہ سے مر جائے وہ شہید، جو آگ میں جل کر مر جائے وہ شہید۔ جو عورت وضع حمل سے مر جائے وہ بھی شہید۔

اس کے بعد یہ دیکھتے کہ ان ”شہداء“ کو اللہ کے ہاں رعایات کیا ملتی ہیں؟ یہ تو ظاہر ہے کہ شہید سیدھا جنت میں جاتا ہے لیکن روایات کی رو سے وہ اکیلا ہی جنت میں نہیں جاتا بلکہ اپنے ساتھ بہت سے اقربا کو جنت میں لے جاتا ہے۔ چنانچہ ابوداؤد کی حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ شہید کو اپنے خویش و اقارب میں سے ستر آدمیوں کی شفاعت کا حق دیا جائے گا۔

ان (اور ان جیسی دیگر روایات) میں آپ کو قدم قدم پر یہ الفاظ ملیں گے کہ ”خدا گناہ بخش دیتا ہے“ اور اس طرح گنہگار جنت میں چلا جاتا ہے۔ ”خدا کی بخشش“ کا عقیدہ اس قدر عام اور ہمارے قلوب کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا ہے کہ ہم ہر آن خدا سے ”بخشش“ کی دعا مانگتے رہتے ہیں حتیٰ کہ مرنے والے کے متعلق بھی ہماری یہی دعا ہوتی ہے کہ اللہ اسے بخش دے۔ اس مقصد کے لئے ہم نے ”مغفرت“ کا ترجمہ ہی ”بخشش“ کر رکھا ہے۔ یہیں سے ہمارے ہاں ”بخشش“ کا لفظ رائج ہوا۔ اور ”بخشش“ کے معنی تو آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اب مسلمان خدا سے جنت بھی ”بخشش“ کے طور پر مانگتا ہے۔ وہی جنت جس کے حصول کے متعلق چند ایک ارشادات خداوندی آپ کی نظروں سے ابھی ابھی گزرے ہیں۔ یہی نفعی ہماری وہ عبرت آموز اور تأسف انگیز ذہنیت جس پر خون کے آئینے بہاتے ہوئے، اقبالؒ نے اپنے مخصوص لہجہ و انداز میں کہا تھا کہ

بہشتے بہرِ پاکانِ حرمِ است بہشتے بہرِ اربابِ کرمِ ہمت
بگو ہندی مسلمان را کہ خوش باش! بہشتے ”فی سبیل اللہ“ ہم است (ارمغانِ حجاز)

آپ اپنی (یعنی ہم مسلمانوں کی) موجودہ حالت پر غور کیجیے اور پھر سوچئے کہ کیا دین کی غایت - وحدتِ انسانیہ - اس قوم کے ہاتھوں وجود میں آ سکتی ہے؟

لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ آپ ان آیات کو ایک بار پھر سامنے لائیے جو پہلے گزر چکی ہیں اور جن میں کہا گیا ہے کہ اگر تم اس دین سے اعراض بر تو گے تو تمہاری جگہ کوئی اور

مایوسی کی کوئی بات نہیں

قوم لے لیگی جو اس کے مقصد کو پورا کرے گی۔ اور قرآن کریم کی اس ”پیشگوئی“ کے کچھ آثار ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ آپ جلد اول ص ۲۳۹۔ آیت (۲/۲۱) میں پیش کردہ حقائق کو ایک بار پھر سامنے لائیں اور دیکھیں کہ یورپ کے مفکر کس طرح اپنے (یعنی اقوام عالم) موجودہ نظریاتِ زندگی سے تنگ آکر ایک ایسی دنیا کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو وحدتِ انسانیت کے زیرِ اصول کے مطابق بسائی جائے۔ ان کی یہ تڑپ، ہمنوز جنین کی شکل میں، ان کے سینوں میں پرورش پا رہی ہے۔ انہیں ایسی دنیا کی تلاش تو ہے لیکن انہیں وہ بنیاد نہیں مل رہی جس پر ایسی آسمان بوس عمارت استوار کی جاسکے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بنیاد قرآنی انداز کے سوا کہیں سے نہیں مل سکے گا۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کو، جاوید نامہ میں ”قوسِ قزح کے رنگ میں بیان کیا ہے۔ “قوس و قزح“ کے رنگ میں اس طرح کہ اس میں اس نے اپنی قلت کی حالت پر جو آنسو بہائے ہیں وہ امید کی قرآنی کرنوں میں سے گزر کر، افقِ عالم پر حسین اور رنگین دھنک کی صورت میں نمودار ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں۔

محفلِ مابے مے و بے ساقی است	سازِ قرآن را نوایا باقی است
زخمہٗ مابے اثر افتد اگر	آسماں دارد ہزاراں زخمہٗ در
ذکرِ حق از اُمتاں آمد غنی	از زمان و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا است	اختیاجِ روم و شام اورا کجا است
حق اگر از پیشِ ما برداردش	پیشِ قوسے دیگھے بگذاردش
از مسلمان دیدہ ام تقلید و ظن	ہر زمان جاغم بلرزد در بدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند	
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند	

۱۔ جب درج کی کرنیں بادلوں میں سے گزرتی ہیں تو ان سے قوس و قزح وجود میں آتی ہے۔ اس استعارہ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

(اب آگے بڑھیے۔ آیت (۳۳۶) میں کہا گیا تھا کہ دین کا مقصد وحدتِ انسانیہ کی عملی تشکیل ہے اور مفاد پرست

قویں اس وحدت کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں۔ پھر ایک امت اٹھتی ہے اور اسی وحدت کے احیاء کے لئے سرگرم عمل ہوتی ہے۔ اس امت کا ان مفاد پرست گروہوں سے ٹکراؤ

پہلا مرحلہ۔ اتفاق

ہوتا ہے۔ (۳۳۶)۔ اس کے بعد بتایا کہ اس ٹکراؤ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ امت کیا کیا تقاضے پورے کرتی ہے۔ آیت (۳۳۷) میں ان تقاضوں کو دو شفقوں میں پیش کیا گیا ہے یعنی مال کا اتفاق اور جان کی قربانی۔ یہی دو تقاضے یا مطالبے اگلی آیتوں میں سامنے آتے ہیں۔ واضح ہے کہ ان آیات کا تعلق اُس دور سے ہے جب قرآنی نظام کے قیام کے لئے جدوجہد کی جارہی تھی اور وہ ہنوز مشکل نہیں ہوا تھا۔ اُس دور میں اتفاقِ مال کے متعلق فرمایا:

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ - قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ
اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ - (۳۳۷)

اس کے لئے، سب سے پہلا مرحلہ مالی قربانی کا ہے۔ اسے رسولِ انتہائے ساتھی تم سے پوچھتے ہیں کہ اس کے لئے کس قدر مال کی ضرورت ہوگی اور اُسے کہاں خرچ کرنا ہوگا۔ ان سے کہو کہ اس پروگرام کی ابتداء معاشرہ کے محدود دائروں سے کی جائے گی۔ اس لئے، سر دست تم یہ دیکھو کہ ان دائروں میں وہ کون کون سے افراد ہیں جو دوسروں کی مدد کے محتاج ہیں۔ مثلاً، سب سے پہلے اپنے گھروں میں اپنے والدین کو دیکھو۔ پھر اور آگے بڑھو تو انہیں دیکھو جو معاشرہ میں بے یار و مددگار رہ گئے ہیں نیز انہیں جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہے۔ پھر اس سلسلہ کو اپنی بستی سے آگے بڑھاؤ، اور باہر سے آنے والوں کے متعلق دیکھو کہ انہیں تمہاری مدد کی کس قدر ضرورت ہے۔ (اس کی آخری حد وہ ہے جسے (۳۳۹) میں بیان کیا گیا ہے)

تم ان لوگوں کی ضروریات کو پورا کرو، اور اس پر یقین رکھو کہ جو کچھ بھی تم دوسروں کی بھلائی کے لئے کرو گے، وہ

سب اللہ کے علم میں رہے گا۔ اس میں سے ایک ذرہ برابر بھی بے نتیجہ نہیں رہنے پائے گا۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اتفاق کی یہ شکل، اسلامی نظام کے عبوری دور سے متعلق ہے۔ اس کے آخری مرحلہ میں اسکی کیا شکل ہوگی، اسے جلد اول ص ۲۹۷، آیت (۳۳۸) اور ص ۲۹۸، آیت (۳۳۹) میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کی بنیادی آیت (۳۳۹) چار آیات کے بعد سامنے آئے گی۔

اب آئیے دوسرے مطالبہ (یعنی جان کی قربانی) کی طرف فرمایا:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ وَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ
خَيْرٌ لَكُمْ وَعَسَى أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ
أَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ . (٢/٢١٧)

مال کے بعد، جانوں کی قربانی کا مرحلہ آئے گا۔ یعنی تمہیں مخالفین سے جنگ بھی کرنی پڑے گی۔ یہ مرحلہ تم پر گراں گزرے گا۔

کیونکہ تم لوگ مار کی خاطر جنگ کرنے کے عادی ہو۔ انسانیت کی بہبود کے لئے، جس میں ایتنا ہی

جان کی قربانی ایثار ہو، ذاتی منفعت کو توڑ ہو، جنگ کرنا، کار سے دارد۔ لیکن ان معاملات میں تم اپنی انفرادی

عقل اور جذبات سے فیصلہ نہ کراؤ۔ اس لئے کہ یہ عین ممکن ہے کہ عقل خود میں تمہیں ایک بات کو سخت ناپسندیدہ

بنا کر دکھا۔ تے لیکن وہ (تمہاری ذات کی بہبود کے نقطہ نگاہ سے) تمہارے لئے بڑی خیر و برکت کی موجب ہو۔

اس کے برعکس، عقل و جذبات کے سطحی تقاضے کسی چیز کو بڑا خوش آئند بنا کر دکھائیں لیکن وہ درحقیقت (متمہاری

ذات کی نشوونما کے لئے) بڑی مضرت رساں ہو۔ اس لئے ان امور کا فیصلہ وحی کی روشنی میں کرو، کیونکہ وحی کی

ننگہ دور رس، حقیقت کو دیکھتی ہے، اور تمہاری جذبات کے تابع چلنے والی عقل کی نگاہ محدود ہوتی ہے۔ وہ حقیقت

کو نہیں جان سکتی۔

جنگ کے متعلق آیات پہلے درج کی جا چکی ہیں اس لئے یہاں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہاں ایک

اور نکتہ کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ مذہب میں اگر قرآنی احکام کی اہمیت کیا شکل اختیار کر لیتی ہے۔

اسی (سورہ بقرہ کی) آیت (۳۶) میں کہا گیا ہے: **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** تم پر روزے فرض کئے گئے

ہیں: اور اس سے ذرا آگے (زیر نظر آیت میں) کہا گیا ہے، کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ۔ تم پر جنگ (قتال) فرض

کیا گیا ہے۔ دونوں آیتوں کے مخاطب مومنین (مسلمان) ہیں۔ اور دونوں کے الفاظ بھی ایک جیسے (کُتِبَ عَلَیْکُمْ)۔

صیام (روزوں) کی فرضیت کا ذکر تو قرآن مجید میں اسی ایک مقام پر آیا ہے لیکن جہاد یا قتال کی فرضیت اور اہمیت

سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں روزوں کی فرضیت اور اہمیت کے متعلق اس قدر

تاکید اور تلقین کی جاتی ہے۔ ان کے ”ثواب“ کے متعلق اتنے دلکش وعظ کہے جاتے ہیں۔ ان سے متعلق مسائل پر اس قدر

کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ افطار اور سحری کے اوقات کے تعین اور ان کے اعلانات

کے سلسلہ میں اتنے انتظامات کئے جلتے ہیں۔ یہ سب بجا اور درست۔ لیکن آپ نے

کبھی کسی محراب اور منبر سے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ - (جنگ کی فرضیت) کے متعلق کچھ سنا ہے؛ اپنی تقریروں

زورِ خطابت پیدا کرنے کے لئے توجہِ اد کے متعلق آیات اور اشعار خوب چپاں کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ محض "شاعری" ہوتی ہے۔ اس کی فرضیت کے متعلق کچھ نہیں کہا جاتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آجکل جنگ نے انتہائی ٹیکنیکل سائنس کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کے لئے قائمہ فوج (STANDING ARMY) ناگزیر ہو گئی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم تو تمام مومنین (مسلمانوں) کو مجاہد (سپاہی) بنانا چاہتا ہے۔ انہی میں سے مستقل قائمہ فوج بھی تیار کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس سے یہ فرضیہ (نماز جنازہ کی طرح) فرضِ کفایہ تو نہیں بن جاتا؟ اس فرضیہ کی اہمیت کو اس لئے اجاگر نہیں کیا جاتا کہ اگر "علماء" حضرات اسے تمام امت کے لئے فرضِ عین کی حیثیت سے پیش کریں اور روزوں کی طرح اس کی اہمیت پر زور دیں تو انہیں خود بھی (اور سب سے پہلے) میدانِ جنگ میں جانا پڑے گا۔ لہذا وہ روزوں کی فضیلت پر زور دیتے رہیں گے اور فرضیہ قتال کا کبھی ذکر نہیں کریں گے۔ حتیٰ کہ اگر کسی وقت دشمن کے خلاف جنگ چھڑ جائے تو وہ حجروں اور خانقاہوں میں بیٹھے اپنی فوج کی فتح کے لئے دعائیں مانگنے پر زور دیں گے خود میدانِ جنگ کی طرف رخ تک نہیں کریں گے۔

امت کے لئے فرضیہ قتال کی اہمیت پہلے ہی کم ہو رہی تھی کہ (وہ جو کہتے ہیں "مرے کو مارے شاہ مدار") اس تصور کو مسلمانوں کے دل و دماغ سے ہمیشہ کے لئے محو کر دینے کے لئے ایک "مامور من اللہ" تشریف لے آئے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ :-

آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اٹھاتا

اور اپنا نام غازی رکھتا ہے وہ اس رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے جس

نے آج سے تیرہ سو سال پہلے فرمادیا کہ مسیح موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم

ہو جائیں گے۔ سواب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں۔ ہماری طرف سے امان اور صلح کاری کا سفید جھنڈا بلند

لیا گیا۔ (ابو بکر - مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی ص ۱۵۱)

اور اس کے بعد "مسیح موعود" صاحب نے اس نثر کی مزید وضاحت نظم میں یوں فرمادی کہ ۵

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دیں گے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

لے فقہ کی رو سے فرضِ کفایہ ایسے فرضیہ کو کہتے ہیں کہ اگر معاشرہ میں سے کچھ لوگ بھی اسے ادا کریں تو اسے پورے معاشرہ کی طرف سے ادا کردہ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

اب آگیا مسیح جو دیں کا امام ہے
 اب آسماں سے نورِ خدا کا نزول ہے
 دیں کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
 اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے
 دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے جہاد
 منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(اعلان مرزا غلام احمد قادیانی -

مندرجہ تبلیغ رسالت جلد پنجم، ص ۴۹)

میں نے اس تمام تفصیل کو اپنی کتاب ”ختم نبوت اور تحریک احمدیت“ میں شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے جس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ”مسیح موعود“ صاحب پر وحی کون سے ”آسمان“ سے نازل ہوا کرتی تھی اور وہ اس قسم کے اعلانات کے لئے کس کی طرف سے ”مامور“ تھے۔

اب ضمنی نکتہ کے بعد پھر آئیہ زیر نظر (۲۱۴) کی طرف آجائیے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک کام تمہیں ناگوار گزرے لیکن وہ درحقیقت تمہارے لئے موجب خیر ہو۔ اور ایک بات تمہیں بہت مرغوب ہو اور وہ درحقیقت تمہارے لئے شر کا موجب ہو۔ خیر و شر کی تفصیلی بحث جلد اول صفحات ۲۵۰؛ ۲۵۵ میں زیر آیت (۱۹/۲۱۴) نیز جلد دوم میں (۳۸/۲۱۴) پر بیان کی جا چکی ہے۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔ اس سلسلہ میں ”وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ“ بنیادی حقیقت ہے۔ انسانی ذات کے لئے کون سے امور موجب خیر اور کون سے باعثِ شر ہیں، یہ وحیِ خداوندی ہی بتا سکتی ہے؛ عقل خود میں اس کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ اسی لئے عقل کی آنکھ وحی کی روشنی کی محتاج ہے۔

اس آیت (۲۱۴) میں کہا گیا ہے کہ جنگ کی وجہ سے بیشک تمہیں انفرادی طور پر تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مصائب برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اگر دشمن تم پر غالب آجائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ان دشمنوں کے عزائم کے متعلق اگلی آیت میں کہا ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ - قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدُّ
 عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ
 أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ
 حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ
 عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا

۲
۲۱۴

وَالْآخِرَةُ وَأَوَّلُكَفَ اصْصَبُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ - (۲/۲۱۷)

لیکن صلح ہو یا جنگ، قانونِ خداوندی کی پاسداری ہر حالت میں لازمی ہے۔ مثلاً جس پہننے میں تمہیں جنگ روکا گیا ہے، اس میں جنگ کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ دوسری طرف، اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھو کہ لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکنا۔ اس کے قوانین کی صداقت سے انکار و سرکشی برتنا۔ مسجد حرام تک میں جنگ کرنے سے باز نہ رہنا اور جو لوگ اس میں پناہ لے چکے ہوں انہیں وہاں سے نکال باہر کرنا۔ یہ جرائم بہت زیادہ سنگین ہیں۔ یہ فتنہ پردازی ہے اور فتنہ پردازی قتل سے بھی زیادہ ہلاکت انگیز نتائج کا موجب ہوتی ہے۔

اسے بھی یاد رکھو کہ یہ لوگ جو تم سے برسرِ پیکار ہیں، کبھی جنگ سے ہاتھ نہیں اٹھائیں گے جب تک — اگر ان میں اس کی استطاعت ہو — تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ نہ کر دیں۔ (جنگ سے ان کا مقصد ہی یہ ہے)۔ لیکن اسے سمجھ لو کہ تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے اور حالتِ کفر میں اس کی موت واقع ہو جائے تو یہ وہ لوگ ہوں گے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے اعمال ان کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی۔ (۲/۲۱۷)۔ یہ بات کہ یہ کسی وقت دین کے صحیح راستے پر نہ گئے، انہیں اس تباہی سے نہیں بچا سکے گی۔

جنگ کے سلسلہ میں مقاصد، شرائط اور ہدایات، آیات (۱۹۳-۱۹۴) میں گزر چکی ہیں۔ ان میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ حرمت کے پہننے کون کون سے تھے اور ان مہینوں میں حرمِ کعبہ کے گرد و پیش ارتداد۔ انفرادی اور قومی | جنگ کی کیا صورت تھی۔ ان امور کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے علاوہ یہاں دو قسم کے ارتداد کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک ارتدادِ قومی یعنی پوری کی پوری قوم کا دین (نظامِ خداوندی) سے برگشتہ ہو جانا، خواہ وہ دشمن کی طرف سے جبریہ ہو اور خواہ اسے وہ قوم، از خود چھوڑ دے۔ اس کا انجام کیا ہو گا، اس کے متعلق سابقہ صفحات میں، استبدال و استخلافِ قومی، کے موضوع کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔ ایسی قوم انعاماتِ خداوندی سے محروم رہ جاتی ہے۔

آیت (۲/۲۱۷) کے دوسرے حصے میں، انفرادی ارتداد کا ذکر ہے یعنی کوئی ایک فرد اسلام چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لے۔ اس کے متعلق بھی گزشتہ صفحات میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ زیرِ نظر آیت میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ اگر وہ شخص دوبارہ اسلام کی طرف نہ آجائے اور حالتِ کفر ہی میں اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کے تمام اعمال غارت ہو جائیں گے۔ یعنی اس نے جو اعمالِ حسنہ اس زمانے میں کئے تھے جب وہ اسلام کا پابند تھا، تو ارتداد کی صورت میں وہ ان کے ثمرات سے بھی محروم ہو جائے گا۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ فَلَا تَمُوتُنَّ

إِنَّا وَآلَنَّا مُسْلِمُونَ۔ (۲/۱۶۷ د ۳۰۸) اس کی تشریح سابقہ صفحات میں زیر آیت (۲/۱۶۷) گزر چکی ہے۔ اگر اتنا دیکھ کر قتل کر دینا ہوتا تو یہ دکھا جاتا کہ مَنْ تَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ - قِيمَتٌ وَهُوَ كَافِرٌ، بہر حال جیسا کہ کہا جا چکا ہے، اس موضوع پر تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

(۱)

جنگ کے متعلق ضروری ہدایات کے بعد کہا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۲/۲۱۸)

جو لوگ نظامِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور اس کے قیام کی راہ میں جو چیز بھی حائل ہو اس سے اپنا دامن چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں۔ حتیٰ کہ اس کے لئے اگر وطن تک بھی چھوڑنا پڑے تو اسے بھی چھوڑ دیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں اور مرتے دم تک اسی روش پر قائم رہیں (۲/۲۱۸) تو یہی لوگ ہیں جو رحمتِ خداوندی کے صحیح معنوں میں امیدوار اور مستحق ہیں۔ خدا کا قانونِ مکافات ان کی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کے مضرت رساں اثرات سے ان کی حفاظت کر دیتا ہے۔ اور ان کی نشوونما کا پورا پورا سامان مہیا کر دیتا ہے۔

اس آیت میں "الَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ" کہا گیا ہے۔ جہاد کے متعلق گزشتہ صفحات میں قتال (جنگ) کے سلسلہ میں ذکر آچکا ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ مومن کی زندگی، قیام و استحکامِ نظامِ خداوندی کے لئے مسلسل مصروفِ جدوجہد رہنا ہے۔ اس جدوجہد میں آخری مقام وہ آجاتا ہے جہاں اسے نظامِ خداوندی کی حفاظت کے لئے سرکبف اور شمشیر بدست میدانِ جنگ میں اترنا پڑتا ہے۔ لیکن اس جدوجہد کا ایک گوشہ اور کجی ہے اور وہ یہ کہ اس کی خاطر اسے جو کچھ چھوڑنا پڑے، بلا تامل و توقف اسے چھوڑنا چھلنا جانا ہے۔ اسے ہجرت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا آخری مقام وہ ہے جہاں اسے وطن تک بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔ چونکہ (قتال کی طرح)

ہجرت

ہجرت کے متعلق بھی بڑے غلط تاثرات قائم کئے گئے ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مفہوم کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حضور نبی اکرم (معاذ اللہ) مکہ سے جان بچا کر مدینہ کی طرف بھاگ گئے تھے۔ اس لئے اسے (ESCAPISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہجرت کی یہ تعبیر غلط تاثرات کا نتیجہ ہے۔ یہ درحقیقت نظامِ خداوندی کے قیام کے پروگرام کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کا وقوع نبی کریم کی حیاتِ طیبہ ہی میں نہیں ہوا۔ قریب قریب ہر رسول کو اس مرحلہ سے گزرنا پڑا تھا۔

جیسا کہ اس سے پیشتر لکھا جا چکا ہے، رسول کا مقصد خالی وعظ و نصیحت نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک ایسے نظام حکومت کا قیام ہوتا ہے جس میں احکاماتِ خداوندی نافذ ہوں۔ وعظ و تلقین اور تبلیغ و تفہیم سب اسی مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسی منزل کی طرف لے جانے والے راستے ہوتے ہیں۔ وہ جس جگہ پیدا ہوتا ہے، کوشش کرتا ہے کہ اس نظام حکومت کا قیام اسی جگہ سے شروع ہو۔ وہ اس فضا کو اس نظام زندگی کے لئے سازگار بنانے میں سعی و عمل کا کوئی گوشہ تشہ نہیں چھوڑتا۔ وہ پوری جدوجہد کرتا ہے کہ لوگ سمجھ سکیں کہ وہ انہیں کس زندگی بخش نظام کی طرف بلاتا ہے لیکن سرکش قوتیں جو اس نظام کے قیام میں اپنے مفاد و مقاصد کی موت دیکھتی ہیں اس کی سرٹوڑ مخالفت کرتی ہیں۔ لیکن جب صورت یہ پیدا ہو جائے کہ اس مقام پر اس نظام کے قیام کا امکان نظر نہ آئے تو اس وقت یہ داعی انقلاب یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان نہیں دے لیتا کہ میرے ذمہ جو فرضیہ عائد ہوتا تھا میں نے اُسے ادا کر دیا۔ اب اگر یہ لوگ نہ مانیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اس کا مقصد، ان پیش نظر لوگوں تک دعوتِ حق و صداقت کا پہنچانا ہی نہیں ہوتا۔ وہ ان تک یہ پیغام پہنچاتا ہی اس لئے ہے کہ وہ اپنے غلط معاشرہ کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کر لیں۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ ایسے معاشرہ کا قیام اس جگہ ممکن نہیں تو وہ پاؤں توڑ کر اسی جگہ نہیں بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ایسے مقام کی طرف چلا جاتا ہے جہاں کی فضا اس معاشرہ کے قیام کے لئے مساعی ہو۔ وطن کی حدود و ثغور اس کے نزدیک کچھ معنی نہیں رکھتیں۔

وطن کا مفہوم رسول کی نگاہوں میں

اس لئے اس کی چار دیواری اس کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہو سکتی۔ اس کے نزدیک وطن وہ ہے جس کی زمین اس... نظامِ خداوندی کے لئے سازگار اور بار آور ہو۔ لہذا جب وہ کسی ایک مقام پر اس نظام کے قیام کے امکانات نہیں دیکھتا تو کسی ایسے مقام کا رخ کر لیتا ہے جہاں اس کے امکانات نسبتاً زیادہ ہوں۔ اسی کا نام، رسول کی زبان میں، ”ذہاب الی اللہ“ یا ”ہجرت الی اللہ“ ہے۔ ہجرت کے معنی ہیں چھوڑ دینا۔ ترک کر دینا۔ ایک مسلم کی زندگی کا ایک لمحہ ”ہجرت“ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہ ہر اس تعلق کو جو اس کے نصب العین کے حصول میں مانع ہو، بلاتامل و توقف چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ یہی وہ کانٹے ہیں جنہیں راستے سے ہٹانا بڑی ہمت کا کام ہے۔ ذاتی جذبات و خواہشات، عیش و آرام، مال کی محبت، اولاد سے وابستگی، رشتہ داروں سے تعلقات، دیگر رجحانات و میلانات، ان میں سے جو ”کانٹا“ بھی دامنگیر ہو، اسے جھٹک کر الگ کر دیا جائے۔ ایک سہل انگار اور تن آسان آدمی کے لئے وطن کی جاذبیت بڑی محکم گیر ہوتی ہے۔ اس لئے انسان وطن کی زمین میں بُری طرح پا بگل ہو جاتا ہے۔ وطن کی یہی کشش و جاذبیت کھتی جو ایک جگہ رہنے والے انسانوں

کے لئے وجہ جامعیت اور باعث اتحاد و اتفاق بنی۔ اور اس کے بعد اس نے رفتہ رفتہ ایسی سختی اختیار کر لی کہ آج دنیا میں قومیتوں کا انحصار اوطان پر تیار پا گیا اور خدا کی یہ وسیع زمین، محض پہاڑوں اور دریاؤں کے فرضی خطوط سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر انسانوں کی بستیوں کے بجائے درندوں کا بھٹ بن گئی، اس میں شبہ نہیں کہ انسان جس مقام پر رہتا ہے اس کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ جس مکان کو آپ استنہ شوق سے بناتے ہیں۔ پھر اس میں اپنے مال و متاع کو محفوظ رکھتے ہیں۔ مختلف کام کاج کرنے کے بعد آپ کا ہر قدم غیر شعوری طور پر اس کی طرف اٹھتا ہے۔ جب آپ کو اطلاع ملتی ہے کہ دریا چڑھ گیا ہے اور عنقریب سیلاب کا رخ اس بستی کی طرف ہونے والا ہے جس میں آپ کا یہ مکان ہے تو آپ کس طرح ہر کشمکش و جاذبیت کو جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں اور دیوانہ و اندھیوں سے بھاگ اٹھتے ہیں۔ اس وقت نہ مکان کی محبت آپ کے راستے میں حائل ہوتی ہے نہ اس کے مشمولات سے وابستگی عیاں گیر۔ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ آپ کے پاس ایک ایسی چیز ہے جسے آپ مکان اور اس کے تمام متعلقات سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ اس کی حفاظت کے لئے آپ ان تمام چیزوں کو بلا توقف و تردد چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ متاع گراں بہا جس کی حفاظت میں آپ کسی تعلق اور وابستگی کی پرواہ نہیں کرتے، آپ کی جان ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جان بڑی گراں بہا متاع ہے۔ لیکن جن کی نگاہیں طبعی زندگی کی چار دیواری سے آگے بھی جاتی ہیں، ان کے نزدیک جان سے بھی زیادہ گراں بہا اور عزیز تر شے ایک اور ہے جسے جوہر خودی، شرف انسانیت، کلمۃ الحق، یا ایمان کے جامع لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہذا اگر کوئی دیکھے کہ باطل کا سیلاب بے پناہ ہے جو چاروں طرف سے امنڈے چلا آرہا ہے اور اس میں اس کی اس متاعِ نایاب کی خیر نہیں تو کہیے کہ اس وقت اس کے نزدیک وطن کی حیثیت کیا رہ جائے گی؟ وہ بلا تردد و تامل وطن کی خسار دار جھاڑی کو اپنے راستہ سے الگ پھینک دے گا، اور کسی ایسے مقام کی طرف رخ کر لے گا جہاں اس کی یہ متاع بے بہا محفوظ ہو جائے۔ (اور اس کی حفاظت صرف اس نظام میں ممکن ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) اس کا نام ہجرت ہے۔ حتیٰ کہ اس کی حفاظت میں اپنی جان تک بھی دینی پڑ جائے تو، زیادہ عزیز شے کی حفاظت کی خاطر، کم عزیز شے کی قربانی کے اصول کے مطابق وہ اس میں بھی دریغ نہیں کرے گا۔ لہذا، ہجرت ایمان کا تقاضا اور مردِ مومن کی مجاہدانہ زندگی کا شعار ہے۔

ہجرت سے مفہوم

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است اس زبابِ ثباتِ مسلم است
معنی اوازِ تنک آبی رم است تزکِ شبِ ہم بہرِ تسخیرِ ہم است

یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر قرآنِ کریم نے ہجرت کو اس قدر اہمیت دی ہے اور مختلف طرق و سبب سے اس کی اساسی حکمت کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ سورہ عنکبوت میں ہے۔

لُعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةً فَإِيَّايَ فَاعْبُدُونِ

(۲۹)

اے میرے بندو جو میرے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہو، اس حقیقت کو سمجھ لو کہ تمہاری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تم میری اور صرف میری محکومیت اختیار کرو۔ اگر ایسا کرنا کسی ایک خطہ زمین میں ممکن نہیں تو میری زمین بہت وسیع ہے۔ تم کسی ایسے خطہ زمین کی طرف ہجرت کر جاؤ جہاں اس انداز کی زندگی بسر کرنے کے امکانات زیادہ روشن ہوں۔

فَإِيَّايَ فَاعْبُدُونِ کے انقلاب انگیز ٹکڑے پر غور کیجیے۔ یعنی مومن کی زندگی یہ ہے کہ وہ خدا اور صرف خدا کی محکومیت اختیار کرے۔ اگر ایسا ہونا اس سرزمین میں ممکن ہے جہاں وہ پیدا ہوا ہے تو ہوا المراد۔ اور اگر وہاں اس کا امکان نہیں تو إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةً اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھ رہنا اور غیر اللہ کی محکومیت پر قناعت کر جانا، یہ تو مردِ مومن کی زندگی نہیں۔ دیکھیے! سورہ نسا میں اسی حقیقت کو کس طرح کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّيْنَاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا - (۱۶)

جو لوگ غیر خداوندی ماحول میں رہ کر اپنے بامقنوں اپنے اد پر ظلم کر رہے ہیں ان کی روح قبض کرنے کے بعد فرشتے ان سے پوچھتے ہیں ”تم کس حال میں تھے؟“ (یعنی دین کے

اعتبار سے تمہارا کیا حال تھا؟)۔ وہ جواب میں کہتے ہیں: ”ہم کیا کرتے؟ ہم ملک میں بے بس اور کمزور تھے“ (یعنی بے بسی کی وجہ سے دین کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے) اس پر فرشتے کہتے ہیں (اگر تم اپنے ملک میں مغلوب دے بس تھے، تو) کیا خدا کی زمین وسیع نہ سکتی کہ کسی دوسری جگہ ہجرت کر کے چلے جاتے؟“ غرضیکہ یہ وہ ملک ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور (جس کا ٹھکانا دوزخ ہوا تو) کیا ہی بڑی جگہ ہے!

معذرت صرف ان لوگوں کی قابل قبول ہے جو طبعی (نہ کہ قلبی) طور پر کمزور و ناتواں اور ہجرت کی کوئی راہ نہ پاتے ہوں۔

معذورین

إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا - فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَغْفُو عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفُورًا - (۹۸-۹۹)

مگر (ہاں) جو مرد، عورتیں، بچے، ایسے مجبور دے بس ہوں کہ کوئی جا رہ کار نہ رکھتے ہوں، اور (ہجرت کی) کوئی راہ نہ پاتے ہوں، تو امید ہے کہ اللہ (ان کی معذوری کو دیکھتے ہوئے) انہیں معاف کر دے، اور وہ درگزر کر دینے والا، سامانِ حفاظت عطا کرنے والا ہے!

باقی رہے ہجرت کر جانے والے تو:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرْعَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً وَمَنْ يُخْرِجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا - (۱۰۰)

لے ہجرت کی راہ نہ پانے والوں پر یہ لازم آجاتا ہے کہ وہ اپنے ہی مقام کو حکومتِ خداوندی کے لئے سازگار بنانے کی جدوجہد کریں نہ کہ اپنی حالت پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں۔

اور (دیکھو) جو کوئی اللہ کی راہ میں (اپنا گھر بار چھوڑ کر) ہجرت کرے گا تو اسے خدا کی زمین میں بہت سی اقامت گا ہیں ملیں گی، اور وہ وہاں (ہر طرح کی) کشائش پائے گا کہ معیشت کی نئی راہیں اس کے سامنے کھل جائیں گی) اور جو کوئی اپنے گھر سے ایسے مقام کی طرف ہجرت کر کے نکلے جہاں کی سر زمین نظام خداوندی کے لئے زیادہ سازگار ہو، اور پھر اُسے (راہ ہی میں) موت آجائے، تو اس کا اجر اللہ کے حضور ثابت ہو گیا (وہ اپنی موت کے مطابق اپنی کوشش کا ضرور اجر پائے گا)۔ اور اللہ تو ہر حال میں (حفاظت اور سامانِ نشو و نما دینے والا ہے۔

قرآن کریم نے صدرِ اول کے مومنین کا دو زمروں میں تعارف کرایا ہے۔ مہاجرین اور انصار۔ مہاجرین وہ جو ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے۔ اور انصار مدینہ کے وہ مومن جنہوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی تھی اور ہر طرح سے ان کی مدد کی تھی۔ جہاں تک مجاہدین کا تعلق ہے ان میں انصار اور مہاجرین دونوں شامل ہیں۔ مہاجرین میں ایک تو وہ تھے جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے ہجرت کی تھی اور دوسرے وہ جنہوں نے اس کے بعد ہجرت کی۔ قرآن کریم نے ان سب کو مومن حقا قرار دیا اور رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کے بلند ترین اعزاز سے مشرف فرمایا ہے۔ تفصیل ان امور کی جلد اول صفحہ ۲۲۵ زیر آیت (۲/۲۱۳) اور ص ۳۱۳۔ آیت (۲/۲۱۳) میں گزر چکی ہے۔ (صحابہ کبار کے متعلق مزید تفصیل کے لئے میری کتاب ”شاہکار رسالت“ دیکھیے)۔

اس مقام پر اتنا مزید سمجھ لینا ضروری ہے کہ مہاجرین اور انصار دو الگ الگ ”پارٹیاں“ نہیں تھیں۔ وہ ایک ہی امت کے افراد اور ایک ہی جماعت کے ارکان تھے۔ ان کے لئے یہ دو اصطلاحیں ان کی منفرد خصوصیات کی بنا پر استعمال کی گئی تھیں جس طرح امتِ مسلمہ کے افراد کے لئے مسلمین، مومنین، متقین وغیرہ اصطلاحات، قرآن میں آئی ہیں۔ اُمت میں الگ الگ پارٹیوں کا تصور خلافِ اسلام اور مشرک ہے۔ (۳۰-۳۱-۳۲)

اس آیت (۲/۲۱۳) میں (۱) ایمان (۲) ہجرت (۳) جہاد کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ ایمان کے

لئے ضروری ہے کہ انسان کے ہوش و حواس قائم ہوں اور وہ عقل و فکر سے پوری طرح کام لے سکے۔ اور ہجرت اور جہاد کے لئے اس ضروری ہے کہ وہ محنت کا عادی اور مشقتیں برداشت کرنے کا خوگر ہو۔ اور ان سب کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے گھر کی زندگی امن و سکون کی ہو۔ کیونکہ جس شخص کی گھر کی زندگی (HOME LIFE) خوشگوار نہ ہو، وہ باہر کی زندگی میں دلجمعی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم نے اگلی آیات میں انہی موضوعات سے بحث کی ہے جنہیں ہم آئندہ باب میں سامنے لائیں گے۔



ساتواں باب

دُرُوبِ خانہ

عائلی قوانین

آیت — ۲۱۹ تا ۲۵۷

- ۱۔ شراب - میسرہ - اِزلام - انصاف - ممانعت
- ۲۔ قُلِّ العَفْوِ کی بحث -
- (قرآن کے معاشی نظام کی اساس)
- ۳۔ یتیموں کی پرورش - حفاظت - عزت
- ۴۔ عائلی زندگی سے متعلق قوانین
- ۵۔ نکاح - نکاح کے لئے عمر
- ۶۔ حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح
- ۷۔ تعدد ازواج — رسول اللہؐ کی ازواجِ مطہرات
- ۸۔ طلاق - حلالہ

- ۹۔ ہمسہ - جہیز
- ۱۰۔ عورتوں اور مردوں میں مساوات
- ۱۱۔ جنسی اختلاط سے مقصد - متعہ کی بحث
- ۱۲۔ النساءِ حرثِ لکھ کی بحث -
- ۱۳۔ عدت - رضاعت - حضانت
- ۱۴۔ کما نذر کے انتخاب کا معیار
- ۱۵۔ وحی - خدا سے ہمکلامی
- ۱۶۔ صفاتِ خداوندی - آیۃ الکرسی
- ۱۷۔ اولیاء اللہ

ساتواں باب

دُرُونِ خانہ

عائلی قوانین

سابقہ باب کے آخر میں کہا گیا ہے کہ دین کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان عقل و ہوش سے کام لے۔ آیت زیر نظر میں ان چیزوں سے اجتناب کا ذکر ہے جس سے عقل و ہوش ماؤف ہو جاتے ہیں۔ فرمایا:-

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا - (۲۱۹)

۲
۲۱۹

اس کا عام ترجمہ یہ ہو گا:-

اے رسول! یہ لوگ تجھ سے خمر اور میسرہ کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ کہو کہ ان دونوں میں بہت زیادہ اثم بھی ہے اور نفع بھی۔ لیکن ان کا اثم ان کے نفع کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ (آیت کا باقی حصہ آگے چل کر لکھا جائے گا)۔

اس میں خمر، میسرہ اور اثم کے الفاظ تشریح طلب ہیں۔ اثم کے متعلق جلد دوم ص ۳۵۳ زیر آیت (۵۷) میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی اضمحلال، افسردگی اور تنکان کے ہوتے ہیں۔ عرب، الْأَثْمَةُ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تنکان کی وجہ سے ایسی مضحل ہو جاتے کہ قطار میں دوسرے اونٹوں کے ساتھ قدم قدم چلنے کے قابل نہ رہے۔ ان سے پیچھے رہ جائے۔ خود یہ لفظ بتا رہا ہے کہ خمر اور میسرہ کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ انفرادی طور پر کبھی اور اجتماعی حیثیت سے کبھی۔ یعنی جو فرد ان کا عادی ہو جائے وہ دیگر افراد معاشرہ کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل نہیں رہتا۔ اور جو قوم ان کی عادی ہو جائے وہ سفر حیات میں دیگر اقوام عالم کے ہمدوش چلنے کی صلاحیت کو بیٹھتی ہے۔ وہ اپنی توانائیاں کھو کر مضحل، فلہذا آمادہ بہ زوال ہو جاتی ہے۔ پہلے خمر کو لیجیے۔ خمر کے بنیاد

خمر

معنی ہیں کسی چیز کو ڈھانپ دینا۔ چھپا دینا۔ خماران اور حنیوں کو کہتے ہیں جن سے عورتیں اپنا سر اور سینہ ڈھانپ لیتی ہیں (اس کی جمع خُمُرُ آتی ہے۔ دیکھیے۔ ۲۴) ان بنیادی معانی کی جہت سے اَلْخَمْرُ ہر نشہ آور چیز کو کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ اَلْخَمْرُ مَا خَاسَرَ الْعَقْلَ۔ (لفات القرآن) یعنی خمر وہ ہے جو عقل کو ڈھانپ لے۔ عرب عام طور پر فشرۃ انگور سے شراب بناتے تھے اور اسے خمر کہتے تھے۔ اسے ہمارے ہاں شراب کہا جاتا ہے۔ (واضح ہے کہ خمر کے لئے شراب کا لفظ ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں ہر اس شے کو جو پی جائے شراب کہا جاتا ہے۔ یعنی مشروب)

خمر (الکحل) کے متعلق دورِ حاضرہ میں اس قدر ریسرچ ہو چکی ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ محققین متفقہ طور پر اس نتیجہ پہنچے ہیں کہ عارضی طور پر شراب دورانِ خون میں تیزی پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے ایسی بیماریوں میں جن کے علاج کے لئے دورانِ خون میں تیزی پیدا کرنا مقصود ہو، دوائی کے طور پر اسکا استعمال فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے عادۃً استعمال سے دورانِ خون کی رفتار میں جو تیزی اور اس کے بعد سستی واقعہ ہوتی ہے اس کا بہ ہتھیت مجموعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے قوائی عملیہ مضحل اور آخر الامر مفلوج ہو جاتے ہیں۔ بشرابی کی عقل و ہوش کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کا مشاہدہ ہر روز کیا جاسکتا ہے۔

قبل از اسلام عربوں کی حالت یہ تھی کہ (بقول مولانا حالیؒ) — شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی تھی — جو قوم صدیوں سے اس کی عادی چلی آرہی ہو، اس سے یہ دفعتاً چھڑائی نہیں جاسکتی۔ اس لئے قرآنِ کریم میں اس سے متعلق احکام تدریجاً آئے ہیں۔ اور ناریخ بتاتی ہے کہ اس کی قطعی مانعت کے احکام قریب چار پانچ سن ہجری میں نازل ہوئے۔ یعنی مکی زندگی کے تیرہ سال اور مدنی زندگی میں سے

تدریجی احکام

چار یا پانچ سال (مجموعی طور پر) سترہ اٹھارہ سال میں جا کر کہیں اسے کٹیہ بند کیا گیا۔ اس ضمن میں پہلا حکم وہی نظر آتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اس کے نقصانات اس کے فوائد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں۔ دوسرا حکم وہ معلوم ہوتا ہے جس میں کہا گیا ہے :-

لہ ہم نے نظر آتا ہے "اور معلوم ہوتا ہے" اس لئے لکھا ہے کہ قرآنِ کریم میں مختلف آیات کے زمانہ نزول کا ذکر نہیں آیا اور روایات میں جس انداز سے اس کا ذکر آتا ہے اس سے بات واضح ہونے کے بجائے اُلٹی الجھ جاتی ہے۔ اس لئے ہمیں قرآنی احکام کے تقدم و تاخر کا تعین ان کے مفہوم کی رُو سے کرنا چاہیے۔ جیسا کہ خمر کے معاملہ میں کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَرَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ - (۳۳)

اے جماعتِ مومنین! تم نشہ کی حالت میں صلوٰۃ کے قریب بھی نہ جاؤ۔ تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ تم کہہ کیا رہے ہو؟ (حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ کی تشریحی بحث تو آگے چل کر آئے گی، یہاں صرف اتنا دیکھیے کہ) قرآن نے کہا ہے کہ تم حالتِ سُکر میں صلوٰۃ کے قریب مت جاؤ۔ اَلْسُكْرُ کے بنیادی معنی کسی چیز کو روک دینے یا بند کر دینے کے ہیں۔ اس سے یہ لفظ ہر اس کیفیت کے لئے بولا جانے لگا جس میں انسان کی عقل و ہوش کے دروازے بند ہو جائیں۔ لیکن عام طور پر اس سے مراد نشہ کی حالت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہر نشہ آور چیز آجائے گی۔ اب دیکھیے کہ مندرجہ بالا آیت میں مومنین سے خطاب ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ تم نشہ کی حالت میں اجتماعاتِ صلوٰۃ میں شریک ہونا تو ایک طرف ان کے قریب بھی نہ آؤ۔ اجتماعاتِ صلوٰۃ تو دین (اسلامی نظام) کے پروگرام کی بنیاد ہے۔ ستون ہے۔ انہیں جب (حالتِ نشہ میں) ان میں شرکت سے روکا گیا تو اس کا عملی نتیجہ یہ ہوا ہوگا کہ جن لوگوں کی ضبط خویش کی صلاحیت قوی ہوگی انہوں نے از خود خمر یا دیگر نشہ آور اشیاء کے استعمال سے اجتناب کر لیا ہوگا۔ صلوٰۃ جیسے اہم اجتماعات میں شرکت سے محرومی کو کون بآسانی برداشت کر سکتا تھا؟ اس سے ایسا نفسیاتی تغیر رونما ہوا ہوگا جس سے اس قسم کی دیرینہ طبعی عادات کے چھوڑنے میں آسانی پیدا ہوگئی ہوگی۔ اس قسم کے تدریجی مراحل سے گزرنے کے بعد بالآخر ان سے کہا گیا کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَنزَالُمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ - إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوَفِّعَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ - (۹۱-۹۰)

(سابقہ آیت میں قسموں پر قائم رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ قسموں پر قائم رہنا اس امر کی شہادت ہے کہ تمہارا عزم و ارادہ محکم ہے۔ تمہاری قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ بہت مضبوط ہے۔ اس سے سیرت میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہر وہ کام جس سے عقل و فکر ماؤف، حوصلہ اور مہمت پست، اور عزم و ارادہ کمزور ہو جائے اس قابل ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے) مثلاً، خمر، میسرہ، انصاف، الزام (جن کا ذکر ۲/۱۹۱ میں آچکا ہے) ایسے کام ہیں جن سے معاشرہ میں تخریب پیدا ہوتی ہے اور انسان کے قلب و دماغ

کی صلاحیتیں ماؤف ہو جاتی ہیں (یہ)۔ لہذا تم ان سے اجتناب کرو تاکہ یہ تمہاری کامیابی کے راستے میں روڑا بن کر نہ اٹک جائیں۔

اگر تم اپنے پست جذبات کی تسکین کے لئے خمر اور میسرہ جیسی عادات پر اُتر آئے تو یہ چیزیں (انفرادی کمزوری پیدا کرنے کے علاوہ) تم میں باہمی عداوت اور کینہ پیدا کر دیں گی اور قوانین خداوندی کو پیش نظر رکھنے اور نظام صلوٰۃ کے قائم کرنے سے تمہیں روک دیں گی۔ کیا اس قدر وضاحت کے بعد بھی تم ان چیزوں سے باز نہیں رہو گے۔

(انصاب اور ازالام کے متعلق گفتگو بعد میں کی جائے گی۔ یہاں اتنا دیکھیے کہ) خمر اور میسرہ کو رجس کہا ہے اور عَمَلِ الشَّيْطٰن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رَجَس کے معنی ہوتے ہیں شک، تردد، التباس اور معاملات کا اس طرح گڈمڈ ہو جانا کہ صحیح بات سامنے نہ آ سکے۔ الجھاؤ (CONFUSION) پیدا ہو جاتا۔ اس قسم کے شکوک و التباس کا فطری نتیجہ اضطرابِ قلب ہوتا ہے۔ اس لئے رَجَس میں یہ سب کچھ آ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کے معانی خود واضح کر دیئے ہیں جہاں کہا ہے کہ وَيَجْعَلُ الرَّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ۔ (یہ) جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان پر (CONFUSION) طاری رہتی ہے۔ ان کے سامنے معاملات گڈمڈ رہتے ہیں۔ کوئی بات صاف اور نکھری ہوئی نہیں ہوتی۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم نے خمر کے استعمال کا نتیجہ جو رجس بتایا ہے تو اس سے کیسی عمیق حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔

پھر اسے ”عملِ الشیطان“ بتایا ہے۔ اس سے تو قرآن نے شرابی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ شیطن کے معنی شعلوں کا بھڑک اٹھنا۔ شدت پیدا ہو جانا۔ سرکش ہو جانا۔ انانیت کا مجسم بن جانا وغیرہ ہوتے ہیں۔ شراب کے نشہ کا فطری نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ شراب کے نشہ میں دھت انسان اپنے آپ کو ”میں“ نہیں کہتا۔ ”میں“ کہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس حالت میں اس کا (EGO) کس قدر دیوہیکل اور جتاتی ہو جاتا ہے۔ وہ شخص ہمہ تن الیغوبن جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ انانیت اور سرکشی ہوتا ہے۔ یعنی وہ عقل و ہوش کھو بیٹھتا ہے اور ہمہ تن شعلہ صفت انانیت کا پیکر بن جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ باہمی بغض و عداوت کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ پھر کہاں کا ذکر اللہ اور کہاں کی صلوٰۃ۔

یہ سب کچھ گنانے کے بعد جماعتِ مومنین سے کہا کہ بتاؤ کیا تم اس کے بعد بھی اس بد عادت کو نہیں چھوڑو گے؟ ان میں سے کون ہو گا جو اس کے بعد یہ کہنے کی جرأت کرے کہ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ جماعتِ مومنین سے اس

کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا !

ہمارے ہاں کے بعض کٹ چھتے (یعنی جن کے دل میں چور ہوتا ہے اور وہ دل کی بات زبان پر لانے کی جرأت نہیں کر سکتے) اکثر کہا کرتے ہیں کہ شراب کو خدا نے "حرام" قرار نہیں دیا اس لئے اس کا پینا کچھ ایسا سنگین جرم نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ قرآن کریم نے حلال اور حرام کو (علاوہ اخلاقی خباثت کے) کھانے پینے کی چیزوں تک محدود رکھا ہے (لحم خنزیر، مردار، دم مسفوح، غیر اللہ کی طرف منسوب اشیاء، شراب (خمر) چونکہ کھانے پینے کی اشیاء (غذا یا خوراک) میں داخل نہیں اسی لئے اسے اس فہرست میں شامل نہیں کیا۔ باقی رہی اس کی مانعت تو جس چیز کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہو کہ وہ

(۱) رجس ہے۔

(۲) شیطانی فعل (عمل الشیطان) ہے۔

(۳) اس سے باہمی بغض اور عداوت پیدا ہوتے ہیں۔

(۴) یہ ذکر اللہ اور صلوٰۃ کے راستے میں روک بن جاتی ہے۔

(۵) اس سے قوائے عملیہ اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مضحل ہو جاتی ہیں۔

اور اس کے بعد کہا کہ اس سے اجتناب کرو۔ ایسا نہ کرو گے تو تم فلاح نہیں پاسکو گے۔ اور آخر میں کہا کہ بناؤ! تم اسے چھوڑنے ہو یا نہیں۔ ہل انتہ منتھون ؟

فرمائیے کہ اس کے خلاف اسلام قرار دینے جانے کے لئے اور کون سے الفاظ کی ضرورت تھی ؟ لفظ حرام میں کون سا ہم پوشیدہ ہے جس سے ڈر کر شراب کے رسیا اسے چھوڑ دیتے۔ قرآن کریم نے فواحش کو حرام قرار دیا ہے۔ (۱۱۶) ہم میں سے کتنے ہیں جو اس کے بعد بے حیائی کی باتوں سے مجتنب رہتے ہیں ؟ سو سوال الفاظ کا نہیں سوال ایمان کا ہے جس شخص کا اس پر ایمان ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے ممنوع قرار دیا ہے ان کا چھوڑ دینا ضروری ہے۔ وہ انہیں چھوڑ دے گا، خواہ اس کے الفاظ کوئی سے بھی کیوں نہ آئے ہوں۔

ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ قرآن کریم نے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے جس میں ہر نشہ آور شے آ جاتی ہے۔ اسلامی مملکت جب اسے قانوناً ممنوع اور اس کے استعمال کو جرم قرار دے گی تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس کی وضاحت کرے۔ اسے (DEFINE) کرے کہ خمر سے مراد کیا ہے اور اس میں کیا چیزیں شامل ہیں اصولاً جب بھی کسی شے یا عمل کو قانونی حیثیت دی جائے تو اس کا (DEFINE) کرنا قانونی تقاضا ہوتا ہے۔ مجھے

اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت اس لئے بھی پیش آئی کہ حال ہی (۱۹۷۷ء) میں حکومت پاکستان نے شراب کو قانوناً ممنوع قرار دیا اور اس کے استعمال کو مستوجب سزا و جرم ٹھہرایا ہے لیکن انہوں نے اسے (DEFINE) نہیں کیا کہ شراب سے مراد کون سی شے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب اس قانون کی خلاف ورزی کے احکامات عدالت کے سامنے آئیں گے تو وہاں یہ سوال ضرور اٹھے گا کہ جس چیز سے منع کیا گیا ہے وہ ہے کیا؟ محض شراب کہہ دینے سے تو قانونی تقاضا پورا نہیں ہو سکے گا۔ قرآن کریم نے جن امور کی تفصیل خود بیان نہیں کی، ان کی تفصیل کا تعین اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔

یہ تو رہی اس کی قانونی حیثیت۔ جہاں تک اس کی معنویت کا تعلق ہے اس کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ خمر وہ ہے جس سے انسان کی عقل و فکر، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مسلوب یا مضلل ہو جائے۔ آپ سوچئے کہ اس میں کیا کیا باتیں نہیں آجاتیں۔ سب سے پہلے تو ”مذہب“ ہے جس میں سوچنے سمجھنے کو گناہ اور ابلیس کی روش قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں ہر عقیدہ کو بلا سوچے سمجھے ماننا اور اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنا ہوتا ہے۔ کیا یہ چیز خمر کی معنویت میں شامل نہیں ہو جاتی؟ — بلکہ اس سے بھی شدید تر شکل میں نشہ کی حالت میں عقل و فکر عارضی طور پر معطل ہوتی ہے لیکن ”مذہبیت“ میں یہ صلاحیتیں مستقلاً مفلوج ہو جاتی ہیں۔

مذہب سے آگے بڑھتے تو کیا دولت کا نشہ، حکومت اور اقتدار کا نشہ، لیڈرشپ کا نشہ — انسانوں کو بدست اور مدہوش نہیں کر دیتا؟

قرآن کریم نے ان تمام نشوں کو خلاف شرفِ انسانیت فلہذا عمل الشیطان قرار دیا ہے۔ قرآن کریم میں

جنت کی شراب | شراب ہر پینے والی چیز کو کہا جاتا ہے۔ یعنی مشروب۔ قرآن مجید نے اس کے لئے طہور کے

لفظ کا اضافہ کر کے بتا دیا کہ یہ مشروبات بھی پاکیزہ ہوں گے (۳۸/۳۹)۔ سورہ محمد میں : اَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرِ لَذَّةٍ لِلْشَّارِبِینَ۔ آیا ہے۔ (۴۷)۔ لیکن وہاں بات ہی یوں شروع کی گئی ہے : مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُونَ۔۔۔ (۴۸)۔ جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی مثال یوں سمجھو۔۔۔۔۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ یہ سب بیان تمثیلی ہے حقیقی نہیں۔ اس لئے ان الفاظ کے معنی مجازی لینے چاہئیں نہ کہ حقیقی۔ اس تمثیلی بیان کی وضاحت بھی یہ کہہ کر دی کہ لَا نَخْوَ فِیْہَا وَلَا تَأْتِیْہُمْ۔ (۵۲)۔ ان مشروبات سے نہ تو کوئی لغو بات ظہور میں آئے گی اور نہ ہی اضمحلال پیدا ہوگا۔ دنیاوی شراب (خمر) کا نتیجہ تو اٹم بتایا تھا۔ ۲/۱۹

جنت کے مشروبات کے متعلق یہ کہہ کر کہ ان کا نتیجہ اٹم نہیں ہوگا انہیں دنیاوی مشروبات سے متمیز کر دیا۔ (جنت کے تمثیلی بیان کے متعلق جلد اول ص ۳۳۲ زیر آیت (۲/۲۵) بحث ہو چکی ہے)

(۰)

اور آخر میں وہ نکتہ جسے ہم نے شروع میں منتظر و صاحت رکھا تھا۔ کہا یہ گیا ہے کہ
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَ أَنْتُمْ سُكَرَىٰ حَتَّى تَعْلَمُوا
مَا تَقُولُونَ - (۲/۲۳)

اے جماعتِ مومنین! تم حالتِ نشہ میں صلوٰۃ کے قریب تک نہ جاؤ۔ تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

اس کے اولین مخاطب عرب تھے۔ اس لئے وہ نشہ کی حالت میں اذکارِ صلوٰۃ کے الفاظ تو (اپنی زبان میں) بولتے تھے لیکن (نشہ کی وجہ سے) ان الفاظ کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے تھے۔ لہذا، اس حکم کا مفہوم یہ ہوا کہ جس شخص کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ نماز میں جو الفاظ بول رہا ہے ان کا مفہوم کیا ہے، اس کا نماز پڑھنا بے معنی ہے۔ اسے اس سے روک دیا گیا ہے۔ اس کی روشنی میں آپ سوچتے کہ ہمارے ہاں جو نمازیں (عام طور پر) پڑھی جاتی ہیں ان میں نمازی کو معلوم ہی نہیں ہوتا جو الفاظ وہ بول رہا ہے ان کا مفہوم کیا ہے۔ کیا وہ بھی اس ذیل میں نہیں آتے؟ ان الفاظ کا دہراتے رہنا جن کا مفہوم اور مطلب انسان نہیں سمجھتا، کیا فائدہ دے سکتا ہے؟ اس کا اطلاق بلا سمجھے قرآن مجید کی تلاوت پر بھی ہوگا۔ اس کے متعلق جلد دوم ص ۳۳۹ زیر آیت (۲/۲۵) بات ہو چکی ہے۔ محض الفاظ کے (بلا سمجھے) دہرانے میں کوئی تاثیر مفہم سمجھنا (خواہ اس کا نام ثواب ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے) سحر کی بنیاد ہے۔ اس کے متعلق جلد دوم زیر آیت (۲/۲۳) پر بڑی تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔

مقصود اس تنبیہ سے یہ ہے کہ قرآن کریم اُسی فریضہ کی ادائیگی کو قابلِ قبول اور نتائجِ خیر قرار دیتا ہے جس میں "تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ" کی شرط پوری ہوتی ہو۔ یعنی جو کیا جائے اس کا مطلب سمجھ میں آ رہا ہو۔

(۰)

آیت زیر نظر (۲/۲۱) میں کہا گیا تھا کہ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ - خمر کی بات ہو چکی۔ اب

میسرہ کی طرف آئیے۔ اس کا مادہ (ی - س - ر) ہے جس کے معنی سہولت یا آسانی کے

میسرہ

ہیں۔ یہی سے لفظ یسار ہے جس کے معنی بائیں ہاتھ کے ہیں۔ ہمارے ہاں جو کہتے ہیں کہ

یہ تو میرے باتیں ہاتھ کاکیل ہے۔ اس سے میسرہ کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یعنی وہ دولت جو محنت و مشقت کے بغیر آسانی سے ہاتھ آجاتے۔ اس میں سارا نظام سرمایہ داری آجاتا ہے جس میں محنت اور مشقت کوئی اور کرتا ہے، اور سرمایہ دار محض اپنے سرمایہ کے بل پر بلا محنت و مشقت اس کے ماحصل کو سمیٹ کر لے جاتا ہے۔ اس قسم کی تمام دولت "میسرہ" کے ضمن میں آجاتی ہے۔ قرآن اُس یُسْر کو جائز قرار دیتا ہے جو عُسْر (محنت و مشقت) کے بعد حاصل ہو۔ (۹۴/۵) لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى۔ (۳۳/۵) کا بھی یہی مفہوم ہے۔ یعنی ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل ہی کا حقدار ہے۔

لیکن عرب اس لفظ (میسرہ) کو جوئے (قمار بازی) کے لئے بھی استعمال کرتے تھے۔ اس میں دونوں باتیں آجاتی ہیں یعنی عقل و فکر کا موقوف ہو جانا اور بلا محنت و مشقت دولت حاصل کرنے کی خواہش۔ جوئے میں عقل و فکر کا دخل ہی نہیں ہوتا۔ اسی لئے اسے (GAME OF CHANCE) کہتے ہیں۔ (CHANCE) کے معنی ہوتے ہیں وہ جس میں انسانی تدبیر یا عقل و فکر کا کوئی دخل نہ ہو۔ وہ محض اتفاقاً ہاتھ آجاتے۔ اس سے خمر کا تعلق واضح ہے۔ یہ تو خمر کے نشہ سے کہیں بڑھ کر مدہوش کن ہو جاتا ہے۔ یہ جنون کی حد تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ اسی لئے عرب اسے قمار کہتے تھے۔ یعنی جنون۔ قمار باز کا جنون دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کا جذبہ؟ بلا محنت و مشقت دوسرے کی دولت حاصل کر لینا۔ قرآن کریم نے سود و خوار کے متعلق کہا ہے کہ اس کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے کسی کو سانپ نے ڈس لیا ہو اور وہ مغبوط الحواسی کے عالم میں مضطرب و بے قرار ہو (كَمَا يَقْوُمُ الَّذِي يَخْبِطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ)۔ یہی حالت جاری ہے کی ہوتی ہے۔ وہ دوسرے کا مال چھیننے کی ہوس میں پاگل ہو رہا ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے خمر اور میسرہ دونوں کو ایک زمرہ (CATEGORY) میں رکھا ہے۔ اس ضمن میں آیات (۹۱/۵-۹۰/۵) دیکھیے جو خمر کے ضمن میں پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ ان سے انسان حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ یہ رَجَسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ہیں۔ ان سے باہمی بغض و عداوت پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ذکر اللہ اور صلوٰۃ کے راستے میں روک بن کر حائل ہو جاتے ہیں۔ لہذا ان کے قریب بھی جانا جائیے۔

آیات (۹۱/۵-۹۰/۵) میں خمر اور میسرہ کے علاوہ انصاب اور ازلام کا بھی ذکر آیا ہے۔ انصاب کی تو قرآن کریم

انصاب نے یہ کہہ کر وضاحت کر دی مَا ذَرِجَ عَلَى النَّصَبِ۔ (۵/۵) جو کچھ غیر اللہ کے استھانوں پر

لہ قمار قریب سے جس کے معنی چاند کے ہیں۔ قمر (چاند) کے ساتھ جنون کا تعلق بڑا قدیمی ہے۔ انگریزی زبان میں LUNATIC

کا لفظ اسی پر شاہ ہے۔

چڑھاوا چڑھانے کے لئے ذبح کیا جاتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غیر اللہ کی طرف نسبت سے یہ شرک ہوگا۔ لیکن آپ ذرا گہرائی میں جا کر دیکھیں گے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اس میں بھی خمر اور میسرہ کا پہلو مضمر ہوتا ہے۔ چڑھاوے چڑھانے میں عقل و فکر کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اندھی عقیدت کا رہنما ہوتی ہے اور چڑھاوے بیشتر اس مقصد کے لئے چڑھائے جاتے ہیں کہ آپ کی مراد محنت و مشقت کے بغیر لوپری ہو جائے۔ چڑھاوا بھی قمار باز کا پھینکا ہوا پانسہ ہوتا ہے کہ یا تو جو کچھ ہاتھ سے دیا ہے وہ بھی جاتا رہا اور یا وہ گوہر مراد ساتھ لے کر واپس آیا۔ قرآن کریم نے اسے بھی ممنوع قرار دیا ہے۔

ازلام

ازلام وہ تیرتھے جن سے عرب قرعے ڈالتے، فالیں لیتے اور چڑھاوے کا گوشت تقسیم کرتے تھے۔ فالیں لینے اور قرعے ڈالنے میں بھی خمر اور میسرہ کا پہلو سامنے آجاتا ہے۔ یعنی عقل و فکر سے کام نہ لینا، اور محض اتفاقات (CHANCES) کی رو سے فیصلے کرنا۔ قرآن کریم کا پیش کردہ بنیادی نظریہ یہ ہے کہ جو معاملہ درپیش ہو انسان اس کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرے۔ عقل و فکر کی رو سے اس کے ہر پہلو پر غور کرے اور اس کے بعد قرآن کریم کی روشنی میں اس کے متعلق فیصلہ کرے۔ قرآن کریم نے عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو جہنم کے کندے اور حیوانات سے بدتر قرار دیا ہے (۱۱۲/۱)۔ لیکن قرآن کو سر آنکھوں پر رکھنے اور ایک ایک رات میں اسے دہرانے والی قوم کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے فیصلوں کے لئے قرعے ڈالتی، لاٹریاں نکالتی، فالیں لیتی اور استخارے کرتی ہے۔ خمر اور میسرہ کو تو سخت معیوب اور مذموم سمجھا جاتا ہے لیکن فالیں لینے اور استخارے کرنے کو نہایت مقدس قرار دیا جاتا اور جن کی طرف ان مقاصد کے لئے رجوع کیا جاتا ہے انہیں نہایت کے مقام بلند پر فائز خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کمیشن بٹھائے جاتے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہمارے زوال کے اسباب کیا ہیں؟ کیا قرآن مجید نے ان تمام امور کا نتیجہ اٹھ کر قرار دے کر قوموں کے زوال کے بنیادی سبب کی پردہ کشائی نہیں کر دی؟ یعنی یہ تمام امور ایسے ہیں جن سے قوائے فکر یہ اور عملیہ مفلوج اور مسلوب ہو جاتے ہیں۔

میسرہ، ازلام، قرعے، فالیں اور استخارے تو پھر بھی کئے کرائے جاتے ہیں عقل و فکر کو موقوف کرنے کا ان سب سے بڑھ کر ایک اور عقیدہ ہے اور وہ ہے عقیدہ تقدیر جس کی رو سے نہ انسان کی عقل و فکر کچھ کام دے سکتی ہے نہ محنت و مشقت کچھ فائدہ۔ جو کچھ قسمت میں لکھا ہے از خود مل جائے گا اور جو کچھ تقدیر میں ہے خود بخود ہوتا جائیگا۔ ہمارا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔

کیا اس عقیدہ کا فطری نتیجہ شدید ترین قسم کا اثم (اضمحلال) نہیں — عقل و فکر کے لئے بھی اثم اور سعی و عمل کے لیے بھی اثم۔

لیکن خمر اور میسرہ گناہ عظیم اور قابلِ تعزیر جرم، اور تقدیر کا عقیدہ جزوِ ایمان۔
خدا ایں سخت جاں ریا را بادہ
کہ افتاد است از بام بلندے

(۱)

اس کے بعد آیت (۲/۲۱۹) کا باقی حصہ لیجیے۔ پوری آیت یوں ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنْفَعٌ
لِّلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا. وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا
يُنْفِقُونَ. قُلِ الْعَفْوَ. كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ
تَتَفَكَّرُونَ - (۲/۲۱۹)

اس مقام پر یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ نظامِ خداوندی کے قیام کی راہ میں کون کون سی چیزیں حائل ہوتی ہیں جن سے بچنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی اصولی بات یہ ہے کہ جو چیز بھی انسان کی عقل و خرد کو موقوف کر کے اس کے قوائے عملیہ کو مضلل کر دے، وہ اس نظام کی راہ میں موانعات میں سے ہے۔ ہر نشہ آور چیز اور وہ دولت جو بلا محنت و مشقت مل جائے (جس میں قمار بازی بھی شامل ہے) اس کی بہنِ مثالیں ہیں۔ ان میں اضافی طور پر منافع بھی ہے۔ لیکن ان سے انسانی ذات میں ایسی افسردگی، سہل انگاری، سستی اور اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے جو اُسے زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کے قابل ہی نہیں چھوڑتا۔ یہ نقصان ان چیزوں کے عارضی نفع کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہلاکت انگیز ہے۔

لہذا، مفت میں ہاتھ آجانے والی دولت کے پیچھے نہ پڑو۔ اپنی محنت سے کماد (۲/۲۱۳)۔ اس میں سے بقدر اپنی ضروریات کے اپنے لئے رکھو، اور جس قدر ان سے زائد ہو، سب کا سب، نوع انسان کی پرورش کے لئے، کھلا رکھو (تاکہ نظامِ خداوندی اُسے ضروری مصرف میں لاسکے)

لے عقیدہ تقدیر کے متعلق جلد اول میں بڑی تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳

اس طرح خدا اپنے احکام و قوانین کو تمہارا سے لئے واضح طور پر بیان کر دیتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو، اور سوچو

کہ تمہارا حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) دونوں کس طرح روشن ہو سکتے ہیں۔

سطح بین نگاہوں کو اس آیت کے مختلف احکام میں کوئی ربط دکھائی نہیں دے گا۔ یہی نہیں کہ انہیں کوئی ربط دکھائی نہیں دے گا وہ یہ بھی کہہ دیں گے کہ اس میں بڑی اُن جوڑ باتیں ہیں۔ خمر اور میسرہ اور ان کے ساتھ العفو (انفاق) ان کا باہمی تعلق کیا ہے؟ جیسا کہ کہا گیا ہے اس قسم کے اعتراضات سطح بینی پر مبنی ہیں۔ سطح سے ذرا نیچے اتر دیکھا جائے تو سارا قرآن مربوط نظر آئے گا۔ اس کی محسوس شہادت خود مطالب الفرقان آپ کے سامنے ہے۔ جلد اول میں قرآن کا معاشی نظام بڑی وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے۔ (دیکھیے۔ ۲ ص ۱۵۵ ذ ۲ ص ۱۶۹) اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس نظام کی آخری شکل یہ ہے کہ افراد معاشرہ (جماعتِ توہمیں کے افراد) پوری پوری تندہی سے محنت کرتے اور اس کے حاصل میں سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لے کر باقی سب بطیب

العفو کا مفہوم

کے یہی معنی ہیں۔ یعنی اپنی ضرورت سے زائد جتنا ہے وہ سب کا سب۔ زیر نظر آیت کے پہلے حصہ میں خمر اور میسرہ سے روکا گیا ہے۔ خمر کا نتیجہ عقل و ہوش کا سلب کر لینا ہے اور میسرہ اس ہوسِ نر کا مظہر جس کی رو سے انسان چاہتا ہے کہ محنت مشقت کیے بغیر دوسروں کی دولت کو ہتھ لیا جائے۔ قرآن کریم اس کے برعکس انسان میں ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ وہ جان مار کر محنت کرے اور پھر اپنی ضرورت سے زائد سب کچھ دوسروں کے لئے چھوڑ دے۔ اور ایسا کچھ پاگلوں کی طرح نہیں، بلکہ بقا تھی ہوش و حواس، عقل و بصیرت کی رو سے دل و دماغ کی کامل رضامندی کے ساتھ کرے۔ آپ نے دیکھا کہ العفو کی نفیات کس طرح خمر اور میسرہ کی کیفیت کی ضد ہے۔ خمر اور میسرہ سے اجتناب، انسانی کردار کا منفی پہلو ہے۔ یعنی اس قسم کی ذہنیت پیدا نہ ہونے دینا اور العفو اس کا مثبت پہلو ہے یعنی ایسی ذہنیت پیدا کرنا۔ پہلا گوشہ حصہ کا ہے اور دوسرا گوشہ حصہ والا۔ جب تک اول الذکر ذہنیت کو چھوڑا نہیں جاگا ثانی الذکر (مثبت) ذہنیت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ یہ کفر بالطاعت اور ایمان باللہ (۲ ص ۱۵۵) کے علی مظاہرے ہیں۔ جب تک مفت دولت ہاتھ آجانے کی ذہنیت میں تبدیلی نہیں آئے گی، اپنی محنت کی کھائی کو بطیب خاطر دوسروں کو دے دینے کی ذہنیت پیدا نہیں ہوگی۔ یہ وجہ ہے کہ نظامِ سرمایہ داری اور اسلام یک جہا نہیں رہ سکتے۔

دوسروں کے مال و دولت کو بلا کھٹکے ہضم کر لینے کی آسان ترین شکل ان میتیوں کا سر پرست بن جانا ہے جو

صاحبِ جاہِ دیا مال دار ہوں۔ ان کا سر پرست بننے میں دوہرا فائدہ ہوتا ہے۔ معاشرہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ شخص یقیوں، لاوارثوں کی پرورش کرتا ہے اس لئے مستحقِ تعریف و توصیف ہے اور وہ ان لاوارثوں کا مال اس طرح خور و مجرد کرتا رہتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہونے پاتی۔ قرآنِ کریم نے اگلی آیت میں اسی سوال کو لیا ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سوال تک آئیں ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے عقل و فکر پر جس قدر زور دیا ہے اور غور و تدبیر کی جس قدر تاکید کی ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ غور و فکر کا دائرہ دنیاوی امور تک محدود ہے۔ مابعد الطبیعیاتی مسائل (MATAPHYSICS) اس کی حدود سے ماوراء ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مابعد الطبیعیاتی امور محسوسات کے دائرے میں نہیں آتے، اس لئے مادی اشیاء کی طرح ان کا حواس (SENSES) کے ذریعے احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ ان کے متعلق بھی غور و فکر کیا جاسکتا ہے۔ آیت (۲۱۹) میں تھمر-میسرہ۔ اتفاق جیسے امور زیر بحث آئے ہیں جن کا تعلق (انظر لفظ ہر) صرف مادی دنیا سے ہے۔ اس لئے ان کے متعلق مادی نقطہ نظر سے غور و فکر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ ان کا تعلق انسان کی اُخروی زندگی سے بھی ہے۔ اس لئے کہ ان سے مقصد انسانی ذات کی نشوونما سے ہے اور انسانی ذات کا دائرہ اسی دنیا تک محدود نہیں۔ اس سے آگے بھی جاتا ہے جسے حیاتِ آخرت کہا جاتا ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں۔ آیت (۲۱۹) کے آخری الفاظ اور آیت (۲۲۰) کے ابتدائی الفاظ کو ملا کر پڑھیے تو بات یوں سامنے آئے گی کہ۔

كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ . فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ .

اس طرح اللہ اپنے احکام کو نہایت وضاحت سے نکھار کر اور ابھار کر بیان کر دیتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور و فکر کر سکو۔

مذہب، بنیادی امور میں بھی غور و فکر کو ممنوع قرار دیتا ہے (قرآنِ کریم) دنیاوی امور ہی میں نہیں، اُخروی امور تک میں غور و فکر کی تاکید کرتا ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ قُلْ إِصْلَاحٌ لَهُمْ خَيْرٌ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ
وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ إِنَّ اللَّهَ
عَزِيزٌ حَكِيمٌ - (۲/۲۲۰)

یہ نظام ہر ضرورت مند کی دستگیری کرے گا۔ ان میں خصوصیت سے وہ لوگ سامنے آتے ہیں جو دنیا میں بے یار و مددگار رہ جائیں۔ ان میں وہ بچے بھی شامل ہیں جن کے ماں باپ مر جائیں۔ ان کے معاملات کو سمجھنا موجب خیر ہے۔ اگر تم ان سے مل جل کر رہتے ہو یا ان کے معاملات میں شرکت کرتے ہو تو ہمیشہ اس کا خیال رکھو کہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔ یاد رکھو! ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں سے کون اصلاح چاہتا ہے اور کس کی نیت میں فتور ہے۔ تمہیں یہ واضح ہدایات اس لئے دی گئی ہیں کہ تمہارے لئے اصلاح کا راستہ آسان ہو جائے۔ اگر اس کا قانون مثبت ایسا نہ ہوتا تو وہ سمجھیں اس قسم کی ہدایات نہ دیتا اور اس سے تم مشکل میں پھنس جاتے۔ لیکن خدا تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے۔ (۲/۲۲۵)

لیکن آسانوں کے یہ معنی نہیں کہ تم جو چاہو کرو۔ تم پر کسی کا کنٹرول ہی نہ ہو۔ خدا کا قانون مکافات، ہر بات پر پورا غلبہ رکھتا ہے اگرچہ اس کا یہ غلبہ عین حکمت پر مبنی ہے۔

لفظ یتیم کے متعلق جلد دوم ص ۳۴۹ زیر آیت (۲/۲۲۵) میں بتایا جا چکا ہے کہ ہمارے ہاں یتیم صرف ان بچوں کو کہتے ہیں جن کے ماں باپ مر چکے ہوں لیکن عربی زبان میں اس کا مفہوم اس سے وسیع ہے۔ اس میں یتیم ہر اس فرد کو کہتے ہیں جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے یا اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے۔ اس تنہائی کے یہ معنی نہیں کہ وہ کسی لقمہ و دق صحرا میں اکیلا ہو۔ قرآن کریم کی رو سے وہ یتیم ہے جو بھرے معاشرہ میں، سینکڑوں، ہزاروں انسانوں کی موجودگی میں، اپنے آپ کو تنہا پائے۔ نہ کوئی اس کا پرسان حال ہو نہ یار و مددگار۔ قرآن کریم نے اس کے لئے بڑی جامع اصطلاح استعمال کی ہے۔ یَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ

یتیموں کے متعلق احکام

(۱/۱۰۱) یعنی وہ جو اتنے لوگوں سے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو یتیم (تنہا) پائے۔ آپ قرآن کریم کی اس نادر اصطلاح پر غور کیجئے اور پھر دیکھیے کہ ہمارے (اور دنیا بھر کے) موجود (غلط) معاشرے میں کس طرح ہر شخص اپنے آپ کو بھرے معاشرہ میں یتیم محسوس کرتا ہے!

یتیمی کا درد وہی محسوس کر سکتا ہے جس پر خود یہ مبنی ہو۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یتامی کے متعلق ہدایات اور احکام دینے سے پہلے حضور نبی اکرمؐ سے کہا کہ آپ تو جانتے ہیں کہ یتیم کیا ہوتا ہے اور یتیمی کا درد کسے کہتے ہیں کیونکہ

آپ پر خودیہ دور گزر چکا ہے۔ فرمایا: اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَآوَىٰ - (۹۳) ”کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم نے تجھے یتیم پایا، تو حفاظت اور پناہ کا سامان مہیا کر دیا؟“ اس میں دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ (تاریخ کی رو سے) حضورؐ کے والدین ابتدائی عمر میں فوت ہو گئے تھے۔ اس لئے آپؐ عرفِ عام میں یتیم ہو گئے تھے۔ دوسرے اس میں حضورؐ کے زمانہ قبل ان ہجرت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے جب آپؐ کے لئے مکہ میں پناہ کی کوئی جگہ نہیں رہ گئی تھی۔ ”فاوی“ (خدا نے تمہارے لئے حفاظت اور پناہ کا سامان فراہم کر دیا) سے مدنیہ کی ”پناہ گاہ“ کی طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے۔ انصار مدنیہ نے مہاجرین مکہ کے لئے جو کچھ کیا تھا اسے اَوَّٰی وَ نَصَرُوْا (۹۳) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بہر حال صورت کوئی بھی ہو، حضورؐ سے کہا گیا ہے کہ آپؐ تو خود یتیمی کی منزل سے گزر چکے ہیں اس لئے: فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تُقَهِّرْ (۹۴)۔ یتیموں پر کسی قسم کی سختی نہیں کرنی چاہیے۔

زیرِ نظر موضوع میں دونوں قسموں کے یتیموں کے متعلق گفتگو کی جائے گی۔ یعنی ان بچوں کے متعلق بھی جن کے ماں باپ مر چکے ہیں اور ان کے سلسلہ میں بھی جو (بلا لحاظِ عمر) اپنے آپ کو معاشرے میں بے یار و مددگار تنہا پائیں۔ پہلے اول الذکر کو لیجیے۔

سورۃ انعام میں ہے :-

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدُّهُ -

(۱۵۳ ۶/ نیز ۱۴۴)

یتیموں کے مال کو ہاتھ تک نہ لگاؤ، الا یہ کہ خود ان کے فائدے، اور نگہداشت کے لئے عمدہ طریق سے

کچھ خرچ کرنا پڑے۔ یہ بھی اس وقت تک کہ وہ جوانی کی عمر کو نہ پہنچیں۔ (۴ ز ۱۴۴)

یہاں ”اَشُدُّهُ“ کہا (یعنی جوانی کی عمر)۔ دوسری جگہ اسے ”نکاح کی عمر“ بلوغت سے تعبیر کیا ہے۔

وَابْتَٰلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا

فَاَذْفَعُوْا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَاْكُلُوْهَا اِسْرَافًا وَّيَدَارًا اَنْ

يَكْبُرُوْا وَاَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَاَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ

بِالْمَعْرُوْفِ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهَدُوْا عَلَيْهِمْ وَاَكْفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (۲۱۹)

اور مٹیوں کی بھی صحیح تربیت کرو۔ اور ان کی جانچ پڑتال کرتے رہو کہ ان کی صلاحیتوں کی کس حد تک نشوونما ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ وہ نکاح کی عمر (سن بلوغت ۱۵ ذی ۱۴) تک پہنچ جائیں۔ پھر اگر ان میں عقل کی نچنگی نظر آئے تو ان کا مال انہیں واپس دے دو (اگر یہ صورت نہ ہو تو پھر ۷ کے مطابق کرو) اور اس خیال سے کہ وہ اس سن بلوغت کو جلد پہنچ جائیں گے اور ان کا مال انہیں واپس دینا ہوگا۔ فصول خرچہ کر کے ان کا مال ہڑپ نہ کر جاؤ۔ باقی رہا ان کے مال کی حفاظت اور ان کی پرورش کا معادضہ، سوئم میں سے جو ضرورت مند نہ ہو، اسے کچھ نہیں لینا چاہیے لیکن جو ضرورت مند ہو (یعنی ان کی جائیداد کے انتظام کے لئے اسے جو وقت صرف کرنا پڑے، اس سے اس کی اپنی آمدنی پر اثر پڑتا ہو اور اس طرح وہ تنگ دست ہو جاتے) تو وہ قاعدے اور قانون کی مطابق حق الخدمت لے لیا کرے۔ پھر جب تم ان کا مال ان کے سپرد کرنے لگو، تو اس پر گواہ لے لیا کرو۔ اور حساب فہمی کے وقت اس حقیقت کو سامنے رکھو کہ تم یہ حساب خدا کو دے رہے ہو جو ظاہر اور پوشیدہ ہر بات سے واقف ہے، اس لئے ٹھیک ٹھیک حساب لینے والا ہے۔

اس سے ذرا پہلے ہے :-

وَاتُّوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا الْخَيْبَتِ بِالنَّطِيبِ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ
إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا - (۲۲)

یتیموں کا مال و اسباب بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھو۔ ایسا نہ کرو کہ ان کی اچھی اچھی چیزیں اپنی نیکی چیزوں سے بدل لو۔ ان کا مال الگ رکھو، اپنا مال الگ۔ ان کے مال میں خرد بُر نہ کرنا بڑی بے انصافی کی بات ہے (اور جیسا کہ دوسری جگہ کہا گیا ہے) ان کا مال انہیں بحفاظت لوٹا دو۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل احکام کی شدت ملاحظہ فرمائیے۔ پہلے کہا کہ تقسیم وراثت کے وقت اگر کوئی ایسے یتیم بچے سامنے آجائیں جن کا ترکہ میں کوئی حصہ نہ ہو تو از روئے مِلَافَت انہیں بھی کچھ دے دو اور نرمی سے سمجھا دو کہ صلہ پوزیشن کیا ہے :-

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينُ فَأَرْتُوا قُوَّهُمْ مِنْهُ وَ

۳۲۹ (فٹ نوٹ) ان آیات میں ”بلغوا النکاح“ اور ”اشدّہ“ کے الفاظ اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کیونکہ (آگے چل کر) عائلی قوانین کے سلسلہ میں ان سے بڑا اہم نکتہ مستنبط ہوگا۔

قُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا - (۳۲)

اگر تقسیم وراثت کے وقت ایسے رشتہ دار بھی موجود ہوں جن کا ترکہ میں حصہ نہ ہو یا دوسرے یتیم اور مساکین، تو انہیں بھی اس میں سے کچھ دے دو اور مناسب طور پر سمجھا دو کہ ترکہ کی تقسیم قانون اور قاعدے کے مطابق ہوگی جس کی رو سے انہیں بطور حق کچھ نہیں مل سکتا جو کچھ انہیں دیا گیا ہے، محض ان کی دلجوئی کی خاطر ہے۔ اس کے بعد ہے:-

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكَوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعْفًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَالْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا - (۳۳)

ترکہ کی تقسیم صحیح قاعدے کے مطابق کرنی چاہیے، اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے کہ اگر تم بھی اپنے پیچھے ناتوان اولاد چھوڑ جاؤ تو تم کبھی نہیں چاہو گے کہ ان سے بے انصافی ہو۔ لہذا تم قانون خداوندی کی نگہداشت کرو اور ان معاملات میں ایسی بات کرو جو بالکل صاف، سیدھی اور محکم ہو۔

اور پھر وہ وعید جس کی رو سے کہا کہ

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَ سَيَصْلُونَ سَعِيرًا - (۳۴)

یاد رکھو! جو لوگ ظلم اور نا انصافی سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں، ان کے متعلق یوں سمجھو گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں جس سے ان کے جذبات حرص و ہوس اور بھڑک اُٹھتے ہیں۔ ان کی نیت نہیں بھرتی اور وہ ناجائز دولت کے پیچھے پاگلوں کی طرح مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ اس سے ان کی انسانی صلاحیتیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہیں۔

قرآن کریم نے جہاں احسان کا حکم دیا ہے۔ یعنی دوسروں کی کمی پوری کرنے کا۔ اس میں یتیموں کا ذکر خاص طور پر کیا ہے: **وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ (سُورہ زمرہ: ۱۷) والدین، ذی القربی، یتامی اور مساکین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔** دوسری جگہ کہا کہ اصل کشادگی راہ یہ ہے کہ **وَالْقِيَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ (سُورہ بقرہ: ۱۷۷) مال کی محبت کے علی الرغم اسے یتامی وغیرہ کی ضرورت پوری کرنے کے لئے دیا جائے** حتیٰ کہ مال غنیمت کے خمس (پانچویں حصہ) کے متعلق کہا کہ

فَاتَّ لِلّٰهِ خُمُسُهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنَ
السَّبِيْلِ - (۵۹ ذ ۵۸)

یا درکھو! میدان جنگ میں جو مال غنیمت بھی ملے گا، اس میں سے پانچواں حصہ خدا اور رسولؐ — یعنی مملکت کی انتظامی ضروریات کے لئے رکھ کر باقی ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے میں صرف کیا جائے گا۔ مثلاً (میدان جنگ میں جانے والوں، اور کام آجانے والوں کے) اقرباء کے لئے یتیموں اور معاشرہ میں بے یارو مددگار تنہا رہ جانے والوں کے لئے۔ ان کے لئے جن کا چلتا ہوا کاروبار روک گیا ہو یا جو کسی حادثہ کی وجہ سے کام کاج کے قابل نہ رہے ہوں۔ نیز ان مسافروں کے لئے جو مدد کے محتاج ہوں۔

(۰)

اب یتیمی کی دوسری صورت کی طرف آئیے۔ یعنی معاشرہ میں تنہا رہ جانے والے۔ اپنے آپ کو بے یارو مددگار محسوس کرنے والے۔ دیکھیے، اس باب میں قرآن مجید کن کن گوشوں سے بے یارو مددگار حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ سورۃ الفجر میں ہے کہ انسان بڑا عجبت پسند اور تلون مزاج واقعہ ہوا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ قَامَا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهُ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ مَرٰبِئِیْ اَكْرَمَنِ - (۵۹) جب اس کی زندگی خوشگوار پہلو بدلتی ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ خوشگواریاں کن اسباب کا نتیجہ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ خدا کی دین ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عزت و آسائش عطا کر دیتا ہے: وَ اَمَّا اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَکْهٰنِ - (۵۹) جب اس کی زندگی دوسرا پہلو بدلتی ہے اور اس پر رزق کی تنگی ہو جاتی ہے تو وہ چیخنے چلانے لگ جاتا ہے کہ خدا نے مجھے خواہ مخواہ ناحق، بلا وجہ، ذلیل و خوار کر دیا، یعنی بلا استحقاق آسائشیں حاصل ہو جائیں تو اسے قابل اعتراض نہیں سمجھتا لیکن اگر (بزرگم خویش) بلا سبب تنگی آجائے تو اس پر چیخنے لگ جاتا ہے۔ اس کے جواب میں خدا کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ خدا کے متعلق تمہارا یہ تصور غلط ہے۔ اس کے ہاں تمام فیصلے قاعدے قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔ وہاں سے نہ کسی کو بلا استحقاق کچھ ملتا ہے، نہ بلا سبب چھینا جاتا ہے۔ لہذا، تم جو ذلیل ہوئے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے

لہ نبوت اس سے مستثنیٰ تھی۔ یعنی وہ کسی کو حق کے طور پر نہیں ملتی تھی۔ وہ خدا کی موبہبت ہوتی تھی۔ لیکن اس کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔

کہ تم نے ایسا معاشرہ قائم کر رکھا تھا، جس میں ان لوگوں کو کوئی پوچھتا نہیں تھا، ان کی کوئی عزت نہیں کرتا تھا، جو تنہا رہ جائیں۔ كَلَّا بَلْ لَّا تُشْكِرُ مَوْنَ الْيَتِيمَ۔ (۹۹)

غور کیجیے کہ یہاں قرآن کریم نے دو لفظوں میں کس قدر عظیم حقیقت کو واشگاف کر دیا ہے۔ عہدِ قدیم کا وحشی ابنِ آدم ہو یا دورِ حاضرہ کا مہذب انسان۔ اس کے ہاں معیار یہ چلا آ رہا ہے کہ عزت اس کی ہوتی ہے جس کا جھگہ بڑا ہو۔ جس کی پارٹی مضبوط ہو۔ عزت تو ایک طرف۔ عہدِ حاضر کے نظامِ جمہوریت میں حق و باطل تک کا معیار اکثریت اور اقلیت قرار پاتا ہے۔ جس پارٹی کی اکثریت ہو اقتدار بھی اس کا حق اور فیصلے بھی اس کے مبنی بر عدل و صداقت۔ اقلیت کو اس کے تابع فرمان رہنا پڑتا ہے۔ جب معاشرہ میں اقلیت کی یہ کیفیت ہو تو ظاہر ہے کہ جو شخص تنہا رہ جائے، جس کے دست و بازو نہ رہیں۔ اسے کون پوچھے گا؟ ایسے شخص کو قرآن نے ”یتیم“ کہہ کر پکارا ہے اور کہا ہے کہ جس معاشرہ میں یتیم کی عزت نہ ہوتی ہو وہ آخر الامر تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

سورة البلد میں اس نے اس حقیقت کو ایک اور انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ دین کے نظام میں

قرآن کا معاشی نظام | بے شک قوم کو سرفرازیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان سرفرازیوں کے لئے ایک تو بڑی محنت اور مشقت کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسرے ان تک تبدیل

پہنچا جاسکتا ہے۔ اس نے اسی لئے اُسے العقبة کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا۔ اس کے بعد کہا کہ وَمَا اَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ (۹۱) تم خود نہیں سمجھ سکتے کہ ”العقبة“ کیا ہے۔ اَدْرَاکَ نہیں ہم سمجھائیں کہ ”العقبة“ کیا ہے۔ فَكَرَبَةٍ (۹۲) دنیا سے غلامی اور محکومی کی لعنت کو ختم کرنا۔ ہر محکوم اور غلام کی گردن میں پڑی ہوئی زنجیر کو کاٹ پھینکنا۔ اَوْ اِطْعَمُ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ (۹۳)۔ جس زمانے میں مستبد قوتیں رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھ جائیں اور اس طرح غریبوں اور محتاجوں پر رزق کے دروازے بند ہو جائیں۔ ایسی حالت میں سامانِ زیست مہیا کرنا۔ کس کے لئے مہیا کرنا؟ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (۹۴) ان کے لئے جو ہزاروں، لاکھوں انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو ”یتیم“ محسوس کریں اَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ (۹۵) یا ان محنت کشوں کے لئے جو محض روٹی کے بکڑے کی خاطر مٹی میں روتے رہیں۔ یہ ہے ”العقبة“ دین کی گھاٹی پر چڑھنا۔ !

یہ ہے الدین — دوسری طرف وہ ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے جو دین کا انکار تو نہیں کرتے لیکن عملاً اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ یعنی زبان سے اپنے

تکذیب دین کر نبوالے

مومن اور مسلمان ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ لیکن عملاً اس انداز کی زندگی بسر کرتے ہیں جو ان کے اس دعوائی ایمان کی قدم قدم پر تکذیب کرتی ہے۔ اس نے اس حقیقت کو سورۃ الماعون میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے ضروری سمجھا کہ اسے پورے کا پورا درج کر دیا جائے۔ جہاں تک یتامیٰ کا تعلق ہے اس میں کہا گیا ہے۔

أَمَّا يَتِ الَّذِينَ يُكْذِبُ بِالْآيَاتِ - فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيمَ - وَلَا يَحْصُنْ عَلَى طَعَامِ الْمَسْكِينِ - قَوْلًا لِّلْمَصْلِيِّينَ - الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ - الَّذِينَ هُمْ يُرَآعُونَ - وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ - (۲۱)

کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو زبان سے تو اسلام کا اقرار کرتا ہے لیکن عملاً دین کی تکذیب کرتا ہے۔ یعنی اس کا طرز عمل اس امر کی دلیل ہے کہ اگر دین داری یہی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا ہے تو پھر دین کا ہر دعویٰ جھوٹا ہے۔

(دین کا مقصد یہ تھا کہ معاشرہ میں جو شخص بے یار و مددگار رہ جائے اسے محسوس تک نہ ہونے پائے کہ وہ تنہا اور بے کس ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے کسی کی کوئی ضرورت ٹوک جائے تو اُسے فوراً پورا کر دیا جائے۔ لیکن) اس دیندار کی حالت یہ ہے کہ جو شخص بے یار و مددگار رہ جائے، یہ اُسے دھکے دیتا ہے اور محتاجوں کی مدد نہ خود کرتا ہے۔ نہ دوسروں کو ایسا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ (۲۱)

کام تو ایسے کرتا ہے لیکن اپنے آپ کو ”دیندار“ ظاہر کرنے کے لئے نمازیں بہت پڑھتا ہے۔ اسی قسم کے نمازی ہیں جن کی نمازیں ان کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ نمازیں پڑھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں (یا دوسروں کو فریب دیتے ہیں) کہ یہ بڑے متقی، پرہیزگار ہیں۔ انہیں اس کا پتہ ہی نہیں کہ صلوٰۃ کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد تھا ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افراد قوانین خداوندی کا اتباع کریں۔ اور عالمگیر انسانیت کو سامانِ نشوونما بہم پہنچا رہے۔ یہ صلوٰۃ کی اس غرض و غایت سے تو غافل رہتے ہیں اور اس کے محسوس ارکان (قیام، رکوع، سجود وغیرہ کی ادائیگی کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ ہم فریضہ خداوندی سے سبکدوش ہو گئے۔) (۲۱)

ان کی اس خود فریبی کا نتیجہ ہے کہ یہ ایک طرف نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور دوسری طرف رذق کے ان سرچشموں پر جنہیں بچنے پانی کی طرح ہر ایک کی ضروریات کے لئے کھلا رہنا چاہیے، بند لگا کر، ان پر اپنا

قبضہ جالیٹے ہیں اور اس طرح ضرورت مندوں کو سامانِ زیست سے محروم کر دیتے ہیں۔ (یوں یہ تکذیبِ دین کرتے اور ننگِ اسلام بنتے ہیں)۔

ان کے برعکس، ان لوگوں کی زندگی ہے جو جنت کے مستحق ہیں۔ ان کی روش یہ ہے کہ وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حَيْثُهِمْ مَسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (۲۲۰) جو لوگ حرکت سے معذور ہو جائیں، یا جو معاشرہ میں بے یار و مددگار رہ جائیں، وہ ایسا انتظام کرتے ہیں کہ وہ سامانِ زیست سے محروم نہ رہنے پائیں۔

(۱۰)

یہ ہیں وہ احکام و ہدایات جو اللہ تعالیٰ نے یتیمی کے متعلق نازل فرمائی ہیں۔ ان سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآنِ کریم ان کے لئے ایسا ب حفاظت اور سامانِ رزق ہی کی تاکید نہیں کرتا بلکہ ایسا معاشرہ متشکل کرنے کی تاکید کرتا ہے جس میں ان کی برابر کی عزت و تکریم ہو۔ اس نقطہ نگاہ سے آیہ زیرِ نظر (۲۲۰) کے ایک گہرے پردہ نگاہ ڈالیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ وَإِنْ تَخَالَطَوْهُمْ فَاَوْحُوا مِنْكُمْ، عام طور پر اس کا مفہوم ”کاروبار میں شرکت“ لیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔ یتیم اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے کہ اسے اپنے ساتھ ملا لو۔ اسے معاشرہ کا جزو بنا لو۔ وہ تمہارے اندر گھل مل جائے۔ اس انداز سے گھل مل جائے کہ اس کی حیثیت تمہارے بھائیوں کی سی ہو جائے۔ تم اسے اپنا بھائی سمجھو وہ تمہیں اپنا بھائی سمجھے۔ اس طرح اس کی تنہائی کا احساس مٹ جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنا تھا تو یہ معاشرہ میں فساد کی حالت تھی۔ جب وہ تم میں سے ہو جائے گا تو یہ معاشرہ کی اصلاح یافتہ شکل ہو جائے گی۔

یہ بھی اصلاح کی وہ شکل جو قرآنِ کریم نے تجویز کی تھی۔ لیکن اس کے برعکس ہماری کیا حالت ہے، اس کے متعلق کیا کہا جاتے؟ ہمارے ہاں جو سوختہ بخت تنہا اور کمزور رہ جاتے اسے کس بُری طرح کچلا جاتا ہے، وہ ہمارا روزمرہ کا مشاغل ہے۔ باقی رہے یتیم بچے، سوا انہیں یتیم خانوں میں داخل کر کے ان کے جوہر انسانیت کی جس طرح تذلیل کی جاتی ہے، وہ کس سے پوشیدہ ہے؟ انہیں مستقلاً احتیاج، گداگری اور نفرت و حقارت کے ماحول میں رکھ کر بیسیوں قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں (COMPLEXES) کی آماجگاہ بنا دیا جاتا ہے وہ جن کی عزت کرنے کا قرآن نے حکم دیا تھا، معاشرہ کی ذلیل ترین مخلوق بن جاتی ہے۔

یاد رکھیے! جس معاشرہ میں کسی ایک فرد کی بھی عزت نفس پر حرف آجائے وہ معاشرہ اسلامی نہیں رہتا۔ اس کا دعویٰ اسلام، دین کی تکذیب ہوتا ہے۔

(۱۱)

اور یہاں سے ہم اس معاشرتی (عائلی) زندگی کی طرف آتے ہیں جسے اگر قرآنی خطوط پر متشکل کیا جائے تو قرآن کے الفاظ میں وہ جنت بدارماں بن جاتی ہے۔ عائلی زندگی سے متعلق احکام و ہدایات مختلف مقامات پر کجبرے ہوئے ہیں۔ لیکن ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ انہیں اسی مقام پر یکجا سامنے لے آیا جائے ان میں نکاح، مہر، طلاق، عدت، تعدد ازواج وغیرہ سب آجائیں گے۔ اس کی ابتدا تو آیت (۲۲۱) سے ہوگی لیکن ظاہر ہے کہ باقی آیات تسلسل کے ساتھ درج نہیں ہوں گی۔ موضوع کے اعتبار سے درج کی جائیں گی۔

(۰)

گھر کی زندگی (HOME LIFE) کی ابتداء ”میاں بیوی“ سے ہوتی ہے جو نکاح کے رشتے سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہوتے ہیں۔

نِکاح

(۱) نکاح کو قرآن مجید نے میاں بیوی کا باہمی معاہدہ قرار دیا ہے۔ آیت (۲۲۱) میں اس کے لئے عقد کا لفظ آیا ہے اور سورۃ النساء میں میثاق کا لفظ (۲۲۱) دونوں کے معنی معاہدہ کے ہیں۔

(۲) نکاح کے لئے قرآن مجید نے عمر کا تعین خود نہیں کیا، لیکن اس نے اس باب میں جو کچھ ضمناً کہا ہے اس میں نکاح کے لئے بلوغت کا لفظ آیا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے: **وَابْتَئُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ**.....

(۳) تم یتیم بچوں کی جانچ پڑتال کرتے رہو تاکہ وہ ”نکاح کی عمر“ تک پہنچ جائیں۔ دوسری جگہ ہے: **حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ**۔ (۲۲۱) ”تاکہ وہ اپنی اشد تک پہنچ جائیں“ اشد بھر پور جوانی کو کہتے ہیں۔ اس نے اس کی خود وضاحت کر دی ہے جب کہا: **ثُمَّ يُخْبِرُ عَنْكُمْ طِفْلًا، ثُمَّ لِيَبْلُغُوا أَشُدَّهُمْ، ثُمَّ لْيَكُونُوا شُيُوخًا**۔ (۲۲۱) ”تم پیدا ہوتے ہو تو بچے ہوتے ہو، پھر تم اپنی جوانی کو پہنچتے ہو، پھر تم بوڑھے ہو جاتے ہو“ اس سے ظاہر ہے کہ اشد بچپن اور بڑھاپے کا درمیانی عرصہ ہے۔ اور وہ جوانی کا زمانہ ہوتا ہے۔ لہذا نکاح کی عمر بلوغت یا جوانی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قرآن کریم نے بلوغت کی عمر کا خود تعین نہیں کیا کیونکہ یہ آب و ہوا اور دیگر عناصر کی رو سے مختلف ملکوں میں مختلف ہو سکتی ہے۔ اس عمر کا تعین اسلامی مملکت کرے گی۔ لیکن یہ تو واضح ہے کہ نابالغ لڑکے یا لڑکی کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے بھی جب قرآن مجید نے اسے باہمی معاہدہ قرار دیا ہے تو معاہدہ کے لئے فریقین کا عاقل بالغ، اور بااختیار ہونا ضروری ہے۔ قرآن مجید نے عورت کی مرضی کے خلاف اس کا مالک بن بیٹھنے کو حلال ہی

قرار نہیں دیا۔ سورۃ النساء ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرِهًا**۔ (۲/۲۴۰)۔ اسے جماعتِ مومنین! یہ تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم عورتوں کی مرضی کے خلاف ان کے مالک بن جاؤ۔ اور ظاہر ہے کہ رضا مندی کا سوال بالغ کی صورت ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ نکاح کے لئے عورت کی طرف سے ولی یا ولی کی اجازت کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ بالغ لڑکی بطیب خاطر خود کسی کو اپنا مختار مقرر کر دے لیکن قانون کی رو سے اس قسم کا مختار نامہ بھی تحریری ہونا چاہیئے۔

لیکن ہماری مروجہ شریعت میں نکاح کے لئے بلوغت کی شرط ہی نہیں، یہاں چھ چھ مہینے کی لڑکیوں کا نکاح ان کا ولی کر دیتا ہے۔ یہ ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ غیر منقسم ہندوستان کی مرکزی مجلسِ قانون ساز کے ایک ہندو ممبر (مسٹر ساردا) نے ایک بل پیش کیا جس کی رو سے نابالغ لڑکے لڑکی کی شادی کو ممنوع قرار دیئے جانے کی تجویز تھی۔ اس کے خلاف ہندوؤں کے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ لیکن سب سے شدید مخالفت ہمارے ”علمائے کرام“ کی طرف سے ہوئی۔ اس درجہ شدید کہ اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس تحریک کا مرکز دہلی میں قسطل باغ کا علاقہ تھا۔ وہاں طے یہ ہوا کہ علماء کا ایک وفد دائرے کے حضور پیش ہو اور اسے بتائے کہ اگر اس قانون کا اطلاق مسلمانوں پر کیا گیا تو یہ ان کے نزدیک مداخلت فی الدین ہوگا اور اس کے خلاف ملک میں کہرام مچ جائے گا۔ مجھے وہ واقعہ کبھی نہیں بھولا جب یہ حضرات ایک وفد کی شکل میں دائرے کیل لاج جا رہے تھے۔ اس میں قریب قریب تمام فرقوں کے علماء حضرات شامل تھے۔ میں استاذ المکرم علامہ اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمۃ) کے پاس بیٹھا تھا۔ جب یہ وفد ان کے مکان کے سامنے سے گزرا، انہوں نے فرمایا کہ یہ ہماری تاریخ کا عجیب المیہ ہے کہ ہمارے مختلف فرقوں کے نمائندوں کا جب بھی اتفاق ہوا ہے باطل یہ ہوا ہے۔ دائرے نے (غالباً) ان کی درخواست کو مسترد کر دیا تو اس کے خلاف سول نا فرمانی کی تحریک شروع ہو گئی۔ چنانچہ لوگ چھ چھ ماہ کے بچوں کو گود میں اٹھائے لئے آتے تھے اور مولوی صاحبان ان کے نکاح پڑھاتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس تحریک کی مرکزی شخصیت کون سی تھی؟ کامریڈ کے مدیر، آکسفورڈ کے تعلیمیافتہ (مولانا) محمد علی جوہر (مرحوم)!

یہ تو پرانی بات ہے۔ پاکستان میں عائلی قوانین نافذ ہوئے تو ان میں نکاح کے لئے بلوغت کی عمر شرط قرار دی گئی تھی۔ اس کے خلاف بڑا ہنگامہ برپا ہوا۔ ان قوانین کے منسوخ کرنے کا مطالبہ اب تک جاری ہے۔ اور اس میں پیش پیش جماعتِ اسلامی ہے۔ چنانچہ اس جماعت کے بانی، ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا فتوے

ہے کہ۔

نابالغ لڑکیوں سے نہ صرف نکاح جائز ہے بلکہ شوہر کا ان کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔

(تفسیر تفہیم القرآن - جلد پنجم - ص ۵۷۱ - طبع اول

نیز ماہ نامہ ترجمان القرآن - بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء)

وہ جنت کی حوروں کے متعلق کہتے ہیں کہ،

کفار کی لڑکیاں جو کم سنی میں وفات پاگئی ہوں گی انہیں جنت میں حوریں بنا دیا جائے گا۔ اہل جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قسروں (محلات) میں رہیں گی اور ان کی سیرگاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔

(تفسیر القرآن - جلد چہارم - ص ۲۸۷ - جلد پنجم ص ۲۷۱

نیز مہفتہ وار ایشیا - موزہ ۱۴ جون ۱۹۶۹ء)

اور آپ کو معلوم ہے کہ نابالغ لڑکیوں کے ساتھ نکاح اور خلوت کی (سند کیا ہے؟ سند میں وہ (ضعفی) روایات جن کی رو سے کہا جاتا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے حضرت عائشہؓ سے چھ سال کی عمر میں نکاح کیا تھا اور تو سال کی عمر میں رخصتی ہو گئی تھی۔ ان روایات نے معاندین اسلام کو حضورؐ کی سیرت طیبہ کے خلاف ایسے اعتراضات کا موقع بہم پہنچایا ہے جن کا ہم سے کوئی جواب بن

حضرت عائشہ کی عمر

نہیں پڑتا۔ مجھے یہ روایات شروع سے کھٹکتی تھیں۔ چنانچہ میں نے اس موضوع پر تحقیق کی تو یہ عجیب حقیقت منکشف ہوئی کہ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر سترہ اور اسی سال کے درمیان تھی۔ (میں نے اس پوری تفصیل کو اپنی کتاب ”ظاہرہ کے نام خطوط“ کے آخری باب میں درج کر دیا ہے)۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس تحقیق پر ہماری مذہبی پیشوا بیت خدا کے حضور سجدہ شکر ادا نہ بجالاتی کہ اس سے معاندین اسلام کے وہ اعتراضات باطل قرار پا گئے جن کا کوئی جواب ہم سے بن نہیں پڑتا تھا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے اٹا مجھ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا یہ کس جرم کی پاداش میں؟ اس جرم کی کہ میری اس تحقیق کی رو سے بخاری کی حدیث غلط قرار پاجاتی ہے۔ یعنی ان حضرات کی حمیت دینی اور جذبہ تحفظ ناموس رسالتؐ کی کیفیت ہے کہ اگر حضور نبی اکرمؐ کی ذات اقدسؐ پر اس قسم کا جگہ و گار طعن پڑتا ہے تو پڑے، لیکن بخاری کی ایک روایت غلط قرار نہ پاسے! امام بخاریؒ نے خود بیان کیا ہے کہ انہیں قریب چھ لاکھ احادیث ملیں جن میں سے انہوں نے پانچ لاکھ ستانوے ہزار کو مسترد

کر دیا اور صرف تین ہزار کو اپنے مجموعہ میں شامل کیا۔ اب روایت پسند حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ ان تین ہزار میں سے کسی ایک روایت کا انکار بھی مسلمان کو کا فر بنا دیتا ہے۔ یعنی وہ روایات جنہیں امام بخاری نے اپنی بصیرت کی رو سے صحیح سمجھ کر اپنے مجموعہ میں داخل کر لیا، وحی منزل من اللہ کی حیثیت اختیار کر گئیں کہ ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ دین میں یہی غلو ہے جس سے انسانوں کو خدا بنا لیا جاتا ہے۔

بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ حضور نبی اکرمؐ نے حضرت عائشہؓ سے ان کے بالغ ہونے کے بعد (سترہ) انیس سال کی عمر میں شادی کی تھی اور یہ قرآن مجید کے ارشاد کے عین مطابق تھا۔ قرآن کریم کی رو سے نابالغ کی شادی نہیں ہو سکتی۔

(۱)

(۲) ازدواجی رشتہ سے میاں بیوی کی زندگی کی ایک نئی منزل شروع ہوتی ہے جس کی مدت بڑی طویل ہوتی ہے۔ جس جوڑے نے مدت العمر تک اس طرح زندگی بسر کرنی ہو ان میں باہمی پسندیدگی لاینفک شرط ہوگی۔ عورت کی پسندیدگی کے متعلق تو اوپر آیت گذر چکی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اس کی رضا مندی کے بغیر تم اس کے مالک بن ہی نہیں سکتے۔ جہاں تک مردوں کا تعلق ہے اس نے کہا ہے خانگوا ما طاب لکم من النساء۔ (۳) تم ان عورتوں سے شادی کرو جو تمہیں پسند ہوں۔

انتخاب

قرآن کریم نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کا زوج قرار دیا ہے (ہمارے ہاں تو زوج یا زوجہ بیوی کو کہتے ہیں لیکن عربی زبان میں میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کو دوسرے کا زوج کہا جاتا ہے)۔ یعنی بیوی میاں کی زوجہ۔ میاں بیوی کا زوج۔ (خو قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے۔ دیکھیے (۴) جہاں خاوند کو عورت کا زوج کہا گیا ہے)۔ لغت کی رو سے زوج ایسی دو چیزوں کو کہتے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کے مطابق ہوں۔ جیسے گاڑی کے دو پہیے کہ اگر ان میں سے ایک دوسرے سے ذرا بھی مختلف ہو تو گاڑی چل ہی نہیں سکتی قرآن کریم نے ازدواجی زندگی کا مقصد یہ بتایا ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ
بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ۔ (۳)

جامد مٹی سے جب زندگی کی ابتدا ہوئی تو وہ ایک جڑوہ (LIFE CELL) کی شکل میں تھی وہ جوش ہو
سے پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تو اس کا ایک حصہ نہ بن گیا دوسرا وہ — اس طرح تم — مرد اور عورت

— ایک دوسرے کے زوج (جوڑے) بن گئے۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ تم ایک دوسرے کی رفاقت سے سکون قلب حاصل کرو۔ اس نے تم میں ایک ایسا گہرا رشتہ پیدا کر دیا جو تمہاری (مرد اور عورت دونوں کی) صلاحیتوں کی نشوونما کا موجب بن گیا۔

زندگی کے اس نقشے میں بھی ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں، قانونِ خداوندی کی حکیمیت اور حیات بخشی کی نشانیاں ہیں۔

ظاہر ہے کہ ازدواجی زندگی میں یہ نتائج اسی صورت میں مرتب ہو سکیں گے جب فریقین میں کامل ہم آہنگی ہو۔ ہم آہنگی | طبیعت اور مزاج کی، فکر و نظر کی، ذوق و جذبات کی، نظریات اور تصورات کی، مقاصد حیات کی، نصب العین زندگی کی، مسلک و مشرب کی، اور سب سے مقدم ہم آہنگی عقائد کی۔ قرآن کریم نے اس کو بنیاد قرار دے کر ایک (EXTREME) مثال سے اس کی وضاحت کی ہے۔ فرمایا:-

وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَةَ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ وَلَا مَٔمَّةً مُّؤْمِنَةً خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا
وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَةَ حَتَّىٰ يَدْعُوَ
إِلَى الْمَنَارِ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْحَقِّ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ وَبَيِّنَ
الْآيَاتِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ - (۲/۲۳۱)

تم جس مفتی معاشرہ کے قیام کی نگرانی ہو، اس کی ابتداء تمہاری گھر کی زندگی سے ہوتی ہے۔ لہذا سب سے پہلے ضروری ہے کہ تم اپنے گھر کو جنت بناؤ۔ اس کے لئے بنیادی سوال یہ ہے کہ میاں بیوی کا انتخاب کس معیار کے مطابق ہونا چاہیے؟ اسی معیار کے مطابق جس کی رو سے تمہاری امت کی تشکیل ہوتی ہے۔ یعنی آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر۔ تمہاری آئیڈیالوجی یہ ہے کہ اطاعت صرف ایک خدا کے قوانین کی ہے۔ اس میں کسی اور کو شریک نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا میاں بیوی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس آئیڈیالوجی میں متفق ہوں۔

بنا بریں تم کسی مشرک عورت سے شادی نہ کرو تا وقتیکہ وہ ایمان نہ لے آئے۔ مشرک آزاد عورت سے مومن نوٹھی بہتر ہوتی ہے خواہ اول الذکر تمہیں کتنی ہی جاذب نگاہ کیوں نہ دکھائی دے۔ سطح مومن عورتیں مشرک مردوں سے شادی نہ کریں تا وقتیکہ وہ ایمان نہ لائیں۔ مشرک آزاد مرد سے مومن غلام بہتر ہے خواہ

اول الذکر کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگے۔ یہ اس لئے کہ متضاد آئیڈیالوجی رکھنے والوں کا ایک جابج جمع کر دینا، جہنم پیدا کر دے گا۔ اس لئے خدا کا قانون ہمیں اس سے روکتا ہے۔ وہ تمہارے گھر کی زندگی کو جنت کی آسودگیاں عطا کرنا اور تمہیں ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔
خدا اس طرح اپنے احکام کو لوگوں کے لئے واضح کر دیتا ہے تاکہ وہ حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیں۔

آپ غور کیجیے کہ قرآن کریم نے ایک ہی آیت میں کتنے اہم امور کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ سب سے پہلے ہم آہنگی، فکر و نظر کو لیتے ہیں۔ مسلمان مرد کے مشرک عورت اور مسلمان عورت کے مشرک مرد سے نکاح کو حرام قرار دینا محض ایک قانونی (فقہی) مسئلہ نہیں۔ یہ ازدواجی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا بنیادی سوال ہے، قلب و نگاہ میں عدم عوافقت سے ازدواجی زندگی جہنم بن جاتی ہے اور ان کی ہم آہنگی سے جنت۔

پھر قرآن نے **لَوْ أَجَبْتَكُم** اور **لَوْ أَجَبْتُكُمْ** کہہ کر یہ بھی واضح کر دیا کہ بنیادی معیار انتخاب حسن و جمال کی فریفتگی اور کشش نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ثانوی چیز ہے۔ اس کے بعد عہد اور امتہ کہہ کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ مال و دولت اور حسب و نسب بھی معیار انتخاب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تمام چیزیں اضافی ہیں حقیقی معیار انتخاب قلب و دماغ کی ہم آہنگی اور فکر و نگاہ کی یک رنگی ہے۔ اس قسم کی مطابقت سے ازدواجی زندگی جنت بدماں بن جائے گی۔ اور اگر اس قسم کی ہم آہنگی نہیں ہوگی تو حسن و جمال، مال و دولت، خاندان اور قبیلہ، حسب و نسب کے باوجود گھر جہنم بنا رہے گا۔

(۳) بعض رشتے ابدی طور پر حرام ہیں یعنی پسندیدگی وغیرہ کے باوجود، ان سے کسی مسلمان (مرد یا عورت) کا نکاح جائز ہی نہیں۔

(۱) مشرک مرد اور عورت کے متعلق اوپر آیت آچکی ہے (۲۲۱)۔ دوسری جگہ **الْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ** کہہ کر واضح کر دیا کہ عورتوں کا مومن ہونا ضروری ہے۔ اس کی استثناء ذیلی شق (ب) میں دی گئی ہے۔

لے (فٹ نوٹ صفحہ ۳۴۰)۔ یہ اسلام کے ابتدائی ایام کا ذکر ہے جس میں ہنوز زمانہ جاہلیت کی لوٹیاں اور غلام مسلمانوں کے ہاں موجود تھے۔ اسلام نے ان غلاموں اور لونڈیوں کو آہستہ آہستہ اپنے معاشرہ کا جزو بنالیا اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔ (تفصیل غلام اور لونڈیوں کے عنوان میں ملے گی)

(ب) مسلمان مرد اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں لیکن مسلمان عورتیں اہل کتاب کے مردوں سے شادی نہیں کر سکتیں۔ سورہ المائدہ میں ہے۔

أَيُّوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ
وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ
الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ - (۵)

تم نے غور کیا کہ حلت و حرمت کے قرآنی احکام نے انسانی زندگی میں کیا خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے؟ اس سے پہلے انسانوں کی خود ساختہ شریعتوں نے اس باب میں ہزار قسم کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں جس سے انسانی آزادی کا دم گھٹ رہا تھا۔ قرآنی ددر میں چند چیزوں کو حرام قرار دے کر باقی تمام خوشگوار چیزیں حلال قرار دے دی گئیں۔ اس کے کس قدر میدان وسیع ہو گیا! نیز اہل کتاب کے ہاں کا کھانا بھی تمہارے لئے حلال ہے بشرطیکہ اس میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جو تمہارے ہاں حرام ہے اور

دہ تمہارے ہاں کا کھانا اپنے لئے جائز سمجھیں۔

کھانے پینے سے آگے بڑھ کر ازدواجی زندگی کی طرف آؤ تو تمہارے لئے مومن پاکدامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاکدامن عورتیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی عقد نکاح میں لانے کے لئے جائز ہیں۔

واضح رہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کی صرف اجازت ہے حکم نہیں۔ اسلامی مملکت بعض مصالح کی بنا پر اس اجازت پر پابندی عائد کر سکتی ہے۔ جیسا کہ (تاریخ بتاتی ہے کہ) حضرت عمرؓ نے بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر ان سے شادی پر پابندی لگا دی تھی۔ اس مقام پر اس نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلامی مملکت قرآن کے حلال کردہ پر وقتی پابندی لگا سکتی ہے۔ اسے ابدی طور پر حرام قرار نہیں دے سکتی۔ نہ ہی اس کے حرام کردہ کو حلال قرار دے سکتی ہے۔

محرمات

(ج) قرآن کریم نے محرمات کی تفصیل خود بیان کر دی ہے۔ آیت (۲۶) میں ہے: وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ جن عورتوں سے تمہارے باپ نے شادی کی ہو ان سے نکاح مت کرو۔ اس سے پہلے تم جو کچھ کر چکے ہو کر چکے۔ اب ایسا نہ کرنا۔ یعنی سو پہلی ماں سے نکاح حرام ہے۔ اسی کے بعد ہے۔

حَرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ

وَأَمَّهَتْ نِسَاءَكُمْ وَرَبَّائِبُكُمْ الَّتِي فِي جُجُورِكُمْ مِّنْ نِّسَاءِكُمُ الَّتِي دَخَلْتُم بِهِنَّ فَإِنْ لَّمْ تَكُونُوا دَخَلْتُم بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا - (۱۶۶)

علاوہ ازیں تم پر جب ذیل رشتوں کی عورتیں بھی نکاح کے لئے حرام قرار دی گئی ہیں۔ تمہاری — (۱) مائیں (۲) بیٹیاں۔ (۳) بہنیں۔ (۴) پھوپھیاں، (۵) خالائیں، (۶) بھتیجیاں۔ (۷) بھانجیاں۔ (۸) وہ عورتیں جن کا تم نے دودھ پیا ہو۔ وہ بمنزلہ ماؤں کے ہیں۔ (۹) تمہاری دودھ شریک بہنیں۔ (۱۰) تمہاری بیویوں کی مائیں (۱۱) تمہاری بیویوں کی (سابقہ شوہر) لڑکیاں جو تمہاری حفاظت میں پرورش پاتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ بمنزلہ تمہاری اولاد کے ہیں۔ اس میں شرط یہ ہے کہ تم ان بیویوں سے خلوت کر چکے ہو۔ اگر خلوت نہ کی ہو تو پھر ان لڑکیوں سے نکاح کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں (۱۲) تمہارے حقیقی بیٹوں کی بیویاں۔ (منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح جائز ہے۔ ۲۳)۔

(۱۳) نیز یہ بھی حرام ہے کہ (جب تک کے مطابق تعدد ازدواج کی ضرورت پڑ جائے تو) تم بیک وقت دو بہنوں کو اپنے نکاح میں لے آؤ۔

ان احکام سے پہلے جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا۔ اب ان کی خلاف ورزی نہ کرنا۔ یاد رکھو! تمہاری ذات کی حفاظت اور نشوونما صرف قوانین خداوندی کی اطاعت سے ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد ہے: وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ كِتَابَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ (۱۶۷) ان عورتوں سے بھی نکاح حرام ہے جو دوسروں کے نکاح میں ہوں۔ بجز ان کے جن کے ساتھ تم پہلے نکاح کر چکے ہو۔ یا لونڈیوں سے۔

ان احکام میں دو تین نکات وضاحت طلب ہیں۔

(i) رضاعی ماؤں اور رضاعی بہنوں سے نکاح حرام ہے۔ قرآن کریم نے رضاعت کی تشریح خود نہیں کی۔ یعنی کتنے

عرصہ کے لئے دودھ پلایا ہو۔ نہ ہی رضاعی بہن کے متعلق متعین طور پر کہا ہے کہ ان دونوں بچوں نے کتنے عرصہ تک اکٹھے دودھ پیا ہو۔ اسلامی ملکیت اس ضمن میں جزئی قوانین خود وضع کریگی۔

رضاعت

ویسے بچے کو دودھ پلانے کی مدت دو سال بتائی ہے۔ اس اعتبار سے رضاعی ماں وہ ہوگی جو بچے کو اس کی دو سال

کی عمر کے اندر دودھ پلائے اور رضاعی بہن وہ جو اس بچے کیساتھ ماں کا دودھ پیئے۔ یہ بہر حال ہمارا استنباط ہے۔ اس کی قانونی حیثیت اسلامی مملکت ہی متعین کر سکتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے صرف رضاعی ماں اور رضاعی بہن سے نکاح حرام ہے۔

(ii) صلبی بیٹیوں کی بیویوں سے نکاح حرام ہے منہ بولے بیٹیوں کے متعلق دوسرے مقام پر ہے۔ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَاءَكُمْ اَبْنَاءَكُمْ (۲۳) وہ حقیقی بیٹے نہیں بن جاتے۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے متبنی کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔

(iii) ”محصنت“ سے نکاح حرام ہے۔ محصنت کے معنی پاکدامن عورتیں بھی ہیں اور شادی شدہ عورتیں بھی۔ آیت (۲۴) میں محصنت سے مراد وہ عورتیں ہو سکتی ہیں جو کسی اور کے نکاح میں ہوں۔ ان سے نکاح حرام ہو گا۔ صد اہل میں البتہ ایک واقعہ سامنے آگیا تھا جس میں اس حکم میں استثناء کی ضرورت لاحق ہو گئی تھی۔ ابتدائی ہجرت کے بعد مکہ میں ایسی عورتیں رہ گئیں جو خود تو اسلام لے آئی تھیں لیکن ان کے خاوند مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ بعد میں وہ عورتیں اپنے خاوندوں کو چھوڑ کر مدینہ چلی آئیں۔ قرآن کریم نے کہا ہے: فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ لَآ هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ وَالتَّوْهُمَ مَّا اَنْفَقُوا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوهُنَّ (۲۵) انہیں ان کے غیر مسلم خاوندوں کی طرف مست لوٹاؤ۔ نہ یہ ان کے لئے حلال ہیں نہ وہ ان کے لئے حلال۔ انہیں یہی رکھو۔ البتہ انہیں تہہ منہ انفاقو۔ جو کچھ (ان کے ساتھ نکاح کے سلسلہ میں) ان کے خاوندوں کا خرچ آیا ہو وہ انہیں ادا کرو۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوهُنَّ (۲۶) اس کے بعد ان سے نکاح کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اس سے یہ حکم مستنبط ہوتا ہے کہ اسلام چھوڑ دینے سے نکاح باقی نہیں رہتا۔ اس کے لئے اسلامی مملکت کو جزئی قوانین وضع کرنے ہوں گے۔

(iv) قرآن کریم میں متعدد مقامات میں مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ آیا ہے جس کے عمومی معنی غلام اور لونڈیاں لئے جاتے ہیں۔ غلامی کے متعلق تفصیلی بحث جلد اول ص ۲۶ آیت (۲) اور جلد دوم ص ۳۵ آیت (۲۵) میں گزر چکی ہے۔ یہ زمانہ نزول قرآن کا ذکر ہے۔ اب غلاموں اور لونڈیوں کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ (v) نکاح سے متعلق آیات میں عورت کو کچھ دینے کی شرط بھی آتی ہے۔ اس سے تہر کہا جاتا ہے جس کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔

(۴) نکاح کے لئے قرآن کریم نے کوئی رسم تجویز نہیں کی حتیٰ کہ اس میں ”نکاح پڑھانے“ کا بھی ذکر نہیں۔ لیکن چونکہ نکاح ایک معاہدہ ہے اس لئے اسلامی حکومت معاہدات کی توثیق کے لئے جو ضابطہ مقرر کرے اس کا اطلاق اس معاہدہ پر بھی ہوگا۔ قانونی ضرورت کے علاوہ، معاشرتی طور پر بھی ضروری ہے کہ اس امر کا اعلان ہو کہ فلاں مرد اور عورت نے باہمی نکاح کیا ہے۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے۔ **مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسْلِفِينَ وَلَا يَتَّخِذِيْ اَخْدَانٍ** - (۵) ”نکاح سے مقصد ازدواجی زندگی کی پابندیاں پوری کرنا ہیں۔ نہ محض جنسی خواہش کی تسکین، اور نہ ہی پوشیدہ تعلقات“ نکاح کا اعلان پوشیدہ تعلقات کے امکان کو ختم کر دے گا۔ اس لئے یہ ازدواجی زندگی کی لازمی شرط ہوگی۔ جو نکاح پوشیدہ رکھا جائے، قرآن کریم کی رو سے جائز نہیں ہوگا۔

(۵) سورۃ النور میں ایک آیت ہے۔

الزَّانِي لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحَرَّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ - (۲۴)

اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

زانی مرد صرف زانیہ (عورت) یا مشرک سے نکاح کرتا ہے اور زانیہ عورت صرف زانی مرد یا مشرک سے نکاح کرتی ہے۔ مومنوں پر یہ حرام ہے۔

اس ترجمہ کی رو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ زانی مرد کا نکاح کسی پاکہ امن عورت سے اور اسی طرح زانیہ عورت کا نکاح کسی پاکہ زمرہ سے جائز نہیں۔ زانی اور زانیہ یا تو آپس میں نکاح کر سکتے ہیں یا مشرکوں سے۔ لیکن یہ مفہوم ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ اس سے جو نتائج مرتب ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔ ہمارے نزدیک یہاں نکاح کا لفظ اپنے بنیادی معانی (مجامعت) کے لئے آیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر مومن مرد یا مومن عورت میں سے ایک بھی پاکہ زمرہ میں ہے تو فعل زنا کا ارتکاب نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں کی باہمی رضا مندی سے ہوتا ہے (زنا بالجبر کا سوال الگ ہے)۔ بلکہ اس فعل کا ارتکاب وہ کرتے ہیں جو قوانین خداوندی پر ایمان ہی نہیں رکھتے (یعنی مشرک) مومن ایسا نہیں کر سکتے۔ اس سے فعل زنا کی شناخت کی وضاحت مقصود ہے۔

تعد ازدواج ہمارے ہاں (یعنی مسلمانوں میں) ایک سے زیادہ بیویوں کا سوال بڑی اہمیت

رکھتا ہے۔ اس لئے اسے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔

قرآن کریم نے وحدتِ زوج یعنی ایک وقت میں ایک بیوی (MONOGAMY) کا اصول مقرر کیا ہے۔ (فواحدۃ - ۱۱)۔ اس کی سند ہے۔ پوری آیت آگے چل کر سامنے آئے گی) اگر کسی وقت بیوی سے نباہ کی صورت نہ ہے تو اس اصول کی رو سے اس کی موجودگی میں دوسری بیوی کی اجازت نہیں۔ اس کی جگہ دوسری بیوی لائی جاسکے گی۔ سورۃ النساء کی آیت (۴/۱۱) میں ہے: وَإِنْ أَرَدْتُمْ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ - اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانا چاہو تو اس کے لئے پہلی بیوی سے معاہدہ نکاح فسخ کرو (اسے طلاق کہتے ہیں) اس مقام پر ہم نے ان آیات کے حوالے صرف یہ بتانے کے لئے دیئے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے اصول وحدتِ زوج کا ہے (ان آیات کی تشریح و تفصیل آگے چل کر بیان کی جائے گی) لیکن بعض ہنگامی حالات میں قرآن مجید نے اس اصول میں استثناء (RELAXATION) بھی کی ہے۔ یہ ہنگامی حالات کس قسم کے ہو سکتے ہیں (اس کے لئے صدر اول کے اسلامی معاشرہ کو سامنے لانا چاہیئے۔

بدنی زندگی میں مخالفین کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مسلمانوں کی مقدار پہلے ہی (مقابلہ) بہت کم تھی۔ ان جنگوں میں شہادات کی وجہ سے ان میں اور بھی کمی واقع ہو گئی۔ اور کمی بھی نوجوانوں میں کیونکہ جنگوں میں اکثر و بیشتر نوجوان ہی شریک ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی مقدار زیادہ ہو گئی۔ اس پر متزاد یہ کہ مکہ سے بہت سی مسلمان عورتیں اپنے سابقہ (غیر مسلم) شوہروں کو چھوڑ کر (ہجرت کر کے) مدینہ آ گئیں۔ اور اللہ نے حکم دیا کہ انہیں ان کے شوہروں کی طرف لوٹایا نہ جاتے۔ ان سے یہیں شادی کر لی جاتے۔ مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتی (حتیٰ کہ اہل کتاب سے بھی نہیں)۔ اس سے معاشرہ میں عجیب سی صورت پیدا ہو گئی۔ بیوہ عورتیں (اور ان کے یتیم بچے) نیز شادی کی عمر تک پہنچی ہوئی (جوان ناکند) لڑکیاں، کثیر تعداد میں، اور اصول وحدتِ زوج کا۔ اس نے ایک تمدنی مشکل پیدا کر دی۔ ان عورتوں کو باعزت مقام حفاظت دینا نہایت ضروری تھا۔ اس مشکل کا ایک ہی حل تھا اور وہ یہ کہ وحدتِ زوج کے اصول میں استثناء پیدا کر کے ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دیکھائے تاکہ یہ مشکل مسئلہ حل ہو جائے۔ یہ تھا وہ استثنائی حل جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا۔

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ
وَتِلْكَ وَرُبْعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَلِكَ

اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا۔ (۲۱)

اگر تم دیکھو کہ بیوہ عورتوں، یتیم بچوں، ناکتخدا جوان لڑکیوں کے مسئلہ کا اور کوئی خاطر خواہ منصفانہ حل نہیں مل سکتا تو اس مشکل کے حل کے لئے تمہیں اجازت دی جاتی ہے کہ ان بے شوہر عورتوں میں سے جو تمہارے نکاح میں آنا چاہیں (۲۱) نکاح کر لو۔ اور جیسا بھی حالات کا تقاضا ہو دو، تین تین، چار چار تک نکاح میں لے آؤ۔ لیکن اگر تم دیکھو کہ تم اس طرح مختلف افراد خاندان میں عدل قائم نہیں رکھ سکو گے تو پھر ایک بیوی کے اصول پر کاربند رہو۔ یا وہ لونڈیاں جنہیں تم اس سے پہلے اپنے نکاح میں لا چکے ہو۔ بے انصافی یا کثرتِ اولاد کے بوجھ سے بچنے کے لئے وحدتِ زوج کا اصول زیادہ مناسب رہے گا۔

اس آیت میں پہلا (غور طلب) لفظ یتیمی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، عربی زبان میں یتیم کا لفظ ان بچوں تک محدود نہیں جن کے ماں باپ مر چکے ہوں۔ اس میں ایسی عورتیں بھی شامل ہیں جن کا شوہر نہ ہو، خواہ وہ بیوہ ہوں اور خواہ وہ ناکتخدا جوان لڑکیاں۔ خود قرآن کریم نے ”یتیمی النساء“ (۲۲) کہہ کر اس کی وضاحت کر دی ہے۔ یتیم عورتیں، یعنی وہ عورتیں جو تمہارا یعنی بلا شوہر کے ہوں۔

دوسرا لفظ تَعُوْلُوْا ہے (مادہ ع۔ و۔ ل) جس کے معنی ہر وہ شے ہیں جس کے بوجھ تلے انسان دب جلتے۔ اہل و عیال میں عیال کے معنی بال بچوں کا بوجھ ہیں۔ اسی سے ”عالی المیزان“ ہے جس کے معنی ہیں ترازو کے ایک پلٹے کا جھک جانا۔ اس کے دونوں پلٹوں کا وزنی برابر نہ رہنا۔ یہاں سے اس کے معنی انصافی کے آتے ہیں۔

اب آئیے آیت زیر نظر (۲۱) کی طرف۔ اس میں تعدد ازواج دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔

(۱) اگر معاشرہ میں بے شوہر عورتوں کا مسئلہ پیچیدہ ہو جائے اور اس کا کوئی مناسب حل نہ مل سکے تو وحدتِ زوج کے اصول میں استثناء کر کے ان عورتوں سے شادی کی اجازت ہے۔

(۲) یہ اجازت پھر اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ افراد خاندان میں عدل قائم رکھا جاسکے اور (اگر بال بچوں

کی پرورش انفرادی ذمہ داری ہے تو) تمام اہل و عیال کی مناسب پرورش ہو سکے۔ یہ مسئلہ بوجھ نہ بن جائے جہاں تک عدل کا تعلق ہے قرآن کریم نے خود ہی بتا دیا کہ اس سے مراد مساویانہ سلوک اور برتاؤ ہے نہ کہ جذبات کا عدل۔ اسی لئے جذبات میں مساوات اور کیسانیت رکھنا نفسیاتی محال ہے جس کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر کہا گیا ہے۔

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوْا كُلَّ الْمِيلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَاِنْ تَصْلَحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا . (۲۴۹)

تم ہزار چاہو۔ جذباتی عدل تم قائم رکھ ہی نہیں سکتے۔ اسی لئے اس عدل کا مطالبہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جو عدل مقصود اور ممکن ہے وہ یہ ہے کہ تم کسی ایک بیوی کی طرف اس قدر نہ جھک جاؤ کہ دوسری بیوی اُدھر لٹکی رہ جائے یہی وہ اصلاحی شکل ہے جس سے قانونِ خداوندی کا تقاضا پورا ہو سکتا ہے۔ اس سے تم گھر میں ناہمواریوں کے مضرت سے محفوظ رہ سکو گے اور راحت اور سکون کی زندگی گزار سکو گے۔

قرآنِ کریم میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت کے متعلق صرف یہ ایک آیت (۲۴۹) ہے۔ اس میں آپ دیکھیے کہ یہ اجازت کتنی شرطوں سے مشروط ہے۔ یعنی

(۱) معاشرہ میں ایسے ہنگامی حالات کا پیدا ہو جانا جس میں بے شوہر عورتوں اور یتیم بچوں کی کثرت ایک مسئلہ (PROBLEM) بن جاتے۔ ظاہر ہے کہ اس کا فیصلہ اسلامی مملکت ہی کرے گی کہ ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں یا نہیں۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ گھر میں عدل (مساویانہ سلوک اور برتاؤ) کو قائم رکھ سکے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے پہلی بیوی کی رضا مندی ضروری ہوگی۔ اس کے بغیر مساویانہ سلوک کی صورت بھی ممکن نہیں ہوگی۔ اور

(۳) تیسری شرط یہ کہ تم اس قدر عیال داری کا بوجھ برداشت کر سکو۔

اگر ایسے ہنگامی حالات پیدا نہیں ہوتے تو ایک سے زیادہ بیویوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اجازت بے سہارا عورتوں کے لئے ہے، باعزت مقامِ حفاظت مہتیا کرنے کے لئے ہے۔ آپ سوچئے کہ جس اجازت کی ابتدا یہی ”وَإِنْ خِفْتُمْ“ سے ہوئی ہے (اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو) تو اس شرط کے بغیر ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت قرآن سے تو نہیں مل سکتی!

(۰)

قرآنِ کریم نے حضورِ نبی اکرم کی ایک سے زیادہ ازواج (مطہرات) کا ذکر کیا ہے۔ اس نے یہ تو نہیں بتایا کہ ایک وقت میں حضور کے حرم میں کتنی بیویاں تھیں۔ نہ ہی ان کی کل تعداد بتائی ہے لیکن

ازواج مطہرات | ایک سے زیادہ ازواج کا ذکر ضرور آیا ہے۔ قرآنی تحدید (چار کی حد بندی) کی روشنی میں

یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ ان کی تعداد ایک وقت میں چار سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے اپنی کتاب ”معراج انسانیت“ میں تفصیل سے لکھا ہے کہ اس کا جواز وہی ہنگامی حالات تھے جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ بعد میں یہ ہنگامی حالات ختم ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی معاشرہ خوش حال اور مرفہ الحال بھی ہو گیا۔ لیکن اس مرفہ الحالی میں سب سے غریب گھرانہ سربراہ مملکت حضور نبی اکرم کا تھا۔ اس تبدیلی احوال و ظروف پر حضور کی ازواج مطہرات کو اجازت دی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو کاشانہ نبوی کو چھوڑ کر اور جگہ چلی جائیں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنْتُنَّ تُحِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزَيَّنْتَهَا فَمَتَّعْنَهُنَّ وَأَسْرَحْنَهُنَّ سَرَّاحًا جَمِيلًا . وَإِن كُنْتُنَّ تُحِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ
وَالْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا . (۳۳-۲۹)

اے رسول! تم اپنی بیویوں پر اس حقیقت کو واضح کر دو کہ (اگر تمہیں میری رفاقت میں رہنا ہے تو تمہاری زندگی کا مقصد اس مشن کی تکمیل ہو گا جسے میں لے کر اٹھا ہوں لیکن) اگر تمہارے پیش نظر محض طبعی زندگی کے مفاد اور دنیاوی زیب و زینت کی زندگی بسر کرنا ہے تو پھر ہماری زندگی باہمی رفاقت کی نہیں ہو سکتی۔ (رفاقت، مقصد کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ اگر مقصد میں اشتراک نہیں تو پھر رفاقت کیسی؟ یہ لڑائیوں کی وجہ سے پیدا شدہ ہنگامی حالات میں تیرے ہاں آئی تھیں۔ اُس وقت اولین مقصد ان کی حفاظت اور پناہ دہی تھا۔ اب جبکہ حالات اعتدال پر آچکے ہیں انہیں اپنے سابقہ فیصلہ پر نظر ثانی کی اجازت ہونی چاہیے۔ بنا بریں، تم ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتا کہ تم طوعاً و کرہاً میرے ساتھ رہو۔ اگر تمہاری منشا الگ ہو جانے کی ہو تو میں تمہیں ضروری سامان دیتے دیتا ہوں اور نہایت عمدگی سے رخصت کر دیتا ہوں (۳۳)۔ (تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اب ایک مملکت حاصل ہو گئی ہے اس لئے تمہاری زندگی شایانہ ٹھاٹھ کی ہوگی، مملکت کے ساتھ جو ذمہ داریاں آتی ہیں، ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ اس گھر کا معیار مملکت کے غریب ترین فرد کی زندگی کا معیار ہو۔ اس لئے مجھے اور میرے ساتھ میرے متعلقین کو غریبوں کی سی زندگی بسر کرنی ہوگی)۔

اگر تم نظام خداوندی کے لئے زندگی وقف کر دینا چاہو اور طبعی زندگی کے قریبی مفاد پر مستقبل کی خوشگاریوں کو ترجیح دو تو تم میں سے جو بھی اس طرح حسن کارنامہ انداز سے زندگی بسر کرے گی خدا کا قانون سکافات اسے اجر عظیم عطا کرے گا۔

یہ اذنِ خداوندی ازواجِ مطہرات تک پہنچا لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس آستانہِ عالیہ کو چھوڑنے کا خیال تک نہ کیا۔ اس کے بعد حضورؐ نبی اکرمؐ سے بھی کہہ دیا گیا کہ چونکہ وہ ہنگامی حالات ختم ہو چکے ہیں جن میں تعدد ازواج کی اجازت دی گئی تھی اس لئے آپ بھی اب نہ کوئی نئی شادی کر سکتے ہیں نہ ان بیویوں کی جگہ اور بیویاں لاسکتے۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ رَقِيبًا. (۲۳)

اس کے بعد تمہارے لئے کسی نئی عورت سے شادی کرنا جائز نہیں ہوگا۔ نہ ہی یہ کہ ان بیویوں میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ کسی اور عورت سے نکاح کر لو خواہ اس کی خوبیاں تمہیں کتنی ہی اچھی کیوں نہ لگیں۔ اب تیری بیویاں وہی رہیں گی جو تیری بیویاں بن چکیں۔
یاد رکھو! خدا کا قانون تمام امور کی نگہداشت کرتا ہے۔

(۰)

دیہاں ان آیات کو ضمناً درج کیا گیا ہے۔ ان کی تشریح اور دیگر متعلقہ آیات کا اضافہ مناسب مقام پر کیا جائیگا۔ یہاں پر آپ کے دل میں یہ سوال ابھرے گا کہ قرآن کریم کے اس قدر واضح احکام و ہدایات کے علی الرغم یہ جو ہمارے ہاں بلا مشروط چار چار تک شادیوں کا معمول چلا آ رہا ہے تو یہ سلسلہ کیسے شروع ہو گیا اور اس کی سند جو از کیا ہے؟ اس کا جواب اس دورِ ملوکیت سے پوچھتے جب قرآن مجید کو بالائے طاق رکھ دیا گیا اور نفسانی خواہشات کا اتباع زندگی کا شعار بن گیا، اور سند اس کی وہ وضعی روایات قرار پائیں جو اس مقصد کے لئے جعلی سکوں کی طرح ”خفیہ مکالموں“ میں ڈھلنی شروع ہو گئیں۔ اس طرح یہ اجازت بلا مشروط ہو گئی۔ آپ کو نکاح کی کسی مجلس میں شرکت کا موقع ملے تو نکاح خواں (مولوی صاحب) جو کچھ پڑھتے ہوں اسے کان لگا کر سننے کا۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ آیت (یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا فِی الْبَیِّنَاتِ مَا یُحْفَظُ لَكُمْ) سے کریں گے یعنی ”وَرَانِ خِفْتُمْ اَلَّا تَقْسِطُوْا فِی الْبَیِّنَاتِ“ (شرط) کے الفاظ غائب کر جائیں گے اور اس خود فریبی یا ابلہ فریبی سے مطمئن ہو جائیں گے کہ بلا مشروط تعدد ازواج کی قرآنی سند حاصل ہو گئی۔ میں نے ایسے مطبوعہ نکاح نامہ کے فارم بھی دیکھے ہیں جن پر یہ آیت ”فَاَنْکَحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ“ سے شروع کی گئی تھی۔ ان حضرات کو اس کا بھی علم نہیں کہ قرآن کریم میں ان کی اس تحریف کے باوجود ”فَاَنْکَحُوْا“ کا (ف) کس طرح ان کی اس فریب دہی کا پردہ چاک کر رہا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، جملہ شرطیں، پہلے ”اگر“ ہوتا ہے اور اس کے بعد ”تو“۔ (مثلاً اگر تم آؤ گے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا) اگر کوئی شخص ”اگر“ والی شرط کو حذف کر کے بات یوں شروع کرے۔ تو میں جاؤں گا۔ تو یہ بے معنی جملہ اس کی جہالت (بلکہ حماقت) کی دلیل ہوگا۔ اس سے آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ ”ان خفتہم“ کے بغیر فانکو“ سے بات شروع کرنا کس قدر جہالت یا فریب دہی ہے!

ایک لطیف اور بھی ملاحظہ فرمائیے۔ مولوی صاحب لڑکی والوں کے گھر میں بیٹھے نکاح پڑھا رہے ہوتے ہیں۔ اور دولہا کے کان میں کہہ رہے ہوتے ہیں کہ تم دو دو۔ تین تین۔ چار چار تک نکاح کر سکتے ہو۔ یہ تو غنیمت ہے کہ لڑکی والے (قرآن کریم کے) عربی زبان کے ان الفاظ کے معنی نہیں سمجھتے۔ اگر وہ سمجھتے ہوں کہ مولوی صاحب ان کے ہونے والے داماد کو کیا پٹی پڑھا رہے ہیں تو وہ انہیں کان سے پکڑ کر باہر نکال دیں۔ اس مقام پر ہندؤں کی مقدس کتاب (وید) کے اشلوکوں کے متعلق ایک بات یاد آگئی۔ ہندؤں کے ہاں بھی شادی کی تقریب پر کچھ مذہبی رسوم ادا کی جاتی ہیں اور ان میں ویدوں کے اشلوک پڑھے جاتے ہیں۔ ان اشلوکوں کے متعلق ہندؤں کے ایک ممتاز ودوان (عالم) پنڈت گنگا پرشاد آریا دھیلے (ایم۔ اے) پر دھان آریہ سماج الہ آباد نے اخبار آریہ منتر بابت ۶ جون ۱۹۲۹ء میں لکھا تھا۔

وہ (رگ وید منڈل ۱۱ سوکت ۵۷ منتر ۳۷ منتر اتنا اشلیل (گندہ) ہے کہ سادھارن (معمولی) سنسکرت جاننے والا اور (دولہا) بھی اسے پڑھنے کا ساہس (حوصلہ) نہ کرے گا۔ ابھی تو لوگ اس لئے پڑھ دیتے ہیں کہ نہ پڑھنے والا سمجھتا ہے نہ سننے والے۔ پرنتو (مگر) کیا آریہ سماج سروا (ہمیشہ) یہی اوستھا (حالت) رکھنی چاہتا ہے؟ یہی (اگر) اس منتر کو نہ نکالا گیا تو اس کے دردھ (خلافت) یا تو بھیا تک دردھ (خوفناک مخالفت) ہوگی یا لوگ اسے اپسیکا کی درشتی سے (بنظر حقارت) چھوڑ دیا کریں گے۔ دونوں ہی باتیں انشٹ (جُری) ہیں۔

(دیکھیے میری کتاب ”مذہب عالم کی آسمانی کتابیں“ ص ۱۳۷۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۷ء)

”مذہب“ خواہ کوئی بھی ہو، گپیت و دیا (یعنی جسے عوام نہ سمجھ سکتے ہوں) بڑا پردہ پوش اور بھرم قائم رکھنے کا موجب ہوتا ہے!

قرآن کریم نے اسلامی معاشرے سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں لوگوں کے لئے نکاح

میں آسانیاں ہوں۔ فرمایا۔

وَأَنْتَكُمُ الْآيَامُ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔ (۲۴۱)

تمہارے معاشرہ کا یہ بھی فریضہ ہے کہ جن لوگوں — مردوں یا عورتوں — کی شادی نہ ہوئی ہو (خواہ وہ کنوارے ہوں، یا رنڈوے مرد اور بیوہ عورتیں) ان کے نکاح کا مناسب انتظام کرے نیز تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو شادی کی صلاحیت رکھتے ہوں، ان کے نکاح کا بھی بندوبست کیا جائے۔ (یعنی معاشرہ ایسا انتظام کرے کہ لوگوں کو مناسب رشتہ تلاش کرنے میں آسانیاں ہوں۔ اور) جسے متاہل زندگی بسر کرنے کے لئے معاشی امداد کی ضرورت ہو اس کا بھی مناسب انتظام کیا جائے۔

یہ سب اس خدا کے مقرر کردہ نظام کی طرف سے ہونا چاہیے جو بڑی وسعتوں کا مالک اور ہر ایک کے حالات

سے باخبر ہے۔ (قوانین خداوندی کے مطابق قائم شدہ نظامِ مملکت کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔)

لیکن قرآن کریم کی رو سے نکاح کرنا کوئی حکم یا فریضہ نہیں۔ جو لوگ کسی وجہ سے بطیب خاطر بھرد رہنا چاہیں یا جن کے لئے نکاح کی صورت پیدا نہ ہو سکے، ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ انہیں ضبطِ نفس سے کام لینا چاہیے۔

وَلَيْسَتَعْظِيفُ الَّذِينَ لَا يَحْدُونَ نِكَاحًا حَتَّى يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ۔ (۲۴۲)

جن لوگوں کے لئے رشتے کا انتظام نہ ہو سکے انہیں ضبطِ نفس سے کام لے کر اپنی عفت کو محفوظ رکھنا چاہیے تاکہ

نظامِ خداوندی ان کے لئے ضروری سہولتیں بہم پہنچا دے۔

یہاں سے ایک اور اہم سوال کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) قرآن کریم نے کھانے پینے کی چیزوں کی حرمت کے سلسلہ میں کہا ہے کہ اگر کسی وقت اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو بقدر ضرورت حرام چیزوں کے کھا لینے کی اجازت ہے۔ لیکن جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے اس نے نہ اضطراری کیفیت کا ذکر کیا ہے، نہ ایسی صورت میں کسی ناجائز طریق کے اختیار کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس نے (قرآنی حدود و شرائط کے مطابق) نکاح کی شکل کو جائز طریق قرار دینے کے بعد واضح طور پر کہہ دیا کہ فَمَنْ ابْتَغَى وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ

لے جیسا کہ متعدد مقامات پر لکھا جا چکا ہے، قرآن کریم میں جہاں جہاں غلام اور لونڈیوں کا ذکر آیا ہے اس سے مراد وہ غلام اور لونڈیاں ہیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں عربی معاشرہ میں موجود تھیں۔

الْعَدْوَن - (۲۳)۔ جو کوئی جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے اس کے سوا کوئی اور شکل اختیار کرے تو وہ قانونِ خداوندی سے سرکشی ہوگی۔

انسانی جسم کی پرورش کے طبیعی تقاضوں (بھوک، پیاس، نیند وغیرہ) اور جنسی جذبہ میں بنیادی فرق ہے۔ جسم کی پرورش کے طبیعی تقاضے از خود بیدار ہوتے ہیں۔ اگر انہیں پورا نہ کیا جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد نوبت موت تک آسکتی ہے۔ (مثلاً) آپ کسی کام میں اس طرح منہمک ہوں کہ آپ کو دنیا و مافیہا کی خبر تک نہ ہو اس دوران میں آپ کو پیاس لگے تو اس کی تسکین (پانی) کا تقاضا بیدار ہونا شروع ہو جاتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ اس قدر شدت اختیار کر جاتا ہے کہ آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ اس کی تسکین (پانی پینے) کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ پانی نہیں پیتے تو بیمار ہو جاتے ہیں۔ اور چند دنوں تک اس حالت کو جاری رکھیں تو آپ پر موت وارد ہو سکتی ہے۔ لیکن جنسی جذبہ کی یہ صورت نہیں۔ جب تک آپ اس کا خیال نہ کریں یہ بیدار ہوتا ہی نہیں اور یہ بھی نہیں ہوتا کہ آپ اس کی تسکین کی صورت پیدا نہ کریں تو آپ بیمار پڑ جائیں یا آپ کی موت واقع ہو جائے۔ جنسی خواہش کو بار بار بیدار کرنے کے بعد اس کی تسکین نہ کی جائے، یا غلط طریقوں سے تسکین کی جائے تو اس سے البتہ بعض اعصابی بیماریاں اور نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسے اصطلاح میں جنسی بدنہادی (SEX-PERVERSION) کہتے ہیں۔ لیکن اگر اسے بیدار نہ کیا جائے تو اس سے عوارض کا پیدا ہونا تو ایک طرف انسان کے مضر جوہر اس قدر توانائی حاصل کر لیتے ہیں کہ عام حالات میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس قسم کے ضبطِ خویش کو قرآن ”عفت“ کہہ کر پکارتا ہے۔ میں اس موضوع پر تفصیل سے دیگر مقامات پر لکھ چکا ہوں جس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں (جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ میری کتاب ”سلیم کے ناخطوط جلد سوم“ میں ”جنسی تعلقات کا تمدن پر اثر“ اور ضبطِ ولادت“ سے متعلق خطوط ملاحظہ فرمائیں۔ بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن کریم کی رو سے منکوحہ بیوی سے مباشرت کے سوا، جنسی جذبہ کی تسکین کی کوئی شکل جائز نہیں!

قرآن کریم نے نکاح کے سلسلہ میں ایک اور شرط کا بھی ذکر کیا ہے۔ سورۃ النسا میں محرمات کی تفصیل دینے

کے بعد کہا ہے: **وَاحِلَ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ**۔ (۲/۲۶۱) ”ان عورتوں کے سوا باقی عورتوں سے نکاح حلال ہے بشرطیکہ تم انہیں نکاح کے لئے چاہو کچھ مال دے کر“۔ اس ”مال دینے“ کو اصطلاح میں **تہر** کہتے ہیں۔ (تہر اگرچہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ مہارت، ماہر، تہر وغیرہ الفاظ اسی مادہ سے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا۔ قرآن کریم میں اس کے لئے **صَدُقَتِهِنَّ** کی اصطلاح آتی ہے۔ (۲/۲۶۱) **يَا أَجُودَ هُنَّ** کی (۲/۲۶۱) **ذ ۵ ذ ۳۳ ذ ۶ ذ ۶۵ ذ ۶۴**۔ اجور، اجر کی جمع ہے۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہو سکتا ہے کہ یہ عورت کے ساتھ تعلقات کا ”معاوضہ“ ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ قرآن کریم نے اس کی وضاحت کر دی کہ یہ کسی چیز کا معاوضہ (اجرت) نہیں۔ یہ کسی معاوضہ کے خیال کے بغیر مرد کی طرف سے اپنی ہونے والی بیوی کے لئے تحفہ ہے۔ قرآن کریم نے اس کے لئے **مَحَلَّة** کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَتِهِنَّ مَحَلَّةً۔ ۴/۴)۔ جو بڑا ہی بلیغ اور (SUGGESTIVE) ہے۔ محل، شہد کی مکھی کو کہتے ہیں۔ محلہ کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح شہد کی مکھی سینکڑوں میل کی مسافت کر کے پھولوں کے رس کا ایک قطرہ لاتی ہے اور اسے بغیر کسی معاوضہ کے چھتہ میں جمع کر دیتی ہے، مرد کی طرف سے مہر اسی طرح تحفہ بیوی کو دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحفہ کا مفہوم اس سے بھی زیادہ وسیع اور عمیق ہے۔ جیسا کہ جلد دوم ص ۱۱۸۴۲۵، زیر آیت (۲/۲۶۱) میں بتایا گیا ہے۔ قرآن کریم مرد اور عورت کو مساوات کا درجہ دیتا ہے لیکن ازدواجی رشتہ استوار ہونے کی صورت میں قرآن کہتا ہے کہ عورت کا وزن مرد کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ نکاح کے ترازو میں عورت کا پلڑا اٹھکا ہوا ہوتا ہے، اور دونوں پلڑوں کو برابر کرنے کے لئے مرد کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اپنے ساتھ کوئی تحفہ بھی رکھے۔ اس طرح مرد + تحفہ = عورت، کی مساوات (EQUATION) صحیح بیٹھتی ہے۔ یہ ہے تہر کی صحیح پوزیشن۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے تہر کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان میں **صَدُقَتِهِنَّ** تو قابل فہم ہے۔ یعنی مرد اپنی ہونے والی بیوی کے لئے محبت اور لطافت کے جو جذبات اپنے دل میں رکھنا ہے، ان کی صداقت کے ثبوت (یا دلیل) میں کچھ تحفہ دیتا ہے۔ لیکن قرآن عیاں بیوی کا جو مقدس رشتہ استوار کرتا ہے اس کی روشنی میں ”**أُجُورَ هُنَّ**“ کی اصطلاح کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔

اس سلسلہ میں اس اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم عربوں کی زبان میں نازل ہوا اس لئے اس

نے اپنے ہاں وہی الفاظ اور اصطلاحات استعمال کی ہیں جو اس زمانے میں عربوں کے ہاں رائج تھیں۔ ان کے مفہوم کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ عرب انہیں کن معانی

عمر دوم سے مراد
اجور ہن سے مراد

میں استعمال کرتے تھے۔ اگر ان معانی میں اور ان میں جن میں انہیں قرآن استعمال کرتا ہے، کچھ فرق ہے تو قرآن اپنے معانی کی وضاحت کر دیتا ہے اور اس طرح اس کی صراحت کر دیتا ہے کہ اس لفظ یا اس اصطلاح کا قرآنی مفہوم کس طرح عربوں کے ہاں مروج یا قدیم سے مختلف ہے۔ (مثلاً عربوں کے ہاں خاوند کو بعل کہتے تھے۔ بعل زمانہ قدیم میں ایک بت کا نام تھا (۳۴/۱۲۵) اور خود عرب بھی اپنے بتوں کو بعل کہتے تھے۔ ان کے ہاں چونکہ خاوند کی حیثیت ”خدا“ (ہماری زبان میں ”مجازی خدا“) کی ہوتی تھی اس لئے انہوں نے خاوند کے لئے یہ لفظ وضع کر لیا تھا۔ ان کے لغت کی رو سے قرآن کریم نے بھی خاوند کے لئے یہی لفظ (بعل جمع بعلول) استعمال کیا ہے۔ (۲۳۸/۲۳۸ ذ ۲۳۸/۱۶۸ ذ ۲۳۸/۱۶۸ ذ ۲۳۸/۱۶۸ ذ)۔ لیکن اُس نے نکاح کے معاملہ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اسلام میں خاوند کی حیثیت بعل (خدا) کی نہیں، برابر کے رفیقِ حیات کی ہے۔ لہذا، ہم قرآن کے استعمال کردہ لفظ (بعل) کو اس کے لغوی معنوں میں نہیں لیں گے۔ اس سے مراد قرآنی حیثیت و مقام کا خاوند لیں گے۔

اس مثال سے لفظ اَجُورَہُنَّ کا استعمال اور اس کا صحیح مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اس نے نخلۃ کے الفاظ سے اجر (معاوضہ) کے تصور کی جڑ کاٹ دی۔ عورت کے ساتھ خلوت کے معاوضہ کا تصور تو پاکیزہ ذہنوں کو اُن متعفن اور تاریک گوشوں کی طرف لے جاتا ہے جہاں بوئے فحش کے بھیکے ابھرتے ہیں۔ قرآن کا عطا کردہ میاں بیوی کا تعلق پاکیزگی اور نظافت کی حسین و جمیل جنت اپنے آغوش میں رکھتا ہے۔ اس میں معاوضہ کا کیا سوال؟ وہاں تو من تو شد من تو من شدی کی کیفیت ہوتی ہے۔

یہ ہے تہر کی قرآنی پوزیشن۔ چونکہ اس کا پیش (یا ادا) کرنا، حکمِ خداوندی ہے، اس لئے اس کے لئے فریضہ کا لفظ بھی آیا ہے۔ (۳۳۶-۳۳۷)

تہر تحفہ ہے اور تحفہ کی کوئی مقدار یا تعداد متعین نہیں کی جاسکتی۔ چونکہ اس کا ادا کرنا فرض ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اسے خاوند کی حیثیت (استطاعت) کے مطابق ہونا چاہیے۔ استطاعت کی نسبت سے یہ ”سونے کا ڈھیر“ بھی ہو سکتا ہے۔ (۲/۳۳۶)

تہر کی ادائیگی نکاح کے ساتھ ہی ہو جانی چاہیے لیکن سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۶ سے ظاہر ہے کہ ایسی صورت بھی ہو سکتی ہے کہ نکاح ہو جائے لیکن تہر مقرر نہ کیا گیا ہو۔ ارشاد ہے لَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوْهُنَّ اَوْ تَقْرَبُوْا لِهِنَّ فَرِیْضَةً (۲/۲۳۶) ”اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ تم ایسی عورتوں کو طلاق دے دو جنہیں تم نے چھوا نہیں یا جن کا ہر مقرر نہیں کیا جاسکا۔“ اس آیت کا بنیادی تعلق تو طلاق سے

ہے جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ یہاں ہم نے اسے صرف یہ بتانے کے لئے درج کیا ہے کہ ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ نکاح ہو جائے لیکن تہر مقرر نہ کیا جاسکا ہو۔ لیکن ایسی صورت شاذ ہوگی..... معمول یہی ہے کہ تہر نکاح کے وقت مقرر اور ادا کیا جائے۔

(۱) اگر تہر نکاح کے ساتھ ادا نہ کیا گیا ہو تو میاں بیوی کی رضامندی سے اس میں بعد میں کمی بیشی بھی کی جاسکتی ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا تَرَضَيْتُمْ مِنْهُ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيزَةِ۔ (۲/۲۲۱)۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تہر مقرر ہو جانے کے بعد تم باہمی رضامندی سے اس میں کمی بیشی کر لو۔ دوسری جگہ ہے:-
وَأَتُوا النِّسَاءَ صَدُقَتِهِنَّ نِحْلَةً فَإِنْ طِبَّنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا۔ (۲/۲۲۱)

تم اپنی بیویوں کا تہر کسی معاوضہ کا خیال کئے بغیر اس طرح ادا کر دیا کرو جس طرح شہد کی مکھی شہد دے دیتی ہے۔ ہاں اگر وہ خود اپنی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں تو تم اسے بلا تامل اپنے صرف میں لاسکتے ہو۔

(۲) نکاح کے بعد قبل از خلوت طلاق ہو جائے تو:-

(۱) اگر تہر مقرر نہیں ہوا تھا تو خاوند کی استطاعت کے مطابق اسے کچھ دے دینا چاہیے:-

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً وَمَتَّعُوهُنَّ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدَرَهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ۔ (۲/۲۳۶)

اور اگر ایسی صورت ہو کہ تم نے ابھی اپنی منکوحہ بیوی کو چھوئے نہیں۔ اور نہ ہی اس کا تہر مقرر ہوا تھا اور طلاق کی نوبت آجائے، تو اس صورت میں بھی قانون کے مطابق طلاق دیدینے میں کچھ مضائقہ نہیں لیکن چاہیے کہ اس مطلقہ کو کچھ ساز و سامان دیدیا جائے۔ صاحب وسعت اپنی حیثیت کے مطابق اور تنگدست اپنی بساط کے مطابق۔ تاکہ مطلقہ ہونے کی وجہ سے اس عورت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی کچھ تلافی ہو جائے۔ اس قسم کا حسن کارنامہ سلوک تم پر واجب ہے۔

(۲) اگر تہر مقرر ہو چکا تھا تو اس کا نصف ادا کرنا ہوگا:-

وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَإِنْ

تَعَفُّوْا اَثَرَبَ لِلتَّقْوٰی وَلَا تَنْسُوْا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
بَصِيْرٌ (۲/۲۲۱)

اور اگر ایسا ہو کہ تم نے اپنی منکوحہ سے مقاربت نہیں کی، لیکن اس کا مہر مقرر ہو چکا تھا اور طلاق کی نوبت آ جاتے، تو اس صورت میں اس کے مہر کا نصف ادا کرنا ضروری ہے۔

لیکن اگر صورت وہ ہو جسے (۲/۲۲۹) میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی مرد کو کچھ معاوضہ دلایا جانا مقصود ہو، تو عورت اپنا حق چھوڑ سکتی ہے۔ اور اگر شکل یہ ہو کہ نکاح کی گرہ کو مرد کھولنا چاہتا ہے (یعنی طلاق کا مطالبہ اس کی طرف سے ہے) تو وہ نصف کے بجائے پورا مہر ادا کر دے تو زیادہ اچھا ہے۔ اس قسم کا باہمی مراعات کا برتاؤ قانونِ خداوندی کے منشاء سے زیادہ قریب ہے۔ اس لئے تم آپس میں حسن سلوک کو کبھی نہ بھولو۔ الگ بھی ہو تو فراخ دلی کا ثبوت دے کر الگ ہو۔ اللہ کا قانونِ مکافات تمہارے ہر عمل پر نگاہ رکھتا ہے۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ عورت بذاتِ خود اپنا حق چھوڑ دے یا ”جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے“ وہ چھوڑ دے۔ ان الفاظ (بیدۃ عقدۃ النکاح) سے ہمارے ہاں یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ نکاح کی گرہ ”خاوند کے ہاتھ میں ہونی ہے۔ وہ چاہے تو اسے باندھے رکھے اور جس وقت چاہے اسے کھول دے عورت (بیوی) کا اس میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ طلاق کا کلی اختیار مرد کو حاصل ہوتا ہے طلاق

طلاق کا حق

کے متعلق تفصیلی گفتگو تو آگے چل کر کی جائے گی، یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ یہ کہنا کہ طلاق کا کلی اختیار مرد کو حاصل ہے، بیوی اس کے قبضہ میں ہوتی ہے، قرآن کی تعلیم، ہدایات، قوانین اور منشاء کے خلاف ہے۔ نکاح ایک معاہدہ ہے اور جس طرح اس کے باندھنے کے لئے فریقین کو کلی اختیار ہوتا ہے، اسی طرح اسکے کھولنے (ختم کرنے) کا اختیار بھی فریقین کو یکساں حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے (نکاح کے عنوان میں) بتایا جا چکا ہے۔ نکاح کے معاملہ میں عورت خود مختار ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ چاہے تو کسی کو اپنی طرف سے ”مختار نامہ“ دے سکتی ہے۔ بیدۃ عقدۃ النکاح سے مراد وہ شخص ہے جسے عورت نے اپنا مختار مقرر کیا ہو یا خود عدالت جس نے طلاق کے تضمینات کا فیصلہ کرنا ہو۔ بہر حال اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ عورت چاہے تو اپنا حق مہر چھوڑ سکتی ہے۔ (اسی طرح مرد بھی اپنا حق چھوڑ سکتا ہے یعنی وہ چاہے تو عورت کو نصف مہر کے بجائے پورا مہر ادا کر دے) لیکن یہ باہمی رضا مندی کی صورت ہے۔ قانونی پوزیشن یہی ہے کہ عورت کو نصف مہر ادا کرنا ہوگا۔ طلاق کی صورت میں مہر کی کچھ اور شرائط بھی ہیں لیکن اسے ہم طلاق کے عنوان میں بیان کریں گے۔

واضح رہے کہ لڑکی کو جہیز دینا محض ایک رسم ہے۔ قرآن کریم میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ اگر لڑکی کے ماں باپ

یا دیگر اعزہ اور احباب اسے کچھ تحفہ دینا چاہیں تو اس کی کوئی مانعت نہیں لیکن لڑکے

جہیز ایک ہے

کی طرف سے جہیز کا مطالبہ ایسی پست ذہنیت کا مظاہرہ ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا

جاسکتا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، قرآن کریم نے تو مرد پر فریضہ عائد کیا ہے کہ وہ عورت کو کچھ تحفہ دے، نہ یہ کہ الٹا

اس سے کچھ طلب کرے۔ چونکہ ہمارے معاشرہ میں اچھے رشتوں کی کمی ہے اور لڑکی کے والدین اس باب میں پریشان

رہتے ہیں، اس لئے بنظر غائر دیکھا جائے تو جہیز کا مطالبہ ان کی اس پریشانی کو (EXPLOIT) کرنا ہوتا ہے۔

اب آپ سوچئے کہ جس رشتہ کا آغاز ہی استحصال کی نیت سے ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟ آغاز کیا، یہاں تو ابھی

تک (ایام جاہلیہ کی طرح) خاوند ساری عمر یہ سمجھتا رہتا ہے کہ اس نے اپنی بیوی سے شادی کر کے اسکے والدین

پر احسان عظیم کیا ہے اور وہ عمر بھر کے لئے اس کے دیل ہو گئے ہیں اور انہیں ایسا ہی رہنا چاہیے۔ اگر اس کے

سسرال والے اس کے کسی مطالبہ کو نہیں مانتے (خواہ وہ کیسا ہی غیر معقول کیوں نہ ہو) تو وہ اپنی بیوی کو تنگ

کرتا ہے تاکہ وہ اپنے ماں باپ کو مجبور کر کے اس کے "بعل" کے نہایت نامعقول مطالبہ کو پورا کر آئے۔ اور وہ

اسے دھمکی دیتا ہے کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ اسے اس کے میکے بھیج دے گا۔ یہ اُس دور کی ذہنیت کا

مظاہرہ ہے جب آدمی ہنوز انسانیت کی سطح پر نہیں پہنچا تھا۔ شریف انسان کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر

سکتا۔ قرآن کریم نے تو نسبی اور سسرالی رشتوں کو ایک ہی سطح پر رکھا ہے۔ (۲/۲۵)۔ تفصیل ذرا آگے چل کر

آتی ہے۔

(۱)

اس طرح نکاح کی تکمیل سے ایک مرد اور عورت، قرآنی قانون کی رُو سے، میاں بیوی بن جاتے ہیں۔ پہلے

بتایا جا چکا ہے کہ نکاح سے مقصد سکینت، رحمت، مودت۔ یعنی مرد اور عورت کی جنت بداماں ازدواجی زندگی

بسر کرنا ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے میاں بیوی کی باہم درگ پویشگی اور جذبیت کو ایک نہایت خوبصورت استعارہ

میں بیان کیا ہے جب کہا کہ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ (۲۱) "تمہارا باہمی رشتہ جسم

اور لباس کا سا ہے۔ وہ تمہارے لئے بمثل لباس کے ہیں۔ تم ان کے لئے مانند لباس کے ہو۔" تم دونوں کے درمیان

کوئی اور حائل نہیں ہو سکتا۔ یہ انتہائی قرب، رازداری اور اعتماد کی صورت ہوتی ہے۔ اس قسم کے باہمی رشتے کا

تعلق تو جذبات سے ہے لیکن باہمی ہمدردی، قرآن کریم زندگی کے اس نہایت اہم مسئلہ کے قانونی پہلو کو بھی نظر انداز

نہیں کرتا اور بتاتا ہے کہ اس رشتہ میں حقوق اور ذمہ داریوں کی شکل کیا ہوگی، اسے اس نے چار لفظوں میں ایسی جامعیت سے سمودیا ہے کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ فرمایا: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲۲۸)۔ "تانونِ خداوندی کی رُو سے عورتوں کی جس قدر ذمہ داریاں ہیں، اتنے ہی ان کے حقوق ہیں" یعنی ہر ذمہ داری کے مقابلہ میں ایک حق۔

اس مقام پر ایک آیت کی وضاحت ضروری ہے۔ ہم نے جلد دوم ص ۱۲۵-۱۱۴، زیر آیت (۲۲۸) میں بتایا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے مردوں اور عورتوں کی حیثیت مساوی ہے اور کسی ایک جنس کو دوسری جنس پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ اس کے خلاف ہمارے قدامت پرست طبقہ کا عورت کے متعلق جو پست نظریہ ہے اس کی وضاحت بھی وہاں کر دی گئی ہے۔ لیکن ان کی طرف سے اپنے نظریہ کی تائید میں جو آیت پیش کی جاتی ہے۔

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ (۲۳۴) اس کے متعلق کہا گیا تھا کہ اس کا صحیح مفہوم اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے مناسب مقام یہی ہے۔ پوری آیت یہ ہے:-

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَالضِّلَاحُتُ قُنْتُ حِفْظُ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ وَالَّتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا - إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا كَبِيرًا - (۲۳۴)۔

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

مرد حاکم ہیں اور عورتوں کے بہ سبب اس کے کہ بزرگی دی اللہ نے بعض ان کے کو اور بعض کے۔ اور بہ سبب اس کے کہ خرچ کرتے ہیں مالوں اپنے سے۔ پس نیک سخت عورتیں فرماں بردار ہیں نگہبانی کرنے والی ہیں بیچ غائب کے ساتھ محافظت اللہ کے۔ اور جو عورتیں کہ تم ڈرتے ہو چڑھا کی ان کی سے۔ پس نصیحت کرو ان کو، اور چھوڑو ان کو بیچ خواب گاہ کے۔ اور مارو ان کو۔ پس اگر کہا مانیں تمہارا پس مت ڈھونڈو اوپر ان کے راہ تحقیق اللہ ہے بلند بڑا۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدین)

لے اس آیت میں وللرجال علیہن رجۃ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ ان کی تشریح عدت کے ضمن میں کی جائے گی۔

یعنی چونکہ مرد کھاتے ہیں اور عورتوں پر اپنا روپیہ صرف کتے ہیں اس لئے وہ عورتوں پر حاکم ہیں۔ عورت کا کام یہ ہے کہ وہ مرد کی فرمانبرداری ہے اور اگر اس کی فرماں برداری میں کوئی فرق آجائے تو مرد کو یہ بھی حق حاصل کہ اسے مارے پیٹے۔

یہ ہے عورت کی پوزیشن اس قرآن کی رو سے جو ہمارے مروجہ ترجموں سے سمجھا جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ میں اس آیت کے صحیح مفہوم تک پہنچوں، ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے..... جب میں کہتا ہوں کہ ہمارے مروجہ ترجمے قرآن کا صحیح مفہوم پیش نہیں کرتے تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ بزرگ جنہوں نے یہ ترجمے کئے تھے عربی کے بڑے بڑے عالم تھے۔ پھر کیا ہوا کہ یہ صحیح ترجمہ نہ کر سکے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے وہ مالک بھی موجود ہیں جن کے باشندوں کی مادری زبان عربی ہے۔ اگر وہ بھی قرآن کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے تو پھر اور کون صحیح مفہوم سمجھے گا۔

یہ اعتراضات بظاہر بڑے وزنی ہیں اس لئے ان کے جواب کے لئے اصل حقیقت کا سمجھنا.... ضروری ہے۔ جن

بزرگوں نے یہ ترجمے کئے ہیں ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ یہ کیسے متعین کیا جائے

کہ قرآن کے فلاں لفظ کا مفہوم کیسا ہے۔ انہیں لامحالہ اہل زبان ہی کی طرف

ترجمے صحیح کیوں نہیں ہوتے

رجوع کرنا تھا۔ ہمارے ہاں تیسری صدی ہجری سے بے کر ان بزرگوں تک سینکڑوں تفاسیر عربی زبان میں لکھی گئی تھیں۔

ان میں سے بعض مفسرین، تفسیر کے علاوہ، عربی ادب کے بھی امام تسلیم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً تفسیر کشاف کے مصنف علامہ

ذخشری یا تفسیر جلالین، جس میں التزام یہ کیا گیا ہے کہ قرآن کے الفاظ کے مرادف عربی الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں۔ ہمارے

مترجمین کے لئے عربی کی ان تفسیروں میں بیان کردہ مفہوم سند کا درجہ رکھتا تھا۔ اسی طرح عربی مالک کے باشندوں کے

لئے بھی ان عربی تفاسیر میں بیان کردہ مفہوم سند کا درجہ رکھتا ہے۔ یعنی جو کچھ ان عربی کی تفسیروں میں لکھا گیا ہے، اسے

قرآن کا صحیح مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ہمارے ترجموں میں قرآن کریم کا جو مفہوم دیا گیا ہے (یا جو مفہوم

خود عربی بولنے والے سمجھتے ہیں) وہ دراصل قرآن کا وہ مفہوم ہے جو ہمارے اسلاف کی تفاسیر میں درج ہو چکا تھا

مثال کے لئے یہی (زیر نظر) آیت دیکھئے۔ اس میں الرَّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ میں قَوَّامُونَ کا ترجمہ

کیا گیا ہے حاکم۔ ہمارے بزرگوں نے قَوَّامُونَ کا مفہوم سمجھنے کے لئے ان عربی تفاسیر کو دیکھا تو کثافت میں اس

کا مفہوم لکھا تھا مسیطرین۔ یعنی داروغے۔ اور جلالین میں لکھا تھا۔ متسلطین یعنی عورتوں پر مسلط۔ اب

ظاہر ہے کہ جب ہمارے مترجمین نے دیکھا کہ یہ ائمہ تفسیر و ادب، قَوَّامُونَ کا مفہوم مسیطرین اور متسلطین

بتاتے ہیں تو انہوں نے اس کا ترجمہ حاکم کر دیا۔ یہ ان الفاظ کا صحیح ترجمہ ہے لیکن یہ ترجمہ قرآن کے لفظ قَوَّامُونَ کا نہیں بلکہ قَوَّامُونَ کے اس مفہوم کا ترجمہ ہے جو کشاف اور جلالین میں دیا گیا ہے۔ لہذا، ہمیں (ان ترجموں کے بجائے) یہ دیکھنا چاہیے کہ ان تفاسیر میں یہ مفہوم کس طرح آگیا۔

یہ تفاسیر اس دور میں لکھی گئی تھیں جب ہمارے معاشرے پر ملکیت کا استبداد غالب آچکا تھا اور ہماری ”شرعیّت“ اور ”طریقت“ مجوسیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے تصورات سے متاثر ہو چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جس میں عورت کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر قرار پا چکی تھی۔ ان تفاسیر میں سب سے پہلے طبری کی تفسیر لکھی گئی۔ (باقی تفسیریں درحقیقت اسی تفسیر پر لکھی ہوئی ”طرحی غزلیں“ ہیں) طبری کا انداز یہ ہے کہ اس میں قرآن کا مفہوم روایات کی رُو سے متعین کیا گیا ہے۔ یہ روایات کس طرح وضع ہوئیں اور انہیں کیسے مرتب اور جمع کیا گیا اس کے لئے کتاب ”مقام حدیث“ ملاحظہ کیجیے۔ روایات کی تاریخ سے اس حقیقت کا سمجھنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ روایات کے وضع کرنے میں کوئی دشواری ہی نہ تھی۔ یہ روایات عکس ہیں اس معاشرے کا جس میں یہ وضع کی گئی تھیں (نہ کہ سُوئے کے عہد مبارک کا) اب ظاہر ہے کہ قرآن کا جو مفہوم ان روایات کی رُو سے متعین کیا گیا تھا وہ کس قسم کا ہوگا، اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے پھر اسی آیت کی مثال سامنے لائیے جو اس وقت زیر نظر ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ کشاف وغیرہ نے قَوَّامُونَ کا مفہوم متسلّطین اور مسیطرین بیان کیا ہے۔ اور

اسی آیت سے عورتوں کو مارنے پیٹنے کا جواز نکالا ہے۔ اس آیت کی ”شان نزول“ میں جو روایا

روایات

ہماری کتابوں میں لکھی ہیں ان میں کہا گیا ہے کہ ایک عورت نے نبی اکرمؐ سے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے۔ آپؐ نے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا کہ یہ آیت نازل ہو گئی اور حضورؐ کو اپنا فیصلہ پس لینا پڑا۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ عورتوں کو مارنا نہ کرو۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ آپؐ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ عورتیں آپؐ کے حکم کو سن کر اپنے خاوندوں پر دلیر ہو گئی ہیں۔ اس پر آپؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دے دی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار پیٹ شروع ہو گئی اور بہت سی عورتیں شکایت لے کر آپؐ کے پاس آئیں۔ اس پر آپؐ نے مردوں سے کہا کہ جو لوگ عورتوں کو مارتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے لیکن جب آپؐ نے عورتوں کو اس کا بدلہ دلوانا چاہا تو یہ آیت نازل ہو گئی۔ لہذا حکم یہی رہا کہ چونکہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس لئے انہیں مار پیٹ سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت اشعثؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عمرؓ کا مہمان ہوا۔ اتفاقاً میاں بیوی میں ناچاقی ہو گئی اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی کو مارا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے کہ اشعثؓ! تیں باتیں یاد

رکھو جو میں نے رسول اللہ سے سن کر یاد رکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے بیوی کو کس بنا پر مارا۔
..... دوسرے یہ کہ وتر پڑھے بغیر نہ سونا اور نمیری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی ہے۔

یہی نہیں کہ مردوں کو عورتوں پر حاکم مقرر کیا گیا ہے بلکہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ وہ ماسوائے اللہ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

یہ ہیں وہ روایات جو زیر نظر آیت کی تفسیر میں ہماری سب سے قدیم کتب تفاسیر میں مذکور ہیں۔ انہی روایات کی بنا پر قواموں کا مفہوم متسلطین (غلبہ و تسلط کے مالک) اور مستیطین (داروغہ) لیا گیا اور اسی مفہوم کا ترجمہ ہمارے ہاں حاکم کیا گیا۔ پھر انہی کے مطابق ہماری فقہ کے احکام مدون ہوئے۔ چنانچہ فقہ حنفی کے امام جصاص نے احکام القرآن میں انہی روایات و تفاسیر کی بنا پر عورتوں کو مارنے سیٹنے اور بند رکھنے کے تمام فقہی قوانین بیان کر دیئے ہیں۔

ان روایات کی وجہ سے ایک بڑی مشکل اور بھی واقع ہو گئی۔ اگر ہمارے یہ مفسرین حضرات قرآنی آیات کا مفہوم اپنی طرف سے متعین کرتے تو بعد میں آنے والوں کے لئے اتنی گنجائش رہ سکتی تھی کہ ان کے بیان کردہ مفہوم سے اختلاف کر سکتے۔ لیکن جب انہوں نے اپنے بیان کردہ مفہوم کی تائید میں رسول اللہ کی طرف منسوب کردہ احادیث درج کر دیں تو ان کا متعین کردہ مفہوم رسول اللہ کا بیان فرمودہ مفہوم قرار پا گیا۔ اس کے بعد کس کی مجال تھی کہ وہ اس مفہوم سے اختلاف کا خیال تک بھی ذہن میں لاسکتا۔ چنانچہ جس کسی نے اس مفہوم سے اختلاف کا خیال ظاہر کیا اسے فوراً کہہ دیا گیا کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسول اللہ زیادہ بہتر سمجھتے تھے؟ اب کون سا ایسا سوختہ بخت مسلمان ہے جو یہ کہہ سکے کہ میں رسول اللہ سے بھی بہتر قرآن سمجھتا ہوں۔ اس طرح ان تفاسیر میں بیان کردہ مفہوم ابدی طور پر مستند قرار پا گئے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم رسول اللہ کے متعین فرمودہ نہیں تھے بلکہ یہ ان روایات کی رو سے متعین کئے گئے تھے جو رسول اللہ کی وفات کے سینکڑوں سال بعد وضع کی گئیں۔ رسول اللہ کا متعین فرمودہ مفہوم وہ ہو سکتا تھا جسے رسول اللہ قرآن کے ساتھ خود ایک کتاب میں لکھ کر یا لکھوا کر مستند طور پر امت کو دے کر جاتے۔ رسول اللہ نے کوئی ایسی تفسیر امت کو نہیں دی۔ اس لئے ان کتب تفسیر میں بیان کردہ مفہوم رسول اللہ کا نہیں، خود ہمارے مفسرین کا مفہوم ہے جو اس دور میں متعین کیا گیا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے لیکن جس کی تائید میں وہ روایات درج کر دی گئیں جو رسول اللہ

کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔

اس سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ ”الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ“ میں قَوَّامُونَ کا ترجمہ حاکم، متسلط، اور داروغہ کس طرح کیا گیا۔ اس مقام پر ایک لطیف بات کا ذکر بھی فائدہ سے خالی نہ ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو اس کا احساس ہو کہ ان روایات کی رو سے ممکن ہے کوئی غیر مسلم یہ اعتراض کر دے کہ رسول اللہ نے عورتوں کے ساتھ اس قسم کے سخت سلوک کی اجازت کیسے دے دی، اب دیکھئے کہ اس اعتراض سے بچنے کی صورت کیا پیدا کی گئی! ایک روایت میں ہے کہ جب آپ نے اس عورت کو جس نے اپنے خاوند کی شکایت کی تھی، بدلہ لینے کی اجازت دی تو خدا کی طرف سے (الرِّجَالُ قَوَّامُونَ) والی آیت نازل ہو گئی۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا آمَرَ دَنَا امْرَأًا اَوْ اَمْرًا اَدَّ اللّٰهُ عَجْرًا۔ یعنی ہم نے کچھ اور چاہا تھا اور اللہ نے اس کے خلاف حکم دے دیا۔ آپ سمجھے کہ یہ بات کیا ہوئی! اس سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ رسول اللہ تو چاہتے تھے کہ عورتوں سے عدل و انصاف کیا جائے۔ لیکن جب خدا نے اس کے خلاف حکم دے دیا تو رسول اللہ مجبور ہو گئے۔ لہذا آپ کو بھی اسی کے مطابق تعلیم دینی پڑی۔

اس روایت کے وضع کرنے والے نے بزعیم خویش، رسول اللہ کو تو اس اعتراض سے بچا لیا، لیکن اتنا نہ سوچا کہ وہی اعتراض اب خود خدا پر بھی عاید ہو گیا۔ بلکہ اعتراض کی شدت اس اعتبار سے اور بھی بڑھ گئی کہ خود رسول اللہ نے خدا کے حکم کی سختی کو محسوس کیا، جبھی تو کہا کہ ہم کچھ اور چاہتے تھے اور خدا نے کچھ اور ہی حکم دے دیا۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ روایت وضعی ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ جو اپنی مرضی کو پورے پورے طور پر خدا کی مرضی (یعنی قَالُوا لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ) سے ہم آہنگ رکھتے (اور ہم آہنگ رکھنے کی تمنا کرتے) تھے، کبھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم کچھ اور چاہتے تھے اور خدا نے کچھ اور حکم دیدیا۔

(۰)

اب آیت ”الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ“ کے صحیح مفہوم کی طرف آئیے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اس آیت میں میاں اور بیوی کے متعلق بات نہیں ہو رہی۔
آیت کا صحیح مفہوم | الرِّجَالُ (عام مردوں) اور النِّسَاءُ (عام عورتوں) کے متعلق بات ہو رہی

لہ جو لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے تمام عمر جو کچھ فرمایا وہ خدا کی طرف سے وحی (غیر متلو) کی رو سے ہوتا تھا، وہ غور کریں کہ رسول اللہ نے یہ کیوں فرمایا کہ ہم نے کچھ اور چاہا تھا اور خدا نے کچھ اور حکم دے دیا۔

ہے، اس لئے یہاں گفتگو یہ ہے کہ معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کے فرائض مفوضہ کیا ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ عورتیں اپنے خصوصی فرائض کی اہم انجام دہی کی وجہ سے اکتسابِ رزق سے معذور ہو جاتی ہیں۔ ان کے برعکس مردوں کا سارا وقت اس کے لئے فارغ ہوتا ہے۔ لہذا قرآن نے تقسیم کار کے اصول کے مطابق مردوں کا فریضہ یہ بتایا کہ وہ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ ہیں۔ لغت میں قَامَ الرَّجُلُ عَلَى الْمَرْأَةِ کے معنی دیئے ہیں مَأْنَهَا۔ یعنی اس نے روزی مہیا کی۔ قَوَّامٌ عَلَيْهِمَا کے معنی ہیں مَأْنٌ لَهَا۔ یعنی اس کی روزی مہیا کرنے والا۔ اس سے آیت کا مفہوم واضح ہو گیا۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ یعنی معاشرہ میں مردوں کے ذمے یہ فریضہ ہے کہ وہ اکتسابِ رزق کریں۔ اس لئے کہ (بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ) تقسیم کار کے اصول کی بنا پر ایک قسم کی استعدادِ مردوں کو زیادہ دی گئی ہے اور دوسری قسم کی استعدادِ عورتوں کو۔ اور چونکہ مردوں کا سارا وقت اکتسابِ رزق کے لئے فارغ ہوتا ہے اور عورتیں اس سے معذور ہو جاتی ہیں، اس لئے مردوں کا کمایا ہوا رزق عورتوں کی ضروریات کی کفالت کرتا ہے۔ رَجِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ) اس سے عورتوں کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی جائیں گی اور ان کی صلاحیتیں نشوونما پائیں گی (فَالصَّلَاحُ) اور انہیں فراغت نصیب ہو جائے گی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اسی مصرف میں لائیں جس کے لئے وہ خاص صلاحیتیں پیدا کی گئی ہیں۔ یہ معنی ہیں قِنِيتُ کے۔ سقاء قنیت اس مشکیزے کو کہتے ہیں جس میں پانی بھرنے کے بعد اسے اس طرح اچھی طرح سی کر بند کر دیا جائے کہ وہ اپنا پانی محفوظ رکھے۔ راستے میں کہیں نہ گرائے اور جہاں ضرورت ہو وہاں اس کا منہ کھل سکے۔ اگر عورتوں کو اکتسابِ رزق کرنا پڑے تو جس مقصد کے لئے انہیں خاص صلاحیتیں دی گئی تھیں وہ مقصد پورا نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ صلاحیتیں غیر محل میں صرف ہو جائیں گی۔ اس کے بعد دو لفظوں میں اس نکتہ کو اور بھی واضح کر دیا جب فرمایا کہ حَفِظْتُ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ۔ یعنی جب اللہ کے قانون نے اس طرح ان کی حفاظت (پرورش) کا سامان ہم پہنچا دیا تو انہیں اطمینان اور فرصت مل گئی کہ وہ اس چیز کی حفاظت کر سکیں جو پوشیدہ طور پر ان کے سپرد کی گئی ہے (یعنی جنین کی حفاظت)

یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن، عورتوں کے خصوصی فرائض اور ان سے متعلقات امور کا تذکرہ نہایت سنجیدہ استعاروں میں کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے مروجہ تراجم اور تفاسیر کی رو سے بات یوں بیان کی جاتی ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں۔ کیونکہ وہ ان پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ (ان کے برعکس) نیک بیویوں (فَالصَّلَاحُ) کا شبہ یہ ہے کہ وہ فرماں بردار (قِنِيتُ) ہوتی ہیں اور مرد کی غیر حاضری

میں اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہیں۔ یعنی مردوں کا کام یہ ہے کہ عورتوں پر حکومت کریں۔ اور عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ مردوں کی فرمانبرداری کریں اور عصمت کی حفاظت۔ گویا صَلَاحَات اور قِنَات اور حِفْظ ہونا صرف عورتوں کے لئے ہے۔ حالانکہ قرآن نے سورہ احزاب (۳۳) میں یہ سب خصوصیات مردوں اور عورتوں دونوں میں مشترکہ طور پر بیان کی ہیں۔ اس لئے اگر 'فرماں بردار' ہونا عورت کے لئے ضروری ہے تو قرآن کی رو سے مرد کے لئے بھی ضروری ہے۔ لہذا، یہ مفہوم کہ مرد کمانے اور حکومت کرنے کے لئے ہیں، اور عورتیں، مردوں کی فرمانبرداری کرنے کے لئے، اس اعتبار سے بھی غلط ہے۔ مرد اور عورت کا باہمی تعلق رفاقت کا ہے اور رفاقت میں ایک کی حکومت اور دوسرے کی فرمانبرداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے رفیق (زوج) ہوتے ہیں اور قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنے والے۔

اب آگے بڑھیے۔ آیت کا باقی ماندہ حصہ یہ ہے۔ (وَالَّتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَ

اهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاصْبِرْ بُوْهُنَّ)۔ چونکہ ہماری تفسیروں

عورتوں کو مارنا

میں یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ مرد کا کام عورت پر حکومت کرنا اور عورت کا کام مرد کی فرماں برداری کرنا ہے، اس لئے باقی ماندہ آیت کا مفہوم، اسی کی تائید میں لیا گیا کہ اگر بیوی، مرد کی فرمانبرداری نہ کرے تو وہ پہلے اسے سمجھائے بھلے، پھر اس سے باہمی تعلقات منقطع کر لے۔ اور اس پر بھی کام نہ چلے تو اسے مارے۔

لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہاں گفتگو میاں بیوی کے متعلق نہیں ہو رہی، عام مردوں اور عورتوں کے فرائض کے متعلق ہو رہی ہے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق، مردوں کا فریضہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اکتسابِ رزق کریں اور عورتیں، رزق کی طرف سے یوں مطمئن ہو جانے کے بعد اپنے خصوصی فرائض کو بطریقِ احسن سرانجام دیں۔ اس کے بعد کہا گیا کہ اگر عورتیں ان انتظامات کے باوجود (جن کی رو سے وہ اکتسابِ رزق کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہیں) معاشرہ کے اس نظم اور تقسیمِ کار کے اصول سے بلا عذر سرکشی اختیار کریں (جیسا کہ آج کل یورپ کے بعض ممالک میں ہو رہا ہے) تو معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس قسم کی فوضولیت (ANARCHY) کو روکے۔ اس لئے کہ اگر عورتوں نے مرد بننے کے چاؤ میں، بلا عذر اپنے فرائض کو چھوڑ دیا تو نسلِ انسانی کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے گا۔ اس کے لئے کہا گیا کہ معاشرہ ایسا انتظام کرے کہ پہلے تو اس قسم کی ذہنیت رکھنے والی عورتوں

کو سمجھانے کی کوشش کی جلتے کہ ان کی یہ روش معاشرہ کے لئے کس قدر تباہی کا موجب ہے۔ اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئیں تو پھر انہیں ان کی خواب گاہوں میں چھوڑ دیا جائے۔ یہ ایک قسم کی نظر بندی (INTERNMENT) کی سزا ہوگی۔ اور اگر وہ اس پر بھی سرکشی سے نہ ہٹیں تو پھر انہیں عدالت کی طرف سے بدنی سزا (CORPORAL PUNISH-MENT) بھی دی جاسکتی ہے۔

یہ ہے صحیح مفہوم اس آیت کا جس کی رو سے ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ خاوند عورتوں پر حاکم اور داروغے ہیں۔ اور انہیں حق حاصل ہے کہ وہ بیویوں کو اپنا محکوم رکھیں۔ کیونکہ بیوی مرد کی کمائی کھاتی ہے۔ بیوی کا فرض یہ ہے کہ وہ خاوند کی تابعدار رہے۔ اور اگر وہ اس کی فرماں برداری نہ کرے تو میاں کو حق حاصل ہے کہ وہ ڈنڈے کے زور سے اپنا حکم منواتے۔

(۱۰)

مردوں اور عورتوں کی مساوات کے خلاف دو اعتراضات اور بھی کئے جاتے ہیں۔ یعنی

(i) وراثت میں لڑکی کا حصہ لڑکے سے آدھا کیوں ہے؟ اور

(ii) شہادت کے لئے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر کیوں قرار دیا گیا ہے؟

جہاں تک وراثت کا تعلق ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ (ملاحظہ

ہو ۲۲)۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، قرآن کریم کی رو سے ایک ایسا معاشرہ

قائم ہوتا ہے جس میں اکتسابِ رزق کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے

وراثت میں لڑکی کا حصہ

ذمے ہوتی ہے۔ کیونکہ ان فرائض و واجبات کی ادائیگی سے جو بنیادی طور پر عورت کے ذمے ہوتے ہیں، عورت

کو اتنی فرصت نہیں مل سکتی کہ وہ اکتسابِ رزق کا بوجھ اٹھا سکے۔ اب ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں اکتسابِ معاش

کی ذمہ داری مرد کے سر پر ہوا اس میں معاشی اسباب کی تقسیم میں مرد کا حصہ یقیناً زیادہ ہونا چاہیے۔ یہ وجہ ہے

کہ ترک میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رکھا گیا ہے۔ لڑکیوں کے ذمہ نہ اپنے اخراجات کی کفالت ہوتی ہے

نہ اپنے خاندان کے رزق کی کفالت۔ اس کے برعکس لڑکے نے اپنے لئے بھی اکتسابِ رزق کرنا ہے اور اپنے

بیوی بچوں کے لئے بھی۔ اس لئے اسے زیادہ حصہ ملنا چاہیے۔ جہاں ایسی صورت نہیں وہاں عورت کا حصہ مرد کے

برابر رکھا گیا ہے۔ مثلاً ماں باپ میں سے ہر ایک کا حصہ (۱/۲)۔ یا کلا لہ کی صورت میں بہن اور بھائی میں سے ہر ایک

کا حصہ (۱/۲) (تفصیل قانونِ وراثت کے ضمن میں اپنے مقام پر ملے گی)۔

لیکن اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مرد اپنے اس فرض کو نظر انداز کر رہے ہوں اور لڑکیوں کے متعلق ایسا ہو کہ وہ کس مہر کی حالت میں رہ جائیں گی تو قرآن نے متوفی کو پورا پورا حق دیا ہے کہ وہ اپنے ترکہ کی تقسیم اقسماً حالات کے مطابق جس طرح جی چاہے (از روئے وصیت) کر جائے۔ قرآن کے مقرر کئے ہوئے حصے اس صورت میں عمل میں آتے ہیں جب متوفی بلا وصیت کئے مر جائے یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہوتی ہو۔ قرآن میں اس کی صراحت موجود ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ لڑکی کا حصہ کم مقرر کرنے سے نہ تو اس کے حقوق میں کمی آجاتی ہے اور نہ ہی معاشرہ میں اس کا مقام مرد سے نیچے رہ جاتا ہے۔

(۰)

دوسرا اعتراض ہے شہادت کے متعلق۔ سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۲ میں ہے کہ جب تم آپس میں قرضہ کا معاملہ کرو تو اسے ضبط تحریر میں لے آؤ اور اس پر دو مرد بطور گواہ بلا لیا کرو۔ اس سے آگے ہے۔ **عورتوں کی گواہی**۔ **فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ**۔ کہ اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کو بطور گواہ بلا لیا کرو۔ دو عورتیں کیوں بلائی جائیں، اس کی علت قرآن نے یہ کہہ کر خود ہی بیان کر دی ہے کہ یہ اس لئے ہے کہ

أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى

عام طور پر اس آیت کے یہ معنی کئے جاتے ہیں کہ دو عورتوں کی اس لئے ضرورت ہے کہ ان میں سے اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ لیکن قرآن نے تَضِلَّ کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی نسیان (بھول جانے) سے مختلف ہیں۔ اس کے بنیادی معنی ہیں، بات کا مبہم یا غیر واضح سا ہو جانا۔ ذہن میں الجھاؤ سا پیدا ہو جانا۔ واضح تر الفاظ میں (TO GET CONFUSED OR BECOME PERPLEXED)۔ اس لفظ

کی وضاحت کے بعد اب اصل آیت کی طرف آئیے۔ اس آیت سے یہ سوال اٹھائے جاتے ہیں کہ

(i) ایک مرد کے بجائے دو عورتوں کو کیوں ضروری قرار دیا گیا۔ اور

(ii) یہ بات خصوصیت سے عورتوں کے متعلق کیوں کہی گئی کہ یہ اس لئے ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ الجھاؤ

سا پیدا ہو جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے اور ان سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن کے نزدیک عورتیں مردوں کے مقابلہ میں کم قابلِ اعتماد ہیں اور ان میں ذہنی صلاحیت بھی کم ہوتی ہے۔

جہاں تک قابل اعتماد ہونے کا تعلق ہے، قرآن نے شہادت میں مردوں کے لئے بھی دو کی شرط عائد کی ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ قرآن مردوں کو بھی قابل اعتماد نہیں سمجھتا۔ اسی لئے ایک کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ ایک کے ساتھ دوسرے کی شہادت بھی ضروری قرار دی گئی ہے؛ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا مقصود یہ نہیں کہ ایک مرد قابل اعتماد نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک کے بیان میں سہو یا سقم رہ جائے تو دوسرے کے بیان سے اس کی کمی پوری ہو جائے۔ یعنی اس سے ایک امکانی احتمال کی قانونی روک تھام مقصود ہے۔ مردوں کے متعلق یہ فتویٰ دینا مقصود نہیں کہ مرد قابل اعتماد نہیں ہوتے اس لئے ان میں سے کسی ایک (تنہا) کی شہادت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ یعنی مقصود شہادت کی توثیق (پختہ کرنا) ہے، نہ کہ مردوں کے ناقابل اعتماد ہونے کا اعلان۔

اسی طرح، جب قرآن نے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو ضروری قرار دیا ہے تو اس سے بھی مقصود نہیں کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں کم قابل اعتماد ہوتی ہیں۔ اس لئے ایک مرد کی جگہ دو عورتیں ضروری ہیں۔ یہاں بھی مقصود ایسا طریقہ اختیار کرنا ہے جس سے شہادت زیادہ سے زیادہ یقینی ہو جائے۔ ورنہ جہاں تک مردوں اور عورتوں کے تقابلی (COMPARATIVE) اعتماد کا تعلق ہے، قرآن نے دونوں کو ایک ہی حیثیت دی ہے۔ مثلاً قرآن میں جہاں لعان کی شہادت کا ذکر ہے، وہاں ایک عورت کی شہادت کو بھی ایسا ہی قابل قبول قرار دیا ہے جیسا ایک مرد کی شہادت کو۔ (ملاحظہ ہو ۲۴/۶)

اب سوال دوسرا باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن نے بالخصوص عورتوں کے متعلق کیوں کہا ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ اشتباہ لاحق ہو جائے، کچھ گھبراہٹ سی ہو جائے تو دوسری عورت بات صاف کر دے۔

وہ تو زمانہ نزول قرآن کی بات ہے۔ آپ آج بیسویں صدی میں، ہمارے ہاں کی مستورات میں سے کسی کو پہلے پہل عدالت میں لے جا کر گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیجئے جہاں گرد و پیش اجنبی مرد ہوں۔ وہاں دیکھئے کہ اس بیچاری کی حالت کیا ہوتی ہے۔ اس کے سینے چھوٹ جائیں گے۔ وہ کانپنے لگ جائے گی۔ اس کی گھگھی بندھ جائے گی۔ اگر اس کے ساتھ اس کی کوئی جان بچان والی عورت موجود ہو تو اس کا حوصلہ بندھ جائے گا۔ اسے کچھ کہنے کی ہمت ہو جائے گی۔ اس دوسری عورت کا ساتھ ہونا اس کے لئے باعث تقویت ہو گا۔ اگر اسے کہیں ہچکچاہٹ ہوگی تو اس کی ساتھی اسکی بات صاف یا پوری کر دیگی۔ قرآن کریم نے اسی قسم کی عورتوں کے متعلق کہا ہے کہ **أَدْمَنْتُ تُنْشَأُ فِي الْحُلِيِّۖ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ** (۳۱/۳۱)؛ "زیرات میں پل ہوئی جھگڑے کے وقت اپنے مافی الضمیر کو بھی واضح طور پر بیان نہیں کر سکتی"۔ اس قسم کی ہیں وہ عورتیں جن کے متعلق کہا کہ انہیں عدالت میں جانا پڑے

تو ان کے ساتھ ایک اور عورت بھی کھڑی کر دو تاکہ اس کا حوصلہ بندھائے۔ لیکن قرآن کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ مناسب تعلیم و تربیت سے انسان (مرد، ہو یا عورت) کی اس قسم کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس نے صحتی معاشرہ کی عورت کے متعلق کہا ہے کہ وہ فصیح البیان (عُزْبًا) ہوگی۔ (۵۶)

(۱۰)

ان تصریحات کے علاوہ، یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن کریم نے دو عورتوں کے سلسلہ میں یہ نہیں کہا کہ اُن دونوں کی شہادت یکے بعد دیگرے لی جائے تاکہ وہ دو شہادات مل کر ایک مرد کی شہادت کے برابر ہو جائیں۔ کہا یہ ہے کہ اَنْ تَصِلَ اِحْدَهُمَا فَتَدْكِرَ اِحْدَهُمَا الْاُخْرٰی (۵۶)۔ اگر ایسا ہو کہ اُن میں سے گواہی دینے والی کو گھبراہٹ کی وجہ سے کہیں الجھاؤ پیدا ہو جائے تو اس کے ساتھ کھڑی دوسری اس کی بہن اسے یاد دلادے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر شہادت دینے والی عورت کو گھبراہٹ لاحق نہ ہو تو دوسری عورت کی دخل اندازی کا موقعہ ہی نہیں آئے گا۔ اور اس اکیلی کی شہادت کافی قرار پا جائے گی۔

اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اگر لڑکیوں کی پرورش "زیورات" میں نہ کی جائے جس سے وہ معاملات زندگی میں جھٹلنے کے قابل ہی نہ بن سکیں اور یوں "غیر مبین" (گونگی) بن کر رہ جائیں، بلکہ انہیں زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا جائے تو پھر وہ غیر مبین نہیں رہیں گی۔ اس صورت میں دوسری عورت کی مداخلت کی ضرورت نہیں رہے گی۔

(۱۱)

ہم نے پہلے نسبی اور سسرالی رشتوں کے متعلق اشارہ کیا تھا، اب اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ عام دستور کے مطابق لڑکا (خاوند) شادی کے بعد بھی اپنے ماں باپ اور دیگر اعزہ و اقرباء کے ساتھ قریب رہتا ہے۔ لیکن لڑکی (بیوی) اپنے تمام اعزہ و اقرباء (اہلِ خاندان) کو چھوڑ کر اس نئے خاندان میں آکر رہتی ہے۔ اس سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ لڑکے (خاوند) کے تمام سابقہ رشتے تو برقرار رہتے ہیں لیکن لڑکی کے رشتے داران دونوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے کہا کہ نہیں! اس رشتے سے ان دونوں خاندانوں میں قرب پیدا ہونا چاہیے (جیسا کہ اشارۃً پہلے کہا جا چکا ہے) اس کے لئے اس نے کہا کہ سسرالی رشتہ بھی ایسا ہی اہم ہے جیسا نسبی رشتہ۔ ارشاد ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا۔

خدا وہ ہے جس نے انسان کی پیدائش ایک قطرہ آب سے کی، اس کے بعد تمدنی اور معاشرتی تقاضوں کی رو سے انسان میں باہمی رشتے استوار ہو جاتے ہیں۔ نسبی (دو صہیلی رشتے اور سسرالی (نصہیلی) رشتے۔ یہ اسی خدا کے مقرر کردہ پیمانوں کی رو سے ہوتا ہے۔

اس طرح مرد اور عورت کے خاندان ایک رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں اور ان کے معاشرتی دائر میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس ضمن میں اتنا اضافہ ضروری ہے کہ لڑکے کی شادی اس وقت کرنی چاہیے جب وہ معاشی طور پر خود کفیل ہو۔ اور اپنے گھر کا بوجھ خود اٹھا سکے۔ شادی کے بعد انہیں اپنے الگ گھر میں رہنا چاہیے نہ کہ لڑکے کے ماں باپ کیساتھ۔ سینکڑوں گھرانوں کے مسائل کا جائزہ لینے کے بعد میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ازدواجی زندگی کی خوشگواہی کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ میاں بیوی کا گھر الگ ہو جس میں وہ آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ سورہ النور کی آیت (۲۴/۳۱) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اس میں کچھ ہرج نہیں کہ تم اپنے گھر سے کھاؤ یا اپنے باپ کے گھر سے یا اپنی ماں کے گھر سے..... اس سے مترشح ہوتا ہے کہ قرآن کریم ماں باپ کے گھر کو الگ قرار دیتا ہے۔ مشترکہ گھر (JOINT FAMILY) کا دستور تو ہندوؤں میں تھا۔ وہیں سے ہمارے ہاں بار پا گیا۔ اس کے نتائج بڑے تلخ ہوتے ہیں۔

(۰)

جنسی اختلاط

ازدواجی زندگی افزائش نسل کا ذریعہ ہوتی ہے جو نتیجہ ہوتی ہے میاں بیوی کے جنسی اختلاط کا۔ قرآن کریم نے اس باب میں بھی ہدایات دی ہیں۔ اس نے کہا ہے :-

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهَرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ (۲/۲۲۲)

۲
۲۲۲

نکاح کے بعد مقاربت کا سوال آتا ہے۔ سو ایام حیض میں اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ حیض عورت کے لئے ایک قسم کی واماندگی کا موجب ہوتا ہے اور اس میں مجامعت نقصان کا باعث۔ لہذا ان ایام میں عورتوں

سے الگ رہنا چاہیے تا وقتیکہ وہ اس سے فارغ ہو جائیں۔ جب یہ عرصہ ختم ہو جائے، تو جس طرح خدا کے طبیعی قانونِ تولید کا اشارہ ہے۔ تم اس طرح ان سے مقاربت کر سکتے ہو۔
 اگر تم اس سے پہلے ایسا نہیں کرتے تھے تو اب صحیح راستے کی طرف لوٹ آؤ۔ قانونِ خداوندی کی رو سے پسندیدہ لوگ وہی ہیں جو غلط راستے کو چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کر لیں اور ناخوش آیند امور سے دور رہیں۔
 ایامِ حیض کے علاوہ (حکم کی حالت میں بھی) روزے کے دنوں میں مباشرت ممنوع ہے۔ اسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ
 لَهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ
 فَالْغَنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ۔ (۲/۲۲۳)

یہ بھی سمجھ لو کہ روزہ دن ہی دن کا ہے، رات کے وقت نہ کھانے پینے کی مانعت ہے نہ ہی بیویوں کی طرف رجوع کرنے کی۔ بیویوں سے جنسی اختلاط قربِ خداوندی کی راہ میں مائل نہیں ہو سکتا۔ (یہ بھی مسلکِ خانقاہیت کا پیدا کردہ تصور ہے) میاں بیویوں کا تو چھوٹی دامن کا ساتھ ہے اور ایسا قریبی رشتہ کہ ان کے درمیان کوئی تیسرا عامل نہیں ہو سکتا۔ اللہ جانتا ہے کہ نفسِ انسانی کے تقاضے کیا ہیں اور مسلکِ رہبانیت میں انسان کے دل میں کس کس قسم کے خیال پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ خود اپنے آپ سے خیانت کرتا رہتا ہے۔ (۲/۲۲۳)۔
 لہذا، خدا کا قانون اس بارے میں انسانوں کی خود ساختہ حدود سے آگے بڑھتا ہے اور تمہارے دل میں جو دوس پیدا ہو رہے تھے، ان سے درگزر کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ تم رات کے وقت منشاءِ خلوندی کے مطابق اپنی بیویوں کے پاس بھی جا سکتے ہو۔

اس کے بعد کہا: وَلَا تَبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ۔ (۲/۲۲۳) اعتکاف کی حالت میں بھی مباشرت ممنوع ہے۔ (روزے اور اعتکاف کے متعلق پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ دیکھیے عنوانِ صیام اور حج)۔

(۱)

آیت (۲/۲۲۳) میں ایک اہم نکتہ وضاحت طلب ہے۔ اس میں کہا ہے کہ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ

حَيْثُ أَمَرَكَ اللَّهُ۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ ”جب وہ پاک ہو جائیں تو جاؤ ان کے پاس جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔“ لیکن قرآن کریم — میں اس قسم کا حکم کہیں نہیں دیا گیا (کہ مباشرت کیسے کرنی چاہیے) اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ”مِنْ حَيْثُ أَمَرَكَ اللَّهُ“ کا مطلب کیا ہے؟ امر کے متعلق جلد اول ص ۲۸۳ زیر آیت (۲/۲۱۱) بتایا جا چکا ہے کہ اس کے بنیادی معنی راستے کی نشاندہی کرنے (DIRECTIVE) یا ہدایات کے ہیں حکم کے معنوں میں یہ ثانیا استعمال ہوتا ہے۔ طبعی افعال کے متعلق خدا کی طرف سے رہنمائی جبلی طور پر حیوانات کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ یہی خدا کا امر ہے جو خود انسان کے اندر بھی موجود ہے۔ یہ تو وحی کی رو سے ہدایت ہے جو خارج سے ملتی ہے۔ طبعی افعال کے متعلق جبلت یا فطری صلاحیت ”امر اللہ“ کا حکم رکھتی ہے۔ اس آیت میں دیکھیے حالت حیض میں مباشرت سے احتراز کے لئے وحی کے ذریعے حکم دیا گیا کیونکہ یہ چیز حیوانی جبلت میں نہیں اور اس کے بعد معاشرتی طریق کے متعلق اتنا کہہ دیا کہ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكَ اللَّهُ۔ یعنی خدا کی مقرر کردہ جبلت ہدایت کے مطابق۔

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں انسان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی ہیں جب انسان انہیں استعمال

میں لاتا ہے تو اس کے ان افعال کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ تفصیل اس

اجمال کی جلد اول ص ۱۸۲۔ زیر آیت (۲/۲) گزر چکی ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں ”مِنْ

فطری تقاضا

حیث امرکم اللہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی فطری تقاضا کے مطابق۔

یہ فطری تقاضا کیا ہے، اسے آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ فطرت افزائش نسل چاہتی ہے اور اس کا ذریعہ نر اور

مادہ کا جنسی اختلاط ہے۔ قرآن کریم ہمارے ذوق سلیم کی رعایت سے جنسیات (SEX) سے متعلق امور پر

گفتگو، ایجابی (SUGGESTIVE) انداز سے کرتا ہے۔ اسی انداز کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے فطرت کے اس

منشار کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

نَسَاءُكُمْ حَرَّتْ لَكُمْ فَأَتُوا حَرَّتَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا
لِأَنفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلْقَوُهُ وَبَشِيرِ

۲
۲۲۳

الْمُؤْمِنِينَ۔ (۲/۲۲۳)

میاں بیوی کے جنسی اختلاط کے معاملہ میں اس اصول کو یاد رکھو کہ اس سے

مقصود افزائش نسل (اولاد پیدا کرنا) ہے۔ اس اعتبار سے تمہاری بیویوں

جنسی اختلاط کا مقصد

کی مثال کھیتی کی سی ہے۔ جس طرح کسان اس وقت تخم ریزی کرتا ہے جب اسے فصل اگانا مقصود ہو اسی

طرح تم بھی اس وقت اپنی کھیتی، میں جاؤ جب تم (اولاد پیدا کرنا) چاہو۔

لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی سمجھ لو کہ انسانی زندگی کا مقصود و منہی، اولاد پیدا کرنا ہی نہیں اصل مقصود اپنی ذات کی نشوونما کرنا ہے۔ حیات جاوید، بقائے ذات سے حاصل ہوتی ہے اولاد کے ذریعے نہیں۔ اس لئے تم یہ بھی دیکھو کہ تم نے بقائے ذات کے لئے کیا کیا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ہمیشہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھو کہ تم خدا کے قانونِ مکافات کی زد سے نہیں بچ سکتے۔ ہمیں اس کا سامنا کرنا ہے۔ زندگی کی خوشگواریاں انہی کے لئے ہیں جو اس حقیقت پر ایمان رکھیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نے ایسے اہم اور نازک مسئلہ کو ایک مثال کے ذریعے کس قدر لطیف انداز میں واضح کر دیا ہے۔ کسان اپنے کھیت میں کلیہ رانی (ہل چلانا) اس وقت کرتا ہے جب تخم ریزی مقصود ہو۔ اور تخم ریزی سے مقصود کھیت میں فصل اگانا ہوتا ہے۔ لہذا، میاں بیوی میں جنسی اختلاط اس وقت ہونا چاہیے جب بچہ پیدا کرنا مطلوب ہو۔ چونکہ افزائش نسل کا مقصد پورا کرنے کے لئے کچھ مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں (مثلاً، استقرارِ حمل، وضع حمل، بچوں کی پرورش اور انسان کی صورت میں ان کی پرورش، تربیت اور تعلیم وغیرہ) اس لئے فطرت نے اس عمل (اختلاط) میں حظ (PLEASURE) کا عنصر رکھ دیا تاکہ وہ اس مشقت طلب معاملہ میں ترغیب کا کام دے۔ اس سے واضح ہے کہ جنسی اختلاط کا حقیقی مقصد افزائش نسل ہے۔ حظ و کیف محض ترغیب کی خاطر ہے۔

افزائش نسل کا فطری مقصد حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہے لیکن اس سلسلہ میں فطرت نے ان دونوں میں ایک اہم فرق رکھا ہے۔ حیوانات کی صورت میں اسے (REGULATE) کرنا فطرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ ایک سائڈ (ہیل) سال بھر کالیوں کے گلہ میں چرتا پھرتا رہتا ہے لیکن وہ کسی گائے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ لیکن جب فطرت کے پروگرام کے مطابق ان کے استقرارِ حمل کا زمانہ (MATING SEASON) آتا ہے، وہی ہیل جنسی اختلاط کے لئے دلیوانہ ہو جاتا ہے اور گائے بھی اس کی طرف کھینچے چلی جاتی ہے۔ اس اختلاط کے بعد ان میں پھر وہی بے رغبتی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر حیوانات کے جنسی جذبہ پر فطرت نے خود (SAFETY VALVE) لگا رکھا ہے۔ وہ اسے اس وقت کھولتی ہے جب ان سے اولاد پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس میں حیوانات کا اپنا اختیار کچھ نہیں ہوتا۔

لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے موجب اختیار پیدا کیا ہے اس لئے یہ (دیگر امور کی طرح) اولاد پیدا کرنے یا نہ کرنے کے معاملہ میں بھی فطرت کے پروگرام کی پابندی پر مجبور نہیں۔ مشیتِ خداوندی یہ چاہتی ہے کہ انسان اپنے

حالات کے مطابق اولاد پیدا کرنے کا (PLAN) خود بنائے اور اس کے مطابق عمل کرے۔ اسی طرح جیسے کسان اپنے پروگرام کے مطابق کھیت میں تخم ریزی کرتا ہے۔ اسی لئے حیوانات اولاد ایک پروگرام کے مطابق

کی صورت میں اولاد کی پرورش کا مسئلہ ایسا دقیق طلب نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کی صورت میں مسئلہ صرف اولاد کی پرورش کا نہیں ہوتا، ان کی تعلیم اور تربیت کا بھی ہوتا ہے اور یہ ذمہ داری بڑی محنت طلب بھی ہوتی ہے اور مناسب ذرائع اور اسباب کے میسر آنے کی متقاضی بھی۔ اس لئے انسان کی صورت میں نہایت ضروری ہے کہ اس کی اولاد اس کی (PLANNING) کے مطابق وجود میں آئے۔

لیکن جس طرح انسان اپنی ہر قوت اور صلاحیت کے استعمال کے معاملہ میں اپنے اختیار و ارادہ کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسے (MIS-USE) ہی نہیں (ABUSE) کرتا ہے، اس نے جنسی اختلاط کے معاملہ میں بھی یہی کچھ کیا۔ اس نے افزائش نسل کے فطری مقصد کو تو رکھا بالائے طاق اور حصول لذت کو مقصود بالذات قرار دے کر اس میں ایسا غرق ہوا کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہی نہیں، مدہوش ہو گیا اور اس طرح اس کو کربہ ارضی کو جہنم میں تبدیل کر دیا۔ بے محابا جنسی اختلاط سے کثرتِ اولاد کا خطرہ تھا۔ اس خطرہ کو مانعِ حل ادویات اور تدابیر سے دور کر لیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ کوشش (بلکہ روش) کہ جنسی اختلاط کی لذت تو حاصل ہو جائے لیکن اس سے حل قرار نہ پائے، دورِ جدید کی اختراع ہے، یہ صحیح نہیں۔ انسان کی دیگر بہتادلیوں (PERVERSIONS) کی طرح یہ بھی قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے اور قوموں کو تو چھوڑتے خود ہمارے ہاں کی کتب روایات میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اُس زمانے میں اس کا طریقِ عزل تھا۔ یعنی جنسی اختلاط میں مادہ تولید رحم کے اندر خارج نہ ہو، باہر خارج ہو۔ اسے آج کی اصطلاح میں (EXTRAXIT) کہا

عزل

جاتا ہے۔ بخاری کی ایک روایت ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک دن وہ نبی اکرمؐ کے پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے کہا کہ ہم (جہاد میں) قید کی ہوئی لونڈیوں سے جماع کرتے ہیں۔ چونکہ ہم ان کو بیچنا چاہتے ہیں (اس لئے یہ نہیں چاہتے کہ وہ حاملہ ہو جائیں) پس آپ عزل کی نسبت کیا رائے دیتے ہیں۔ حضرتؓ نے فرمایا کیا تم لوگ ایسا کرتے ہو؟ تم کو کچھ مجبوری نہیں ہے اگر تم ایسا نہ کرو۔ اس لئے کہ جس جان کا پیدا کرنا اللہ نے مقدر کر دیا ہے وہ ضرور پیدا ہوگی۔

(بخاری جلد اول۔ ترجمہ اردو شائع کردہ نور محمد۔ کراچی ص ۹۲)

ایک اور روایت میں ہے :-

ابن حجر نے کہتے ہیں کہ میں نے ابوسعید کو دیکھا ہے اور میں نے ان سے (کچھ) دریافت کیا تھا تو انہوں نے کہا کہ غزوہ بنی مصطلق میں ہم نبی (ص) کے ہمراہ گئے تو ہم نے عرب کے قیدیوں میں سے کچھ قیدیوں کو پایا۔ پھر ہمیں عورتوں کی خواہش ہوئی اور تجرد نے ہم پر غلبہ پایا تو ہم نے عزل کی خواہش کی۔ پس ہم نے رسول خدا (ص) سے اس کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا اگر تم یہ نہ کرو تو تم کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کیونکہ قیامت تک جو جان پیدا ہونے والی ہے وہ تو ضرور پیدا ہوگی۔

(بخاری۔ جلد اول صفحہ ۵۷۳ ترجمہ اردو۔ شائع کردہ نور محمد۔ کراچی)

ہمارے ہاں (پاکستان میں) جب ضبطِ ولادت (FAMILY PLANNING) کی اسکیم جاری ہوئی تو عزّل کے جواز اور عدم جواز کے متعلق مذہبی پیشوا سیت میں بحث چل نکلی۔ دونوں نے اپنی اپنی تائید میں روایات اور ائمہ سلف کے فتاویٰ پیش کئے۔ اس کی مخالفت کرنے والے ان روایات کا انکار تو نہیں کر سکتے تھے جو فریق ثانی نے ان کے حق میں پیش کی تھیں لیکن ان کا مسلک عجیب مغذرت خواہانہ تھا۔ مثلاً ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس باب میں لکھا تھا :-

عزّل کی اجازت میں جو چند روایات مروی ہیں، ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنے ذاتی حالات یا مجبوریاں بیان کیں اور آنحضرتؐ نے انہیں سامنے رکھ کر کوئی مناسب جواب دیدیا۔ اس طرح کے جو جوابات نبی (ص) سے حدیث میں منقول ہیں ان سے اگر عزّل کا جواز نکلتا ہے تو وہ ہرگز ضبطِ ولادت کی اس عام تحریک کے حق میں استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ جس کی پشت پر ایک باقاعدہ علامہ پرستانہ اور اباحت پسندانہ فلسفہ کارفرما ہے۔

(ترجمان القرآن۔ اپریل ۱۹۶۰ء)

ہم مودودی صاحب کے اس جواب پر کسی قسم کا تبصرہ لاحق حاصل سمجھتے ہیں۔ اس سے تو ہر حال انہیں بھی انکار نہیں کہ روایات کی رو سے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بعض نے عزّل کی بابت دریافت کیا اور حضورؐ نے اس کی اجازت دی ! لیکن حیرت ہے کہ مودودی صاحب ضبطِ ولادت کے لئے عزّل کو تو خالص مادہ پرستانہ اور اباحت پسندانہ فلسفہ قرار دیتے ہیں لیکن استمنا بالید (مشت زنی - MASTURBATION) کو کچھ ایسا جرم نہیں سمجھتے۔ اسی باب میں کسی نوجوان نے ان سے پوچھا تو انہوں نے جواب

مشت زنی

میں لکھا کہ :-

ان دلائل کی بنا پر صحیح مسلک یہی ہے کہ یہ فعل حرام ہے۔ لیکن عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ اس کی حرمت زنا اور

عملِ قومِ لوط اور وطنِ بہائم کی بہ نسبت کمتر ہے۔ اس لئے اگر کسی شخص کو ان گناہوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہو جائے
کا خطرہ ہو اور اس سے بچنے کے لئے وہ اپنے جوشِ طبع کی تسکین اس ذریعے سے کر لے تو اس کے حق میں یہ کہا جا
سکتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اسے سزا نہ دے۔

(رسائل و مسائل جلد دوم۔ ستمبر ۱۹۶۴ء۔ ایڈیشن ص ۲۰۲)

یہ اُس خدا کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کا حکم یہ ہے کہ وَلَيْسَتَعْقِبِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا (۱۳۳) جنہیں جنسی
خواہش کی تسکین کا جائز ذریعہ (نکاح) میسر نہ آئے، وہ ضبطِ نفس سے کام لیں، لیکن اس ساری بحث میں قولِ فیصل
قرآنِ کریم کا وہ ارشاد ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ۔

(۱) جنسی اختلاط کا ایک ہی ذریعہ جائز ہے اور وہ ہے نکاح۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ فَمَنِ ابْتَغَى
وَمَا آءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰحِشُونَ (۱۳۳) جو اس کے سوا کوئی اور طریق اختیار کرنا چاہتا ہے تو وہ فاحش
خداوندی سے سرکشی برتا ہے۔

(۲) اور نکاح کے ساتھ جنسی اختلاط کا مقصد اس نے بتایا ہے مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ۔ (۱۳۴) محصنین
محصنین کے معنی ہیں محفوظ رکھنا اور مسافحین کے معنی ہوتے ہیں بہا دینا۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی
رُو سے جائز جنسی اختلاط کا مقصد مادہ تولید کو بیوی کے رحم میں محفوظ رکھنا ہے نہ کہ اسے بہا دینا۔ اس سے قَاتِلُوا
حَرَثَكُمْ اَتَىٰ شِئْنُكُمْ۔ (۱۳۴) تم بیوی سے مفاربت اس وقت کرو جب تمہارا مقصد یہ ہو کہ مادہ تولید اس
کے رحم میں محفوظ رہے۔ یعنی استنقرِ ارحل کے لئے۔ اس مادہ کو بہا دینے کے لئے نہیں۔ کسان اپنے کھیت میں کبھی اس
لئے تخم ریزی نہیں کرتا کہ پانی کی لہر آئے اور اسے بہا کر لے جائے۔

(۱)

لیکن اس آیت میں "اَتَىٰ شِئْنُكُمْ" کے ایک اور مفہوم نے توقیامت ہی دُصادی۔ "اَتَىٰ" کے معنی
"جب" بھی ہیں اور "جہاں سے بھی" "جب" کے لحاظ سے اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ "عورتیں تمہاری کھیتیاں
ہیں۔ تم اپنی کھیتی میں جب جی چاہے آؤ" اور جیسا کہ ہم نے تفصیل سے بتایا ہے کہ "جب جی چاہے" سے مراد ہے
"جب افزائشِ نسل مطلوب ہو" لیکن ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ
"عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں تم اپنی کھیتی میں "جہاں سے" جی چاہے آؤ۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سے مطلب
کیا لیا گیا؟

یہاں تک لکھنے کے بعد میں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور گہری سوتج میں ڈوب گیا کہ جو کچھ لکھنا پڑ گیا۔ کیا اس سے قرآن پاک کی اس تفسیر (مطالب الفرقان) کے ان اوراق کو آلودہ کروں؟ یہ احساس میرے دامن گیر تھا لیکن دوسری طرف یہ حقیقت بھی میرے سامنے تھی کہ

لطف بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی !

”تفسیر القرآن بالقرآن“ کی اہمیت اجاگر کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید کی جو تفسیر (وضعی) روایا کی رو سے کی جاتی ہے، اس کی کچھ مثالیں بھی سامنے آتی رہیں۔ اُس احساس اور اس اہمیت کے تقابل اور موازنہ کے بعد یہی مناسب سمجھا گیا کہ دل پر پتھر رکھ کر ہی سہی، اس کی مثال پیش کر دینی چاہیے۔ سوائے (بصد معذرت) درج ذیل کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہماری کتب احادیث میں سب سے بلند مقام بخاری کو حاصل ہے۔ اسے صحیح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔ اس میں آیت نِسَاءُكُمْ حُرَّتٌ لَّكُمْ فَاَتُوا حُرَّتْكُمْ اَلَا تَشْتُمُوْنَ (۲۴/۲۴) کی تفسیر میں لکھا ہے :-

نافع مولیٰ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ قرآن پڑھتے ہیں کسی سے کلام نہیں کرتے تھے۔ ایک روز قرآن پڑھتے ہیں ان کے پاس چلا گیا۔ جب وہ سورہ بقرہ پڑھتے ہوئے اس آیت (نساء کم) پر پہنچے تو مجھ سے کہا کہ تجھے معلوم ہے یہ آیت کب نازل ہوئی۔ میں نے کہا۔ مجھے معلوم نہیں۔ انہوں نے اس کا شان نزول بیان کیا اور پھر آگے پڑھنے لگے۔ عبدالصمد کہتے ہیں ابن عمرؓ سے یہ بھی روایت پہنچی ہے کہ بعض آدمی عورتوں سے اغلام کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ جابرؓ سے روایت ہے کہ یہودی کہا کرتے تھے کہ جو شخص اپنی عورت سے الٹا کر جماع کرے اس کی اولاد بھینگی ہوگی۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ یہ قول غلط ہے۔ عورتوں سے جس منہیت سے چاہو جماع کرو۔

بخاری کی دو شرحیں بڑی مستند اور معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ ایک حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری اور دوسری علامہ بدر الدین عینی کی عمدۃ القاری۔ علامہ عینی نے پہلے بخاری کی حدیث نقل کی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ

ہم سے اسحاق نے بیان کیا کہ ہمیں نصر بن شمیل نے خبر دی کہ سہیل ابن عون نے نافع سے خبر دی کہ ابن عمرؓ جب قرآن پڑھا کرتے تھے تو فارغ ہونے تک بولتے نہیں تھے۔ میں ایک روز قرآن کریم لے کر ان کے پاس بیٹھا اور انہوں نے سورہ بقرہ پڑھی۔ حتیٰ کہ کسی مقام تک پہنچے اور پوچھنے لگے۔ جانتے بھی ہو کس بارے میں نازل

ہوئی تھی؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں۔ تو ابن عمرؓ نے فرمایا۔ فلاں فلاں بارہ میں نازل ہوئی تھی۔ پھر آگے چل دیئے۔ اور عبدالصمد سے مروی ہے کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا کہ مجھ سے ایوب (اسمختیانی) نے بیان کیا نافع سے۔ انہوں نے ابن عمرؓ سے کہ قَاتِلُوا حَرَّتُكُمْ اَتَىٰ شَيْئُهُمْ کی تفسیر ابن عمرؓ نے بیان کی کہ اپنی بیوی سے۔ میں جماع کرے۔ اس کو محمد بن یحییٰ ابن سعید نے بھی بیان کیا ہے اپنے باپ سے۔ انہوں نے عبید اللہ سے۔ انہوں نے نافع سے۔ انہوں نے ابن عمرؓ سے۔

اس کے بعد علامہ مذکور لکھتے ہیں :-

یہاں اصل کتاب (بخاری) میں خالی جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔ یعنی لفظ فی کے بعد۔ حمیدی نے الجمع بین الصحیحین میں کہا ہے فی قبلہا۔ یعنی اپنی بیوی کی مشرکگاہ میں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس روایت کو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں ابو قلابہ سے الرقاشی سے انہوں نے عبدالصمد بن عبدالوارث سے نقل کیا ہے کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا اور وہاں انہوں نے یاتئہا فی الدبر (اپنی بیوی سے دبر میں جماع کرے) لفظ سے بیان کیا ہے۔ (عمدة القاری)

یہ رہی علامہ عینی کی شرح۔ اب حافظ ابن حجر عسقلانی کی شرح ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں :-

ابن العربی نے سراج المرید میں نقل کیا ہے کہ بخاری نے اس حدیث کو تفسیر میں نقل کیا ہے اور کہا ہے۔ یاتئہا فی اور خالی جگہ چھوڑ دی ہے اور یہ مسئلہ مشہور ہے۔ اس موضوع پر محمد بن شعبان نے ایک پوری کتاب تصنیف کی ہے اور محمد بن سحنون نے ایک جزو لکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ابن عمرؓ کی حدیث، عورت سے دبر میں مجامعت کرنے ہی کے بارے میں ہے۔ مازری نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں علماء کے اندر اختلاف ہے۔ جو لوگ اس کے حلال ہونے کے قائل ہیں انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے اور جو لوگ اس کے حرام ہونے کے قائل ہیں وہ یہ کہہ کر اس سے الگ ہو گئے ہیں کہ یہ آیت اس سبب کے بارہ میں نازل ہوئی تھی جو جابر کی حدیث میں آ رہا ہے۔ یعنی یہودیوں پر رد کرنے کے لئے۔ جیسا

لے ان حضرات کی دیانت ملاحظہ فرمائیے۔ بخاری کے متن (عربی) میں قال یاتئہا فی کے الفاظ موجود ہیں اور فی کے بعد جگہ خالی ہے۔ لیکن بخاری کا اردو ترجمہ جسے نور محمد۔ کارخانہ تجارت کتب (کراچی) نے شائع کیا ہے اس میں یہ فقرہ ہی غائب کر دیا گیا ہے۔ (اردو ترجمہ بخاری، جلد دوم - ۲۳۳)

اس سے بڑھ کر اور کون سی چیز واضح ہوگی اور میں اس میں ذرا بھی شک نہیں کرتا۔ رہا امام شافعیؒ کا مذہب، اس کے بارے میں تو امام طحاویؒ نے فرمایا ہے کہ ہم سے محمد بن الحکم نے بیان کیا کہ انہوں نے امام شافعیؒ کو کہتے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ رسول اللہؐ سے اس کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے اور قیاس یہ ہے کہ وہ حلال ہے۔ (عبینی)

یعنی امام مالکؒ تو یقینی طور پر اس کے جواز کے قائل تھے اور خود اس پر عمل پیرا اور امام شافعیؒ کا قیاس تھا کہ یہ حلال ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس باب میں امام شافعیؒ کا ایک مناظرہ بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے امام اعظمؒ کے ایک شاگرد امام محمدؒ سے کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں :-

امام حاکم نے مناقب شافعیؒ میں ابن الحکم کے طریق سے نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ کا ایک مناظرہ مشہور ہے جو اسی مسئلہ کے بارے میں امام شافعیؒ اور امام محمد بن الحسن کے درمیان ہوا۔ ابن الحسن نے امام شافعیؒ کے خلاف اس امر میں استدلال کیا کہ کھیتی تو فرج ہی میں ہو سکتی ہے تو امام شافعیؒ نے جواب میں کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فرج کے علاوہ باقی سب کچھ حرام ہے۔ امام ابن الحسن نے اس کو مان لیا کہ ہاں فرج کے علاوہ دوسرے مواقع حرام ہیں۔ اس پر امام شافعیؒ نے پوچھا۔ مجھے بتاؤ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی پنڈلیوں کے درمیان یا اس کی کہنیوں کے درمیان مجامعت کرے تو کیا یہاں کھیتی ہوگی۔ امام محمدؒ نے کہا کہ نہیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا پھر تم جس بات کے خود بھی قائل نہیں، اس سے کس طرح استدلال کرتے ہو۔ امام حاکم نے کہا کہ شاید امام شافعیؒ اپنے قولِ قدیم میں اس کے حلال ہونے کے قائل ہوں کیونکہ اپنے قولِ جدید میں اس کے حرام ہونے کی انہوں نے تصریح کی ہے۔ (فتح الباری)

بخاری میں ایک اور روایت بھی ہے۔ اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔ عطاء کہتے ہیں کہ :-
کچھ حرج نہیں اگر کوئی شخص اپنی حاملہ لونڈی سے شرمگاہ کے سوا (اور حجہ) مباشرت کر لے۔

(اردو ترجمہ جلد اول ص ۴۹۲ - کتاب البیوع)

آپ نے غور فرمایا کہ ہماری کتب احادیث و تفاسیر کی رو سے اس آیت کی کس قسم کی تفسیر سامنے آتی ہے شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے ”آئی شیعہ“ کا ترجمہ تو ”جہاں سے چاہو“ ہی کیا ہے لیکن حاشیہ میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ :-

یہود، عورت کی پشت کی طرف ہو کر وطی کرنے کو ممنوع کہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس سے بچہ احوال پیدا

پیدا ہوتا ہے۔ آپ سے پوچھا گیا تو اس پر یہ آیت اتری۔ یعنی تمہاری عورتیں تمہارے لئے بمنزلہ کھیتی کے ہیں۔ جس میں نطفہ بجائے تخم اور اولاد بمنزلہ پیداوار کے ہے۔ یعنی اس سے مقصد اصلی صرف نسل کا باقی رکھنا اور اولاد کا پیدا ہونا ہے۔ سو تم کو اختیار ہے کہ آگے سے یا کروٹ سے یا اس کی پشت سے پڑ کر یا بیٹھ کر جس طرح چاہو مجامعت کرو۔ مگر یہ ضروری ہے کہ تخم ریزی اس خاص موقع میں ہو جہاں پیداواری کی امید ہو۔ یعنی مجامعت خاص فرج میں ہو۔ لواطت ہرگز ہرگز نہ ہو۔ یہود کا خیال غلط ہے کہ اس سے بچہ احوال پیدا ہوتا ہے۔

مولانا مرحوم اس نتیجہ پر تو صحیح پہنچے تھے کہ قرآن کریم کی رو سے میاں بیوی کے اختلاط سے مقصد اولاد پیدا کرنا ہے لیکن چونکہ ”اَللّٰہُ شَیْءٌ عَظِیْمٌ“ سے متعلق روایات میں یہودیوں کا ذکر آیا ہے، اس لئے انہیں ان روایات کے حوالے سے یہ وضاحت کرنا پڑی۔ لیکن اگر قرآن کو قرآن ہی سے سمجھا جائے تو نہ اس قسم کی دوراز کار تاویلات کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی اس قسم کی کثافتوں سے اس کتابِ مطہر کے معانی کو آلودہ کرنے کی جرأت پیدا ہو سکتی ہے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ قرآن کریم نے ان دونوں متصل آیات میں سب کچھ واضح کر دیا تھا۔ آیت (۲۲۳) میں مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمْ اللّٰہُ سے فطری طریق کی طرف اشارہ کر دیا۔ حیض کے دنوں میں مجامعت سے منع کر کے اس کی وضاحت کر دی۔ اور آیت (۲۲۴) میں عورتوں کو حَرْثٌ (کھیتی) سے تشبیہ دے کر اختلاطِ جنسی کا مقصد صراحت سے بیان کر دیا۔ لیکن قرآن کریم کو چھوڑ کر جب آپ نے روایات اور ان پر مبنی تفاسیر کی طرف رخ کیا، تو اس متعفن دلدل میں پھنس کر رہ گئے جسے ہم بادلِ صدا خواستہ سامنے لاتے ہیں۔

(۰)

تعلقات میں کشیدگی

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ قرآن کریم نے زوجین کے انتخاب میں ہم آہنگی اور یک نغی پر بڑا زور دیا ہے۔ اور ازدواجی رشتہ کا مقصد باہمی مودت، سکینت اور رحمت سے، گھر کو جنت بنانا بتایا ہے۔ لیکن ان تمام احتیاطوں کے باوجود ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے میاں بیوی کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جائے۔ اس سلسلہ میں بعض کشیدگی محض عارضی رنجش کی وجہ سے ہوگی جس کی عام وجہ سرِ بَعِ الغضب ہونا ہے۔ یعنی یونہی (TEMPER) (Loose - کر جانا۔ مثلاً) انسان غصے میں آکر بیہودہ بکواس شروع کر دیتا ہے اور جہالت کی وجہ سے بیوی

ظہار

کو "ماں" کہہ دیتا ہے۔ یا اس قسم کی کوئی اور لغو بات۔ (عروہوں کے ہاں اسے ظہار کہتے تھے) اور غصہ ٹھنڈا ہو جانے پر اپنے کئے پر خود ہی نادم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ غصے کی حالت میں بیوی کو "ماں" کہہ دینے سے وہ سچ مچ "ماں" نہیں بن جاتی۔ وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمْ الَّتِي تَظْهَرُونَ مِنْهُنَّ أُمَّهَاتِكُمْ (۲۳)۔ "ظہار سے تمہاری بیویاں تمہاری مائیں نہیں بن جاتیں" اسی لئے اس قسم کی لغو باتوں کو حقیقت پر محمول نہیں کر لینا چاہیے۔ سورہ البقرہ میں پہلے کہا:-

وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۲۲۴)

عالمی زندگی کے سلسلہ میں دوسری بات یہ یاد رکھو کہ بعض لوگ، یونہی کوئی لغو سی قسم کھا لیتے ہیں کہ میں فلاں کام نہیں کروں گا۔ پھر جب ان سے بھلائی اور تقویٰ اور لوگوں میں اصلاح کے کاموں کے لئے کہا جائے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے ایک قسم کھا رکھی ہے، اس لئے ہم ان کاموں میں حصہ نہیں لے سکتے۔

اور پھر فرمایا:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ (۲۲۵)

یاد رکھو! خدا اس قسم کی لغو باتوں پر گرفت نہیں کرتا جو تم، یونہی بلا سوچے سمجھے کھا لو۔ وہ ان قسموں پر گرفت کرتا ہے جو تم دل کے ارادے سے کھاؤ (۲۲۵)۔ وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ نیز اس کا قانون ایسا نہیں جو یونہی ذرا ذرا سی باتوں پر بھڑک اٹھے۔ اس میں بڑی سہار ہے اور مقصد تمہاری حفاظت ہے نہ کہ تباہی۔

لیکن چونکہ اس قسم کی بیہودہ حرکات سے گھر کی فضا مسموم ہو جاتی ہے اس لئے قرآن کریم ان کی روک تھام کے لئے ان پر بخوشی سنا دیا ضروری سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ پہلے کہتا ہے۔

وَالَّذِينَ يُظْهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحَرِيرٌ مَرْقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَا ذَٰلِكُمْ تُوَعُّظُونَ بِهِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَا فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا ذَٰلِكَ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ

وَنِلَّكَ حَدُودَ اللَّهِ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ - (۲۲۵)

(لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ معاشرہ میں اس قسم کی لغوٹیوں کو عام ہونے دیا جائے۔ سنجیدہ لوگوں کا معاشرہ ایسا نہیں ہو کر تا۔ لہذا جو لوگ اپنی بیوی کو ماں (یا ایسے ہی کوئی اور الفاظ) کہہ بیٹھیں اور اس کے بعد پیشیان ہو کر اپنی اس بیہودہ بات کو واپس ... لینا چاہیں، (تو انہیں کچھ جرمانہ ادا کرنا ہو گا تاکہ وہ اپنے آپ پر قابو رکھنا سیکھیں اور غیوہنی جو جی میں آئے منہ سے نہ نکال دیا کریں۔ وہ جرمانہ یہ ہے کہ) قبل اس کے کہ وہ یہ حیثیت میاں بیوی ایک دوسرے کے پاس جاتیں، ایک غلام آزاد کریں۔ یہ اس لئے ہے کہ تم آئندہ کے لئے نصیحت پکڑو اور اللہ تمہارے تمام معاملات سے باخبر ہے۔

جس کے پاس غلام نہ ہو یا غلام آزاد کرانے کی استطاعت (یا اس زمانے کے غلاموں کے ختم ہو جانے کے بعد جب غلام باقی ہی نہ رہیں تو) اس صورت میں وہ تعلقات زنا شوی سے پہلے دو ماہ کے متوازن روئے رکھے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلائے۔ یہ اس لئے کہ تم اس نظام خداوندی کی صداقت پر یقین محکم رکھو جو اس کے رسول کے ہاتھوں متشکل ہوا ہے۔

یہ خدا کی مقرر کردہ حدود ہیں جن کے اندر رہنا ضروری ہے (اگر اس باب میں سہواً غلطی ہو جائے تو اس کے ازالہ کی شکل وہ کفارہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ لیکن جو لوگ سرے سے ان حدود ہی کا انکار کریں تو وہ کافر ہیں) اور کافروں کے لئے الم ایگز تباہی ہے۔

یہ تو رب غصہ کی حالت میں ظہار سے متعلق۔ لیکن کوئی شخص عمداً بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھالے۔ (اسے ایللا کہا جاتا ہے)۔ تو ظاہر ہے ایسی شکل کو دائماً یا غیر متعین عرصہ کے لئے قائم نہیں رکھا جاسکتا۔

اِیْلًا

اس کے لئے قرآن کریم نے کہا کہ

لِّلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَاءِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ . وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ

۲
۲۲۶-۲۲۷

فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ - (۲۲۶-۲۲۷)

جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھالیں، تو عورت کو اس معلق حالت میں غیر متعین عرصہ کے لئے نہیں چھوڑا جاسکتا۔ انہیں زیادہ سے زیادہ چار ماہ تک انتظار کرنا چاہیے۔ اگر وہ اس عرصہ میں باہمی تعلق کی طرف رجوع کر لیں تو انہیں اس کی اجازت ہے۔ کیونکہ قانون خداوندی میں اس قسم کی لغوٹیوں سے حفاظت

اور مرحمت کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ (۵۹ ذ ۳۳ ذ ۵۸)
لیکن اگر وہ معاہدہ نکاح سے آزاد ہو جانے کا فیصلہ کر لیں (جسے طلاق کہتے ہیں) تو انہیں ایسا کر لینا چاہیے۔
اس لئے کہ یہ اس خدا کا قانون ہے جو ہر بات کا سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ (اسے معلوم ہے کہ
جب نباہ کی شکل باقی نہ رہے تو ہر الگ ہو جانا ہی بہتر ہوتا ہے)۔

اس مقام پر قرآن کریم نے اس قسم کے توڑنے کے کفارہ کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ لیکن دوسرے مقام پر ہے:
لَا يُؤْخَذُ كُمْ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤْخَذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ
الْأَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِينٍ مِنْ أَوْسَطِ مَا تَطْعَمُونَ
أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ
أَيَّامٍ ذَلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ كَذَلِكَ
يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ (۵)

اگر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہم نے فلاں فلاں حلال چیزوں کے نہ کھانے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اس
لئے اب اس قسم کو کس طرح توڑیں؟ تو یاد رکھو۔ لغو اور مہمل قسموں پر کوئی مواخذہ نہیں ہوتا (۵۸ ذ ۲۲)۔ باقی میں
وہ (غلط) قسمیں جو تم نے قصد و ارادہ سے نہایت محکم طور پر کھائی ہوں تو انہیں بھی توڑا جاسکتا ہے۔
لیکن اس صورت میں کچھ کفارہ دینا ہوگا۔ یہ کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ کھانا ویسا ہی ہونا
چاہیے جیسا تم عام طور پر اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو۔ یا دس مسکینوں کو کپڑا دینا یا کسی غلام (گردن) کا
آزاد کرنا۔ لیکن جسے یہ کچھ میسر نہ ہو (یا حالات ایسے ہوں جن میں یہ کچھ ممکن نہ ہو)۔ مثلاً کوئی محتاج
یا غلام جو نہ تو وہ تین دن کے روزے رکھ لے۔ یہ کفارہ ہے تمہاری اُن (غلط) قسموں کا جو تم نے
بالا ارادہ کھائی ہوں۔ لیکن جو قسمیں قوانین خداوندی کے خلاف نہ ہوں، ان کی پاسداری نہایت ضروری
ہے۔ اس لئے کہ یہ قسمیں درحقیقت عہد و پیمان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور عہد کا پورا کرنا نہایت ضروری ہے
(خواہ وہ عہد دوسروں کے ساتھ کیا گیا ہو یا خود اپنے ساتھ)۔

اس طرح اللہ اپنے احکام و قوانین کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج

پیدا کریں۔

چونکہ ایلا میں بھی قسم دل کے ارادے سے کھائی جاتی ہے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اس کیلئے بھی یہی کفارہ ہوگا۔
لیکن اگر شیعہ شخص چار ماہ کے عرصہ میں رجوع نہیں کرتا تو پھر جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے (۲۲۶-۲۲۷) نوبت طلاق تک پہنچ جائے گی۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

ظہار اور ایلا سے متعلق احکام کی روشنی میں اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہوگا کہ جو لوگ اپنی بیویوں کو بستے نہیں اور ادھر لٹکی ہوئی چھوڑے رکھتے ہیں، یا مفقود الخبر ہو جاتے ہیں، ان کے لئے ضروری قوانین وضع کرے۔

(۰)

طلاق

میاں بیوی کی کشیدگی کی انتہائی شکل وہ ہے جس میں معاہدہ نکاح کے فسخ کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ اسے طلاق کہتے ہیں۔ طلاق کے لغوی معنی آزاد ہو جانے یا آزاد کرانے کے ہیں۔ نکاح کے معاملہ کو تو قرآن کریم نے فریقین کی رضامندی پر چھوڑا تھا اس لئے کہ وہ ان کا انفرادی مسئلہ تھا۔ لیکن فسخ نکاح کا معاملہ انفرادی نہیں رہتا۔ اس میں فریق مقابل اور اکثر اوقات اولاد کے مفاد پر زور پڑتی ہے۔ اس لئے اس نے اسے معاشرہ کا مسئلہ قرار دیا ہے اور اسلامی مملکت کو ہدایات دی ہیں کہ اسے اس باب میں کیا کرنا چاہیے؟ یہ بات یہیں سے واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں عام روش ہے کہ مرد کا جس وقت جی چاہے طلاق۔ طلاق کہہ کر بیوی کو (اکثر اوقات مع بچوں کے) گھر سے نکال باہر کرے یہ قطعاً خلاف قرآن ہے۔ نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں میاں بیوی برابر کے فریق ہوتے ہیں تو (ظاہر ہے کہ) اس کے فسخ کرنے میں بھی وہ برابر کے فریق ہوں گے۔ یہ تو معاہدہ کے بنیادی تصور کے خلاف ہے کہ اس کے استوار کرنے میں تو زوجین برابر کے فریق ہوں لیکن اس کے فسخ کرنے کا کلی اختیار ایک فریق (خاوند) کو حاصل ہو اور فریق ثانی (بیوی) مجبور و مقہور ہو۔ قرآن کریم کی رو سے اس میں نہ خاوند کو (UNILATERALLY) کوئی اختیار ہوتا ہے نہ بیوی کو۔ یہ معاملہ معاشرہ (مملکت) کے طے کرنے کا ہے۔
اب آپ دیکھیے کہ قرآن کریم اس باب میں معاشرہ کو کیا ہدایات دیتا ہے۔ وہ اسے کہتا ہے :-

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَأَبْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُّوفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا - (۲۲)

اگر تمہیں کسی میاں بیوی میں ناجاتی کا خدشہ ہو تو ایک ثالث خاوند کے خاندان سے اور ایک بیوی کے خاندان سے مقرر کرو۔ اس طرح اگر میاں بیوی باہمی مصالحت کا ارادہ کر لیں (یادوںوں ثالث ان میں اصلاح کی نیت سے موافقت پیدا کرنے کی کوشش کریں) تو قانونِ خداوندی ان میں موافقت پیدا کر دے گا۔ اس لئے کہ اس کا قانون علم و آگہی پر مبنی ہے۔

آپ دیکھیے اس میں ”إِنْ خِفْتُمْ“ (اگر تمہیں اس کا.... اندیشہ ہو) کا مخاطب معاشرہ (مملکت) ہے۔ لہذا میاں بیوی کی باہمی کشیدگی کے دور کرنے کے لئے سب سے پہلا قدم یہ ہو گا کہ مملکت ایک مصالحتی بورڈ کی تشکیل کرے۔

دوسرے ”يَشْقَاقَ بَيْنَهُمَا“ میں میاں اور بیوی دونوں شامل ہیں اس لئے جس طرح خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ باہمی کشیدگی کی صورت میں تشکیل مصالحتی بورڈ مقرر کرنے کے لئے مملکت کی طرف رجوع کرے، اسی طرح بیوی کو بھی حق حاصل ہے۔ بیوی کے متعلق دوسری جگہ ہے۔

وَإِنْ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا - (۲۴)

(جو عورتیں سرکشی پر اثر آئیں ان کے متعلق (۲۴) میں حکم دیا جا چکا ہے)۔ اس کے برعکس اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی طرف سے سرکشی یا بے رغبتی محسوس کرے تو اس میں کچھ حرج نہیں کہ وہ جن شرائط پر بھی چاہیں آپس میں مصالحت کر لیں۔ اس لئے کہ مصالحت بہر حال جھگڑے سے بہتر ہوتی ہے۔ (مصالحت کیلئے ثالثوں کے تقرر کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے۔ (۲۴) مصالحت کے معاملہ میں بالعموم روپے پیسے کا سوال سدا رہا ہو جایا کرتا ہے اور معاملات سلجھنے نہیں پاتے۔ اس لئے کہ انسان کی طبیعت میں بخل ہوتا ہے۔ اگر تم اس جذبہ پر قابو پا کر حسن سلوک سے کام لو اور اس طرح قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو تو تمہیں اس کا اجر ملے گا۔ خدا کا قانون مکافات تمہارے ہر عمل سے باخبر ہوتا ہے۔

اس طرح باہمی مصالحت ہو جائے تو ہوا المراد ورنہ بیوی کو بھی عدالت میں سلسلہ جنائی کرنی ہوگی۔ عدالت میں عورت کے اپنے معاملہ کے متعلق بحث کرنے کا ذکر خود قرآن کریم میں آیا ہے جہاں فرمایا:

قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا وَتَشْتَكِي إِلَى اللَّهِ - وَاللَّهُ يَسْمَعُ

تَحَاوَرَكُمَا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ (۵۶)

اللہ نے اس عورت کی بات سن لی ہے جو تجھ سے (اے رسول) اپنے غاوند کے بارے میں جھگڑا رہی تھی اور اپنی مظلومت کے متعلق خدا سے فریاد کر رہی تھی (اس نے عدالتِ خداوندی میں استغاثہ دائر کیا تھا)۔ اللہ تم دونوں کے سوال جو کچھ سن رہا تھا۔ وہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

اگر مصالحتی بورڈ کی مصالحت کی کوششیں ناکام رہ جائیں تو عدالتِ مجاز فیخ نکاح کا فیصلہ سنا دے گی۔ یہ بات کہ یہ فیصلہ عدالت کے ذریعے ہوگا، قرآن کریم سے واضح ہے۔ سورہ الطلاق میں ہے:-

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ
وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ - (۶۵)

(اے رسول! جب تم طلاق کے مقدمات کا فیصلہ کرو تو لوگوں سے کہہ دو کہ اس کے بعد عدت کا سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسے ضروری پورا کرنا چاہیے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اس کا حساب رکھو اور اس طرح

اپنے نشوونما دینے والے کے احکام کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ (۲۳۷-۲۳۸؛ ۲۳۹)

دیکھیے! یہاں خطاب تو النبی (بصیغہ واحد) سے ہے لیکن اس کے بعد طَلَّقْتُمُ (تم طلاق دو) میں جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ عام دستور کے مطابق عدالت کے لئے جمع کا صیغہ لایا جاتا ہے۔ دوسرے طَلَّقْتُمُ سے پہلے يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ کہنے کے معنی یہ ہیں کہ طلاق کا فیصلہ لوگ از خود نہیں کر سکتے۔ یہ فیصلہ نبی (یعنی اسلامی مملکت یا عدالت) کی وساطت سے کیا جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے جہاں جہاں طلاق کے متعلق ہدایات دی ہیں اس سے مراد عدالت کے ذریعے فسخ معاہدہ کا فیصلہ ہے جس کا اولین قدم مصالحتی بورڈ کی طرف رجوع کرنا ہے۔ بادی النظر میں ذہن اس طرف جاتا ہے کہ جب مصالحتی بورڈ اپنی کوشش میں ناکام رہ جائے تو عقد نکاح از خود فسخ ہو جانا چاہیے۔ لیکن اس میں بعض دیگر امور فیصلہ طلب ہوتے ہیں جن کے لئے عدالت کی طرف رجوع ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً:-

(۲) اگر عدالت مجاز دیکھے کہ عورت بے قصور ہے اور مرد ہی نباہ نہیں کرنا چاہتا تو وہ عورت سے کچھ دلائے بغیر طلاق کا فیصلہ کر دے گی۔ سورہ النساء میں ہے۔

وَإِنْ أَرَدْتُمْ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَاسْتَيْمُوا إِلَيْهَا فَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ

لہ عدت کے متعلق آگے چل کر بات کی جائے گی۔

فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا اتَّخَذُوا مِنْهُ بُهْتَانًا وَإِنَّمَا مُبِينًا وَكَيْفَ
تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَى بَعْضُكُمْ إِلَى بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنْكُمْ مِيثَاقًا
غَلِيظًا - (۲/۲۶۴)

اگر تم یہ فیصلہ کر لو کہ موجودہ بیوی کو طلاق دے کر کسی اور جگہ نکاح کرنا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ محض
نئی عورت سے شادی کرنے کا شوق طلاق کے لئے وجہ جواز ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان شرائط کے
مطابق جن کا ذکر آگے چل کر آئے گا طلاق تک کی نوبت پہنچ جائے۔ اور تم اپنی بیوی کو سونے کا ڈھیر بھی لے
چکے ہو تو اس سے کچھ واپس نہ لو (البتہ اگر طلاق کا مطالبہ عورت کی طرف سے ہو تو پھر اس میں سے کچھ لیا جا
سکتا ہے) (۲/۲۶۴) یا اگر اس سے بے حیاتی کا ارتکاب ہوا ہو تو۔ (۲/۲۶۴) لیکن جب ایسی صورت نہ ہو اور تم
اس (بیچاری) کے خلاف ناحق نیتیں لگا کر کچھ وصول کرنا چاہو تو یہ ایک کھلا ہوا گناہ ہے۔ یعنی ایسی
معیوب حرکت جس کے مذموم ہونے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

جو کچھ تم نے اسے دیا تھا وہ کیسے واپس لے سکتے ہو۔ درآں حالیکہ تم میں زنا شوقی کے تعلقات رہ
چکے ہیں اور تمہاری بیویاں نکاح کے وقت تم سے اپنے حقوق کے تحفظ کا پختہ عہد بھی لے چکی ہیں لہذا
تمہارے لئے اس معاہدہ کا احترام ضروری ہے۔

(ضمنی) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مرد اگر کسی دوسری عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ پہلی بیوی کی موجودگی
میں ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ پہلی بیوی کو (قاعدے قانون کے مطابق) طلاق دے کر اس کی جگہ کوئی اور بیوی لا
سکتا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے اصول وحدت زوج (ایک وقت میں ایک بیوی) کا ہے۔

(۳) لیکن عورت اگر فحش کی مرکب ہو تو عدالت اس سے کچھ ہرجانہ دلا سکتی ہے۔ ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرِهًا وَلَا تَفْضُلُوهُنَّ
لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْنَهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبِينَةٍ - (۲/۲۶۴)

(جیسا کہ مردوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ بیوی کا انتخاب اپنی مرضی سے کریں) (۲/۲۶۴) اسی طرح نکاح کے لئے
عورتوں کی رضا مندی بھی ضروری ہے۔ تمہارے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے مالک بن
جاؤ (ایسا کرنا حلال ہی نہیں) اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ اگر وہ تمہارے نکاح میں نہ رہنا چاہیں تو انہیں
اس نیت سے روک رکھو کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ ہتھیا لو۔ ایسا قطعاً جائز نہیں۔

بجز اس کے کہ ان سے کھلی ہوئی بے حیائی کا ارتکاب ہوا ہو۔ (اس صورت میں عدالت تمہیں اس میں سے کچھ دلا سکتی ہے)۔

(ضمناً) آیت کے پہلے الفاظ سے واضح ہے کہ عورت کی رضا مندی کے بغیر (اکراہاً) نہ اس سے نکاح کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی نکاح کے بعد اسے باندھ کر رکھا جاسکتا۔ یعنی نہ اسے نکاح کے لئے مجبور کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی (نکاح کے بعد) اسے اس کی رضا مندی کے خلاف بیوی بنا کر رکھا جاسکتا ہے۔ ایسا کرنا ”حلال ہی نہیں“ حرام ہے۔ یہ آیت عورت کے حق طلاق کی توثیق سند ہے۔

(۴) اسی طرح اگر عدالت دیکھے کہ مرد بے قصور ہے اور عورت نباہ نہیں کرنا چاہتی تو وہ مرد کو کچھ جزا دلا سکتی ہے۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا اسْتَمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۲/۲۲۹)

طلاق کی صورت میں اس کی اجازت نہیں کہ جو کچھ تم عورتوں کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ بھی واپس لے لو۔ ہاں اگر کسی وقت ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ایک طرف یہی چیز ان کی علیحدگی کے راستے میں حائل ہو رہی ہو اور دوسری طرف میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے میں انہیں خدشہ ہو کہ (تعلقات کی کشیدگی کی بنا پر) وہ حقوق و واجبات ادا نہیں کر سکیں گے جو قانونِ خداوندی نے ان پر عائد کر رکھے ہیں۔ اور معاشرہ کا نظام عدالت بھی اسی نتیجہ پر پہنچے اور سمجھے کہ خاوند کو واقعی کچھ معاوضہ ملنا چاہیے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے حق میں سے کچھ چھوڑ دے اور معاہدہ نکاح سے آزادی حاصل کر لے۔ یہ قانونِ خداوندی کی حدود ہیں جن کی نگہداشت ضروری ہے۔ جو کوئی ان حدود سے تجاوز کرے گا وہ قانون کی نگاہ میں مجرم ہوگا۔

(نوٹ) اس آیت کے پہلے چند الفاظ ”الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ فَإِمْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ“ اس مقام پر حذف کر دیئے گئے ہیں۔ انہیں ان کے مناسب مقام پر سامنے لایا جائے گا۔

(۵) عدالت کے اس فیصلہ (طلاق) کے بعد عورت کی عدت شروع ہو جائے گی۔ عدت کے متعلق تفصیلی احکام تو آگے چل کر درج کئے جائیں گے۔ اس مقام پر اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ

(۱) عدت اس عرصہ کو کہتے ہیں جس میں مطلقہ یا بیوہ عورت کسی دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتی۔
(۲) عدت کے عرصہ میں اس امر کی گنجائش ہوتی ہے کہ سابقہ میاں بیوی پھر سے ازدواجی رشتہ استوار کر لیں۔ اس کی شرائط آگے چل کر بیان کی جائیں گی۔

اسی سلسلہ میں حسب ذیل ہدایات غور طلب ہیں :-

(۱) سورۃ الطلاق میں ہے :-

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ - (۶۵)

جب وہ مدت (عدت) ختم ہونے کو ہو تو انہیں (عورتوں کو) یا تو ”معروف“ طور پر رکھ لو۔ یا معروف طور پر الگ کر دو۔

”معروف“ کے معنی ہیں مملکت کے وضع کردہ قاعدے اور قانون کے مطابق۔

(۲) سورۃ بقرہ میں ہے :-

فَإِمْسَاكُ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ - (۲۲۹)

یا انہیں معروف طور پر روک لو اور یا حسن سلوک کے ساتھ الگ کر دو۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ عدت کے دوران ان (سابقہ میاں بیوی) کو رشتہ ازدواج کی استواری کا موقع دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں دو باتیں واضح ہیں۔

(۱) اگر طلاق بیوی نے حاصل کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس خاوند کے ہاں بسنا نہیں چاہتی اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ (اس کا سابقہ) خاوند اسے زبردستی دوبارہ اپنے ہاں لے جائے۔ ہاں اگر وہ عورت اپنا ارادہ بدل لے تو اور بات ہے۔

(ب) اگر خاوند نے طلاق حاصل کی ہے حالانکہ بیوی اس کے ہاں بسنا چاہتی تھی اور مرد اپنی اصلاح کا ارادہ کر لیتا ہے تو یہ رشتہ دوبارہ استوار ہو سکتا ہے۔ بَعُولَتِهِنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا۔ (۲۴۴)۔ اگر وہ اپنی اصلاح کا ارادہ کر لے تو وہ اس سابقہ بیوی کو واپس لے لینے کا زیادہ حق دار ہے۔“

”حقدار“ کے معنی یہ نہیں کہ وہ بطور استحقاق اس عورت کو دوبارہ بیوی بنا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اپنی اصلاح کر لے تو وہ اس کا مستحق ہو جاتا ہے۔ عورت کی رضامندی بہر حال ضروری ہوگی۔ لیکن عورت کو تنگ کرنے کی نیت سے ایسا نہ کیا جائے۔ ارشاد ہے:-

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمَّا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ
سَرَحوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا. وَمَنْ يَفْعَلْ
ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ. وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا. وَادْكُرُوا
نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ
يَعِظُكُمْ بِهِ. وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيمٌ (۲/۲۳۱)

جب مطلقہ عورت کی عدت کا زمانہ ختم ہونے کو آئے تو (جیسا کہ ۲۳۰ میں کہا گیا ہے) یا اُسے نکاح میں لے
آؤ یا قاعدے کے مطابق رخصت کر دو۔ [اور یہ فیصلہ دو معتبر گواہوں کے رو برو کر و تاکہ بات واضح ہو
جائے۔ (۲/۲۳۱)]

اور یاد رکھو! ان عورتوں سے دوبارہ نکاح اس نیت سے نہ کرو کہ ان پر زیادتی کر کے انہیں تکلیف
پہنچائی جائے۔ جو ایسا کرے گا وہ خود اپنے آپ کو نقصان پہنچائے گا۔ لہذا، قانونِ خداوندی کو یونہی مذاق
نہ سمجھو۔ اس کے نتائج و عواقب بڑے دور رس ہوتے ہیں۔ یہ تو اللہ کی نوازشات میں سے ہے کہ اس نے
تمہیں ایسا واضح ضابطہ قوانین عطا کر دیا ہے۔ اور صرف قانون ہی نہیں بتایا بلکہ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا
ہے کہ قانون کی غرض و غایت کیا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے نتائج کیا نکلیں گے۔
لہذا، تم ان قوانین کی پوری پوری نگہداشت کرو اور اس حقیقت پر یقین رکھو کہ یہ اس خدا کا قانون
ہے جو سب کچھ جانتا ہے۔

(ضمناً) آیت کے ان الفاظ پر دوبارہ نگاہ ڈالو۔ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا — احکامِ خداوندی
کا مذاق نہ اڑاؤ۔ ذرا سوچئے کہ کیا اس وعیدِ خداوندی کے موردِ ہم ہی نہیں؟ ہم نے جس طرح طلاق کے مسئلہ
کو اضمح کو اور تماشا بنا رکھا ہے اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ وعید ہمارے ہی لئے ہے۔

(۲) اگر انہوں نے ازدواجی رشتہ کو استوار کر لیا ہے تو ہو المراد — لیکن اگر الگ ہو جانے کا فیصلہ

کیا ہے تو اس کے لئے دو گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ سورہ الطلاق میں ہے :-
 فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا
 ذَوَى عَدْلٍ مِّنكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ ۔ (۲/۲۳۲)
 جب ان عورتوں کی مدت کی مدت قریب الاختتام ہو تو خواہ انہیں معروف طور پر روک لو اور خواہ
 معروف طور پر الگ کر دو۔ اس کے لئے دو عادل گواہوں کی ضرورت ہوگی جنہیں چاہیے کہ وہ (فریقین
 کی خاطر نہیں بلکہ) خدا کی خاطر شہادت کو قائم رکھیں ۔

اس مقام پر ایک اہم نکتہ غور طلب ہے۔ ان آیات میں کہا گیا ہے کہ طلاق کے عدالتی فیصلہ کے بعد عدت کے
 دوران معروف طریق سے رشتہ ازدواج استوار ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کے لئے نکاح کی تجدید
 کی ضرورت ہوگی یا صرف باہمی رضا مندی کافی ہوگی۔ فرق ان میں یہ ہوگا کہ تجدید نکاح کی صورت میں، تہرہ دوبارہ
 دینا پڑے گا۔ اس سلسلہ میں ایک مقام پر نکاح کا لفظ بھی آیا ہے جہاں کہا ہے ۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ
 أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضُوا بَيْنَهُمَا بِالْمَعْرُوفِ (۲/۲۳۲)

جب مطلقہ عورتیں اپنی عدت کے قریب پہنچ جائیں اور سابقہ میاں بیوی قاعدے اور قانون کے مطابق پھر
 ازدواجی زندگی بسر کرنے (نکاح) کا ارادہ کریں تو تم ان عورتوں کو اس سے مت روکو ۔

یہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس صورت میں تجدید نکاح کی ضرورت ہوگی۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے قرآن کریم
 نے کہا یہ ہے کہ یہ سب کچھ ”بالمعروف“ ہوگا۔ یعنی ان قواعد و ضوابط کی رو سے جنہیں اسلامی مملکت قرآنی حدود
 کے اندر وضع کرے۔ لہذا وہ مملکت اس باب میں جو فیصلہ بھی کرے وہ ”معروف“ کی شرط کو پورا کرے گا۔

(۲)

تین مرتبہ کی طلاق

طلاق کے متعلق قرآنی احکام و ہدایات واضح ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں جو احکام شریعت رائج ہیں ان کی
 رو سے خاوند کو تو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے بغیر کوئی وجہ بتائے (ARBITERARILY) بیٹھے
 بٹھائے بیوی کو طلاق دے دے لیکن اگر بیوی اس کے مظالم سے رشتہ گاری حاصل کرنا چاہے تو اسے عدالتوں

کے دروازے کھٹکھٹانے پڑیں۔ اس کے لئے اصطلاح بھی الگ ہے۔ یعنی ”خُلْع“ جس کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں۔ مروجہ قانونِ شریعت کی رو سے زیادہ سے زیادہ یہ رعایت دی جاتی ہے کہ خاوند اگر چاہے تو اپنا ”حق طلاق“ مشروط یا غیر مشروط طور پر بیوی کو تفویض کر سکتا ہے۔ یعنی طلاق کا حق مرد ہی کو حاصل ہوتا ہے، بیوی کو نہیں۔ وہ اس کے رحم و کرم پر ہی رہتی ہے۔ یعنی اس بات کا تو عورت کو پورا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس مرد کے حوالہ نکاح میں آنا چاہتی ہے یا نہیں۔ لیکن جب وہ ایک دفعہ اس جبل (پھندے) میں پھنس جلتے تو اس سے چٹکارا پانے کا اسے کوئی اختیار نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ یہ احکام ہمارے دورِ ملکیت کے وضع کردہ ہیں جب مرد عورتوں کو اپنی لونڈیا بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ شریعتِ خداوندی کو ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

عورتوں کو لونڈیاں بنا رکھنے کے سلسلہ میں ایک اور اہم گوشہ سامنے آتا ہے۔ جب عدالت نے طلاق کا فیصلہ کر دیا تو یہ ایک طلاق ہو گئی۔ (یاد رکھیے! قرآن کریم کی رو سے طلاق کا لفظ اس وقت بولا جائے گا جب عقدِ نکاح فسخ ہو جائے)۔ اگر یہ میاں بیوی عدت کے دوران پھر سے ازدواجی رشتہ استوار نہ کریں اور علیحدہ ہو جائیں، تو اگر یہ چاہیں تو اس کے بعد بھی آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ اگر یہ (عدت کے دوران یا اس کے بعد) ازدواجی رشتہ استوار کر لیں لیکن اس کے بعد پھر طلاق واقع ہو جائے (یعنی اُسی طریق کے مطابق جس کا پہلے ذکر آچکا ہے) عقدِ نکاح فسخ ہو جائے، تو یہ دوسری مرتبہ کی طلاق ہوگی۔ اس طلاق کے بعد بھی اس کی گنجائش ہوگی کہ یہ (عدت کے دوران یا اس کے بعد) پھر سے میاں بیوی بن جائیں۔ لیکن اگر اس کے بعد پھر طلاق واقع ہو جائے جو اس میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں تیسری مرتبہ کی طلاق ہوگی تو پھر انہیں اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ یہ (عدت کے دوران یا اس کے بعد) آپس میں نکاح کر لیں۔ ہاں اگر ایسا ہو کہ یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کر لے اور اس سے طلاق ہو جائے (یا یہ بیوہ ہو جائے) تو اس صورت میں یہ اپنے پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔ سورۃ البقرہ (۲/۲۲۹) میں ہے اَطْلَاقٍ مَّرَّتَيْنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيحٌ بِاِحْسَانٍ۔ ایک میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں صرف دو مرتبہ کی طلاق کی صورت میں اس کی اجازت ہے کہ وہ پھر سے ازدواجی رشتہ استوار کر لیں تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد وہ ایسا نہیں کر سکتی۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدِ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَتَرَاجَعَا اِنْ ظَنَّا اَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ (۲/۲۳۰)

اگر کسی میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں دو مرتبہ کی طلاق (اور تین مرتبہ کے نکاح) کے بعد تیسری مرتبہ طلاق ہو جائے تو اس کے بعد یہ عورت اپنے سابقہ خاوند کے نکاح میں نہیں آسکتی۔ ہاں! البتہ اگر وہ کسی اور شخص سے نکاح کرے اور اس سے بھی طلاق ہو جائے تو پھر اس میں کوئی ہرج نہیں کہ وہ اپنے پہلے خاوند سے نکاح کرے۔

یہ ہیں عائلی زندگی سے متعلق وہ قوانین جنہیں اللہ ان لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان کرتا ہے جو معاشرتی زندگی کی مصلحتوں کا علم رکھتے ہیں۔

آپ دیکھتے کہ قرآن کریم کے یہ احکام کس قدر واضح ہیں۔ لیکن وہ جو اس نے کہا تھا کہ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا - (۲۴۶)۔ "ہمارے احکام کا مذاق مت اڑاؤ" تو اس کی تین مثال ہمارے ہاں کے "شرعی احکام" ہیں۔ ان احکام کی رو سے، اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین مرتبہ "طلاق، طلاق، طلاق" کہہ دے (یعنی طلاق کا لفظ تین مرتبہ کہہ دے) تو یہ تین مرتبہ کی طلاق (طلاق ثلاثہ یا طلاق بائن) قرار پا جاتی ہے جس کے بعد نہ یہ جوڑا میاں بیوی رہتا ہے نہ ہی یہ آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ البتہ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ یہ عورت "ایک رات کے لئے" کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے۔ وہ اس کے ساتھ شب بسر کرے

حلالہ!

کرنے کے بعد دوسری صبح اسے طلاق دیدے، تو پھر یہ سابقہ میاں بیوی آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ اسے حلالہ کہا جاتا ہے۔ یہ صورت جس قدر حیات سوز اور غیرت کش ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا سب سے زیادہ شرمناک اور الم انگیز پہلو یہ ہے کہ غصہ میں آکر طلاق۔ طلاق۔ طلاق تو مرد کہتا ہے اور اس کے بعد یہ اپنی اس حرکت پر نادم بھی ہو جاتا ہے لیکن اس کی سزا اس بے گناہ بیوی کو بھگتنی پڑتی ہے۔ اور سزا بھی ایسی جس کے مقابلہ میں وہ عفت آب موت کو ترجیح دے یعنی ایک رات کے لئے کسی غیر مرد سے ہم بستری! اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ اسے "شرعیّت خداوندی" کہہ کر پکارا جاتا ہے (معاذ اللہ۔ استغفر اللہ)۔ میرے پاس اکثر اس قسم کے استفسارات آتے رہتے ہیں کہ مرد نے غصہ میں آکر طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ دیا۔ مولوی صاحب نے فرمادیا کہ اب تو حلالہ کرنا ہوگا۔ بال بچوں والی عصمت آب (اور اکثر حالات میں) معمر بیوی سرسپٹ رہی ہے۔ اس کی غیرت اسے اس کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ لیکن مولوی صاحب اس پر مصر ہیں کہ حلالہ کرنا ہی ہوگا۔ اکثر و بیشتر اس "کارِ خیر" کے لئے خود اپنے آپ کو پیش کر دیتے ہیں۔ ایسے واقعات بھی میرے سامنے پیش کئے گئے جن میں حلالہ کرنے والا اس عورت کو طلاق

نہیں دیتا۔ یا اس کے لئے بھاری رقم مانگتا ہے۔ یہ سب کچھ شریعتِ حقہ کے نام پر ہوتا ہے اور ”اربابِ شریعت“ کے دل میں خوفِ خدا کا ذرا سا احساس بھی بیدار نہیں ہوتا کہ اس بحیرِ خلافِ اسلام ہی نہیں خلافِ انسانیت شرمناک فعل کو ختم کریں۔ ختم کرنا تو ایک طرف، حکومت کی طرف سے نافذ کردہ عائلی قوانین (FAMILY - LAWS - 1961) میں تھوڑی سی اصلاح کی کوشش کی گئی تھی۔ ان کے خلاف ہماری مذہبی پیشواہیت قیامت برپا کر دی۔ اب بھی جس وقت ان کی ”اسلامی حمیت“ جوش میں آتی ہے تو ان کی طرف سے سب سے پہلا مطالبہ ان قوانین کو منسوخ کرنے کا پیش ہوتا ہے۔ آسمانِ راحق بود گر خوں سبارد بر زمیں !

(۰)

مُتَع

اسم نے دیکھ لیا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے نکاح، مرد اور عورت کے مابین ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ ہے۔ یہ معاہدہ ’طلاق‘ یا زوجین میں سے کسی ایک کی وفات سے منقطع ہوتا ہے۔ طلاق نہ ہو تو یہ عمر بھر تک قائم رہتا ہے۔ اس میں مدت کا سوال ہی نہیں۔

لیکن عرب جاہلیہ میں جنسی اختلاط کی ایک اور شکل بھی رائج تھی جس میں یہ اختلاط ایک معینہ مدت کیلئے معینہ معاوضہ کے عوض روا رکھا جاتا تھا۔ اسے وہ متعہ سے تعبیر کرتے تھے۔ قرآنِ کریم نے اسے ختم کر دیا لیکن شیعہ حضرات کے ہاں اسے جائز سمجھا جاتا ہے۔ میرا منصب چونکہ قرآنی احکام و ہدایات کی بتائیں ہے اس لئے میں فرقہ دارانِ بحث میں نہیں الجھا کرتا۔ بنا بریں، میں شیعہ حضرات کے اس مسلک کے متعلق گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ سنی حضرات جو اس قسم کے جنسی تعلقات (متعہ کو زنا قرار دیتے ہیں، ان کی کتب روایات میں اس کے متعلق کیا کچھ مذکور ہے۔

سنیوں کی سب سے معتبر کتاب بخاری شریف ہے۔ جسے اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس میں (جلد دوم صفحہ ۵۹) مطبوعہ کرزن گزٹ پریس دہلی، جلد سوم صفحہ ۴۶) مطبوعہ مصر) حسب ذیل حدیث آئی ہے۔

۱۔ مسودہ کی نظر ثانی کے وقت (جنوری ۱۹۷۹ء میں) ملک میں شرعی قوانین کے ملکتی قوانین کی حیثیت میں نفاذ کا چرچا عام ہو رہا ہے اس میں بھی عائلی قوانین (۱۹۶۱ء) کی منشیخ کا مطالبہ پیش پیش نہیں کہا جاسکتا کہ کتاب کی اشاعت تک صورتِ طالت کیا ہو !

عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ لڑائیوں پر جایا کرتے تھے اور ہمارے پاس کوئی سامان (اپنے مقتضائے فطرت کے پورا کرنے کا) نہ ہوتا تھا۔ تو ہم نے کہا کہ ہم اپنے اعضائے شہوانی کو قطع نہ کرادیں؟ حضورؐ نے ہمیں اس سے منع فرمایا۔ پھر ہمیں اجازت دی کہ عورتوں سے کسی کپڑا وغیرہ کے عوض میں ”نکاح“ کر لیا کریں۔

بخاری کے بعد صحیح مسلم کا مرتبہ ہے۔ اس میں یہ روایت تین طریقوں سے آئی ہے۔ اس میں ایک جگہ ”إِلَى أَجَلٍ“ کا اضافہ ہے۔ یعنی رسول اللہ نے ہمیں اجازت دی کہ ہم ایک میعاً مقررہ کے لئے عورتوں سے کپڑے وغیرہ کے عوض نکاح کر لیا کریں۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ اس میں لڑائیوں کے زمانے کی تخصیص نہ تھی۔

(صحیح مسلم مطبوعہ مجتبائی۔ دہلی۔ جلد ۱۔ صفحہ ۴۵۰)

جمع الفوائد (شیخ محمد بن محمد سلیمان سوسی مالکی مطبوعہ میرٹھ ج ۱۔ ص ۲۲۲) میں اس روایت میں اتنا فرق ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے کہا کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ لڑائیوں پر جاتے تھے اور ہمارے ساتھ عورتیں نہیں ہوتی تھیں۔ اس پر حضورؐ نے مذکورہ بالا اجازت دی تھی (یعنی ایک وقت معین کے لئے نکاح کی اجازت) یہی روایت مسند امام ابی عبداللہ محمد بن ادیس شافعی مطبوعہ مصر ص ۱۴۵ میں بھی ہے۔ نیز شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے منشی الاخبار میں اس روایت کو متفق علیہ قرار دیا ہے اور صاحب کنز العمال (ج ۲۹ ص ۸) نے لکھا ہے کہ امام طبری نے تہذیب الآثار میں اس کی تخریج کی ہے۔

دوسری حدیث صحیح بخاری (مطبوعہ دہلی جلد ۲ صفحہ ۷۷۷۔ و مصر جلد ۳ ص ۱۵۱) میں یوں درج ہے۔

جابر بن عبداللہ اور سلمہ بن الاکوع کا بیان ہے کہ ہم ایک لشکر میں تھے کہ حضورؐ کا فرستادہ شخص ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا کہ تمہیں اجازت دی گئی ہے کہ تم متعہ کرو۔ اب تم متعہ کر سکتے ہو۔

صحیح مسلم (ص ۱۵۱) میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضورؐ کے منادی کرنے والے نے آکر اعلان کیا کہ تم لوگوں کو متعہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ دوسری روایت (مسلم ص ۱۵۱) میں ہے کہ حضورؐ نے خود تشریف لا کر متعہ کی اجازت کا اعلان فرمایا۔

تیسری حدیث بخاری (مطبوعہ دہلی جلد ۱ ص ۶۷۷ و مصر ص ۱۵۱) میں یوں ہے۔

سلمہ بن الاکوع کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو مرد و عورت آپس میں قرارداد کر لیں تو تین راتوں تک ان کی مباشرت کی میعاد ہونی چاہیے۔ اس کے بعد اگر وہ چاہیں تو اس مدت میں اضافہ کر لیں اور اگر چاہیں

توجدائی اختیار کر لیں۔

صحیح مسلم (مطبوعہ دہلی ۱۳۵۸ھ) میں ہے کہ حضورؐ نے جنگ ادھاس والے سال تین دن کے میعاد میں متعہ کی اجازت دی۔ یہی روایت جمع الفوائد، سنن، دارقطنی اور کنز العمال میں بھی ہے۔

اب ذرا اس کی تفصیل سنئے۔ صحیح مسلم (مطبوعہ دہلی صفحہ نمبر ۱۵۱) میں ہے۔

سبرہ جہنی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے متعہ کی اجازت دی تو میں اور ایک اور شخص بنی عامر کی ایک عورت کے پاس اکٹھے گئے اور اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے اپنی اجرت کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ میں اپنی چادر دوں گا۔ میرے ساتھی نے کہا کہ وہ اپنی چادر دے گا۔ اس کی چادر میری چادر سے اچھی تھی لیکن میں اس کی نسبت جوان تھا۔ وہ عورت جب اس کی چادر کی طرف دیکھتی تھی تو اس کی طرف مائل ہو جاتی تھی اور جب میری طرف دیکھتی تو مجھے پسند کرتی۔ بالآخر اس نے کہا کہ تم اور تمہاری چادر میرے لئے کافی ہے۔ چنانچہ تین روز تک میں اس کے پاس رہا۔

غور فرمایا آپ نے کہ جناب امام مسلم نیشاپوری صحابہ کبارؓ کا کیا نقشہ کھینچ رہے ہیں! (استغفر اللہ! استغفر اللہ!) کنز العمال (جلد ۸ صفحہ ۲۹۴) میں سبرہ کی روایت ان الفاظ میں ہے کہ حجۃ الوداع میں :-

جب ہم مکہ معظمہ پہنچے تو خانہ کعبہ کا طواف کیا اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی۔ پھر حضورؐ نے ہمیں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی۔ ہم نے اگر عرض کیا کہ عورتیں متعہ کے لئے راضی نہیں ہوتیں جب تک کوئی میعاد مقرر نہ کی جائے حضورؐ نے فرمایا کہ میعاد مقرر کر کے متعہ کر لو۔

آپ نے دیکھا کہ ہمارے راویوں کے بیان کے مطابق نبی اکرمؐ اپنے آخری حج میں صحابہؓ کو کیا تعلیم دے رہے ہیں۔ (اللھم اغفر لنا۔ اللھم اغفر لنا)۔

اہل سنت والجماعت حضرات کی مدافعت (DEFENCE) یہ ہوتی ہے کہ حضورؐ نے بیشک متعہ کی اجازت دی تھی لیکن بعد میں اس کی ممانعت فرمادی تھی۔ یہ کہہ کر وہ اپنے جی میں خوش ہو لیتے ہیں کہ ہم نے اسلام کے ماتھے سے ایک بہت بڑے کلنک کے ٹیکے کو دھو دیا۔ لیکن یہ سادہ لوح اتنا نہیں سمجھتے کہ جو رسول (ان راویوں کے بیان کے مطابق) اپنی نبوت کے آخری سالوں تک متعہ جیسے فعل کی اجازت دیتے رہے، اس رسول کے متعلق (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) دنیا کیا رائے قائم کیگی؟

ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ متعہ کی ممانعت کی جس قدر روایات ہیں ان میں ایسا تضاد رکھ دیا گیا ہے

کہ سوچنے والا اٹل شخصے میں پھنس جائے کہ یہ کیا پریشان کن روایات ہیں۔ مثلاً کنز العمال (جلد ۸ صفحہ ۲۹۵) میں ایک ہی راوی (سبرہ جہنی) سے (جن کی روایات اوپر گزر چکی ہیں) کہ حضورؐ نے متعہ کی اجازت حجۃ الوداع میں دی تھی، تین مختلف روایات ہیں جن میں سے

ایک میں ہے کہ حضورؐ نے خیبر کے دن متعہ سے ممانعت فرمائی۔ دوسری میں ہے کہ حضورؐ نے فتح مکہ کے دن ممانعت فرمائی اور تیسری میں ہے کہ آپؐ نے حجۃ الوداع میں ممانعت فرمائی۔

لیکن شرح مسلم نووی (مطبوعہ دہلی جلد ۱ صفحہ ۱۵۴) میں اسحق بن راشد کی روایت ہے کہ حضورؐ نے جنگ تبوک میں متعہ سے منع فرمایا۔

اندازہ فرمایا آپؐ نے کہ کس طرح کثرتِ تعبیر سے خواب کو پریشان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کا حل یہ سوچا گیا کہ یوں سمجھنا چاہیے کہ متعہ ایک سے زیادہ مرتبہ جائز قرار دیا گیا اور ایک سے زائد مرتبہ اس کی ممانعت کی گئی ہے چنانچہ امام مسلمؒ نے اس باب کا عنوان ہی یہ قائم کیا ہے۔

باب نکاح المتعہ و بیان انہ ابيع ثم نسخ واستقر تحريمہ الى يوم القيمة۔
باب نکاح متعہ اس امر کے بیان میں کہ وہ مباح تھا پھر منسوخ ہوا۔ پھر مباح ہوا اور اس کے بعد پھر منسوخ ہوا اور پھر قیامت تک کے لئے اس کی حرمت قائم رہی۔

چلتے! ایک بات طے تو ہوتی کہ حضورؐ نے جب آخری بار متعہ کی ممانعت فرمادی تو پھر وہ قیامت تک کے لئے حرام ہو گیا۔

لیکن ٹھہریے! اسی صحیح مسلم کے (جس نے اوپر لکھا ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں متعہ قیامت تک کے لئے حرام ہو گیا) کچھ ورق آگے الٹیے اور دیکھئے کہ ان میں کیا نظر آتا ہے۔ جلد ۱ صفحہ ۱۵۴ پر درج ہے۔

عطا کی روایت ہے کہ جابر بن عبد اللہؓ عمرہ کے ارادے سے مکہ معظمہ آئے تو ہم ان کی ملاقات کو گئے اور مختلف لوگوں نے ان سے سوالات دریافت کئے۔ پھر متعہ کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا کہ ہاں! ہم لوگوں نے عہدِ رسول اللہؐ اور عہدِ ابوبکرؓ اور عہدِ عمرؓ میں برابر متعہ کیا ہے۔

لیجئے! رسول اللہؐ اسے قیامت تک کے لئے حرام قرار دے چکے ہیں لیکن صحابہ کبارؓ حضرت عمرؓ کے زمانے تک متعہ کئے جا رہے ہیں (معاذ اللہ!)۔ اسی مسلم میں دوسری روایت یوں آئی ہے۔

ابو الزبیر کا بیان ہے کہ میں نے جابر بن عبد اللہؓ کو کہتے ہوئے سنا کہ ہم لوگ برابر ایک مٹھی بھر جو یا آٹے کے

عوض میں متعہ کرتے رہے ہیں۔ جناب رسالتاً کے زمانے میں اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے عمرو بن حریث والے واقعے میں اس کی ممانعت کی۔

کنز العمال میں اس کی اجرت ”ایک پیالہ بھر ستو“ لکھی ہے۔ اس کی تائید فتح الباری (شرح بخاری) جلد ۹ صفحہ ۱۳۵ نے بھی کی ہے۔

کنز العمال (ص ۲۹۴) میں اس کی تفصیل بھی ملاحظہ فرمائیے: تحریر ہے:-

ام عبد اللہ بنت ابی قحیفہ کی روایت ہے کہ ایک آدمی شام سے آیا اور ان کے مکان میں قیام کیا۔ اس نے کہا کہ بغیر عورت کے مجھے تکلیف ہے تم میرے لئے کوئی عورت تلاش کرو جس سے میں متمتع ہو سکوں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے اسے ایک عورت کا پتہ دیا اور اس نے اس سے متعہ کیا اور اس پر کچھ عدد دل لوگوں کی گواہیاں قرار دیں۔ پھر ایک طویل زمانے تک وہ اس کے ساتھ رہا اور اس کے بعد شام واپس چلا گیا۔ کسی نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی۔ انہوں نے مجھے بلوایا اور دریافت کیا کہ کیا یہ واقعہ صحیح ہے۔ میں نے کہا۔ ہاں! انہوں نے فرمایا کہ جب وہ پھر آئے تو مجھے اطلاع دینا۔ جب وہ آیا تو میں نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی۔ انہوں نے اُسے بلوایا اور کہا کہ یہ تم نے کیا کیا تھا؟ اس نے کہا کہ میں نے ایسا رسول اللہ کے سامنے کیا۔ انہوں نے منع نہیں کیا یہاں تک کہ حضورؐ کا انتقال ہو گیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ایسا ہوا۔ انہوں نے بھی منع نہیں کیا۔ پھر خود آپ کے زمانے میں بھی ایسا ہوتا رہا۔ آپ نے بھی کوئی ممانعت نہیں فرمائی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر میں پہلے ممانعت کر چکا ہوتا تو تمہیں سنگسار کر دیتا۔ اچھا جدائی اختیار کر لو تا کہ نکاح اور مسافحت (زنا) میں تمیز ہو سکے۔

ابھی تک تو صرف صحابہؓ (مردوں) ہی کا ذکر تھا۔ مندرجہ بالا روایت میں ایک صحابیہؓ کا ذکر بھی آگیا کہ انہوں نے اس ”کارِ خیر“ میں کس قدر مدد کی۔ (یا اللہ! توبہ!) لیکن اسی پر اکتفا تھوڑا ہے۔ ذرا آگے بھی بڑھتے۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے حیار سے کہتے کہ وہ آنکھیں بند کر لے۔ بغیرت سے کہتے کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ شرم سے کہتے کہ وہ اپنا منہ چھپالے کہ اب ذکر آرہا ہے حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت عائشہ الصدیقہؓ کی بہن حضرت زبیرؓ کی رفیقہ حیات حضرت اسماء ذات النطاقین رضی اللہ عنہا کا۔ یہ ذکر ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تفسیر مظہری (ص ۵۷) میں۔ وہاں لکھا ہے۔ (توبہ! توبہ! نقل کفر، کفر نباشد)

روی النسائی والطحاوی عن اسماء بنت ابی بکر قالت فعلتھا علی

عہدِ رسول اللہ -

حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ رسول اللہ کے زمانے میں ہمارے ساتھ متعہ ہوا۔

اسی بنا پر جب حضرت اسماء کے بیٹے (عروہ) نے حضرت ابن عباس رضی سے کہا کہ ”تم کو خدا کا خوف نہیں کہ تم متعہ کی اجازت دیتے ہو“ تو حضرت ابن عباس نے کہا کہ ”اسئل امّک یا عروہ“ ذرا جا کر اپنی دالہ سے پوچھو۔ (زاد المعاد ابن قیم، جلد ۱، ص ۲۱۹)

یلتنی متّ قبل هذا وکنت نسیاً منسیاً۔

بہر حال، یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ نے متعہ کی ممانعت کی تھی یا نہیں کی تھی، لیکن حضرت عمرؓ نے اسے ضرور بند کر دیا چنانچہ زاد المعاد (ابن قیم) جلد ۱، ص ۲۲۳ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ”دو متعہ تھے جو رسول اللہ کے زمانے میں رائج تھے۔ لیکن میں انہیں بند کرتا ہوں۔ ایک متعہ حج اور دوسرا عورتوں کے ساتھ“ آپ کو اطمینان ہو گیا ہو گا کہ چلئے! حضرت عمرؓ کے زمانے ہی میں سہی، یہ لغویت تو ختم ہوئی۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ سازش ہی کیا جو اس طرح ختم ہو جائے! ابھی سلسلہ آگے بھی چلتا ہے۔ چنانچہ فتح الباری (شرح صحیح بخاری)، جلد ۱، ص ۱۳۱ پر ہے۔

ابن عبد البر نے کہا ہے کہ ابن عباس رضی کے تمام اصحاب جو اہل مکہ اور یمن سے تھے جواز متعہ کے قائل تھے۔ ابن

حزم نے کہا ہے کہ تابعین میں سے طاؤس اور سعید بن جبیر اور عطاء اور تمام فقہائے مکہ اسے جائز سمجھتے تھے۔

یہ ہیں وہ احادیث مقدسہ اور ہمارے ائمہ کے اقوال اُس متعہ کے متعلق جسے (اس روایت کی رو سے جو درج کی جا چکی ہے) خود حضرت عمرؓ نے مسافحت (زنا) قرار دیا تھا۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ سنی حضرات مناظروں اور حبشوں میں ان اعتراضات کا کیا جواب دیتے ہیں، ہمیں تو صرف اس قدر دیکھنا ہے کہ یہ تمام روایات اور ان کی شرحیں سنیوں کی اپنی کتابوں کے اندر موجود ہیں۔ اور کتابیں وہ ہیں جنہیں رسول اللہ کی غیر متکلو وحی کہا جاتا ہے۔ جنہیں قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل (مثلہ معہ) ٹھہرایا جاتا ہے۔ جن کی تعلیم سے ہمارے ”علمائے کرام“ کو سند فضیلت

نہ متعہ حج (حج اور عمرہ کے تمتع) کے بند کرنے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

۴ شیخ حضرات کے ممتاز مجتہد سید علی نقی صاحب نے اپنے رسالہ ”متعہ اور اسلام“ میں ان تمام روایات کو نقل کیا ہے اور سنیوں میں سے کسی نے ان سے انکار نہیں کیا۔

ملتی ہے۔ جن کے درس نمازوں کے بعد مسجدوں میں باعثِ سعادت کونین تصور کئے جاتے ہیں۔ جنہیں مسلمان اس لئے سینے سے لگاتے لگاتے پھرتے ہیں کہ ان کے ذریعے سنتِ رسول اللہ اور سنتِ صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ان کتابوں میں ہے۔

لیکن کھڑیے! ابھی تک معاملہ صرف روایات تک محدود تھا، قرآن سامنے نہیں آیا تھا۔ اب دیکھیے کہ اس سلسلہ میں کس طرح قرآن کو بھی ساتھ ہی لپیٹنے کی کوشش کی۔

امام طبری کی تفسیر اہل سنت و الجماعت کے ہاں ام القاسم کہلاتی ہے۔ یہ سب سے پہلی مدون تفسیر ہے۔ بعد کی تمام تفسیریں قریب قریب اسی کے تتبع میں لکھی گئیں۔ دیکھیے کہ حضرت امام طبری متعہ کی سند کس طرح لاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :-

ابو ثابت کا بیان ہے کہ ابن عباسؓ نے مجھے ایک مصحف دیا اور کہا کہ یہ ابی بن کعب کی قرأت کے مطابق ہے۔ یحییٰ بن عیسیٰ جو اس روایت کے ناقل ہیں، نصیر بن ابی الاشعث سے ان کا بیان ہے کہ اس مصحف کو نصیر کے پاس دیکھا۔ اس میں لکھا تھا کہ فما استمتعتم به منهن الی اجل مسملی (یعنی تم عورتوں سے متعہ کرو ایک ميعاد مقررہ کے لئے۔

ابونضرہ کی روایت ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے متعہ کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم سورہ نساء کی تلاوت نہیں کرتے ہیں نے کہا۔ کیوں نہیں؟ کہا پھر اس میں یہ آیت نہیں پڑھا کرتے کہ فما استمتعتم به منهن الی اجل مسملی۔ میں نے کہا۔ نہیں! میں اگر اس طرح پڑھتا ہوتا تو آپ سے دریافت کیوں کرتا۔ انہوں نے کہا۔ اچھا تو معلوم ہونا چاہیے کہ اصل آیت یوں ہی ہے۔ عبدالاعلیٰ کی روایت میں بھی ابونضرہ سے نقل ہے کہ میں نے ابن عباسؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی فما استمتعتم به منهن۔ ابن عباسؓ نے کہا۔ الی اجل مسملی۔ میں نے کہا کہ میں تو اس طرح نہیں پڑھتا۔ انہوں نے تین مرتبہ کہا خدا کی قسم خدا نے اسی طرح نازل کیا ہے۔

ابواسحق کی روایت ہے کہ ابن عباسؓ نے پڑھا۔ فما استمتعتم به منهن الی اجل مسملی۔ پانچویں روایت شعبہ کی ہے۔ اس میں بھی ابواسحق سے ایسی ہی روایت ہے۔ قتادہ

کا بیان ہے کہ ابی بن کعب کی قرأت میں یوں ہے۔ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ إِلَىٰ أَجَلٍ مَّسْهُومٍ۔ عمرہ بن مرہ کی روایت ہے کہ میں نے سعید بن جبیر کو پڑھتے سنا۔ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ إِلَىٰ أَجَلٍ مَّسْهُومٍ۔

یہ اقتباس کسی شیعہ بزرگ کی کتاب کا نہیں۔ بلکہ سنیوں کے جلیل القدر امام طبری کی تفسیر کا ہے۔ اور جن حضرات کی طرف سے روایات منسوب ہیں وہ بلند پایہ صحابی رضہ ہیں جو خدا کی قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے ہیں کہ یہ آیت اُس طرح نازل نہیں ہوئی تھی جس طرح قرآن میں درج ہے بلکہ اس اضافہ کے ساتھ نازل ہوئی تھی جس سے متعہ کا جواز ثابت ہوتا ہے بغور کیا آپ نے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے۔

تفسیر کاٹ بالا سے آپ دیکھئے کہ سنیوں کی نہایت معتبر کتب روایات اور مستند تفاسیر میں خدا، رسول، صحابہ رضہ، تابعین وغیرہ کی کس قسم کی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ ان روایات اور تفاسیر کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ۔

(i) جو آیات قرآن میں درج ہیں وہ اسی شکل میں نازل نہیں ہوئی تھیں بلکہ مختلف صحابہ رضہ کی قرأتوں کی رو سے ان کی تنزیلی شکلیں کچھ اور تھیں۔

(ii) خود رسول اللہ نے صحابہ رضہ کو مٹھی بھر جو یا آٹے کے عوض میں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اور یہ اجازت نبوت کے آخری دور تک جاری رہی۔

(iii) عہد رسالت اور عہد صحابہ رضہ کے اسلامی معاشرہ میں متعہ عام تھا اور اس میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ نہ مردوں کو نہ عورتوں کو۔

(iv) رسول اللہ نے اپنے آخری زمانہ میں متعہ کو حرام قرار دے دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود عہد حضرت ابوبکر رضہ اور حضرت عمر رضہ کے ابتدائی زمانہ تک متعہ برابر جاری رہا۔

(v) حضرت عمر رضہ نے متعہ کو بند کر دیا لیکن اس کے باوجود صحابہ رضہ، تابعین اور فقہائے مکہ اسے جائز سمجھتے رہے۔ (vi) اور جنہوں نے اسے طوعاً و کرہاً ناجائز سمجھا وہ بھی یہ کہتے رہے کہ عمر رضہ نے خدا کی ایک بہت بڑی رحمت کو روک دیا۔ چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنی تفسیر منظری (۵۷۲) میں لکھتے ہیں :-

محدث عبدالرزاق نے اپنی کتاب میں ابن جریر سے اور انہوں نے عطاء سے روایت کی ہے کہ ابن عباس رضہ کہا کرتے تھے کہ متعہ کو جائز ہونا خدا کی طرف سے اپنے بندوں پر رحمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر عمر رضہ نے

اس کی مانعت نہ کر دی ہوتی تو کبھی کسی کو زنا کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

کیا آپ کسی طرح بھی باور کرنے کو تیار ہیں کہ یہ احادیث واقعی رسول اللہ کی ہو سکتی ہیں۔ پھر سن رکھیے کہ یہ احادیث شیعہ حضرات کی احادیث کی کتابوں سے نہیں لی گئیں۔ یہ اہل سنت والجماعت کی حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں درج ہیں۔ اور ان کے انکار کرنے والے کو ”منکر حدیث“ قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جاتا ہے۔

(۱)

شاید آپ کہہ دیں کہ یہ عہد کس (اسلاف) کی باتیں ہیں۔ انہیں چھوڑیے۔ سنیوں کے ہاں اب تو متعہ کو حرام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ٹھہریے اور خود اپنے زمانے کے ایک مفسر کی بات سنئے جو اپنے آپ کو شیعہ نہیں کہتے۔ یعنی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ وہ اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اگست ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں لکھتے ہیں:-
فرض کیجیے کہ ایک جہاز سمندر میں ٹوٹ جاتا ہے اور ایک مرد اور ایک عورت کسی تختے پر بہتے ہوئے کسی ایسے سنسان جزیرے میں پہنچ جاتے ہیں جہاں کوئی آبادی موجود نہ ہو۔ وہ ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہیں اور شرعی شرائط کے مطابق ان کے درمیان نکاح بھی ممکن نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ باہم خودی ایجاب و قبول کر کے اس وقت تک کے لئے عارضی نکاح کر لیں جب تک وہ آبادی میں نہ پہنچ جائیں یا آبادی ان تک نہ پہنچ جائے۔ کم و بیش ایسی ہی اضطراری صورتیں اور بھی ہو سکتی ہیں۔ متعدد اسی طرح کی اضطراری حالت کے لئے ہے۔

یعنی یہ صاحب جنسی جذبہ میں ”اضطراری حالت“ کے تائل ہیں اور اس کا علاج متعہ بتاتے ہیں! یہ وہ بات ہے جو (معاذ اللہ۔ صد ہزار بار معاذ اللہ) خدا کو بھی نہیں سوجھی تھی کیونکہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اس نے جنسی خواہشات کے ضمن میں اضطراری حالت کا ذکر تک نہیں کیا۔ اس کے برعکس کہا یہ کہ وَلَيْسُ تَعْفِيفُ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا۔ (۲۴/۲)۔ ”جنہیں نکاح میسر نہ آ سکے وہ ضبط نفس سے کام لیں“

اکثر پوچھا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں (من حیث القوم) جنسی خواہش (SEXUAL URGE) کی اس قدر شدت کیوں ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جس قوم کو ”از روئے شریعت“ حسب ذیل قسم کے احکام بتائے جائیں، ان میں جنسی

۱۔ وہ کون سی شرعی شرائط ہیں جن کے مطابق وہاں نکاح ممکن نہیں ہے؟

۲۔ عارضی کیوں۔ مستقل کیوں نہیں؟

جذبات کی شدت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا۔ (مثلاً) :-

(۱) ایک وقت میں چار چار عورتوں سے شادی۔ اور وہ بھی اس چھوٹ کے ساتھ کہ جب جی چاہے ان میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ نئی بیوی لے آئیں۔ اس سے آپ ایک شخص کی عمر بھر میں بیویوں کی تعداد کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مشہور مغربی مفکر اور مؤرخ برٹا (BRIFFAULT) نے جنسیات کے متعلق ایک بڑی وسیع اور ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (THE MOTHER)۔ اس میں وہ ایک کُرْد کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے عمر بھر بیک وقت ایک ہی بیوی رکھی لیکن وہ چالیس کے قریب بیویاں بدل چکا تھا۔

(۲) بیویوں کے علاوہ لونڈیاں جن پر نہ تعداد کی پابندی ہے نہ ہی نکاح کی ضرورت، ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے سلاطین اور امراء کے محلات میں لونڈیوں کی کس قدر بھرمار ہوتی تھی۔

(۳) نابالغ لڑکیوں سے نکاح اور مباشرت کی شرعاً اجازت۔

(۴) نکاح کے علاوہ اضطرابی حالت میں متعہ کی اجازت۔ بلکہ استمناء بالید (MASTURBATION)

کی بھی۔ اور عزل کی بھی۔

(۵) یہ تو اس زندگی میں۔۔۔ مرنے کے بعد جنت میں کفار کی کس لڑکیوں کو نو خیز جوان لڑکیوں میں تبدیل کر کے "مومنین" کے سپرد کر دیا جائے گا۔ ان کی بیویاں محلات میں ساتھ رہیں گی اور یہ لڑکیاں (حوریں) سیرگاہوں میں داد عیش دیں گی۔

جس قوم کو یہ کچھ "شرعاً جائز" بتایا جائے وہ جنسی خواہشات پر کنٹرول کیسے رکھ سکتی ہے؟ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اسے بھی سن لیجیے۔ قرآن کریم نے جنسی بدنہادی یا بے راہ روی کا نتیجہ افسوسناک بتایا تھا جس کے معنی اضلال ہیں۔ اس اضلال کی تشریح ایک مغربی محقق کی زبانی سنئے جس نے عمر بھر جنسیات کے مسئلہ پر تحقیق عینی کے بعد

اس کے نتائج کو ایک ضخیم کتاب میں قلمبند کر دیا ہے۔ یہ محقق ہیں کیمرچ یونیورسٹی کے ڈاکٹر (J. D. UNWIN)۔ اور ان کی کتاب کا نام ہے۔

ڈاکٹر انون کی تحقیق

(SEX AND CULTURE)۔ اس میں وہ ان قوموں کے متعلق جنہوں نے جنسی جذبہ کی نسکین کے

زیادہ مواقع مہیا کر رکھے ہوں، لکھتا ہے۔

اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے رہنمائی حاصل نہیں کرتی۔

وہ واقعات کے اسباب و علل (CAUSES) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہوتا ہے اسے

اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں)۔ وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جو ان کی سمجھ میں نہ آئے کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس قوت کا منظر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیر العقول نظر آئیں۔ اور کبھی دیگر ایسی اشیا کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے۔ حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے (اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ان توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو نذر نیاز، گنڈہ تعویذ، اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ) اس قسم کے معتقدات، اس قوم میں نسلاً بعد نسل متواتر چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اور جب ان کی لاشوں کو تر خاک دبا دیا جاتا ہے تو نیا منیا ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے، بالکل حیوان ہوتے ہیں۔ (۳۴۶-۳۴۵)

اس کے برعکس وہ لکھتا ہے کہ

اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیق توانائیاں مدتِ مدید تک، بلکہ ابد الابد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدتِ مدید تک بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کم از کم محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رُخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہوں گی۔ وہ تمدن و تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسانی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطہ ادراک میں بھی نہیں آسکتا۔ (۴۳۲)

قرآن ایسا ہی معاشرہ تخلیق کرنا چاہتا تھا۔

عدت ہم طلاق سے متعلق موضوع میں دیکھ چکے ہیں کہ مطلقہ عورت ایک معین عرصہ تک کسی

دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتی۔ اس مدت انتظار کو عدت کہا جاتا ہے۔ یہ عدت صرف عورت کے لئے ہے مرد کے لئے نہیں۔ سورہ بقرہ میں جو کہا گیا ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲۲۸)۔ عورت کی جس قدر ذمہ داریاں ہیں اسی قدر اس کے حقوق ہیں۔ البتہ ایک بات میں مرد کو اس پر فوقیت حاصل ہے (درجہ۔ ایک درجہ ہیں)۔ اور وہ فوقیت یہ ہے کہ طلاق (یا بیوگی) کے بعد عورت ایک مدت تک دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتی اور مرد پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں۔ عدت سے مقصد یہ ہے کہ اس دوران میں یتعین ہو جائے گا کہ اگر عورت حمل سے ہے تو اس کا ہونے والا بچہ اس کے سابقہ شوہر کی اولاد ہے۔ اس کا تعین اس مولود کے لئے نہایت ضروری تھا اس لئے یہ حکم دیا گیا۔ جیسا کہ درج ذیل آیت سے ظاہر ہے، قرآن کریم نے خود اس حکمت کی وضاحت کر دی ہے۔

(۲) مطلقہ عورت کی عدت تین حیض ہے۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكُنَّ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ..... (آیت کا باقی حصہ پہلے گزر چکا ہے)

۲
۲۲۸

طلاق یافتہ عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو (کاح ثانی سے) اتنا عرصہ روکے رکھیں جتنے ہیں ان کے تین حیض پورے ہوں۔ [جنہیں کسی وجہ سے حیض نہ آتا ہو، ان کی عدت تین ماہ کی ہے (۶۵)۔ اور جس عورت کی طلاق مقاربت سے پہلے ہو جائے، اس کی کوئی عدت نہیں۔ (۳۳)۔] اگر وہ حاملہ ہوں تو انہیں اس امر کا اظہار کر دینا چاہیے۔ ان کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ اللہ نے جو کچھ ان کے رحم میں پیدا کر دیا ہے وہ اسے چھپائے رکھیں۔ خدا کے قانون (اللہ اور آخرت) کو مان لینے کے بعد اس قسم کی جزئیات تک کی

پابندی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ [حمل کی صورت میں ان کی عدت وضع حمل تک ہوگی۔ (۶۵)۔]

وہ جو کہا گیا ہے کہ "إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوا هُنَّ" (۶۵)۔ جب عورتوں کو طلاق دو تو اس طرح دو کہ ان کی عدت کا شمار ہو سکے، تو اس سے یہی مراد ہے۔ یعنی حیض کی رو سے شمار کر نیکی سہولت۔

(۳) جو عورتیں ایسی سن رسیدہ ہوں کہ وہ حیض آنے کی طرف سے ناامید ہو چکی ہوں، یا جنہیں کسی طبیعی

نقص کی وجہ سے حیض نہ آسکا ہو، ان کی عدت تین مہینے ہوگی۔ اور حاملہ عورتوں کی مدت وضع حمل تک۔

وَالَّذِي يَكُنَّ مِنَ الْمَحِيضِ مِنْ نِسَاءٍ كَمَنْ لَمْ يَحِيضْ فَأُولَٰئِكَ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ

ثَلَاثَةَ أَشْهُرٍ وَالَّتِي لَمْ يَحِضْ وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ. وَ
مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا. (۲۲۸)

[جیسا کہ (۲۲۸) میں بتایا جا چکا ہے، عدت کی مدت عام حالات میں تین حیض کا زمانہ ہے لیکن جن عورتوں کو حیض آنا بند ہو چکا ہو اور اس وجہ سے یہ دشواری لاحق ہو کہ ان کی عدت کا شمار کس طرح کیا جائے تو ان کے لئے تین حیض کے بجائے تین مہینے عدت کے شمار کرو۔ یہی عدت ان عورتوں کے صمن میں شمار کرو جنہیں کسی عارضہ کی وجہ سے حیض نہ آسکا ہو۔ اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے۔ (بعض طبائع کو شاید عدت کی یہ مدت لمبی معلوم ہو کیونکہ اس مدت میں انہیں مطلقہ بیوی کے اخراجات کا متحمل ہونا پڑے گا۔ لیکن اس میں ملول خاطر ہونے کی کوئی بات نہیں) جو شخص بھی قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرے گا، نظامِ خداوندی اس کے لئے آسانیاں پیدا کر دیگا۔ (متعلقہ عدالت کو ایسی شکلیں بھی سامنے رکھنی چاہئیں اور ان کا حل تجویز کرنا چاہیے)۔

(۴) جس عورت کو ہاتھ لگانے سے قبل طلاق دی گئی ہو اس کے لئے کوئی عدت نہیں۔ اس لئے کہ اس کی صورت میں ”حل“ معلوم کرنے کا سوال ہی نہیں ہوگا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُونَهَا فَمَتَّعُوهُنَّ وَسَرَّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا. (۲۲۹)

اے جماعتِ مومنین! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انہیں (قانون کے مطابق) طلاق دے دو قبل اس کے کہ تم نے انہیں چھوا ہو تو تمہارے لئے ضروری نہیں کہ تم ان کی عدت کا شمار کرو (جس میں ان کا نان نفقہ تمہارے ذمہ ہوتا ہے اور جس میں وہ دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتیں)۔ تم انہیں مناسب سامان دے کر نہایت خوشگوار انداز سے رخصت کر دو۔ (نکاح ایک معاہدہ ہے جب دیکھا جائے کہ وہ معاہدہ نبھ نہیں سکتا تو قاعدے اور قانون کے مطابق اسے فسخ کر دیا جائے۔ اس میں لمبی پیدا ہونے کی کون سی بات ہے۔ (۲۲۸-۲۲۹) (۲۲۹-۲۳۰)

(ضمناً) آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم جنسی تعلقات کو کس طرح ایمانیت کے انداز سے بیان کرتا ہے، وہ مباشرت کے لئے بھی ”قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ“ کے الفاظ لایا ہے۔ یعنی قبل اس کے کہ تم نے انہیں چھوا ہو۔

(۵) بیوہ عورتوں کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے۔

وَلَمَّا طَلَّقْتَ مَنَاعٍ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ كَذَلِكَ

يَبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ - (۲۲۲-۲۲۱)

مطلقہ عورتوں کو قاعدے قانون کے مطابق عدت کے دوران سامانِ زندگی مہیا کرو (۲۲۵-۲۲۴) یہ ان لوگوں پر واجب ہے جو قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔

اس طرح اللہ اپنے قوانین کو تمہارے لئے واضح طور پر بیان کر دیتا ہے تاکہ تم عقل و فکر سے کام لے کر انہیں سمجھ سکو۔

انہیں گھر سے نکالا نہیں جاتے گا۔ بجز اس کے کہ وہ کسی بے حیائی کی مرتکب ہوں۔ نہ وہ خود ہی وہاں سے نکلیں۔ سورۃ الطلاق میں ہے۔ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ (۶۵) ”تم انہیں ان کے گھروں سے نکالو نہ وہ خود ہی وہاں سے نکلیں۔ بجز اس کے کہ وہ کسی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہوں“ اس صورت میں مرد پر اس کی کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہے گی۔ ذرا آگے چل کر ہے۔ أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وَجْدِكُمْ وَلَا تُضَارَّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ (۶۶) ”تم اپنی حیثیت کے مطابق انہیں وہیں (یا ویسے ہی) رکھو جہاں (یا جیسے) تم خود رہتے ہو اور انہیں تنگ کرنے کے لئے کسی قسم کی اذیت مت دو“ اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی۔

لِيُنْفِقَ ذُو سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهِ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آثَرَ اللَّهُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آثَرَهَا سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا - (۶۷)

مطلقہ کا خرچ، یا دودھ پلانے کی اجرت کا معاملہ طے کرنے کے سلسلہ میں اس بات کو مدنظر رکھو کہ صاحبِ وسعت اپنی وسعت کے مطابق خرچ دے اور جس کا ہاتھ تنگ ہو تو جو کچھ اللہ نے اُسے دے رکھا ہے وہ اس کے مطابق دے۔ یاد رکھو! خدا کا قانون کسی پر اس کی حیثیت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اگر اس خالتو خرچ سے اس پر کچھ تنگی آجائے تو قانونِ خداوندی کی مدد سے اس کی تنگی کو آسانی سے بدلا جاسکتا ہے۔

اوپر کہا گیا ہے کہ مطلقہ عورت اپنے گھر میں رہے۔ کسی دوسری جگہ نہ چلی جاتے۔ لیکن قرآن کریم کے اس حکم سے کہ مرد اُسے تنگ نہ کرے (۶۵) یہ مستنبط کیا جاسکتا ہے کہ اگر مرد اُسے تنگ کرے تو وہ (عدالت کی اجازت یا اطلاع کے بعد) کسی اور جگہ سکونت اختیار کر سکتی ہے۔

(۷) بیوہ عورت کے لئے ایک سال تک کی رہائش اور خور و نوش کا انتظام ضروری ہے جس کے لئے چاہیے

کہ مرد وصیت کر جائے۔ اگر وہ خود کسی اور جگہ چلی جائے تو یہ ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا. وَصِيَّةً لِّأَنْوَاجِهِمْ
مَّتَّاعًا إِلَى الْكَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ. فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ
فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوفٍ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ. (۲/۲۳۵)

تم میں سے جو لوگ بیوہ عورتیں چھوڑ کر مر جائیں انہیں چاہیے کہ اپنی بیویوں کے متعلق وصیت کر جائیں کہ سال بھر تک انہیں گھر سے نہ نکالا جائے اور انہیں سامان زندگی دیا جائے۔ لیکن اگر وہ از خود چلی جائیں اور قاعدے اور قانون کے مطابق اپنے لئے کچھ اور فیصلہ کر لیں تو اس سے تم پر کوئی الزام نہیں آتا۔ یاد رکھو! اللہ کا قانون بڑی قوت والا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی حکمت پر مبنی ہے۔

(۸) عدت کے دوران عورت دوسری جگہ شادی تو نہیں کر سکتی لیکن نکاح کے لئے سلسلہ جنابی کی مانعت نہیں۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ
اَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَكِنْ لَا
تَوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا. وَلَا تَعْزِمُوا عَقْدَةَ
النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا
فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ. (۲/۲۳۵)

ان عورتوں کی عدت کے دوران میں اگر تم ان سے نکاح کی بابت کچھ اشارہ کنایہ کہہ دو یا اپنے دل میں اس کا ارادہ پوشیدہ رکھو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ خدا کو اس کا علم ہے کہ تمہیں ان سے نکاح کرنے کا خیال آئے گا۔ لیکن ان سے خفیہ خفیہ نکاح کا وعدہ مت لے لو۔ ہاں! (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) قاعدے قانون کے مطابق ان سے بات چیت کرو۔ لیکن عدت کے دوران نکاح کی گرہ کو پختہ مت کرو۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھو کہ (ظاہر اعمال تو ایک طرف) خدا تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہے۔ اور یہ بھی سمجھ لو کہ ان حدود و قیود سے خدا تم پر کوئی سختی نہیں کرنا چاہتا۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ تمہارا معاشرہ غلط روی کے نقصانات سے محفوظ رہے۔ خدا ایسا نہیں کہ وہ تمہاری غلط روی پر پونہی بھر سکے اور تمہیں سخت قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دے۔ یہ کچھ مستبد حکمران کیا کرتے ہیں۔ خدا ایسا نہیں کرتا۔

اگر وہ اپنے سابقہ شوہر کے ساتھ شادی کرنا چاہے (عدت کے دوران یا اس کے بعد) تو اس کے راستے میں

روڑے نہیں اٹکانے چاہئیں :-

وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ
أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضُوا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ذَلِكَ يُوعَظُ بِهِ
مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَمْ آزَكَا
لَكُمْ وَأَطْهَرُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (۲۳۲)

۲
۲۳۲

جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت کے قریب پہنچ جائیں، اور یہ سابقہ میاں بیوی پھر از دو اجی زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں اور آپس میں قانون کے مطابق نکاح کرنا چاہیں، تو اسے افراد معاشرہ! تم ان عورتوں کو اس سے مت روکو۔ یہ تلقین ہر اس شخص کو کی جاتی ہے جو اشد اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ ان قوانین کی اطاعت میں تمہاری ذات کی نشوونما کا سامان اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کا راز پوشیدہ ہے۔ یاد رکھو! یہ قوانین اس خدا کے عطا کردہ ہیں جو ان باتوں کو جانتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے (اس لئے تم ان کی اطاعت کرو۔ ان کے نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ یہ کس قدر حقیقت اور حکمت پر مبنی ہیں)۔

(۱)

رضاعت

قرآن کریم نے یہ حکم نہیں دیا کہ ماں اپنے بچے کو اتنی مدت تک ضرور دودھ پلائے۔ اس کا فیصلہ بچے کی حالت کے مطابق ماں باپ خود ہی کر سکتے ہیں۔ ویسے قرآن کریم نے عمومی طور پر کہا ہے کہ بچے کی ماں پہلے جنین کو اپنے بطن میں رکھتی ہے اور پھر اسے دودھ پلاتی ہے تو اس میں اس کے اڑھائی برس صرف ہو جاتے ہیں۔ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا۔ (۳۱) ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں اسے اپنے بطن میں رکھتی ہے پھر درِ دزہ کا کرب اٹھاتی ہے اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے تک تیس ماہ کی مدت لگ جاتی ہے۔ دوسری جگہ (قانونی مقاصد کے لئے) دودھ چھڑانے کا وقت دو سال بتایا ہے۔ وَفِصْلُهُ فِي عَامَيْنِ۔ (۳۲)۔

(۲) لیکن جب معاملہ قانونی حیثیت اختیار کرے تو بات متعین ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں قرآن کریم نے

کہا ہے کہ عورت کو :-

(۱) بچے کا باپ رضاعت کی اجرت دے۔ اس صورت میں رضاعت کی مدت دو سال ہوگی۔ لیکن اگر وہ باہمی رضامندی سے اس سے کم مدت میں دودھ چھڑانا چاہیں یا کوئی دوسرا انتظام مناسب خیال کریں تو ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُنَتِّمَ الرِّضَاعَةَ. وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ. لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ. وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ. فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا. وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تُنْتَرِضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا اتَّيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ. وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔ (۲/۲۳۳)

اگر طلاق کی صورت میں ماں کی آغوش میں دودھ پیتا بچہ ہو اور باپ چاہے کہ وہ اس بچے کو پوری مدت تک دودھ پلائے تو ماں کو چاہیے کہ وہ پورے دو سال تک بچے کو دودھ پلائے (۲/۲۳۳ و ۲/۲۳۴)۔ اس صورت میں قاعدے اور قانون کے مطابق اس عورت کی روٹی کپڑے کا انتظام اُس مرد کے ذمے ہوگا۔ یہ انتظام اس مرد کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس باب میں اصول یہ ہے کہ کسی شخص پر اس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ (فیصلہ کرنے والی عدالت کو چاہیے کہ اس چیز کو پیش نظر رکھے کہ) نہ تو اس بچے کی وجہ سے ماں کو ناحق تکلیف پہنچے اور نہ ہی اس کے باپ کو۔ اگر اس بچے کا باپ (اس اشارہ میں) فوت ہو جائے تو اس کی ذمہ داری اس کے وارث کے سر پر ہوگی۔

اگر دونوں باہمی رضامندی اور مشورہ سے (قبل از وقت) دودھ چھڑا کر (کوئی) اور انتظام کر لینا چاہیں (تو) اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر تم بچہ کے لئے کسی اور دودھ پلانے والی کا انتظام کرنا چاہو تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ جو کچھ تم نے بچے کی ماں سے طے کیا تھا وہ اسے پورا پورا دے دو۔

بہر حال تم ہمیشہ قانون خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھو کہ خدا کا قانون مکافات تمہارے ہر عمل اور نیت پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس لئے قانون کی محض رسمی پابندی کرو اور نہ ہی اس سے گریز کی راہیں تلاش کرو۔

دوسری جگہ ہے :-

وَإِنْ كُنَّ أُولَاتٍ حَمِلْنَ فَلْيَضْحَكُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاتُّوهُنَّ أَجُورَهُنَّ وَأَتَمِّرُوا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوفٍ وَإِنْ تَعَاَسَرْتُمُ فَسَتَرْضِعْ لَهُ أُخْرَى - (۶۵)

اور اگر وہ حمل سے ہیں تو وضع حمل تک تو تمہیں ان کا خرج بہر حال برداشت کرنا ہے اور اگر وضع حمل کے بعد وہ تمہاری خاطر بچے کو دودھ پلائیں (یعنی تم کوئی اور انتظام نہ کرو اور باہمی رضامندی سے یہ طے پا جائے کہ وہی بچے کو دودھ پلائیں۔ تو) انہیں ان کی دودھ پلائی کی اجرت دو۔ ان امور کی تفصیل کو باہمی مشورے سے قاعدے قانون کے مطابق طے کر لیا کرو اور اگر تم میں سے کسی پر یہ انتظام گراں گزرے تو تم کسی دوسری عورت کا انتظام کر لو جو بچے کو دودھ پلائے۔

حضانہ

ماں باپ کی علیحدگی کی صورت میں نابالغ بچے کس کی تحویل میں رہیں اس کی بابت قرآن مجید نے کوئی حکم نہیں دیا۔ اس کا فیصلہ عدالت مجازہ متعلقہ حالات کے پیش نظر کرے گی۔ اس باب میں اصول یہ پیش نظر ہونا چاہیے کہ لَا تَضَارُّ وَالِدَا الْيَتَامَى وَلَا مَوْلَاؤُا لَهُ يَتْلُوهُمَا وَعَلَى الْوَارِثَاتِ مِثْلُ ذَلِكَ۔ (۲۳۳)۔ ایسا انتظام ہونا چاہیے جس سے ماں یا باپ کو کسی قسم کی مشقت یا مضرت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان امور کے متعلق اسلامی حکومت خود قوانین وضع کرے گی۔

(۷)

زیر نظر باب میں عائلی زندگی سے متعلق قرآن کریم کے احکام اور ہدایات فی الجملہ آگئے ہیں۔ اور آیات (۲۳۳) آیات (۲۳۲) کی تفسیر بھی سامنے آگئی ہے۔ ان کے درمیان آیات (۲۳۸-۲۳۹) کی تشریح رہ گئی ہے اسے پیش کر کے اس موضوع کو ختم کیا جائے گا۔ آیات یہ ہیں :-

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى . وَتُؤْمُوا لِلَّهِ ثِنْتِينَ . فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا . فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ . (۲۳۸-۲۳۹)

۲
۲۳۸-۲۳۹

ان کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے :-

خبردار رہو سب نمازوں سے اور بیچ والی نماز سے اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے۔ پھر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ پڑھ لو یا سوار۔ پھر جس وقت تم امن پاؤ تو یاد کرو اللہ کو جس طرح کہ تم کو سکھایا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے۔
(ترجمہ مولانا محمود الحسن)

ان آیات میں مفسرین اور مترجمین نے صلوٰات سے مراد نمازیں لیا ہے۔ ان میں اختلاف ہے تو ”صلوٰۃ الوسطیٰ“ (درمیانی نماز) کے مفہوم میں بھی لیکن عام طور پر اس سے مراد عصر کی نماز لی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ پانچ نمازوں (فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء) کے درمیان پڑتی ہے۔

یہ آیات عائلی قوانین کے درمیان آئی ہیں جن کا سلسلہ آیت (۲۲۱) سے شروع ہوا ہے۔ ان سے پہلے بھی طلاق، مہر، عدت وغیرہ سے متعلق احکام ہیں اور ان کے بعد بھی۔ اس لئے ربط کے لحاظ سے یہاں نماز سے متعلق احکام کی حکمت سمجھ میں نہیں آتی۔ ہو سکتا ہے اس میں میری کوتاہی فہم کا قصور ہو (خوف کی حالت میں صلوٰۃ نماز کے متعلق احکام (۱۰۳-۱۰۱) میں آئے ہیں۔ ان کی تفسیر متعلقہ مقام پر کی جائے گی)۔

صلوٰۃ کے متعلق تفصیلی بحث جلد اول صفحات ۱۲۰-۱۷۷ زیر آیت (۲) میں کی جا چکی ہے۔ وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ صلوٰۃ کے بنیادی معنی قوانین خداوندی سے وابستگی اور ان کی رُو سے عائد کردہ فرائض منصبی کے ہیں۔ ان معانی کی رُو سے ہم سمجھتے ہیں کہ ان آیات میں صلوٰۃ سے مراد وہ فرائض ہیں جو سیاق و سباق کی آیات میں عائلی زندگی کے ضمن میں عائد کئے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے میں نے ان آیات کا حسب ذیل مفہوم لیا ہے۔

یہ ہیں (عائلی زندگی کے سلسلے میں) تمہارے فرائض منصبی جن کی محافظت ضروری ہے۔ لیکن تمہارا مرکزی فریضہ جس کی محافظت اشد ضروری ہے یہ ہے کہ تم زندگی کے ہر گوشے میں ہمیشہ قوانین خداوندی کی اطاعت میں کمر بستہ کھڑے رہو۔ خوف کی حالت میں پیادہ چل رہے ہو یا سواری پر اور حالت امن میں اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے (۱۰۳-۱۰۱)۔ ہر حال میں قوانین خداوندی کو اس طرح سامنے رکھو جس طرح اس نے تمہیں بتایا ہے۔ تم اس سے پہلے ان امور سے واقف نہیں تھے۔

(۰)

تجدیدِ یادداشت کے لئے اسے دہرا دینا غیر محل نہ ہو گا کہ سابقہ (چھٹا) باب (آیات ۲ تا ۲۱۸) میں قتال (جنگ) کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ اسی ضمن میں

فلسفہ موت و حیات

قرآن کریم نے بتایا کہ جہاد زندگی میں کامیابی کے لئے دو بنیادی شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان نازک سے نازک مواقع پر بھی اپنے ہوش و حواس نہ کھوئے اور اپنی اسکیموں کو اتفاقات (CHANCES) پر نہ چھوڑے بلکہ حسن تدبیر سے انہیں کامیاب بنانے کی کوشش کرے اور دوسرے یہ کہ باہر کی دنیا میں جدوجہد کرنے والوں کی گھر کی زندگی بڑی پرسکون اور اطمینان بخش ہونی چاہیے۔ اس کے متعلق ضروری ہدایات سابقہ صفحات میں (آیات ۲۱۹ تا ۲۲۷) سامنے لائی گئیں۔ ان اہم متعلقہ مباحث کے بعد قتال (جنگ) سے متعلق سلسلہ کلام کو پھر جاری کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں بنی اسرائیل کی داستان کے دو مزید اوراق سامنے لائے گئے ہیں۔

مطالب الفرقان، جلد دوم، صفحات ۳۸۶-۳۸۵ پر مذکور آیات (۲۲۷-۲۲۹) کو ایک بار پھر سامنے لائیے۔ ان میں یہ کہا گیا ہے کہ یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ جنت کا گھر ان کے لئے ریزرو (مخصوص) ہے۔ ان سے کہا گیا کہ جب واقعہ یہ ہے (جیسا تم کہتے ہو) تو تم دنیا میں اس قدر ذلت و خواری کی زندگی کیوں بسر کر رہے ہو۔ تم اس دنیا کو خیر باد کہو اور مر جاؤ۔ مرنے کے بعد جنت کی خوشگوار یوں کے مزے لوٹو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ تم دیکھو گے کہ یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ انہیں معلوم ہے کہ ان کے کر توت کیا ہیں۔ اس لئے موت کے نام سے ان کی جان جاتی ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم ایک واقعہ بیان کرتا ہے جس میں اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ جو لوگ موت سے ڈرتے ہیں موت انہیں جا دیوچتی ہے۔ لیکن جو اس کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں موت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ قرآن کریم نے اس کی وضاحت تو نہیں کی کہ یہ واقعہ کس قوم یا جماعت سے متعلق ہے لیکن قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق بھی بنی اسرائیل ہی سے ہے۔ ارشاد ہے:-

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ . (۲۲۷-۲۲۹)

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ جو قوتیں تمہارے نظام کی راہ میں حائل ہوں گی تمہیں ان کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ (۲۱۸-۲۱۹)۔ لیکن خارجی قوتوں کا مقابلہ وہی قوم کر سکتی ہے جس کا داخلی نظام پرسکون اور اطمینان بخش ہو۔ اس کے لئے تمہیں عائلی زندگی کے متعلق قوانین دیئے گئے (۲۲۲-۲۲۱)۔ اب تم پھر اصل موضوع کی طرف آؤ۔ یعنی اس موضوع کی طرف کہ تمہاری اجتماعی زندگی میں استحکام کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے تم قوم بنی اسرائیل کے ایک اور واقعہ پر غور کرو۔ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے لیکن جب دشمن کا سامنا ہوا تو وہ اپنا گھر بار

سب کچھ چھوڑ بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اس قدر بزدلی کا ثبوت کیوں دیا؟ محض اس لئے کہ وہ موت سے ڈرتے تھے۔ لیکن وہ زندگی کے اس اصول کو بھول گئے کہ زندہ وہی رہتا ہے جو موت سے نہیں ڈرتا۔ (۲/۲۴۳)۔ جو موت سے بھاگتا ہے اسے موت آگے بڑھ کر دبوچ لیتی ہے۔ جب انہوں نے اس راہ کو پالیا تو انہیں حیاتِ فو عطا کر دی گئی۔ وہ دشمنوں کے مقابلہ پر ڈٹ گئے اور آخر الامر فتح مند ہوئے۔

یہی وہ قانونِ حیات ہے جس سے اقوامِ عالم کو افضلیت و فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس قانون کی قدر دانی نہیں کرتے۔

خطرات کا مقابلہ انسان کے اندر وہ فولادیت پیدا کرتا ہے جس سے اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ لَا يَحْزَنُهُمُ الْفَرَاحُ الْأَكْبَرُ۔ (۲/۲۴۳) کائنات کا عظیم ترین حادثہ بھی انہیں مغموم و محزون نہیں کر سکتا۔ بقول اقبالؒ

زندگانی ہے صدف، قطرہ نیساں ہے خودی وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کرنے کے
ہو اگر خود نگر و خود گز و خود گیر خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ کے

اور اس قسم کی فولادیت پیدا کرنے کا طریق یہ ہے کہ

میار ایزم بر ساحل کہ آں حب نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و باموجش در آویز حیات جاوداں اندر ستیز است

قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ حقیقی زندگی خطرات کا مقابلہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ”پل صراط“ پر سے گزرے بغیر انسان جنت میں داخل نہیں ہو سکتا!

مذکورہ صدر آیات میں کہا گیا ہے: إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ (۲/۲۴۳)۔ انسانوں کے ساتھ خدا کا برتاؤ فضل و عنایات کا ہے۔ اس سے نگاہ کا رخ ایک اور سمت کو مڑ جاتا ہے۔ خدا نے انسان کو جان عطیہ (وہی طور پر) دی ہے اور یہ بات بذل و سخا اور جود و عطا کے خلاف ہے کہ جو چیز کسی کو عطیہ دے دی جائے اسے اس سے واپس لے لیا جائے۔ اس لئے خدا انسان سے جان واپس نہیں لیتا۔ وہ تو چاہتا ہے کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ اس کے پاس رہے۔ لیکن یہ ”ناشکرا“ اس عطیہ عظمیٰ کی قدر نہیں کرتا اور اسے مفت میں ضائع کر دیتا ہے۔ اس حقیقت کو اقبالؒ نے بڑے دلآویز انداز میں بیان کیا ہے جب کہا کہ

جانے کہ دادند دیگر نگیرند
آدم بمبرد از بے یقینی

اگلی دو آیات میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ یہ حیاتِ جاوداں کیسے حاصل ہوتی ہے۔ اس قوم سے جو موت کے ڈر سے بھاگ کھڑی ہوئی تھی کہا کہ بھاگو نہیں۔ جم کر کھڑے ہو جاؤ۔ اور

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۲: ۲۴۴)

ہم نے ان سے کہا تھا کہ تم موت سے ڈر کر بھاگنے کے بجائے حق و انصاف کی راہِ خداوندی میں دشمنوں کا جم کر مقابلہ کرو۔ ان سے ڈٹ کر لڑو۔ یاد رکھو! تمہاری کوئی قربانی ضائع نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ اللہ ہر ایک بات کو سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

(۱)

قرآن کریم نے نظامِ اسلامی کے قیام اور استحکام کے سلسلہ میں کہا ہے کہ إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۹/۱۱۱) اللہ مومنین سے ان کا مال اور ان کی جان خرید لیتا ہے اور ان کے عوض انہیں جنت عطا کر دیتا ہے۔ قتال فی سبیل اللہ میں تو جان حاضر کر دی جاتی ہے۔ لیکن اس قتال (اور ہر قسم کے جہاد فی سبیل اللہ) کے لئے مال کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے آیت (۲: ۲۴۴) کے تسلسل میں کہا۔

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضِعَّهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْصِطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔ (۲: ۲۴۵)

تمہاری اجتماعی قوت کے لئے مال کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے نہایت حسن کارانہ انداز سے ”قرض“ دو۔ اسے ”قرض“ اس لئے کہا جاتا ہے کہ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ یہ دولت تمہارے ہاتھ سے نکل کر کسی اور کے پاس چلی جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ روپیہ کسی اور کے پاس نہیں جاتا یہ چند در چند (کئی گنا ہو کر) تمہارے پاس واپس آ رہا ہوتا ہے۔

یاد رکھو! دولت کا بڑھنا اور گھٹنا خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ تم اپنے لئے جس قسم کے قوانین جی چاہے بنا لو، آخر الامر نتیجہ خدا کے قوانین کے مطابق ہی مرتب ہوگا۔ تم اس سے ہٹ کر کہیں اور جا نہیں سکتے۔ تمہارا ہر قدم اسی کی طرف اٹھ رہا ہے۔

اور وہ قانون یہ ہے کہ دولت جس قدر نظامِ حق و انصاف کے قیام اور عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کی جائے وہ اسی قدر بڑھتی ہے۔

قرآن کریم نے جماعتِ مومنین کی طرف سے ایثارِ مال کو ہر جگہ قرض کہہ کر پکارا ہے۔ بلکہ قرضِ حسنہ کہہ کر۔ اس

اصطلاح میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ نظام خداوندی اپنے ابتدائی مراحل میں جب وہ ہنوز زیر تشکیل ہوتا ہے۔ افراد جماعت سے ہر قسم کی قربانی کا متقاضی ہوتا ہے۔ وہ ہنوز اس قابل نہیں ہوتا کہ انہیں اس کے بدلے میں کچھ دے سکے۔ لیکن جب وہ نظام قائم ہو جاتا ہے تو وہ انہیں ایک ایک کے بدلے میں سود دیتا ہے۔ اس لئے اس نے ان کے اس مالی اشارے (عطیات) کو قرض کہہ کر پکارا ہے جو دگنا چوگنا واپس دے دیا جاتا ہے۔

نظام سرمایہ داری میں قرض اور ربو کی بحث ذرا آگے چل کر آئے گی۔ اس مقام پر صرف ایک نکتہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ربو کے ضمن میں کہا گیا ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً** (پہلی)۔ اس کا عام طور پر ترجمہ ”دگنا چوگنا“ کیا جاتا ہے اور اسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ لیکن جو قرض خدا واپس کرتا ہے اس میں ”فِيضِعْفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً“ کو خدا کی طرف سے فضل و رحمت کہہ کر پکارا گیا ہے۔ بات واضح ہے۔ سودی کاروبار میں مقرض جو کچھ اصل زر سے زائد دیتا ہے، باس مجبوری، دل پر پتھر رکھ کر دیتا ہے۔ لیکن نظام خداوندی، افراد قوم کو جو کچھ دیتا ہے بطیب خاطر دیتا ہے۔ جبر و اکراہ سے نہیں دیتا۔ اس لئے افراد کی طرف سے جو کچھ دیا جاتا ہے وہ قرض حسنہ بن جاتا ہے۔

اس آیت میں قبض اور بسط کے الفاظ بھی ایک دوسرے کے مقابلہ میں آئے ہیں۔ قبض کے معنی ہوتے ہیں کسی کو اپنی گرفت میں لے کر ہاتھ سکیڑ یا کھینچ لینا۔ اور بسط کے معنی ہوتے ہیں دست کرم کو دراز کرنا، وسیع کرنا، کشادہ کرنا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرض کے معاملہ میں بظاہر ایسا نظر آئے گا کہ خدا (یا نظام خداوندی) نے جو کچھ لیا ہے وہ اس کے قبضہ میں چلا گیا ہے، اس نے اسے اپنی گرفت میں لے کر مٹھی میٹ لی ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ اس نے اسے دگنا چوگنا کر کے واپس دینے کے لئے لیا ہے۔ خدا کے قابض اور باسط ہونے کے یہی معنی ہیں۔ چونکہ اللہ کو دیئے ہوئے قرض کی واپسی کے متعلق آگے چل کر تفصیلی آیات ہمارے سامنے آئیں گی اس لئے اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ البتہ یہاں خود لفظ ”قرض“ کے متعلق تھوڑی سی تشریح ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس تشریح سے اللہ کو دیئے ہوئے ”قرض“ کا مفہوم نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔

قرض کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کاٹنا۔ چبانا۔ آپ نے جب کالی کرنے والے مولیشیوں (گائے میل وغیرہ) کو دکھا ہوگا۔ وہ چلتے چلاتے ادھر ادھر منہ مارتے ہیں اور جو کچھ میسر آئے اُسے اسی طرح نکلے جاتے ہیں۔ پھر جب انہیں فرصت ملتی ہے تو وہ آرام سے بیٹھ کر اس نکلے ہوئے چارہ کو منہ میں لوٹاتے ہیں اور آہستہ آہستہ چبا کر اسے معدہ میں واپس بھیج دیتے ہیں۔ اس طرح وہ چارہ ہضم

لفظ قرض کا مفہوم

ہو کر جزو بدن بننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جگالی کے اس عمل کو عرب القرینہ کہتے تھے۔ اس سے قرصِ حسنہ کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔ یعنی تمہارا مال اگر تمہارے پاس رہے تو وہ ایسا چارہ ہوتا ہے جو مہضم ہو کر جزو بدن بننے کے قابل نہیں ہوتا لیکن جب تم اسے نظامِ خداوندی کو دیدیتے ہو تو وہ تمہیں اس شکل میں واپس کرتا ہے جس سے وہ جزو بدن بن کر مدحِ حیات ہو جائے۔ نظامِ خداوندی جو کچھ افراد معاشرہ سے لیتا ہے وہ اسے انہیں حیاتِ تازہ عطاء کرنے کے لئے صرف کرتا ہے۔ یہ ہے قرآن کے معاشی نظام کی لم اور غایت۔ یعنی جان و مال کے عوض جنت۔ !

(۰)

قال کی رو سے حیاتِ نو عطاء ہونے کے قانونِ خداوندی کے بعد ایک اور واقعہ کی طرف آئیے جس میں بنی اسرائیل کا نام لیا گیا ہے۔ فرمایا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَا مِنْ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوسٰى اِذْ قَالُوْا لِنَبِيِّ
لَّهْمُ اَبْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ
اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا. قَالُوْا وَمَا لَنَا اَلَّا نُقَاتِلَ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَابْنَاءِنَا. فَلَمَّا
كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِنْهُمْ. وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ
بِالظَّٰلِمِيْنَ۔ (۲/۲۴۶)

اس ضمن میں وہ واقعہ بھی غور طلب ہے جو موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سردارانِ قوم کو پیش آیا۔ انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے کوئی کمانڈر مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اس کے زیرِ کمان اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اس وقت تو تم جنگ کے لئے اس قدر شوق اور آمادگی کا اظہار کر رہے ہو لیکن (تمہاری جو نفسیاتی کیفیت ہو چکی ہے اس سے) کچھ بعید نہیں کہ جب تمہیں جنگ کا حکم دیا جائے تو تم اس سے گریز کرو۔ انہوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کی راہ میں جنگ نہ کریں، درآئیں گے ہم اپنے گھر وں سے نکال باہر کئے اور اپنے بچوں تک سے علیحدہ کر دیئے گئے ہیں۔

لیکن ہوا وہی جو ان کے نبی نے کہا تھا۔ جب انہیں جنگ کا حکم دیا گیا تو ان میں سے بجز معدودے چند، سب گریز کی راہیں نکالنے لگے۔ لیکن یہ کوئی غیر متوقع بات نہ تھی۔ جو لوگ قانونِ شکنی اور نافرمانی

کے عادی ہو چکے ہوں ان میں نظم و ضبط کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور صلاحیت کہاں رہ سکتی ہے؟ اللہ ان کی اس نفیاتی کیفیت سے واقف تھا، اور اسی لئے ان کے نبی نے ان سے کہا تھا کہ جب جنگ سامنے آئے گی تو تم بھاگ کھڑے ہو گے۔

تورات کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد (حضرت) یوشع بن نون آپ کے جانشین ہوئے۔ قرآن کریم میں حضرت الیسع کا نام زمرۃ انبیاء میں آیا ہے (۲/۲۸۹) یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے (حضرت) یوشع بن نون مراد ہیں یا توراۃ کے یسعیاہ نبی۔ ان کے زمانے میں فلسطین کا کچھ علاقہ بنی اسرائیل کے زیر نگیں آگیا لیکن ازاں بعد منسلق م کے قریب حضرت داؤد اور (حضرت) طالوت کی زیر سرکردگی سارے کے سارے فلسطین پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ زیر نظر واقعہ کا تعلق اسی زمانہ سے ہے۔ اس آیت کے آخری حصہ میں قَوْلُوا (وہ میلن جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے) سے ان کی اسی دوں بہتی اور پست حوصلگی کی وضاحت کی گئی ہے جس کی طرف آیت (۲/۲۴۶) میں اشارہ کیا گیا تھا۔ بر مانی قوم نے اپنے نبی سے کمانڈر مقرر کرنے کے لئے کہا جس مقصد کے لئے قرآن کریم نے اس واقعہ کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے وہ اگلی آیت میں سامنے آتا ہے۔ فرمایا:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ - (۲/۲۴۶)

بہر حال جب انہوں نے کمانڈر مقرر کرنے کی درخواست کی تو ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے طالوت کو کمانڈر مقرر کر دیا ہے۔ انہوں نے چپٹے ہی اس پر اعتراض کر دیا کہ وہ ہم پر کیسے کمان کر سکتا ہے؟ اُس کے مقابلہ میں اس منصب اور اقتدار کے ہم زیادہ حقدار ہیں۔ وہ غریب آدمی ہے۔ اس کے پاس مال و دولت کہاں ہے؟ ان کے نبی نے ان سے کہا جنگ کی کمان کے لئے مال و دولت معیار نہیں ہوا کرتا۔ اس کا معیار یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کا علم کس قدر ہے اور جسمانی توانائی کا کیا حال ہے۔ طالوت کو یہ کچھ فراوانی سے میسر ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنی ان صلاحیتوں اور قوتوں کو اپنے ذاتی فائدے کے لئے ہی صرف نہیں کرتا دوسرے لوگ بھی ان سے نفع اندوز ہوتے ہیں۔ اللہ کا یہی قانون ہے جس کے مطابق

کسی کو منصب و اقتدار کے لئے منتخب کیا جاتا ہے اور اس کا یہ قانون کشادہ نگہی اور علم و حقیقت پر مبنی ہے وہ تمہارے خود ساختہ معیاروں کا پابند نہیں۔

کمانڈر کا انتخاب غور کیجئے۔ بنی اسرائیل ہدایات خداوندی کو فراموش کر کے اس مقام تک پہنچ گئے تھے جہاں مال و دولت ہی معیارِ عز و جاہ رہ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے نزدیک ایک فوج کے کمانڈر کا تقرر بھی اسی معیار کے مطابق ہونا چاہیے تھا۔ یعنی اسے کسی دولت مند گھرانے کا فرد اور کسی امیر کبیر باپ کا بیٹا ہونا چاہیے تھا۔ قرآن کریم نے ان کی اس غلط نگہی کی تردید کی اور کہا کہ معیارِ انتخاب اہلیت ہونی چاہیے نہ کہ دولت۔ فوج کے کمانڈر کے لئے ضروری ہے کہ اُسے عسکری نظام کا پورا پورا علم حاصل ہو اور اس کے ساتھ جسمانی قوت بھی۔ (حضرت) طاہوت کا انتخاب اسی معیار کے مطابق رو بعل لایا گیا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم ایک تاریخی واقعہ کے ضمن میں بھی کس قدر محکم اصولِ حیات سامنے لے آتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ وہ تاریخی واقعات بیان ہی اس مقصد کے لئے کرتا ہے۔

اس مقام پر ذرا اُڑکیے اور اس سے بھی زیادہ اہم نکتہ پر غور کیجئے۔ آیت کے آخری حصہ میں کہا گیا ہے: **وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَّشَاءُ**۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے: "اللہ جسے چاہتا ہے اپنی حکومت عطا کر دیتا ہے" **مَن يَّشَاءُ** "کا ترجمہ" جسے چاہتا ہے " اسی مقام پر نہیں کیا جاتا۔ قرآن کریم کی تمام آیات میں ان (اور ان جیسے دیگر) الفاظ کا ایسا ہی ترجمہ کیا جاتا ہے اور پھر اسے عقیدہ جبر کے لئے بطور سند پیش کر دیا جاتا ہے۔ یعنی کہا یہ جاتا ہے کہ ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔ انسان اس باب میں مجبور واقعہ ہوتا ہے۔ اس کے چاہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسے مسئلہ تقدیر کہا جاتا ہے۔ جس کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ (بالخصوص صفحات ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸

رو سے نہیں عطا ہوتا۔ وہ خدا کے قانونِ مشیت کی رو سے عطا ہوتا ہے اور خدا کا قانونِ مشیت یہ ہے کہ منصب و اقتدار اس کو ملتا ہے جو اس کے لئے ضروری صلاحیت اور اہلیت رکھتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس سے ”مَنْ يَشَاءُ“ کا مفہوم کیسے واضح ہو گیا۔

مناصبِ اقتدار کے لئے علم اور قوت دونوں کو معیار قرار دے کر قرآنِ کریم نے ایک عظیم حقیقت بیان کر دی ہے۔ نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش نتائج اسی صورت میں مرتب ہو سکتے ہیں جب

قوت اور علم

علم کے ساتھ قوت اور قوت کے ساتھ علم وابستہ ہو۔ اقبال کے الفاظ میں یہ

اہلِ حق را زندگی از قوت است قوت ہر ملت از جمعیت است

رائے بے قوت ہمہ مکروفسوں قوت بے رائے جہل است وجنوں

آپ نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانی ضوابطِ قانون (الکتاب) کے ساتھ الحدید (شمیرِ خارہ شکاف) بھی نازل فرمائی ہے (۵۶)۔ زندگی ان دونوں کے امتزاج سے باقی رہ سکتی ہے اور آگے بڑھ سکتی ہے۔ اس کے بعد کہا کہ ذرا آگے جلو کے تو متہیں نظر آجائے گا کہ طاوت کے انتخاب میں کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔ اس کے ہاتھوں جو کارنامے سرزد ہوں گے وہ اس انتخاب کے معیار کی صداقت کی دلیل بن جائیں گے۔ فرمایا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّكُمْ إِن كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ - (۲۸)

اُن کے نبی نے ان سے یہ بھی کہا کہ خدا نے جو اقتدار و اختیار طاوت کو سونپا ہے اس کا (پہلا) نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں تمہارے موجودہ قلوب کی جگہ (جو خوف و اضطراب کے نشین ہیں) ایسا قلب عطا ہوگا جو سکون و اطمینان سے بریز ہوگا۔ نیز وہ تمہیں ان تمام بہترین اور باقی رہنے والی خصوصیات اور تعلیمات کا وارث بنا دے گا۔ جو موسیٰ اور ہارون کے متبعین نے چھوڑی ہیں اور جن کی حفاظت خدا کی کائناتی قوتیں کرتی چلی آرہی ہیں۔ اگر تم خدا کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہو تو تمہارے لئے یہ بات اس امر کا پختہ نشان بن جائیگی کہ طاوت کا انتخاب فی الواقعہ صحیح تھا۔

”تابوت سکینت“ کے متعلق تورات (کتاب خروج اور سموئیل) میں لکھا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا لکڑی کا

صندوق تھا جسے سونے سے مڑھا گیا تھا۔ اس میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے تبرکات تھے جب فلسطینیوں نے بنی اسرائیل کو شکست دی تو وہ اس مقدس صندوق کو لوٹ کر لے گئے۔ لیکن اس کی وجہ سے ان پر طرح طرح کے عذاب نازل ہوتے تو انہوں نے اسے ایک گاڑی پر رکھا۔ گاڑی کے آگے دو گائےں جو تیں اور انہیں بنی اسرائیل کے علاقہ کی طرف ہانک دیا۔ اس طرح یہ تابوت (صندوق) انہیں واپس مل گیا۔ ہمارے اکثر مفسرین نے بھی تورات کی اس تفصیل کو اپنے ہاں درج کر دیا ہے۔ لیکن قرآن کریم پر غور کرنے سے بات کچھ اور سمجھ میں آتی ہے۔ یہاں ذکر ان خصوصیات کا ہو رہا ہے جن کی بنا پر طاوت کا انتخاب عمل میں لایا گیا تھا۔ اس کی پہلی دو خصوصیات کا تعلق دماغ (فکر) اور جسمانی صحت اور توانائی سے تھا۔ اس کے بعد کہا کہ اتنا ہی نہیں کہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر اس کا اہل ہے، وہ اس قلب سلیم کا بھی حامل ہے جو پیر وان حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کی ابدیت درکنار (صحیح آسمانی) تعلیم کا خزانہ اور سکون و اطمینان کا پیکر ہے۔ عربی لغت کی رُو سے تابوت کے معنی قلب اور سینے کے بھی ہیں۔

جہاں تک ملائکہ کا تعلق ہے، قرآن کریم میں میدان جنگ میں مجاہدین (صحابہ کبارؓ) کی مدد کے لئے ملائکہ کے نزول کا ذکر آیا ہے۔ ان کی طرف سے اس تائید و امداد سے مقصود یہ تھا۔ لَتَطْمَئِنُّ بِہِ قُلُوبُکُمْ۔ (۱۱۰) اور قُلُوبُکُمُ اللَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ (۱۱۱) تاکہ مجاہدین کو اطمینان قلب اور ثبات قدم نصیب ہو۔ اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (۱۱۲) اللہ وہ ہے جس نے مومنین کے دلوں کو سکینت (سکون) عطا فرمایا۔ (ملائکہ کے متعلق تفصیلی ذکر جلد دوم۔ باب اول میں آچکا ہے)۔

بہر حال حضرت طاوت کے انتخاب کے خلاف اعتراض کرنے والوں کو بتایا گیا کہ انہیں کس قدر صحت اور توانائی، فکری اور علمی صلاحیت اور قلبی پاکیزگی کا بہرہ وافر عطا ہوا ہے۔ اور وہ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ اور ان کے متبعین کی صحیح تعلیم کے بھی حامل ہیں۔ تم آگے بڑھو گے تو قدم قدم پر ان کی ان خصوصیات کے مظاہر دیکھو گے۔ نگاہ بلند سخن دلنواز چاں پُر سوز یہی ہے رختِ سفر میر کا رواں کے لئے

اس کے بعد یہ لشکرِ جاتوت (دشمن) کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن کریم نے پہلے کہا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ۔ (۱۱۳) تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔ اور اس کے بعد کہا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ (۱۱۴) تم پر جنگ کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ صیام اور قتال میں کیا تعلق ہے اور قتال میں کامیابی کے لئے صیام کا راز

عائد کردہ پابندیوں کی مشق کس قدر ضروری ہے، اس کا عملی ثبوت زیر نظر واقعہ کی اگلی کڑی سے لگ سکے گا جس میں کہا کہ :-

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اعْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرَبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ . (۲۴۹)

۲
۲۴۹

بہر حال طالوت کمانڈر مقرر ہو گیا۔ جب وہ لشکر کے ساتھ دشمن کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا تو اس نے یہ دیکھنے کے لئے کہ ان میں کس قدر ڈسپلن پیدا ہو چکا ہے، ان سے کہا کہ دیکھو! راستے میں ایک ندی آئے گی۔ اس سے پانی نہ پینا۔ جو اس سے پانی پئے گا وہ سمجھ لے کر وہ ہمارے لشکر میں رہنے کے قابل نہیں۔ جو اس سے پانی نہ پئے گا بجز اس کے کہ یونہی حلق تر کرنے کے لئے چلو بھر پانی پی لے تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ وہ ہمارا ساتھی ہوگا۔ (لیکن کمانڈر کے اس حکم کے علی الرغم) انہوں نے بجز معدودے چند اس ندی سے پانی پی لیا۔

آپ نے دیکھا کہ جنھوں نے صیام کی پابندیوں سے ضبطِ خویش کی مشق نہیں کی تھی وہ کس طرح راہِ کارزار میں پہلے ہی مرحلہ پر فیل ہو گئے۔ اب آگے بڑھیے :-

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ . (۲۵۰)

(اس کے بعد انہوں نے یقین دلایا کہ وہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے) چنانچہ جب طالوت انہیں اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان پر پکے رہے تھے ساتھ لے کر پار ہوا تو ان بزدلوں نے جنھوں نے پیدے معافی مانگی تھی، کہہ دیا کہ ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کی ہمت نہیں۔

بات صاف ہے۔ جن سپاہیوں میں کچھ وقت کے لئے پیاس پر غلبہ پانے کی بھی سکت نہیں تھی ان میں دشمن کا مقابلہ کرنے کی ہمت کہاں سے آجاتی؟ اس کا حقیقی سبب آیت کے اگلے حصہ میں آتا ہے جہاں کہا :-
قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا اللَّهَ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ . (۲۵۱)

اس پر ان لوگوں نے جنھیں خدا کے سامنے جانے کا خیال، فلذا، اس کے قانونِ مکافات عمل پر پورا پورا

یقین تھا۔ ان سے کہا کہ دشمن کی تعداد کی کثرت سے مت گھبراؤ۔ خدا کے قانون میں یہ بھی ہے کہ تعداد کی کمی سیرت و کردار کی قوت سے پوری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق (تاریخ میں) کئی واقعات ایسے سامنے آتے ہیں جن میں کم تعداد کے لوگ گمراہ کثیر پر غالب آ گئے تھے۔ اصل چیز استقلال و استقامت ہے۔ جو حق پر ثابت قدم ہے، خدا کے قانون کی تائید اس کے شامل حال رہتی ہے۔

دیکھیے۔ یہاں ان دو گروہوں کے بنیادی فرقوں کو کس وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ ایک گروہ وہ تھا جسے حیاتِ آخرت پر ایمان تھا۔ اس لئے وہ موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو اس دنیا کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ موت سے خوف کھاتا تھا۔ (آیت ۲۴۷) میں اسی فرق کو سامنے لا کر اس داستان کی مہمید بیان کی گئی تھی۔

کثرت و قلت

اس آیت میں قرآن کریم نے فتح و ظفر کے ایک اور عظیم راز کا افشاء کیا ہے۔ کہا یہ ہے کہ دنیا میں افراد کی کثرت و قلت معیارِ فتح و شکست نہیں۔ معیار ان افراد کا جو ہر ذاتی ہے۔ چھوٹی سی جماعت جو ایمانِ محکم اور عملِ پیہم کی قوتوں سے مسلح ہو، بہت بڑی بھیڑ (CROWD) پر نہایت آسانی سے غالب آ سکتی ہے۔ تاریخِ عالم پر تیرتی ہوئی نگاہ ڈالیے۔ ہر مبارزت میں آپ کو اس اصول کے خط و خال ابھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ نگاہوں کے سامنے واضح مقصد۔ اور وہ مقصد بھی عالمگیر انسانیت کے لئے منفعت بخشوں کا حصول۔ دل میں اس مقصد کی صداقت پر یقین اور اس کے حصول کی تڑپ۔ پاؤں میں استقامت، بازوؤں میں قوت، بڑھتی ہوئی تہمتیں، اٹھتے ہوئے قدم اور جیاتِ جاوداں منزلِ مقصود سے

جہادِ زندگی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں!

اسی حقیقت کی طرف بدر کے میدان میں مجاہدین کی توجہ ان الفاظ میں مبذول کرائی گئی تھی کہ اِنَّ يَتِيَكُنَّ مِنْكُمْ مَّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ (۲۴۷) ”اگر تم میں ایک ثابت قدم مجاہد ہوئے تو وہ دو سو پر غالب آ جائیں گے“ کہ اصلی مقابلہ تعداد کا نہیں ہونا، افراد کے جوہروں کا ہونا ہے۔ مغربی جمہوریت کا ستیاناس کہ اس نے انسان کے جوہر ذاتی کو یکسر نظر انداز کر کے تعداد کی کثرت و قلت کو حق و باطل کا معیار قرار دے دیا۔ یعنی جس جھوٹ کی تعداد میں کیا دن باٹھ اٹھ جائیں

مغربی جمہوریت کا باطل نظریہ

وہ سچ قرار پا جائے، اور جس سچ کی تائید میں اسچاس یا تھ کھڑے ہوں اُسے جھوٹ سمجھا جائے۔ سوچئے کہ دنیا میں اس سے بڑا عالمگیر فریب کوئی اور بھی ہو سکتا ہے اور قیامت بالائے قیامت کہ آج قریب قریب ساری دنیا اس

قریب کو منزل من اللہ صداقت کا درجہ دیتے ہوئے ہے۔ قرآن کی رُو سے حق، حق ہے اگر اس کی تائید میں ایک لفظ بھی نہ اُٹھے۔ اور باطل، باطل ہے خواہ اس کی تائید میں کیا ون چھوڑ سو فیصد باتھ بھی کھڑے ہو جائیں۔ جب تک دنیا اس ابدی صداقت کو تسلیم نہیں کرے گی، فسادِ آدمیت مٹ نہیں سکے گا۔ اور حق کتاب اللہ کے اندر ہے۔

آیت کے آخر میں ہے: **كَمُؤْمِنٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ (۲/۲۵۰)۔**

اذن اللہ کے معنی

اس میں بِإِذْنِ اللہ کے معنی کئے جاتے ہیں خدا کے حکم یا اس کی اجازت سے۔ اس سے پھر جبر کا عقیدہ سامنے آتا ہے۔ یعنی اگر خدا کا حکم ہو تو ایسا ہو سکتا ہے ورنہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے لغات القرآن میں تفصیل سے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے مراد اس کا قانون ہے۔ اس آیت میں بِإِذْنِ اللہ کے بعد وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ کے ٹکڑے نے بات واضح کر دی ہے۔ یعنی خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر مستقل مزاج اور ثابت قدم افراد کم مقدار میں بھی ہوں تو وہ دوں ہمت اور سہمت حاصل افراد پر غالب آجائیں گے۔ خواہ موخر الذکر تعداد کے لحاظ سے کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔ قرآن کریم نے کم تعداد افراد کے غلبہ و نصرت کو ہر مقام پر اسی شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ وہ صابرین، یعنی ثابت قدم ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اِذْنِ اللہ کے معنی قانونِ خداوندی ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ خدا ہر موقع پر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کی اجازت دی جائے یا نہ دی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے اس کیلئے یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ صابرین کی کم تعداد بھی غیر صابرین کی زیادہ تعداد پر غلبہ حاصل کر لے گی۔

(۱)

اس کے بعد اس داستان کا اگلا ٹکڑا دیکھیے۔ فرمایا:-

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ۔ (۲/۲۵۰)

چنانچہ جب یہ باہمت لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے صف آراء ہوئے تو انہوں نے کہا کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! (تو دیکھنا ہے کہ ہم کھوڑے ہیں اور دشمن جہم غفر لے کر ہمارے سامنے کھڑا ہے، سو) تو ہمارے دلوں کو ہمت اور استقلال سے لبریز کر دے اور ہمارے قدموں کو ثبات عطا فرما دے اور ہمیں ان لوگوں پر غلبہ عنایت کر دے جو تیرے قوانین سے انکار کرتے اور ان سے سرکشی برتتے ہیں۔

دیکھتے! یہ دعائیں (آرزوئیں) کس طرح اس تابوتِ سکینت (قلبِ سلیم) کی پکار پکار کر شہادت دیتی ہیں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اور آیت میں جمع کا صیغہ اس حقیقت کی دلالت کرتا ہے کہ جس قسم کا میر کارواں (سربراہ) ہوگا، اسی قسم کے اس کے رفقاء سفر ہو جائیں گے۔ سربراہ کی سیرت کا اس کے متبعین کی ذہنیت اور کردار پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَاتَّهَ اللَّهُ الْمَلِكَ
وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ
بَعْضَهُمُ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ
عَلَى الْعَالَمِينَ - (۲/۱۵۱)

۲
۲۵۱

چنانچہ انہوں نے خدا کے اس قانون کے مطابق (کہ فتح و ظفر مندی حق پر جم کر کھڑے ہو جانے سے وابستہ ہوتی ہے) اپنے دشمنوں کو شکست فاش دے دی اور داؤد کے ہاتھوں (جو ان کے لشکر میں تھا) جالوت مارا گیا اور خدا نے (اس کے بعد) اسے حکومت و اقتدار اور فہم و فراست عطا فرمایا اور اسے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق (وحی کا) علم بھی دیا۔

یہ ہے طاہرات کا واقعہ۔ مقصد اس کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ اگر اللہ مستبد اور سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام نہ کرے تو دنیا میں فساد ہی فساد برپا ہو جائے۔ اس نے یہ انتظام اس لئے کر رکھا ہے کہ وہ انسانیت کی تباہی اور بربادی نہیں چاہتا، اس کی تعمیر اور ترقی چاہتا ہے۔ (۲۲-۳۹) لیکن یاد رہے کہ مستبد قوتوں کی روک تھام انسانی جماعتوں کے ہاتھوں ہی سے ہوتی ہے۔ خدا براہِ راست ایسا نہیں کیا کرتا۔ اس لئے دنیا میں ایسی جماعت کا رہنا بڑا ضروری ہے۔

یہاں فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ کہا گیا ہے۔ ان شرائط نے جنہیں ان مجاہدین نے پورا کیا اور ان آرزوؤں نے جو شدتِ طلب سے عین میدانِ جنگ میں ان کے لبوں پر دعائیں بن کر آئیں اور حینِ کار کا عکس ہم سابقہ آیت میں دیکھ چکے ہیں، اذنِ اللہ کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ یعنی قانونِ خداوندی کے مطابق انہیں غلبہ نصیب ہوا۔ اور آیت کے آخری الفاظ سے جہاد فی سبیل اللہ کی علتِ غائی اور منتہی و مقصود واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی جماعتِ مومنین صرف اس لئے شمشیر بکف میدانِ جنگ میں اترتی ہے کہ دنیا سے فساد مٹ جائے۔ اس نکتہ کی وضاحت

سابقہ باب میں قتال کے سلسلہ میں بڑی مشرح و بسط سے کی جا چکی ہے۔ اس لئے اس کی تفصیل میں جانے کی یہاں ضرورت نہیں۔

حضرت داؤد کے متعلق گفتگو متعلقہ مقام پر کی جائے گی۔

(۱۰)

اور ان تشریحات کے بعد فرمایا:-

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ (۲/۲۵۳)

۲
۲۵۳

یہ ہیں وہ قوانین جنہیں ہم، اے رسول! حق و صداقت کے ساتھ تمہیں دے رہے ہیں اور یہ کوئی نئی

بات نہیں۔ ہم اس قسم کے قوانین اپنے تمام پیغمبروں کو دیتے چلے آئے ہیں اور تو بھی انہی میں سے ہے۔

یہ احکام، قوانین اور حقائق، اسی طرح بذریعہ وحی انبیاء سابقہ کو بھی دیئے گئے تھے۔ لیکن ان کے نام لیواؤں نے ان میں تحریف کر دی اور وہ حقیقت کے بجائے افسانے بن کر رہ گئے۔ انہی حقائق کو اب ہم (اے رسول!) تیری طرف منزہ شکل میں نازل کر رہے ہیں۔ اور چونکہ یہ کتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ رہے گی اس لئے اس میں یہ حقائق افسانے نہیں بن سکیں گے۔ دنیا میں ہر متلاشی حقیقت کو اسی کتاب کی طرف آنا پڑے گا۔



تیسرا پارہ شروع

سابقہ آیت کے اخیر میں کہا گیا ہے کہ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ (۲/۲۵۳) تو منجملہ مرسلین من اللہ ہے اس

کے بعد کہا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَ

۲
۲۵۳

رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَاتَّخَذْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيْتَ وَ

أَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتُلَ الَّذِينَ

مَنْ بَعْدَهُمْ مَنْ بَعْدَ مَا جَاءَ تَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنْ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ
مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَكِنَّ اللَّهَ
يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ. (۲/۲۵۳)

یہ تمام رسول، منصب رسالت کے اعتبار سے تو ایک جیسے تھے (۲/۲۵۳)۔ لیکن ان کی تعلیم کے دائرہ اثر و نفوذ کے لحاظ سے ان میں بعض کو بعض پر فضیلت حاصل رہی ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جن سے خدا نے (جبریل کے واسطے کے بغیر) براہ راست باتیں کیں [مثلاً موسیٰ (۲/۲۵۳)] بعض کے درجے (دیگر امور میں) بلند کئے۔ انہی میں عیسیٰ ابن مریم بھی ہے جسے ہم نے واضح دلائل دیئے اور مقدس وحی سے اس کے لئے سامان تقویت ہم پہنچایا۔ اگر ہمارا قانون مشیت یہ ہوتا کہ انسان بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور زندگی بسر کرے تو ان مولوں کی اس قدر واضح تعلیم کے بعد ان کے متبعین آپس میں جنگ و جدال اور اختلافات نہ کرتے۔ لیکن چونکہ انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو سا راستہ چاہے اختیار کر لے (۲/۲۵۳)۔ اس لئے انہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ بعض نے ایمان کی راہ پسند لی۔ بعض نے کفر کا راستہ اختیار کر لیا۔ پھر سن لو کہ اگر مشیت کا قانون یہ ہوتا کہ انسان کو جبراً ایک ہی راہ پر چلایا جائے تو یہ کبھی آپس میں جنگ و قتال نہ کرتے۔ (ممکن ہے تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ خدا نے انسان کو صاحب اختیار بنایا ہی کیوں؟ نہ اسے اختیار دیا جاتا نہ دنیا میں جنگ و قتال ہوتے۔ لیکن ان امور کے فیصلے تمہاری منشاء کے مطابق نہیں ہو سکتے)۔ یہ سب خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے جو تمام نظام کائنات کو اپنے محیطِ کل ارادے (پروگرام) کے مطابق چلا رہا ہے۔ انسان کا صاحب اختیار ہونا بھی اسی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ اس آیت میں دو ایک نکات غور طلب ہیں:-

(۱) حضرات انبیاء کرام پر ایمان لانے کے سلسلہ میں قرآن کریم نے ہمیں یہ یقین کی ہے کہ لَا تَفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ۔ (۲/۲۵۳) اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ فَصَلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَرَفَعْنَا دَرَجَاتٍ۔ (۲/۲۵۳) اس کے متعلق زیر آیت (۲/۲۵۳) باب دوم میں بتایا جا چکا ہے کہ جہاں تک ان حضرات کے رسول (یعنی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر) ہونے کا تعلق ہے ان میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ان کی تعلیم کے دائرہ اثر و نفوذ اور جو پروگرام ان کے سپرد کیا گیا تھا اس کے بروئے کار لانے کے سلسلہ میں پیش آنے والی مشکلات اور تصاویر کے اعتبار سے ان میں اختلافِ مدارج ہے۔ بایں ہمہ بحیثیت رسالت یہ حضرات یکساں واجب التکریم اور مستحق احترام

ہیں۔ اس باب میں اتنا اور سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ دنیا میں ہر ملک اور ہر قوم میں مرسلین من اللہ آئے رہے۔ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ۔ (۲۵۳) ان میں کچھ وہ ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں کر دیا گیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا (متعینہ طور پر) ذکر نہیں کیا گیا۔ اہل مذاہب جن ہستیوں کو اپنے مذہب کا "بانی" کہتے ہیں ہم ان میں سے کسی کے خلاف بھی گستاخی کا کلمہ زبان پر نہیں لا سکتے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان انبیاء میں سے ہوں جن کا متعین طور پر ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا۔ سوچتے کہ کیا اس قسم کی کشادہ نگہی کی تعلیم کہیں اور بھی ملتی ہے؟

(۲) دوسری بات یہ کہی گئی ہے مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ۔ (۲۵۳)۔ ان میں وہ بھی ہیں جن سے خدا

نے "کلام" کیا۔ قرآن کریم میں صرف ایک نبی (حضرت موسیٰ) کے متعلق "کَلَّمَ اللّٰهُ" کے الفاظ آئے ہیں سورہ النساء میں ہے: كَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيْمًا (۲۵۳) سورہ اعراف میں ہے۔ وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ۔ (۲۵۳-۲۵۴) یہ وہ مقام ہے جب طور پر حضرت موسیٰ کو شرف ہمکلامی سے نوازا گیا تھا۔

حضرات انبیاء کرام کو خدا کی طرف وحی ملتی تھی، وحی کے متعلق حسب ذیل مقامات میں گفتگو ہو چکی ہے۔ جلد اول، آیت (۲)۔ ص ۱۴۱-۱۴۲۔ آیت (۲)۔ ص ۳۰۸-۳۰۹۔ جلد دوم آیت (۲)۔ ص ۱۲۹۔ آیت (۲)۔ ص ۱۸۱۔ آیت (۲)۔ ص ۹۸-۹۹۔

ان مقامات میں بتایا جا چکا ہے کہ کوئی غیر از نبی یہ جان ہی نہیں سکتا کہ خدا کی طرف سے وحی کیسے ملتی تھی۔ اور اب جبکہ وحی کا سلسلہ (حضور رسالت) کی ذات اقدس پر ختم ہو گیا اس لئے کوئی بھی اس راز کو نہیں پاسکتا۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ جو کچھ قرآن کریم میں ہے وہ خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی ہے۔ قرآن کریم میں تمام انبیاء کرام کے سلسلہ میں وحی (اوحینا) کا لفظ آیا ہے حتیٰ کہ طور کے ایک مقام کو چھوڑ کر خود حضرت موسیٰ کے لئے بھی اوحینا ہی کا لفظ آیا ہے۔ (دیکھیے ۱۴۰ ذ ۱۴۱ ذ ۱۴۲ ذ ۲۵۳ ذ ۲۵۴)۔ دوسری طرف وحی کے ذریعے عطا کردہ قرآن کریم کو خدا نے کلام اللہ کہہ کر پکارا ہے (۲۵۳ ذ ۲۵۴) اور قرآنی قوانین و حقائق کو "کلمات اللہ" سے تعبیر کیا ہے (۲۵۳)۔ لہذا وحی اور کلام اللہ ایک ہی بات ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَرَآئِ حِجَابٍ (۲۵۳)۔ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے۔ بجز ان دو طریقوں کے۔ یعنی جبریل کی وساطت سے قلب نبوی میں خدا

کی وحی کا انشاء۔ یا پس پردہ خدا کی بات اس تک پہنچ جائے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلوہ گاہ طور پر یہ دوسرا طریق اختیار کیا گیا تھا۔ لیکن اس کی نوعیت جو بھی تھی، وہ سلسلہ اب ختم ہو گیا۔ وحی کا دروازہ بند ہو گیا۔ اس لئے اب خدا کسی انسان سے براہ راست بات نہیں کرتا۔ نہ کرے گا۔ اب انسانوں کے ساتھ خدا اپنی کتاب کے ذریعے ہی باتیں کرتا ہے۔ یعنی جب کوئی شخص قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہے تو خدا اس سے باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ اسی لئے اس نے اسے کلام اللہ کہا ہے۔ یہ وہ عیساٰ طریق ہے جسے سورہ شوریٰ کی مندرجہ بالا آیت کے آخری حصہ میں یوں بیان فرمایا ہے۔ اَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بآيَاتِهِ مَا يَشَاءُ (۲/۲۵۳)۔ غیر از نبی انسانوں تک خدا کا کلام رسولوں کی وساطت سے پہنچتا تھا۔ اس کا یہ کلام اب ہم تک اس کی کتاب کے توسط سے پہنچتا ہے۔

(۳) حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہا ہے۔ وَآيَاتُنَا بِرُوحِ الْقُدُسِ (۲/۲۵۳)۔ اس سلسلہ میں جلد اول زیر آیت (۲/۲۵۳) پر وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کی آیات کا تعلق عالمِ امر میں قوانینِ خداوندی سے ہے۔

(۴) انسانوں کو صاحب اختیار و ارادہ کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول اور جلد دوم میں انسان اور تقدیر سے متعلق عنوانات دیکھئے۔ (نیز کتاب التقدير)

(۵) اس آیت میں کہا ہے کہ انبیاء سابقہ کی امتوں نے اختلاف افتراق سے کام لیا جس کا آخری نتیجہ باہمی جنگ و قتال تھا۔ اس کے بعد امت مسلمہ کو تنبیہ کی گئی ہے کہ دیکھنا کہیں تم بھی ایسا نہ کرنا۔ اس کے لئے جلد اول و دوم میں فرقہ سازی، تفرقہ انگیزی، اختلافات وغیرہ سے متعلق عنوانات دیکھیے۔

(۶) اس میں نوع انسان کے دو گروہوں میں بٹ جانے کا ذکر ہے فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ (۲/۲۵۳)۔ ایمان میں مشترک انسان اور کفر میں مشترک انسان۔ یہی قرآن کریم کی رو سے قومیت کا معیار ہے۔ یعنی قرآن کریم کی رو سے دنیا میں دو ہی قومیں ہیں۔ جماعتِ مومنین ایک قوم اور جو ان میں سے نہیں وہ دوسری قوم۔ اسی کو (موجودہ اصطلاح میں) ”دو قومی نظریہ“ کہا جاتا ہے۔

(۱)

قوموں کے عروج و زوال کی ان داستانوں کے بعد فرمایا :-

لہ اولیاء اللہ کے کشف والہام کا کوئی ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ اس موضوع پر الگ گفتگو کی گئی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ
يَوْمٌ لَا يَبْعُ فِيهِ وَلَا خِلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ هُمُ

۲
۲۵۴

الظَّالِمُونَ - (۲۵۴)

اے جماعتِ مومنین! انبیائے سابقہ اور اقوامِ گزشتہ کے یہ تمام احوال و کوائف اس لئے بیان کئے گئے ہیں کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ زندگی کی خوشگواریاں حاصل کرنے کا راز نظامِ خداوندی قائم کرنے میں پوشیدہ ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تمہیں جو کچھ بھی خدا نے دیا ہے اسے اس مقصد کے لئے کھلا رکھو۔ اس وقت تم ایسا کرنے پر قادر ہو لیکن اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پھر ان خوشگوار یوں کا حصول ممکن نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ وہ جنس نہیں جسے تم جس وقت چاہو بازار سے خرید لو۔ نہ ہی یہ کسی دوست سے احساناً مل سکتی ہے اور نہ ہی کسی کی سفارش سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جو اس حقیقت سے انکار کرتا ہے وہ اپنا نقصان آپ کرتا ہے۔

اس میں جس قانونِ مکافاتِ عمل کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی ہے وہ اپنی پوری تشریح و توضیح کے ساتھ جلد دوم - آیت (۲۵۴) صفحہ ۲۴۰-۲۲۸- میں سامنے آچکا ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لینا چاہیے۔ جس خدا کا یہ قانون ہے اس کی چند اہم صفات کا تعارف اگلی آیت میں کرایا گیا ہے۔

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ لَهُ
مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ
إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ
بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ
وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ - (۲۵۵)

۲
۲۵۵

اس آیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے اس کے الفاظ کا تشریحی مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔ اس لئے پہلے ان الفاظ

کو سامنے لایا جاتا ہے۔

آیتِ الكرسي | اللَّهُ کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول آیت (۱) مناسبت میں بحث ہو چکی ہے۔

لیکن اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس کی کچھ مزید وضاحت ضروری سمجھی گئی ہے۔

دین (یا مذہب) کا بنیادی نقطہ خدا پر ایمان ہے۔ دہریوں کو چھوڑ کر (جو خدا کی ہستی سے انکار کرتے ہیں)

دنیا کا ہر شخص کہے گا کہ وہ خدا کو مانتا ہے، خواہ خدا کے لئے اس کے ہاں الفاظ کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن (یہ چیز بظاہر ناقابل فہم یا کم از کم تعجب انگیز دکھائی دے گی کہ) قرآن کریم ان کے اس ماننے (ایمان) کو ماننا (ایمان) تسلیم ہی نہیں کرتا۔ نزول قرآن کریم کے زمانے میں ایک گروہ ایسا تھا جو کسی سابقہ آسمانی کتاب پر ایمان رکھنے کا مدعی نہیں تھا (جیسے کفار یا مشرکین عرب) اور ایک گروہ جو کسی نہ کسی سابقہ آسمانی کتاب پر ایمان رکھتا تھا۔ (جیسے یہودی اور عیسائی جنہیں قرآن اہل کتاب کہہ کر پکارتا ہے) ان اہل کتاب کے خدا پر ایمان کے دعوے سے تو انکار ہی نہیں کیا جاسکتا۔ خدا تو ایک طرف وہ وحی، ملائکہ، رسل، حیات بعد المات پر بھی ایمان کے مدعی تھے۔ جہاں تک اول الذکر گروہ کا تعلق ہے خدا کو وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں مانتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ قُلْ لِّسَنَیْ اَلَاہُتِ وَاَمِّنْ فِیْہَا اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ سَیَقُولُوْنَ اِلٰہُ (۲۳۸)۔ ان سے کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ ارض اور جو کچھ اس میں ہے، کس کی ملکیت ہے تو یہ فوراً کہہ دیں گے کہ اللہ کی۔ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّعٰی وَاَرْضِ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔ سَیَقُولُوْنَ اِلٰہُ۔ (۲۳۹)۔ ان سے پوچھو کہ اس وسیع کائنات اور عرش عظیم کا رب کون ہے یہ فوراً جواب دیں گے کہ اللہ۔ اس کے بعد ہے: قُلْ مَنْ مَّیْدَ مَلٰئِکَہٗ مَلٰئِکَہٗ کُلِّ شَیْءٍ۔ ان سے پوچھو

سب سے ایمان کا مطالبہ

کہ اشیائے عالم پر اقتدار کس کا ہے۔ یہ بلا تامل کہیں گے کہ اللہ کا۔ (۲۳۹-۲۴۰) لیکن اس کے باوجود وہ نہ صرف ان کفار و مشرکین کو بلکہ اہل کتاب کو بھی اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ قرآن کریم ان کے ایمان باللہ کو ایمان باللہ کیوں تسلیم نہیں کرتا؟ بات واضح ہے۔ خدا (اللہ) ایک مجرد حقیقت ہے۔ انسانی خیال و قیاس و گمان و وہم سے بالا۔ غیر محسوس اور غیر مرئی۔ لہذا جب کوئی کہتا ہے کہ وہ خدا کو مانتا ہے تو وہ اسی خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتا ہے جس کا تصور اس کے ذہن میں موجود ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کا تصور ہر فرد کا الگ الگ ہو سکتا (بلکہ ہوتا) ہے۔ جب قرآن کریم بھی خدا (اللہ) پر ایمان کی دعوت دیتا ہے تو وہ ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت و ماہیت کے متعلق کچھ نہیں بتاتا۔ ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کو انسان سمجھ ہی نہیں سکتا۔ کوئی محدود (FINITE)، لامحدود (IN-FINITE) کا تصور نہیں کر سکتا۔ اس لئے قرآن ذاتِ باری تعالیٰ کی کنہ و حقیقت کے متعلق کچھ نہیں بتاتا۔ وہ اس کی صفات (ATTRIBUTES) کا ذکر کرتا ہے اور نہایت وضاحت سے ذکر کرتا ہے۔ ان صفات سے خدا کا جو تصور (CONCEPT) ذہن انسانی میں آتا ہے، قرآن کریم اس تصور کے مطابق خدا (اللہ)

پر ایمان کو صحیح ایمان قرار دیتا اور تسلیم کرتا ہے۔ خدا کی ان صفات کے متعلق کبھی کوئی انسان صحیح طور پر نہیں بتا سکتا تھا۔ انہیں خدا نے خود بتایا۔ خدا نے جو وحی انبیاء سابقہ کی طرف بھیجی تھی اس میں بھی اس نے اپنی صفات کو بتایا ہوگا۔ لیکن وہ وحی اپنی منزہ شکل میں کہیں موجود نہیں۔ اس لئے اب خدا کی صفات اپنی حقیقی اور منزہ شکل میں قرآن مجید کے اندر محفوظ ہیں اور انہی صفات کے مطابق خدا پر ایمان، معیار خداوندی کے مطابق کسی ایمان قرار پا سکتا ہے۔ ان صفات کے سوا جو صفات بھی اس کی طرف منسوب کی جائیں گی وہ انسانی ذہن کی وضع کردہ (یا محرف) ہوں گی۔ اس لئے وہ ناقابل قبول قرار پائیں گی۔ یہ وجہ ہے جو ان کے متعلق کہا گیا کہ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ۔ (۲۳/۱) ذہن انسانی خدا کی جو صفات بھی وضع کر چکا، خدا کے حقیقی

ت صفا خداوندی

ان سے منزہ اور بلند و بالا ہوگا۔ لہذا معیار خداوندی کے مطابق مومن (خدا پر ایمان رکھنے والا) اس کو کہا جائے گا جو ان صفات کے مطابق خدا کو مانے جو قرآن کریم میں خود خدا نے بیان کی ہیں۔ یہی وجہ ہے جو اس نے دنیا بھر کے ”خدا کو ماننے“ کے مدعیوں کے متعلق کہہ دیا کہ خَافُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا۔ (۲/۲۶)۔ اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں جس کو اسے جماعت مومنین، تم ایمان لاتے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ لوگ راہِ راست پر ہیں۔ (یہ آیت اور اس کی تشریح سابقہ صفحات میں آچکی ہے) ان صفات کہ قرآن کریم میں الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ (۲۶/۵۳) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ قرآن کریم کے اوراق میں دہشتہ موتیوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں اور اپنے اپنے مقام پر ہمارے لئے وجہ فروغِ دیدہ ہوتی جائیں گی۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، دین (اسلام) کا بنیادی نقطہ خدا کا صحیح تصور ہے اور وہ تصور ان صفات کے صحیح طور پر سمجھنے ہی سے قائم ہو سکتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ان صفات اور ان کے صحیح طور پر سمجھنے کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ زیر نظر آیت میں ان میں سے کچھ صفات ہمارے لئے وجہ تابندگی قلب نظر بنتی ہیں۔ فرمایا۔

اللَّهُ — اللہ وہ ہے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ۔ جس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔

جب اسلام بطور دین (نظامِ حیات) سامنے آئیگا تو اس میں اس صفتِ خداوندی کو اساسی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس کا مفہوم جلد اول، آیت (۱/۱) ص ۱۲-۱۳ میں گزر چکا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اس صفتِ خداوندی پر ایمان سے خدا کا تصور محض نظری یا اعتقادی نہیں رہ جاتا۔ عملی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی اس ایمان کے بعد، انسان دنیا کے کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت یا محکومیت قبول

اور اختیار نہیں کر سکتا۔ آپ نے غور فرمایا! اس ایک صفتِ خداوندی پر ایمان: جہاں انسانیت میں کیسا عظیم انقلاب برپا کر دیتا ہے! اسی لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ

چو می گویم مسلمانم بلزم کہ دائم مشکلاتِ لاِ اللہ را

لیکن جب دین، مذہب میں بدل جاتا ہے تو وہ ان تمام مشکلات کو آسان کر دیتا ہے۔ مذہب میں اگر لاِ اللہ الا اللہ کے معنی ہو جاتے ہیں: خدا کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں۔ یعنی اگر تم خدا کی پرستش، بندگی (پوجا پاٹ) کرتے رہو تو تم مومن ہو، خواہ اطاعت اور محکومیت کسی کی اختیار کر لو۔ دیکھا آپ نے کہ مذہب کے فریب نے لاِ اللہ کی مشکلات کو کس طرح آسان کر دیا؟

اور بابِ شریعت کے بعد جب اہل طریقت آگے بڑھے تو انہوں نے سارا جھگڑا **وحد الوجود کا نظریہ** ہی چکا دیا۔ تصوف کا بنیادی عقیدہ وحدۃ الوجود یا ہمہ اوست کا ہے جس کے

معنی یہ ہیں کہ کائنات میں جو کچھ ہے، خدا ہی ہے۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ

خود بر سر آں کوزہ خریدار بر آمد

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ

خود بر سر آں کوزہ خریدار بر آمد

اور اس عقیدہ کے ماتحت انہوں نے لاِ اللہ الا اللہ کا مفہوم یہ متعین کیا کہ دنیا میں جن معبودوں کی پرستش کی جاتی ہے وہ سب اللہ ہی ہیں۔ ہر پتھر کی مورتی جس کی پوجا کی جاتی ہے، اللہ ہے۔ ہر انسان جس کی لوگ پرستش کرتے ہیں، ہر حیوان جسے دیوتا مانا جاتا ہے، اللہ ہی ہے۔ یہ بھی اللہ وہ بھی اللہ۔ (معاذ اللہ، صد ہزار بار معاذ اللہ)۔ اور اسے نہ صرف عینِ دین بلکہ مغزِ دین کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے اس قسم کے عقائد وضع کئے اور جو ان کا اتباع کرتے ہیں انہیں مقربینِ بارگاہِ خداوندی اور اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔ سچ ہے۔ حق کا تو ایک متعین مقام ہوتا ہے۔ باطل کی پستی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ (وحدت الوجود کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم۔ آیت ۲۱۔ ص ۸۸ دیکھئے۔)

(۲) الْحَيّ - زندہ اور زندگی عطا کرنے والا۔

وہ اپنی ذات میں زندہ ہے۔ اسے کسی اور نے حیات (زندگی) عطا نہیں کی۔ وہ اپنی مخلوق کو **الْحَيّ** زندگی عطا کرتا ہے۔ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيًّا۔ (۲۱) اس نے ہر شے کو پانی کے ذریعہ زندگی عطا کی: خُودِ انْسانوں کے متعلق ہے۔ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاحْيَاكُمْ۔ (۲۸)

”تم بے جان تھے۔ اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔ اس طرح مخلوق بھی حَیّ (زندہ) ہو گئی۔ لیکن خدا کے الحی (زندہ) اور مخلوق کے زندہ ہونے میں ایک فرق تو یہ ہے کہ خدا از خود زندہ ہے۔ اُسے کسی نے زندگی عطا نہیں کی۔ اور مخلوق کو خدا نے زندگی عطا کی ہے۔ اور دوسرا فرق یہ ہے کہ اللہ — الحی لا یموت ہے (۲۵۸)۔ ایسا زندہ جسے موت نہیں آئے گی۔ لیکن مخلوق کے متعلق ہے۔ ”هُوَ یُحْیِیْ وَیُمُوتُ“ (۲۵۹) ”جس خدا نے تمہیں زندگی عطا کی ہے وہی تم پر موت بھی طاری کرتا ہے“ لہذا ”لَا یَمُوتُ“ صرف خدا کی ذات ہے اہل جنت کیلئے حیاتِ ابدی کا ذکر آیا ہے لیکن خدا کی ابدیت اور انسانوں کی ابدیت میں بڑا فرق ہے۔ اس کی تشریح جنت کی زندگی سے متعلق عنوان میں اپنے مقام پر کی جائے گی۔

(۳) الْقَیُّوْمُ — اس کے دو معنی ہیں۔ (۱) جو اپنے قائم، محکم اور استوار رہنے میں کسی سہارے کا محتاج نہ ہو۔ جو قائم بالذات ہو (SELF-SUBSISTING)۔ اور (۲) اپنی مخلوق کے معاملہ کی اس طرح تدبیر کرنے والا کہ ان کی پیدائش اور سامانِ زیست بہم پہنچانے کا بندوبست کرے اور ان کے مقاماتِ حیات کا علم رکھے۔ جو ہر شے پر نگران ہو۔ جس کے بغیر کوئی شے قائم نہ رہ سکے۔ (۴) لَا تَأْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّ لَا نَوْمٌ — سِنَۃ (مادہ و۔ س۔ ن)۔ نیند کی ابتدائی کیفیت یا اونگھ کو کہتے ہیں۔ اس کے معنی کسی چیز سے غافل ہو جانے کے بھی ہیں۔ اور قوٰم نیند کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ (خدا) مخلوق کو زندگی اور سامانِ پرورش عطا کرنے کے بعد ان کی طرف سے غافل اور بیخبر نہیں ہو گیا۔ وہ ان کی ہر حالت سے باخبر اور ان کا ہر مقام میں نگران ہے۔

قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ جب وہ کوئی اپنا نظریہ پیش کرتا ہے تو اس سے بالواسطہ کسی نہ کسی باطل عقیدہ کی تردید بھی کر دیتا ہے۔ ہندو دھرم میں عقیدہ ہے کہ ایشور پر ماتما سورہا ہے اور یہ کائنات اس کا خواب ہے۔ جب وہ نیند سے بیدار ہو جائے گا تو کائنات خود بخود معدوم ہو جائے گی۔ قرآن کریم میں لَا تَأْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّ لَا نَوْمٌ کہہ کر اس باطل عقیدہ کی بھی تردید کر دی۔ کائنات کے بالحق پیدا کئے جانے کے متعلق جلد دوم آیت (۲۱۰) پر گفتگو کی جا چکی ہے۔ اسے ایک منظر دیکھ لینا چاہیے۔

مغربی مادیین کا نظریہ یہ ہے کہ خدا نے کائنات کو پیدا کر دیا۔ لیکن اب اسے اس کی دیکھ بھال کی ضرورت نہیں۔ جس طرح ایک کلاک کو کوک (چابی) دے دی جاتی ہے تو وہ مدتِ معینہ تک خود بخود چلتا رہتا ہے اسی طرح نظم کائنات بھی ایک خود کار مشین کی طرح سرگرم عمل ہے۔ نہ خدا اس میں اب کوئی دخل دیتا ہے نہ کائنات

کو اس کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ خدا اس کی نگرانی کی طرف سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں، اس نظریہ کی بھی تردید کر دی۔ اس نے دوسری جگہ کہا ہے۔ **يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** - (۵۵)۔ کائنات کی ہر شے اپنی حیات، قیام اور نشوونما کے لئے خدا کی محتاج ہے۔ پھر ان اشیائے کائنات کی یہ کیفیت نہیں کہ ان کی ضروریات کے تقاضے غیر متبدل ہیں۔ وہ ہمیشہ ویسے ہی رہتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی شے کا کوئی تقاضا ایک دفعہ پورا کر دیا جائے تو پھر اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایسا نہیں۔ **كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ** - (۵۶)۔ ان کے تقاضے ہر آن بدلتے رہتے ہیں اور خدا کی ربوبیت ہر نئے تقاضے کے مطابق سامانِ نشوونما ہم پہنچاتی رہتی ہے۔ لہذا ان کی مستقل اور مسلسل نگرانی کی ضرورت ہے اور ایسا کچھ وہی خدا کر سکتا ہے جسے نیند تو ایک طرف اونگھ تک بھی نہ آئے جو ایک لمحہ کے لئے کبھی اس نگرانی کی طرف سے غافل نہ ہو۔ وہ اپنی مخلوق کے احوال و ظروف سے ہر آن واقف اور باخبر ہو۔

(۵) **لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ** - کائنات کے کسی ایک گوشے سے نہیں۔ پوری کی پوری کائنات سے۔ آیت کے اس ٹکڑے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کائنات میں جو کچھ ہے سب اس خدا کی ملک ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جملہ کارِ کائنات اس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہے۔ وہ اس کے لئے سرگرم عمل ہے اور یہ (خدا) ہر قدم پر اس کی نگرانی بھی کرتا ہے اور ضروری سامانِ قیام و نشوونما بھی مہیا کرتا ہے۔

(۶) **مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ اِلَّا بِاِذْنِهٖ** - اشیائے کائنات اس کے پروگرام کی تکمیل میں بلاچون و چرا سرگرم عمل رہتی ہے۔ ان میں سے کسی کو یا رائے سرتابی نہیں، مجال سرکشی نہیں۔ (تفصیل اس اجمال کی جلد دوم، باب اول ص ۶۶ میں ملائکہ کے عنوان میں گزر چکی ہے۔ نیز زیر آیت ۲ ص ۹۰ میں)۔ لیکن انسان اس میں کوتاہی بھی کرتا ہے اور اس سے سرتابی بھی برتاؤ۔ لیکن جب وہ ایسا کرتا ہے تو اسے اس غفلت اور سرتابی (قانون شکنی) کے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں اور اس کے متعلق خدا کا نظامِ عدل ایسا ہے کہ اس میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا، بجز اس کے کہ وہ اس کے قانون کے مطابق ہو۔ شفاعت کے متعلق بحث جلد دوم، زیر آیت ۲ ص ۳۳ پر ہو چکی ہے۔

(۷) **يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ** - اس باب میں کسی کی مداخلت کی اس لئے بھی گنجائش نہیں کہ حاکم (اللہ تعالیٰ یا اس کا قانونِ مکافات) ہر ملزم کے ماضی اور حال سے پوری طرح واقف

ہوتا ہے۔ (قانونِ مکانات کے متعلق جلد اول زیرِ آیت (۲۶) ص ۱۵۲ پر گفتگو ہو چکی ہے۔ مزید تفصیل وہاں دیکھ لی جائے)۔

(۸) وَلَا يَحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ۔ خدا کے علم کی تو یہ کیفیت ہے کہ زبان و مکان کے حدود بھی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ لیکن انسان کو تو اسی قدر علم حاصل ہو سکتا ہے جس قدر اس کے حصول کی استعداد اسے خدا نے عطا کر رکھی ہے۔ حصولِ علم کے ذرائع سماعت و بصر اور قلبِ فہم اور ادراک ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی دسترس یا وسعت کی ایک حد ہے جس سے آگے وہ جا ہی نہیں سکتے۔ لہذا اس کا علم بہر حال محدود ہے۔ دوسرا ذریعہ علم وحی خداوندی کے ذریعے عطا کردہ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ علم اتنا ہی ہے جتنا خدا نے دینا چاہا۔ لہذا قانونِ خداوندی کی رو سے انسان کا اکتسابی علم یا وحی کی رو سے عطا شدہ علم، علمِ خداوندی کے مقابلہ میں بہر حال محدود ہے۔

(۹) وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ اس کا علم ساری کائنات کو محیط ہے۔ کرسی کے معنی علم اور اقتدار دونوں ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ سابقہ ٹکڑے میں علم کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی اس لئے اس ٹکڑے میں علم کے مفہوم کو ترجیح دی جائے گی۔ (لفظ کرسی کی نسبت سے اس آیت کو عام طور پر آیت الکرسی کہا جاتا ہے۔

(۱۰) وَلَا يَؤُودُهُ حِفْظُهُمَا۔ اتنی وسیع و عریض کائنات! عصرِ حاضر کے ماہرینِ علمِ الافلاک تو اسے ناپید اکنار بھی کہتے ہیں اور وسعت گیر (EXPANDING) بھی۔ اس قسم کی کائنات کے ذرہ ذرہ کے متعلق علم۔ اس کی نگرانی، اس کے ہر تقاضا کا پورا کرنا انسانی اعمال کے نتائج و عواقب کا مرتب کرنا عقلِ انسانی اپنے انداز رکھے مطابق یہی تاثر لے سکتی ہے کہ ایسا پروگرام تھکا دینے والا ہے۔ لیکن تھک جانا تو محدود توانائی کا نتیجہ ہے۔ جو ذاتِ لا متناہی توانائیوں کی مالک اور سرچشمہ ہو اس کے لئے تھک جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو ذہنِ انسانی کی افسانہ طرازی تھی جو اس نے (محرفِ تورات میں) کہا کہ خدا نے چھ دن لگانا محنت کر کے کائنات کو پیدا کیا اور ساتویں دن (تھک کر) آرام کرنے لگا۔ (سبت۔ ہفتہ کی تعطیل اسی "سنتِ خداوندی" کے اتباع میں ہے)۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ اس قدر لا متناہی توانائیوں کا مالک کبھی تھکا نہیں کرتا۔

(۱۱) وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ۔

عُلُو کے معنی بلندی یا کسی کے اوپر ہونے کے ہیں۔ بلندی کے اعتبار سے اس میں شرف و عظمت یعنی

بلندی مدارج سب آجاتے ہیں۔ اور اوپر ہونے کے اعتبار سے اس کے معنی غلبہ اور تسلط کے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کریم میں ذاتِ باری تعالیٰ کی یہ صفت مختلف شکلوں میں آتی ہے۔ مثلاً سُبْحَنُہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ (۱۶)۔ ذہن انسانی خدا کے متعلق جو تصور پیدا کرے گا وہ (خدا) اس سے بلند و بالا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ تَعَالٰی اللہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ۔ (۲۱)۔ اس میں ملک (اقتدار) کی نسبت سے تعالیٰ کے معنی صاحبِ غلبہ و اقتدار ہوں گے۔ دیگر مقامات پر عَلُوْا کَیْرًا (۱۷) الْعَلِیُّ کَبِیْرٌ (۲۲) یا الْکَبِیْرُ الْمُتَعَالِیُّ (۳۳) بھی آئے ہیں۔ ان مقامات میں کبریا کی جہت سے غلبہ و اقتدار، بلندی و برتری مقصود ہوگا

الاعلیٰ

ان جہات کی رو سے خدا کی جامع صفت اَلَا عَلٰی (۴۴) آتی ہے۔ اول تو لفظ اَعْلٰی کے معنی ہی سب سے بلند و برتر ہیں۔ پھر اس کے ساتھ (اَلَا) نے اس تخصیص کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے۔ کائنات میں خدا کا غلبہ و تسلط تو ظاہر و باہر ہے۔ انسانی دنیا میں اس کی اس بلندی و کبریا کی کاظہر اس وقت ہوتا ہے جب اس کے قوانین کو انسانی معاشرہ میں غلبہ و ممکن حاصل ہو۔ اور یہ غلبہ و ممکن ان انسانوں کے ہاتھوں قائم ہوتا ہے جو اس مقصد کے لئے جان تک کی بازی لگا دیں۔ چنانچہ اس نے جہاد فی سبیل اللہ کی غرض و غایت ہی یہ بنائی ہے کہ جَعَلَ کَلِمَۃَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا السُّفْلٰی وَ کَلِمَۃَ اللّٰهِ هِیَ الْعُلَیّٰ۔ (۹۱) تاکہ انسانوں کا خود ساختہ نظام پست (مغلوب) ہو جائے اور خدا کا نظام غالب آجائے۔ جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں یہ نظام غالب آتا ہے ان کے متعلق بھی کہا کہ وَلَا یَقْنُوْا وَلَا تَحْزَنْوْا وَاَنْتُمْ اَلْعُلُوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۲۱۳) "عارضی تغیرات اور زمانے کی گردشوں سے مت گھبراؤ۔ مت ملول خاطر ہو۔ چونکہ تم قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین محکم رکھتے ہو اس لئے آخر الامر غالب تم ہی آؤ گے" آیت (۲۱۳) میں خدا نے اپنے آپ کو الاعلیٰ کہا تھا۔ یہاں اس کے قوانین کو غالب کرنے والی جماعت کو الاعلون کہا ہے۔ یوں صفاتِ خداوندی علیٰ حدِ بشریت عبدِ مومن کی سیرت و کردار میں منعکس ہوتی ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

مومن بالاتے ہر بالا ترے غیرتِ او برتنا بدہم سرے

عَظِیْمٌ

عظم کے معنی بڑی کے ہیں۔ چونکہ انسانی پیکر میں ہڈیاں اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے عظمت کا لفظ انتہائی اہمیت کے لئے بولا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کا ترجمہ "بہت بڑا" کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ لفظ عذاب کے لئے بھی آیا ہے۔ (عَذَابٌ عَظِیْمٌ) اور اجر اور فوز کے لئے بھی۔ (اَجْرٌ عَظِیْمٌ، فَوْزٌ عَظِیْمٌ وغیرہ)

ان معانی کی رُو سے اَلْعَلِيِّ الْعَظِيمِ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ عام الفاظ میں تو یہ کہ ذاتِ خداوندی انتہائی بلندیوں اور عظمتوں کی مالک ہے۔ لیکن ذرا گہرائی میں جائیے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ کائنات کی اساس و بنیاد (عظم) سے لے کر اس کی انتہائی بلندیوں (علو) تک میں ذاتِ خداوندی کو غلبہ و تسلط حاصل ہے۔ یہ ہیں ذاتِ خداوندی کے اَلْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ میں سے چند ایک۔ یہ اور ان کے علاوہ دیگر صفاتِ خداوندی کی رُو سے ذاتِ خداوندی کا جو تصور قائم ہوتا ہے اس کے مطابق خدا کی ہستی پر ایمان لانا، ایمان باللہ کہلا سکتا۔ (میں نے جملہ صفاتِ خداوندی کی تفصیل اپنی کتاب ”من ویزداں“ میں بیان کی ہے)۔

اس مقام پر اس حقیقت کو پھر دہرا دیا جائے کہ ذاتِ خداوندی کی کنز و حقیقت کا ادراک ذہنِ انسانی کے لئے ممکن نہیں۔ حتیٰ کہ اسے کسی مثال سے بھی سمجھایا نہیں جاسکتا کہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (۲/۲۵۶)۔ اس کی مثل کوئی شے نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ذاتِ باری تعالیٰ کی معرفت (بیچانے) کا مطالبہ نہیں کیا، اس پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کی صفات سے (جو اس نے خود قرآنِ کریم میں) بیان کی ہیں، اس کا تصور قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہی خدا پر صحیح ایمان اور دین کی بنیاد ہے۔

(۰۰)

ادین کی اس بنیاد کو سامنے لانے کے بعد کہا :-

لَا اِكْرَاهُ فِي الدِّينِ | لَا اِكْرَاهُ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ
الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ
بِاللهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا
وَاللهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۲/۲۵۶)

اس قدر عظیم قوتوں کا مالک خدا اگر چاہتا تو جس طرح خارجی کائنات میں اس کا نظام از خود قائم ہے انسانی دنیا میں بھی از خود قائم ہو جاتا اور انسان اس کے مطابق چلنے پر مجبور ہوتا۔ لیکن ہم اس باب میں زبردستی نہیں کرنا چاہتے۔ اسے انسانوں کو اپنے دل کی رضا مندی سے قائم اور اختیار کرنا چاہیے۔ اس کے لئے ہم نے کیا یہ ہے کہ (وحی کے ذریعے) صحیح اور غلط راستے واضح کر دیئے ہیں اور انسان سے کہہ دیا ہے کہ وہ جو نا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔

سو جو قوم غیر خداوندی نظام سے منہ موڑ کر اس نظام کی صداقت پر ایمان لے آئے گی اور اسے اپنی زندگی

کا نصب العین بنائے گی تو سمجھ لو کہ اس نے ایسے حکم سہائے کو تمام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ یہ نظام اس خدا کا تجویز کردہ ہے جو ہر بات کا سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

یہ آئینہ جلیلہ دنیائے ”مذہب“ میں انقلاب عظیم کا اعلامیہ ہے۔ دنیا میں جس قدر کشت و خون مذہب کے نام پر ہوا ہے دیگر وجوہات یا محرکات کے حصہ میں اس کا عشر عشر بھی نہیں آیا۔ ان سب کے خلاف قرآن کریم نے اعلان کر دیا کہ دین (عرف عامہ میں مذہب) کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر نہیں۔ وحی نے غلط اور صحیح راستوں کو واضح کر دیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے جو نسا راستہ اختیار کر لے۔ اس میں کسی قسم کی زبردستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں اس اصل عظیم کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے انسانیت کو بالغ تصور کر کے اپنی ہدایات دی ہیں۔ اس لئے کسی بات کے منوانے کے لئے جو طریقے اس کے عہد طفولیت (بچپن کے زمانے) میں کار فرما یا موثر تھے ان کا دور ختم ہو گیا۔ اب یہ ہر بات اپنی عقل و بصیرت کی دوسے، اپنے فیصلہ سے مانے گا۔ انسانی اختیار و ارادہ کے متعلق حسب ذیل مقامات دیکھیے :-

(۱) جلد اول۔ آیت (۱/۱) ص ۱۲۱ ذ آیت (۲/۱) ص ۱۸۸-۱۸۹۔ آیت (۲/۲۳) ص ۳۱۴-۳۱۹

جلد دوم۔ آیت (۲/۲) ص ۱۵۱ ذ آیت (۲/۲۸) ص ۲۳۳ -

”دین میں جبر“ کے موضوع پر اس جلد کے چھٹے باب میں (زیر آیت ۱۹۳-۱۹۴) بڑی تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے جسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ بلخص اس تمام بحث کا یہ ہے کہ نہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی کو اس میں باندھ کر رکھا جاسکتا ہے۔ اس کے اندر آنے کے دروازے بھی ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلے ہیں اور باہر نکلنے کے دروازے بھی۔ اس لئے کہ ایمان تو نام ہی ابدی صداقتوں کو دل و دماغ کی پوری ضرورت سے ملنے اور ان پر قائم رہنے کا ہے جہاں یہ رضا مندی ختم ہوئی، ایمان بھی ختم ہو گیا۔

آیتہ زیر نظر میں کہا گیا ہے کہ دین کے معاملہ میں اکراہ کی اس لئے ضرورت نہیں (یا وہ جائز نہیں) کہ رشد اور غواہیت کے (یعنی صحیح اور غلط) راستے واضح طور پر سامنے آچکے ہیں۔ جب قرآن کریم نے کہا کہ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ غلط اور صحیح میں یہ امتیاز قرآن مجید میں کر دیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ غلط اور صحیح کے تعین کے لئے قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

رشد

ہر وہ عقیدہ، نظریہ، تصور، مسلک جو قرآن کے مطابق ہے، رشد ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ غواہیت ہے۔

رشد کا مفہوم پانچویں باب میں (زیر آیت ۲۵۶) بیان کیا جا چکا ہے۔

غوابت

تختی - (مادہ غ - و - ی) کے بنیادی معنی بھٹک جانا، گمراہ ہو جانا، دھوکا کھا جانا ہیں (اس کے مزید معانی متعلقہ مقامات میں سامنے آتے جائیں گے) زیر نظر آیت میں یہ لفظ رشد کے تدمقابل آیا ہے۔ اس لئے جب رشد کے معنی صحیح راستہ ہوں گے تو غوابت کے معنی غلط راستہ ہوں گے۔ اس حقیقت کو یاد رکھیے کہ غلط راستہ کبھی صحیح منزل کی طرف نہیں لے جاسکتا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ - (MEANS ARE JUSTIFIED BY THE ENDS ACHIEVED) - ”جس ذریعہ سے بھی مقصد حاصل ہو جائے اسے جائز سمجھا جائے گا“ بڑا گمراہ کن نظریہ ہے۔ جائز نصب العین تک جانے کے ذرائع بھی جائز ہونے چاہئیں۔ ذرائع کو نصب العین سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔

اس آیت میں اگلی بات یہ کہی گئی ہے کہ فَمَنْ تَكْفُرًا لِّطَاغُوتٍ وَيُؤْمِنَ بِاللَّهِ... یعنی ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت ضروری ہے جب تک طاغوت سے انکار نہ کیا جائے، اللہ پر ایمان لایا نہیں جاسکتا۔

طاغوت

طاغوت کا مادہ (ط - غ - ی) ہے جس کے معنی حدود شکنی یا سرکشی اختیار کرنا ہیں۔ ان معانی میں وسعت کے لحاظ سے ہر اس قوت کو طاغوت کہا جاتا ہے جو قوانین خداوندی سے سرکشی برتے۔ (دیکھیے لغات القرآن)۔ زیر نظر آیت میں یہ لفظ (طاغوت) اللہ کے بالمقابل آیا ہے، اس لئے اس کے معنی ”خدا کے تدمقابل کھڑا ہو جانے والے“ ہوں گے۔ اس کے متعلق جلد اول، آیت (۶) ص ۲۱۵ پر بحث ہو چکی ہے۔ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ جب تک پہلے ہر غیر قرآنی نظریہ، تصور، عقیدہ، مسلک، مشرب کو ذہن سے نکالنا نہ جائے، اللہ پر ایمان لایا نہیں جاسکتا۔ بات بالکل واضح ہے۔ دو متضاد چیزیں یک جا ہونہیں سکتیں۔ اسے جمع بین النقیضین کہتے ہیں جو ناممکنات میں سے ہے۔ جو کچھ تختی پر پہلے لکھا ہے، جب تک اسے مٹایا نہ جائے، نئے نقوش اس پر ثبت نہیں ہو سکتے۔ خود قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ۔ (۵۶)۔ تطہیر قلب و دماغ کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا مثبت (POSITIVE) تک آنے کے لئے منفی (NEGATIVE) عمل لازماً ہے۔ یہی وہ ابدی طریق ہے جسے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ - کے نہایت مختصر جملہ میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ لَا منزل اول ہے جس کے بعد لَا کی منزل آتی ہے۔ جب روس میں کمیونزم کے انقلابی نعرہ کا آغاز ہوا تو دنیا میں تھلک مچ گیا۔ علامہ اقبالؒ نے اس کے فلسفہ پر قرآنی روشنی میں نگاہ ڈالی تو انہیں روسی کمیونزم اس میں بڑا بنیادی سقم دکھائی دیا۔ انہوں نے کہا۔

لَا سُلَاطِينَ، لَا كَلِيَّةَ، لَا إِلَهَ
مَرْكَبُ خُودِ رَسُوْنِي إِلَّا تُرَانِدُ

کرده ام اندر مقاماتش نگہ
فکر اور تشدد بادِ لَا بساند

لیکن

سوئے إِلَّا می خرامد کائنات
نفی بے اثبات مرگ امتاں

در مقام لَا نیا ساید حیات
لَا وِ إِلَّا برگ و ساز امتاں

(مثنوی - پس چہ باید کرد)

اسی حقیقت کو انہوں نے جاوید نامہ میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

بگذر از لَا جانبِ الْآخِرِ
تارہ اثبات گیری زندہ
جستہ اور اساس محکمہ

کردہ کارِ خداوندان تمام
در گذر از لَا اگر جویندہ
ایک می خواہی نظام عالمی

نظام عالم کے لئے اساس محکمہ الْآ ہے۔ اور یہ الْآ قرآن کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ اسی لئے انہوں نے روس سے کہا کہ

فکر را روشن کن از اُم الکتاب (جاوید نامہ)

داستان کہنہ شستی باب باب

یہ تمام تنقید و تلقین در حقیقت تفسیر ہے ”کفر بالطاغوت و ایمان باللہ“ کی۔ روس کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ لَا کی منزل (کفر بالطاغوت) طے کرنے کے بعد لَا کی طرف نہ بڑھا۔ لیکن ہماری شوریدہ نجفی کی وجہ یہ ہے کہ ہم لَا کی منزل (کفر بالطاغوت) طے کئے بغیر، لَا (ایمان باللہ) کے مدعی بن گئے۔ نتیجہ اس کا ہمارا مروجہ مذہب ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ

حدیث او ہمہ تخمین وطن بود

متابع شیخ اساطیر کہن بود

حرم چوں دیر بود، او برہمن بود (ارمغان حجاز)

ہنوز اسلام او زمار دار است

جب تک ذہنوں سے ”رام“ نہ نکلے ”رحیم“ ان میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کعبہ کبھی بیت اللہ نہیں بن سکتا جب تک اسے تمام بتوں سے پاک نہ کر دیا جائے۔ ہمارے حقیقی اسلام پر آنے کا طریق ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ”مروجہ مذہب اسلام“ کے ایک ایک عنصر کو قرآن کریم کے معیار پر پرکھا جائے۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر کے اس کی جگہ قرآنی عنصر کو اختیار کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (۲۸۶)

زندگی کے لئے ایسا محکم سہارا تھا آجائے گا جو کبھی ٹوٹے گا نہیں۔ (مادہ کے لحاظ سے) عروۃ ایسے درختوں کو کہتے ہیں جن کی جڑیں زمین میں پائیدار ہوں اور ان کے پتے سردی میں بھی نہ جھڑیں۔ چنانچہ جب مولیشیوں کے لئے کہیں اور چارہ نہ ملے تو یہ درخت ان کی زندگی کا سہارا بن جاتے ہیں۔ ایسے درختوں پر ہر موسم میں اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس پہنچ سے ہر وہ شے جس پر کامل بھروسہ کیا جاسکے، عروۃ کہلاتی ہے۔

اول تو عروۃ ہی ایسا محکم اور قابل اعتماد سہارا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ وثقی کہہ کر اس کی محکمیت کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ وثاق ایسی مضبوط رسی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کسی چیز کو کس کر باندھ دیا جائے اور وہ کبھی نہ ٹوٹے۔

اور ان دونوں (عروۃ اور وثقی) کی تفسیر لَا انفِصَامَ لَهَا سے کر دی۔ انفِصَامُ کسی چیز کے ٹرخ جانے کو کہتے ہیں۔ یعنی اس کا ٹوٹ جانا تو کجا وہ ٹرخ تک بھی نہ سکے۔ اس قسم کا ہے وہ محکم سہارا جو کفر بالطاغوت کے بعد ایمان باللہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی کو دوسری جگہ جبل اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے: **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا**۔ (۳۳)۔ ”تم اللہ کی رسی کو اجتماعی طور پر نہایت مضبوطی سے تھامے رکھو“ ظاہر ہے کہ جبل اللہ سے مراد کتاب اللہ ہے۔ یہی وہ عروۃ الوثقی ہے جو کبھی دغا نہیں دیتا۔ لیکن اس جبل اللہ کے محکم سہارا بننے کی شرط کیا ہے؟ وَلَا تَفَرَّقُوا۔ (۳۴)۔ تم میں اختلاف اور افتراق پیدا نہ ہو جائے۔ جو نبی امت فرقوں میں بٹی، نہ عروۃ الوثقی باقی رہا نہ جبل اللہ۔ اس کے بعد خوش فہمی یا خود فریبی باقی رہ گئی کہ ہم نے جبل اللہ کو ختم رکھا ہے۔ اسے تھاما ہوتا تو ذلت اور پستیوں کے گڑھوں میں کیوں گرتے۔

چہ گویم زان فقیرے درد مندے مسلمانے بگو ہر ارجمندے
خدا ایں سخت جاں ریا ربا دہ کہ افتاد است از بام بلندے (ایمان حجاز)

(۰)

اس تمک بالعرۃ الوثقی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اسے اگلی آیت میں بیان کر دیا جہاں کہا:-
اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاءُ الظَّالِمَاتِ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ (۲۵۴)

۲
۲۵۴

اس نظام کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اللہ کا قانون اس جماعت کا نگران و محافظ اور یار و مددگار ہوگا۔ جو اس کی صداقت پر یقین رکھ کر اسے قائم کرنے کی کوشش کرے گی۔ وہ انہیں غلط راستوں کی تاریکیوں سے نکال کر صحیح راہ کی روشنی میں لے آئے گا۔ ان کے برعکس جو لوگ اس نظام کی صداقت سے انکار کرتے ہیں، ان کے معاملات دنیا کی مکش (غیر خداوندی) قوتوں کے سپرد ہو جاتے ہیں جو انہیں صحیح راستے کی روشنی سے ہٹا کر غلط راہوں کی تاریکیوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ ان تاریکیوں میں جہاں انسانیت کی کھیتی مجلس کر رکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہے اور اس تباہی سے نکلنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔

اس آیت کا نقطہ ماسک یہ ہے کہ اللہ مومنین کا ولی بن جاتا ہے۔ چونکہ ولی اللہ، اولیاء اللہ، ولایت وغیرہ تصورات نے ہمارے ہاں بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے اس لئے یہ نقطہ وضاحت چاہتا ہے۔

ولی کے معنی | وَلِیُّکَ مَا دَہ (و۔ ل۔ ی) متعدد معانی کے لئے آتا ہے۔ ان میں سے ہمارے زیر نظر موضوع سے متعلق حسب ذیل معانی ہیں :-

(۱) اَلْوَلِیُّ کے بنیادی معنی ہیں کسی کے قریب اور نزدیک ہونا۔ قُرب کے اعتبار سے اَلْوَلِیُّ دوست اور مددگار کو کہتے ہیں۔

(۲) اِسْتَوٰی عَلٰی الشَّیْءِ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو اپنے قبضہ میں لے لینا۔ اسی سے اَوَّلَیَۃٌ سُلْطَنُ اور حکومت کو کہتے ہیں اور وَاٰلِ نِکْرَانِ اور حاکم کو۔ اَلْوَلِیُّ بھی نگران، ناظم، اور حاکم کو کہتے ہیں۔

(۳) ولی کے معنی کسی کی طرف رجوع کرنا۔ یا کسی کی اطاعت کرنا بھی ہیں۔ اس اعتبار سے اَلْوَلِیُّ کے معنی اطاعت گزار یا کسی کی پیروی کرنے والے کو کہیں گے۔

ان تصریحات سے الٰہی کے دونوں معانی واضح ہو گئے۔ جب اللہ کو ولی کہا جائے گا تو اس کے معنی نگران، حاکم اور مطاع کے ہوں گے۔ یعنی جس کی اطاعت کی جائے، جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ سورہ کہف میں اس حقیقت کی ان الفاظ سے وضاحت کر دی۔ فرمایا: مَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَلِیٍّ وَلَا یُشْرِکُ فِی حُکْمِهِ اَحَدًا۔ (پہ) ”خدا کے سوا ان کا کوئی ولی نہیں۔ اس لئے کہ خدا اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہاں ولی کے معنی ”حاکم“ (مطاع) کے واضح ہیں۔ اسی سے لفظ مولا ہے۔ یعنی جس کی اطاعت کی جائے۔ جسے حاکم تسلیم کیا جائے۔ سورہ آل عمران میں ہے :-

لَا یُہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تُطِیْعُوْا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَرُدُّوْکُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ

فَتَقَلَّبُواْ خُسِرِينَ۔ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَ هُوَ خَيْرُ النَّصِيْرِيْنَ۔ (۳-۱۳۸-۱۳۹)

اے جماعتِ مومنین! تم اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ یہ نظام کسی شخص کی موت سے درہم برہم نہیں ہو سکے گا (۱۳۸) اس میں خرابی واقع ہوگی تو اس طرح کہ تم ان لوگوں کی بات نہ ماننے لگ جاؤ (اور ان جیسے کام کرنے لگ جاؤ) جو اس نظام کے مخالف ہیں۔ اگر تم نے ایسا کیا تو وہ لوگ تمہیں پھر اسی راستے کی طرف لے جائیں گے جس پر تم اس سے پہلے چلتے تھے۔ اس سے تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔

تمہیں اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی کرنی چاہیے۔ وہی تمہارا مربی اور دمساز ہے اور وہی حامی و ناصر۔ یہاں دیکھیے۔ پہلی آیت میں غیرِ خدا کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں کہا گیا ہے: هُوَ مَوْلٰىكُمْ یعنی اطاعت صرف خدا کی کی جائے گی۔ وہی مطاع اور حاکم ہے۔ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ جیسا کہ واضح ہے، خدا کی یہ اطاعت اس کی کتاب کی رو سے کی ہوتی ہے۔ یعنی کتاب اللہ کی اطاعت خود اللہ کی اطاعت ہے۔ فرمایا:-

اَتَّبِعُواْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُواْ مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَاءَ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔ (۴)

اے جماعتِ مومنین! تم اسی ضابطہٗ قوانین (قرآن) کا اتباع کرو جسے تمہارے نشوونما دینے والے نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔ اور اس کے سوا کسی کارساز و رفیقِ کار کا اتباع مت کرو۔ (انسانوں کے لئے صحیح روشِ زندگی یہی ہے۔ لیکن، بہت تھوڑے ہیں جو اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔) وہ ہدایتِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کے فیصلوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ یہ شرک ہے)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا ولی ہوتا ہے جو اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ لہذا، اولیاء اللہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا (کی کتاب) کی اطاعت کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں ان کی خصوصیات کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا:-

اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (۵)

یاد رکھو! جو لوگ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے اللہ کے رفیق (اولیاء اللہ) بن جاتے ہیں۔ انہیں نہ کسی خارجی قوت کا خوف رہتا ہے، نہ داخلی کشمکش سے اندوہناکی یہاں اولیاء اللہ کی خصوصیت یہ بتائی کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ اور دوسری جگہ کہا:-

فَاتِمَا يَا تَيْسَكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنْ هَذَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۱۱۱)

آدم سے کہا گیا کہ ہماری طرف سے، ہمارے رسولوں کی معرفت (۱۱۱) تمہاری طرف راہنمائی آتی رہے گی۔

جو لوگ اس راہنمائی کے مطابق زندگی بسر کریں گے وہ ہر قسم کے خوف و ہراس سے محفوظ رہیں گے۔ (۱۱۲-۱۱۳)

یہاں یہ بتا دیا کہ ”لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ“۔ ”نتیجہ ہوتا ہے ہدایاتِ خداوندی کے اتباع کا۔ لہذا آیت (۱۱۲) اور (۱۱۳) کے ارتباط سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جو لوگ ہدایاتِ خداوندی کا اتباع کرتے ہیں انہیں اولیاء اللہ کہتے ہیں۔ ان کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ مومنین اور متقین ہی کو اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔ آیت (۱۱۲) آپ کے سامنے آچکی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اولیاء اللہ کو خوف و حزن نہیں ہوتا۔ اس سے اگلی آیت میں ہے۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ۔ (۱۱۴)۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔ (۱۱۵)۔ ان کی اس دنیا کی زندگی بھی ہر قسم کی خوشگوار یوں کی حامل ہوگی۔ اور آخرت کی زندگی بھی۔ یہی وہ مومن اور متقی ہیں جن پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ۔ (۱۱۶)

جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور دنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں کرتی تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ (خدا کی کائناتی قوتیں ان کا ساتھ دیتی ہیں اور ان کے لئے باعثِ تقویت بنتی ہیں۔ (۱۱۷) اور وہ ان سے کہتے ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تمہارے لئے اس جنتی معاشرہ کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ (۱۱۸-۱۱۹-۱۲۰-۱۲۱-۱۲۲-۱۲۳)

وہ ان سے کہتے ہیں

مَنْ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهَىٰ أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ۔ (۱۲۴)

ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے۔ (اس لئے تمہیں یہ جنتی زندگی، اس دنیا میں بھی نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی) اس جنتی زندگی میں وہ سب کچھ ہوگا

جسے تمہارا جی چاہے گا۔ اور وہ سب کچھ ملے گا جسے تم طلب کر دو گے۔ (جو چاہو ہو گے، ہو گا۔ جو مانگو گے ملے گا۔ یہ ہو گا نتیجہ تمہارے یقینِ محکم اور عملِ پہنچ کا)

اس سے ظاہر ہے کہ ایمان اور استقامت کا لازمی نتیجہ نزولِ ملائکہ ہے اور یہ کسی خاص گروہ کی اجارہ داری نہیں۔ یہ جماعتِ مومنین کی خصوصیت ہے۔ انہی کو اولیا۔ اللہ کہا جاتا ہے۔

اولیا۔ اللہ کا عقیدہ دنیا کے ہر مذہب میں چلا آ رہا ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں جس جس قسم کے غلط عقائد وضع اور اختیار کر رکھے تھے، قرآن کریم نے ان کی ایک ایک کر کے تردید کر دی۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ بزرگ دوسروں کو نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں اس لئے لوگ ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ قرآن کریم نے کہا دوسروں کو نفع پہنچانا تو ایک طرف یہ اپنی ذات کو بھی (قوانینِ خداوندی سے ہٹ کر) کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ قُلْ أَفَأَتَّخِذُكُمْ مِّنْ دُونِهِمُ أَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُونَ لِنَفْسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا۔ (۳۱) ”ان سے پوچھو کہ کیا تم اللہ کے سوا اوروں کو اولیاء تسلیم کرتے ہو اور عقیدہ یہ رکھتے ہو کہ وہ تمہیں نفع یا نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتے ہیں۔ ان سے کہو کہ تمہیں نفع یا نقصان پہنچانا تو ایک طرف یہ تو خود اپنی ذات کے لئے بھی اس قسم کا اختیار نہیں رکھتے۔“ مسلمانوں کے نزدیک حضور نبی اکرم سے بڑھ کر ”ولی اللہ“ کون ہو سکتا تھا۔ خود حضور کی زبان مبارک سے کہلوا یا گیا کہ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ۔ (۱۰۸) ”ان سے کہو کہ میں تو اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ یہ سب خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔“

ان کا یہ بھی عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ بزرگ مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہیں، اس لئے یہ ہمیں بھی خدا کا مقرب بنا دیں گے۔ ہم ان کی اطاعتِ قربِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے اس عقیدے کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی سختی سے تردید کی ہے۔ سُوْرَةُ الزَّمْرِ آیت ۱۶ میں ہے اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّيْنَ۔ ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ سو تم اس کتاب کے مطابق خدا کی اطاعت اور محکومیت اختیار کرو۔ اور اس اطاعت کو اس کے لئے مختص کر دو۔ اس میں کسی اور کو شریک مت کرو۔ اِلَّا اللّٰهُ الدِّيْنَ الْحَالِصُ۔ پھر سن رکھو کہ اطاعتِ خالصتہ احکام و قوانینِ خداوندی کی ہوگی جو اس نے اس کتاب میں دے رکھے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهِ اَوْلِيَآءَ۔ مَا نَفْعُهُمْ اِلَّا لِيَقْرَبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ ذُلْفٰی۔ جو لوگ اس کے سوا اوروں کو اولیا تسلیم کر لیتے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی اطاعت

اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں خدا کا مقرب بنا دیں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَخْتَصُّ بِنَفْسِهِ مَنَ هُوَ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ۔ اللہ ان کی ان باتوں کا ابھی فیصلہ کرتا ہے۔ جن میں یہ (دین کی اصل و حقیقت سے) اختلاف کرتے ہیں۔ اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ کَذِبٌ کَفَّارٌ۔ (۳۹)۔ جو جھوٹا اور ناشکر گزار ہے، خدا اسے کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ یاد رکھو! مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ۔ صحیح راستے پر وہی ہے جو خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے۔ وَمَنْ یُّضِلّْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِیًّا مُّرْشِدًا۔ (۱۲۸) اور جو کوئی اس کی راہنمائی کو چھوڑ کر اور راہیں اختیار کر لے تو اس کا نہ کوئی ولی ہو سکتا ہے نہ مُرْشِد۔ مُرْشِد (صحیح راستہ دکھانے والا) اور ولی (جس کی اطاعت کی جائے) صرف خدا کی ذات ہے۔ اور اس کی اطاعت اس کتاب کے ذریعہ کی جاتی ہے جسے اس نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے نازل کیا ہے۔

اس ضمن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ”اولیاء اللہ“ خدا تک پہنچنے (یا اپنی دعاؤں کو خدا تک پہنچانے) کا وسیلہ (ذریعہ) ہیں اور ہم اسی مقصد کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس عقیدہ کی تائید میں سورہ مائدہ کی یہ آیت پیش کر دی جاتی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوا الْوَسِیْلَةَ
وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تَفْلِحُوْنَ (۱۱۰)۔ اس کا سیدھا سادہ ترجمہ یہ ہے۔ ”اے ایمان والو! تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور اس کی طرف ”وسیلہ“ طلب کرو۔ اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔“ اس لفظ ”وسیلہ“ سے پیر پرستی کی دلیل لائی جاتی ہے اور پھر اس پر اشخاص پرستی کی وہ عظیم عمارت قائم کر دی جاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا اور جو نبی اکرم کی بعثت کا مقصد تھا۔ وَیَضَعُ عَنْہُمْ اِصْرَہُمْ وَاَلَا غُلَالٌ اَلَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْہِمْ۔ (۱۱۰)۔ قرآنی آیات کا اسی قسم کا غیر قرآنی مفہوم ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ یُضِلّْ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیُہْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا۔ (۱۲۸)۔ بہت سے لوگ اس قرآن (کا غلط مفہوم لے کر) گمراہ ہو جاتے ہیں اور بہت سے اس سے صحیح راہنمائی حاصل کر لیتے ہیں۔

عربی زبان میں لفظ ”وسیلہ“ کے معنی ذریعہ ہی نہیں بلکہ مرتبہ، درجہ، قرب، منصب، منزلت بھی ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم تو انہیں خداوندی کی نگہداشت کرو اور خدا کے ہاں درجہ، مرتبہ، قرب، منزلت طلب کرو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کے راستے میں پوری پوری جدوجہد کرتے رہو۔ اس سے تم مقصد زندگی کے حصول میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ یہ مفہوم کہ تقویٰ سے خدا کے ہاں درجہ اور منزلت حاصل ہو جاتی ہے، قرآن کے متعدد مقامات سے

واضح ہے۔ مثلاً اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ (۲۳۹)۔ خدا کے ہاں تم میں سب سے زیادہ واجب العزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے۔ اور اگر ”وسید“ کے معنی ”ذریعہ“ کہتے جاتیں تو بھی مطلب واضح ہے کہ تم تقویٰ اور جہاد کے ذریعہ خدا کے ہاں قدر و منزلت طلب کرو۔ قرآن، خدا اور انسان کا براہ راست تعلق قائم کرتا ہے اور یہ تعلق اس کی کتاب کے ذریعہ قائم ہوتا ہے۔ خدا اور انسان کے درمیان دوسرے انسانوں کے ذریعہ بننے کا تصور غیر قرآنی ہے۔ اسی لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اِذَا سَأَلَ لَكَ عِبَادِي عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ۔

خدا اور انسان کا براہ راست تعلق

جب (اے رسول) تجھ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان سے قریب ہوں۔ اتنا قریب کہ اُجِيبُ دَعْوَةَ الدّٰعِ اِذَا دَعَا۔ میں ہر اس شخص کی پکار کا، جو مجھے پکارتا ہے جواب دیتا ہوں۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ فَلْيَسْتَجِيبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (۲۳۹)۔ انہیں چاہیے کہ میری فرماں برداری کریں۔ مجھ پر ایمان رکھیں۔ تاکہ انہیں رشد و ہدایت مل جائے۔ بات کس قدر صاف ہے۔ جو شخص قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور ان کی اطاعت کرتا ہے، اسے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے لوگ ”مرشد“ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم کا نقطہ ماسکو یہ سمجھئے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان کسی طاقت کو حائل نہیں ہونے دیتا۔ نہ سیاست میں حکمران کی طاقت کو، نہ رزق کے معاملہ میں سربراہ کی طاقت کو۔ نہ مذہب میں پیشوائیت کی طاقت کو۔ (اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ عناصر ہیں ہی نہیں) اور نہ ”خدا اور بندے کے تعلق“ کے لئے پیرانِ طریقت کی طاقت کو۔ اس کی کتاب کے ذریعہ ہر شخص کا خدا سے براہ راست تعلق قائم ہو جاتا ہے اور اس کی اطاعت اس نظام کے ذریعہ ہوتی ہے جو اس مقصد کے لئے باہمی مشاورت سے متشکل کیا جاتا ہے۔

”اولیاء اللہ“ کے غلط تصور کی رُو سے خدا اور انسانوں کے درمیان اس کے ”خاص بندوں“ کی کڑی کو

کس قدر لاینفک سمجھا جاتا ہے اس کا اندازہ اس حکایت سے لگائیے جو خانقاہیت کی تعلیم گاہوں میں سب سے پہلے ذہن نشین کرائی جاتی ہے۔ حکایت یہ ہے کہ حضرت بابا فریدؒ دریا کے اس پار رہتے تھے اور ان کی خانقاہ دریا کے اُس پار تھی۔ وہ ہر صبح گھر سے نکلتے۔ آگے آگے آپ پیچھے

یا فرید۔ یا فرید

پیچھے آپ کا ایک مقرب مرید۔ دریا کے کنارے پہنچتے تو کسی پل یا کشتی کے بغیر، پانی پر سیدھے چلتے ہوئے اُس پار پہنچ جاتے۔ اسی طرح شام کو واپس آجاتے۔ مرید سے انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ پانی پر چلتے وقت یا فریدؒ یا فریدؒ کہتے

رہا کرو۔ اس طرح برسوں گزر گئے۔ ایک دن پانی پر چلتے، مرید نے سنا کہ خود بابا صاحب بھی کچھ الفاظ دہرا رہے ہیں۔ اس نے کان لگا کر سنا تو وہ کہہ رہے تھے۔ یا اللہ۔ یا اللہ۔ مرید نے دل میں سوچا کہ میں بھی "یا فرید" کے بجائے "یا اللہ" ہی کیوں نہ کہوں۔ اس نے جونہی "یا اللہ" کہا دھڑام سے پانی میں گر گیا اور لگا غوطے کھانے۔ بابا صاحب نے اسے سنبھالا اور کنارے پر آکر پوچھا کہ آج کیا ہوا تھا! اس نے ڈرتے کانپتے بات سنائی تو آپ نے فرمایا کہ تم نے کبھی اللہ کو دیکھا ہے؟ اس سے براہ راست کوئی راہ و رسم ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جس سے تمہاری جان نہ پہچان۔ اُسے تم اپنی مدد کے لئے کس طرح پکار سکتے ہو؟ فرید کی خدا سے راہ و رسم ہے اس لئے وہ اسے پکارتا ہے۔ تمہاری فرید سے راہ و رسم ہے، تم اسے پکارو۔ جس دن تمہاری راہ و رسم خدا سے براہ راست ہو جائے گی تم بھی اسے پکار لینا!

یہ اور اسی قسم کی دیگر حکایات سے شروع ہی ہے۔ یہ چیز ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ خدا کے مقرب بندے۔ اولیاء اللہ۔ خدا اور دوسرے انسانوں کے درمیان لاینفک کڑی ہوتے ہیں۔ تم خدا سے براہ راست اپنا رشتہ جوڑ ہی نہیں سکتے۔ اور ان سے یہ رشتہ ان کی زندگی تک ہی محدود نہیں سمجھا جاتا۔۔۔۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان سے بدستور قائم رہتا ہے۔ اس لئے کہ اولیاء اللہ کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی اسی طرح حاضر و ناظر رہتے ہیں جس طرح زندگی میں۔ وہ سب کی سنتے ہیں۔ سب کچھ دیکھتے ہیں۔ مانگنے والوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں، خدا کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم واضح الفاظ میں کہتا ہے:

مُرَدِّے ہماری نہیں سُن سکتے

مِنْ أَمْثَلُ مِمَّنْ يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ وَهُمْ عَنِ دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ۔ اور اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہے جو اللہ کو چھوڑ کر اسے پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتا۔ (جواب دینا تو ایک طرف) وہ ان کی پکار سے کیسے بے خبر ہوتے ہیں۔ انہیں اس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ انہیں کون پکار رہا ہے۔ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِينَ۔ (۱۰۰/۱۰۱) اور جب لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا تو یہ (اپنے ان پکارنے والوں کے) دشمن ہوں گے اور ان کی پرستش سے کفر اُکار کر دیں گے۔ یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ یہاں کفار کے بتوں کا یا ان کے دیگر معبودانِ باطل کا ذکر نہیں۔ ذکر خدا کے ان نیک بندوں کا ہے جنہیں لوگ ان کی وفات کے بعد اپنی مرادوں کے لئے پکارتے ہیں۔ ان کا ان عقیدت مندوں کی اس قسم کی حرکات سے بری الذمہ ہونے کا اظہار، ان کے خدا کے مخلص بننے کی شہادت ہے۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ اپنے پکارنے والوں کی پکار کو سن ہی نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی رو سے مرنے والوں کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ ان کا تعلق اُس دنیا سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ إِنَّ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا

دُعَاءُكُمْ۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سنتے ہی نہیں: وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ۔ اور اگر بفرمانِ مال وہ تمہاری پکار کو سُن بھی لیتے تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ وَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بَشِرْ كُمْ وَلَا يُنْبِئُكُمْ بِمِثْلِ خَبِيرٍ۔ (۳۵۱) اور قیامت کے دن وہ تمہارے اس شرک سے اظہارِ نفرت اور بیزاری کریں گے۔ یہ باتیں تمہیں وہ خدا بتا رہا ہے جس سے کچھ بھی چھپا نہیں۔ وہ اُس دنیا سے چلے جانے والوں کے احوال و کوائف سے اچھی طرح واقف ہے۔ یہاں بھی آمریت کے دوسرے حصے سے واضح ہے کہ بات خدا کے ان نیک بندوں کی ہو رہی ہے جو اپنے ان عقیدت مندوں کے اس شرک سے متنفر ہوں گے۔ سوچتے کہ جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کے اس فعل کو شرک قرار دیتے ہیں اور یہ ان کے عقیدت مند اور تابع فرمان بنتے ہیں۔ ان کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ غیب کی باتیں جانتے ہیں اور خدا کا ارشاد ہے کہ قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ غَيْبٌ كَالْعِلْمِ كَوْنِي غَيْبٌ جَانِتَا وَالْغَيْبُ إِلَّا لِلَّهِ۔ ان سے کہہ دو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو غیب کا علم رکھتا ہو۔ اور مُردوں کی تو حالت یہ ہے کہ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ انہیں اس کا بھی علم نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیات عام مُردوں سے متعلق ہیں، شہیدوں سے متعلق نہیں شہید زندہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان اولیاء اللہ کو شہیدوں کے زمرے میں شامل کر دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے نفس کو مار دیا ہوتا ہے۔ بلکہ ان کا رتبہ شہداء سے بھی بڑھ کر بتایا جاتا ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ

اَوْكُشْتُ دُشْمَنًا اسْت، اِس كُشْتُ دُوسْت

شہداء یعنی مقتولین فی سبیل اللہ کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول زیر آیت (۲/۲۵۵) اور زیر نظر جلد آیت (۲/۲۵۵) پر تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔

اولیاء اللہ کی طرف منسوب کردہ کرامات کے متعلق (معجزات کے ضمن میں) جلد اول آیت (۲/۲۵۵) ص ۳۱ دیکھیے۔

لہ علم غیب کے متعلق اور تو اور خود رسول اللہ سے ارشاد ہے: قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبُ (۲/۲۵۵) ان سے کہہ دو کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم جانتا ہوں! اللہ تعالیٰ آپ کو (اور دوسرے رسولوں کو) جن امور غیب کا علم دینا چاہتا تھا وہ وحی کے ذریعے دے دیتا تھا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت مریم کا قصہ بیان کرنے کے بعد فرمایا: ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ (۲/۲۵۵) یہ غیب کی ان خبروں میں سے ہے جسے اللہ نے تیری طرف وحی کیا ہے۔ چونکہ وحی نبی اکرم کے ساتھ ختم ہو گئی اس لئے اس کے بعد کسی کو غیب کا علم ہونے کا امکان بھی ختم ہو گیا۔ جو غیب کے علم کا دعویٰ کرتا ہے وہ درحقیقت نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔

علاوہ ازیں خود نفس تصوف کے متعلق جلد اول اور جلد دوم میں بھی گفتگو کی جا چکی ہے۔ حوالوں کے لئے دیکھئے انڈکس جسے اسی جلد کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ تصوف کے موضوع پر.... ایک مبسوط کتاب بھی میرے زیر ترتیب ہے۔ اس کے شائع ہونے پر اس کی پوری تاریخ اور حقیقت سامنے آجائے گی۔

(۱)

اولیاء اللہ کے متعلق اس تفصیلی گفتگو کے بعد آئیے آیت زیر نظر (۲۵۷) کی طرف۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اللہ جماعتِ

مومنین کا ولی ہے۔ اس کی اس ولایت کا مقصد کیا ہے۔ وہ کرتا کیا ہے؟

ظلمات سے نور کی طرف

فرمایا: يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ۔ ”وہ انہیں ظلمات سے

نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے۔ ظلمت کا مفہوم مطالب الفرقان جلد اول زیر آیت (۲۵) پر بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا بتایا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو ظلمات (تاریکیوں) سے نور (روشنی) کی طرف لانا کیسے ہے۔ اس کے لئے سورۃ ابراہیم کی پہلی آیت دیکھتے جس میں کہا گیا ہے:-

الْأَنبِيَاءُ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ۔ (۱۳)

خدا نے علیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ یہ صراطِ قوائین ہم نے تیری طرف اس لئے نازل کیا ہے کہ تو اس کے ذریعے

نورِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے (یٰۤاٰیُّهَا النَّبِيُّ) اور ان کے نشوونما دینے والے کے

قانون کے مطابق، انہیں اس کے تجویز کردہ راستے پر ڈال دے جو جلال و جمال اور حسن و قوت کا مالک ہے۔ (۱۳)

یعنی خدا کی کتاب نورِ انسان کو زندگی کی تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اس کتاب

کی صداقت سے انکار کرتے ہیں وہ نورِ انسان کو روشنی سے تاریکی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ وہ اس دنیا میں بھی جہنم کی زندگی گزارتے ہیں اور اگلی دنیا میں بھی۔

نور و ظلمات کی اس کشمکش کی وضاحت کے لئے داستانِ حضرت ابراہیم کا ایک نیا گوشہ سامنے لایا گیا ہے اس

کے لئے اگلا باب ملاحظہ فرمائیے۔



آٹھواں باب

قرآنی نظام ابتدائی مراحل

آیت ۲/۲۵۸ تا ۲/۲۸۴ ختم سورہ بقرہ

- ۱۔ اسوۂ ابراہیمی — ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا ہے ہیں۔
- ۲۔ مردوں کو زندہ کرنے کا طریق۔
- ۳۔ اتفاق فی سبیل اللہ کی تفصیلات، تضمنات، مقاصد اور منتہی۔
- ۴۔ معاشی نظام کی بنیاد — دل کی رضامندی۔
- ۵۔ ربو کی بحث — یہ نظام سرمایہ داری کا دوسرا نام ہے۔
- ۶۔ تجارت اور ربو میں فرق۔
- ۷۔ ربو کا نظام، اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔
- ۸۔ کاروباری معاملات کے لئے تفصیلی ہدایات
- ۹۔ ایمان — خود رسول کو بھی اپنی وحی پر ایمان لانا ہوتا تھا۔
- ۱۰۔ لَا يَكْفِيكَ اللَّهُ قَنْسًا إِلَّا وَسَّعَهَا۔ کا مفہوم
- ۱۱۔ مومنین کی حسین دعائیں۔

اپنے مولا کے حضور

(ختم سورہ بقرہ)

آٹھواں باب

قرآنی نظام کے اہل مراعل

آیات $\frac{2}{258} - \frac{2}{284}$

قرآن کریم نے دو عظیم اشران ہستیوں کی سیرت طیبہ کو جماعتِ مومنین (بلکہ پوری نوع انسان) کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار دیا ہے۔ ایک نبی اکرمؐ (۳۳) اور دوسرے حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت ابراہیمؑ کے ضمن میں صرف انہی کی زندگی کو (اسوہ) قرار نہیں دیا گیا، ان کے ساتھ ان کے متبعین کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ چنانچہ جس آیت میں اس سوہ کا ذکر آیا ہے وہ یوں ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَاءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحَدًّا (۲۵۸)

تمہارے لئے ابراہیمؑ اور اس کے رفقاء کے طرزِ عمل میں نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ انہوں نے اپنی قوم سے علانیہ کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کی تم نے خدا کو چھوڑ کر معبودیت اختیار کر رکھی ہے ان سے سخت بیزار ہیں (۲۵۸-۲۵۹) ہم تمہارے غلط مسلک کا یکسر انکار کرتے ہیں۔ ہم اسے باطل سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر تم میں اور ہم میں ہمیشہ کے لئے دشمنی اور عداوت رہے گی تا آنکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ (اس صورت میں تم ہمارے دینی بھائی ہو

جاؤ گے۔ ۳۱۱ : ۵۸)

آپ دیکھیے۔ اس میں اُسوۂ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ آیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اسوۂ حسنہ اور ان کے رفقاء کی زندگی کو ہمارے لئے اسوہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد آیت (۲۶۰) میں اس حقیقت کو یہ کہہ کر دہرایا گیا ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ یعنی ان سب (حضرت ابراہیمؑ

مع ان کے رفقاء کی زندگی کو ہمارے لئے اسوۂ کہا گیا ہے۔ اسوۂ کے معنی ماڈل کے ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس زندگی کو اللہ تعالیٰ دوسروں کے لئے ماڈل قرار دے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس زندگی کے ضروری خط و خال خود ہی بیان کر دے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ زندگی دوسروں کے لئے ماڈل نہیں بن سکتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان امور کو اپنی کتاب (قرآن مجید) میں واضح طور پر بیان کر دیا۔ اسی طرح نبی اکرم کی حیاتِ طیبہ کو جو ہمارے لئے ماڈل (اسوۂ حسنہ) قرار دیا گیا ہے تو وہ ماڈل بھی قرآن مجید کے آئیم کے اندر محفوظ ہے۔ (تشریح اس نکتہ کی اپنے مقام پر کی جائے گی)۔ یہاں صرف حضرت ابراہیم کی انقلاب انگیز زندگی کے نمایاں خطوط سے بحث کی جائے گی۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، حضرت ابراہیم کی داستانِ حیات کے اس مقام پر ان کے طرزِ عمل کو اسوۂ کہا گیا ہے: **اِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَّوْا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ كُفْرًا بَكُمْ وَ بَدِ اٰیٰتِنَا وَ بَيِّنٰتُكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰی تَوْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحَدَّثَ۔** (پ) جب انہوں نے اپنی پوری کی پوری قوم کو مخاطب کر کے اعلان کیا کہ ہم تم سے اور جن کی تم نے خدا کو چھوڑ کر معبودیت اختیار کر رکھی ہے، ان سے سخت بیزاریں۔ ہم تمہارے غلط مسلک کو کبھی مسترد کرتے ہیں۔ ہم اسے باطل سمجھتے ہیں۔ اس بناء پر تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بغض و عداوت رہے گی تا آنکہ تم خدا سے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ یہ اس قوم کے ساتھ تصادم کی آخری منزل تھی۔ قرآن کریم نے اس سلسلہ میں اس سے پہلے بھی اس انقلاب آفرین زندگی کی دو چار اہم کڑیاں بیان کی ہیں۔ ان میں سے پہلی کڑی وہ ہے جہاں انہوں نے خود اپنے والد سے بر ملا کہدیا کر آپ کس باطل مسلک کی پیروی کر رہے ہیں۔ اسے چھوڑ دیجئے اور حق کے اس مسلک کا اتباع کیجئے جسے خدا نے متین کیا ہے اس واقعہ کی تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم، زیر آیت (۲) ص ۳۴۷ پر بیان کی جا چکی ہے۔ اس اعلان کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ ذہن میں رکھیے کہ یہ کسی عام باپ کو سرزنش کرنے کا واقعہ نہیں تھا۔ آج ہم اس امر کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے کہ قدیم زمانے میں سلطنتوں میں پروہتوں (PRIESTS) کا مقام کیا ہوتا تھا۔ اس کے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ مملکت کا عملاً اقتدار انہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور ان کے سامنے خود بادشاہ کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیم کے والد مملکت کے اسقف اعظم (مہامنتری) تھے اور ان کے بیٹے (حضرت ابراہیم) کو یہ منصب بلند ورثہ میں ملنے والا تھا۔ اس حقیقت کے پیش نظر آپ اندازہ لگا لیجئے کہ حضرت ابراہیم کی اپنے باپ کو اس تنبیہ کا نتیجہ کیا ہو سکتا تھا؟ انہوں نے اس نتیجہ کی پرواہ کئے بغیر انتہائی جرات اور بیباکی سے باپ کو تنبیہ کر دی اور خندہ پیشانی سے اس کا نتیجہ بھگت لیا۔ یعنی نہ صرف اس جاہ و منزلت

اور شان و شوکت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا، بلکہ گھرباز تک کو چھوڑنا پڑا۔

یہ تو پھر اپنے گھر میں اپنے باپ سے تصادم تھا، اگلا قدم خود بادشاہ کے ساتھ ٹکراؤ تھا۔ اور بادشاہ بھی وہ جسے تاریخ نروذ کہہ کر پکارتی ہے۔ اسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

الَّذِي حَاجَّ اِبْرَاهِيْمَ فِي رَبِّهِ اِنَّ اِلٰهَهُ الْمَلِكُ (۲۵۸)

۲۵۸

”کیا تم نے اس شخص کی سرگزشت پر بھی غور کیا جس نے ابراہیمؑ سے اور تو اور خود خدا کے بارے میں بھی

حجت بازی شروع کر دی تھی۔ ایسے کرنے کی اُسے جرأت کیسے ہوئی؟ محض اس لئے

بادشاہ سے مناظرہ کہ وہ اس ملک کا بادشاہ تھا۔ اس نے نشہ حکومت کی بدستی میں اپنے آپ کو مطلق العنان

سمجھ لیا اور اس زعم باطل میں مبتلا ہو گیا کہ اسے حق حاصل ہے کہ جس کے خلاف جی چاہے زبان دمازی کرے۔

حضرت ابراہیمؑ خدا کی طرف سے دعوت دیتے تھے۔ اس نے کہا کہ کون ہے تمہارا رب؟ اِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ

رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ (۲۵۹) حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ میرا رب وہ ہے جس کے قبضہ قدرت میں

زندگی اور موت ہے۔ بات بالکل صاف اور واضح تھی لیکن وہ تو کٹ جتیاں کر رہا تھا۔ کہنے لگا: اِنَّا اُحْيِي وَ

اُمِيتُ (۲۶۰) یعنی اگر اس بات سے کوئی خدا بن سکتا ہے تو مجھے خود مقام الوہیت حاصل ہے۔ میں خود خدا

ہوں کیونکہ میں روز لوگوں کی زندگی اور موت کے فیصلے کرتا ہوں۔ جس کی چاہتا ہوں گردن اڑا دیتا ہوں۔ جسے چاہتا

ہوں بخش دیتا ہوں۔

ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو جواب دیا تھا، اس سے مراد یہ ہو کہ میں جس نظام خداوندی کے قیام کی دعوت

دیتا ہوں، اس کی ایک اہم خصوصیت انسانی جان کا احترام ہوگا۔ اس میں موت اور حیات کے فیصلے خدا کے قانون

کے مطابق ہوں گے، کسی فرد کی مرضی کے مطابق نہیں ہوں گے۔ اس کے جواب میں بادشاہ نے کہا کہ میں کسی ایسے

نظام کو نہیں جانتا۔ میری مملکت میں میرا حکم ہی نظام اور قانون ہے۔ وہ اس زعم باطل میں کیوں مبتلا ہو گیا؟ اس

لئے کہ اِنَّ اِلٰهَهُ الْمَلِكُ اسے حکمرانی کا اقتدار حاصل تھا۔ وہ قوت کے نشہ میں مدہوش تھا۔

حضرت ابراہیمؑ نے فوراً عکس کر لیا کہ یہ شخص حقائق کی طرف سے گریز کی راہ اختیار کر کے اپنی سطح میں رعایا کو محسوس

کی نگاہ فریبیوں میں الجھانا چاہتا ہے۔ اگر کوئی عام مناظرہ ہوتا تو اپنی بات کی سچ میں نظری بحث میں الجھ جاتا اور بادشاہ

کے جواب کی تردید میں دلائل پر دلائل دیئے چلا جاتا تا آنکہ مناظرہ جھگڑے کی نذر ہو کر ختم ہو جاتا۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ

کا مقصد مناظرہ بازی نہیں تھا۔ ان کا مقصد احقاقِ حق تھا۔ اس کے لئے انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا جس کی طرف

خدا کی وحی یہ کہہ کر راہنمائی کرتی ہے کہ: اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ۔ (۲۵۷) ”تم لوگوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف بطریق حکمت و موعظت دعوت دو، اور ان سے نہایت حسن کارانہ انداز سے گفتگو کرو۔“ لہذا وہ (بادشاہ) اگر محسوسات کی طرف آگیا تھا تو حکمت کا تقاضا تھا کہ اس کے سامنے محسوس دلیل پیش کی جاتی۔ اس کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ۔ (۲۵۸) ”میرے خدا کے قانون کے مطابق سورج مشرق کی جانب سے طلوع ہوتا ہے۔ اگر تمہاری مملکت میں تمہارا قانون (یا حکم) چلتا ہے تو سورج کو حکم دو کہ وہ مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو۔“ بات واضح ہو جائے گی کہ خود تمہاری مملکت میں بھی کس کا قانون کا رفرما ہے۔ تمہارا یا میرے خدا کا! فَبِهُتَ الَّذِي كَفَرَ۔ (۲۵۸) یہ دلیل ایسی مسکت اور بدیہی تھی کہ وہ لا جواب ہو گیا لیکن اس کے باوجود اس نے اعتراف حقیقت نہ کیا۔ نشہ حکومت کا پیدا کردہ پندار نفس اعتراف حقیقت کا راستہ روک کر کھڑا ہو جایا کرتا ہے فرعون اور اس کے مصاحبوں کے سلسلہ میں قرآن کریم نے یہی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ: وَبَجَدُوا بِهَا وَاسْتَدْبَرْتُمْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلُمًا وَعُتُوًّا (۲۵۹) ”وہ دل میں تو دعوت حضرت موسیٰؑ کی صداقت کے قائل ہو گئے تھے لیکن ان کا پندار نفس اور نشہ حکومت کی بدستی انہیں اعتراف حقیقت کی اجازت نہیں دیتے تھے اس لئے وہ ظالم و بران اس سے انکار کئے چلے جاتے تھے“ اسی لئے قرآن حکیم نے مندرجہ بالا واقعہ کے آخر میں کہا: وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔ (۲۶۰) ظالمین راہ ہدایت کی طرف نہیں آیا کرتے۔

(۰)

اس کے بعد قرآن کریم سرگزشت خلیلی کی اس کڑی کو سامنے لایا ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کے استفسار پر سمجھایا گیا ہے کہ اقوامِ مردہ کو دوبارہ زندہ کرنے کا طریق کیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس نے بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس واقعہ کو پیش کیا ہے جس میں انہیں بخت نصر کے ہاتھوں تباہی اور قریب سو سالہ غلامانہ زندگی کے بعد حیاتِ تازہ عطا ہوئی تھی۔ اسے مطالب الفرقان کی دوسری جلد میں زیر آیت (۲۶۱) تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔ چونکہ آیت (۲۵۹) بھی وہاں (مع مفهوم) درج کی جا چکی ہے اس لئے اسے یہاں دوبارہ درج کرنے کی ضرورت نہیں۔

۲
۲۵۹

(۰)

اس کے بعد وہ آیت سامنے آتی ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کو بتایا گیا ہے کہ مردہ اقوام کو از مہر نو زندہ کرنے

کا طریق کیا ہے۔ یہ آیت مع اس کے مفہوم اور تشریح کے جلد دوم زیر آیت (۲۵۷) صفحہ ۲ پر درج کی جا چکی ہے۔ لیکن اس میں دو ایک نکات ایسے ہیں جو مزید تشریح طلب ہیں اس لئے اسے یہاں دوبارہ درج کیا جاتا ہے:-

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲۶۰)

ہمارے ہاں اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

ادریا دکر وجب کہا ابراہیمؑ نے اسے پروردگار میرے دکھلا دے مجھ کو کہ کیونکر زندہ کرے گا تو مردے۔ فرمایا۔ کیا تو نے یقین نہیں کیا۔ کہا کیوں نہیں۔ لیکن اس واسطے چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جائے میرے دل کو۔ فرمایا تو پکڑ لے چار جانور اڑنے والے۔ پھر ان کو بلا لے اپنے ساتھ۔ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑہ۔ پھر ان کو بلا۔ چلے آئیں گے تیرے پاس دوڑتے۔ (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن)

اس ترجمہ کی رُو سے پہلی غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے پوچھا یہ تھا کہ ”تو کیونکر مردے زندہ کرے گا؟“ ظاہر ہے کہ (زندہ کرے گا) سے یہی مراد ہو سکتی ہے کہ تو مردوں کو قیامت کے دن کیونکر دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس پر خدا نے پوچھا کہ کیا اس پر تمہارا ایمان نہیں؟ تمہیں اس کا یقین نہیں کہ ہم مردے زندہ کریں گے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ ایمان تو ہے، لیکن میں اپنا اطمینان چاہتا ہوں۔ دل کی تسکین چاہتا ہوں۔

آپ اس جواب کے ان الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجئے کہ ”مجھے اس پر ایمان تو ہے لیکن میرا دل اس سے مطمئن نہیں“ آپ سوچتے کہ جس بات پر دل مطمئن نہ ہو اسے ایمان کہا جاسکتا ہے؟ ایمان تو کہا ہی اسے جاتا ہے جو دل اور دماغ کے پورے اطمینان اور سکون کے بعد لایا جاتے۔ اگر کسی شخص (اور شخص بھی عام نہیں۔ خدا کے ایک جلیل القدر نبی) کی یہ کیفیت ہو کہ وہ خدا سے کہے کہ میرا ایمان تو ہے لیکن مجھے یقین یا اطمینان اسی صورت میں میسر آئے گا جب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں کہ تو واقعی مردوں کو زندہ کر سکتا ہے، تو کیا اس کے ایمان کو (معاذ اللہ) ایمان کہا جائے گا؟ اور اگر ایمان حاصل ہونے کی شرط یہ ہے کہ خدا سچ مچ مردوں کو زندہ کر کے دکھا دے تو پھر اس قسم کا ایمان تو صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کے حصہ میں آیا۔ باقی دنیا کا ایمان بغیر اطمینان اور تسکینِ قلب کے رہ گیا۔

ہمارے مفسرین اور ان کے تتبع میں مترجمین کی دشواری یہ ہے کہ یہ حضرات قرآن کریم کو روایات کے تابع رکھتے

ہیں۔ انہی کی رُو سے قرآن کی تغیر ہوتی ہے اور اسی تغیر پر مبنی ترجمہ کیا جاتا ہے۔ آیہ زیر نظر کی تفسیر میں بخاری میں حسب ذیل

روایت درج ہے :-

حضرت ابراہیم کو شک

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ہم شک کرنے

میں ابراہیمؑ سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں جب انہوں نے کہا کہ اے میرے پروردگار! مجھے دکھا کہ تو مردوں

کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ (بخاری، کتاب التفسیر، اردو ترجمہ جلد سوم ص ۶۸)

بخاری کی شرح فتح الباری میں اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ :-

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) دوسو شیطانی سے ایسا کہا تھا!

آپ سوچئے کہ ان روایات کی رُو سے بات کہاں تک پہنچتی ہے؟ ان کی رُو سے خدا کے ایک جلیل القدر نبی کو اس باب میں شک گزرتا ہے کہ خدا مردوں کو زندہ کر سکتا ہے اور اس کا ایک اور عظیم المرتبت نبی یہ کہتا ہے کہ نحن احق بالشفق من ابراهيم۔ ہم (حضرت) ابراہیمؑ سے بھی زیادہ شک کرنے کے حقدار ہیں! آپ غور کیجئے کہ جس ایمان کے بارے میں ایسے جلیل القدر انبیاء کے ریب و تشکیک کا یہ عالم ہو، تو دوسروں کے ایمان کی کیا کیفیت ہوگی! اور انبیاء بھی وہ جن کی زندگی کو خود خدا نے دنیا بھر کے لئے ماڈل قرار دیا ہے! حضرات انبیاء کرام کا ایمان تو شک و ارتباب کی طوفانی دنیا میں روشنی کے بلند مینار کی طرح روشن اور مستحکم ہوتا ہے جو ہر ڈمگمانے والی کشتی کے مسافروں کے لئے دلیل راہ اور وجہ استقامت بنتا ہے۔ اگر ان کے ایمان کی بھی (معاذ اللہ) یہ کیفیت ہو تو پھر دنیا میں ایمان کہاں تلاش کیا جائے گا؟ اور پھر یہ کچھ اس حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا جا رہا ہے جس نے ابھی بادشاہ وقت کے سامنے کہا تھا کہ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ۔ (۲۵۸)۔ ”میرا رب وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے“ اگر انہیں خدا کے زندہ کرنے کی قدرت پر ایمان نہ ہوتا تو وہ فریقِ مقابل کے سامنے یہ دلیل کس طرح پیش کر سکتے تھے؟

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے اطمینان کی خاطر جس طرح مردوں کو زندہ کر کے دکھایا، اس کی تفصیل بھی روایات کی زبانی سن لیجئے۔ مولانا محمود الحسن (مجموع) کے (مذکورہ صدر) ترجمہ کی تشریح میں حاشیہ پر لکھا ہے :-

حضرت ابراہیمؑ حسب ارشاد الہی چار جانور لائے۔ ایک مور، ایک مرغ، ایک کوا، ایک کبوتر۔ اور چاروں کو اپنے ساتھ ہلایا تاکہ پہچان رہے اور بلانے سے آنے لگیں۔ پھر چاروں کو ذبح کیا پھر ایک پہاڑ پر چاروں کے سر رکھے۔ پہلے بیچ میں کھڑے ہو کر ایک کو پکارا۔ اس کا سراٹھ کر ہوا میں کھڑا ہوا۔ پھر دھڑلا۔ پھر پر لگے۔ پھر اوڑھ اور دوڑتا چلا آیا۔ پھر اسی طرح چاروں آگئے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، چونکہ ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن نے جو کچھ سمجھنا تھا سمجھا جا چکا، اور وہ ہماری کتب روایات اور تفاسیر میں درج ہو چکا ہے، اس لئے ہمارے لئے قطعاً جائز نہیں کہ ہم از خود اس پر غور و فکر کریں۔ ہمارا کام اتنا ہی ہے کہ ہم یہ بتائیں کہ فلاں روایت میں یہ آیا ہے اور فلاں تفسیر میں یہ لکھا ہے۔ اگر یہ حضرات خود قرآن مجید پر غور کرتے تو یہ حقیقت سامنے آ جاتی کہ قرآن کریم میں حیات اور ممات کے الفاظ افراد کی طبعی موت اور زندگی کے لئے ہی نہیں آئے، یہ الفاظ قوموں کی موت اور زندگی کے لئے بھی آئے ہیں۔ (مثلاً، سورہ انفال میں ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ**۔ (۲۶۱)) اے جماعتِ مومنین! تم اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جس سے تمہیں زندگی حاصل ہو۔ غور کیجئے۔ یہاں خطاب **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** سے ہے۔ یعنی ان لوگوں کو مخاطب کیا جا رہا ہے جو طبعی طور پر زندہ ہیں اور ان سے کہا جا رہا ہے کہ تم خدا اور رسول کی آواز پر لبیک کہو جو تمہیں اس چیز کی طرف بلاتی ہے جو تمہیں زندگی عطا کر دے۔ عاف ظاہر ہے کہ یہاں زندگی سے مراد طبعی زندگی نہیں بلکہ عز و شرف کی حیاتِ قلی ہے۔ دوسرے مقام پر... **رَسُولُ اللَّهِ سَعَىٰ كَيْدًا ۖ إِنْ تَسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تَسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ۖ إِنَّ تَسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا**... (۲۶۲)۔ تو مردوں کو نہیں سنا سکتا۔ نہ ہی ان بہروں کو سنا سکتا ہے کہ جب تو ان سے بات کرے تو وہ منہ موڑ کر چل دیں۔ تو تو انہیں ہی سنا سکتا ہے جو بحق و صداقت پر مبنی بات مان لینے پر آمادہ ہوں۔

اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ **لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا**۔ (۲۶۱)۔ تو قرآن کے ذریعے انہی لوگوں کو آگاہ کر سکتا ہے جن میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے اور وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ان آیات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے قوموں کی زندگی اور موت سے کیا مراد ہے! یہی مفہوم زیر نظر آیت میں مردوں سے ہے۔ یعنی مردہ قوم۔ اس قسم کے الفاظ ہم ہر روز اپنے ہاں استعمال کرتے ہیں۔ ”بروقِ مردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا“ وغیرہ۔ حضرت ابراہیم کے سامنے بھی یہی مرحلہ تھا کہ جس مردہ قوم کی طرف وہ مبعوث ہوئے تھے اُسے کس طرح دوبارہ زندہ کیا جائے؟ انہیں اس کا تو یقین تھا کہ مردہ قومیں دوبارہ زندہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن جس طریق سے وہ زندہ ہوتی ہیں وہ اس کے متعلق اپنا اطمینان چاہتے تھے۔ انہوں نے خدا سے کہا تھا کہ مجھے بتا کہ اس قسم کی مردہ قوم کو میں کس طریق سے (کیف) زندہ کروں! اور خدا نے ایک مثال کے ذریعے وہ طریق بتا دیا تھا یعنی عملِ ”تر میل“۔ ان سے کہا گیا تھا کہ انہیں اپنے ساتھ اس طرح مانوس کر دو کہ یہ وحشی انسان جماعتی زندگی کے خوگر ہو جائیں جو مرکز کی

آواز پر کَبَيْدَكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ کہتے ہوئے اُڑ کر آجاتے ہیں۔ ان کی وحشت کا تو یہ عالم تھا کہ خود حضور نبی اکرم کے زمانے میں جب اعراب نئے نئے زیر تربیت آئے تھے تو ان کی کیفیت یہ تھی کہ جمعہ کے اجتماع میں بیٹھے ہیں حضور خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ یعنی انہیں مخاطب کر کے کچھ حقائق سمجھا رہے ہیں۔ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا بِالْفُتْنَاءِ أَلْبَسُوا إِلَيْهَا وَتَرُكُوا قَائِمًا۔ (۶۲) ”اُدھر سے مال تجارت لئے کوئی قافلہ آ نکلتا ہے، یا کسی تماشاگر کی دنگدگی کی آواز کان میں پڑتی ہے تو یہ حضور کو وہیں برسبر منہ پھوڑ کر بھاگ اُٹھتے تھے۔ لیکن جب ان مانوس وحشی پرندوں کی تربیت ہو گئی تو ان میں ایسی قلب مامیت ہو گئی کہ لَا تُلْهِهُمْ تِجَارَةً وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ۔ (۶۳) ”بیع و تجارت کی کوئی کشش انہیں ذکر اللہ سے غافل نہیں کر سکتی تھی۔ یہ تھا وہ طریق تربیت جو حضرت ابراہیمؑ کی درخواست پر انہیں بتایا گیا تھا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ تم نے دیکھا نہیں کہ وحشی پرندوں کو سدھانے والے کیا کرتے ہیں؛ جب ان پرندوں کو پکڑا جاتا ہے تو وہ اڑ جاتے کے لئے بیحد مضطرب و بیتاب ہوتے ہیں۔ وہ مچھڑ مچھڑاتے ہیں۔ قفس کی تیلیاں توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن سدھانے والا انہیں اپنے ساتھ اس طرح مانوس کرتا ہے کہ وہ انہیں جنگل میں آزاد چھوڑ دیتا ہے اور وہ اس کی آواز پر پھڑ پھڑاتے ہوئے اس کے پاس آ جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ حق و صداقت سے دور بھاگنے والی (مردہ) قوموں کو اس طرح اپنے ساتھ مانوس کیا جاتا ہے، تب جا کر انہیں حیات تازہ عطا ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ بڑا صبر آزما اور حوصلہ طلب ہوتا ہے۔ اس قسم کا منصب ہوتا ہے ایک رسول اور اس کے اتباع میں ایک مصلح کا۔ وحشی جانوروں کو سدھانا آسان کام نہیں ہوتا۔

یہ تھا کَيْفَ تَحْيِي الْمَوْتَى کا جواب۔

(۱)

اس آیت جلیلہ میں دو نکات اور بھی غور طلب ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ کہا تھا کہ مجھے ایمان تو ہے لیکن میں اپنا اطمینان چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ ان کا ایمان کس بات پر تھا اور وہ اطمینان کس بات کا چاہتے تھے؟ انہیں ایمان خدا کے قادر مطلق ہونے کا تھا۔ یعنی انہیں اس پر یقین کامل تھا کہ جب خدا نے کہا ہے کہ یہ مردہ قوم زندہ ہو گئی ہے تو یہ یقینی بات ہے۔ اس میں کسی قسم کا شک اور شبہ نہیں۔ لیکن وہ سوچتے تھے کہ جب مجھ سے کہا گیا ہے کہ ان میں زندگی پیدا کروں تو مجھے یقینی طور پر معلوم ہونا چاہیے کہ میں کون سا طریقہ اختیار کروں جس سے یہ مقصد حاصل ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں غلط طریق اختیار کروں جس کی وجہ سے یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے اور اس طرح (میں نہیں لیکن)

دنیا اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ خدا کا وعدہ ہی غلط تھا۔ وہ اس لئے اپنا اطمینان کرنا چاہتے تھے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا جائے وہ بالکل صحیح ہونا چاہیے۔

اس سے یہ اہم نکتہ سامنے آ جاتا ہے کہ خدا کے قوانین (مواعید) تو سب برحق ہیں لیکن ان کا صحیح نتیجہ اسی صورت میں سامنے آ سکتا ہے جب اس منزل تک پہنچنے کے لئے صحیح راستہ اختیار کیا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جو پہلی دعا سکھائی ہے — اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (۱)۔ تو اس سے مراد صحیح طریق عمل کا اختیار کرنا ہے۔ اس کے متعلق اطمینان ہونا ایسا ضروری ہے کہ حضرت ابراہیم جیسے نبی نے خدا کے وعدہ (قانون) پر یقین کامل کے ساتھ صحیح طریق کی طرف راہنمائی کے لئے خدا سے درخواست کی۔ قرآن کریم کے مکمل ضابطہ حیات ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے جہاں زندگی کے بلند مقاصد کا تعین کیا ہے، اس کے ساتھ ہی اس نے ان مقاصد کے حصول کے طریق بھی خود ہی واضح کر دیئے ہیں۔ لہذا قرآن کریم کو ضابطہ حیات تسلیم کرنے والوں کے لئے، نہ مقاصد حیات کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے، نہ ان مقاصد کے حصول کے طریقوں کے متعلق ریب و تشکیک کا امکان اس کتاب عظیم کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ لَا رَيْبَ فِيهِ (۲)۔

دوسرا غور طلب نکتہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے خدا سے اپنا اطمینان چاہا تو خدا نے ایک امر مطلق کی طرح یہ کہہ نہیں ڈانٹ دیا کہ ”جو کچھ ہم نے کہا ہے کیا اس میں تمہیں کوئی شک ہے جو اپنا اطمینان چاہتے ہو؟ ہم نے جو کچھ کہہ دیا ہے تمہیں اسے آنکھیں بند کر کے مان لینا چاہیے؟“ خدا نے ایسا نہیں کہا بلکہ ان کا اطمینان کرادیا قرآن کریم میں جو ہے کہ خدا نے کتاب کے ساتھ حکمت بھی نازل کی ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے جو احکام اور قوانین دیئے ہیں ان کی صداقت کے متعلق اطمینان کرانے کے لئے دلائل و براہین کی رُو سے ان کی غرض و غایت بھی واضح کر دی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ زیر نظر آیت (۳) کے آخر میں کہا گیا ہے: وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ عزیز کے معنی غلبہ اور اقتدار کے مالک کے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ”حکیم“ کے اضافے سے یہ واضح کر دیا ہے کہ خدا کا غلبہ و اقتدار دھاندلی پر مبنی نہیں بلکہ حکمت (REASON) پر مبنی ہے۔ اس لئے اسے دلائل و براہین کی رُو سے سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔ یہی وہ طریق ہے جس سے انسان کو خدا کے ”عزیز“ ہونے پر اطمینان ہو جاتا ہے، یعنی وہ اس کے اقتدار کو ڈر اور خوف کی وجہ سے نہیں تسلیم کرتا بلکہ قلب و دماغ کے کامل اطمینان کے ساتھ تسلیم کرتا ہے

اور اسوۂ ابراہیمؑ یہ ہے کہ انسان اپنے ایمان کے متعلق دلائل و شواہد کی بنا پر اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ان تاریخی شواہد کو پیش کرنے کے بعد جماعتِ مومنین کے سامنے وہ پروگرام لایا گیا جس کی رو سے خود انہیں زندگی کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں نصیب ہونی تھیں۔ اس پروگرام کی آخری کڑی تو وہ ہے جب اس جماعت کو نظامِ خداوندی کی مدافعت کے لئے سربکف میدانِ جنگ میں اترنا پڑا۔ لیکن اس منزل سے پہلے یا اس تک پہنچنے کے لئے اتفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت بتائی گئی اور انہیں سمجھایا گیا کہ اس نظام کے قیام کے لئے جو کچھ وہ آج دیں گے، وہ ان کے ہاتھ سے جاتا نہیں رہے گا۔ نظام قائم ہو جانے کے بعد وہ سو سو گنا زیادہ ہو کر واپس مل جائے گا۔ اسی حقیقت کو کھینچی کی مثال سے سمجھایا گیا کہ یہ مثال نہایت برجستہ اور آسانی سے سمجھ میں آ جانے والی ہے فرمایا:-

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ
أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَعِفُ
لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔ (۲۴۱)

۲
۲۴۱

ان تاریخی شہادت کے بعد پھر اسی مقام کی طرف لوٹ آؤ جہاں سے
نظامِ خداوندی کی تشکیل کی بات شروع ہوئی تھی (یعنی اتفاق فی

اتفاق فی سبیل اللہ

سبیل اللہ کی طرف (۲۴۱)۔ اس نظام کے قیام کے لئے اپنی محنت کی کھائی کو کھلا رکھنا درحقیقت بیج ڈال کر کھیتی اگانا ہے۔ ظاہر بین نگاہیں دیکھتی ہیں کہ بیج کا دانہ مٹی میں مل کر ضائع ہو گیا لیکن کسان کی دُور رس نگاہوں کو نظر آتا ہے کہ اس ایک دانہ سے کس قدر بالیں پیدا ہوں گی اور ہر بال میں کس طرح سینکڑوں دانے ہوں گے اس طرح اللہ کا قانونِ مشیت، ہر اس قوم کو جو اس پر عمل پیرا ہو ایک ایک کے سو سو کر کے دیتا ہے۔ اس لئے کہ خدا کا قانون بڑی فراخیاں اپنے اندر رکھتا ہے اور کبیر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

اتفاق فی سبیل اللہ کی طرف اجمالی اشارہ آیت (۲۴۱) میں کیا گیا تھا۔ اب اس اجمال کی تفصیل سامنے آتی ہے۔ اتفاق کے متعلق تفصیلی بحث جلد اول زیر آیت (۲۴۱) میں آچکی ہے۔ اس میں اتفاق ہی نہیں بلکہ قرآنِ کریم کے معاشی نظام کا بھی ذکر آگیا ہے۔ نیز (جلد اول) زیر آیت (۲۴۱) میں ۲۹۲ اور اسی جلد سوم میں زیر آیت (۲۴۱) بھی گفتگو کی جا چکی ہے۔ ان تفصیلات کی روشنی میں اتفاق سے متعلق آیات جواب زیر نظر آ رہی ہیں، محتاج وضاحت نہیں۔ ان میں البتہ اگر کوئی نیا نکتہ سامنے آئے گا تو اس کی تشریح کر دی جائے گی۔

اس آیت میں لفظ سَبْعَ آیا ہے۔ اس کے بنیادی معنے سات (۷) ہیں لیکن اس کا عام طور پر استعمال "متعدد" یا "اکثر" کے مفہوم کے لئے ہوتا ہے۔ (مثلاً) جس طرح ہم اپنے

سَبْعَ کا مفہوم

ہاں کہتے ہیں کہ ”تمہیں سو بار منع کیا ہے“ ”تمہیں ہزار بار سمجھایا گیا ہے“ ”وہاں لاکھوں آدمی تھے“ تو ایسے مقامات پر سو یا ہزار یا لاکھ کی متعینہ تعداد مقصود نہیں ہوتی۔ مفہوم ان سے متعدد بار یا بکثرت ہوتا ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں جب سَبْع (سات) یا سَبْعُوْنَ (ستر) یا سَبْعُمِائَةِ (سات سو) بولا جائے گا تو اس سے بھی مراد متعدد یا بکثرت ہوگی۔ ان کی گنتی مقصود نہیں ہوگی۔ ان الفاظ کے سلسلہ میں اس مفہوم کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ قرآن کریم میں سَبْع سَمُوٰتِ کے الفاظ متعدد بار آئے ہیں اور ہمارے ہاں ان کا ترجمہ ”سات آسمان“ کیا جاتا ہے۔ جس سے کئی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان الفاظ سے مراد ”متعدد فضائی کرے“ ہے۔ (یہ بحث جلد اول۔ زیر آیت (۲/۲۵۲) میں بھی آچکی ہے)۔

جب اسلامی نظام قائم ہو جاتا ہے تو اس وقت افرادِ معاشرہ نہ کسی کو انفرادی طور پر کچھ دیتے ہیں نہ کسی سے انفرادی طور پر کچھ لیتے۔ اُس وقت سارا معاملہ نظامِ مملکت سے متعلق ہوتا ہے۔ لیکن اس نظام کے قیام تک کے عبوری دور میں محتاج افراد کی امداد ذی استطاعت لوگوں کی طرف سے انفرادی طور پر ہوتی ہے۔ اس میں خیرات، کاشاتبہ پایا جاتا ہے جس کا اثر دینے اور لینے والے ہر دو افراد پر پڑ سکتا ہے۔ دینے والے میں احسان کرنے کا جذبہ جس کا نفیاتی نتیجہ تکبر یا احساسِ برتری ہوتا ہے اور لینے والے میں ممنون احسان ہونے کا جذبہ جس سے احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کریم اس دور کے لئے بھی ایسی ہدایات دیتا ہے جن سے اس قسم کے جذبات پیدا نہ ہوں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :-

الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ تَعَرَّ لَا يَتَّبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا
مَنْ أَوْ لَا أَذَى لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُونَ - (۲/۲۶۲)

جو لوگ نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے جو نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ اپنی کمائی کو کھلا رکھتے ہیں اور اس کے بعد انہیں اس کا خیال تک بھی نہیں آتا کہ اس سے انہوں نے کسی پر احسان کیا ہے۔ اور نہ ہی وہ اس سے دوسروں کے لئے خواہ مخواہ کی مصیبت بن جاتے ہیں (وہ شکرِ تک کے متمنی نہیں ہوتے) (۲/۲۶۲) تو یہ وہ لوگ ہیں جن کی محنتوں کا معاوضہ اور قربانیوں کا صلہ اس نظام کے قیام کی شکل میں بائیں منط مکتبہ کے انہیں نہ کسی خارجی خطرہ کا خوف ہوتا ہے اور نہ داخلی کشمکش یا احتیاج کے خیال سے غمگینی اور افسردگی۔ نہ خوف، نہ حزن۔

کہا یہ گیا ہے کہ اس وقت داد و ستد کا یہ معاملہ انفرادی ہے لیکن اس سے صحیح قرآنی معاشرہ متشکل ہو جائے گا جس سے تم سب ہر قسم کے خطرات و خدشات سے محفوظ و مامون ہو جاؤ گے اور یہ تمہارے موجودہ ایشیا کا بہت بڑا صلہ ہو گا۔ اس ضمن میں کہا۔

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتَّبِعُهَا أَذًى - وَاللَّهُ غَفِيرٌ حَلِيمٌ (۲۶۳)

۲
۲۶۳

جس مالی امداد کے بعد انسان احسان جتا جتا کر دوسروں کے لئے مصیبت بن جائے، اس سے کہیں بہتر ہے کہ صاحب احتیاج کو عمدہ طریق سے جواب دے دیا جائے اور اس طرح اسے اذیت رسی سے محفوظ رکھا جائے۔ یاد رکھو! خدا کا نظام نہ تمہارا محتاج ہے اور نہ ہی ایسا کمزور کہ ذرا ذرا سے دھچکوں سے اس کی بنیادوں میں تزلزل آجائے۔ تم اس کے لئے خوش دلی سے دینا نہیں چاہتے تو نہ دو۔ اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ لیکن کچھ دے کر احترام انسانیت کو تو فراموش نہ کر دو۔

انفاق کا ایک نتیجہ تو تمدنی ہوتا ہے۔ یعنی اس سے ذی احتیاج افراد کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں اور اس لئے معاشرہ کا توازن برقرار رہتا ہے۔ لیکن اس کا دوسرا (اور نہایت اہم) نتیجہ دینے والے کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ یعنی اس سے اس کی ذات (نفس) کی نشوونما ہوتی ہے۔ (دیکھئے آیت ۲۶۴)۔ لیکن اگر اس میں کسی اور جذبہ کی آمیزش (تو ایک طرف ذرا سی آلاش بھی) ہو جائے تو پھر یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ اس سے انفاق کا عمل راہیگاں چلا جاتا ہے۔ فرمایا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِيقًا وَنَسَاءً النَّاسُ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ تَحْتَهُ كَسَبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (۲۶۴)

۲
۲۶۴

اے جماعتِ مومنین! اگر تم نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے کچھ دے کر احسان جتاتے پھرو اور دوسروں کے لئے مصیبت بن جاؤ تو اس سے تمہارا انفاق تعمیری نتائج کے بجائے تخریبی نتائج پیدا کرنے کا موجب بن جائے گا۔ دیکھنا! تم ایسا نہ کرنا۔ یہ کچھ تو وہی کر سکتا ہے جسے قوانینِ خداوندی کی صداقت اور مستقبل کی زندگی پر تو یقین نہ ہو لیکن اس خیال سے کہ میں نے انہی لوگوں میں رہنا ہے اس لئے ان سے بنا کر رکھنا ضروری ہے، اس مد

میں کچھ دیدے۔ اس انفاق کی مثال یوں سمجھ جیسے کسی چٹان پر ذرا سی مٹی جم جائے (اور یوں دکھائی دے کہ وہ بڑی عمدہ زمین ہے جس میں اچھی کھیتی اُگے گی۔ لیکن) جب اس پر بارش کا ایک تیز چھینٹا پڑے تو سب مٹی بہہ جائے اور نیچے چٹان کی چٹان رہ جائے۔ اس طرح (ایک ایک دانہ کا سینکڑوں دانے بننا تو ایک طرف) فصل کاشت کرنے میں جس قدر محنت صرف ہوئی تھی وہ بھی اکارت چلی جاتی ہے۔

یاد رکھو جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان نہ رکھیں اور (محض لوگوں کے دکھاوے کے لئے "نیک کام" کریں تو) ان پر فلاح و سعادت کی راہیں کشادہ نہیں ہوتیں۔ (اعمال کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے ایمان — صحیح مقصد — کا ہونا اشد ضروری ہے)۔

ان کے برعکس۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَشْبِيئًا
مَنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَاتَتْ أُكُلَهَا
ضِعْفَيْنِ فَإِنْ لَمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطُلٌّ ۖ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۲/۲۶۵)

۲
۲۶۵

ان کے برعکس جو لوگ اپنی محنت کی کمائی کو کھلا رکھتے ہیں تاکہ اُسے قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کیا جائے اور اس سے (نوعِ انسانی کی پرورش اور) ان کی اپنی ذات کا استحکام و ثبات ہو جائے، ان کی مثال ایسی ہے کہ کسی اونچی زمین پر (جس تک سیلاب نہ پہنچ سکے) ایک باغ اُگا یا جائے۔ اس پر اگر زور کی بارش ہو تو دو گنا پھل دے اور اگر یوں ہی ہلکی سی پھوار بھی پڑ جائے تو وہ بھی اس کی شادابی کے لئے کافی ہو۔

خدا کا قانونِ مکافات جو علم و بصیرت پر مبنی ہے، ایسے لوگوں کے اعمال کے خوشگوار نتائج مرتب کرتا ہے۔

”مَرْضَاتِ اللَّهِ“ کا مفہوم (اسی جلد میں) زیرِ آیت (۲/۲۶۶) تفصیل سے بتایا جا چکا ہے۔ دوسری بات اس

آیت میں یہ کہی گئی ہے کہ انفاق سے ”تَشْبِيئِ نَفْسٍ“ ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی مقصد

تَشْبِيئِ نَفْسٍ

یا نتیجہ جس کی طرف آیت (۲/۲۶۶) میں ضمناً ارشاد کیا گیا ہے۔ نفس کی بحث جلد دوم۔ زیرِ آیت

(۲/۲۶۷) پر بڑی شرح و بسط سے آچکی ہے۔ اس میں منجملہ دیگر امور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جس طرح انسانی جسم کی

پرورش ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے انسان ”لیتا“ (یعنی اپنے استعمال میں لاتا ہے)۔ اسی طرح اس کی ذات (نفس) کی

نشوونما اس سے ہوتی ہے جو وہ دوسروں کو دیتا ہے۔ اَلَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى۔ (۲/۲۶۷) اسی کو یہاں

تَشْبِيئًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی انفاق سے انسانی ذات میں ثبات و استحکام پیدا ہو جاتا ہے

یہ ہے وہ جذبہ محرک جس سے تو میں، جان مار کر محنت کرتا اور اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لئے رہا باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے۔ قرآن کریم کے معاشی نظام کی عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوتی ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جو مارکس کو نہیں مل رہی تھی۔ (دیکھیے جلد اول ص ۱۱۶) وہ انسانی نفس ہی کا قاتل نہیں تھا تو اسے یہ بنیاد کہاں سے مل سکتی تھی؟ اسی لئے اقبال نے روس کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ :-

ایکمی خواہی نظام عالمی جستم اور اساس محکمے؟

یہ اساس محکم صرف قرآن کریم سے مل سکتی تھی جو اشتراکی نظام کے مدعیوں کے سامنے نہیں۔ اس لئے وہ نظام ناکام رہ گیا۔ کَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ قُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا۔ (۲۴۶)

جس نظام کی بنیاد مستحکم نہ ہو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس سے اگلی آیت میں بیان کر دیا۔ فرمایا:-

أَيُّودٌ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ ثَمَرٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ
فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ۔ (۲۴۶)

ذرا سوچو کہ تم میں سے کوئی شخص بھی اسے پسند کر گیا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو جس میں پانی کی ندیاں رواں ہوں (تاکہ وہ سرسبز و شاداب رہے)، اس میں کثرت سے پھل آئے (اور یوں اس شخص کی اپنی اور اس کی اولاد کی زندگی خوشحالی میں گزرے) لیکن اس کے بعد جب وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے چھوٹے چھوٹے ہوں عین اس وقت جھلسا دینے والی آندھی کا بگولا اٹھے اور سارے باغ کو تباہ کر کے رکھ دے۔ سوچو کہ اس سے اس کا اور اس کی اولاد کا کیا حشر ہوگا؟

(بعینہ یہی حالت ہے ان لوگوں کی جو صرف انفرادی مفاد عاجلہ پر نگاہ رکھتے ہیں اور مستقبل کے متعلق کچھ نہیں سوچتے۔ خدا کا نظام رزق و بیت قائم ہی اس لئے کیا جاتا ہے کہ معاشرہ میں ایسی حالت کبھی نہ پیدا ہونے پائے اور کوئی خاندان کسی وقت بھی اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے)۔

یوں اللہ تعالیٰ مختلف مثالوں سے اپنے قوانین کو وضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر سے کام لو اور سوچو کہ کیا نوع انسان کو محتاجی اور مفلسی اور تباہی و بربادی سے محفوظ رکھنے کے لئے کوئی اور نظام بھی ہو سکتا ہے؟

انشورس

(ضمناً) اس آیت پر غور و فکر سے ایک اور نتیجہ بھی مستنبط ہوتا ہے۔ آج جبکہ قرآن کا معاشی نظام نافذ نہیں، اس قسم کے واقعات آتے دن رونما ہوتے رہتے ہیں کہ ایک شخص کے ذرائع آمدنی (جائیداد، مکان، کارخانہ وغیرہ) کسی حادثہ کی وجہ سے تباہ ہو گئے اور اس طرح یہ مرفدا کمال خاندان نان شبینہ تک کا محتاج ہو گیا۔ یا خاندان کا فرد کاسب وفات پا گیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے در بدر بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ اس قسم کی تباہی سے محفوظ رہنے کے لئے، انشورس کی ایکجیں رائج کی گئی ہیں۔ یہ اسکیمیں قرآن کے معاشی نظام کا بدل تو نہیں ہو سکتیں لیکن موجودہ غیر قرآنی معاشرہ میں یہ بہر حال غنیمت ہیں اور ان سے ضرور فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ — شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اسے ساقی! اسے کون بتائے کہ جن اصولوں کی رو سے آپ اسے حرام قرار دے رہے ہیں وہ قرآن کے معاشی نظام کے اصول ہیں اور جب اور جہاں وہ معاشی نظام ہی قائم نہ ہو وہاں اس کے اصول کس طرح کارفرما ہو سکیں گے! یہ وہ بنیادی غلط نگہی ہے جس کی وجہ سے ہمارے معاشرہ میں بے شمار بھینس پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ باطل کے نظام میں حق کی پیوند کاری ممکن ہی نہیں۔ اس سلسلہ میں جلد دوم میں زیر آیت (۲۵۳) کی بحث پر ایک نظر پھر ڈال لیجئے۔

(۱۰)

اس کے بعد پھر انفاق فی سبیل اللہ کے موضوع کی طرف آجائیے، فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْنِوْا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ (۲۴۶)

لہذا اے جماعتِ مومنین! تم زمین کی پیداوار میں سے بھی، اور اپنی صنعت و حرفت سے بھی جو کچھ کھاؤ اس میں سے بھی بہترین حصہ کو نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے کھلا رکھو۔ اس قسم کا بھولے سے بھی ارادہ نہ کرو کہ اس میں ایسی نکمی چیزیں دے دی جائیں جنہیں تم ان کی اصلی قیمت پر خریدنے کے لئے تیار نہ ہو بلکہ ان میں نقص کی وجہ سے ان کی قیمت کم کر دو۔ یاد رکھو! خدا کا نظام ایسا نہیں کہ وہ بھیک مانگتا پھرے اور تم اس کی جھولی میں بچے کچے کھڑے ڈال دو۔ وہ اس قسم کی خیرات سے بے نیاز اور ہر قسم کی ستائش کا مستزاد ہے۔

(وہ تم سے جو کچھ مانگتا ہے تمہارے فائدے کے لئے مانگتا ہے۔ اپنے لئے نہیں مانگتا۔)

اس آیت میں دو مقامات غور طلب ہیں۔ جیسا کہ آیت (۲۴۶) کے تحت بتایا گیا ہے۔ قرآن کے معاشی نظام کی بحث

اس سے پہلے نہایت تفصیل سے کی جا چکی ہے۔ اس نظام کی رُو سے (۱) زمین پر ذاتی ملکیت کا تصور خلافِ قرآن ہے۔ اور (۲) انسان جو کچھ اپنی محنت سے کمائے، اس میں سے وہ بقدر اپنی ضروریات کے رکھ کر باقی دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے۔ یہاں ان ہر دو ذرائع کی وضاحت ماکسبشہر و مِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ سے کر دی۔ یعنی جو کچھ تم اپنی محنت سے کھاؤ اور جو کچھ زمین سے برآمد ہو۔ زمین سے برآمد ہونے والی اشیاء میں زراعت بھی شامل ہے اور معدنیات وغیرہ (ذخائر ارضی) بھی۔

پھر حَلِيبَاتٌ اور لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ کہہ کر اس کی بھی تاکید کر دی کہ یہ نہ ہو کہ تم اچھی اچھی چیزیں اپنی ضروریات پوری کرنے کے ضمن میں خود رکھ لو اور ناکارہ اور ناقص چیزیں فی سبیل اللہ دیدو۔ جیسا خیرات کے ٹکڑے گدا گروں کی جھولی میں ڈالنے سے کیا جاتا ہے۔ دوسری جگہ اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی کہ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ (۳۱) تم کبھی کشادگی راہ نہیں پاسکتے جب تک تم اپنی محبوب ترین متاع دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کھلی نہ رکھو۔ — جان مار کر محنت کرنا اور اس کے ماحصل میں سے بہترین چیزیں بطیب خاطر دوسروں کے لئے دے دینا یہ ہے کشادہ (عرف عام میں، نیکی) کی راہ! اس کے بعد قرآن کریم بتاتا ہے کہ اس راستے میں کون سی چیز روک بن کر کھڑی ہوگی۔ اس سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ فرمایا۔

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً
مِّنْهُ وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔ (۲۶۸)

اس مقام پر یہ بھی سمجھ لو کہ تمہارے انفرادی مفاد کے خیالات تمہیں یہ کہہ کر ڈرائیں گے کہ اگر تم نے سب کچھ دوسروں کے لئے دے دیا تو تم مفلس اور نادار ہو جاؤ گے۔ کل کو تم پر برا وقت آگیا تو کیا کرو گے؟ اس لئے تم اپنا پیسہ اپنے پاس رکھو۔

”شیطان“ کے متعلق جلد دوم باب اول میں بحث ہو چکی ہے۔ ملخصاً اس سے مراد ہر وہ جذبہ ہے جو انسان کو قوانینِ خداوندی کے اتباع سے روکے۔ ”انفاق فی سبیل اللہ“ (قرآن کے معاشی نظام کی تشکیل و قیام کی راہ) میں سب سے بڑی رکاوٹ انسان کے ذاتی مفاد پرستی کے جذبات ہوتے ہیں۔ یہاں ان سے محتاط رہنے کی تاکید کی گئی ہے لیکن خالی تاکید ہی نہیں۔ ان سے بچنے کا طریق بھی بتایا گیا ہے۔ اور طریق وہ بتایا گیا ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ علم النفس (سائیکالوجی) کی رُو سے، ایک قسم کے جذبات کی روک تھام ان سے متضاد جذبات کی رُو

سے کی جاتی ہے، لیکن قرآن کہتا ہے کہ جذباتی روک، مستحکم اور پائیدار نہیں ہو سکتی۔ محکم اور پائیدار روک وہی ہو سکتی ہے جسے انسانی عقل و فکر (REASONS) کی رو سے سمجھ اور دلائل و براہین کی رو سے اختیار کرے۔

لیکن خود عقل کی بھی تو دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ عقل جو انسانی جذبات کے مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ بنتی ہے (خواہ وہ مقاصد کیسے بھی کیوں نہ ہوں) اور دوسری عقل وہ ہے جو قرآنی روشنی میں منزل مقصود تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ اول الذکر کو اقبالؒ دانش برہانی یا عقل خود ہیں اور ثانی الذکر کو دانش نورانی یا عقل جہاں ہیں سے تعبیر کرتا ہے۔ (تفصیل اس کی جلد اول - آیت (۲/۲۵) پر گزر چکی ہے)۔ اسی عقل کو قرآن ”خیر کثیر“ عطا کرنے والی حکمت کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ وہ عقل ہے جو انسان کے انفرادی مفاد پرستی کے جذبات کا رُخ کلی مفاد انسانیت کی طرف موڑ دیتی ہے۔ فرمایا:۔

وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ - (۲/۲۵)

جو کچھ تم خرچ کرنے کی چیزوں سے خرچ کرتے ہو۔ یا جو کچھ تم (مالی امداد کے علاوہ دیگر امور میں) اپنے اوپر واجب قرار دے لیتے ہو، تو ان میں سے ہر بات خدا کے قانونِ مکافات کی نگاہوں میں ہوتی ہے اور وہی تمہارا مؤید و مددگار ہوتا ہے۔ وہ ان کا حامی و ناصر نہیں ہوتا جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتیں۔

ہمارے ہاں نذر کا لفظ منت ماننے کے معنوں میں آتا ہے (نذر نیاز)۔ اور منت بھی وہ جو اولیاء اللہ کے مزاروں یا بزرگوں کے آستانوں پر مانی جاتے۔ لیکن قرآن کریم نے مومنین کی نذر کا مفہوم کچھ اور بتایا ہے۔ نذر کے لغوی معنی ہیں ہر وہ بات جسے انسان اپنے اوپر واجب قرار دے لے۔ اس آیت میں نذر کا لفظ انفاق کے مقابل آیا ہے۔ انفاق، مال و دولت کے کھلا رکھنے کا نام ہے۔ لیکن معاشرہ میں ایسے لوگ بھی تو ہوتے ہیں جن کے پاس مال و دولت نہیں ہوتا۔ وہ اس کے بجائے دیگر خدمات اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔ انہیں ان کی نذر کہا جائے گا۔ مثلاً سورہ توبہ میں منافقین کے متعلق کہا۔ الَّذِينَ يُلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ (۹)۔ ان لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جماعتِ مومنین میں سے جو صاحبِ استطاعت، اپنے دل کی رضامندی سے نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے مال و دولت صرف کرتے ہیں یہ انہیں ریاکاری کا طعنہ دیتے ہیں۔ اور جو ان (مومنین) میں ایسے ہیں جن کے پاس دینے کے لئے روپیہ پیسہ نہیں ہوتا لیکن وہ اس مقصد کے لئے اپنی محنت پیش کر دیتے ہیں، یعنی مختلف خدمات

سراجام دیتے ہیں، تو یہ منافقین ان کی مفلسی پر ان کی منہسی اڑاتے ہیں؛

یہ خدمات ان کی نذر ہی ہوتی ہیں۔ قبروں اور آستانوں پر نذرین پیش کرنا قرآن کی رو سے حرام ہے کیونکہ یہ مَبَٰ اُھِلّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہ۔ (۵) کے تحت آجاتا ہے۔ (تفصیل اس کی آیت (۱۲۱) کے تحت گزر چکی ہے)۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے قرآنی نظام کی تشکیل تک کے عبوری زمانے میں اتفاق کی دو صورتیں ہوں گی۔ ایک تو اس نظام کی اجتماعی ضروریات کے لئے دیا اور دوسرے حاجت مندوں کی ضروریات پوری کر کے لئے انفرادی طور پر دینا۔ اجتماعی ضروریات کے لئے اتفاق اگر کھلے بندوں بھی ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں کیونکہ اس سے کسی فرد کی عزت نفس مجروح نہیں ہوتی۔ لیکن اگر کسی محتاج کو کھلے بندوں کچھ دیا جائے تو اس سے اس کے پندار کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس لئے اُسے ایسے انداز سے دینا چاہیے کہ ”دایاں ہاتھ دے تو بائیں... کو خبر نہ ہو“ اس کے لئے فرمایا:-

اِنْ تَبَدُّوْا الصَّدَقَاتِ فَاِنْعَمٰہِیْ وَاِنْ تَخْمُوْہَا وَتَوْتُوْہَا الْفُقَرَاءَ فَہُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَیُکْفِرْ عَنْکُمْ مِّنْ سَیِّاَتِکُمْ وَاَللّٰہُ جَمًا تَعْمَلُوْنَ خَیْرًا (۲/۲۷۱)

جو کچھ تم اجتماعی ضروریات کے لئے دیتے ہو اُسے کھلے بندوں دو تو بھی اچھا ہے۔ اور اگر نظام کے ابتدائی مراحل میں اُسے اہل حاجت تک چپکے سے پہنچا دو تو بھی ٹھیک ہے۔ یہ چیزیں ہر صورت میں تمہاری ناہمواریوں اور کمزوریوں کو دور کر دیں گی۔ اور ایسا ضرور ہو کر رہے گا۔ کیونکہ خدا کا قانون مکافات تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔

(ضمناً) مندرجہ بالا آیات میں صدقات کا لفظ بار بار آیا ہے۔ اس کی تشریح ہم آیت (۱۱) کے ضمن میں کر چکے جس میں صدقات صرف کرنے کی مَدَات کی تفصیل دی گئی ہے اور جنہیں ہمارے ہاں غلطی سے مصارف زکوٰۃ کی مَدَات سمجھا جاتا ہے۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ صدقات ان عطیات کو کہا جائے گا جو ہنگامی ضروریات پوری کرنے کے لئے پیش کئے جائیں۔ عطیہ کے لفظ سے مفہوم واضح ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس میں احسان مندی کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔ اگلی آیت میں اس نکتہ کی وضاحت ایک اور انداز میں کر دی گئی ہے۔

صدقات

آپ نے دیکھا کہ اتفاق (یا قرآن کریم کے معاشی نظام) کی بنیاد اس پر ہے کہ یہ سب بطیب خاطر کیا جاتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا جبر یا زبردستی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ محض قانون کے زور پر بھی یہ نظام نہ متشکل کیا جاسکتا ہے نہ قائم رہ سکتا۔ اسی لئے حضور نبی اکرم سے کہا گیا کہ آپ کا فریضہ ان حقائق کو ان لوگوں کے سامنے پیش کر دینا ہے ان کا زبردستی متوانا نہیں۔ آپ کا فریضہ صحیح راستہ دکھا دینا ہے، اس راستے پر چلانا نہیں جسے اس راستے پر چلنا ہو گا وہ اپنی خوشی سے اس پر چلے گا۔ فرمایا:-

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُنْفِقُوا
مِنْ خَيْرٍ فَلَا يُنْفِكُمْ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ وَ
مَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ - (۲/۲۴۶)

اے رسول! تم ان لوگوں کو نظامِ خداوندی کی راہ دکھا دو۔ تمہارے ذمے اتنا ہی ہے۔ انہیں اس راستے پر چلا دینا تمہارے ذمے نہیں (۱/۱۶۱ و ۲/۲۴۶)۔ کسی کا صحیح راستے پر چلنا خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ جس کی رو سے اس نے انسان کو اپنے لئے آپ راستہ منتخب کرنے کا اختیار دے رکھا ہے۔ تم ان لوگوں کو اتنا بتا دو کہ تم جو کچھ بھی اس ضمن میں خرچ کرو گے اس کا فائدہ خود تمہاری اپنی ذات کو ہوگا، بشرطیکہ یہ کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق نظامِ خداوندی کی تشکیل کے لئے خرچ کیا جائے۔ اس کا جذبہ محرک کچھ اور نہ ہو۔ یوں، جو کچھ تم خرچ کر دو گے وہ تمہیں پورا پورا واپس مل جائے گا۔ اس میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوگی۔

اس میں دین (نظامِ خداوندی) کی ایک عظیم حقیقت بیان کی گئی ہے۔ یہ نظام صرف ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہو سکتا ہے جو دل و دماغ کی پوری رضامندی سے اس کی صداقت کے قائل ہوں اور اس پر عمل پیرا ہونا خود اپنے لئے مفید سمجھتے ہوں۔ اس انفاق کے سلسلہ میں جو کہا گیا ہے کہ یہ مرضاتِ اللہ یا لوجہ اللہ ہوگا تو اس سے یہی بتانا مقصود ہے کہ اس میں نہ کسی قسم کا جبر ہے اور نہ ہی اس میں کوئی اور جذبہ کارفرما ہونا چاہیے۔

معاشی نظام کی بنیاد

جسے اس حقیقت پر ایمان ہو کہ اس انفاق سے خود اس کا اپنا بھلا ہوگا۔ اس سے اس کی ذات کا استحکام ہوگا۔ وہی اس پر وگرام پر عمل پیرا ہو سکے گا۔ اگر کوئی شخص اپنے دل کی رضامندی سے اسے اختیار نہ کرنا چاہے تو اور تو اور خود رسول اللہ بھی اسے اس پر کاربند نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کر دیا جہاں کہا کہ: إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ (۲/۲۴۶) ”تو، (اور تو اور) انہیں بھی زبردستی اس راستے پر نہیں چلا سکے گا جن سے تجھے محبت ہے“ اس لئے مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ (۱/۱۶۱)۔ اور یہ ہے عالمگیر معاشی نظام کی وہ بنیاد جو مارکس کو نہیں مل سکی تھی اور جس کے موجود نہ ہونے سے کمیونزم تو ایک طرف اس کی ابتدائی شکل سوشلزم بھی کہیں عملاً کامیاب نہیں ہو سکی۔ ایسے نظامِ قانون کے زور یا حکومت کے ڈنڈے سے نہیں چلا کرتے۔ یہ صرف دلوں کی رضامندی سے چلا کرتے ہیں۔ اسے ایمان کہا جاتا ہے۔

جہاں تک انفاق میں حصہ لینے والوں کا تعلق ہے انہیں کہہ دیا کہ مَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا يُنْفِكُمْ (۲/۲۴۶)

”جو کچھ تم دو گے وہ تمہارے اپنے ہی فائدہ کے لئے ہے۔“ جو کچھ وہ دیتے ہیں اس کے مصرف کے متعلق کہا کہ :-
 لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ
 يَحْسِبُهُمُ انْجَاهًا لِّأَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ
 النَّاسَ اِنْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ (۲۴۳)

یہ بھی یاد رکھو کہ اس روپیہ کو پیشہ در بھیک منگوں پر خرچ نہیں کیا جائے گا۔ یہ ان حقیقی ضرورت مندوں کے لئے ہوگا جو اس نظام کی تشکیل کے سلسلہ میں کہیں اس طرح محصور ہو جائیں کہ وہ نہ وہاں سے کسی اور جگہ جاسکیں اور نہ ہی وہاں رہتے ہوئے اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ ان میں (سیرت کی پختگی کی وجہ سے استغناء کا یہ عالم ہو کہ) نادانانہ ہی سمجھ کہ ان کے پاس بہت کچھ ہے۔ انہیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ البتہ جاننے والے انہیں ان کے چہروں پر نمودار ہونے والے اثرات سے پہچان لیں۔ یہ لوگ پیٹ پیٹ کر مانگنے والے گداگر نہیں ہوتے۔

ان لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تم جو کچھ دو گے اللہ کو اس کا پورا پورا علم ہوگا۔ یعنی اُسے دینے والوں کی نیت کا بھی علم ہوتا ہے اور لینے والوں کی ضروریات کا بھی۔

ایمان، انسان کی سیرت میں کیسا عظیم انقلاب برپا کر دیتا ہے، اس کی ایک ہلکی سی جھلک اس آیت میں سامنے آسکتی ہے۔ مجبوری کا یہ عالم کہ نامساعد حالات کے زرخے اور دشمنوں کے ہجوم میں گھر سے ہوتے ہیں۔ ضروریات زندگی تک سے محروم ہیں۔ لیکن استغناء کی یہ کیفیت کہ اس کا اظہار تک کسی سے نہیں کرتے،
مومنین کا استغناء کہ یہ بھی عزت نفس کے منافی ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اکثر اوقات انسان کے

چہرے کی طبعی علامات اندرونی تقاضوں کی غماز ہو جاتی ہیں۔

دل کا خون آنکھ میں کھینچ آئے تو کیا اس کا علاج

نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہوا!

ضرورت مندوں کا یہ استغناء اور دینے والوں کا یہ عالم کہ :-

شانِ عطار کو تیری عطار کی خبر نہ ہو یوں بھیک دے کہ دستِ دعا کو خبر نہ ہو

اور یہ سب کچھ کہنے کے بعد بتا دیا کہ یہ عبوری دور چند دنوں کی بات ہے۔ اس کے بعد جب یہ نظام قائم ہو جائیگا، تو سب خطرات اور حزن و ملال ختم ہو جائیں گے۔

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ

أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ - (۲۴۴)

اس انداز سے دینے والے وہ لوگ ہیں جو اپنا مال دن رات کھلے مندوں اور حاشی سے اس مقصد کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ انہی کی قربانیوں سے وہ نظام قائم ہوتا ہے جس میں نہ کسی کو کسی قسم کا خوف و خطر رہتا ہے نہ افسردگی اور غمگینی۔

(۱)

قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ اضداد سے اپنے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ اور یہ انداز بڑا بلیغ اور موثر ہوتا ہے۔ غالب کے الفاظ میں :

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

اس نے مندرجہ بالا آیات میں اُس نظام کا نقشہ سامنے رکھ دیا جس کی بنیاد اتفاق پر ہے۔ یعنی انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے۔ اس کے ماحصل میں سے کم از کم اپنی ضروریات کے لئے رکھے اور باقی سب بطریق خاطر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدے۔ اس کے بعد وہ اس نظام کو سامنے لاتا ہے جو اس نظام کی ضد ہے یعنی اس میں (اپنی کمائی کو دوسروں کو دے دینا تو کجا) انسان خود محنت نہیں کرتا اور دوسروں کی محنت کے حاصل کو ان سے چھین لیتا ہے۔ اسے رتبو کہا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں رتبو کا ترجمہ سود (بیاج) کر دیا گیا اور پھر یہ بحثیں چل پڑیں کہ کس قسم کا سود حرام ہے، اور کس

کس قسم کا حلال؟ کسی نے اس نکتہ پر غور کرنے کی زحمت نہ کی کہ قرآن کہتا ہے کہ : فَإِنْ

لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِمَحْرَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ - (۲۴۹)۔ اگر یہ لوگ اسے (رتبو

رتبو کی بحث

کو) ترک کر دینے کے لئے تیار نہیں تو ان سے کہہ دو کہ اسے خدا اور رسول (نظام خداوندی) کی طرف سے اعلان جنگ سمجھو۔ اس سے ظاہر ہے کہ رتبو ایک ایسا جرم ہے جسے نظام خداوندی کے خلاف بغاوت کے مرادف اور اعلان جنگ کا مستوجب قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی مملکت میں معاشی نظام بڑی بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور رتبو ایک ایسا نظام ہے جو اس نظام کی ضد ہے۔ رتبو درحقیقت نظام سرمایہ داری کا دوسرا نام ہے۔

رتبا۔ رتبو (مادہ۔ ر، ب، و) کے معنی زیادہ ہونا، بڑھنا، پھولنا ہیں۔ یہیں سے لفظ رتبو ہے جس

کے بنیادی معنی اصل سے زائد لینا ہیں۔ زمانہ نزول قرآن میں رتبو کی انفرادی شکل رائج تھی۔ یعنی ایک شخص کسی کو روپیہ بطور قرض دیتا تھا اور جب وہ قرض واپس کرتا تھا تو اسے اصل سے کچھ زائد ادا کرنا پڑتا تھا۔ قرآن کریم نے

جب ربو کو حرام قرار دیا تو اس کی (اس زمانے کی) مروجہ شکل کی یہ کہہ کر جڑ کاٹ دی کہ :

وَإِنْ تَبْتِغُمْ فَلَكُمْ رُؤُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ - (۲/۲۴۹)

اگر تم اس سے باز آ جاؤ تو تم صرف اصل زر واپس لے سکتے ہو۔ اس سے نہ تم پر کوئی زیادتی ہوگی نہ مقروض پر۔

یعنی اصل زر سے کچھ بھی زائد لینا ربو تھا۔

اس کے بعد ربو نے ایک معاشی نظام کی شکل اختیار کر لی جس میں ضرورت مند کو قرضہ دے کر اس سے زائد وصول کرنے کے علاوہ ربو (زائد) کی بیسیوں شکلیں وضع ہو گئیں۔ ان تمام شکلوں پر مشتمل وہ نظام ہے جسے نظام سرمایہ داری کہا جاتا ہے۔ لہذا، قرآن کریم نے جو کچھ ربو کے متعلق کہا ہے اس کا اب اطلاق نظام سرمایہ داری پر ہوگا۔

قرآن کے معاشی نظام کے متعلق جو کچھ جلد اول (صفحہ ۲۹۷) اور سابقہ صفحات میں زیر آیت (۲/۲۱۹) کہا گیا ہے اس پر ایک بار پھر نظر ڈالئے۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ وہ معاشی نظام ان ستونوں پر استوار ہوتا ہے :-

۱۔ ذرائع پیداوار، نظام اسلامی کی تحویل میں رہیں۔ لوگوں کی انفرادی ملکیت میں نہ ہوں۔ اسلامی نظام زراعت کا ایسا انتظام کرے جس سے تمام افراد معاشرہ کی غذائی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔

۲۔ بحران کے جو معذور ہوں، ہر فرد معاشرہ محنت سے کمائے۔ اور

۳۔ اس کمائی میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لئے کرباقی سب ذی احتیاج لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے نظام اسلامی کے حوالے کر دے۔

اس سے واضح ہے کہ اس نظام میں فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی کے پاس نہیں رہتی اور جب فاضلہ دولت ہی نہیں رہتی تو اس دولت (سرمایہ) کے معاوضہ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، سرمایہ داری کا نظام ہے جس میں ہر فرد کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قدر جی چاہے دولت حاصل اور جمع کر لے اس میں سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد جس قدر دولت بچے وہ اس کا مالک ہے۔ اسے جس طرح جی چاہے استعمال کرے۔ یہ فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہے جو نظام سرمایہ داری کی جڑ ہے۔

اگر ایک شخص اپنی فاضلہ دولت (مثلاً ایک ہزار روپے) کو بکس میں بند کر کے رکھ چھوڑے تو اس کے بعد بھی وہ ہزار کا مزار ہی رہے گا۔ اس میں ایک روپیہ کا بھی اصفافہ نہیں ہوگا۔ لیکن نظام سرمایہ داری میں ایسی صورتیں پیدا کی جاتی ہیں جن سے یہ فاضلہ دولت بڑھتی رہے مثلاً :-

۱۔ عمومی سطح پر لوگوں کو سودی قرضے دینا۔

۲۔ اس روپے سے زمین خرید کر اُسے مزارعوں کو کاشت کے لئے دے دینا اور پیداوار کا ایک مقررہ حصہ بلا محنت و مشقت ہتھ لینا۔

۳۔ اس سرمایہ سے صنعت (کارخانے) قائم کر لینا۔ ان میں کام کرنے والوں کی محنت سے جو کچھ حاصل ہو۔ اس میں سے کم از کم محنت کشوں کو دینا اور باقی سب خود رکھ لینا۔

۴۔ کسی کے کاروبار میں روپیہ (INVEST) کر کے، منافع کا حصہ دار بن جانا۔

۵۔ ایسا کچھ براہ راست کرنا یا ایسا کرنے والے (بینکوں یا دیگر اقتصادی اداروں میں سرمایہ لگا کر بالواسطہ، روپیہ کماتے چلے جانا۔

آپ نے دیکھا کہ ان (یا ان جیسی دیگر) شکلوں میں معاوضہ محنت کا نہیں ہوتا، سرمایہ کا ہوتا ہے۔ اسے نظام سرمایہ داری یا ربو کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ نظام جس میں — دائرہ این می کارڈ، آں حاصل بُرد — محنت کوئی کرتا ہے، اور اس محنت کا ما حاصل کوئی اور لے جاتا ہے۔ اور اس طرح حاصل کردہ دولت سے وہ مزید ذرائع پیداوار کا مالک بنتا چلا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے ان معاشی اصولوں کو جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے ابدی قوانین قرار دے کر، نظام (سرمایہ داری) کو جو اُس کے نظام کی ضد تھا، حرام قرار دے دیا اور اُسے اسلامی نظام کے خلاف بغاوت کہہ کر پکارا۔ لیکن جب دین کا نظام باقی نہ رہا تو جس طرح مسلمانوں نے باطل کے دیگر نظام اپنے ہاں رائج کر لئے اسی طرح نظام سرمایہ داری کو بھی اپنا لیا، اور قیامت بالائے قیامت کہ اسے عین اسلام قرار دے لیا۔ (مثلاً) مودودی صاحب فرماتے ہیں :-

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے

ہمارا موجودہ شرعی نظام

تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلاحد و نہایت رکھی جاسکتی ہیں۔ روپیہ پیسہ، جانور، استعالیٰ اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر آخر زرعی جائیدادیں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بناء پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا

میلان یہ ہو کہ اس کے حقوق ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جاتے۔ یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حد خاص سے زائد ملکیت کو عملاً بے کار کر دیا جائے۔

(مسئلہ ملکیت زمین ۱۹۵۰ ایڈیشن - ۵۲-۵۳) *

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں :-

جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر وہ جس طرح ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اُسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہ راست خود کرو، اور جس طرح اُس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی کہ تم کسی ایسے کام پر حقوق ملکیت نہیں رکھ سکتے جس کو تم اجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوق ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔ (ایضاً ص ۷۷)

آپ نے دیکھا کہ نظام سرمایہ داری کس انتہائی شکل میں ہمارے ہاں رائج ہے اور اسے کس طرح عین اسلام قرار دیا جاتا ہے۔ اب سود کی صرف ایک ہی شکل حرام سمجھی جاتی ہے۔ یعنی انفرادی قرضہ پر اصل زر سے کچھ زائد لینا یہ سوال بڑی شد و مد سے زیر بحث ہے کہ بنک کا سود حلال ہے یا حرام!

آپ نے دیکھا کہ اسلام کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے۔ بہر حال یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی ہے کہ ربوہ سے قرآن کریم کا مفہوم کیا ہے۔ اس مفہوم کی روشنی میں ربوہ سے متعلق آیات کو دیکھیے۔ سابقہ آیات میں انفاق اور صدقات کی برکات کو سامنے لایا گیا تھا۔ ان کے برعکس ربوہ ہے جس میں ہو بس زر کی وجہ سے انسان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ :-

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ

۱۔ اے شرعی اصطلاح میں مضاربہت کہتے ہیں۔ یعنی (SLEEPING PARTNERSHIP)

۲۔ اے شرعی اصطلاح میں مزارعت کہتے ہیں۔ یعنی نقد پٹہ یا بٹائی پر زمین کاشت کرانا۔

الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ
 اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَاتَّهَىٰ فَلَهُ
 مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ
 فِيهَا خَالِدُونَ (۲/۲۷۵)

ایک طرف تو یہ لوگ ہیں جو اپنا پیٹ کاٹ کر ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں (۲/۲۷۵) اور دوسری
 طرف وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو قرض دیتے ہیں تو ان کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر جتنا دیتے ہیں اُس سے زیادہ
 وصول کرتے ہیں۔ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کی حالت یوں سمجھو جیسے کسی کو سانپ نے ڈس لیا ہو
 اور وہ دیوانہ وار ادھر ادھر بھاگتا پھرے (یعنی ہوس زر ان کے سینے میں آگ لگا دیتی ہے جس سے وہ ہر وقت
 مضطرب و بمقار رہتے ہیں)۔ یہ لوگ اس روش کے جواز میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ربو (روپے پر زیادہ وصول
 کرنا) تجارت کی مثل ہے دونوں میں کچھ فرق نہیں (جس طرح تجارت میں دوکاندار کا ہک سے اپنے اصل زر سے فائدہ
 لینا ہے اسی طرح ربو میں روپیہ دینے والا اپنے اصل سے زیادہ وصول کرتا ہے) یہ ان کی کٹ جھتی ہے۔ تجارت
 میں انسان روپیہ بھی لگاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ محنت بھی کرتا ہے۔ جو کچھ وہ زائد لیتا ہے وہ اس کے روپے کا
 منافع نہیں ہوتا اس کی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے اور یہ جائز ہے۔ اس کے برعکس ربو میں محنت کچھ نہیں کی
 جاتی۔ محض روپے پر منافع لیا جاتا ہے۔ یہ ناجائز ہے (اس ضمن میں اس اصول کو یاد رکھو کہ جائز صرف محنت کا معاوضہ
 ہے (۲/۲۷۵) خالی سرمایہ لگا کر دوسروں کی محنت کا حاصل خود لے لینا جائز نہیں ہے۔ اس کو ربو کہتے ہیں)۔
 سو جس شخص تک خدا کا یہ قانون پہنچ جائے اور وہ اپنی سابقہ روش سے رُک جائے تو جو کچھ وہ پہلے لے چکا
 ہے، لے چکا۔ نظام خداوندی کی رُو سے اس سے گزشتہ کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ لیکن جو اُس سے نہ رُکے یا دوبارہ یہی
 روش اختیار کر لے تو یہ لوگ ہیں جن کی سعی و عمل کی کھیتیاں ٹھہلس جائیں گی اور ان کے لئے اس عذاب سے نکلنے کی کوئی
 صورت نہیں ہوگی۔

اس آیت میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک یہ کہ نظام سرمایہ داری میں انسان کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے گویا اُسے
 ”شیطان“ نے ڈس لیا ہو۔ عربی محاورہ میں شیطان سانپ کو بھی کہتے ہیں جس شخص کو سانپ نے ڈس لیا ہو،
 کرب و اضطراب کے علاوہ اس کی پیاس کی شدت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کتنا ہی پانی پیا جاتے وہ بجھتی ہی
 نہیں۔ یہی کیفیت ہوس زر کے ڈسے ہوئے انسان کی ہوتی ہے۔ وہ کتنی ہی دولت جمع کر لے اس کی ہوس ٹپتی

ہی نہیں بلکہ اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ اَلْهٰكُمُ الشَّكَاوَةُ حَتّٰی ذُرْتُمْ الْمَقَابِرَ۔ (۱۲۲)۔ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دولت نہیں کھاتا ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی ہوس میں دولت کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا ہے۔ اور بھاگتا چلا جاتا ہے۔ تاکہ وہ قبر کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

نظام سرمایہ داری کے مؤیدین کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح تجارت میں اصل زر سے زائد لینا جائز ہے۔ وہی صورت ربو کی ہے۔ قرآن کریم نے اس کا جواب یہ دیا کہ تجارت اور ربو میں بنیادی فرق ہے۔ تجارت میں تاجر سرمایہ بھی لگاتا ہے اور محنت بھی کرتا ہے۔ وہ جو کچھ اپنی لگت سے زیادہ وصول کرتا ہے وہ اس کی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے نہ کہ سرمایہ کا معاوضہ۔ اس کے برعکس ربو میں بغیر محنت کے سرمایہ پر بڑھوتی جاتی ہے۔ لہذا، بیع (یعنی محنت کا معاوضہ) حلال ہے اور ربو (صرف سرمایہ پر زیادتی) حرام ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر تاجر اپنی محنت سے زیادہ نفع لیتا ہے تو وہ ربو کے زمرہ میں آجائے گا اور حرام ہوگا۔ اسلامی مملکت میں اگر کاروبار انفرادی شکل میں رائج ہوگا تو مملکت طے کرے گی کہ

قانون کا اطلاق

کاروباری انسان کی محنت کا معاوضہ کیا ہوگا۔ وہ اس سے زیادہ منافع نہیں لے سکیگا۔ اس آیت میں "فَاَنْتَهٰی فَلَهٗ مَا سَلَفَ" سے ایک اہم قانونی نقطہ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یعنی قانون کا اطلاق اس کی تاریخ نفاذ سے ہوگا۔ اس سے پہلے کے واقعات یا معاملات اس کی زد میں نہیں آئیں گے۔ اس کے بعد قرآن کریم نے ربو اور صدقات میں فرق کر کے بتایا۔ فرمایا:-

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبْوَا وَيَرْبِّی الصَّدَقٰتِ۔ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ کُلَّ

کَفّٰرٍ اَشِیْمٍ۔ (۲/۲۴۹)

۲
۲۴۹

یاد رکھو! ربو جس کے متعلق انسان بظاہر یہ سمجھتا ہے کہ اس سے سرمایہ بڑھتا ہے درحقیقت خود بھی مٹتا ہے اور اس قوم کو بھی مٹا دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیا جاتا ہے اور جس کے متعلق بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سے سرمایہ میں کمی آ جاتی ہے، خود بھی بڑھتا ہے اور اس قوم کے بڑھنے، پھولنے، پھیلنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

ربو سے یہ ذہنیت عام ہو جاتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے سامان زیست کو لوگوں سے چھپا کر رکھا جائے تاکہ وہ اس کے لئے محتاج ہوں اور قرض لینے پر مجبور۔ اور قرض دینے والا ان کی محنت کی کھائی پر عیش اڑائے۔ اس سے انسان کی قوم عمل مغلوب ہو جاتی ہے اور وہ سفر زندگی میں آگے بڑھنے کے قابل نہیں رہتا۔ لہذا نظام سرمایہ داری

کی حامل قوم تباہ و برباد ہو کر رہتی ہے۔

نظام سرمایہ داری میں انسان اپنی دولت کو چھپا کر رکھتا ہے۔ آج کل کی اصلاح میں اسے کالا دھن (BLACK MONEY) کہہ کر پکارتے ہیں۔ عربی لغت میں ایسا کرنے والے کو کفار کہا جائے گا۔ یعنی دولت کو چھپ کر رکھنے والا۔

اس نظام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب انسان محنت کئے بغیر دولت حاصل کرنے کا عادی ہو جائے تو رفتہ رفتہ اس کی قوت عمل (پہلے کمزور اور پھر) زائل ہو جاتی ہے جس شخص کے قومی مضحل ہو جائیں، اسے عربی زبان میں اتم کہا جاتا ہے۔ نظام سرمایہ داری میں پوری کی پوری قوم کی تخلیقی قوتیں مضحل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہودیوں کی مثال ہمارے سامنے ہے جب ربو ان کے معاشرہ کا عام چلن ہو گیا تو وہ دنیا میں کوئی اور کام کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اسی بناء پر کہا کہ ان کی تباہی کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ : **وَآخِذْهُمْ الرَّبُّوْا وَقَدْ فَهُوْا عَنَّهُ وَآكَلْهُمْ اَمْوَالُ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ**۔ (۲/۲۷)۔ ان کے ہاں ربو کا چلن عام ہو گیا تھا حالانکہ (شرعیّت موسوی میں) انہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ لیکن جن لوگوں کو دوسروں کی محنت کی کھائی باطل طریقوں سے غصب کر لینے کی چاٹ لگ جائے، وہ اس سے کب باز آتے ہیں؟

یہاں کہا گیا ہے کہ نظام سرمایہ داری (ربو) میں قومی دولت بڑھتی نہیں، گھٹتی اور رفتہ رفتہ مٹ جاتی ہے۔ سورہ آل عمران کی ایک آیت میں کہا گیا ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَّوْا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ (۳/۱۷۹)

ہمارے ہاں اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے :-

اے ایمان والو! مت کھاؤ سود دو نے پر دونا اور ڈرو اللہ سے تاکہ تمہارا بھلا ہو۔

اور پھر اس سے یہ مسئلہ مستنبط کیا جاتا ہے کہ سود مرکب (COMPOUND INTEREST) حرام ہے، مفرد سود (SIMPLE INTEREST) حرام نہیں ہے۔ امام راغب نے کہا ہے کہ اس آیت میں **مُضَاعَفَةً** دراصل **ضَعْفٌ** سے ہے جس کے معنی کم کرنے کے ہیں۔ **ضَعْفٌ** سے نہیں جس کے معنی بڑھانے کے ہیں۔ لہذا آیت کے یہ معنی ہیں کہ تم جو سمجھ رہے ہو کہ ربو سے سرمایہ بڑھتا ہے، وہ بڑھتا نہیں، درحقیقت گھٹتا ہے۔ اس سے قومی دولت گھٹ جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی شہادت یا ثبوت کی ضرورت نہیں۔ عہد حاضر کے اقتصادیات کے

ماہرین اس باب میں تحقیق و تفتیش کے بعد اسی نتیجے پر پہنچ رہے ہیں۔ یہ آیت (۲/۱۲۹) گویا یَحَقُّ اللّٰهُ الرَّحْلُ (۲/۲۴۴) کی تفسیر ہے۔ اس نکتہ کی مزید تشریح سورہ روم کی آیت ۳۹ میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:-

وَمَا آتَيْتُمْ مِّنْ رَبٍّ بِالْيَرْبُؤِ فِيْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا
اَنْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تَرْيَدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۲/۳۹)

یاد رکھو! جو کچھ تم دوسروں کو اس لئے دو کہ اس کے بدلے میں تمہیں ان کے مال و دولت میں سے اس سے زیادہ ملے جو تم نے انہیں دیا ہے، (تو ہو سکتا ہے کہ اس طرح تمہیں تمہارے حساب کے مطابق کچھ زیادہ مل جائے لیکن)

قانونِ خداوندی کی رو سے اس سے تمہارے مال و دولت میں کچھ اضافہ نہیں ہوگا۔ (یہ تمہیں اس لئے اضافہ نظر آتا ہے کہ تم انفرادی طور پر حساب کرتے ہو۔ اگر تم پوری انسانیت کو سامنے رکھ کر غور کرو تو تم دیکھ لو گے کہ یہ اضافہ نہیں)۔ اس کے برعکس جو کچھ تم اس لئے دو کہ اس سے دوسروں کی نشوونما ہو جائے، اور اس میں تمہیں کسی قسم ذاتی معاوضہ کا خیال نہ ہو، بلکہ یہ تم اس لئے کرو کہ اس سے تمہاری زندگی قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جائیگی،

تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے دیئے ہوئے مال میں فی الحقیقت اضافہ ہوتے ہیں۔ (۲/۲۴۴-۲۴۵-۲۴۶) (۲/۲۴۴-۲۴۵)

اُس دور میں تو معلوم نہیں اس کی شکل کیا ہوگی لیکن ہمارے زمانے میں مضاربیت (یعنی کسی کے کاروبار میں روپیہ لگا کر منافع میں حصہ دار ہو جانا) یا بینک میں روپیہ جمع کر کے اس کا منافع لینا، اسی زمرہ میں آئے گا۔ آپ دیکھیے اس سے کاروباری مشارکت اور کمرشل انٹرسٹ سے متعلق مسائل جن کے سلسلہ میں اس قدر بحثیں چلی ہوئی ہیں، قرآن کے معاشی نظام میں کس طرح حل ہو جاتے ہیں۔

ضمناً آیت (۲/۱۲۹) سے اگلی آیت میں ہے:- وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ اُحْدَثَتْ لِلْكَافِرِيْنَ (۲/۱۲۹)

”مخاطب رہو اس جہنم کی آگ سے جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے“ اس سے ظاہر ہے کہ نظامِ سرمایہ داری، کفر کے مرادف ہے۔ ظاہر ہے کہ جو نظام، نظامِ خداوندی کے خلاف بغاوت ہو (۲/۲۴۶) وہ کفر نہیں تو کیا اسلام ہوگا؟

اس کے بعد وضاحت کر دی کہ اس قسم کا نظام، جماعتِ مومنین کا مسلک نہیں ہو سکتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوْا الزَّكٰوةَ
لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۲۴۴)

خدا پر ایمان رکھنے، اور اس کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پر وگرام پر عمل پیرا رہنے والے، بھلا یا انسانیت سوز نظام کس طرح قائم کر سکتے ہیں؟ وہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں ہر فرد قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے اور

اس طرح نوع انسان کی نشوونما کا سامان فراہم کرتا چلا جائے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کے حسن عمل کا صلہ، نظام ربوبیت کی شکل میں سامنے آتا ہے اور اس طرح انہیں نہ کسی قسم کا خوف لاحق ہوتا ہے، نہ غمگینی ستاتی ہے۔

ان تشریحات اور تصریحات کے بعد وہ قولِ فیصل سامنے لایا گیا جس میں کہا گیا ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ

(۲۴۸-۲۴۹)

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ نردولِ قرآن کے زمانے میں عربوں میں انفرادی سود کا کاروبار عام تھا اور معاشرہ میں لے معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان آیات کی رو سے قرآن کریم نے اسے (اور اس کے ساتھ پورے نظامِ سرمایہ داری کو) حرام قرار دے دیا اور ان سے کہہ دیا کہ جو کچھ تم پہلے لے چکے ہو، لے چکے، لیکن جو کچھ مقروض کے ذمے، سود میں سے بچایا ہے، تمہیں وہ بھی چھوڑنا ہوگا۔ تمہارے مؤمن ہونے کا یہی تقاضا ہے۔ تم صرف اصل زر (رأس المال) واپس لے سکتے ہو۔ اس سے نہ تم پر کچھ زیادتی ہوگی نہ مقروض پر۔

اور اس کے بعد کہا کہ اگر تم اس کاروبار (اور نظام) کو نہیں چھوڑو گے، تو پھر تمہیں اسلامی مملکت کا باغی سمجھا

جائے گا اور یہ نظام تمہارے خلاف اسی طرح جنگ کرے گا جس طرح مملکت کے باغیوں کے خلاف جنگ کی جاتی ہے۔

اسلامی نظام کے خلاف بغاوت

اس مقام پر ایک ثانیہ کے لئے رُکئے اور غور کیجئے کہ اس میں خطابِ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا سے ہے۔ یعنی جماعتِ مؤمنین سے اور ان سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نظامِ سرمایہ داری سے باز نہ آتے تو تمہارے خلاف جنگ کی جاتی۔ اس سے آپ اس جرم کی سنگینی اور اس نظام کے حرام ہونے کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اور اس کے بعد اس حقیقت پر غور کیجئے کہ ہمارے ہاں جو صدیوں سے نظامِ سرمایہ داری رائج چلا آرہا ہے تو قرآن کریم کی رو سے ہماری پولیشن کیا ہے۔ ہم میں یہ نظام (سرمایہ داری) اس لئے رائج رہا کہ ہمارے ہاں مسلمانوں کی سلطنتیں قائم رہیں۔ اسلامی حکومت کہیں بھی قائم نہ ہوئی۔

اوپر کہا گیا ہے کہ جس مقروض کے ذمے تمہارا قرضہ ہے تم اس سے سود کا بچایا نہیں لے سکتے، صرف اصل زر

لے سکتے ہو۔ اس کے بعد دیکھیے کہ قرآن کریم کہاں تک آگے چلا جاتا ہے۔ فرمایا:-

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ

۲
۲۸۰۰

كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ (۲۸۰)

اگر مقروض تنگ دست ہے تو اُسے اتنی مہلت دو کہ وہ قرض بے سہولت ادا کر سکے۔ اور اگر تم اُسے بالکل ہی معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے بہت اچھا ہے بشرطیکہ تم دو برس نگاہ سے دیکھ سکو کہ اس میں کس قدر اجتماعی مفاد مضمر ہیں۔

سود تو ایک طرف، اصل زر کو کبھی چھوڑ دینا بڑا ہمت طلب مرحلہ تھا۔ بالخصوص اُس قوم کے لئے جو صدیوں سے ربوہ کی عادی چلی آرہی تھی۔ اس قسم کی ہمت صرف ایمان کی قوت سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ:-

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ

۲
۲۸۱

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ۔ (۲۸۱)

تم اس دور کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھو جب تمہارے معاملات کے فیصلے قانون خداوندی کی رو سے ہونگے وہ قانون یہ ہے کہ ہر شخص کو صرف اس کی محنت کا معاوضہ ملے گا۔ اور پورا پورا معاوضہ اس میں ذرہ برابر کمی نہیں کی جائے گی۔ کوئی کسی دوسرے کی محنت کا استحصال نہیں کر سکے گا۔ یہ وہ دور ہو گا جب قرآن کا معاشی نظام قائم ہو گا۔

تم سوچو کہ اس وقت تمہاری حالت کیا ہوگی! تم نے جو کچھ دوسروں کی محنت کے استحصال سے غضب کیا ہو گا، اُسے ظلم قرار دیا جائے گا اور یہ تم جانتے ہی ہو کہ عدالت خداوندی میں ظلم کی سزا کیا ہوتی ہے! ابھی وقت ہے کہ تم اپنے آپ کو اس سزا سے بچا لو۔

(۲)

اسلامی نظام کے قیام تک کے عبوری دور میں انفرادی قرضوں کی ضرورت پڑے گی۔ قرآن کریم نے سودی قرضوں کی ممانعت کر دی۔ اگلی آیت میں قرضہ بلا سود کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم نے بجز مستثنیات، اصولی ہدایات ہی دی ہیں۔ ان اصولوں کی جزئیات

خود متعین نہیں کیں۔ انہیں اسلامی مملکت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے **لین دین کے متعلق ہدایات** اپنے زمانے کے حالات کے مطابق یہ جزئیات خود متعین کرے لہٰذا

کے معاملات کی قرآن کے نزدیک کس قدر اہمیت ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے ان کی جزئیات تک کا تعین خود کر دیا ہے اور وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ کہ جس آیت میں ان معاملات سے متعلق احکام دیئے گئے ہیں، وہ اس کتاب ہدایت کی سب سے لمبی آیت ہے۔ اور (جیسا کہ آپ ابھی ابھی دیکھیں گے) اس میں چھوٹی سے چھوٹی فروعی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ کیا یہ بات قابل غور نہیں کہ صلوٰۃ (نماز) جیسے فریضہ کی جزئیات تو اس نے خود متعین نہیں کیں، اور لین دین سے متعلق معاملہ کی اس قدر تفصیلی جزئیات خود متعین کر دی ہیں، چونکہ یہ آیت بڑی لمبی ہے اس لئے ہم اس کے ایک ایک ٹکڑے کو الگ الگ کر کے پیش کرتے ہیں۔ فرمایا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَيْتُمْ بَيِّنَاتٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاصْبِرُوا (۲۸۲)

۲
۲۸۲

اے جماعتِ مومنین! جب تم ایک مدت معینہ کے لئے کسی سے قرضہ کا معاملہ کرو تو اسے ضبطِ تحریر میں لے

آیا کرو۔

اس میں أَجَلٍ مُّسَمًّى (ایک مدت تک) کی تخصیص اس لئے کر دی کہ ذرا آگے چل کر دست بدست تجارتی معاہدے سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

سب سے پہلی بات یہ دیکھئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ لین دین کے معاملہ کو ضبطِ تحریر میں لے آیا کرو۔ یعنی ایسا کرنا فریضہ خداوندی ہے۔ لیکن آپ دیکھئے کہ ہم نے کبھی اس کا احسان تک بھی کیا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے عائد کردہ فریضہ ہے اور ایسا نہ کرنا اس کی معصیت! ہم اجنبی لوگوں سے معاملہ کرتے وقت تو اسے تحریر میں لے آتے ہیں لیکن جہاں ”باہمی تعلقات“ ہوں وہاں تحریر کی بات کرنا، دوسرے کے منہ پر طمانچہ مار دینے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ ان سے تحریری معاملہ نہیں کرتے اور پھر اس کے نتائج بھی بھگتتے ہیں! بلا تحریر لین دین کے معاملات میں آخر الامر جس قدر تنازعات پیدا ہوتے ہیں اور ان سے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے، وہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ (۲۸۲) ”چاہئے کہ کوئی کاتب اس معاملہ کو دیا ننداری کے ساتھ لکھ دے“ غور فرمائیے۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ فریقین میں سے کوئی اسے لکھ لے۔ کہا یہ کہ کوئی تیسرا شخص اسے ضبطِ تحریر میں لاتے۔ اس سے اس تحریر کا موثق ہونا واضح ہے۔

ضمناً۔ قرآن کریم کے خلاف سازش کرنے والوں نے یہ بھی مشہور کر رکھا ہے کہ قرآن رسول اللہ کی زندگی میں لکب کتابی شکل میں مرتب نہیں ہوا تھا۔ اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اُس زمانے میں عربوں میں لکھ پڑھے اشخاص بہت کم تھے۔ آپ سوچیے کہ جس معاشرہ میں عام لین دین کے معاملات کو تحریر میں لانے کا حکم دیا گیا تھا، کیا وہاں

قرآن کریم جیسی اہم دستاویز کو تحریری شکل دینے کے لئے کاتب نہیں مل سکتے تھے؛

وَلَا يَأْتِيكَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ (۲/۲۸۲)۔ جب کسی کاتب کو اس کے

لکھنے کے لئے کہا جاتے تو اُسے چاہیے کہ اس سے انکار نہ کرے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اُسے لکھنے پڑھنے کی استعداد عطا فرمائی ہے تو اُسے چاہیے کہ اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔

یہاں اس نکتہ پر بھی غور کیجیے کہ کاتب نے لکھنا پڑھنا خود سیکھا ہے لیکن کہا یہ گیا ہے کہ کَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُسے سکھایا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ جن باتوں کو انسان خود اپنی سعی و کاوش سے سیکھتا ہے۔ اُسے بھی خدا کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے کیونکہ انسان کو اس کی بنیادی صلاحیت خدا ہی کی عطا کردہ ہوتی ہے۔

وَلِيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلِيَتَّقِيَ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَمْنَحَنَّ مِنْهُ شَيْئًا (۲/۲۸۳)۔ جس نے

قرض لیا ہے وہ اس تحریر کو املا کرائے، اور کاتب کو چاہیے کہ وہ خدا کو حاضر ناظر جان کر، ٹھیک ٹھیک لکھے۔ اس میں اپنی طرف سے کمی بیشی نہ کرے۔

اس احتیاط پر غور کیجیے کہ یہ تحریر قرض لینے والا لکھوائے! قرض دینے والا نہیں۔ فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ (۲/۲۸۴)۔ اگر قرض لینے والا کم عقل سا ہو۔ یا ضعیف ہو۔ یا ایسی تحریر لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو اس کی طرف سے اس کا کوئی کارمختار (دوست یا سرپرست) عدل و انصاف کے مطابق یہ تحریر لکھوادے۔ یہاں بھی دیکھئے۔ ایسی صورت میں بھی قرض دینے والے سے نہیں کہا کہ وہ تحریر لکھوادے۔ قرض لینے والے کے کسی نمائندہ کو اس کی اجازت دی ہے۔ وَاسْتَشْهَدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ (۲/۲۸۵)۔ اور ایسے معاملات کے وقت اپنے میں سے دو مردوں کو بطور گواہ بلا لیا کرو۔

فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى (۲/۲۸۶)۔ اگر کسی وقت دو مرد موجود نہ ہوں تو فریقین کی رضامندی سے، ایک

مرد اور دو عورتیں بطور گواہ بلا لو۔ دو عورتیں اس لئے کہ اگر ایک عورت کو گھبراہٹ وغیرہ کی وجہ سے کہیں مغالطہ ہو جائے۔ یا وہ (CONFUSED) ہو جائے

تو دوسری عورت اسے یاد دلادے۔

یہ وہ آیت ہے جس سے ہمارے ہاں بات کا تنگ نظر بنا لیا گیا ہے۔ مطالب الفرقان جلد دوم، زیر آیت (۲/۲۸۶)

صفحات ۲۵-۱۱ پر بتایا جا چکا ہے کہ ہمارے ہاں کس طرح عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں ناقص العقل، فروتر جنس کا سد تمام برائیوں کی جڑ اور خرابیوں کا سرچشمہ قرار دیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس قوم میں جنسیات (SEX) کا غلبہ ہو، اس کے نزدیک عورت کی حیثیت مردوں کے جنسی جذبہ کی تسکین کے ذریعے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اسی لئے وہ عورت کو مقام انسانیت دینے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے۔ وہ اسے ایک جنس (COMMODITY) تصور کرتے ہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ہمارے ہاں ایک طرف تو عورت کو تمام برائیوں کی جڑ اور جہنم کا کندہ قرار دیا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ ماں کی طرف چونکہ جنسی جذبہ کی نسبت نہیں کی جاسکتی اس لئے اسے ”عورت“ کے زمرہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔ عورت سے ان کی مراد، جنسی جذبہ کی تسکین کا ذریعہ ہی ہوتی ہے۔ اس لئے اسے مقام انسانیت نہیں دیا جاتا۔

عورت کے ناقص العقل ہونے کے ثبوت میں یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ قرآن کریم نے دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کے برابر قرار دیا ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ عورت میں مرد کے مقابلہ میں، ادھی عقل ہوتی ہے۔ اس موضوع پر سیر حاصل بحث، سابقہ (ساتویں) باب میں آیت (۲/۲۸۲) کے تحت آچکی ہے۔ اسے یہاں دہرائے کی ضرورت نہیں۔

(۰)

اب آگے چلئے۔ فرمایا:-

وَلَا يَأْتِ الشَّهَادَةُ إِذَا مَا دُعُوا۔ (۲/۲۸۲) یہ جب گواہوں کو شہادت کے لئے طلب کیا جائے تو انہیں

چاہئے کہ اس سے انکار نہ کریں؛

اس قدر تفصیلات کے بعد پھر اس کی تاکید کی کہ ان معاملات کو ضرور تحریر میں لے آیا کرو

وَلَا تَسْمَعُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلٍ۔ (۲/۲۸۲)۔ قرض متوڑا ہو یا بہت، اس کی میعاد

کے اندر اسے ضبط تحریر میں لانے میں کوتاہی مت کرو۔

اور اس کے بعد اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس کے لئے اس قدر تاکید کیوں کی جا رہی ہے۔ فرمایا:-

ذِكْرُكُمْ أَفْضَلُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا۔ (۲/۲۸۲) یہ چیز قانونِ عدل کے

تقاضا کو پورا کرنے کے زیادہ قریب ہے۔ اس سے شہادت محکم ہو جاتی ہے اور شکوک و شبہات کا بہت کم

امکان رہتا ہے۔

إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتَبُوهَا. وَأَشْهَدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ. (۲۸۳)۔ لیکن اگر تم آپس میں کوئی دست بستہ معاملہ کرو۔ جیسے دکاندار آپس میں کرتے رہتے ہیں اور اسے ضبط تحریر میں نہ لائے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں۔ البتہ ایسی خرید و فروخت کے وقت بھی گواہ ضرور رکھ لیا کرو۔

وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ (۲۸۳)۔ اسے بھی اچھی طرح یاد رکھو کہ کاتب یا گواہ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جائے۔ وہ اسی صورت میں دیانتداری سے یہ فرائض بسر انجام دے سکیں گے کہ انہیں کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہ ہو اور وہ بلا خوف و خطر سچی بات کہہ سکیں۔

وَإِنْ تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيَعْلَمَكُمُ اللَّهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۸۳)۔ اگر تم ایسا کرو گے تو یہ قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ تم ہر معاملہ میں قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان معاملات سے پوری پوری طرح آگاہ کر دیا ہے۔ بتا دیا ہے۔ سمجھا دیا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ انسانی معاملات کو صحیح خطوط پر رکھنے کے لئے کس قسم کی ہدایات کی ضرورت ہے۔

اگلی آیت میں ان ہدایات کی تکمیل کر دی جہاں کہا کہ:-

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنِ مَقْبُوضَةً فَإِنْ أَمِنْ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ فَلْيُؤَدِّ الَّذِي أُؤْتِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ (۲۸۳)

۲
۲۸۳

اگر تم حالتِ سفر میں ہو اور تمہیں کاتب نہ مل سکے تو قرض لینے والے کی کوئی چیز بطور ضمانت اپنے پاس رکھ لو۔ اور اگر تم ایک دوسرے پر اعتماد کرو تو جس شخص پر اعتماد کیا گیا ہے اُسے چاہیے کہ اس امانت کو اپوری پوری دیانت سے (واپس کر دے اور اس طرح اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی نگہداشت کرے۔

اور تم شہادت کو کبھی نہ چھپاؤ۔ جو ایسا کرتا ہے (تو اگر لوگوں کو اس کا پتہ نہ بھی چلے اور وہ ان میں معتبر بنا رہے

پھر بھی) اس کا دل عزو مجرم ہوتا ہے اور اس کی ذات کی نشوونما کی قوتیں مضحمل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس لئے کہ

خدا کے قانونِ مکانات سے تو کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ اسے ہر بات کا علم ہوتا ہے۔

آپ نے رہنِ باقبضہ کے الفاظ اکثر سنے ہوں گے۔ آپ نے کسی شخص کو ایک ہزار روپیہ بطور قرض دیا۔ اس قرض پر

رہن با قبضہ (از روئے شریعت) سود لینا تو حرام ہے۔ آپ اس مفروض کی زمین رہن رکھ لیتے ہیں اور اس کی آمدنی شیرِ مادر کی طرح ہضم کرتے رہتے ہیں، کیونکہ شریعت نے فتویٰ دے رکھا ہے کہ مرہونہ جائیداد یا زمین کی آمدنی لے لینا حلال و طیب ہے۔ اگر آپ اس مفروض سے سود لیتے تو وہ پچاس سو روپے سالانہ سے زیادہ نہ ہوتا۔ اسے تو حرام قرار دیا جاتا ہے لیکن آپ اس کی مرہونہ اراضی سے ہزار پان سو روپے سالانہ تک کی آمدنی ہڑپ کر جاتے ہیں اور کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ یا تعجب! آیت میں مفروض کی کسی شے کو ”بطور امانت“ اپنے پاس رکھ لینے کی اجازت دی گئی ہے اور وہ بھی اس صورت میں اور اس وقت تک کہ معاملہ کو تحریر میں نہ لایا جاسکے۔

(۰)

اس آیت میں کتمانِ شہادت (شہادت چھپانے) کا نتیجہ یہ بتایا کہ **اِثْمٌ قَلْبُہٗ**۔ اِثْمٌ کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی صلاحتوں یا قوتوں کا مضلل ہو جانا ہوتے ہیں۔ شہادت چھپانے والے کے دل میں جو کھٹک رہتی ہے کہ اگر راز افشا ہو گیا تو کس قدر رسوائی (اور بعض حالات میں عقوبت) ہوگی اس سے اس کی جراتیں مفلوج اور بیباکیاں مغلوب ہو جاتی ہیں۔ اور یہی اِثْمٌ قَلْبُ ہے۔

(۰)

ہدایات کی تکمیل ہو گئی اور سورہ بقرہ بھی اپنے اختتام تک پہنچنے کے قریب آگئی۔ جس طرح قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ ہر آیت کے آخر میں ایسے الفاظ (بالعموم صفاتِ خداوندی) لاتا ہے جن سے اس آیت کے مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے، اسی طرح وہ ہر سورہ کے آخر میں ایسی آیات لاتا ہے جن میں اس سورہ کے مقاصد سمٹ کر آ جاتے ہیں۔ سورہ بقرہ کی آخری تین آیات میں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ فرمایا:-

لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ (۲۸۴) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (یعنی جملہ کائنات) میں جو کچھ ہے خدا کے مقرر کردہ مقاصد کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہے؛ کائنات اور اس میں کار فرما قوتوں (ملائکہ) کے متعلق جلد دوم، آیات (۲۸۵-۲۸۶) میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔ ان مقاصد میں جن کی تکمیل کے لئے کائناتی قوتیں مصروف کار رہتی ہیں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ **خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلَیُّجْزِیْ کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ وَہُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ۔ (۲۸۷)** خدا نے ارض و سما کو باحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی

ذہو“ اس سے ظاہر ہے کہ کارگر کائنات کے سرگرم عمل رہنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خدا کا قانونِ مکافات نتیجہ خیز ہو۔ یہ کس طرح سے ہوتا ہے، ہم نہیں جانتے۔ ہو سکتا ہے کہ انسانی علم مزید ترقی کرے تو

قانونِ مکافات

رموزِ فطرت کا یہ گوشہ بھی بے نقاب ہو جائے۔ لیکن اتنا تو ہمارا مشاہدہ (اور تاریخ کی مسد شہادت) ہے کہ ظالم اور مستبد فراعندہ کو ان کے اعمال کی سزا ایسی راہوں سے ملتی ہے جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔ فَاتَّهَمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ۔ (۳۳) ”ان پر کبھی ایسی مقامات سے آتی جو ان کے حیطہ شعور میں بھی نہیں تھے۔ اسی (قانونِ مکافات کی) طرف توجہ منصف کرنے کے لئے کہا: وَإِنْ شُبِّدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تَخَفَوْهُ لِيَجْازِبَكُمْ بِهِ اللَّهُ۔ (۲۸۸) ”جو کچھ تمہارے دل میں ہے وہ عملی شکل اختیار کر کے محسوس طور پر سامنے آجائے یا وہ تمہارے ارادے اور آرزو ہی کی منزل میں رہے، ان سب کا شمار تمہارے اعمال میں ہوتا ہے جن کا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا“ (قانونِ مکافاتِ عمل کے متعلق مختلف مقامات پر بحث ہو چکی ہے۔ بالخصوص دیکھیے جلد دوم آیت (۲۸۸) ص ۲۳۔

فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (۲۸۸) غلط اور صحیح راستے متمیز ہو کر تمہارے سامنے آچکے ہیں اور ان پر چلنے کے نتائج کی بھی وضاحت ہو چکی ہے۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے وہ راستہ اختیار کر لے جو اُسے تباہیوں کی طرف لے جائے جس کا جی چاہے تباہیوں سے محفوظ رہنے والی راہ اختیار کر لے۔ خدا نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں جن پر اُسے پورا پورا کنٹرول ہے۔ ان ہی پیمانوں کو قانونِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ انہی پیمانوں کی رُو سے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایک فرد سے جو عمل سرزد ہوا ہے اس میں وہ کس حد تک صاحبِ اختیار تھا، اور کس حد تک (شعوری یا غیر شعوری طور پر) مجبور۔ اعمال کے نتائج اسکے اختیار و ارادے کی نسبت سے مرتب ہوتے ہیں۔

خدا نے اپنے ان قوانین کا علم اس وحی کی رُو سے دے دیا ہے جو اس رسولؐ پر نازل ہوتی ہے۔ اَمَّا

الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ۔ (۲۸۸) ”رسولؐ اور جماعتِ مومنین

ان صداقتوں پر ایمان لاتے ہیں جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی رسولؐ پر نازل ہوتی ہیں“

۲
۲۸۵

بہاں ایک اہم نکتہ قابلِ غور ہے۔ کہا کہ رسولؐ پر جو وحی نازل ہوتی ہے پہلے وہ خود اس کی صداقت پر ایمان لانا

ہے۔ اس سے ایک بات یہ واضح ہو جاتی ہے کہ وہ وحی، رسولؐ کی اپنی فکری

تخلیق نہیں ہوتی۔ کسی مفکر کے لئے اس کی اپنی فکری تخلیق پر ایمان لانے کا

خود رسولؐ کا ایمان لانا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اُسے بالکل سچی اور صحیح سمجھتا ہے۔ ایمان لانے لیا نہ لانے کا سوال ان امور کے متعلق پیدا ہوتا ہے جو کسی کو خارج سے ملیں۔ رسول کو وحی خارج سے ملتی ہے۔ اس میں اس کی اپنی فکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ اس وحی کی صداقت پر اسی طرح ایمان لاتا ہے جس طرح دوسرے انسان۔ کیونکہ وہ حقیقت (وحی) ان کی بھی فکری تخلیق نہیں ہوتی۔ اسی لئے کہا کہ **اَمَّنَ الرَّسُولُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ**۔ رسول اور باقی مومن سب اس منزل من اللہ وحی پر ایمان لاتے ہیں۔ رسول سے تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اس ایمان کا اعلان بھی کرے۔ **قُلْ اَمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ**۔ (۲۴۱)۔ اے رسول! تم کہو کہ میں خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب پر ایمان لایا ہوں۔ ایمان کے متعلق قرآن کریم نے واضح کر دیا ہے کہ وہ صداقت اور حقیقت کو غور و فکر کے بعد تسلیم کرنے کا نام ہے۔ (۲۴۲)۔ اس سے واضح ہے کہ رسول بھی خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی پر غور و فکر

کرنا تھا اور یہی مسلک مومنین کا بھی تھا۔ اس سے آپ سوچ لیجئے کہ ہمارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا فُتْرَ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ سَلٰمٌ (۲۴۸)

یہ سب ایمان لاتے ہیں اللہ پر، ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ اور ان رسولوں میں بحیثیت رسالت کوئی تفریق نہیں کرتے۔ (اس کے متعلق اسی جلد میں آیت (۲۴۸) کے تحت گفتگو کی جا چکی ہے)۔ **وَقَالُوا سَمِعْنَا وَاطَعْنَا عَفْرَانَكَ رَبَّنَا وَالْيَاكُ الْمَصِيْرُ**۔ (۲۴۹)۔ وحی کی صداقتوں پر ایمان لانے سے معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ ایمان لانے والے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہی راستہ صحیح ہے۔ اس یقین کے بعد اسے اس راستے پر چلنا بھی ہوتا ہے۔ جو چلتا ہے وہ منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ جو چلتا ہی نہیں اس کا اس راستے کو صحیح سمجھنا اُسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

قرآن کریم میں **سَمِعْنَا وَاطَعْنَا** کے الفاظ متعدد مقامات پر آئے ہیں۔ **سَمِعْنَا** کے معنی ہیں احکام خداوندی

کا دل کے کانوں سے سُن کر انہیں اچھی طرح سمجھ لینا۔ اور **اطَعْنَا** کے معنی یہ ہیں کہ سمجھنے کے بعد

اطاعت ان کے مطابق عمل کرنا۔ گویا انسانیت کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے تین شرائط لاینفک ہیں۔

وحی کی رو سے عطا شدہ رہنمائی کی صداقت پر غور و فکر کے بعد یقین کرنا (ایمان)۔ پھر ان صداقتوں پر مبنی احکام کا اچھی طرح سمجھ لینا۔ اور سمجھنے کے بعد ان کے مطابق عمل کرنا۔ اس سے انسان منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

اس کے بعد بتایا کہ ان احکام کی اطاعت سے مقصد کیا ہے! فرمایا:-

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا۔ (۲۸۶)

۲
۲۸۶

یہ الفاظ اس مقام پر بھی آئے ہیں اور اس کے علاوہ دیگر چند ایک مقامات پر بھی (مثلاً ۲۳۳ ذ ۱۵۳ ذ ۶۴ ذ ۲۳ ذ ۶۲ ذ)۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ خدا کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ مکلف (ذمہ دار) نہیں ٹھہراتا۔ بات بڑی واضح ہے لیکن بہانہ جو اس سے بڑا غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کسی لاکھوں پتی کے پاس آپ ایک فلاحی کام کیلئے عطیہ لینے جاتے ہیں۔ وہ آپ کو دس روپے دے دیتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہمیں تو آپ سے بہت زیادہ کی توقع تھی اس پر وہ کہتا ہے کہ میری وسعت اتنی ہی ہے اور خدا کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کام مکلف نہیں ٹھہراتا، اسلئے آپ زیادہ کے لئے اصرار نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی روش منسلک خداوندی

ذمہ داری بقدر وسعت

کے خلاف خود فریبی یا ابلہ فریبی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یا تو مختلف وسعتوں کی مطابق خود ہی احکام دے دیئے ہیں۔ مثلاً روزوں کے احکام کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ حکم یہ تھا کہ مہینہ بھر کے روزے پورے کئے جائیں۔ مریض اور مسافر بعد میں گنتی پوری کر لیں۔ اور اس کے بعد فرمایا: وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مَسْكِينٍ۔ (۲۱۷ ذ ۱۸۸ ذ) جو لوگ بمشقت روزہ نباہ سکتے ہوں وہ روزے کے بجائے کسی مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ یہ ہے علی قدر وسعت مکلف ٹھہرانے کی ایک مثال۔ یا (مثلاً) مناسک حج کے سلسلہ میں حجامت نہ بنوانے کا حکم دیا۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر کوئی مریض ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو وہ اس کے بدلے میں روزے رکھ لے، یا کوئی عطیہ دیدے، یا کوئی اور عمل خیر کرے جسے وہ اپنے اوپر واجب قرار دے لے (۲۱۷ ذ) آپ نے دیکھا کہ یہ تمام رعایتیں اس اصول کی تفسیر ہیں کہ ذمہ داری بقدر وسعت ہوتی ہے۔ اسی طرح قتل مومن بالخطا کے فدیہ کے طور پر ایک غلام آزاد کرنے کا حکم دیا اور اس کے بعد کہا جسے اس کی توفیق نہ ہو وہ دو ماہ کے روزے رکھے (۲۱۷ ذ) یہ متبادل فدیہ بھی وسعت کے پیش نظر تجویز کیا گیا ہے۔ اس قسم کی مزید مثالوں کے لئے (۲۱۷ ذ ۲۱۷ ذ) دیکھیے۔ ان مقامات میں اللہ تعالیٰ نے علی قدر وسعت خود ہی متبادل احکام دے دیئے ہیں۔ یا مثلاً معاملہ عدالت میں جائے تو اسے اس کا اختیار دے دینا کہ وہ فریق متعلقہ کی وسعت کو مد نظر رکھتے ہوئے فیصلہ کرے۔ آیت (۲۱۷ ذ) سے یہی متبادر ہوتا ہے۔ لیکن ان الفاظ (لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا) کا ایک مفہم اور بھی ہے جو اس سے وسیع تر اور عمیق تر

ہے۔ دنیاوی حکومتوں میں قانون کے نفاذ سے مقصد افراد معاشرہ کی آزادی پر

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا

پابندی عائد کرنا ہوتا ہے۔ جو احکام خدا نے صادر کئے ہیں وہ بھی پابندیاں عائد کرتے ہیں لیکن (قرآن کہتا ہے کہ) ان پابندیوں سے مقصد تمہاری آزادی کو سلب کرنا نہیں بلکہ اس میں اور وسعت پیدا کرنا

ہے۔ خدا کی طرف سے صادر کردہ احکام سے مقصد نفسِ انسانی کے اختیار میں اور وسعتیں پیدا کرنا ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ نہروں میں مختلف مقامات پر ٹھوکریں (FALLS) بنادی جاتی ہیں۔ سطحِ بین نگاہیں یہ سمجھیں گی کہ ان رکاوٹوں سے مقصد نہر کی روانی کو روکنا ہے۔ لیکن دیدہ ور یہ جانتے ہیں کہ ان رکاوٹوں سے مقصد نہر کی روانی کی رفتار کو اور تیز کرنا ہوتا ہے (DISCIPLINED LIFE) سے انسانی صلاحیتوں میں وسعت اور توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے فرد کی ذات بھی متوازی (BALANCED) ہو جاتی ہے اور معاشرہ بھی متوازن۔ اور اس کا بہ نسبت مجموعی نتیجہ، کاروانِ انسانیت کی ترقی کی راہوں میں کشادہ پیدا ہونا ہے۔

یہ ہے مفہوم لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا کا۔ اقبال کے الفاظ میں۔

می شود از جبر پیدا اختیار!

اور اسکی وضاحت آیت کے اگلے ٹکڑے نے کر دی جہاں کہا کہ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۱۱۴) اس کا عمومی مفہوم تو یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کئے کا پھل پائے گا۔ جو جیسا کریگا ویسا بھرے گا۔ لیکن یہ قرآن ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ غور و فکر کا متقاضی ہوتا ہے۔ لہٰذا میں (ل) سے مفہوم فائدہ یا نفع ہے اور علیہا میں (علی) کے معنی نقصان یا تخریب ہیں۔ اتنے سے فرق سے معانی یہ ہو گئے کہ صحیح کام کا فائدہ بھی کام کرنے والے کو ہوگا اور غلط کام کا نقصان بھی اسی کو۔ یہ قانون مکافاتِ عمل کا بنیادی اصول ہے۔

لیکن بات اس سے بھی آگے جاتی ہے۔ کَسَبَ (مادہ ک۔ س۔ ب) کے بنیادی معنی جمع کرنے کے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ کمائی کرنے، کچھ حاصل کرنے، یا محض کچھ کرنے کے معانی میں بھی استعمال ہونے لگا لیکن عربی زبان میں مختلف ابواب ہوتے ہیں اور ایک ہی مادہ کے باب بدلنے سے معانی میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ اس آیت میں دیکھیے۔

کَسَبَ اور اِکْتَسَبَ میں فرق

لَهَا کے ساتھ کَسَبَتْ آیا ہے اور عَلَیْهَا کے ساتھ اِکْتَسَبَتْ۔ کَسَبَ اور اِکْتَسَبَ میں باب کا فرق ہے اور اسی فرق سے انکے معانی میں بھی فرق آگیا ہے۔ کَسَبَ کے معنی ہوتے ہیں ایسا کام کرنا جس میں اپنا بھی فائدہ ہو اور اس کیساتھ دوسروں کا بھی فائدہ۔ اور اِکْتَسَبَ کے معنی ہوتے ہیں ایسا کام جو محض اپنے فائدے کے لئے کیا جاتے۔ اب آیت کے معنی یہ ہو گئے کہ جو شخص اس لئے کمائی کرتا ہے کہ اس سے اُسے بھی فائدہ پہنچے اور دوسرے لوگوں کو بھی تو یہ وہ کارِ خیر ہے جس کا اُسے نہایت منفعت بخش صلہ ملیگا اور جو شخص محض اپنے فائدے کیلئے کچھ کرتا ہے دوسروں کا کوئی خیال نہیں کرتا تو ایسی روش زندگی کا انجام نقصانِ رسانیاتباہ کن ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم کے ایک ایک لفظ کے اندر کیسے کیسے حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اسلئے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ سے اس حقیقت کی وضاحت کر دی کہ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمَا لِي بِهِمْ عِلْمٌ بقائے دوام اسی عمل کے لئے ہے

جو عالمگیر انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو۔

اس کے بعد کہا کہ جماعتِ مومنین ان اصولوں کو سامنے رکھ کر آمادہٴ عمل ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے آدم (آدمی) کا سب سے پہلا تعارف یہ

کہہ کر کرایا تھا کہ وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلِ قَنُوسَىٰ وَلَمْ نُحِبِّ لَهُ عِزْمًا (۱۵۶) ”ہم نے آدم کو ایک حکم دیا تھا لیکن وہ اسے بھول گیا۔ اس سے بھول ہو گئی“ (ضمناً) انسان میں نسیان کی وجہ قرآن نے بتائی ہے وہ

نسیانِ عزم کی کمزوری

ایک عظیم نفسیاتی حقیقت کا تبیان ہے۔ کہا کہ یہ اس کے عزم کی ناپختگی کا نتیجہ تھا۔ اگر عزم بچتا ہو تو انسان اپنے مقصد یا منزل کو بھولتا نہیں۔ یہ عزم کی ناپختگی ہے جس سے خیال کسی دوسری طرف ہٹ جاتا ہے اور انسان اصل مقصد بھول جاتا ہے۔ (بہر حال) آدم سے بھول ہو گئی لیکن جب اس کا احساس ہوا تو اس نے فوراً اپنی غلطی پر اظہارِ ندامت کیا اور آئندہ سے محتاط رہنے کا اقرار۔ قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۱۵۷)۔ انہوں نے کہا کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! اس عہدِ فراموشی سے ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ اگر تو ہمیں اس کے خیر ہی نتائج سے محفوظ رکھ کر ہماری نشوونما کا سامان ہم نہیں پہنچا سکتا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ اگر تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور تم نے اس کی ذمہ داری قبول کر لی ہے تو تمہاری باز آفرینی کا امکان ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ فَاِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۱۵۸)۔ تم میرے ضابطہ ہدایت کا اتباع کرو۔ اس سے اس نقصان کا ازالہ ہو جائیگا جو تمہارے سہو و خطا سے تمہیں پہنچ سکتا تھا۔ تفصیل جلد دوم زیر آیت (۱۵۸) ص ۱۳۳ پر گزر چکی ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے زیر نظر آیت میں مومنین کے دل سے ابھر کر لب پر آنے والی آرزوؤں اور التجاؤں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

کہ: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَسِينَا اَوْ اَخْطَاْنَا (۱۵۹) ”اے ہمارے نشوونما دینے والے! اگر ہم سے بھول چکے ہو جائے تو اس پر ہماری فوری گرفت نہ ہو جائے۔ ہمیں مہلت دی جائے کہ ہم اس غلطی کا ازالہ کر لیں۔“ (اسی کو توبہ

مومنین کی دعائیں

کہتے ہیں جس کے متعلق جلد اول زیر آیت (۱۶۰) جلد دوم زیر آیت (۱۶۱) پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے، اگر ہمیں اس کے ازالہ کیلئے مہلت نہ ملی تو ہمارا حشر بھی وہی ہوگا جو ہم سے پہلے تباہ ہونے والی قوموں کا ہوا تھا، ہمیں اس سے بچا لے۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اَصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا (۱۶۰)۔ وہ قومیں اپنے جرائم کی وجہ سے ایسے بوجھ کے نیچے دب گئی

تھیں جس نے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ قَدْ مَدَّ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ يَدَيْهِمْ فَسَوَّاهَا (۱۶۱)۔ خدا کے قانونِ مکافات نے ان کے جرائم کی وجہ

ان پر اس طرح رڈ رولر پھیر دیا کہ وہ زمین کیساتھ بالکل ہموار ہو گئے۔ ”بارالہ! ہماری یہ حالت نہ ہو۔ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ

(۱۶۲) اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ”اے ہمارے پروردگار! ہم پر اتنا بوجھ نہ لادینا جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت ہی نہ ہو“ یہ ترجمہ خدا

کے متعلق بڑا غلط تصور پیدا کرتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ خدا اپنے بندوں پر اتنا بوجھ بھی لاد دیا کرتا ہے جو ان کی طاقت سے باہر ہو۔ یہ تو

(معاذ اللہ) ظلم ہے۔ استبداد ہے۔ بڑی زیادتی ہے۔ اسی قسم کا تصور سورہ فاتحہ کی آیت (۱) کے غلط ترجمہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس مقام پر غلط ترجمہ

کی رو سے) یہ کہا جاتا ہے کہ ”اے ہمارے پروردگار! دکھا ہمیں سیدھی راہ۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا نہ کچھ ان لوگوں کی راہ جن پر تیرا غضب ہوا اور وہ گمراہ ہو گئے“ اس کے مفہوم متبادر ہوتا ہے گویا خدا لوگوں کو ان راہوں پر بھی ڈال دیا کرتا ہے جو انہیں تباہی کی طرف لے جائیں اور مومن اس کی دعائیں مانگتے ہیں کہ کہیں ہمارے ساتھ ایسا نہ کر دینا۔ (تفصیل جلد اول ص ۵۲ پر گزر چکی ہے) آپ نے غور کیا کہ اس قسم کی آیات کے غلط ترجمہ سے بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔

زیر نظر آیت کا مراد ترجمہ (ہم پر اتنا بوجھ نہ لا دینا جس کے اٹھنے کی ہم میں طاقت نہ ہو) ایک تو اس لئے غلط ہے کہ ابھی بھی خدا کا یا ارشاد ہماری نظر دل سے گزر چکا ہے کہ: لَا يَكْفِيكَ اللَّهُ فَنَسًا إِلَّا وُسْعَهَا (یہ)۔ خدا کسی کی وسعت سے زیادہ لئے مکلف ہی نہیں ٹھیراتا، ایسے خدا کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ کسی پر اس کی قوتِ بڑاشت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا کرتا ہے قرآن میں نصاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو رسول اللہ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ: وَيَضَعُ عَنْهُمْ أَصْرَهُمْ وَالْأَعْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (یہ)۔ وہ نوع انسان کو ان بوجھوں سے آزاد کر دیا جن کے نیچے وہ دبی چلی آرہی ہے اور ان زنجیروں کو توڑ پھینکے گا جن میں وہ جکڑی ہوئی ہے۔ اس خدا کے متعلق یصو کہ وہ انسانوں پر ناقابلِ بڑاشت بوجھ ڈال دیا کرتا ہے، غلط ہے لیکن جن لوگوں کے نزدیک خدا کی ایک صفت الْمُضِلُّ بھی ہے (یعنی معاذ اللہ) گمراہ کر نیوالا، وہ اگر ان آیات کے اس قسم کے ترجمے کر دیں تو ہمیں تعجب کی کوئی بات؟ آیت کا ٹکڑا درحقیقت اس کے اس حصہ کا ضمیمہ ہے جس میں کہا گیا ہے لَا يَكْفِيكَ اللَّهُ فَنَسًا إِلَّا وُسْعَهَا (یہ) خدا انسان پر جو ذمہ داری ڈالتا ہے

اس سے اس کی وسعتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ (یہ) کہا یہ گویا ہے کہ ہم پر جس قدر ذمہ داری عائد کی جائے اسی نسبت سے ہماری قوتِ بڑاشت میں اضافہ ہو جائے یعنی ذمہ داری کے عائد ہونے کے ساتھ ہی وُسْعُهَا کا عمل شروع ہو جائے۔ سورہ ہود میں حضرت شعیبؑ کا اپنی قوم سے خطاب ہے کہ اِنْ اُرِيدُ اِلَّا الْاِصْلَاحُ مَا اسْتَطَعْتُ۔ میرا ارادہ اور مقصد صرف یہ ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق تم میں اصلاح کرتا رہوں۔ اس کے بعد ہے وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ (یہ)۔ لیکن میری استطاعت (قوتِ عمل) اور تمہاری اصلاح کے لئے جو کچھ اور جس قدر چاہیے، ان میں مطابقت قانونِ خداوندی کی رو سے پیدا ہوگی۔ توفیق کے معنی دو چیزوں میں مطابقت پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر ہم اپنے ارادوں اور کوششوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا کرتے ہیں کہ وَبَيِّنِ الْتَوْفِيقَ۔ یعنی ہمارے ارادوں اور مطلوبہ نتائج میں مطابقت خدا کے قوانین کی رو سے ممکن ہے یعنی ان ارادوں کو کامیاب کرنے کیلئے جس قدر استطاعت درکار ہو وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہی سے حاصل ہوگی۔ یہ معنی ہیں رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ کے۔ اگر یہ توفیق (مطابقت) نہ ہو تو پھر (حسرت کے الفاظ میں) کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں میری ہمتوں کی پستی، میرے شوق کی بلندی

مؤمنین کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ جوں جوں ہمارا شوق بلند ہو اسی نسبت سے ہماری ہمتوں میں بلندی پیدا ہوتی جائے۔ اس لئے کہ۔۔۔ دیتے ہیں بادہِ ظرفِ قدحِ خوارِ دیکھ کر۔

اس کے بعد مؤمنین کی اگلی آرزوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا: وَعُفِّ عَنَّا، وَاعْفُ رُفْلَنَا، وَارْحَمْنَا (یہ) اگر ہم

سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو ہمیں اس کی بھی توفیق ہو کہ ہم اپنے حسن عمل سے اس کے غلط نقوش اور مضر اثرات کو مٹا سکیں۔ عفو کے معنی مٹا دینا ہے۔ غلط نقوش مٹتے کس طرح ہیں، اس کے متعلق یہ اصول بتا دیا کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱)۔

» اعمال حسنہ غلط اعمال کے تخریبی نتائج کا ازالہ کر دیتے ہیں۔ « وَعَفَّ عَنْكَ کے یہی معنی ہیں۔ یعنی ہمیں اس کا موقع عطا کر دے کہ ہم ایسا کر سکیں اور اس طرح وَاعْفِرْ لَنَا۔ ہم ان کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رہ سکیں۔ وَارْحَمْنَا اور ہماری ذات کی نشوونما کرنے کے لیے آپ نے دیکھا کہ ان تمام دعاؤں میں مخاطب اللہ کو کیا گیا ہے۔ اگلے دو لفظوں کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے (محاکاتی انداز میں) یوں سمجھئے کہ ان دعاؤں کے سننے کے بعد خدا کی طرف سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ تم ہم سے یہ کچھ کیوں مانگ رہے ہو؟ اس کا جواب دو لفظوں میں یہ کہہ کر دیا جاتا ہے کہ اسلئے کہ

اَنْتَ مَوْلَانَا۔ (۱۲)

تو ہی تو ہمارا آقا، ہمارا کارساز، ہمارا سرپرست، ہمارا حامی و ناصر، ہمارا آخری سہارا ہے۔ تجھ سے نہ مانگیں تو اور کس سے مانگیں۔

تیسرے سو اکوٹی شائستہ وفا بھی تو ہو

میں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے در جاؤں

لفظ ”مَوْلَانَا“ کے معانی، سابقہ صفحات میں ولی یا اولیاء اللہ کے ضمن میں گزر چکے ہیں۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ مؤمن کا ایمان اور اس کی پکار اَنْتَ مَوْلَانَا ہے۔ یعنی مولا صرف خدا کی ذات ہے۔ اس کے سوا کسی کو مولا سمجھنا کھلا ہوا شرک اور ایسا کہنا، اس شرک کا اعلان ہے۔ اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کر

اَنْتَ مَوْلَانَا

لیجئے کہ یہ جو ہم قدم قدم پر انسانوں کو ”مَوْلَانَا“ یا مرشدی و مولائی کہتے ہیں تو قرآن کریم کی رو سے اسے کیا کہا جائیگا !

ان تمام آرزوؤں اور دعاؤں کے بعد آخر میں بتایا گیا کہ ان سے ہمارا مقصد و منتہی کیا ہے ! ہم ایسی قوتیں اور صلاحیتیں کیوں چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ فَاَنْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ۔ (۱۳)۔ دنیا میں جتنی قوتیں حق کی لخت اور دین خداوندی کی راہ میں حائل ہوں، ہمیں ان پر غلبہ و تسلط حاصل ہو جائے اور اس طرح لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ

(نظام خداوندی آخر الامر تمام انسان ساز نظاموں پر غالب آجائے) کی حقیقت منتظر لباسِ مجاز میں ہمارے (اور ساری دنیا کے) سامنے آجائے۔

بارالہا ! ہماری ان آرزوؤں کو شرف قبولیت عطا فرما !

اختتام تک پہنچ گئی۔ رَبَّنَا قَتَلْنَاكَ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

قرآن کریم کی ایک سورہ (بقرہ) کی تفسیر مطالب الفرقان کی تین جلدوں کو محیط ہوئی ہے اور اس کے باوجود میری تسکین اور تسلی نہیں ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ

حسنِ این قصۂ عشق است، در دفترِ نمی گنجد

اس کے بعد بیدہ التوفیق۔

پرفیز



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

انڈکس

مطالب الفرقان جلد اول، دوم و سوم۔ مشتمل بر سورہ فاتحہ و سورہ بقرہ

جلد اول — سورہ فاتحہ — (۱: ۱-۷)

جلد اول — سورہ بقرہ — (۲: ۱-۲۹)

جلد دوم — سورہ بقرہ — (۲: ۳۰-۱۱۲)

جلد سوم — سورہ بقرہ — (۲: ۱۱۳-۲۸۶)

مطالب الفرقان کی پہلی تین جلدیں یوں تو سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی تفسیر پر مشتمل ہیں، لیکن چونکہ یہ تفسیر آیات کے اصول کے مطابق مرتب کی گئی ہیں اس لئے ان جلدوں میں قرآن کریم کے بیشتر اہم حقائق و احکام آگئے ہیں۔ اس بنا پر مناسب معلوم ہوا کہ ان تین جلدوں کا جامع انڈکس تالیف کر دیا جائے تاکہ زیر نظر موضوع کی تلاش میں آسانی ہے۔ اس انڈکس کے مرتب کرنے میں بڑی کاوش اور احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن یہ بہر حال ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو اور خطا کا امکان رہتا ہے۔ اسی امکان کے پیش نظر متعلقہ جلد کے صفحہ نمبر کے ساتھ آیت کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے کہ اگر صفحہ نمبر میں غلطی ہوگئی ہو تو متعلقہ آیت کو دیکھ لیا جائے۔ اگر اس کے باوجود حوالہ صحیح نہ ملے تو براہ کرم ہمیں مطلع فرما دیا جائے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی جائے۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَان !

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
الف				درخواست کرنا کہ مجھے بتا تو			
ابتلاء کے معنی	دوم	۲۴۱	(۲: ۴۹)	مردوں کو زندہ کس طرح کرتا ہے			
ابتلاء کا مفہوم	سوم	۱۱۱، ۴۰	(۲: ۱۲۳، ۱۵۵)	حضرت ابراہیم (امت مسلمہ کا نمونہ)			
(حضرت ابراہیم کا خدا سے)	دوم	۲۴۴	(۲: ۵۵)	حضرت ابراہیم کی بادشاہ سے مناظرہ			
				داستان جلیلہ زابتلاء۔ اہمیت	سوم	۴۰-۴۷	(۲: ۱۲۴)

آیت	صفحہ	جلد	مضمون	آیت	صفحہ	جلد	مضمون
(۲:۴)	۱۴۴	اول	آخرت پر ایمان	تہذیبِ برگزشتہ آدم	۴۲	دوم	ابلیس
(۲:۲۸)	۳۴۹	اول	آخری زندگی کی اہمیت	(۲:۳۴)	۱۰۱	دوم	ابلیس اور آدم کی معصیت
(۲:۲۱۹)	۳۲۷	سوم	آخری زندگی پر غور و فکر				میں فرق
(۲:۳۰)	۶۱	دوم	آدم۔ (آدی ہی مراد ہے)	(۲:۱۷۷)	۱۵۸	سوم	ابن اسبیل کی امداد
(۲:۳۷)	۱۳۳	دوم	آدم کی توبہ اور اصلاح کی گنجائش	(۲:۸۳)	۳۴۳	دوم	ابن اللہ کے باطل عقیدہ کی تردید
(۲:۳)	۱۲۴	اول	اذان	(۱:۲)	۲۲	اول	ابن مسکویہ اور نظریہ ارتقاء
(۲:۲۵۰)	۴۲۵	سوم	اذن اللہ کا مفہوم	(۲:۴۰)	۱۵۴	دوم	اثری انکشافات کی اہمیت
(۱:۷)	۵۷	اول	ارتقاء کا قرآنی مفہوم	(۲:۸۵)	۳۵۶	دوم	اثم و عدوان
			(نیز دیکھئے مرتبہ)	(۲:۲۱۹)(۲:۲۰۶)	۲۱۷، ۲۵۸	سوم	" "
(۱:۱)	۱۷	اول	ارتقاء کا نظریہ	(۲:۴۳)	۲۱۳	دوم	اجتماعی نظام کا نام سلام ہے
(۱:۲)	۳۱	اول	ارتقاء۔ عمومی اور فحائی	(۲:۸۵)	۳۵۴	دوم	اجرتوں کا نظام باطل ہے
(۲:۲۱)	۲۹۰	اول	" " "	(۲:۴۰)	۱۶۳	دوم	اجارہ و رہبان کے خلاف
(۲:۲۲)	۲۹۴	اول	ارض کے فراش ہونے کا مطلب				حضرت علیؑ کے وعظ
(۲:۲۲)	۲۹۶	اول	ارض (زمین) پر ذاتی ملکیت	(۲:۸۵)	۳۵۳	دوم	احسان۔ جنگ کے قیدیوں کو بطور احسان چھوڑ دو
			نہیں ہو سکتی				
(۲:۲۲)	۳۰۷	اول	ارض پر ذاتی ملکیت رسول اللہ کے زمانے ہی میں کم ہو گئی تھی	(۲:۲۱)	۲۸۷	اول	احسن الخالقین
(۲:۲۹)	۳۵۲	اول	ارض و سما کی تخلیق	(۱:۱)	۷	اول	احمد
(۲:۵۹)	۲۹۴	دوم	ارض مقدس پر بنی اسرائیل کے قبضے کا واقعہ۔ دون ہمتی کی انتہاء	(۲:۱۱۳)	۷	سوم	اختلافات۔ ہمارے اختلافات کیسے مٹ سکتے ہیں؟
				(۲:۱۱۳)	۹	سوم	اختلافات کتاب اللہ کی حکمرانی سے مٹ سکتے ہیں
(۲:۳)	۱۳۷	اول	(موجودہ) ارکانِ اسلامی کا برقرار	(۱:۵)	۶۲	اول	اختیارِ ارادہ۔ انسان کی خصوصیت

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
رکھنا ضروری ہے				اسلام اجتماعی نظام کا نام ہے	دوم	۲۱۱-۲۱۶	(۲:۴۳)
آزاد (مولانا ابوالکلام آزاد کی غلط نگہی)	اول	۸۴	(۲:۳۵)	(ہمارا مردہ) اسلام کس طرح غیر اسلامی عقائد و مسائل کا مجموعہ بن گیا	اول	۱۲۳	(۲:۳)
آزمائش - خدا بندوں کی آزمائش نہیں کرتا	دوم	۲۳۱	(۲:۴۹)	" " "	دوم	۳۱۵	(۲:۷۱)
ازواج کے معنی - ہم آہنگی و فقاہ	اول	۳۳۸	(۲:۲۵)	(صرف) اسلام ہی کیوں سچا دین ہے	سوم	۲۸	(۲:۱۲۰)
استبدال و استخلاف قومی	اول	۱۹۳	(۲:۷۷)	اسلام، عمر بھر کا مسلسل پروگرام ہے	سوم	۶۸	(۲:۱۳۲)
" "	سوم	۲۸۵	(۲:۲۰۹)	" اسلام یا تلوار" کا گمراہ کن پراپیگنڈہ	سوم	۲۶۶	(۲:۱۹۳)
استہزا - ذنابت کی آخری حد	اول	۲۴۷	(۲:۱۳۷)	اسلام کی تشریح و توضیح	سوم	۲۸۲	(۲:۲۰۸)
استخلاف فی الارض	اول	۳۰	(۱:۳)	اسلام کے اصولوں میں لچک نہیں ہے	اول	۱۷۸	(۲:۶)
استخارہ	سوم	۳۱۶	(۲:۲۱۹)	اسلامی نظام نوع انسان کی ربوبیت کا ذمہ دار	اول	۲۰	(۱:۱)
استکبار فی الارض بغیر الحقی منہ ہے	اول	۲۲۹	(۲:۱۱-۱۲)	" رسول اللہ کے بعد	اول	۳۱	(۱:۳)
استغانت	اول	۳۷	(۱:۴)	" اس کے بنیادی مقاصد	سوم	۵۴-۵۶	(۲:۱۷۷)
استغانت بالصبر والصلوة	اول	۳۹	(۱:۴)	اسم سے مراد صفت خداوندی ہے	اول	۲	بسم اللہ
" " "	دوم	۲۲۲	(۲:۴۵)	(بسم اللہ)			
" " "	سوم	۱۰۹	(۲:۱۵۳)	اسم اعظم	دوم	۳۹۲	(۲:۱۰۲)
استغناء کی کیفیت	سوم	۴۷۳	(۲:۲۷۳)	اسماء سے مراد - اشیائے فطرت کا علم	دوم	۸۲	(۲:۳۱)
استنساخی طریق - نتائج خود بتا	سوم	۷۶	(۲:۱۳۹)	اسماء خداوندی سے مراد	سوم	۱۲	(۲:۱۱۴)
دینگے کہ کونسا نظام سچا ہے	اول	۳۰۴	(۲:۲۲)	(حضرت) اسماعیل کی حجاز کی طرف نقل مکانی	سوم	۵۳	(۲:۱۲۴)
اسٹیٹ - دورِ حاضر کا تہ	سوم	۶۹	(۲:۱۳۴)	تورات کا افسانہ	سوم	۵۳	(۲:۱۲۴)
اسلاف کے متعلق بحثوں میں مت پڑو۔				اسوۃ ابراہیمی کے اتباع کا حکم	دوم	۳۴۸	(۲:۸۳)

آیت	صفحہ	جلد	مضمون	آیت	صفحہ	جلد	مضمون
(۲:۶)	۱۶۷	اول	(۱۰) مقدار کی بدستیاں	(۲:۲۵۸)	۴۵۵	سوم	اسوۂ ابراہیمی کے اتباع کا حکم
(۲:۵۰)	۲۴۵	دوم	آل کے معنی	(۲:۹)	۲۲۳	اول	اسوۂ حسد
(۲:۲۵۵)	۴۳۸	سوم	الا علی	(۲:۲۵۸)	۴۵۶	سوم	" "
(۱:۱)	۸-۹	اول	اللہ - صاحب اقتدار (اللہ کے سلسلے میں عنوان خدا بھی دیکھیے)	(۲:۴۳)	۲۰۲	دوم	اشتراکیت اور اسلام کا فرق
(۲:۲۲)	۳۰۰	اول	الا الارض بھی خدا ہے اور لا الہ الا	سرگزشت آدم	۴۱	دوم	" اشرف المخلوقات " کا تصور صحیح نہیں
(۲:۳)	۹۶	اول	الہام کا ذکر قرآن میں نہیں	(۲:۱۹۹)	۲۵۳	سوم	اصحاب الفیل
(۲:۵۹)	۲۹۳	دوم	الفاظ پر زور - معانی سے روگردانی	(۲:۴۸)	۲۳۵	دوم	اصطلاحات کا مفہوم متعین کرنے کا طریق
(۱:۷)	۵۴	اول	(باہمی) الفت (کے سجاتے جنگ)	(۲:۱۱-۱۲)	۲۳۱	اول	اصلاح اور فساد کا مفہوم
			جہاں غضب خداوندی ہے	(۲:۳)	۱۲۵	اول	(دین کے) اصول و جزئیات کا باہمی تعلق
(۱:۱)	۱۰	اول	اللہ کا صحیح تصور	(۲:۷۱)	۳۱۰	دوم	اصول ناقابل تغیر جزئیات قابل تغیر
(۲:۳۰)	۸۸	اول	" "	(۱:۷)	۵۴	اول	اضداد (کے تعاقب سے وضاحت)
(۲:۱۱-۱۲)	۲۳۵	اول	اللہ اکبر کا مفہوم	(۲:۲۸۵)	۴۹۱	سوم	اطاعت - ایمان کے بعد سمجھوتہ کر اطاعت
(۲:۶۱)	۳۰۲	دوم	اللہ اور اس کے رسول غالب آکر رہیں گے	(۲:۸۶۹)	۲۰۲، ۲۰۹	اول	اعراب نے یہودیوں کے زیر اثر منافقت اختیار کر لی تھی
			اس کا مفہوم				
(۲:۱۸۷)	۲۰۰	سوم	اللہ اکبر کا مفہوم	(۲:۴۲)	۱۹۷	دوم	اعمال نامہ الحق ہے
(۲:۱۷۷)	۱۶۳	سوم	(رحل) امانت کا مفہوم	(۲:۶۷)	۳۱۲	دوم	" اعدائے اللہ من الشیطان الرجیم " کا مفہوم
سرگزشت آدم	۳۹	دوم	امانت - محل امانت کا مفہوم	(۲:۱۳۵)	۱۱۳	دوم	افتراق وہ ملعونہ شجر ہے جس سے آدم کو منع کیا گیا تھا
(۲:۷۸)	۳۳۹	دوم	امانی کے معنی				
(۲:۳)	۱۳۸	اول	(تشکیل) امت کے دو اساسی عنصر	(۲:۳۱)	۸۷	دوم	انفلاطون کا نظریہ کائنات

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
امت کی تشکیل	دوم	۲۱۹	(۲:۴۳)	باطنی علم کا عقیدہ۔ یہودیوں میں	دوم	۱۸۶	(۲:۴۱)
امتِ مسلمہ کی خصوصیات	سوم	۹۰	(۲:۱۳۳)	باطنیت — سحر کی	دوم	۱۳۳	(۲:۱۰۳)
امتِ مسلمہ کی تشکیل۔ امتِ واحدہ	سوم	۳	(۲:۱۱۳)	پیداوار اور تصوف کی بنیاد	سوم	۱۲۶	(۲:۱۵۹)
امر۔ عالمِ امر	اول	۲۸۳	(۲:۲۰-۲۱)	باطنیت — یہودیوں کے ہاں	دوم	۲۸۳	(۲:۱۰۲-۳)
امر۔ عالمِ امر و عالمِ خلق	اول	۲۸۳	(۲:۲۱)	عیسائیوں کے ہاں	دوم	۱۱۱	"
امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ	سوم	۹۰	(۲:۱۴۳)	خود مسلمانوں کے ہاں	دوم	۱۱۴	"
ساری امت کا ہے ذکر کسی خاص گروہ کا۔				بیتسہ (یا اصطبل) کا عقیدہ اور رسم	سوم	۷۵	(۲:۱۳۸)
امنِ عالم کے ذمہ دار	اول	۸۷	(۲:۳)	بخت نصر کا حملہ	دوم	۱۶۰	(۲:۴۰)
آمرؤں کا بظاہر دبدبہ لیکن حقیقت بزدلی	دوم	۱۰۷	(۲:۳۴)	حزقیل نبی کا خواب	دوم	۱۶۱	"
امی کے معنی	دوم	۳۳۷	(۲:۷۸)	بخشش کا تصور غیر قرآنی ہے	دوم	۲۸۸	(۲:۵۸)
آمرؤں کا مسلک — اپنے حریفوں کو ذلیل کر کے خوش ہونا	دوم	۱۰۷	(۲:۳۴)	بدیع السموت والارض	اول	۳۸۳-۹۲	(۲:۲۱)
				بر کے معنی	دوم	۲۱۹	(۲:۴۴)
				بر کی راہ کون سی ہے	سوم	۱۵۷	(۲:۱۷۷)
				برہوسماج کی تحریک	اول	۸۳	(۲:۳)
				برہوسماجی اسلام	اول	۸۳	(۲:۳)
				برفو (BRIFFAULT) کی شہادت	اول	۲۶۹	(۲:۱۹)
				برق	اول	۲۶۶	(۲:۱۹)
				برنباس کی انجیل کی شہادت	دوم	۱۶۵	(۲:۴۰)
				"بسم اللہ" وحی ہے (بسم اللہ)	اول	۲۴	(۱۰۲)
				بسم اللہ کی مزید تشریح
بایل۔ بحرکاری کا اولین مرکز	دوم	۳۹۹	(۲:۱۰۲)				
(ال) باری کا مفہوم	دوم	۲۶۶	(۲:۵۴)				
باطل پر مبنی نظام منپ نہیں سکتا	اول	۲۶۹	(۲:۱۹)				
باطل کا مفہوم	دوم	۸۹	(۲:۳۱)				
باطل کے معنی	دوم	۱۹۶	(۲:۴۲)				
باطل اور حق کی کشمکش	دوم	۱۹۷	(۲:۴۲)				

ب

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(خلاصہ اللہ سوا فائز کے کہیں)	اول	۶۴	(۱:۲)	بنی اسرائیل نے دین کو اپنی نسل تک محدود کر دیا	دوم	۳۰۵	(۲:۶۱-۶۲)
بشر و مشکم	اول	۳۱۱	(۲:۲۳)	بھوک (اور خوف) عذابِ خداوندی ہیں	اول	۵۲	(۱:۶)
بصر اور نظر کا فرق	اول	۱۶۸	(۲:۶)				
بعثت کا قرآنی مفہوم	دوم	۲۸۱	(۲:۵۶)	پارٹیوں میں بٹ جانا عذاب ہے۔	دوم	۱۷۲	(۲:۴۰)
بقدر (گتے) فرج کرنے کا واقعہ	دوم	۳۱۱	(۲:۶۷)	پاکستان کی تحریک کے دوران ،	دوم	۱۰۶	(۲:۳۴)
بنی اسرائیل کا				نیشنلسٹ علماء اور اقبالیہ			
بلاء کا قرآنی مفہوم	دوم	۲۴۱	(۲:۴۹)	میں وجہ نزاع			
بناء - سماء کو بنا رہا	اول	۲۹۵	(۲:۲۲)	پاکستان کی تحریک کے دوران ،	دوم	۳۶۱	(۲:۸۵)
بند رہ جانا - اصحابِ بہت کا	دوم	۳۰۷	(۲:۶۵)	نیشنلسٹ علماء کا مسلک			
بنی اسرائیل کی داستان - ابتداء	دوم	۱۷۱	(۲:۴۰)	پاکستان میں سیکولر ازم	دوم	۳۶۲	(۲:۸۵)
آخری تباہی تک				پانی کے چشمے - بنی اسرائیل کے	دوم	۲۹۷	(۲:۶۰)
بنی اسرائیل کے دس گم گشتہ اسباب	دوم	۱۵۹	(۲:۴۰)	پریش - مذہب میں عبادت ،	اول	۳۶	(۱:۴)
(قبائل)				پریش میں تبدیل ہو جاتی ہے			
بنی اسرائیل کو تعاتے خداوندی	دوم	۲۲۸	(۲:۴۷)	پڑوں کا جھگڑا اور اٹھنا -	اول	۱۹۷	(۲:۷)
کی یاد دہانی				قانونِ مکافا و مہلت			
بنی اسرائیل کے عجیب و غریب	دوم	۲۲۹	(۲:۷۸)	پندار نفس کی بنا پر انکار	اول	۱۶۶	(۲:۶)
عقائد - نجات کے متعلق	سوم	۳۳	(۲:۲۲-۲۳)	پیش گوئیاں اور روایات	دوم	۳۵۷	(۲:۸۵)
بنی اسرائیل نے سمندر کیسے پار کیا تھا؟	دوم	۲۴۵	(۲:۵۰)	پیش گوئیوں	اول	۹۵	(۲:۳)
بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کو	دوم	۲۷۵	(۲:۵۵)	کی حقیقت			
کس طرح ستایا؟				پیمان شکن	اول	۳۴۴	(۲:۷۷)
بنی اسرائیل کے قتل کا واقعہ	دوم	۳۲۳	(۲:۷۳)				

آیت	صفحہ	جلد	مضمون	آیت	صفحہ	جلد	مضمون
(۲:۸۳)	۲۴۳	دوم	تخلیقی قوت انسان میں				ت
(۲:۸۳)	۳۴۳	دوم	(خدا کا عمل) تخلیقی ہے۔ تولیدی نہیں				
(۲:۲۴)	۳۱۶	اول	ترتیب قرآن	(۲:۲۴۷)	۴۲۲	سوم	تاہوت سکینہ (بنی اسرائیل کا)
(۲:۳۰)	۲۵	دوم	تزکیہ نفس	(۲:۴۰)	۱۵۰	دوم	تاریخ سے مفہوم
(۲:۳۰)	۷۳	دوم	تسبیح سے مراد	"	"	"	تاریخ کی اہمیت۔ قرآن کی رو سے
سرگزشت	۶۸	دوم	تسخیر فطرت	"	۱۵۱	"	تاریخ کی مادی تعبیر۔ مارکسی نظریہ
(۲:۳۱)	۸۳	"	"	(۲:۳)	۹۴	اول	تاریخی شواہد۔ قرآنی دعاوی کی
(۲:۳۱)	۸۶	دوم	(مقام آدم اور مقام موسیٰ)				صدائیت کی دلیل
(۱:۵)	۴۵	اول	تصوف کی غلط نگہی	(۲:۴۱)	۱۸۲	دوم	تالمود (یہودیوں کی فقہ اور روایت)
(۲:۲۸)	۳۵۰	اول	(الیہ راجعون کا غلط مفہوم)				کی کتاب
(۲:۱۰۳)	۴۰۸	دوم	تصوف پر تفصیلی بحث	(۲:۱۰۹)	۴۳۵	دوم	تبلیغ بہر حال کئے جاوے
(۲:۱۰۳)	۴۲۷	دوم	تصوف اور علامہ اقبالؒ	(۲:۵۹)	۲۹۳	دوم	تبلیغی جماعت
(۲:۲۵۷)	۴۴۶	سوم		(۲:۲۶۵)	۴۶۶	سوم	تثبیت نفس
(۲:۱۱-۱۲)	۲۳۴	اول	تصوف کا غلط نظریہ۔ علو اور کبریا کی	(۲:۱۱-۱۲)	۲۳۷	اول	تجارت کا غلط نظام
			مومن کا حق ہے				وجہ فساد آدمیت
(۲:۴۳)	۲۱۳	دوم	تصوف اور دین میں فرق	(۲:۲۷۹)	۴۸۲	سوم	تجلیات اور ربوں میں فرق
(۲:۵۵)	۲۷۸	دوم	تصوف، خدا کی ذات بے نقاب	(۲:۱۷)	۲۵۸	اول	تجرباتی طریق۔ عقل کا
			دیکھنے کا مدعی ہوتا ہے	(۲:۹)	۲۱۵	اول	تخاکم الی الطاعت۔ شیوہ منافقین
(۲:۴۸)	۲۳۵	دوم	تعاون کے لئے شفاعت کا لفظ	(۲:۴۱)	۱۸۳	دوم	تحریر۔ سابقہ کتب میں
(۲:۲۲۱)	۳۴۵	سوم	تعدد ازواج	(۱:۱)	۱۶-۲۲	اول	تخلیق خداوندی میں اضافے
(۲:۱۰۲)	۴۱۹	دوم	تعویذ۔ گنڈے	(۲:۲۱)	۲۸۸	اول	
(۲:۳)	۱۲۹	اول	تغییر و ثبات کا امتزاج	(۲:۲۱)	۲۹۰	اول	تخلیقی قوت انسان میں

صفحہ	جلد	مضمون	آیت	صفحہ	جلد	مضمون	
(۲:۶)	۱۶۴	اول	تقلید رک تباہ کاریاں	(۲:۳۹)	۱۴۲	دوم	(ہماری کتب) تفاسیر میں قصہ آدم
(۲:۲۲)	۳۰۷	"	"	(۲:۷)	۱۹۳	اول	تفرقہ انگیزی خدا کا مذا ہے
(۲:۱۷۰)	۱۳۸	سوم	"	(۲:۲۱۳)	۲۹۰	سوم	"
(۲:۲۱)	۷۵	اول	تقلوی کا مفہوم	(۲:۹۱)	۲۱۵	اول	تفرقہ انگیزی - منافقین کا شعار
(۲:۱۳۹)	۱۳۶	دوم	تکذیب دین کا مفہوم	"	"	"	(مسجد صبرا کی تعمیر)
(۲:۲۰۲)	۲۵۴	سوم	کرنے والے	(۲:۴۰)	۱۷۲	دوم	تفرقہ خدا ہے
(۲:۷۸)	۳۳۹	دوم	تلاوت قرآن پاک - مفہوم سمجھ بغیر	(۲:۴)	۱۹۱	اول	تفرقہ یہودیوں میں
(۲:۱۲۱)	۳۲	سوم	تلاوت کے معنی قرآن مجید کا	(۲:۵۱)	۲۵۹	دوم	تفرقہ - قوم کہ تفرقہ سے بچانے
"	"	"	اتباع کرنا ہے	"	"	"	کے لئے عارضی شرک تک
"	"	"	"	"	"	"	برداشت کیا گیا
(۲:۲۱۹)	۳۲۲	سوم	تلاوت بغیر سمجھ	"	"	"	"
(۲:۴۰)	۱۷۶	دوم	تکون فی الارض - خدا کا انعام ہے	(۲:۱۲۴)	۳۶	سوم	تفریق بین الرسل
(۲:۵۸)	۲۸۵	دوم	بنی اسرائیل کے لئے	(۲:۲۵۳)	۴۲۷	سوم	"
(۱:۵)	۴۴	اول	تناسخ کا باطل نظریہ	(۲:۱۰۲)	۳۹۷	دوم	(ہماری کتب) تفسیر کی حقیقت
(۲:۱۶۷)	۱۳۴	سوم	"	(۲:۱۵۲)	۱۰۵	سوم	تقدیر - آغاز کار انسان کے
(۲:۶)	۱۶۱	اول	تندیر کا مفہوم	(۲:۲۱۹)	۳۲۵	سوم	ہاتھ میں ہے
(۲:۵۴)	۲۶۶	دوم	قواب	(۱:۷)	۶۳	اول	تقدیر - (عقیدہ جبرگراہی ہے)
(۱:۲)	۲۶	اول	توبہ کا مفہوم	(۲:۱۶)	۱۶۳	"	"
(۲:۵۴)	۲۶۶	دوم	"	(۲:۷)	۳۸۸	"	"
(۲:۱۸۷)	۱۸۷	دوم	تورات کی تاریخ	(۲:۲۰)	۲۷۴	اول	تقدیرات الہیہی قوانین خداوندی
(۲:۳۹)	۱۳۹	دوم	تورات میں قصہ آدم	(۲:۲۴۷)	۴۲۰	سوم	ہیں -
(۲:۲۱)	۲۸۳-۹۲	اول	تولید اور تخلیق میں فرق	(۲:۳۰)	۷۵	دوم	تقدیس کا مفہوم
(۲:۸۳)	۳۴۳	دوم	"	(۱:۷)	۶۰	اول	تقلید رک تباہ کاریاں

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
قوم پرستی کے خلاف (مذہبی رسوم و مناسک قوم پرستی پر مبنی ہوتے ہیں)	سوم	۲۳۴	(۲:۱۸۹)	جہیز	سوم	۳۵۸	(۲:۲۲۱)
				جذلیت (ہنگل اور مارکس کا نظریہ)	دوم	۱۵۱	(۲:۴۰)
				جذبات اور علم و ہدایت کا تعلق	اول	۱۴	(۱:۱)
				جذبات کے مغلوب ہو جانے والے		۱۴	(۱:۱)
				اپنے جذبات کو آلہ بنالینے والے		۱۴	(۱:۱)
ثبات و تغیر کا حسین امتزاج	اول	۱۲۹	(۲:۳)	(کمرش) جذبات، شیطان کھلاتے ہیں	دوم	۵۰	مرکز نش آدم
شقلیل - دنیا کی ہر شے آخرت کے مقابلے میں شقلیل ہے	اول	۲۵۷	(۲:۱۶)	جرائم جن کی وجہ سے نبی اسرائیل کی تباہی واقع ہوئی	دوم	۱۶۶	(۲:۴۰)
ثنویت (دو خداؤں کا عقیدہ)	دوم	۱۸۲	(۲:۴۰)	جرم و سزا کا فلسفہ	سوم	۱۷۱	(۲:۱۷۹)
	اول	۱۳۱-۱۴	(۱:۱)	جزا اور سزا کا قرآنی مفہوم	اول	۸۹	(۲:۳)
ثنویت (شکر ہے)	اول	۵۷	(۱:۷)		دوم	۲۳۲	(۲:۴۸)
غضب خداوندی اور ارتداد ہے		۵۷	(۱:۷)	جزئیات صلوٰۃ اور قرآن	اول	۱۲۵	(۲:۳)
کفر ہے		۱۷۱	(۲:۶)	(احکام کی) جزئیات کا تعین	اول	۱۲۵	(۲:۳)
				اسلامی نظام مملکت کر گیا			
				جمارا (یہودیوں کا مجموعہ روایات)	دوم	۱۸۴	(۲:۴۱)
				جماعت کی اہمیت	دوم	۲۱۳	(۲:۴۳)
جادو - رسول اللہ پر جادو کی حقیقت	دوم	۴۱۷	(۲:۱۰۳)	جمال و جلال کا سرچشمہ	اول	۸	(۱:۱)
جبر کا عقیدہ پستی کردار کی علامت ہے	دوم	۴۰۴	(۲:۱۰۳)	جماعت مؤمنین کی اہمیت	دوم	۲۰۱	(۲:۴۳)
جبریل	دوم	۳۸۷	(۲:۹۷)	جمہوریت (کی غلط نگہی)	اول	۶۲	(۱:۷)
جہت اور انسان	دوم	۳۲۳-۳۲۴	مرکز نش آدم	جمہوریت کا باطل نظریہ	سوم	۱۶۱	(۲:۱۷۷)
جہاد (دیکھ جنگ)				جناح کا مفہوم		۱۲۰	(۲:۱۵۸)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
جنت اور جہنم کا تمثیلی بیان	اول	۱۴۸	(۲: ۴)	جنّ والنس	دوم	۵۲	سرگزشتِ آدم
	"	۳۳۴	(۲: ۲۵)	جَوَا (میسرہ)	سوم	۳۲۲	(۲: ۲۱۹)
جنت کے معنی	اول	۳۳۲	(۲: ۲۵)	جہنم کے معنی	اول	۳۲۷	(۲: ۲۴)
جنتِ آدم	"	۳۳۵	(۲: ۲۵)	جہنم کا آغاز یہیں سے ہو جاتا ہے	اول	۱۹۴	(۲: ۷)
	دوم	۱۱۱	(۲: ۳۵)				
جنت، اجتماعی زندگی میں ملتی ہے	اول	۳۳۸	(۲: ۲۵)	پٹپٹی غذاؤں کا مطالبہ۔	دوم	۲۹۸	(۲: ۶۰)
جنت جانکاہ مشقوت کے بعد ملتی ہے	اول	۳۳۷	(۲: ۲۵)	بنی اسرائیل کی طرف سے			
" " "	سوم	۲۹۶	(۲: ۲۱۴)				
جنت کسی کی اجارہ داری نہیں۔ اسکے دروازے ہر ایک کیلئے کھلے ہیں۔	دوم	۴۳۷	(۲: ۱۱۱-۱۲)	حادثوں کون ہیں؟	اول	۵	(۱: ۱)
جنتِ آدم اور جنتِ مومن میں فرق	دوم	۱۳۸	(۲: ۳۹)	جسطِ اعمال۔ اعمال کا بے نتیجہ رہ جانا	سوم	۲۸۸	(۲: ۲۱۰)
احصولِ جنت کے آسان طریقے	سوم	۲۹۸	(۲: ۲۱۴)	الحجارة کے معنی	اول	۳۲۸	(۲: ۲۴)
جنت کی شراب	"	۳۲۱	(۲: ۲۱۹)	حجر اسود۔ دیکھئے حج	سوم	۲۵۲	(۲: ۱۹۹)
جنسی بدنہادی وجہ قیادِ آدمیت۔	اول	۲۳۸	(۲: ۱۱-۱۲)	حج سے متعلق احکام	سوم	۲۳۵	(۲: ۱۸۹)
جنسی اختلاط کے متعلق بحث				حج۔ عالمگیر انسانیت کا نقطہ اجتماع	سوم	۲۳۵	(۲: ۱۸۹)
جنگ اور عیسائیت	دوم	۷۸	(۲: ۳۰)		سوم	۱۲۰	(۲: ۱۵۸)
جنگ اور قرآن	دوم	۸۰	(۲: ۳۰)		سوم	۲۳۳	(۲: ۱۸۹)
جنگ کا مقصد احقاقِ حق اور	دوم	۱۹۹	(۲: ۴۲)		سوم	۲۳۸	(۲: ۱۹۷)
ابطالِ باطل ہے				حج کی تقریب پر جانوروں کو ذبح کرنا۔	سوم	۲۴۴	(۲: ۱۹۹)
جنگ کے متعلق تفصیلی بحث	سوم	۲۶۳۸۰	(۲: ۱۹۰-۹۵)	حج کے اجتماع میں غیر مسلموں کو	سوم	۲۳۵	(۲: ۱۸۹)
جان کی قربانی	سوم	۲۹۶	(۲: ۲۱۶)	دعوتِ مشاہدہ			
جنگِ احزاب کا ہولناک نقشہ	سوم	۲۹۷	(۲: ۲۱۴)				

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
حدیث کے لفظی معنی	دوم	۳۳۶	(۲:۷۷)	حق کے معنی	دوم	۱۹۵	(۲:۴۲)
حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے؟	سوم	۱۷۹	(۲:۱۸۰)	دکھان، حق	دوم	۲۰۱	"
حرام اور حلال کا نظریہ	سوم	۱۴۰	(۲:۱۷۲)	حق و باطل کی کشمکش	دوم	۱۹۷	(۲:۴۲)
حرام چیزوں کی فقہی فہرستیں	سوم	۱۴۸	(۲:۱۷۳)	حقوق اللہ اور حقوق العباد	اول	۱۱۰	(۲:۳)
حرام چیزوں کی قرآنی فہرست	سوم	۱۴۳	(۲:۱۷۳)	حقوق اور ذمہ داریاں	اول	۳۵۴	(۲:۲۹)
حرام مال سے اجتناب	سوم	۲۰۳	(۲:۱۸۶)	حقوق اور ذمہ داریوں کا باہمی تعلق	اول	۳۵۴	(۲:۲۹)
حرث و نسل کی ہلاکت	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۵)	حقوق و فرائض	سوم	۱۶۵	(۲:۱۷۷)
حرکت - زندگی کا غیر متحرک ہو جانا	اول	۱۹۰	(۲:۷)	حکم اور قانون میں فرق	سوم	۱۸۴	(۲:۱۸۳)
عذاب ہے	سوم	۲۸۱	(۲:۱۹۴)	حکمت اور کتاب - قانون اور اس کی غایت	سوم	۱۸۶	(۲:۱۸۳)
حرمت کے مہینوں کی پابندی	دوم	۳۰۲	(۲:۶۱)	حکمت اور قوت کا امتزاج	سوم	۲۸۳	(۲:۲۰۹)
حزب اللہ غالب آکر رہیں گے۔	سوم	۱۹۷	(۲:۱۸۵)	حکومت (اور کتاب و نبوت)	دوم	۱۷۷	(۲:۴۰)
حزب اللہ و حزب الشیطان	دوم	۳۰۲	(۲:۶۱)	انعاماتِ خداوندی سے ہیں	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۵-۲۰۶)
حزقی آیل - نبی کا خواب	دوم	۱۶۱	(۲:۴۰)	حکومت نجب منافقین کے ہاتھ میں آجائے۔	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۵-۲۰۶)
حسد و انتقام کا جذبہ	دوم	۱۰۹	(۲:۳۴)	حکومتِ خداوندی سے مراد کتاب اللہ کی حکمرانی ہے	سوم	۳	(۲:۱۱۳)
حسن جنات - اعمالِ حسنہ	دوم	۲۸۹	(۲:۵۸)	حکومت کا غلط نظام فساد ہے	اول	۲۲۹	(۲:۱۱-۱۲)
الاسمار الحسنیٰ	سوم	۱۳۷	(۲:۱۶۸)	حلال اور طیب رزق	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۵)
حسن کارانہ انداز سے بات چیت	دوم	۳۵۰	(۲:۸۳)	حلالہ	سوم	۳۹۴	(۲:۲۳۰)
حضانت (بچہ کسی کی تحویل میں ہے)	سوم	۴۱۲	(۲:۲۳۷)	حلال اور طیب رزق	اول	۲۹۴	(۲:۲۲)
حق - خدا حق ہے - قرآن حق ہے -	دوم	۱۹۵	(۲:۴۲)	حلال اور طیب رزق	اول	۲۹۴	(۲:۲۲)
اسلام دین الحق ہے - اعمالِ حق ہیں	دوم	۸۹	(۲:۳۱)	حلال اور طیب رزق	اول	۲۹۴	(۲:۲۲)
حق کا مفہوم	دوم	۸۹	(۲:۳۱)	حلال اور طیب رزق	اول	۲۹۴	(۲:۲۲)

صفحہ	جلد	مضمون	آیت	صفحہ	جلد	مضمون
۱۷	سوم	خدا زمان و مکان کی نسبتوں سے بلند ہے	سرگزشت آدم	۳۹	دو	حمل امانت کا مفہوم
۲۵۹	سوم	خدا کا غلط تصور۔ بادشاہ کا سا	(۱:۱)	۵	اول	حد اور علوم کائنات
۲۷۶	دوم	خدا کو بے نقاب دیکھنے کا مطالبہ	(۱:۱)	۳	اول	خدا کا تفصیلی مفہوم
۲۲	سوم		(۲:۱۳۵)	۷۱	سوم	حنیف کا مفہوم
۳۲۳	دوم	خدا کے ہاں بیٹا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کی بیوی نہیں	(۲:۲۱)	۲۹۲	اول	حوادث ارضی و سماوی اور ان سے حفاظت
۲۰۴	اول	خدا کا مفہوم	(۲:۱۰۲)	۳۹۶	دوم	سواریان حضرت عیسیٰ کی مدافعت
۳۳۳	دوم	خشیت کے معنی	(۲:۲۵)	۳۳۹	اول	حجروں کا مفہوم
		خلافت (دیکھیے "استخلاف فی الارض")	(۲:۴)	۱۴۹	اول	حیاتِ آخرت
۶۴	دوم	خلافتِ آدم کا مفہوم	(۲:۲۸)	۳۴۹	اول	حیات بعد المات کی اہمیت
۲۸۵	دوم	خلافتِ ارضی۔ بنی اسرائیل کے لئے	(۲:۲۸)	۳۵۰	اول	حیات و موات کا مفہوم
۲۷۲	اول	خلق۔ عالمِ خلق				
۲۸۳	"					
۶۴	دوم	خلیفۃ اللہ کا غلط عقیدہ	(۲:۲۷)	۳۴۵	اول	خامرونا مراد کون ہیں؟
۳۱۷	سوم	خمر	(۲:۷)	۱۸۵	اول	ختم اللہ علی قلوبہم کا مفہوم
۱۴۶	سوم	(لحم) خنزیر سے متعلق بحث	(۱:۲)	۲۴	اول	ختم نبوت سے تکمیلِ وحی
۱۱	اول	خودی (انسانی ذات)	(۲:۸۷)	۳۶۳	دوم	
۲۵۹	سوم	خوشنودی باری تعالیٰ کا غلط تصور	(۲:۱۱۳)	۳	سوم	
۱۹۴	اول	خوف و حزن خدا کا عذاب ہے،	(۲:۱۱۸)	۱۹	سوم	
۱۳۳	دوم	خوف و حزن سے مامونیت	(۲:۷)	۱۸۴	اول	خدا (دیکھیے عنوان "اللہ")
۱۸۰	دوم	خوفِ خدا کا صحیح مفہوم				خدا، انسانی اعمال کو اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے؟

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
خیر و شر کا مسئلہ	اول	۲۵۰	(۲:۱۶)	دیاوی مفادات کے دروازے	اول	۲۴۱	(۲:۲۰)
	"	۲۶۵	(۲:۱۹)	سب کے لئے کھلے ہیں			
خیر و شر — ان کا مفہوم	دوم	۲۴	(۲:۳۰)	دو ٹوک بات کرو	دوم	۴۳۰	(۲:۱۰۴)
خیر و شر کی تمیز انسان کے اندر نہیں	دوم	۳۸	(۲:۱۳۳)	(زندگی کا) دوری تصور	اول	۴۴	(۱:۵)
				دوستداری کے تعلقات	اول	۵۹	(۱:۴)
				(مغضوب علیہ سے)			
درجات و درجات کا معنوی فرق	اول	۲۰۲	(۲:۸)	دولت جمع کرنے کی ممانعت	دوم	۲۰۸	(۲:۴۳)
درو کا مفہوم	سوم	۱۱۳	(۲:۱۵۴)	دولت مند طبقہ اپنے آپ کو	اول	۲۴۶	(۲:۱۳)
دعا کا مفہوم	اول	۳۸	(۱:۴)	عقل کل کا مالک سمجھتا ہے			
دعا کا تفصیلی مفہوم	سوم	۲۰۴	(۲:۱۸۶)	الدین — خارجی کائنات میں	اول	۲۹	(۱:۳)
دعا کا ضمنی مفہوم	سوم	۱۱	(۲:۱۱۴)	" — انسانی دنیا میں	"	"	"
دعائیں — مومنین کی	سوم	۴۹۴	(۲:۲۸۶)	(ایم) الدین کی خصوصیات	اول	۳۲	"
دلائل — قانون اور شمشیر کا	سوم	۱۵۳	(۲:۱۴۶)	دین — کتاب اللہ کی حکمرانی	اول	۳۰	"
بابی تعلق				کانامہ ہے			
دنیا اور آخرت دونوں میں حصہ	اول	۱۵۰	(۲:۴)	دین میں اکراہ نہیں	اول	۴۲	(۱:۵)
	سوم	۲۵۵	(۲:۲۰۰)		سوم	۲۴۸	(۲:۱۹۰-۹۴)
"دنیا کے مقابلے میں آخرت" کا مفہوم	اول	۲۵۳	(۲:۱۶)		"	۴۳۹	(۲:۲۵۶)
دنیا میں ذلیل قوم آخرت میں بھی	دوم	۱۱۱	(۲:۲۰-۳۰)	الدین، مذہب میں کیسے تبدیل ہو جاتا ہے	اول	۳۴	(۲:۳)
ذلیل ہوگی				— ظواہر کو مقصود بالذات سمجھ لیتے ہیں			
دنیاوی زندگی میں اعمال کے	اول	۱۴۹	(۲:۴)	— تغیر پذیر چیز نیاات کو غیر متبدل			
نتائج				قرار دینے سے			
				دین کی سب سے زیادہ مخالفت	دوم	۱۸۸	(۲:۴۱)

آیت	صفحہ	جلد	مضمون	آیت	صفحہ	جلد	مضمون
(۲:۱۶)	۲۵۳	اول	ذاتِ انسانی، نفع نقصان کا حقیقی معیار ہے۔	(۲:۴۱)	۱۸۹	دوم	مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے
(۲:۴۴)	۲۲۸	دوم	(انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے)	(۲:۴۳)	۲۱۳	دوم	دین، قرآنِ خالص کی اطاعت کا نام ہے
(۱۰:۲)	۲۳	اول	ذات کی نشوونما، وحی کی رو سے	(۲:۹۱)	۳۰۲	دوم	دین - اجتماعی نظام کا نام ہے
(۲:۱۶)	۲۵۳	"	"	(۲:۹۱)	۳۰۵	دوم	دین کا آخر الامر غلبہ
(۱:۱)	۱۱-۱۲	اول	(صفاتِ خداوندی، انسانی) ذات کی نشوونما کا معیار ہیں	(۲:۹۱)	۳۰۵	دوم	دین - یہودیت اور عیسائیت میں قومی تھا۔ قرآن نے اسے عالمگیر قرار دیا۔
(۱:۴)	۳۸	اول	ذات میں اعتدال و توازن	(۲:۴۹)	۳۴۰	دوم	دین فروشی
(۲:۱۲۹)	۶۵	سوم	(انسانی) ذات کو درخور اعتناء نہ سمجھنے والے	(۲:۸۵)	۳۶۲	دوم	دین کے نظام کی تکمیل تدریجاً ہوتی ہے
(۲:۴۰)	۱۲۳	دوم	ذبحِ ابناء کا مفہوم	(۲:۱۰۸)	۴۳۵	دوم	دین، تمام کا تمام قرآنِ مجید کے اندر ہے
(۲:۶۴)	۲۱۱	دوم	ذبحِ بقر کا واقعہ	(۲:۸۵)	۳۶۰	دوم	دین کے حصے بخرے نہیں کئے جاسکتے
(۲:۱۸۸)	۲۰۲	سوم	ذبح کرتے وقت تکبیر کا مفہوم	(۲:۱۱۳)	۴	سوم	الدین شروع سے اخیر تک ایک ہی تھا
(۲:۱۱۴)	۱۱	سوم	ذرائع اور مقصد میں فرق	()	۵	"	دین میں آمیزش
(۲:۳۰)	۷۷-۷۸	دوم	ذکر کا مفہوم	(۲:۱۳۳)	۷۰	سوم	دین اللہ کا ہوتا ہے۔ اس کی نسبت کسی انسان کی طرف نہیں کرنی چاہیے
(۲:۱۱۳)	۱۰	سوم	"	(۲:۱۴۴)	۱۵۶	سوم	دین کے بنیادی مقاصد
(۲:۱۵۲)	۱۰۶	سوم	"	(۲:۱۹۳)	۲۶۵	سوم	دین میں کسی قسم کا جبر اور زبردستی نہیں۔
(۲:۳۵)	۱۱۳	دوم	ذلت کی زندگی، آخرت میں بھی عذاب کا موجب ہوگی				
(۲:۱۷۷)	۱۶۱	سوم	ذلت کے اسباب	(۱:۱)	۱۱-۱۲	اول	(انسانی) ذات
(۱۰:۷)	۵۵	اول	ذلت و سستی (غضبِ خداوندی)	(۲:۶)	۱۶۲	"	"

ذ

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
ذلت و پستی (غضبِ خداوندی)	اول	۱۹۱	(۲: ۷۷)	رزقِ حلال ہو سکتا ہے۔			
ذمہ داریوں اور حقوق کا باہمی تعلق	سوم	۱۰۵	(۲: ۱۵۲)	رزق اور اس کی تقسیم	اول	۲۵۴	(۲: ۲۹)
ذی القربیٰ سے حسن سلوک	دوم	۳۴۹	(۲: ۸۳)	رزقِ حلال و طیب	اول	۳۵	(۲: ۲۲)
				رزق کا قرآنی مفہوم	اول	۱۰۵	(۲: ۳)
				رزق کی تنگی خدا کا عذاب ہے۔	اول	۱۹۴	(۲: ۷۷)
				رزق کی فراوانیاں۔ جنتِ آدم	دوم	۱۱۱	(۲: ۳۵)
				کی خصوصیات			
رام چندرجی کا اتباع نہیں۔	دوم	۳۴۸	(۲: ۸۳)	رزق کی اہمیت	سوم	۶۱	(۲: ۱۲۶)
اسوۃ ابراہیمی کا اتباع				رزق کے ساتھ طیب کی شرط	اول	۲۸۳	(۲: ۵۷)
رب اور ربوبیت کا مفہوم	اول	۱۶	(۱: ۱)	رزق کے لئے دعائے ابراہیمی	سوم	۶۱	(۲: ۱۲۶)
(نظام) ربوبیت کی خصوصیات	سوم	۱۵۴	(۲: ۱۷۷)	رزقِ کریم کا انتظام	سوم	۱۵۶	(۲: ۱۷۷)
ربو (سرکاری داری) کا نظام کفر ہے	اول	۱۷۳	(۲: ۶)	رسمی عبادات بے معنی اور بے نتیجہ	دوم	۵۴	باب اول
ربو کی تفصیلی بحث	سوم	۴۷۴	(۲: ۲۷۴)	ہوتی ہیں			
الرجال قوامون على النساء کی تشریح	سوم	۳۶۳	(۲: ۲۲۱)	رسول۔ ہر رسول کا اعلان کہ میں	دوم	۱۹۳	(۲: ۲۱)
رجز کے معنی ضعف یا اضمحلال	دوم	۲۹۳	(۲: ۵۹)	تمہارے ہی جیسا بشر ہوں			
رحمن اور رحیم میں فرق	اول	۲۰	(۱: ۲)	دہر، رسول کو کتاب دی گئی تھی	دوم	۲۶۵	(۲: ۵۳)
رحمت کے معنی	اول	۲۰	(۱: ۲)	رسول غالب اگر رہیں گے اس کا مفہوم	دوم	۳۰۲	(۲: ۶۱)
رحم کا صحیح مفہوم۔ عیسائیت کی	اول	۲۵	(۱: ۲)	رسول کی وفات کے بعد غلبہ دین	دوم	۳۰۶	(۲: ۶۱)
غلط نگہی				(خود) رسول کو بھی اپنی وحی پر ایمان	سوم	۴۹۰	(۲: ۲۸۵)
رزاقیت	اول	۲۸۲	(۲: ۲۱)	لانا ہوتا تھا۔			
رزق اللہ ہی رزقِ کریم اور	اول	۲۹۶	(۲: ۲۹)				

آیت	صفحہ	جلد	مضمون	آیت	صفحہ	جلد	مضمون
(۲:۸۸)	۳۶۸	دوم	رسول اللہ کی دعا۔ رب زدنی علما	(۲:۸)	۲۰۲	اول	رسول اللہ کی حیات طیبہ بطور اسوۂ حسنہ
(۲:۸۹)	۳۶۹	دوم	رسول اللہ کی بعثت کے متعلق کتب سابقہ میں ذکر	(۲:۸)	۲۰۲	اول	رسول اللہ نے جو معجزات ان کا زمانہ سر انجام دیئے ان میں فوق الفطرت عناصر کا دخل نہیں تھا
(۲:۱۰۳)	۴۱۷	دوم	رسول اللہ پر (معاذ اللہ) حادثہ				
(۲:۲۲۰)	۳۲۹	سوم	رسول اللہ کی یتیمی کی حالت	(۲:۸)	۲۰۲	اول	رسول اللہ کی دوزخیت اور بشریت
(۲:۲۲۱)	۳۲۸	سوم	رسول اللہ کی ازواج مطہرات				
(۲:۶۱)	۳۰۰	دوم	رسولوں کا قتل	(۲:۹)	۴۱۲	اول	رسول اللہ کے خلاف (معاذ اللہ) الزام تراشیاں
(۲:۱۲۴)	۳۶	سوم	رسولوں کے متعلق لا نفرق اور فصلنا بعضهم علی بعض کا مفہوم	(۲:۲۳)	۳۰۸	اول	رسول اللہ خدا کے عہد تھے
				(۲:۲۴)	۳۲۱	اول	رسول اللہ دعوت نبوت سے پہلے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے
(۲:۱۳۶)	۷۳	سوم					
(۲:۲۵۲)	۴۳۷	سوم		(۲:۲۴)	۳۲۳	اول	رسول اللہ کی سیرت حضور کا معجزہ تھی
(۲:۱۸۶)	۲۰۸	سوم	رشد	(۲:۴۱)	۱۸۲	دوم	رسول اللہ پر قریش تو ایمان لے آئے اہل کتاب نہ لائے
(۲:۲۵۶)	۴۴۰	"					
(۲:۱۸۸)	۲۰۲	سوم	رشوت کی ممانعت	(۲:۴۳)	۲۱۰	دوم	رسول اللہ کی مالی حالت
(۲:۲۰۷)	۲۵۹	سوم	رضاجوئی باری تعالیٰ سے کیا مراد ہے	(۲:۴۸)	۲۳۷	دوم	رسول اللہ کے لئے شافع یا شفیع کے الفاظ نہیں آئے۔ شاہد یا شہید کے الفاظ آئے ہیں
(۲:۲۳۲)	۴۱۰	سوم	رضاعت				
(۲:۲۲۱)	۴۴۳	"	رضاعی ماں۔ بہن سے نکاح حرام ہے				
(۲:۲۰۷)	۲۶۰	سوم	رضی اللہ عنہم ورضوانہ کا مفہوم	(۲:۴۵)	۳۳۴	دوم	رسول اللہ دل سے چاہتے تھے کہ لوگ ایمان لے آئیں
(۲:۱۹)	۲۶۶	اول	رعد				
(۲:۱۷۷)	۱۵۸	سوم	رقبۃ (فی الکراب) غلامی کے خلاف جدوجہد۔ تحریر رقبۃ	(۲:۷۸)	۳۳۸	دوم	رسول اللہ نبوت سے پہلے ان پڑھ تھے بعد میں ایسے نہیں رہے تھے

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
رکوع کا مفہوم	دوم	۲۱۱	(۲:۴۳)	زمین پر ذاتی ملکیت — رسول اللہ کے	اول	۳۰۶	(۲:۲۲)
ری الجمار (حج میں تین شیطانوں کو پتھر مارنا)			دیکھو حج	زمین کے فراش ہونے کا اعجاز	اول	۲۹۴	(۲:۲۲)
روایات اور پیش گوئیاں	دوم	۳۵۷	(۲:۸۵)	زمین کے وارث صالحین ہوں گے۔	دوم	۲۹۴	(۲:۵۹)
روایات کی رو سے قصہ آدم		۳۹۰-۴۲	(۲:۳۹) کے بعد	ابدی قانون			
روح القدس	دوم	۳۸۷	(۲:۹۷-۹۸)	زندگی اور ہلاکت، دلائل و براہین کی	اول	۱۹۶	(۲:۷۱)
روح القدس کا ایک مفہوم	دوم	۳۶۵	(۲:۸۷)	رُوسے			
روزوں (صیام) کے احکام	سوم	۱۸۴	(۲:۱۸۳)	زندگی کا آغاز کیسے ہوا۔ سائنس دانوں	اول	۲۸۵	(۲:۲۱)
رہن با قبضہ	سوم	۴۸۸	(۲:۳۸۳)	کا اعتراف عجز			
ریب اور شک میں فرق	اول	۷۳	(۲:۲)	زندگی کی نمود کے متعلق قرآنی اشارات	اول	۲۸۹	(۲:۲۱)
ریاکاری	اول	۲۱۳	(۲:۹)				
				س			
زاویہ نگاہ کا فرق	اول	۳۴۲	(۲:۲۶)	(اول) سابقون الاولون کا مقام بلند	اول	۹۴	(۲:۳)
(ایتائے) زکوٰۃ — دین کا اہم ستون	اول	۱۰۵	(۲:۳)	ساحرین دربار فرعون کا ایمان	دوم	۲۵۰	(۲:۵۰)
(ایتائے) زکوٰۃ — صرف ایسا مال نہیں	سوم	۱۶۲	(۲:۱۷۷)	سازشیں اور سرگرمیاں — منافقین کی	اول	۲۱۱	(۲:۹)
کی تاکید	دوم	۴۳۶	(۲:۱۱۰)	ساکن و منجد (ہونا زندگی کا) — غذائے	اول	۱۹۰	(۲:۷۱)
زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم اور قرآنی مفہوم	دوم	۲۰۶	(۲:۴۳)	سامری کون تھا؟	دوم	۲۵۶	(۲:۵۱)
زکوٰۃ کے متعلق ایک وضعی روایت	"	۲۰۹	"	سائل سے مراد	سوم	۱۵۸	(۲:۱۷۷)
زکوٰۃ — رسول اللہ نے مروجہ زکوٰۃ	"	۲۱۰	"	سائیکولوجی کی تحقیق — سائنس آف ہٹسری۔	دوم	۱۵۰	(۲:۴۱)
نہیں دی				نفس انسانی کے متعلق			
زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی	اول	۲۹۶	(۲:۲۲)	سبا اور حضرت سلیمانؑ	دوم	۳۰	باب اول
					اول	۲۴	(۱:۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
سبت کا واقعہ	دوم	۳۰۷	(۲: ۶۵)	سسرالی رشتے	سوم	۳۶۹	(۲: ۲۲)
سیح (تسیح)	دوم	۷۳	(۲: ۳)	سفاہت کے معنی	اول	۲۴۵	(۲: ۱۳)
سیح سموات کے معنی	اول	۳۵۲	(۲: ۲۹)	سقف محفوظ - سماء	اول	۲۹۵	(۲: ۲۲)
سبل السلام کے معنی	سوم	۴۶۳	(۲: ۲۶۱)	سلوی	دوم	۲۸۳	(۲: ۵۷)
سبل (ابن اسبل)	اول	۴۷	(۲: ۵)	(حضرت) سلیمان کے خلاف تورات کی	دوم	۳۹۵	(۲: ۱۰۲)
(فی) سبل اللہ کا مفہوم	سوم	۱۵۸	(۲: ۱۷۷)	یا وہ گوئی اور قرآن کی نعت			
شیٹ - دورِ حاضر کا بندہ - باطل خدا	اول	۳۰۴	(۲: ۲۲)	- لیکن ہماری کتب تفاسیر میں		۲۹۷	(۲: ۱۰۲)
سجدہ کا قرآنی مفہوم - اور ہمارے	دوم	۹۸	(۲: ۳۴)	سمار کو بناد اور سقف محفوظ بنایا	اول	۲۹۵	(۲: ۲۲)
سجدے				سمندر پار کرنا - بنی اسرائیل کا	دوم	۲۴۵	(۲: ۵۰)
سجدہ ملائکہ	دوم	۶۸، ۹۸		سنت (براہیمی) (قربانی)	سوم	۲۵۰	(۲: ۱۹۹)
سحر - (جادو) کی حقیقت	دوم	۴۰۴	(۲: ۱۰۲)	سنت اللہ - قانون مکافات عمل	دوم	۱۵۳	(۲: ۴۰)
سزائے دارانہ نظام - پہلے لوگوں کو	دوم	۳۵۴	(۲: ۸۵)	سود (دیکھیے رنؤ)			
محتاج بنا دینا پھر ان کی امداد				سور (دیکھیے خنزیر)			
کے لئے خیراتی کام کرنا - یہ				سورة کے معنی	اول	۳۱۶	(۲: ۲۴)
فریب نفس ہے -				سوشلزم	اول	۱۱۷	(۲: ۳)
سزائے داری کا نظام اور قرآن	اول	۱۰۸	(۲: ۲)	- فق ہے	دوم	۳۸۹	(۲: ۹۹)
	اول	۱۷۳	(۲: ۶)	سیرت - نبی کی سیرت اس کے دعویٰ	اول	۹۲	(۲: ۳)
	اول	۲۳۷	(۲: ۱۱-۱۲)	کی صداقت کی دلیل -			
	سوم	۳۲۵	(۲: ۲۱۹)	سیکولر ازم اور اسلام	اول	۱۳	(۱: ۱)
	سوم	۴۷۸	(۲: ۲۷۵)	(مذہب سیکولر ازم ہوتا ہے)	اول	۳۳۲	(۱: ۳)
سزا اور جزا کا قرآنی مفہوم	دوم	۲۳۱	(۲: ۴۸)	سیکولر ازم میں آخرت پر ایمان	اول	۱۴۶	(۲: ۴)
				نہیں ہوتا -			

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
سیکولرازم - خدا کا انکار یا اُسے محض کائناتی خدا ماننا	اول	۳۰۱	(۲:۲۲)	شرک (ثنویت شرک ہے)	اول	۵۷	(۱:۷)
سیکولرازم - انسانی ذات انکار	دوم	۳۱	باب اول	شرک کیوں ظلم عظیم ہے	دوم	۱۰۳	(۲:۳۳)
" - دو خداؤں کا عقیدہ	دوم	۱۶۵	(۲:۲۰)	شرک - قرآنِ خالص کے ساتھ شخصیتوں کو ملا دینا	دوم	۱۹۰	(۲:۴۱)
سیکولرازم کے خلاف -	دوم	۱۶۳	(۲:۴۰)	شرک، تفرقہ سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے	دوم	۲۵۹	(۲:۵۱)
حضرت عیسیٰ کا جہاد				شرک کے انسان شرفِ انسانیت کے	دوم	۲۶۲	(۲:۵۱)
سیکولرازم فسق ہے	دوم	۳۸۹	(۲:۹۹)	حرم ہو جاتا ہے، اس لئے یہ ظلم عظیم ہے۔			
سیکولرازم - پاکستان میں	دوم	۳۶۱	(۲:۸۵)	شرک کے بزدلی	دوم	۲۷۷	(۲:۵۵)
" - مذہب کے نقاب میں	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۴)	شرعیّت سازی اور دین فروشی	دوم	۳۴۰	(۲:۷۹)
" - کے تحت حکومت کا انجام	"	۲۸۷	(۲:۲۰۹)	شعار (محسوس مراسم) بھی زوری ہیں	اول	۱۳۹	(۲:۳)
سیکولرازم کا نظریہ کائنات	دوم	۸۷	(۲:۳۱)	شعار کا مفہوم	سوم	۱۲۲	(۲:۱۵۸)
سیات کے معنی	سوم	۱۳۷	(۲:۱۶۸-۶۹)	شعور کا قرآنی مفہوم	اول	۲۰۷	(۲:۱۱۴)
				شفاعت اور شفاعت سیئہ	دوم	۲۳۵	(۲:۹)
				شفاعت کا باطل عقیدہ	دوم	۲۳۳	(۲:۴۸)
				شفاعت کا قرآنی مفہوم	دوم	۲۳۴	"
				شفیع یا شفیع کا لفظ رسول اللہ کے لئے نہیں آیا، شاہد یا شہید کا لفظ آیا ہے	دوم	۲۳۷	"
				شک اور ریب میں فرق	اول	۷۳	(۲:۲)
				شکر کا مفہوم	دوم	۲۶۳	(۲:۵۲)
شب بارات	سوم	۱۹۵	(۲:۱۸۵-۸۸)				
شجر - جس سے آدم کو منع کیا گیا تھا - سے کیا مراد تھی؟	دوم	۱۱۳	(۲:۳۵)				
شخصیت پرستی کی زنجیروں کو توڑ دیا گیا۔	دوم	۹۸	(۲:۳۴)				
شراب (دیکھتے خمر)							

آیت	صفحہ	جلد	مضمون	آیت	صفحہ	جلد	مضمون
(۲:۱۵۸)	۱۲۱	سوم	صفا اور مروہ	(۲:۱۸۹)	۲۳۰	سوم	شمسی کیلنڈر
(۲:۲۵۵)	۲۳۳	سوم	صفات خداوندی - اصل سوال	(۲:۱۷۷)	۱۵۳	سوم	شمسیر کا مقام دین میں
			اپنی کا ہے	(۲:۱۹۳)	۲۷۷	"	
(۲:۱۶)	۲۵۵	اول	صَلَوَاتُ	(۲:۲۸۲)	۴۸۳	سوم	شہادت کے متعلق ہدایات
(۲:۳)	۹۷-۱۰۲	اول	صلوٰۃ - اقامتِ صلوٰۃ دین کا	(۲:۱۶)	۲۵۵	اول	شہداء
			بنیادی گوشہ	(۲:۱۵۴)	۱۱۰	سوم	(مقتولین فی سبیل اللہ)
(")	"	"	صلوٰۃ کے عمومی معانی	(۲:۱۵۴)	۱۱۱	سوم	کے متعلق افسانے
(")	"	"	الصلوٰۃ - اسلامی نظامِ حاکمیت	(۲:۱۸۹)	۲۲۹	سوم	شہر الحرام
(")	۱۲۲	"	(نماز اور صلوٰۃ میں فرق)	(۲:۳۰)	۵۰	دوم	شیطان
(")	۱۱۸	"	الصلوٰۃ اور معاشیات				
(۲:۳)	۱۲۴	اول	صلوٰۃ فریضہ موقت ہے				
(۲:۳)	۱۲۵	"	صلوٰۃ کی جزئیات قرآن میں نہیں	(۲:۱۹)	۲۶۶	اول	صاعقہ
			دی گئیں	(۲:۲۵)	۲۲۲	دوم	صبر
(۲:۲۱۹)	۳۶۲	سوم	(بلا سمحہ) صلوٰۃ یا تلاوت قرآن مجید	(۲:۱۳۸)	۷۴	سوم	صبغۃ اللہ کا مفہوم
(۲:۱۱۰)	۴۳۶	دوم	(اقامت) صلوٰۃ و ایٹائے زکوٰۃ	(۲:۲۳)	۳۱۳	اول	صحابہ کا ایمان اور مقام
			کی تاکید	(۲:۹)	۲۲۵	"	سب تو من تھے
(۲:۲۳۸)	۴۱۲	سوم	صلوٰۃ الوسطی	(۲:۲۷۲)	۴۷۲	سوم	صدقات کا مفہوم
(۲:۱۸)	۲۶۳	اول	صوم و کلمہ و عقی	(۲:۹)	۲۱۲	اول	صدقات کی تقسیم میں منافقین کی
(۲:۱۸۳)	۱۸۴	سوم	صوم (صیام) کے احکام				الزام تراشیاں
(۲:۱۸۷)	۱۹۷	سوم	صوم کی غایت	(۱:۵)	۴۴	اول	صراطِ مستقیم - ایک عظیم حقیقت
				(")	۴۴	"	(زندگی کا سفر دوری نہیں صراط ہے)
(۲:۱۸۷)	۱۹۷	سوم	صیام - بطور کفارہ	(")	۴۷	"	(خدا خود) صراطِ مستقیم پر ہے

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
ض				طیب رزق کا مفہوم نیز دیکھیے عنوان "رزق"	اول	۳۰۵	(۲/۲۲)
ضبط ولادت	سوم	۲۶۰-۴۴	(۲:۲۲۳)	ظ			
حزار (مسجد) - تفرقہ کی بنیاد	اول	۱۷۳	(۲:۶)	ظہار - بیویوں کو ماں کہہ دینا	سوم	۳۸۲	(۲:۲۲۴)
ضلالت کا مفہوم	"	۵۹	(۱:۷)	ظلمات کے معنی	اول	۲۶۱	(۲:۱۷)
ضالین کا اتباع مت کرو	"	۶۰	(۱:۷)	ظلم عظیم - شرک کیوں ظلم عظیم ہے	دوم	۲۶۱	(۲:۵۱)
ط				ظواہر اور غایت کا تعلق	"	۱۲۳	(۲:۳)
طاغوت سے فیصلہ کرنا شیوہ منافقین	اول	۲۱۵	(۲:۹)	ظواہر کو ترک کر دینے کا نتیجہ	"	۱۲۳	(۲:۳)
اکفر، باطاغوت، ایمان باللہ	سوم	۷۲	(۲:۱۳۵)	ظواہر کو مقصود و منتہی سمجھ لینے کا نتیجہ	"	۱۲۳	(۲:۳)
کی اولین منزل ہے				— اس سے دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے	"	۱۲۳	(۲:۳)
طاغوت کی راہ میں جنگ	سوم	۲۷۴	(۲:۱۹۳)	ع			
طاغوت سے کفر	سوم	۴۴۱	(۲:۲۵۶)	عاجل مفادات سب کے لئے کھلے ہیں	اول	۲۷۱	(۲:۲۰)
حضرت طالوت کا انتخاب	سوم	۴۱۹	(۲:۲۴۶)	عادات و عمرانیات کے اثرات کا غلط عقیدہ	دوم	۴۶	(۲:۳۰)
طبقاتی تقسیم خلاف قرآن ہے	دوم	۳۵۴	(۲:۸۵)	عاقبتین کا مفہوم	سوم	۵۸	(۲:۱۲۵)
طبقاتی کشمکش - خطرناک حد تک	دوم	۱۲۶	(۲:۳۶)	عالم خلق و امر	اول	۲۸۳	(۲:۲۱)
طفیان کا مفہوم	اول	۲۴۸	(۲:۱۵)	عالمین کا مفہوم	"	۱۸	(۱:۱)
طلاق سے متعلق احکام	سوم	۳۸۵	(۲:۲۲۵)	(حضرت عائشہ کی عمر شادی کے وقت	سوم	۳۳۸	(۲:۲۲۰)
طواف کا مفہوم	سوم	۳۰۳	(۲:۲۱۵)				
طور سے مراد	دوم	۳۰۶	(۲:۶۳)				
طیب رزق کا مفہوم	دوم	۲۸۳	(۲:۵۷)				

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
عالمی قوانین	سوم	۳۹۴	(۲:۲۳۰)	عرش خداوندی	دوم	۶۷	باب اول
عبادت کا صحیح مفہوم	اول	۳۵	(۱:۴)	عزل (اس کی تفسیر از روئے روایت)	سوم	۳۷۴	(۲:۲۲۳)
عبادت اپنی آزاد مملکت میں ہی ہو سکتی ہے	"	۳۶	(۱:۴)	عزم کی کمزوری (آدم میں)	سوم	۴۹۳	(۲:۲۸۶)
عبد۔ رسول اللہ خدا کے عبد تھے	"	۳۰۸	(۲:۲۳)	عزیر کون تھا؟	دوم	۲۵۴	(۲:۵۱)
عبدیت کا مقام۔ شرفِ انسانیت	دوم	۱۰۳	(۲:۳۴)	عشق حقیقی اور عشق مجازی	سوم	۱۳۰	(۲:۱۶۵)
عبوری دور سے متعلق احکام	دوم	۳۵۲	(۲:۸۵)	عصا کے معنی	دوم	۲۴۷	(۲:۵۰)
عہد اللہ سے مراد	اول	۳۴۴	(۲:۲۷)	عفو	دوم	۲۶۲	(۲:۵۲)
عہد فراموشی	اول	۳۴۴	(۲:۲۷)	العفو کا مفہوم	سوم	۳۲۶	(۲:۲۱۹)
(ایفا سے) عہد کا مفہوم	سوم	۱۶۳	(۲:۱۷۷)	عقبہ۔ دین، عقبہ ہے	دوم	۲۲۳	(۲:۴۵)
عدالتی منازک کو بھی عذاب کہا گیا ہے	اول	۱۹۹	(۲:۷)	العقبہ کا مفہوم (العقبہ کے معنی)	سوم	۳۲۳	(۲:۲۲۰)
عداوت کی لعنت	دوم	۱۲۶	(۲:۳۶)	والعقبۃ۔ دین کی گھاٹی کیا ہے؟	سوم	۱۵۹	(۲:۱۷۷)
عدت	سوم	۴۰۶	(۲:۲۲۸)	عقل و فکر سے کام لینے والے	اول	۵۵	(۱:۷)
عدل اور رحم میں تطابق	اول	۲۶	(۲:۲)	(امور آخرت میں بھی) عقل و فکر	سوم	۳۲۷	(۲:۲۱۹)
عدل و احسان کا حکم	دوم	۲۹۱	(۲:۵۸)	عقل کا تجرباتی طریق	اول	۱۱۵	(۲:۳)
عدل کے ایک معنی۔ کچھ سے دلا	دوم	۲۳۸	(۲:۴۸)	" " "	"	۲۵۸	(۲:۱۷)
عذاب کے معنی	اول	۱۸۸	(۲:۷)	عقل تنہا زندگی کے مسائل کا حل	"	۲۶۰	(۲:۱۷)
عذاب کی شکلیں۔ بنی اسرائیل پر	دوم	۲۹۹	(۲:۶۱)	دریافت نہیں کر سکتی	سوم	۹۰	(۲:۱۷۳)
عربی زبان کی وسعت	اول	۷۳	(۲:۲)	علماء۔ اسلام میں علماء کا کوئی الگ	سوم	۹۰	(۲:۱۷۳)
عربی زبان کی کتاب	اول	۴۲۰	(۲:۲۴)	گر وہ نہیں	اول	۶	(۱:۱)
عرس	سوم	۱۳۰	(۲:۱۷۵)	علماء کون ہیں؟	دوم	۸۷	(۲:۳۱)
				(ہمارے) علماء کے علم اور کردار کے متعلق	دوم	۳۶۹	(۲:۸۸)

آیت	صفحہ	جلد	مضمون	آیت	صفحہ	جلد	مضمون
(۲: ۶۰)	۲۹۷	دوم	(حضرت) عیسیٰ اور یحییٰ عیسیٰ	(۲: ۸۸)	۳۶۹	دوم	مشہور علماء کی شہادت۔ امام غزالی
(۲: ۶۰)	۱۹۳	دوم	” کے انقلاب آفرین عظمت				مفتی محمد عبیدہ۔ مولانا آزاد۔ اور
(۲: ۸۳)	۳۴۳	دوم	” کے ابن اللہ ہونے کے				علامہ اقبالؒ وغیرہ کی تنقیدات۔
			باطل عقیدہ کی تردید	(۲: ۸۸)	۳۶۸	دوم	علم حاصل کرنے اور اسے بڑھاتے
(۲: ۳۰)	۷۸	دوم	عیسائیت اور جنگ				رہنے کی ضرورت کبھی ختم نہیں
(۲: ۴۸)	۲۳۹	دوم	عیسائیت میں کفارہ حضرت مسیح				ہو سکتی۔
			کا عقیدہ	(۲: ۱۱-۱۲)	۲۳۳	اول	علو فی الارض، بغیر الحی منع ہے
				(۲: ۱۰۹)	۴۳۵	دوم	علیحدگی۔ مخالفین سے علیحدگی
							بھی جس کی راہ انداز سے اختیار کرو
(۲: ۵۰)	۲۴۴	دوم	غار کا واقعہ۔ رسول اللہ کی ہجرت	(۲: ۱۵۲)	۱۰۴	سوم	عمرہ
			کے دوران	(۲: ۱۸۹)	۲۲۸	”	”
(۱: ۷)	۵۴	اول	غضب خداوندی سے کیا مراد ہے	(۲: ۸۰-۸۲)	۳۴۲	دوم	عمل اور فعل میں فرق
(۲: ۲۲۰)	۳۲۸	سوم	غلاموں کو آزاد کرنا یا کرنا دین	(۲: ۳۶)	۱۱۳-۱۱۵	دوم	عورت کی حیثیت۔ عیسائیت میں
			کی غایت ہے	(”)	”	”	” — ہماری ضمنی روایت
(۲: ۱۷)	۲۶۰	اول	غلامی کا مسئلہ				اور تفاسیر کی رو سے
(۲: ۸۵)	۳۵۸	دوم	”	(”)	”	”	” — قرآن کی رو سے
(۲: ۴۰)	۱۹۰	دوم	غلامی عذاب ہے	(۲: ۹)	۲۱۸	اول	(شریف) عورتوں سے چھڑ چاڑ۔
(۲: ۵۵)	۲۷۲	دوم	غلامی میں سنجیدگی۔ بنی اسرائیل کی				سنگین ترین جرم ہے
(۲: ۱۷۷)	۱۵۸	سوم	غلامی کے لئے جد جہد کرنے والوں	(۲: ۲۸۲)	۴۸۵	سوم	(ایک مرد کے عوض دو عورتوں
			کی اسناد				کی گواہی
(۲: ۶۱)	۳۰۲	دوم	غلبہ۔ خدا اور رسول کا۔	(۲: ۲۳۳)	۳۷۷	سوم	” عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں ”
			دین حق کا				کا مفہوم

آیت	صفحہ	جلد	مضمون	آیت	صفحہ	جلد	مضمون
(۲:۳۳)	۳۰۴	اول	فرعون — دورِ جاہلیت کا زند	(۲:۳۴)	۱۰۱	دوم	غلطی کا اعتراف، اصلاح کے امکانات
(۲:۴۰)	۱۵۷	دوم	فرعون مصر				روشن کر دیتا ہے
(۲:۵۰)	۲۴۹	دوم	فرعون کا ڈوبتے وقت ایمان	"	"	"	— اس کی ذمہ داری قبول نہ کرنا
"	لفظ ٹوٹا	دوم	فرعون کے منہ میں جبریل مٹی ٹھونس رہا تھا۔				الہییت ہے
"	۲۵۲	دوم	فرعون کی لاش کا محفوظ رکھے جان	(۲:۴۱)	۱۹۳	دوم	غلو — رسولوں کو خدا اور علمائے مثنیٰ
۲:۵۲	۲۶۴	دوم	فرقان کے معنی				کو رسول بنا دینا
(۲:۳)	۱۳۵	اول	فرقہ اہل قرآن کی گمراہی	(۲:۴۱)	۱۹۳	دوم	غلو فی الدین کفر ہے
(۲:۶)	۱۷۲	اول	فرقہ بندی شرک اور کفر ہے۔ خدا کا عذاب ہے	(۲:۲۵۶)	۴۴۱	سوم	غواہیت — گمراہی
				(۲:۳)	۹۰	اول	غیب کا مفہوم — ایمان بالغیب
				(۲:۳۱)	۹۵	دوم	غیب و شہود کا سنات
(۲:۷)	۱۹۳	اول					ف
(۲:۹)	۲۱۵	اول	فرقہ بندی — منافقین کی سازش				(سورۃ) فاتحہ کا خلاصہ
"	"	"	فرقہ ساری کے لئے مسجد خرا کی تعمیر	(۱:۱-۷)	۶۴	اول	فاتحین کا مفتوحہ حلاقوں میں داخلہ
(۲:۴۱)	۱۹۲	دوم	فرقہ بندی — یہود و نصاریٰ کی باہمی فرقہ بندی اور ہم	(۲:۵۸)	۲۸۶	دوم	فاتح کے کہتے ہیں
(۲:۴۳)	۳۳۱	دوم		(۲:۲۶)	۳۴۳	اول	فاتحہ دولت کسی کے پاس نہ ہے
(۲:۱۱۳)	۶	سوم	فساد اور اصلاح کا مفہوم	(۲:۲۱)	۲۸۳	اول	فاتح السموات والارض
(۲:۱۱-۱۲)	۲۲۹	اول	فساد آدمیت کے اہم گوشے	(۲:۲۱۹)	۳۲۴	سوم	فائلیں لیٹنا
(۲:۱۱-۱۲)	۲۳۱	اول	فساد انگیزیاں اور خوں ریزیاں	(۲:۱۹۳)	۲۷۵	سوم	فتنہ کے معنی
(۲:۳۰)	۷۶	دوم	فساد انگیزیاں اور خوں ریزیاں	(۲:۱۶۸-۱۶۹)	۱۳۶	سوم	فحشاء کے معنی
(۲:۹۹)	۳۸۹	دوم	فسق — اخلاقی پابندیوں سے دور بھاگنے کا نام ہے	(۲:۲۲)	۲۹۴	اول	خراشا — زمین کو فراشا پیدا کیا گیا۔

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(سیکولرازم۔ سوشلزم۔ کمیونزم۔ اسی جذبہ کی پیداوار ہیں)	اول	۲۴۶	(۲:۱۴)	قانونِ مکافاتِ عمل	دوم	۱۵۵	(۲:۴۰)
فضیلت کا قرآنی معیار	دوم	۳۲	باب اول	(نیز دیکھئے مکافاتِ عمل)	سوم	۴۹۳	(۲:۲۸۴)
فطرت - فطرت اللہ اور انسانی فطرت کا غلط عقیدہ۔	دوم	۶۶	باب اول	قانون کی حکمرانی	اول	۷۱	(۲:۲)
فطرت کی قوتیں (ملائکہ)	دوم	۶۸	باب اول	قانون اور اس کی غایت	سوم	۱۸۶	(۲:۱۸۳)
فطرت کی تسخیر	دوم	۸۲	(۲:۳۱)	قانون اور حکم میں فرق	سوم	۱۸۴	(۲:۱۸۶)
فطرت کے قوانین اور شاید کا علم	دوم	۸۹	(۲:۳۱)	قانون کا اطلاق اس کی تاریخِ نفاذ سے ہوگا۔ سابقہ تاریخ نہیں	سوم	۴۷۹	(۲:۲۷۵)
فطرت کے قوانین بالحق ہیں	اول	۱۸۹	(۲:۷)	قبلہ - مرکزِ طاعت ہے	دوم	۲۱۶	(۲:۴۳)
فطری حواش اور انسانی اعمال	دوم	۳۴۲	(۲:۱۸۲)	قبلہ کی تحویل کی ہدایات	سوم	۸۶	(۲:۱۴۲)
فعل اور عمل میں فرق	سوم	۱۲۳	(۲:۱۵۹)	(تعبین) قبلہ کا مقصد	سوم	۹۰	(۲:۱۴۳)
فقہ اور قرآن	دوم	۳۵۵	(۲:۱۸۵)	قبلہ کی طرف رخ کر لینا مقصود بالقد نہیں	سوم	۱۵۵	(۲:۱۷۷)
فلاحی مملکت بھی نظامِ سرمایہ داری کا فریب ہے	اول	۲۰۶	(۲:۱۹)	قتال۔ (دیکھو "جنگ")	دوم	۳۰۰	(۲:۹۱)
فواد اور قلب	سوم	۲۵۳	(۲:۱۹۹)	قتلِ انبیاء و رسل	دوم	۳۰۴	(۲:۱۰۷)
(اصحاب) الغیل	دوم	۳۴۶	(۲:۱۸۳)	قتل بغیرِ الحق کا مفہوم	دوم	۳۳۳	(۲:۷۳)
فیمل لائف کی اہمیت	اول	۱۱۷	(۲:۳)	قتل کا واقعہ - بنی اسرائیل کا	دوم	۷۳	(۲:۳۰)
قانون	اول	۲۹۳	(۲:۲۱)	قدس - قدوس	اول	۲۷۳	(۲:۳۰)
'قالوبلی' اور یومِ الست کے افسانے	اول	۷۲	(۲:۲)	تدیر کے معنی	اول	۲۷۳	(۲:۳۰)
				قادر مطلق کا مفہوم	اول	۲۷۳	(۲:۳۰)
				قرأت کا فن	دوم	۲۹۳	(۲:۵۹)
				قرآنِ کریم حضور کے زمانے ہی میں	اول	۷۲	(۲:۲)

آیت	صفحہ	جلد	مضمون	آیت	صفحہ	جلد	مضمون
(۲:۲۱۹)	۳۲۲	سوم	قرآن مجید کی تلاوت مفہوم سمجھے بغیر				مرتب و مدقّق شکل میں موجود تھا
(۲:۸۷)	۳۶۶	دوم	قرآن خالص سے نفرت	(۲:۳)	۱۳۵	اول	(فرقہ اہل) قرآن کی گمراہی
(۲:۸۷)	۳۶۶	دوم	قرآن میں تبدیلی کا مطالبہ	(۲:۴)	۱۴۱	"	قرآن کریم ہی منزل من اللہ ہے
(۲:۹۳)	۳۸۳	دوم	قرآن مجید کو پڑھنا اور سننا اور اس پر عمل نہ کرنا ہمارا شیوہ ہے	(۲:۶)	۱۷۲	"	قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم نہ کرنے والے کافر ہیں
(۲:۱۰۵)	۴۳۳	دوم	قرآن کریم خیر ہے۔ اس کا مطلب	(۲:۶)	۱۷۳	"	قرآن کی آواز کسی تک نہ پہنچے دو۔ کفار کی ٹیکنیک
(۲:۱۱۳)	۹-۱۰	سوم	قرآن کی حکمرانی				
(۲:۱۸۲)	۱۷۹	سوم	قرآن کو حدیث منسوخ کر سکتی ہے؟	(۲:۱۷)	۲۶۲	اول	قرآن نور ہے
(۲:۱۷۲)	۸۸	سوم	قرآن کریم کی تفسیر میں اور اس کے ترجمے کس طرح کئے گئے۔	(۲:۲۱)	۲۸۰	اول	قرآن عالمگیر انسانیت کے لئے ہے
				(۲:۲۳)	۳۹۰-۳۱۵	اول	قرآن کافی ہے
(۲:۱۵۹)	۱۲۲	سوم	قرآن کریم بالکل واضح کتاب ہے	(۲:۸۷)	۳۶۶	دوم	
(۲:۱۵۹)	۱۲۶	سوم	قرآن کے باطنی معانی	(")	۳۸۰-۱۶	اول	قرآن کا چیلنج کہ اس جیسی کتاب لاؤ۔
(۲:۱۸۴)	۱۹۰	سوم	قرآن کا نزول۔ تاریخ انسانیت کا عظیم ترین انقلابی واقعہ	(۲:۲۴)	۳۲۰	"	قرآن۔ عربی زبان کی کتاب
(۲:۱۸۴)	۱۹۱	سوم	قرآن طے چرشن مسرت مناد	(۲:۲۴)	۳۲۳	اول	قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا
(۲:۱۸۶)	۲۲۶	سوم	قرآن ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے۔	(۲:۴۰)	۱۴۸	دوم	قرآن فہمی کے تین طریقے
(۲:۲۱۹)	۳۲۲	سوم	قرآن کی تلاوت سمجھے بغیر	(۲:۴۱)	۱۸۷	"	قرآن کریم کے مصدق ہونے کا مفہوم
(۲:۳)	۹۸	اول	قرآنی اصطلاحات کا مفہوم	(۲:۲۴)	۳۱۶	اول	قرآن کی ترتیب بھی معجزہ ہے
(۲:۱۵۹)	۱۲۵	سوم	قرآنی تعلیم کو مسخ کرنے اور چھپانے کے طریق	(۲:۷۳)	۳۲۸	دوم	قرآن مجید میں (معاذ اللہ) ابہام ہے (مودودی مرحوم کا عقیدہ)
(۲:۱۸۶)	۲۲۳	سوم	قرب خداوندی	(۲:۷۸)	۳۳۹	دوم	قرآن مجید کی تلاوت مفہوم سمجھے بغیر

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(ذوی القربیٰ کے لئے اتفاق قربانی	سوم	۱۵۷	(۲: ۱۷۷)	(مسلمانوں کی) قوم کا جدِ گائے شخص	اول	۷۷	(۲: ۲۱)
قربانی	سوم	۲۴۴	(۲: ۱۹۹)	قوموں کا استبدال — عذاب	اول	۱۹۲	(۲: ۷۷)
قربانی سے متعلق بحث	سوم	۲۳۵	(۲: ۱۸۹)	خداوندی ہے			
قرض حسنہ — خدا کو قرض دینا	سوم	۴۱۶	(۲: ۲۴۵)	قوموں کے عروج و زوال کے قوانین	دوم	۱۵۵	(۲: ۴۰)
قرعہ اندازی	سوم	۳۲۴	(۲: ۲۱۹)	قوموں کی ہلاکت سے مراد	دوم	۱۵۵	(۲: ۴۰)
قریش کی مخالفت کی وجوہات	دوم	۴۳۲	(۲: ۲۰۵)	قوموں کے عروج و زوال کا ابدی اصول	سوم	۶۹	(۲: ۱۳۴)
تساوت قلبی — یہودیوں کی قصاص کا حکم — جرم قتل کی سزا	دوم	۳۳۰	(۲: ۷۷)	قومیت پرستی وجہ فسادِ آدمیت	اول	۲۳۹	(۲: ۱۱-۱۲)
قلب اور فؤاد	سوم	۱۷۹	(۲: ۱۷۸)	کے خلاف مفکرین	اول	۲۴۱	(۲: ۱۱-۱۲)
قلّت و کثرت معیار نہیں۔ صلاحیت معیار ہے۔	اول	۲۰۶	(۲: ۹)	مغرب کی چیخ و پکار			
قری کیلنڈر	سوم	۲۳۰	(۲: ۱۸۹)	قیامت کے دن کا صحیح مفہوم	سوم	۷	(۲: ۱۱۳)
قوانین فطرت اور قرآنی قوانین	اول	۱۱-۱۹	(۱: ۱)				
قوانین فطرت خارجی کائنات کا دین ہیں۔	اول	۲۹-۳۰	(۱: ۳)				
قوانین خداوندی ہی تقدیرات الہیہ ہیں	اول	۲۷۳	(۲: ۲۰)	دشاویزات کے) کاتب کے متعلق ہدایات	سوم	۴۸۴	(۲: ۲۸۲)
اپنے قوانین کی خلاف ورزی خود خدا بھی نہیں کرتا	دوم	۴۴۴	(۲: ۸۳)	کارل مارکس کا اعترافِ عجز	اول	۱۱۶	(۲: ۳)
قوانین اور حکمت کا امتزاج	سوم	۲۸۳	(۲: ۲۰۹)	کافۃ — اسلام کا مطالبہ	سوم	۲۸۳	(۲: ۲۰۸)
قوت اور علم کا امتزاج	سوم	۴۲۱	(۲: ۲۴۷)	کائنات کس طرح عدم سے وجود میں آگئی	اول	۱۶	(۱: ۱)
قوت کا استعمال — جائز اور مجاز	دوم	۸۰	(۲: ۳۰)		اول	۲۸۵-۸۶	(۲: ۲۱)
				کائنات میں دینِ خداوندی	اول	۳۰-۳۱	(۱: ۳)

ک/گ

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے	اول	۱۷۰	(۲:۶)	کتاب کے ایک حصے پر ایمان	اول	۵۷	(۱:۷)
(آغاز) کائنات کے متعلق سائنس دانوں کا عجیب فہم	اول	۲۸۵	(۲:۲۱)	دوسرے سے انکار			
کائنات کی تسخیر	دوم	۶۸	باب اول	کتاب کے معنی	اول	۷	(۲:۲)
	دوم	۸۳	(۲:۳۱)	(اہل) کتاب کے ایمان کا مطالبہ	اول	۷۳	(۲:۳)
کائنات کے متعلق افلاطون کا نظریہ	دوم	۸۷	(۲:۳۱)	(اہل) کتاب ہیں سے حضور پر بہت کم ایمان لائے۔	سوم	۲۸	(۲:۱۲۰)
وحشت الوجود				کتاب و حکمت و نبوت۔ بنی اسرائیل کو ملی تھی۔	دوم	۱۷۷	(۲:۴۰)
مادہ پرستوں کا نظریہ	دوم	۸۷	(۲:۳۱)	کتاب۔ ہر رسول اور ہر نبی کو دی گئی تھی۔	دوم	۲۶۵	(۲:۵۳)
کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے۔ اسے باطل سمجھنا کفر ہے۔	دوم	۸۹	(۲:۳۱)	کتاب ہر نبی کو ملی تھی	سوم	۷۲	(۲:۱۳۶)
(تخلیق) کائنات اور قانون مکافات	دوم	۹۳	(۲:۳۱)	(اہل) کتاب کے ہاں کا کھانا	سوم	۱۴۵	(۲:۱۷۳)
عمل کا باہمی تعلق				کتاب و حکمت۔ قانون اور ان کی نغایت	سوم	۱۸۶	(۲:۱۸۳)
(اشیاء) کائنات کا محدود علم	دوم	۹۴	(۲:۳۲)	کتب سابقہ پر ایمان کے معنی	اول	۱۷۲	(۲:۴)
کائنات کا غیب و شہود۔ مضر و محسوس	دوم	۹۵	(۲:۳۳)	کتاب کو بھی اذین آتینہم (الکتب) کہا گیا ہے	سوم	۷۳	(۲:۱۳۶)
کائناتی حوادث اور انسانی اعمال	اول	۱۸۹	(۲:۷)	کتاب حق	دوم	۲۰۱	(۲:۴۳)
کائناتی خدا اور ارضی خدا اور۔ یہ سیکولر ازم یا کفر ہے۔	اول	۳۰۱	(۲:۲۲)	کثرت و قلت کا مسئلہ۔ معیار کامیابی	سوم	۲۰۴	(۲:۲۴۹)
کائناتی قوتیں۔ ملائکہ	دوم	۶۷	باب اول	تعداد کی کثرت نہیں۔			
کبریائی شان خداوندی ہے	اول	۲۳۵	(۲:۱۱-۱۲)				
کتاب اللہ (کلمہ) کا نام الدین ہے	اول	۲۹۰-۳۰	(۱:۳)				

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
کذب کا قرآنی مفہوم	اول	۲۰۵	(۲:۱۸)	کلم اللہ موسیٰ تکلیما کا مفہوم	سوم	۴۲۹	(۲:۲۵۳)
کرامتِ اولیاء	اول	۳۱۰	(۲:۲۳)	کلمات اللہ سے مراد وحی خداوندی	دوم	۱۳۱	(۲:۳۴)
کرتی خداوندی	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)	اور اس پر مبنی نظریہ حیات	سوم	۴۲۰	(۲:۲۲۴)
کسب اور کتاب میں فرق	سوم	۴۹۳	(۲:۲۵۵)	کمانڈر کے انتخاب کا معیار	دوم	۲۰۸	(۲:۴۳)
کشف الہام کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)	کیونز م اور اسلام کا فرق	دوم	۲۸۳	(۲:۵۴)
کعبہ (مسجد الحرام) کی دیکھ بھال	سوم	۱۵	(۲:۱۱۴)	کیونز م اور قرآنی نظام کے رزق میں فرق	دوم	۳۶۹	(۲:۹۹)
کعبہ - نظام خداوندی کا مرکز محسوس	سوم	۴۴	(۲:۱۲۲)	کیونز م - فق ہے	اول	۱۱۵	(۲:۳)
مرکز اجتماع انسانیت	سوم	۵۵۵	(۲:۱۲۵)	مکمل العمل نہیں	سوم	۴۴۱	(۲:۲۵۶)
امت میں وحدت پیدا کرنیکا ذریعہ	سوم	۹۰	(۲:۱۲۳)	کے فلسفہ کی بنیادی کمزوری	دوم	۲۵۳	(۲:۵۱)
کعبہ کی محسوس علامات کو مقصود بالذات	سوم	۱۰۱	(۲:۱۲۸)	گوسالہ پرستی کا واقعہ (بنی اسرائیل کا)	دوم	۲۶۱	(۲:۶۱)
نہ سمجھ لینا	اول	۱۴۴	(۲:۶)	کے سلسلے میں ہمارے	دوم	۲۶۰	(۲:۶۰)
کفار مومنوں پر غالب نہیں آسکتے	اول	۱۴۵	(۲:۶)	تفسیری افسانے	سوم	۲۳۰	(۲:۱۸۹)
کفار کے ساتھ دوستانہ تعلقات	اول	۱۴۵	(۲:۶)	کیلنڈر - شمسی یا قمری	سوم	۲۳۵	(۲:۲۱۹)
تمام نہیں کئے جاسکتے	دوم	۲۳۹	(۲:۴۸)	لاٹری	دوم	۳۴۴	(۲:۸۸)
کفارہ کا مفہوم	سوم	۴۴۰	(۲:۲۵۶)	لعنت کے معنی	سوم	۱۲۹	(۲:۱۵۹)
کفر بالطغوت - ایمان باللہ سے پہلے	اول	۱۵۹	(۲:۶)	لوٹریاں (دیکھو غلامی)	سوم	۴۸۳	(۲:۲۸۲)
کفر بھی (ایمان کی طرح) خود اختیار کیا جاتا ہے	اول	۱۵۹	(۲:۶)	لین دین کے متعلق ہدایات	سوم	۴۸۳	(۲:۲۸۲)
کفران نعمت (دیکھئے "نعمت")	سوم	۱۹	(۲:۱۲۸)				
کلام اللہ	سوم	۴۲۹	(۲:۲۵۳)				
	سوم	۴۲۹	(۲:۲۵۳)				
(خدا سے) حکلائی کا عقیدہ	سوم	۴۲۹	(۲:۲۵۳)				

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
م				اشخاص پرستی اس کا مسلک ہوتا ہے۔ خود ساختہ شریعت کو شریعتِ خداوندی بنانا ہے۔ دین میں غلو کرتا ہے۔ مذہب کو کاروبار بنا لیتا ہے۔ باسانی جنت دلانے کا وعدہ کرتا ہے	دوم	۱۹۴	(۲:۴۱)
ماحول کے اثرات کا غلط عقیدہ	دوم	۳۳	باب اول	مذہب جب ذریعہ معاش بن جائے۔ مذہبی آزادی (دیکھئے "جنگ")	دوم	۳۴۰	(۲:۷۹)
مارکس کا نظریہ تاریخ	دوم	۱۵۱	(۲:۴۰)	مذہبی پیشوا - یہود کے	دوم	۲۳۰	(۲:۴۴)
ماضی پرستی کی تباہ کاریاں	سوم	۷۸	(۲:۱۴۱)	مذہبی پیشواؤں کی دین فروشی	اول	۹۲	(۱:۷)
مال و دولت کی اہمیت	سوم	۱۷۶	(۲:۱۸۰)	مذہبی پیشوائیت اور دین کا نظام	اول	۳۳	(۱:۳۳)
مالک کے معنی	اول	۲۸	(۱:۳)	فسادِ آدمیت کی بنیاد ہے	اول	۲۳۵	(۲:۱۱-۱۲)
مثنیٰ کی قانونی حیثیت کچھ نہیں	سوم	۳۵۹	(۲:۲۲۱)	کاکاروبار	اول	۲۵۶	(۲:۱۶)
منفعہ	سوم	۳۹۵	(۲:۲۳۲)	یہودیوں کی	دوم	۱۶۳	(۲:۴۰)
متقین کی خصوصیات	اول	۷۵	(۲:۲)	مذہبی رسوم و مناسک تو ہم پرستی پر مبنی ہوتے ہیں مزدکی منرا (دیکھئے "جنگ") (نیز دیکھئے "ارتداد")	سوم	۲۲۸	(۲:۱۸۹)
مثالوں کے ذریعے تبیانِ حقیقت	اول	۳۴۱	(۲:۲۶)	مرشد صرف خدا ہے	سوم	۲۲۵	(۲:۱۸۶)
(قرآنی) مثالوں کے چند نمونے	اول	۳۴۳	(۲:۲۶)	موضات اللہ سے مراد	سوم	۲۵۹	(۲:۲۰۷)
محبت - خدا کے ساتھ	سوم	۱۳۰	(۲:۱۶۵)	مرکزِ ملت - قبلہ	دوم	۲۱۶	(۲:۴۳)
محسوس حرکات و خیالات کا تعلق	اول	۱۲۲	(۲:۳)	مزارات اور خانقاہیں	دوم	۸۳	(۲:۳۱)
محکومی، خدا کا عذاب ہے۔	اول	۱۹۲	(۲:۷)				
(حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)	اول	۷	(۱:۱)				
محمد رسول اللہ والذین معہ	اول	۱۵۴	(۲:۵)				
مخالفینِ اعراس - لیکن حسن کا راز انداز ہے	دوم	۴۳۵	(۲:۱۰۹)				
مذہب کیسے پیدا ہو گئے	سوم	۳	(۲:۱۱۳)				
(دین کی) مذہب میں تبدیلی	اول	۳۴	(۱:۳)				
مذہب پرست طبقہ (مذہبی پیشوائیت)	دوم	۱۹۴	(۲:۴۱)				
دین کا سب سے شدید مخالف ہوتا ہے							

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
مزارعت! نظام سرمایہ داری ہے	دوم	۳۵۴	(۲:۸۵)	(غلط) معاشی نظام وجہ فساد آدمیت ہے	اول	۲۳۶	(۲:۱۱-۱۲)
مساکین کے لئے انفاق	دوم	۳۵۰	(۲:۸۳)	معاشی نظام۔ زمین پر ذاتی ملکیت	اول	۲۹۶	(۲:۲۲)
مستبد حکمران اور ان کی فساد انگیزی کا نتیجہ	سوم	۲۵۷	(۲:۲۰۶)	نہیں ہو سکتی۔			
مسجد کا مفہوم	سوم	۱۵	(۲:۱۱۴)	معاشی طبقات کی کشمکش۔ خطرناک حد تک	دوم	۱۲۶	(۲:۳۶)
مسجد الحرام کی دیکھ بھال	سوم	۱۵	(۲:۱۱۴)	معجزات کا مطالبہ اور انکار	اول	۳۰۹	(۲:۲۳)
مسجد ضرا کی تعمیر اور ہماری مسجدیں	اول	۲۱۶-۱۷	(۲:۹)	معجزۃ!۔ رسول اللہ کی سیرت تھی!	اول	۳۲۳	(۲:۲۴)
مسکنت۔ خدا کا عذاب ہے۔	دوم	۲۹۹	(۲:۶۱)	معراج سے متعلق روایات	سوم	۸۴	(۲:۱۴۲)
(پیدائشی) مسلمانوں کی پوزیشن	اول	۸۱	(۲:۳)	معراج نبوی (ضمنی تذکرہ)	سوم	۲۲۲	(۲:۱۸۶)
مشیت رنی	سوم	۳۷۵	(۲:۲۲۲)	مغضوب علیہ	اول	۵۴	(۱:۷)
مشناہ یہودیوں کی روایات کا مجموعہ	دوم	۱۸۶	(۲:۴۱)	مغضوب علیہ اور ضالین کوئی خاص	اول	۵۵	(۱:۷)
مصدق لہما معکم کے معنی	دوم	۱۸۲	(۲:۴۱)	قویں نہیں۔			
مصلحین اور مفسدین ایک جیسے نہیں ہوتے	اول	۲۴۴	(۲:۱۱-۱۲)	مغفرت کا مفہوم	دوم	۲۸۷	(۲:۵۸)
معاہدات کی پابندی ساری قوم کی	دوم	۳۹۰	(۲:۱۰۰)	مغاہمت۔ اصولوں میں نہیں ہو سکتی	اول	۱۷۸	(۲:۶)
طرفے ہونے چاہیے۔				مفلحون۔ کون ہیں؟	اول	۱۵۳	(۲:۵)
معاشی عدم توازن باعث غضب	اول	۵۸	(۱:۷)	مقام محمود	اول	۷	(۱:۱)
خداوندی ہے				مقتولین فی سبیل اللہ	اول	۲۵۵	(۲:۱۶)
(قرآن کا) معاشی نظام	اول	۱۰۵	(۲:۳)	مقربین بارگہ خداوندی	سوم	۱۱۰	(۲:۱۵۴)
	اول	۲۹۴	(۲:۲۲)	مقطعات (حروف)	اول	۷۰	(۱:۲)
	سوم	۳۲۶	(۲:۲۱۹)	مکاتب نکو۔ ایک ایسی سازش	دوم	۲۵۹	(۲:۵۱)
الحغو " " "	سوم	۲۶	(۲:۲۱۹)	رقانون، مکانات عمل۔ دین کی بنیاد	اول	۲۵	(۱:۲)

[illegible]

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
مومن، مشرک کیسے ہو جاتا ہے	اول	۵۸	(۱:۷)	ناپختہ ذہنوں کے ساتھ ایمان لانے والے	دوم	۳۱۵	(۲:۷۱)
مومن کے کہتے ہیں؟	اول	۷۷	(۲:۲۲)	النار کے معنی	اول	۳۲۶	(۲:۲۴)
مومن اور مسلمان میں فرق	اول	۸۲	(۲:۲۲)	الناس والحجۃ کا مفہوم	اول	۳۲۸	(۲:۲۴)
مومن۔ خوفِ حزن سے ناموں۔ سب پر غالب	دوم	۱۳۵	(۲:۳۸)	ناسخ و منسوخ کا قرآنی مفہوم (حدیثِ قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے ناسخ و منسوخ کی آیت)	دوم	۳۳۴	(۲:۱۰۶)
مومنین اور خدا کا باہمی معاہدہ	اول	۱۱۱	(۲:۳)	نبوت۔ ہونے والے نبی کی تلاشِ حقیقت میں سرگردانی	اول	۵۹	(۱:۷)
(جماعت) مومنین میں باہمی محبت اور الفت	اول	۵۶	(۱:۷)	نبوت (اور کتابِ حکمت) انعاماتِ خداوندی ہیں۔	دوم	۱۷۷	(۲:۲۰)
مومنین کو علو فی الارض حاصل ہوگا	اول	۲۳۳	(۲:۱۱-۱۲)	نبی کی طرف نازل ہونے والا علم وحی کہلاتا تھا	اول	۳۳۵	(۱:۲۵)
مومنین اور تسخیرِ کائنات	دوم	۸۶	(۲:۳۱)	نبی۔ ہر نبی کو کتاب دی گئی تھی	دوم	۲۶۵	(۲:۵۳)
مومنین کو بھی الذین او تو الکتاب کہا گیا ہے۔	سوم	۳۱	(۲:۱۲۱)	نبی کا قلب پر سوز و غمخوار	دوم	۳۳۶	(۲:۱۰۶)
مومنین کی جماعت کی اہمیت	سوم	۹۰	(۲:۱۴۳)	نجات کا غلط اور قرآنی مفہوم	دوم	۱۷۷	(۲:۲۰)
مہر	سوم	۳۵۳	(۲:۲۲۱)	نجات کے متعلق یہودیوں کے عجیب و غریب عقائد	دوم	۲۲۹	(۲:۵۸)
مہلت کا قانون	اول	۱۹۷	(۲:۷)	نذر۔ خدا کے ہمسر	اول	۲۹۷	(۲:۲۲)
میشاق بنی اسرائیل	دوم	۱۷۹	(۲:۲۰)	نذر کا مفہوم	سوم	۴۷۰	(۲:۲۶۶)
میشاق کا نظریہ اور اس کی عملی شکل	سوم	۱۶۳	(۲:۱۷۷)	نزول کے معنی	دوم	۲۸۳	(۲:۵۷)
میرزا غلام احمد کی دلیل کہ مفری علی اللہ قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس کی تردید	دوم	۳۰۰	(۲:۶۱)	نزول قرآن کا شہادتِ نظریہ	اول	۳۱۶	(۲:۲۳)
میرزا غلام احمد نے جہاد منسوخ کر دیا۔	سوم	۳۰۵	(۲:۲۱۶)	نسل کے معنی	سوم	۲۷۴	(۲:۱۹۹)
میزانِ عدلی کو قائم رکھو	اول	۲۴۹	(۲:۱۵۵)	نسل کا باطل عقیدہ۔ تمہیدِ مگرزشت آدم	دوم	۱۱۶	(۲:۳۶)
میسرہ	سوم	۳۲۲	(۲:۲۱۹)	نسل و حرث کی ہلاکت	سوم	۲۵۶	(۲:۲۴۵)
میکائیل	دوم	۳۸۷	(۲:۹۷)	نسلِ انبیاء کا باطل نظریہ	سوم	۴۳	(۲:۱۲۴)
ن	سوم	۳۳۸	(۲:۲۲۰)	نسی کا عملی مفہوم	سوم	۲۳۱	(۲:۱۸۹)
نابالغ لڑکی کی شادی	سوم	۳۳۸	(۲:۲۲۰)	نسیانِ عزم کی کمزوری ہے۔	سوم	۷۹۳	(۲:۲۸۶)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
نصاری کہتے ہیں یہودی باطل پر ہیں	سوم	۳	(۲:۱۱۳)	نفسیاتی (تبدیلی سے تغیرِ نعماء)	اول	۵۳	(۱:۶)
نصرت کے ایک معنی مجرم کی ناجائز مدد کر کے	دوم	۲۳۹	(۲:۴۸)	نفسیاتی امراض	اول	۲۰۶	(۲:۹)
اسے سزا سے بچالینا۔				نفسیاتی طریقِ تفتیش	دوم	۳۲۶	(۲:۷۳)
نظام کن بنیادوں پر استوار ہوتا ہے	سوم	۴۴	(۲:۱۲۴)	ترکیہ نفس	دوم	۲۵	(۲:۳۰)
نظامِ خداوندی کی عملی شکل	سوم	۱۶۵	(۲:۱۷۷)	نماز اور الصلوٰۃ محسوس حرکات اور خیالات کا باہمی تعلق	اول	۱۲۲	(۲:۳)
نظامِ خداوندی کے دشمن لیکن ایمان کے دعویدار	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۴)	نفع نقصان کا مفہوم اور حقیقی معیار	اول	۲۵۰	(۲:۱۶)
نظامِ خداوندی قائم ہو کر رہے گا خواہ کسی قوم کے ہاتھوں ہو۔	سوم	۳۰۲	(۲:۲۱۴)	نماز کے اوقات و رکعات کے متعلق اشارات	اول	۱۳۱	(۲:۳)
نظر و بصر کا فرق۔	اول	۱۶۸	(۲:۶)	نماز کی جزئیات قرآن کریم میں نہیں دی گئیں	اول	۱۲۸	(۲:۳)
نعمت کا مفہوم	اول	۴۸	(۱:۶)	نماز۔ ارکانِ اسلامی کی موجودہ شکلوں کا برقرار رکھنا ضروری ہے	اول	۱۳۹	(۲:۳)
نکاح کی تفصیل و شرائط	سوم	۳۳۶	(۲:۲۲۱)	نماز۔ الفاظ کا مفہوم سمجھے بغیر	سوم	۳۲۲	(۲:۲۱۹)
دکھان (نعمت کا نتیجہ)	اولی	۴۸	(۱:۶)	نمازی کیسے فرض ہوئیں	سوم	۸۵	(۲:۱۷۲)
نفس (بقائے)	دوم	بالکل ص ۳		نور۔ قرآن کریم نور ہے	اول	۲۶۲	(۲:۱۷)
نفس (انسانی ذات یا خودی)	اولی	۱۱-۱۲	(۱:۱)	نوع انسانی کے اختلافات کی تاریخ	سوم	۲۹۳	(۲:۲۱۳)
انفاق سے تشبیتِ نفس	سوم	۴۶۶	(۲:۲۶۵)	نیشنلزم کی تباہ کاریاں	اول	۲۴۱	(۳:۱۱-۱۲)
نفس۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کے نفس پر مرتب ہوتا ہے۔	اول	۲۰۶	(۲:۹)	نیشنلسٹ علماء کا مسلک	دوم	۳۶۱	(۲:۸۵)
نفسِ امارہ۔ نفسِ قوامہ۔ نفسِ منطمہ	دوم	۵۷		تحریکِ پاکستان کے دوران			
نفسِ شعوری و غیر شعوری کا مجادلہ	دوم	۳۰					

مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
والدین کی اطاعت کا عقیدہ صحیح نہیں	دوم	۳۶۷	(۲:۸۳)	وحی کیسے نازل ہوتی تھی ہم جان نہیں سکتے	دوم	۳۸۷	(۲:۹۷)
قرآن نے ایسا حکم نہیں دیا۔				وحی ہی کلام اللہ ہے	سوم	۴۲۷	(۲:۲۵۳)
وحی کے معنی	سوم	۱۳۹	(۲:۱۷۱)	وحی پر ایمان - خود رسول اللہ کو بھی	سوم	۴۹۰	(۲:۲۸۵)
وجدان، وحی نہیں	اول	۱۴۰	(۲:۴)	لانا ہوتا تھا			
وحیت انسانیت - قرآنی تعلیم	اول	۲۳۹	(۲:۱۱-۱۲)				
کا منتہی							
	سوم	۲۹۰	(۲:۲۱۳)	وراثت کا باطل نظریہ	دوم	۴۶	(۲:۱۳۴)
وحیت الوجود کا نظریہ	سوم	۴۳۴	(۲:۲۵۶)	وراثت نسل کا غلط عقیدہ	دوم	۴۶	(۲:۱۳۴)
	دوم	۲۷۹	(۲:۵۵)	ورد - وظائف - تعویذ گندے - اسم اعظم	دوم	۷۵	(۲:۳۰)
وحی کی ضرورت	اول	۱۳	(۱:۱)	سب یہودی تصورات ہیں	سوم	۱۱۲	(۲:۱۵۷)
وحی، خدا سے براہ راست ملنے والا	اول	۲۳	(۱:۲)	وسعت کے مطابق ذمہ داری۔	سوم	۴۹۲	(۲:۲۸۶)
علم ہے۔				لَا يَكْلَفُ اللَّهُ نَفْسًا وَلَا وَسْعًا كَمَا مَفْهُوم	سوم	۱۷۷	(۲:۱۸۰)
وحی سب کی سب قرآن کریم میں درج	اول	۱۴۱-۱۴۰	(۲:۴)	وصیت کا حکم	دوم	۱۴۲	(۲:۳۹)
ہے۔ وحی خفی (غیر متلو، غیر مکتوب)				وصنی روایات اور قصہ آدم	اول	۳۲۸	(۲:۲۴)
کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا ہے۔				وقود جہنم (جہنم کا ایندھن)	دوم	۸۷-۸۸	(۲:۳۱)
	دوم	۱۸۶	(۲:۴۱)	ویدانت اور وحدت الوجود کا	سوم	۴۴۴	(۲:۲۵۷)
وحی کا ثبوت	اول	۳۷۹	(۲:۲۳)	نظریہ کائنات			
وحی کی راہنمائی کی ضرورت	دوم	۱۳۹	(۲:۳۷)	ولی کے معنی			
وحی کی دو قسمیں - یہودیوں کا عقیدہ	اول	۱۴۱	(۲:۴)				
(اور مسلمانوں کا بھی)							
	دوم	۱۸۶	(۲:۴۱)				



مضمون	جلد	صفحہ	آیت	مضمون	جلد	صفحہ	آیت
حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ	دوم	۲۶۵	(۲:۱۵۳)	یتامی کی عزت نہ کرنے کا نتیجہ ذلت	سوم	۱۶۱	(۲:۱۷۷)
دونوں کو کتاب دی گئی تھی				یتیموں کے متعلق احکامات۔ دونوں قسم	سوم	۳۳۲	(۲:۲۲۰)
ہبہ (اور وصیت)	سوم	۱۷۶	(۲:۱۸۰)	کے یتیم۔ یعنی وہ جن کے ماں باپ ہوں			
ہبوط آدم سے مراد	دوم	۱۲۵	(۲:۳۶)	اور وہ بھی جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں			
ہجرت کا مفہوم اور اہمیت	سوم	۴۰	(۲:۱۲۴)	یہودی بچے منافق تھے	اول	۲۰۴	(۲:۸)
	سوم	۳۰۸	(۲:۲۱۸)	(کیا) یہودیوں کی حکومت قائم ہو	دوم	۱۶۸	(۲:۴۰)
ہدایت کا مفہوم	اول	۴۱	(۱:۵)	سکتی ہے؟			
(اشیائے کائنات کی) ہدایت	اول	۴۱	(۱:۵)	یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں کی حالت	دوم	۱۸۹۵	(۲:۴۱)
(رسول) ہدایت (صحیح راستہ) دکھاتا تھا	سوم	۲۶	(۲:۱۱۹)		دوم	۲۲۰	(۲:۴۴)
اس راستے پر چلانا اسکے ذمہ نہیں تھا				یہودیوں میں ہمت اور استقلال باقی نہیں رہا تھا	دوم	۲۲۲	(۲:۴۴)
ہلاکت حرث و نسل بیکو ل نظام حکومت	سوم	۲۵۷	(۲:۲۰۵)	یہودیوں کی قساوت قلبی	دوم	۳۳۰	(۲:۷۴)
کا نتیجہ				یہودیوں کی ہوس زر	دوم	۳۳۲	(۲:۷۴)
ہنگل کی جدلیت	دوم	۱۵۲	(۲:۴۰)	یہودیوں کی لپیٹ ذہنیت۔	دوم	۴۲۹	(۲:۱۰۴)
				آداب معاشرت تک سے عاری ہو چکے تھے			
یتامی سے حسن سلوک (یتیم کا وسیع مفہوم)	دوم	۳۶۹	(۲:۸۳)	یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ باطل پر ہیں	سوم	۷	(۲:۱۱۳)
	سوم	۱۵۶	(۲:۱۷۷)	ایسے یا یوشع	سوم	۴۱۸	(۲:۲۴۶)
	سوم	۲۳۳	(۲:۲۲۰)	یوم۔ یوم الدین	اول	۲۹۰۲۲	(۱:۳)
				”یوم الست	اول	۲۹۳	(۲:۲۱)

